بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

علمی و تحقیقی رسائل

جلد ہفت دہم

17

1. گاؤں میں جمعہ
2. عید کے دن مصافحہ و معانقہ کا حکم
3. عید کے اہم مسائل
4. نمازِ عید، باجماعت اور تنہاء پڑھنے کا حکم

مصنف

مُفتی مُحمّد رضوان

ادارۂ غفران

راولپنڈی پاکستان

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جلد17

علمی وتحقیقی رسائل

(1)...گاؤں میں جمعہ

(2)...عید کے دن مصافحہ ومعانقہ کا حکم

(3)...عید کے اہم مسائل

(4)...نمازِ عید، باجماعت اور تنہاء پڑھنے کا حکم

مصنّف

مفتی محمد رضوان خان

ادارہ غفران راولپنڈی پاکستان

www.idaraghufran.org

نام کتاب: علمی وتحقیقی رسائل (جلد17)

مصنّف: مفتی محمد رضوان خان

طباعتِ اوّل: ربیع الاول ۱۴۴۳ھ - اکتوبر 2021ء

صفحات: 744

ملنے کے پتے

رسائل کی اجمالی فہرست

نام رسائل	از صفحہ نمبر
پیشِ لفظ ’’مجلسِ فقہی‘‘ ادارہ غفران، راولپنڈی	22
(1)...گاؤں میں جمعہ	25
(2)...عید کے دن مصافحہ و معانقہ کا حکم	279
(3)...عید کے اہم مسائل	469
(4)...نمازِ عید، با جماعت اور تنہاء پڑھنے کا حکم	535
تفصیلی فہرست رسالہ اول	4
تفصیلی فہرست رسالہ دوم	8
تفصیلی فہرست رسالہ سوم	15
تفصیلی فہرست رسالہ چہارم	17

تفصیلی فہرست رسالہ اول

(گاؤں میں جمعہ)

تفصیلی فہرست رسالہ دوم

(عید کے دن مصافحہ ومعانقہ کا حکم)

تفصیلی فہرست رسالہ سوم

(عید کے اہم مسائل)

صفحہ نمبر	مضامین
473	**تمہید** (من جانبِ مؤلف)
474	**عید کے اہم مسائل**
//	''عیدُ الفطر'' کے معنیٰ
475	عید کی حکمت
477	نمازِ عید کا حکم
479	نمازِ عید واجب ہونے کی شرائط
482	نمازِ عید صحیح واداء ہونے کی شرائط
485	نمازِ عید کے لیے مسجد وغیرمسجد کا حکم
488	خواتین کے لیے نمازِ عید کا حکم
492	نمازِ عید کی ادائیگی کا وقت
497	نمازِ عید کا طریقہ اور چند متعلقہ مسائل
499	حنفیہ کے نزدیک عید کی نماز کا طریقہ

تفصیلی فہرست رسالہ چہارم

(نمازِ عید، باجماعت اور تنہاء پڑھنے کا حکم)

صفحہ نمبر	مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیشِ لفظ

''مجلسِ فقہی'' ادارہ غفران، راولپنڈی

مولانا مفتی محمد رضوان خان صاحب حفظہ اللہ (مدیر: ادارہ غفران، راولپنڈی) کے علمی وتحقیقی رسائل کی سترہویں جلد کے مضامین ورسائل، بحمداللہ تعالیٰ، نظرِ ثانی وغیرہ کے متعلقہ مراحل سے گزر کر اشاعت کے مرحلہ میں داخل ہورہے ہیں۔

اس جلد میں درجِ ذیل چار تحقیقی، علمی اور تفصیلی موضوعات پر مشتمل رسائل شامل ہیں:

(1)...گاؤں میں جمعہ

(2)...عید کے دن مصافحہ ومعانقہ کا حکم

(3)...عید کے اہم مسائل

(4)...نمازِ عید، باجماعت اور تنہاء پڑھنے کا حکم

ابھی بھی مزید کئی جلدوں کے رسائل ومضامین پر بھی بحمداللہ تعالیٰ مختلف جہات سے کام جاری ہے، اور بحمداللہ تعالیٰ کئی رسائل کا کام کافی حد تک مکمل ہوچکا ہے، اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے بعافیت واستقامت اس سلسلہ کو حسبِ مراد انجام دینے کی توفیق عطاء فرمائے۔ آمین۔

ادارہ غفران کے متعدد اہلِ علم نے اس جلد کے رسائل کا مطالعہ کیا، اور مفید مشورے اور قابلِ اصلاح امور کی نشاندہی کی، جن میں سے بعض امور سے مؤلف نے کلی، یا جزوی اتفاق کیا، اور بعض پر مؤلف کو شرح صدر نہ ہوا، اس لیے اس میں حسبِ منشاء ترمیم، یا اس کی توضیح کی، اور اس طرح کی جزوی چیزوں میں نیک نیتی کے ساتھ، حسبِ ذوق وحسبِ استعداد، اختلاف، شرعی وفقہی اعتبار سے مذموم نہیں۔

اراکینِ مجلس نے ان رسائل کو حسبِ سابق تحقیق پر مبنی اور وقت کے اہم موضوعات کے

مطابق محسوس کیا۔

دعاء ہے کہ یہ مجموعہ، اللہ کی بارگاہ میں قبول ومنظور ہو، اور علمی وفقہی دنیا میں وسعت واعتدال کے قائم ہونے کا باعث بنے، اور غلط فہمی، لاعلمی یا تعصب کی بناء پر جو مسلمانوں میں باہمی اختلافات اور دوریاں موجود ہیں، اللہ تعالیٰ ان دوریوں کا خاتمہ فرمائے، اور جملہ حضراتِ اہلِ علم کے لیے مغفرت اور ترقی درجات کا ذریعہ بنے۔ آمین۔

اسمائے گرامی: اراکینِ مجلسِ فقہی، ادارہ غفران

(1)......مفتی محمد رضوان صاحب (صدر مجلس)

(2)......مفتی محمد یونس صاحب (نائب صدر)

(3)......مولانا طلحہ مدثر صاحب (ناظم)

(4)......مولانا محمد ناصر صاحب (رکن)

(5)......مولانا طارق محمود صاحب (رکن)

(6)......مولانا عبدالسلام صاحب (رکن)

(7)......مولانا غلام بلال صاحب (رکن)

(8)......مولانا محمد ریحان صاحب (رکن)

(9)......مولانا شعیب احمد صاحب (رکن)

13/ محرم الحرام/ 1443ھ 22/ اگست/ 2021ء بروز اتوار

ادارہ غفران، چاہ سلطان، راولپنڈی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

علمی و تحقیقی سلسلہ

گاؤں میں جمعہ

یومِ جمعہ اور نمازِ جمعہ کی فضیلت واہمیت
شہر اور گاؤں میں جمعہ کی نماز کے حکم سے متعلق
فقہائے کرام کے اقوال اور ان کے مستدلات پر ایک نظر
بوقتِ ضرورت ومصلحت گاؤں میں جمعہ کی نماز کے جواز پر کلام
اس سلسلے میں غیر حنفیہ یا حنفیہ میں سے کسی مذہب یا قول پر عمل کرنے کی تحقیق

مؤلف
مفتی محمد رضوان خان

ادارہ غفران، چاہ سلطان، راولپنڈی
www.idaraghufran.org

فہرست

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تمہید

(من جانبِ مؤلف)

عرصۂ دراز سے ہندوستان و پاکستان اور دنیا کے بعض دوسرے ممالک، جہاں فقہ حنفی سے منسلک ومنتسب اہلِ علم اور عوام کا طبقہ آباد ہے، ان علاقوں کے گاؤں، دیہات میں نمازِ جمعہ کے قیام اور جواز سے متعلق مسائل، بکثرت زیرِ بحث آتے ہیں، کیونکہ فقہ حنفی کے مطابق، نمازِ جمعہ کا حکم، شہروں میں ہے، عام گاؤں، دیہات میں نمازِ جمعہ کا حکم نہیں، لیکن ان ممالک کے بہت سے گاؤں، دیہات کی مساجد میں نمازِ جمعہ پڑھنے کا عام رواج ہے، اور عوام کے علاوہ، اہلِ علم حضرات کے بڑے طبقے کا بھی نمازِ جمعہ کے قیام کی طرف خاص رجحان ومیلان ہے، جس کی مختلف مصلحتوں وفائدوں کو بیان ومشاہدہ کیا جاتا ہے۔

جبکہ فقہ حنفی سے وابستہ بڑی تعداد میں اصحابِ افتاء حضرات، ایسے مقامات پر جمعہ کی نماز کو نہ صرف یہ کہ واجب قرار نہیں دیتے، اسی کے ساتھ وہ حضرات، جمعہ کی نماز کو غیر صحیح بھی قرار دیتے ہیں، اور ساتھ ہی مختلف گناہ ومکروہات لازم آنے کا بھی حکم لگاتے ہیں، جس کے نتیجے میں وہاں کے علماء وعوام میں انتشار وخلفشار، اور اختلاف وافتراق وغیرہ کی کیفیت لازم آتی ہے، جس کا انکار کرنا، درحقیقت ''امرِ واقعہ'' کا انکار ہے۔

دوسری طرف عدمِ جواز کے فتاویٰ جاری ہونے کے باوجود بھی اکثر مقامات پر جمعہ کی نماز کو بند کرنے کا معمول نہیں، چنانچہ ہندوستان و پاکستان وغیرہ میں فقہ حنفی سے منسلک بہت سے اہم علم وفقہ کے مدارس کے دیہی علاقوں میں بھی عرصۂ دراز سے بکثرت جمعہ کی نمازیں جاری ہیں، اور ان علاقوں میں، اصحابِ افتاء واہلِ علم حضرات کے عدمِ جواز کے فتاویٰ جاری اور تحریری وتقریری اور عملی کوششیں کرتے رہنے کے باوجود، عملی طور پر زیادہ اثر نہ ہوسکا، بلکہ عدمِ جواز کے فتاویٰ وکوششوں کی بناء پر، وہاں کے بہت سے عوام، ان اصحابِ افتاء واہلِ علم

حضرات، اوران کے متبعین سے بُعد ودوری کا راستہ اور جمعہ کے مجوزین، وعاملین سے قرب وہم آہنگی اختیار کیے ہوئے ہیں، خواہ، وہ کسی بھی مسلک ومشرب سے وابستہ ہوں۔

ہمارے مشاہدہ میں گاؤں، دیہات میں جاری شدہ جمعہ کی نمازوں کے خلاف فتاویٰ جاری کرنے اوران کو بند کرنے کی کوششوں کے بعد، جو مختلف اوقات میں، انتشار وخلفشار اور اختلاف وافتراق کے ان گنت واقعات آتے رہے، ان کی داستان بہت طویل، اور " لیس الخبر کالمعاینة " والی بات ہے، جس کو اس مختصر تحریر میں لانا ممکن نہیں، البتہ بطورِ نمونہ ایک خاص رنگ کے واقعات کو اجمالی انداز میں ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ بہت سے گاؤں، دیہات کے علاقوں سے وابستہ طلبۂ کرام، جب دینی مدارس وجامعات سے، دینی وفقہی تعلیم حاصل کرکے اپنے علاقوں میں پہنچتے ہیں، اور وہاں پہلے سے جاری شدہ جمعہ کی نمازوں کی مخالفت وممانعت کا حکم لگاتے ہیں، تو ایک طرف تو ان کو اپنے علاقوں میں تعلیم وتعلُّم اور درس وتدریس، امامت وخطابت کا کام کرنا، عوامی مخالفت کی وجہ سے دُشوار ہوجاتا ہے، اور دوسری طرف جمعہ کے دن مساجد میں جاکر جمعہ ادا کرنا، یا جمعہ کی نماز ترک کرکے گھر میں بیٹھے رہنا بھی دُشوار محسوس ہونے لگتا ہے، اور اسی کشمکش میں ایک عرصہ گزر جاتا ہے، اور بسا اوقات اپنے علاقہ میں عمر بھر کے لئے، اِن علماء کو، عوام سے مخالفت ومخاصمت اور دُوری تک کی نوبت آجاتی ہے، دین کی خدمت سرانجام دینا تو بعد کا مرحلہ ہے۔

عام مسلمانوں کے دل ودماغ میں فطری وقدرتی طور پر جو نمازِ جمعہ وعیدین سے اُنسیت ومحبت پائی جاتی ہے، اس کو جدوجہد کرکے عوام کے دِلوں سے نکالنا مشکل ہوتا ہے، ایسی صورت میں نمازِ جمعہ کی ممانعت کا حکم لگانے والوں کو نمازِ جمعہ کا مخالف ومنکِر سمجھا جاتا ہے، اوراس طرح عمر بھر کے لئے ایک عالم ومقتداء کی علمی وعملی صلاحیتوں کے اس علاقہ میں استعمال ہونے کا راستہ مسدود ہوکر رہ جاتا ہے، اور وہ عوام سے کنارہ کشی اختیار کرنے میں اپنی عافیت وسلامتی محسوس کرتا ہے، جبکہ اس مسئلے میں، غیر روایتی، اور وسیع تر تفقہ واجتہاد کے پیشِ نظر،

علاقہ بھر میں عوام کی تدریس وتبلیغ اور اصلاحِ اعمال وفلاحِ دارین کا راستہ نکالنا ممکن تھا۔

ان حالات میں بھی بعض اہلِ علم واصحابِ افتاء حضرات کا موقف یہ ہے کہ ان چیزوں کی ذمہ داری ہم پر عائد نہیں ہوتی، اور ہم تو صرف اور صرف اپنے فقہ، یا اپنے اکابر ومشائخ کے مخصوص قول کے مطابق فقہی حکم بیان کرنے اور فتویٰ دینے کے مکلّف ہیں، اور بس۔

لیکن اس موقف سے دوسرے اصحابِ علم وفقہ کا متفق ہونا ضروری نہیں، بلکہ کوئی، اس موقف سے دلائل واحوال کے پیشِ نظر اختلاف کرے، تو اس کی بھی گنجائش ہے، اور ہم بھی اس مسئلے پر عرصۂ دراز سے دلائل اور حالات کا جائزہ لیتے رہنے کے بعد اسی نتیجے پر پہنچے کہ اہلِ علم حضرات کو ہر دور کے عرف وحالات پر نظر کر کے ہی رائے قائم کرنے، اور اس کو نظر انداز کر کے کسی مخصوص زمانے، یا علاقے کے مطابق جاری کردہ کسی خاص فتوے، یا بعض فتاویٰ کی ہر حال میں پیروی واتباع کرتے رہنے کے طرزِ عمل سے اجتناب کرنے کی ضرورت ہے۔

پھر اس اختلافی ونزاعی فضاء میں جمعہ قائم وجاری رکھنے والے حضرات وافراد، اپنے یہاں کسی بھی جگہ سے نمازِ جمعہ کے جواز پر مشتمل فتاویٰ کے متلاشی ومتمنی رہتے، اور اس کے لیے جدوجہد کرتے ہیں، اور اس طرح بعض اوقات ایک ہی مقام کے لیے مختلف قسم کے فتاویٰ حاصل کر لینے کے بعد مدتِ دراز تک اختلاف جاری رہتا ہے، اور اگر اس میں نفسانیت کی آمیزش بھی ہو جائے، تو پھر یہ انتشار ''کریلا اور نیم چڑھا'' کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

اور انتہاء یہ ہے کہ عرصۂ دراز گزرنے اور اس مقام کی تمدنی ومعاشرتی حالت تبدیل ہونے کے باوجود، بعض لوگوں کا قدیم فتاویٰ پر ہی اصرار رہتا ہے، اور وہ اس کے برخلاف رائے قبول کرنے کو تیار نہیں ہوتے، اور اس کو اپنی اونچ نیچ اور ذاتی انا کا مسئلہ بنا لیتے ہیں۔

اور جب فقہ حنفی کے علاوہ کسی دوسرے فقہ کے مطابق جمعہ کے جائز ہونے کی گنجائش پر کلام کیا جاتا ہے، تو اہلِ علم حضرات کے ایک بڑے طبقہ کی طرف سے اس کی اجازت نہیں دی جاتی، اور اس میں مکروہات اور تلفیق وغیرہ لازم آنے کے خدشہ کو حائل سمجھا جاتا ہے، بلکہ فقہائے

حنفیہ کے کسی ایسے قول کے مطابق بھی جواز کی گنجائش نہیں دی جاتی، جو اِن اہلِ افتاء کے نزدیک غیر معروف، یا مرجوح قول شمار ہوتا ہو، اگرچہ کسی دوسرے کے نزدیک، دلائل اور حالاتِ حاضرہ، یا عرفِ مروج کے مطابق، وہ فقہی قول، معروف اور راجح کیوں نہ شمار ہو، اور اسی پر بس نہیں کیا جاتا، نمازِ جمعہ قائم وادا کرنے والوں کو فرائض کا تارک قرار دے کر فاسق وگمراہ اور کبیرہ گناہوں کا مرتکب ہونے کا حکم لگانے سے بھی گریز نہیں کیا جاتا۔

اور اگر کوئی صاحبِ علم ان حضرات کی رائے کے برخلاف فتویٰ جاری کردے، تو نہ صرف یہ کہ اس کے خلاف زبانی، قلمی وعملی اقدامات واسباب اختیار کیے جاتے ہیں، بلکہ ساتھ ہی عوام الناس کو اس فتوے پر عمل سے بھی باز رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے، اور طرح طرح سے اس صاحبِ فتویٰ اور اس کے متبعین کو ملامت کی جاتی ہے، جو بسا اوقات جادۂ اعتدال سے تجاوز کر جاتی ہے، اور ایک اجتہادی، فروعی مسئلہ کا اختلاف ''ذاتی اختلاف'' کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے، جو انتہائی خطرناک صورتِ حال پر منتج ہوتا ہے۔

اس قسم کے حالات کے پیشِ نظر بندہ محمد رضوان نے اپنی مفصل کتاب ''جمعہ مبارکہ کے فضائل واحکام'' میں کچھ محتاط انداز میں کلام کیا تھا، اور بعض دوسری تالیفات میں بھی، لیکن وہ کلام منتشر تھا، جس کو خاص مسئلہ ھٰذا میں امتیاز حاصل نہ تھا، اور کچھ پہلوؤں پر مزید صراحت و وضاحت کے ساتھ کلام کرنے اور روشنی ڈالنے کی ضرورت تھی۔

اسی دوران بندہ کے پاس ایک دور دراز کے علاقے سے دو متدین حضرات خاص اس مسئلے کے حل کے لیے تشریف لائے، اور اپنے یہاں جمعہ کی نماز کی بابت ایک عرصے سے جاری خلفشار وانتشار کے متعلق استفسار کیا، اور اپنے یہاں آ کر اس مسئلہ پر عوام کو خطاب کرنے اور خلفشار وانتشار کی کیفیت کو ٹھنڈا کرنے کی دعوت دی، جس کو بندہ نے ایک عظیم کارِ خیر سمجھ کر قبول کرلیا، کیونکہ دو مسلمان افراد، یا جماعتوں میں بے جا افتراق وانتشار کو ختم کرادینے کی اسلام میں بڑی اہمیت وفضیلت ہے، جس کی خاطر شریعتِ مطہرہ نے بعض خاص اور استثنائی

احکام بھی جاری فرمائے ہیں۔ ؎

؎ مندرجہ بالا تحریر تو پہلے لکھی جا چکی تھی، پھر جب 20 / ذوالحجہ 1440 ہجری، بروز جمعرات کو بندہ کا مذکورہ علاقہ میں جانا ہوا، تو وہاں جا کر اس علاقے کے ایسے ایسے بوڑھے اور معمر، متدین حضرات سے ملاقات وزیارت کا شرف حاصل ہوا، جو اپنی جوانی اور شباب سے یہاں جمعہ کی نماز پڑھتے آئے ہیں، اور اب عمر رسیدہ ہو چکے ہیں، وہ وہاں جمعہ کی نماز کے ناجائز ہونے کے حکم سے کافی پریشان اور مضطرب تھے۔

جب بندہ نے وہاں جا کر علاقہ کا مشاہدہ کیا، تو معلوم ہوا کہ یہ علاقہ، کئی چھوٹی چھوٹی آبادیوں کے لیے مرکزی حیثیت رکھتا ہے، اور اردگرد کی چھوٹی چھوٹی بستیوں کے لوگ، یہاں جمعہ کی نماز ادا کرنے کے لیے ذوق وشوق کے ساتھ حاضر ہوتے ہیں، اور اپنی روزمرہ کی ضروریات کے لیے بھی یہاں پر آتے ہیں، جس میں جمعہ کی نماز کے لیے نائی سے فاضل بال کٹوانے کے لیے حجامت کرانے کی ضرورت بھی ہے، اور وہ جمعہ وعیدین کی نمازوں کے ساتھ والہانہ عقیدت ومحبت رکھتے ہیں، جس کو ترک کرنے کے لیے، وہ آمادہ نہیں ہیں۔

بندہ نے ان کے علاقہ کا مشاہدہ ومعائنہ کر کے، وہاں پر جاری شدہ جمعہ وعیدین کی نماز کو درست وجائز قرار دیا، اور وہاں کے عوام کو اس موضوع پر خطاب بھی کیا، جس میں مقامی اور غیر مقامی، بعض علمائے کرام اور اصحابِ علم بھی شریک تھے، جس کے نتیجے میں الحمدللہ تعالیٰ ایک عرصے سے جاری اضطراب واختلاف کا خاتمہ ہوا، اور مقامی وغیر مقامی تقریباً تمام حضرات وافراد نے اجتماعی طور پر خوشی واطمینان کا اظہار کیا، جس کے آثار ان کے چہروں اور طرزِ عمل سے بھی ظاہر تھے، اور اس طرح بحمد اللہ تعالیٰ ایک عرصے سے جاری خلفشار وانتشار کا دور اپنے اختتام کو پہنچا، اور ان حضرات کی اس مخلصانہ سعی وجدوجہد کے طفیل اس موضوع پر ایک مستقل مضمون بھی تیار ہو گیا۔

بعض قرب وجوار سے تشریف لائے ہوئے اہلِ علم، مہمانانِ گرامی کے ذریعے معلوم ہوا کہ گاؤں، دیہات میں عدمِ جوازِ جمعہ کے فتاویٰ سے ان کے مختلف علاقوں میں بھی اسی قسم کی فضاء قائم ہے، بندہ کے خطاب سے ان مہمانانِ گرامی کو بھی اطمینان ہوا، اور اپنے علاقہ میں دینی خدمات سرانجام دینے کے حوالے سے ان کو جو مشکلات درپیش تھیں، ان کے ازالہ کی ایک کرن ان کو بھی نظر آئی، بندہ نے ان کو اپنے زیرِ نظر مضمون کو ملاحظہ کرنے کا ذکر کیا۔

بندہ نے اپنے خطاب وگفتگو میں اس بات کی بھی برملا وضاحت کی کہ جو اہلِ علم اور اصحابِ افتاء حضرات، اس طرح کے دیہات اور گاؤں میں نمازِ جمعہ کو ناجائز قرار دیتے ہیں، وہ بھی چونکہ اصحابِ علم اور اہلِ افتاء حضرات ہیں، اس لیے ان کی بے ادبی اور بے احترامی کے کسی بھی قسم کے طرزِ عمل سے اجتناب فرمائیں، اور اس مسئلے کو ایک علمی، فقہی وفروعی اختلاف کے درجہ میں رکھیں، جس طرح اور بھی بے شمار علمی وفقہی مسائل میں اہلِ علم حضرات وفقہائے کرام کا اختلاف رونما ہوتا رہتا ہے، لیکن ان مسائل میں علماء وفقہاء کی بے ادبی وبے احترامی کو جائز نہیں سمجھا جاتا۔

ہم نے موجودہ حالات اور دلائل کے پیشِ نظر، جس قول کو راجح سمجھا، اس کا اظہار کیا ہے، بعینہٖ اسی طرح دوسرے اصحابِ علم وافتاء کو بھی اپنے رجحان کو ظاہر کرنے کا حق حاصل ہے، لیکن اس قسم کے مسائل کو باہمی جنگ وجدل کا ذریعہ بنا کر اپنی ہی صفوں میں اختلاف وانتشار، خلفشار اور اضطراب کی فضاء پیدا کرنا، سخت نقصان دہ ہے۔

محمد رضوان۔ 22 / ذوالحجہ / 1440 ہجری۔ 24 / اگست / 2019 عیسوی، بروز ہفتہ۔

اور ساتھ ہی اس موقع پر بندہ نے اس مسئلہ پر کچھ تفصیل سے تحریر کرنے کی ضرورتِ شدیدہ کو محسوس کیا، اور فوری طور پر مسئلہ ھٰذا کو ایک مضمون کی شکل میں، تعطیلاتِ عیدالاضحیٰ میں بعجلت تیار کیا، جو اس وقت آپ حضرات کے سامنے ہے، ممکن ہے کہ کسی دوسرے وقت میں اس پر مزید کلام کیا جائے، اور تشنہ طلب پہلوؤں اور شبہات پر مزید روشنی ڈالی جائے۔

اس مضمون میں ہمیں ''فیما بیننا و بین اللہ'' جو تحقیق راجح معلوم ہوئی، اس کو تحریر کر دیا ہے، اگر کوئی اس کے مطابق عمل کرے، تو اس کے جواز میں ہمیں شبہ نہیں، البتہ اگر کوئی صاحبِ علم اس سے اختلاف کریں، اور کوئی دوسری رائے قائم کریں، تو جن لوگوں کو ان کی رائے پر شرح صدر ہو، وہ اس پر عمل کر سکتے ہیں، جس پر ہمیں اعتراض کا حق نہیں، لیکن عدل وانصاف اور دیانت داری، بلکہ دینداری کا تقاضا یہ ہے کہ دوسرے حضرات کو بھی چاہئے کہ وہ ان لوگوں کے درپے ہونے اور اپنی اتباع پر مجبور کرنے سے بھی گریز کریں، جو نہ تو ان کی رائے کو راجح سمجھتے اور نہ ہی ان کی اتباع کرنا چاہتے، بلکہ وہ ان کے مقابلے میں دوسرے اصحابِ فقہ وافتاء کے قول وفتوے پر عمل پیرا ہیں، جیسا کہ صحابۂ کرام، تابعینِ عظام اور سلفِ صالحین کا یہی پاکیزہ ومبارک طریقہ رہا ہے کہ وہ سوال واستفسار کرنے والوں کو اپنی رائے سے آگاہ فرما دیا کرتے تھے اور دوسرے کی رائے پر عمل کرنے والوں کے درپے نہیں ہوا کرتے تھے اور فقہی واجتہادی مسائل کو فروعی درجے میں ہی رکھا کرتے تھے اور ان کو حق وباطل کے بجائے صواب وخطاء کے احتمال کا درجہ دیا کرتے تھے، جس میں مصیب کے لیے دو اجر وثواب اور مخطی کے لیے ایک اجر وثواب کی امید رکھا کرتے تھے۔

لہٰذا ایسی صورتِ حال میں ہمارے نزدیک اس مسئلے کو باہمی معرکہ آرائی کا ذریعہ بنا کر فتنہ وانتشار کو مزید ہوا دینا، اور پھیلانا کوئی کارِ خیر نہیں۔

رہا جمعہ کی نماز پڑھنے اور قائم کرنے والوں کی طرف، خواہشِ نفس کی پیروی کرنے کی نسبت کا معاملہ، تو کسی کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ نمازِ جمعہ اور وعظ وتذکیر کی شکل میں عبادت سرانجام

دینے والوں کی طرف، خواہشِ نفس کی پیروی کی نسبت کرے، کیونکہ کسی کے ظاہر کو چھوڑ کر، بلکہ اس کی مخالفت کر کے، اس طرح کا حکم لگانا، درست طریقہ نہیں، بالخصوص جبکہ ان کا عمل ائمۂ متبوعین اور فقہائے مجتہدین میں سے کسی قول، یا مذہب کے مطابق ہو، جس کی مدلّل اور باحوالہ انداز میں تفصیل ہم نے اپنی بعض دوسری تالیفات میں ذکر کر دی ہے۔

یہ ملحوظ رہنا بھی ضروری ہے کہ جمعہ کا دن عبادت و ذکر، اور وعظ و تذکیر کا خاص دن ہے، اور اس دن لوگوں کے نمازِ جمعہ کے لیے مساجد میں حاضر ہونے سے عام مسلمانوں کو مساجد، مدارس، اصحابِ علم اور دین سے وابستگی کا ایک راستہ نکلتا ہے، اور اس کام کو حکمت و بصیرت، احساسِ ذمہ داری، اور اخلاص و نیک نیتی کے ساتھ انجام دینے کے نتیجے میں عامۃ المسلمین میں دین کی بیداری اور اصلاح کی فکر اور مسلمانوں میں اتحاد و اتفاق کا وسیع تر اور ہمہ جہتی، مستحکم نظام قائم کیا جا سکتا ہے۔

پس ہماری نظر میں اس مسئلہ کے اندر وسیع تر فقہی اصولوں کی روشنی میں توسع و گنجائش کا راستہ نکالنا، جبکہ ان اصولوں کا پیمانہ، اپنی مخصوص اور تنگ نظری پر مشتمل روایتی ترجیحات پر مبنی نہ ہو، اس دور کی ہمہ جہتی اور دینی اعتبار سے اہم ضرورت ہے، بے شک کسی دوسرے کو اس سے اتفاق نہ ہو، لیکن کسی دوسرے کا اختلاف، ہمیں اس رائے کے قائم کرنے میں بحمد اللہ تعالیٰ مانع و حائل نہیں، جس کو ہم ''فیما بیننا و بین اللہ ''حق و صواب، اور عند اللہ اجر و ثواب کا ذریعہ سمجھتے ہوں۔

اللہ تعالیٰ اعتدال کو اختیار کرنے کی توفیق عطا فرمائے، اور بے جا تشدد و تعصب سے محفوظ فرمائے۔ آمین۔ فقط

وَاللہُ سُبْحَانَہٗ وَتَعَالٰی اَعْلَمُ وَعِلْمُہٗ اَتَمُّ وَاَحْکَمُ.

محمد رضوان خان 15 / ذوالحجہ / 1440ھ 17 / اگست / 2019ء بروز ہفتہ

ادارہ غفران، راولپنڈی، پاکستان

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سوال:

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے بارے میں کہ:

ہمارا علاقہ چراگاہ بستی، چک نمبر M.67، کے نام سے، تحصیل جلال پور، پیروالا، ضلع ملتان، صوبہ پنجاب، پاکستان میں ''منشی والا'' کے قریب واقع ہے، اور کافی قدیمی علاقہ ہے۔

اس علاقہ کی آبادی تقریباً ایک ہزار کے قریب ہے، اور یہ آبادی کافی حد تک اکٹھی ایک ہی جگہ میں واقع ہے، جس کے کافی سارے مکانات ایک دوسرے کے ساتھ متصل ہیں، اور تقریباً 8 گلیاں ہیں، جن کے درمیان میں ایک آر پار مصروف روڈ بھی واقع ہے، اس موضع کے اردگرد 1، 2 کلومیٹر کے اندر اندر کئی چھوٹی چھوٹی بستیاں آباد ہیں، اس موضع میں اس وقت چھ، سات کریانہ اور پرچون کی دوکانیں ہیں، جن میں روزمرہ کی کافی ضروریات ملتی ہیں، ایک جوتے کی دوکان ہے، تین سبزی کی دوکانیں ہیں، ایک گھر میں کپڑے کا کاروبار ہوتا ہے، نائی ہے، ایک ڈاکٹر کا کلینک ہے، دو آٹے کی چکیاں ہیں، اردگرد کی چھوٹی آبادیوں کے لوگ یہاں اپنی روزمرہ کی ضروریات، اور خریداری وغیرہ کرنے کے لئے آتے ہیں، پرائمری تک اسکول بھی ہے، جس میں سینکڑوں مقامی و غیر مقامی بچے پڑھتے ہیں، سرکاری اجازت سے عیدگاہ بھی ہے، اس موضع میں مستقل بازار نہیں ہے، فی الحال اس موضع میں دو مساجد ہیں، ایک مسجد بریلوی حضرات کی ہے، اور ایک مسجد ہمارے دیوبند حضرات کی ''جامع مسجد عثمانِ غنیؓ'' ہے، ہماری مسجد بڑی ہے، لیکن اس مسجد میں اگر ہمارے موضع کے تمام عاقل بالغ افراد بیک وقت نمازِ جمعہ میں شریک ہوں، تو وہ سارے اس میں سما نہیں سکتے۔

اس موضع میں تقریباً 40 سال سے جمعہ کی نماز ہورہی ہے، جس میں 100 سے زائد افراد شریک ہوتے ہیں، اور خود اس موضع کے مستقل باشندے تقریباً 50 سے 60 تک شریک ہوتے ہیں، باقی افراد اردگرد کی قریبی آبادیوں سے آکر نمازِ جمعہ میں شریک ہوتے ہیں۔

تقریباً 8 سال پہلے یہاں پر ملتان کے ایک بڑے مدرسہ کے مفتی صاحب تشریف لائے، اور انہوں نے یہاں آ کر بتلایا کہ یہاں فقہ حنفی کے مطابق جمعہ کی نماز ادا نہیں ہوتی، جس کے بعد سے بعض لوگوں میں تشویش پیدا ہوگئی، اور اسی وقت سے لوگوں میں اختلاف وانتشار پیدا ہوگیا، اور لوگوں کے مختلف خیالات پیدا ہوگئے، بعض جگہ سے فتاویٰ بھی منگوائے گئے، جن میں فقہ حنفی کے مطابق جمعہ کی نماز کو ناجائز قرار دیا گیا، اور یہ بتلایا گیا کہ یہاں جمعہ کی نماز پڑھنے سے جمعہ کا فریضہ ادا نہیں ہوگا، اور یہ جمعہ کی نماز نفل نماز شمار ہوگی، اور مکروہ بھی ہوگی، اور ظہر کی نماز اور جماعت ترک کرنے کی وجہ سے سب لوگ گنہگار ہوں گے، اور کسی دوسرے فقہ کے مطابق بھی نمازِ جمعہ پڑھنا، تلفیق لازم آنے کی وجہ سے ناجائز ہوگا۔

اسی وقت سے پریشانی پیدا ہوگئی، کئی لوگ بریلوی حضرات کی مسجد میں جمعہ کی نماز پڑھنے کے لئے جانے لگے، اور کچھ لوگوں نے جمعہ کی نماز ہی پڑھنا چھوڑ دی، اور وہ ظہر کی نماز بھی نہیں پڑھتے، لیکن عرصۂ دراز سے جاری نمازِ جمعہ کو بند کرنا فتنہ کا باعث معلوم ہوا، جس کی وجہ سے نمازِ جمعہ تو جاری ہے، لیکن لوگوں کی حاضری کم ہوگئی، اور جمعہ کی نماز میں حاضر ہونے اور دین کی بات سُننے سے جو اُن لوگوں کو دین کا فائدہ ہوتا تھا، وہ بھی موقوف ہوگیا، جبکہ نمازِ جمعہ میں حاضر ہونے والے لوگوں کو دین کا فائدہ ہو رہا ہے، لیکن بعض لوگوں کے ذہنوں میں شکوک وشبہات اور انتشار کی کیفیت موجود ہے۔

آپ سے درخواست ہے کہ ہمارے علاقہ میں کیا نمازِ جمعہ پڑھنا کسی طرح درست نہیں، یا ہمارے یہاں نمازِ جمعہ پڑھنا جائز ہے، اور اس میں کوئی گناہ تو لازم نہیں آتا؟

اور کیا ہم فقہ حنفی کے علاوہ فقہ شافعی، یا حنبلی، یا مالکی کے مطابق نمازِ جمعہ پڑھ لیں، تو اس کی کسی طرح گنجائش ہے؟ مفصَّل جواب سے مستفید فرمائیں۔

سائل: محمد ندیم

جلال پور، پیروالا، ضلع ملتان۔ 15 / ذوالقعدۃ / 1440 ہجری

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جواب:

اسلام میں جمعہ کے دن اور جمعہ کی نماز کی بڑی اہمیت وفضیلت ہے، اور اس کو بلاعذر چھوڑ دینے پر سخت وعیدیں آئی ہیں۔

لیکن جمعہ کی نماز درست، یا واجب ہونے کے لئے کچھ شرائط اور خصوصیات کا پایا جانا ضروری ہے، جن میں سے بعض شرائط وخصوصیات پر فقہائے کرام ومجتہدینِ عظام کا اتفاق ہے، اور بعض شرائط میں اختلاف ہے۔

اختلافی شرائط میں ایک شرط، جمعہ کی نماز منعقد ہونے کے لئے مخصوص لوگوں وافراد کی تعداد کی شرط ہے، اور دوسری شرط گاؤں اور دیہات میں جمعہ کی نماز واجب یا صحیح ہونے کی ہے۔

پس نمازِ جمعہ کے لئے حنفیہ کے نزدیک تین عاقل، بالغ مرد افراد ضروری ہیں، خواہ وہ وہاں کے مستقل باشندے ہوں، یا کوئی اور ہوں، اور مالکیہ کے نزدیک اس آبادی کے بارہ مستقل باشندے اور شافعیہ وحنابلہ کے نزدیک اس آبادی کے چالیس مستقل باشندے شریک ہوں، تو نمازِ جمعہ درست ہوجاتی ہے، پھر حنفیہ کے نزدیک نمازِ جمعہ کے لئے اس جگہ کا شہر، یا بڑا گاؤں ہونا ضروری ہے، لیکن مالکیہ، شافعیہ وحنابلہ، ان سب جمہور فقہائے کرام نزدیک جس آبادی میں مستقل طور پر لوگ رہائش پذیر ہوں، اس میں نمازِ جمعہ جائز ہے، خواہ وہ شہر ہو، یا گاؤں۔

اس مسئلہ کی آگے مدلَّل انداز میں تفصیل ذکر کی جاتی ہے، جس کے بعد ان شاءاللہ تعالیٰ آپ کے سوال کا جواب دیا جائے گا، اور اس سے معلوم ہوگا کہ آپ کے گاؤں میں امام شافعی، امام احمد اور امام مالک رحمہم اللہ کے علاوہ حنفیہ کے نزدیک بھی نمازِ جمعہ جائز ہے، جس پر بعض اہلِ علم حضرات کے اعتراض، یا شبہ کرنے سے نمازِ جمعہ کے جائز ہونے پر کوئی فرق واقع نہیں ہوتا، اور آپ اپنے یہاں بلا کھٹک نمازِ جمعہ کو قائم وجاری رکھ سکتے ہیں۔

(فصل نمبر 1)

یومِ جمعہ کی فضیلت واہمیت

جمعہ کے دن کے تفصیلی فضائل تو ہم نے اپنی مفصَّل ومدلَّل کتاب ''جمعہ مبارکہ کے فضائل واحکام'' میں ذکر کردیے ہیں، تفصیل وتحقیق کے متلاشی ومتمنی حضرات وافراد اس کی طرف رجوع کرسکتے ہیں، یہاں نہایت اختصار کے ساتھ جمعہ کے دن کی کچھ فضیلت واہمیت کا ذکر کیا جاتا ہے۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰی ذِكْرِ اللّٰهِ وَذَرُوا الْبَیْعَ. ذٰلِكُمْ خَیْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (سورة الجمعة، رقم الآية ۹)

ترجمہ: اے ایمان والو! جب نداء (یعنی اذان) دی جائے نماز کے لئے یومِ جمعہ کو، تو سعی کرو تم اللہ کے ذکر کی طرف، اور چھوڑ دو تم بیع کو، یہ بہتر ہے تمہارے لئے، اگر تم جانتے ہو (سورہ جمعہ)

مذکورہ آیت میں جمعہ کے دن، اور جمعہ کی نماز کا خاص اہمیت کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے، اور جس سورت میں یہ آیت مذکور ہے، اس سورت کا نام بھی جمعہ کے نام پر ''سورہ جمعہ'' ہے، جس سے جمعہ کی نماز کے ساتھ ساتھ جمعہ کے دن کی بھی فضیلت واہمیت ظاہر ہوتی ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

أَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ، قَالَ: خَیْرُ یَوْمٍ طَلَعَتْ عَلَیْهِ الشَّمْسُ یَوْمُ الْجُمُعَةِ فِیْهِ خُلِقَ آدَمُ وَفِیْهِ اُدْخِلَ الْجَنَّةَ وَفِیْهِ اُخْرِجَ مِنْهَا

وَلَاتَقُوْمُ السَّاعَةُ اِلَّافِیْ یَوْمِ الْجُمُعَةِ (مسلم،رقم الحدیث ۸۵۴" ۱۸" کتاب الجمعة، باب فی فضل یوم الجمعة،سنن الترمذی، رقم الحدیث ۴۸۸؛ مسنداحمد، رقم الحدیث ۹۴۰۹؛ المعجم الاوسط للطبرانی، رقم الحدیث ۴۳۳۵؛ صحیح ابنِ خزیمة، رقم الحدیث ۱۷۲۹) [1]

ترجمہ: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جن دنوں میں سورج طلوع ہوتا ہے، ان میں سب سے بہتر دن جمعہ کا دن ہے، اسی دن (أبوالانسان) حضرت آدم علیہ السلام پیدا کئے گئے، اسی دن وہ جنت میں داخل ہوئے، اسی دن انہیں جنت سے نکالا گیا (اورزمین پر اتارا گیا) اوراسی جمعہ کے دن قیامت قائم ہوگی (مسلم)

اس سے معلوم ہوا کہ جمعہ کا دن ہفتہ کے تمام دنوں سے بہتر ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ أَنَّہُ قَالَ: مَا تَطْلُعُ الشَّمْسُ بِیَوْمٍ، وَلَا تَغْرُبُ، بِأَفْضَلَ -أَوْ أَعْظَمَ -مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَةِ، وَمَا مِنْ دَابَّةٍ إِلَّا تَفْزَعُ لِیَوْمِ الْجُمُعَةِ، إِلَّا ھٰذَانِ الثَّقَلَانِ مِنَ الْجِنِّ وَالْإِنْسِ (مسند احمد، رقم الحدیث ۹۸۹۶) [2]

ترجمہ: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نہیں طلوع ہوتا سورج، کسی دن اور نہ ہی غروب ہوتا، جو افضل، یا اعظم ہو، جمعہ کے دن کے مقابلہ میں، اور ہر جانور جمعہ کے دن سے گھبراتا ہے، سوائے ان دو "ثقلان" یعنی جنات اورانسانوں کے (مسند احمد)

حضرت اوس بن اوس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ: إِنَّ مِنْ أَفْضَلِ أَیَّامِکُمْ یَوْمَ

---

[1] قال شعیب الارنؤوط: حدیث صحیح، وھذا إسناد قوی (حاشیة مسند احمد)

[2] قال شعیب الارنؤوط: إسنادہ صحیح علی شرط مسلم (حاشیة مسند احمد)

الْجُمُعَةِ، فِيهِ خُلِقَ آدَمُ، وَفِيهِ قُبِضَ، وَفِيهِ النَّفْخَةُ، وَفِيهِ الصَّعْقَةُ، فَأَكْثِرُوا عَلَيَّ مِنَ الصَّلَاةِ فِيهِ، فَإِنَّ صَلَاتَكُمْ مَعْرُوضَةٌ عَلَيَّ قَالَ: قَالُوا: يَا رَسُولَ اللّٰهِ، وَكَيْفَ تُعْرَضُ صَلَاتُنَا عَلَيْكَ وَقَدْ أَرِمْتَ يَقُولُونَ :بَلِيتَ -؟ فَقَالَ: إِنَّ اللّٰهَ عَزَّ وَجَلَّ حَرَّمَ عَلَى الْأَرْضِ أَجْسَادَ الْأَنْبِيَاءِ (سنن ابی داؤد ،رقم الحديث ۱۰۴۷، كتاب الصلاة، ابواب الجمعة، باب فضل يوم الجمعة وليلة الجمعة،ابنِ ماجه، رقم الحديث ۱۰۸۵؛ مسند احمد، رقم الحديث ۱۶۱۶۲) [1]

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بے شک تمہارے سب دنوں میں جمعہ کا دن افضل ہے، اسی دن حضرت آدم کو پیدا کیا گیا، اوراسی دن اِن کی روح قبض کی گئی، اوراسی دن صور پھونکا جائے گا، اوراسی دن قیامت قائم ہوگی، پس تم اس دن کثرت سے مجھ پردرود پڑھا کرو، اس لئے کہ تمہارادرود مجھ پر پیش کیا جاتا ہے، حضرت اوس کہتے ہیں کہ لوگوں نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! ہمارادرود آپ پر کس طرح پیش کیا جائے گا، جبکہ آپ کا جسم مبارک (وصال کے بعد) بوسیدہ ہو چکا ہوگا؟ لوگوں کا مطلب یہ تھا کہ آپ مٹی ہو چکے ہوں گے، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بے شک اللہ عزوجل نے زمین پر نبیوں کے جسموں کوحرام کردیا ہے (ابوداؤد)

حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

فَقَالَ: إِنَّ أَعْظَمَ أَيَّامِ الدُّنْيَا يَوْمُ الْجُمُعَةِ فِيهِ خُلِقَ آدَمُ وَفِيهِ تَقُومُ

---

[1] قال شعيب الارنؤوط:

صحيح لغيره، وهذا إسناد رجاله ثقات(حاشية سنن ابی داؤد)

وقال ايضاً:

إسناده صحيح، رجاله رجال الصحيح، غير صحابيه فمن رجال أصحاب السنن(حاشية مسند احمد)

السَّاعَةُ (مستدرک حاکم، رقم الحدیث ۸۶۹۸، کتاب الاھوال) [1]

ترجمہ: انہوں نے فرمایا کہ دنیا کے تمام دنوں میں عظیم ترین دن جمعہ کا دن ہے، جس میں حضرت آدم کو پیدا کیا گیا، اوراسی دن قیامت قائم ہوگی (حاکم)

مذکورہ احادیث وروایات سے معلوم ہوا کہ جمعہ کا دن، ہفتہ کے دوسرے تمام دنوں سے زیادہ فضیلت وعظمت والا دن ہے، لہٰذا اس دن کی تمام مسلمانوں کو قدر کرنی چاہیے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: سَيِّدُ الْأَيَّامِ يَوْمُ الْجُمُعَةِ، فِيْهِ خُلِقَ آدَمُ، وَفِيْهِ أُدْخِلَ الْجَنَّةَ، وَفِيْهِ أُخْرِجَ مِنْهَا، وَلَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ إِلَّا يَوْمَ الْجُمُعَةِ (مستدرک حاکم، رقم الحدیث ۱۰۲۶، کتاب الجمعة) [2]

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمام دنوں کا سردار جمعہ کا دن ہے، اس دن آدم علیہ السلام کو پیدا کیا گیا، اوراسی دن ان کو جنت میں داخل کیا گیا، اور اسی دن ان کو جنت سے نکالا گیا، اور قیامت بھی جمعہ کے دن ہی قائم ہوگی (حاکم)

حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، قَالَ: سَيِّدُ الْأَيَّامِ يَوْمُ الْجُمُعَةِ فِيْهِ خَمْسُ خِلَالٍ: فِيْهِ خُلِقَ آدَمُ، وَفِيْهِ أُهْبِطَ، وَفِيْهِ تَوَفَّى اللّٰهُ آدَمَ، وَفِيْهِ سَاعَةٌ لَا يَسْأَلُ الْعَبْدُ رَبَّهُ شَيْئًا فِيْهَا إِلَّا آتَاهُ مَا لَمْ يَسْأَلْ مَأْثَمًا أَوْ قَطِيْعَةَ رَحِمٍ، وَفِيْهِ تَقُوْمُ السَّاعَةُ، وَمَا مِنْ مَلَكٍ مُقَرَّبٍ وَلَا سَمَاءٍ،

---

[1] قال الحاكم: هذا حديث صحيح الإسناد ولم يخرجاه وليس بموقوف فإن عبد الله بن سلام على تقدمه في معرفة قديمة من جملة الصحابة، وقد أسنده بذكر رسول الله صلى الله عليه وسلم في غير موضع. والله أعلم.

وقال الذهبي في التلخيص: صحيح.

[2] قال الحاكم: هذا حديث صحيح على شرط مسلم، فقد استشهد بعبد الرحمن بن أبي الزناد، ولم يخرجا سيد الأيام.

وقال الذهبي في التلخيص: واستشهد مسلم بابن أبي الزناد.

وَلَا أَرْضٍ، وَلَا جِبَالٍ، وَلَا رِيَاحٍ، وَلَا بَحْرٍ إِلَّا وَهُوَ يُشْفِقُ مِنْ يَوْمِ الْجُمُعَةِ أَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ السَّاعَةُ (مسند البزار ،رقم الحديث ۳۷۳۸، ؛ المعجم الكبير للطبراني، رقم الحديث ۵۳۷۶،مسند احمد، رقم الحديث ۲۲۴۵۷) [1]

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمام دنوں کا سردار جمعہ کا دن ہے، اس دن میں پانچ خصلتیں ہیں، ایک تو اس دن میں آدم علیہ السلام کو پیدا کیا گیا، دوسرے اسی دن ان کو جنت سے اتارا گیا، تیسرے اسی دن اللہ نے آدم علیہ السلام کو وفات دی، چوتھے اس دن میں ایک وقت ایسا ہوتا ہے کہ بندہ اپنے رب سے جس چیز کا بھی اس وقت میں سوال کرتا ہے، تو اس کا رب اسے عطا فرماتا ہے، جب تک گناہ کا، یا قطع رحمی کا سوال نہ کرے، پانچویں اس دن میں ہی قیامت قائم ہوگی، اور کوئی بھی مقرب فرشتہ اور آسمان اور زمین اور پہاڑ اور ہوا اور سمندر ایسا نہیں، جو جمعہ کے دن سے اس وجہ سے نہ ڈرتا ہو (یعنی ہر مقرب فرشتہ، آسمان و زمین وغیرہ اس وجہ سے ڈرتے ہیں) کہ اس دن میں قیامت قائم ہوگی (بزار، طبرانی)

اس طرح کی حدیث حضرت ابنِ عمر رضی اللہ عنہ کی سند سے بھی مروی ہے۔ [2]

حضرت سعید بن مسیّب رحمہ اللہ سے مرسلاً روایت ہے کہ:

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: سَيِّدُ الْأَيَّامِ يَوْمُ

---

[1] قال البزار: وهذا الكلام لانعلمه يروى ، عن النبى صلى الله عليه وسلم الا من هذا الوجه بهذا الاسناد، واسناده صالح.

وقال الهيثمى: رواه أحمد والبزار إلا أنه قال فيه " :سيد الأيام يوم الجمعة "والطبرانى فى الكبير وفيه عبد الله بن محمد بن عقيل وفيه كلام وقد وثق، وبقية رجاله ثقات (مجمع الزوائد، تحت رقم الحديث ۲۹۹۵، باب فى الجمعة وفضلها)

وقال شعيب الارنؤوط:صحيح لغيره(حاشية مسند احمد)

[2] عن عمرو بن دينار، قال :سمعت ابن عمر يقول :قال رسول الله صلى الله عليه وسلم :سيد الأيام عند الله يوم الجمعة؛ فيه خلق آدم أبوكم، وفيه دخل الجنة، وفيه خرج، وفيه تقوم الساعة (المعجم الكبير للطبرانى، رقم الحديث ۱۳۶۵۶)

الْجُمُعَةِ (مصنف ابنِ ابی شیبة،رقم الحدیث ۵۵۵۱،کتاب الصلاة، باب فی فضل الجمعة ویومها،مسند الشافعی، ج ۱، ص ۷۲، ومن کتاب إیجاب الجمعة؛ معرفة السنن والآثار للبیهقی، رقم الحدیث ۲۶۹۲) [1]

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جمعہ (ہفتہ بھر کے) تمام دِنوں کا سردار ہے (ابنِ ابی شیبہ)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے موقوفاً روایت ہے کہ:

إِنَّ سَيِّدَ الْأَيَّامِ يَوْمُ الْجُمُعَةِ ، وَسَيِّدَ الشُّهُوْرِ رَمَضَانُ (مصنف ابنِ ابی شیبة،رقم الحدیث ۵۵۵۲،کتاب الصلاة؛باب فی فضل الجمعة ویومها،المعجم الکبیر للطبرانی، رقم الحدیث ۹۰۰۰، شعب الایمان، رقم الحدیث ۳۳۶۵، فضائل شهر رمضان؛ کتاب الفوائد للغیلانیات، رقم الحدیث ۱۸۴) [2]

ترجمہ: تمام دنوں کا سردار، جمعہ کا دن ہے، اور تمام مہینوں کا سردار، رمضان کا مہینہ ہے (ابنِ ابی شیبہ)

مذکورہ احادیث وروایات سے معلوم ہوا کہ جمعہ کا دن ہفتہ بھر کے تمام دنوں کا سردار ہے، جس

---

[1] وفیه ایضاً: عن الحاکم فی "علوم الحدیث"قال: واصحها۔ قال ابن معین: مراسیل ابن المسیب ،لانه من اولاد الصحابة ،وادرک العشرة ،وفقیه اهل الحجاز ومفتیهم، واول الفقهاء السبعة الذین یعتد مالک باجماعهم کاجماع کافة الناس (مقدمة اعلاء السنن، ج۱۸ ص۸۹۳۸،فوائد فی علوم الحدیث ، الفصل الخامس فی احکام المرسل من الاحادیث والاخبار والمدلس منها، والمعلق والمنقطع والمعضل، الناشر: دارالفکر، بیروت، لبنان، الطبعة الاولٰی ۱۴۲۱ھ ۔ ۲۰۰۱م)

وأصحها کما قال ابن معین، مراسیل ابن المسیب ;لأنه من أولاد الصحابة وأدرک العشرة، وفقیه أهل الحجاز، ومفتیهم، وأول الفقهاء السبعة الذین یعتد مالک بإجماعهم، کإجماع کافة الناس،وقد تأمل الأئمة المتقدمون مراسیله فوجدوها بأسانید صحیحة، وهذه الشرائط لم توجد فی مراسیل غیره(تدریب الراوی فی شرح تقریب النواوی للسیوطی، ج ۱ ص ۲۲۹، انواع الحدیث، النوع التاسع المرسل، حکم المرسل)

[2] قال الهیثمی:رواه الطبرانی فی الکبیر، وابوعبیدة لم یسمع من ابیه (مجمع الزوائد، تحت رقم الحدیث ۴۷۷۷، ج۳ص ۱۴۰، باب فی شهور البرکة وفضل شهر رمضان)

سے جمعہ کے دن کی فضیلت واہمیت ظاہر ہوتی ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: نَحْنُ الْآخِرُوْنَ السَّابِقُوْنَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ، بَيْدَ أَنَّهُمْ أُوتُوْا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِنَا، وَأُوتِيْنَاهُ مِنْ بَعْدِهِمْ، وَهُوَ الْيَوْمُ الَّذِىْ أُمِرُوْا بِهٖ، فَاخْتَلَفُوْا فِيْهِ، فَجَعَلَهُ اللّٰهُ لَنَا عِيْدًا، فَالْيَوْمَ لَنَا، وَغَدًا لِلْيَهُوْدِ، وَبَعْدَ غَدٍ لِلنَّصَارٰى (مسند احمد، رقم الحديث ۷۴۰۱)[1]

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہم لوگ (دنیا میں آنے والوں میں) آخر ہیں (لیکن) قیامت کے دن ہم ہی سابقین ہوں گے، باوجودیکہ ان کو کتاب ہم سے پہلے دی گئی اور ہمیں ان کے بعد (تو اس کتاب کے پہلے دیئے جانے کی وجہ سے یہ نہیں ہوگا کہ وہ قیامت کے دن بھی ہم سے پہلے ہوں، قیامت میں سبقت حاصل کرنے والے ہم ہی ہوں گے) یہ وہ دن ہے، جس کو ان پر مقرر کیا گیا تھا (کہ اس کو خاص عظمت وعبادت کے لئے مخصوص کرلو) لیکن وہ اس بارے میں مختلف رہے (اور بھٹکتے رہے)

پس جمعہ کے دن کو اللہ نے ہمارے لیے عید بنا دیا ہے، پس آج جمعہ کا دن ہمارے لیے عید ہے، اور کل (یعنی ہفتہ کو) یہود کی عید ہے، اور کل کے بعد (یعنی اتوار کو) نصاریٰ کی عید ہے (مسند احمد)

یہود ونصاریٰ کے اختلاف کا مطلب یہ ہے کہ ہفتے کے سات دِنوں میں ایک دن خاص عبادت کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے علم میں رکھا تھا، جب اہلِ کتاب کو ہفتے میں ایک دن متعین کرنے کا حکم ہوا، تو یہود ونصاریٰ بھٹکتے ہی رہے، اور جمعہ کا مبارک دن طے نہ کرسکے، یہود نے ہفتہ اور نصاریٰ نے اتوار کا دن چُنا، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس امت کو یہ توفیق دی کہ

[1] قال شعيب الارنؤوط: إسناده صحيح على شرط الشيخين (حاشية مسند احمد)

انہوں نے جو دن مقرر کیا، وہ عظیمُ الشان دن اور اللہ تعالیٰ کی پسند کے مطابق تھا۔
اور بعض حضرات نے اختلاف کا یہ مطلب بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جمعہ کا بابرکت دن ہونا، اس امت سے پہلے لوگوں کو بھی بتلایا گیا تھا اور اس دن کے منتخب کرنے کی توفیق دی تھی، لیکن انہوں نے اختلاف کرتے ہوئے کسی نے ہفتے کا دن اور کسی نے اتوار کا دن متعین کیا، پھر اللہ تعالیٰ کی رحمت اس امت پر متوجہ ہوئی کہ اللہ تعالیٰ نے اس امت کو یہ بابرکت دن متعین کرنے کی توفیق بخشی (معارف القرآن ادریسی، جلد ۸ صفحہ ۱۱۳، ۱۱۴، بتغیر)

اس فصل کا خلاصہ

مذکورہ اور اس جیسی کئی احادیث وروایات سے جو بات معلوم ہوتی ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہفتہ بھر کے دنوں میں جمعہ کا دن، مسلمانوں کے لئے عظیم فضیلت وعبادت والا دن ہے، جو اس امت کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے خاص نعمت وتحفہ ہے، اور اسی وجہ سے اس دن میں ''نمازِ جمعہ'' کی شکل میں ایک مخصوص اور اہم عبادت تجویز کی گئی ہے، جس کا آگے ذکر آتا ہے۔
اس لئے مسلمانوں کو اس دن کی قدر کرنی چاہئے، اور اس کی عظمت وفضیلت کو سمجھ کر اس پر عمل کرنا چاہیے، اور اس دن کی بے قدری وناقدری کرنے سے اپنے آپ کو بچانا چاہیے۔
اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

(فصل نمبر 2)

نمازِ جمعہ کی فضیلت واہمیت

جمعہ کی نماز فرض ہے، اور اس کی تاکید واہمیت قرآن مجید کی آیت اور بے شمار احادیث اور اجماعِ امت سے ثابت ہے، اس لئے نمازِ جمعہ کے منکر کو فر قرار دیا گیا ہے۔ [1]

ذیل میں اس کی کچھ تفصیل ذکر کی جاتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا قرآن مجید میں ارشاد ہے کہ:

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰی ذِكْرِ اللّٰهِ وَذَرُوا الْبَیْعَ. ذٰلِكُمْ خَیْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (سورة الجمعة، رقم الآية ۹)

ترجمہ: اے ایمان والو! جب نداء (یعنی اذان) دی جائے نماز کے لئے یومِ جمعہ کو، تو سعی کرو تم اللہ کے ذکر کی طرف، اور چھوڑ دو تم بیع کو، یہ بہتر ہے تمہارے لئے، اگر تم جانتے ہو (سورہ جمعہ)

مذکورہ آیت میں جمعہ کی اذان ہونے پر ذکر، یعنی نمازِ جمعہ کی سعی کرنے کا حکم دیا گیا ہے، جس

---

[1] صلاة الجمعة من الفرائض المعلوم فرضيتها بالضرورة، وبدلالة الكتاب والسنة؛ فيكفر جاحدها (الموسوعة الفقهية الكويتية، ج۲۷، ص۱۹۳، مادة "صلاة الجمعة")

قال ابن الهمام: الجمعة فريضة محكمة بالكتاب والسنة والإجماع، وقد صرح أصحابنا بأنه فرض آكد من الظهر، وبإكفار جاحدها اهـ، وقال في كتاب الرحمة في اختلاف الأمة: اتفق العلماء على أن الجمعة فرض على الأعيان، وغلطوا من قال: هي فرض كفاية (مرقاة المفاتيح، ج۳ص۱۰۲۳، كتاب الصلاة، باب الجمعة)

فالجمعة فرض لا يسع تركها ويكفر جاحدها والدليل على فرضية الجمعة الكتاب والسنة وإجماع الأمة (بدائع الصنائع، ج ۱ ص ۲۵۶، فصل كيفية فرضية صلاة الجمعة، فصل صلاة الجمعة)

سے نمازِ جمعہ کا فرض ہونا معلوم ہوا۔ [1]

اور جمعہ کی فرضیت قرآن مجید کے علاوہ سنت اور اجماعِ امت سے بھی ثابت ہے۔ [2]

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: اَلْجُمُعَةُ عَلٰى مَنْ سَمِعَ النِّدَاءَ (سنن ابی داؤد، رقم الحديث ١٠٥٦، كتاب الصلاة، ابواب الجمعة)

---

[1] صلاة الجمعة من الفرائض المعلوم فرضيتها بالضرورة، وبدلالة الكتاب والسنة؛ فيكفر جاحدها .قال الكاساني:

الجمعة فرض لا يسع تركها، ويكفر جاحدها والدليل على فرضيتها :الكتاب والسنة وإجماع الأمة.

أما الكتاب فقوله تعالى :(يا أيها الذين آمنوا إذا نودى للصلاة من يوم الجمعة فاسعوا إلى ذكر الله قيل " :ذكر الله "هو صلاة الجمعة، وقيل :هو الخطبة، وكل ذلك حجة؛ لأن السعي إلى الخطبة إنما يجب لأجل الصلاة، بدليل أن من سقطت عنه الصلاة لا يجب عليه السعي إلى الخطبة، فكان فرض السعي إلى الخطبة فرضا للصلاة؛ ولأن ذكر الله يتناول الصلاة ويتناول الخطبة من حيث إن كل واحد منهما ذكر الله تعالى.

وقد استدل الإمام السرخسي -أيضا -بالآية المذكورة من وجهين:

الوجه السابق، ووجه آخر حيث قال : اعلم أن الجمعة فريضة بالكتاب والسنة، أما الكتاب فقوله تعالى :(فاسعوا إلى ذكر الله وذروا البيع) والأمر بالسعي إلى الشيء لا يكون إلا لوجوبه، والأمر بترك البيع المباح لأجله دليل على وجوبه أيضا (الموسوعة الفقهية الكويتية، ج٢٧، ص١٩٣، مادة "صلاة الجمعة")

[2] ثم فرضية الجمعة :بالكتاب والسنة والإجماع ونوع من المعنى :أما الكتاب :فالآية المذكورة، والمراد من الذكر فيها الخطبة باتفاق المفسرين، والأمر للوجوب، فإذا فرض السعي إلى الخطبة التي هي شرط جواز الصلاة فإلى أصل الصلاة كان أوجب، ثم أكد الوجوب بقوله: (وذروا البيع) فحرم البيع بعد النداء ، وتحريم المباح لا يكون إلا من أجل واجب . .وأما السنة: فحديث جابر وأبي سعيد قالا :(خطبنا رسول الله صلى الله عليه وسلم . .) . الحديث، وفيه: (واعلموا أن الله فرض عليكم صلاة الجمعة. .) الحديث .رواه البيهقي .وروى أبو داود من حديث عبد الله بن عمرو بن العاص عن النبي صلى الله عليه وسلم أنه قال :(الجمعة على من سمع النداء) ، وعن حفصة، رضي الله تعالى عنها، أنه صلى الله عليه وسلم قال :(رواح الجمعة واجب على كل محتلم) ، رواه النسائي بإسناد صحيح على شرط مسلم، قاله النووي .وأما الإجماع :فإن الأمة قد أجمعت من لدن رسول الله صلى الله عليه وسلم :إلى يومنا هذا على فرضيتها من غير إنكار(عمدة القاري للعيني، ج٦ص١٦٢، كتاب الجمعة)

باب من تجب عليه الجمعة) ل

ترجمہ: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جمعہ کی نماز اس شخص پر واجب ہے، جو نداء (یعنی اذان) سنے (ابوداؤد)

اس سے معلوم ہوا کہ اذان سننے والے پر جمعہ کی نماز واجب ہے۔

اذان سننے والے کو نمازِ جمعہ چھوڑنے پر اور بھی کئی احادیث میں وعیدیں آئی ہیں، جن کا ذکر آگے آتا ہے، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ جب کوئی جمعہ کی اذان کی آواز سنے، اور اسے جمعہ کی نماز سے کوئی عذر نہ ہو، تو وہ نمازِ جمعہ چھوڑنے کی وجہ سے گناہ گار ہوتا ہے۔ ۲

ل قال شعيب الارنؤوط:حسن لغيره(حاشية ابى داوٗد)

۲ اور اس طرح کی احادیث کے پیشِ نظر بہت سے فقہائے کرام، شہر سے متصل جمعہ کی آواز سننے والے لوگوں پر بھی جمعہ کی فرضیت کے قائل ہیں، جبکہ شہر کے لوگوں پر اذانِ جمعہ سنے بغیر بھی وجوبِ جمعہ کے قائل ہیں۔ محمد رضوان۔

ذهب المالكية والشافعية والحنابلة إلى أنه تجب الجمعة على من كان خارج المصر .

قال ابن قدامة :فأما غير أهل المصر ممن كان بينه وبين الجامع فرسخ فما دون فعليه الجمعة، وإن كان أبعد فلا جمعة عليه، روى هذا عن سعيد بن المسيب والليث وإسحاق ، لما روى عن عبد الله بن عمرو رضى الله عنهما أن النبى صلى الله عليه وسلم قال :الجمعة على من سمع النداء ، ولأن النبى صلى الله عليه وسلم قال للأعمى الذى قال :ليس لى قائد يقودنى :أتسمع النداء ؟

قال :نعم !قال :فأجب، ولأن من سمع النداء داخل فى عموم قول الله تعالى :(يا أيها الذين آمنوا إذا نودى للصلاة من يوم الجمعة فاسعوا إلى ذكر الله)

وهذا يتناول غير أهل المصر إذا سمعوا النداء ، ولأن غير أهل المصر يسمعون النداء وهم من أهل الجمعة، فلزمهم السعى إليها كأهل المصر .

وروى عن ابن عمر وأبى هريرة وأنس رضى الله عنهم ونافع وعكرمة والحكم وعطاء والأوزاعى أنهم قالوا :الجمعة على من آواه الليل إلى أهله، وهو من حديث أبى هريرة عن النبى صلى الله عليه وسلم .

وذهب أبو حنيفة وأبو يوسف إلى أنه لا جمعة على من كان خارج المصر، لأن عثمان رضى الله عنه صلى العيد فى يوم جمعة ثم قال لأهل العوالى :من أراد منكم أن ينصرف فلينصرف، ومن أراد أن يقيم حتى يصلى الجمعة فليقم، ولأنه خارج المصر فأشبه الحل(الموسوعة الفقهية الكويتية، ج۳۸،ص۲۷، ۲۸ ،مادة "مصر")

(مسئله) من كان مقيما فى قرية لا يقام فيها الجمعة او فى برية هل يجب عليهم حضور الجمعة بالمصر قال ابو حنيفة رح ومحمد رح لا يجب عليه الجمعة مطلقا وقال ابو يوسف رح والشافعى

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

حضرت ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، قَالَ لِقَوْمٍ يَتَخَلَّفُوْنَ عَنِ الْجُمُعَةِ لَقَدْ هَمَمْتُ اَنْ آمُرَرَجُلًا يُصَلِّيْ بِالنَّاسِ ثُمَّ اُحَرِّقَ عَلٰى رِجَالٍ يَتَخَلَّفُوْنَ عَنِ الْجُمُعَةِ بُيُوْتَهُم (صحيح مسلم،رقم الحديث ۶۵۲ ”۲۵۴“کتاب المساجد ومواضع الصلاة؛ باب الذين يتخلفون عن صلاة الجماعة والجمعة، مستدرک حاکم، رقم الحديث ۱۰۸۰) [1]

ترجمہ: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں کے بارے میں جو جمعہ کی نماز سے پیچھے رہ جاتے ہیں، فرمایا کہ میرے دل میں آتا ہے کہ میں کسی شخص کو کہہ جاؤں کہ وہ (جمعہ کی نماز میں حاضر شدہ) لوگوں کو نماز پڑھائے اور میں ان لوگوں کو جو جمعہ کی نماز میں نہیں آتے، ان کے گھروں سمیت آگ لگا دوں (مسلم)

﴿ گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ ﴾

رح واحمد رح واسحق رح ان كان يبلغهم نداء مؤذن جهورى الصوت يوذن فى وقت تكون الأصوات هادنة والرياح يجب عليهم حضور الجمعة كذا قال مالك رح لكن حده بفرسخ وربيعة باربعة أميال وقال ابن همام قال بعض العلماء قدر ميل وقيل قدر ميلين ولم يجده الشافعى رح وعن احمد فى التحديد نحو قولهما والحجة بهذا القول عموم قوله تعالى إذا نودى للصلوة من يوم الجمعة فاسعوا وقوله عليه السلام انما الجمعة على من سمع النداء رواه ابو داود وغيره من عبد الله بن عمرو فى رواية بلفظ الجمعة على من سمع النداء (التفسير المظهرى، ج۹،ص ۲۹۰، ۲۹۱، سورة الجمعة)

ثم فى ظاهر الرواية لا تجب الجمعة إلا على من سكن المصر والأرياف المتصلة بالمصر .وعن أبى يوسف -رحمه الله تعالى -أن كل من سمع النداء من أهل القرى القريبة من المصر فعليه أن يشهدها وهو قول الشافعى -رضى الله تعالى عنه -لظاهر قوله تعالى ’’إذا نودى للصلاة من يوم الجمعة‘‘(المبسوط،للسرخسى،ج۲ص ۲۳، كتاب الصلاة، باب صلاة الجمعة)

ومن هو فى أطراف المصر ليس بينه وبين المصر فرجة بل الأبنية متصلة فعليه الجمعة وإن كان بينه وبين المصر فرجة من المزارع والمراعى فلا جمعة عليه وإن كان يسمع النداء وعند محمد رحمه الله إن سمع النداء فعليه الجمعة(منية المصلى،ص ۲۹۹، كتاب الصلاة ، فصل فى صلاة الجمعة)

[1] قال الحاكم:وهو صحيح على شرط الشيخين، ولم يخرجاه هكذا إنما خرجا بذكر العتمة، وسائر الصلوات .

وقال الذهبى فى التلخيص: على شرطهما.

رسولُ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم امت کے لئے بہت ہی شفیق اور مہربان تھے، لیکن اس کے باوجود آپ نے جمعہ کی نماز سے پیچھے رہ جانے والوں کے بارے میں اتنے غم وغصہ کا اظہار فرمایا، اس کی وجہ سوائے اس کے اور کیا ہوسکتی ہے کہ جمعہ کی نماز سے پیچھے رہ جانے والوں کو آخرت کے سخت عذاب سے ڈرانے اور بچانے کے پیشِ نظر ایسا فرمایا۔ [1]

حضرت ابنِ عمر اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ:

أَنَّهُمَا سَمِعَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ: عَلٰى اَعْوَادِ مِنْبَرِهٖ لَيَنْتَهِيَنَّ اَقْوَامٌ عَنْ وَدْعِهِمِ الْجُمُعَاتِ اَوْلَيَخْتِمَنَّ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ ثُمَّ لَيَكُوْنَنَّ مِنَ الْغَافِلِيْنَ (صحيح مسلم، رقم الحديث ۸۶۵ "۴۰" كتاب الجمعة، باب التغليظ فى ترك الجمعة)

ترجمہ: اُنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے برسرِ منبر یہ فرماتے ہوئے سنا کہ یا تو لوگوں کو چاہئے کہ وہ جمعہ کی نمازیں چھوڑنے سے باز آ جائیں، ورنہ اللہ (جمعہ چھوڑنے کے وبال کی وجہ سے) ان کے دلوں پر مہر لگا دے گا، پھر وہ غافل

---

[1] (عن ابن مسعود، أن النبى صلى الله عليه وسلم قال :لقوم) ، أى :فى شأنهم، قال ابن حجر :أو عنهم، وهو غير صحيح كما لا يخفى .(يتخلفون عن الجمعة) : قال الطيبى :سبق معنى الحديث فى باب الجماعات .("لقد هممت أن آمر رجلا يصلى بالناس، ثم أحرق ") : بالنصب، وفى نسخة بالتشديد ("على رجال يتخلفون ") ، أى: بغير عذر ("عن الجمعة ") ، أى :عن إتيانها ("بيوتهم ") : بضم الباء وكسرها مفعول لأحرق، والمعنى لقد أردت أن أجعل خليفتى فى الإمامة، ثم أتوجه بخدمتى نحو المتخلفين فأحرق بيوتهم، أى :ما فى بيوتهم من أنفسهم ومتاعهم عليهم، وفى هذا من الوعيد ما لا يوصف.

قال السيد بادشاه رحمه الله :فإن قلت :كيف يترك الفرض ويشتغل بهم؟ قلت : المقصود التغليظ والمبالغة دون الحقيقة، على أنه يجوز تركه إلى بدل لمصلحة ضرورة إذا أدى إليه الاجتهاد، ولكن الإحراق إنما يتصور إذا كان تخلفهم جحودا، ولعله وقع قبل نسخ الهم بالتحريق .قلت :لا يلزم من جعل الخليفة ترك فرض الجمعة مطلقا، فإنه يتصور تكرارها، كما هو الآن من المسائل الاجتهادية الخلافية(مرقاة المفاتيح، ج٣ص ١٠٢٦، كتاب الصلاة، باب وجوبها)

لوگوں ہی میں سے ہو جائیں گے (مسلم)

حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، قَالَ: لَيَنْتَهِيَنَّ أَقْوَامٌ يَسْمَعُوْنَ النِّدَاءَ يَوْمَ الْجُمُعَةِ ثُمَّ لَا يَأْتُوْنَهَا أَوْ لَيَطْبَعَنَّ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ ثُمَّ لَيَكُوْنُنَّ مِنَ الْغَافِلِيْنَ (المعجم الكبير للطبراني، رقم الحديث ۱۹۷، ج۱۹ ص۹۹) [1]

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو لوگ جمعہ کے دن، جمعہ کی اذان کو سنتے ہیں، پھر وہ جمعہ کی نماز کے لیے نہیں آتے، تو وہ باز آجائیں، ورنہ اللہ ان کے دلوں پر مہر لگا دے گا، پھر وہ غافلین میں سے ہو کر رہ جائیں گے (طبرانی)

دلوں پر مہر لگانے سے مراد یہ ہے کہ دلوں پر پردہ پڑ جاتا ہے، اور وہ شخص اللہ تعالیٰ کی الطاف وعنایات سے محروم ہو جاتا ہے، اور جہل اور سختی وغیرہ پیدا ہو جاتی ہے، جو اصلاح وہدایت کے لئے رکاوٹ کا سبب بن جاتی ہے، اور بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ نمازِ جمعہ چھوڑنے والے کے دل میں نفاق پیدا ہو جاتا ہے، جیسا کہ آگے آتا ہے۔ [2]

اس حدیث کی تشریح میں بعض محدثین نے فرمایا کہ بلا شرعی عذر کے جمعہ کی نماز چھوڑتے رہنے والے لوگوں کے دلوں پر مہر اس لئے لگائی جاتی ہے کہ جمعہ کی نماز چھوڑتے رہنے کی عادت سے دلوں پر زنگ کا غلبہ ہو جاتا ہے، اور نیک اعمال، یا ان کی برکات سے محرومی مقدر بن جاتی ہے، اور پھر اس کے نتیجہ میں دل کی غفلت بڑھتی رہتی ہے، جو انسان کے لئے

---

[1] قال المنذری:

رواه الطبرانی فی الكبير بإسناد حسن (الترغيب و الترهيب للمنذری، تحت رقم الحديث ۱۰۹۰)

و قال الهيثمی:

رواه الطبرانی فی الكبير وإسناده حسن (مجمع الزوائد، تحت رقم الحديث ۳۱۸۱)

[2] (طبع الله على قلبه) أی ختم عليه وغشاه ومنعه ألطافه وجعل فيه الجهل والجفاء والقسوة أو صير قلبه قلب منافق (فيض القدير للمناوی، تحت رقم الحديث ۸۵۸۹)

بڑی ہلاکت کا سبب بنتی ہے۔ [1]

حضرت ابو جعد ضمری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: مَنْ تَرَكَ ثَلَاثَ جُمَعٍ تَهَاوُنًا بِهَا طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قَلْبِهٖ (سنن ابی داؤد، رقم الحديث ۱۰۵۲، کتاب الصلاة، ابواب الجمعة، باب التشديد فی ترک الجمعة؛ مسند احمد، رقم الحديث ۱۵۴۹۸؛ مستدرک حاکم، رقم الحديث ۱۰۳۴) [2]

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص نے تین جمعوں (کی نمازوں) کو سُستی کی وجہ سے چھوڑ دیا، تو اللہ اس کے دل پر مہر لگا دیتا ہے (ابوداؤد، مسند احمد، حاکم)

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ تَرَكَ الْجُمُعَةَ ثَلَاثًا

---

[1] ("أو ليختمن الله على قلوبهم ") ، أي :ليمنعنهم لطفه وفضله، والختم الطبع ' ومثله الرين............ ("ثم ليكونن من الغافلين ") ، أي :معدودين من جملتهم، قال الطيبي :(ثم) لتراخي الرتبة فإن كونهم من جملة الغافلين المشهود عليهم بالغفلة أدعى لشقائهم، وأنطق لخسرانهم من مطلق كونهم مختوما عليهم، قال القاضي :والمعنى أن أحد الأمرين كائن لا محالة، إما الانتهاء عن ترك الجمعات، وإما ختم الله على قلوبهم، فإن اعتياد ترک الجمعة يغلب الرين على القلب، ويزهد النفوس فی الطاعة، وذلک يؤدی بهم إلی أن يكونوا من الغافلين(مرقاة المفاتيح ، ج۳ص۱۰۲۳ كتاب الصلاة،باب وجوب الجمعة)

[2] قال شعيب الارنؤوط:

صحيح لغيره، وهذا إسناد حسن من أجل محمد بن عمرو -وهو ابن علقمة ابن وقاص الليثي -فهو صدوق حسن الحديث(حاشية ابی داؤد)

وقال ايضاً:

اسنادهٔ حسن(حاشية مسند احمد)

وقال الحاكم:

هذا حديث صحيح على شرط مسلم، ولم يخرجاه.

وقال الذهبي: على شرط مسلم.

مِنْ غَيْرِ ضَرُوْرَةٍ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قَلْبِهٖ (سنن ابنِ ماجه، رقم الحديث ١١٢٦، كتاب اقامه الصلاة والسنة فيها، باب فيمن ترك الجمعة من غير عذر؛ صحيح ابنِ خزيمة، رقم الحديث ١٨٥٦) [1]

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے بغیر ضرورت کے (یعنی شرعی عذر کے بغیر) تین جمعوں (کی نمازوں) کو چھوڑ دیا، اللہ اس کے دل پر مہر لگادے گا (ابنِ ماجہ، ابنِ خزیمہ)

حضرت ابوقتادہ انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: مَنْ تَرَكَ الْجُمُعَةَ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ مِنْ غَيْرِ ضَرُوْرَةٍ طُبِعَ عَلٰى قَلْبِهٖ (مسند احمد، رقم الحديث ٢٢٥٥٨) [2]

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے بغیر ضرورت کے تین مرتبہ جمعہ چھوڑ دیا، تو اس کے دل پر مہر لگادی جاتی ہے (مسند احمد)

ملحوظ رہے کہ کسی حدیث میں بغیر ضرورت کے اور کسی حدیث میں سُستی کی وجہ سے تین جمعے چھوڑنے پر دل پر مہر لگانے کی وعید کا ذکر آیا ہے، مطلب دونوں کا قریب قریب ہے، کیونکہ سُستی میں بھی کوئی ضرورت اور مجبوری نہیں ہوتی، سوائے نفس وشیطان کی شرارت کے۔

اور جو شخص معذور ہو، یعنی اُسے ایسا عذر ہو کہ شریعت نے اس پر اس عذر کی وجہ سے نمازِ جمعہ کو لازم قرار نہ دیا ہو، وہ اس وعید میں داخل نہیں۔

---

[1] قال الدكتور مصطفىٰ الاعظمى: اسنادهٗ صحيح (حاشية ابنِ خزيمة)
وقال المنذرى: وروى ابن ماجه عنه بإسناد جيد مرفوعا (الترغيب والترهيب، تحت رقم الحديث ١٠٩٢، كتاب الجمعة الترغيب فى صلاة الجمعة)
قال شعيب الارنؤوط: صحيح لغيره، وهذا إسناد حسن من أجل أسيد :وهو ابن أبى أسيد البراد (حاشية سنن ابن ماجه)

[2] قال شعيب الارنؤوط: صحيح لغيره (حاشية مسند احمد)

اس طرح کی احادیث کی کثرت کے پیشِ نظر بعض حضرات نے تین جمعہ چھوڑنے پر دل پر مہر لگانے کی حدیث کو متواتر قرار دیا ہے۔ [1]

حضرت ابو جعد ضمری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: مَنْ تَرَكَ الْجُمُعَةَ ثَلَاثًا مِنْ غَيْرِ عُذْرٍ فَهُوَ مُنَافِقٌ (صحیح ابنِ حبان، رقم الحدیث ۲۵۸، کتاب الایمان، باب ماجاء فی الشرک والنفاق، صحیح ابنِ خزیمۃ، رقم الحدیث ۱۸۵۷) [2]

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص تین جمعے (کی نمازیں) بغیر کسی (شرعی) عذر کے چھوڑ دے، تو وہ منافق ہے (ابنِ حبان، ابنِ خزیمہ)

حضرت یحییٰ بن اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: مَنْ سَمِعَ النِّدَاءَ يَوْمَ الْجُمُعَةِ فَلَمْ يَأْتِ، أَوْ لَمْ يُجِبْ، ثُمَّ سَمِعَ النِّدَاءَ فَلَمْ يَأْتِ، أَوْ فَلَمْ يُجِبْ، ثُمَّ سَمِعَ النِّدَاءَ فَلَمْ يَأْتِ، أَوْ لَمْ يُجِبْ، طَبَعَ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ عَلٰى قَلْبِهٖ، فَجُعِلَ قَلْبَ مُنَافِقٍ (مسند ابی یعلٰی، رقم الحدیث ۷۱۶۷، ج۱۳ ص۱۰۸) [3]

ترجمہ: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے جمعہ کی اذان کو سنا، پھر جمعہ کی نماز کے لیے نہیں آیا، یا (یہ فرمایا کہ) اس کا (عمل سے) جواب نہیں دیا، پھر

---

[1] (من ترک الجمعة ثلاثاً من غير عذر طبع الله على قلبه) - من ترک الجمعة ثلاثاً من غير عذر طبع الله على قلبه أورده فى الأزهار من حديث أبى الجعد الضمرى وجابر وأبى قتادة وأسامة وحارثة بن النعمان وابن عمر وأبى هريرة وابن أبى أوفى وأبى عبس بن جبر وابن عباس وابن أسعد بن زرارة وصفوان ابن سليم مرسلاً اثنى عشر نفساً.

(قلت) فى الباب أيضاً عن عائشة وكعب بن مالک ومحمد ابن عباد بن جعفر مرسلاً (نظم المتناثر من الحديث المتواتر للكتانى، تحت رقم الحديث ۹۲، كتاب الجمعة والعيد)

[2] قال شعيب الارنؤوط: اسنادهٗ حسن (حاشية ابن حبان)

قال الدكتور محمد مصطفىٰ الاعظمى: اسناده حسن صحيح (حاشية ابن خزيمة)

[3] قال حسين سليم أسد الدارانى: إسناده حسن (حاشية مسند ابى يعلىٰ)

دوبارہ جمعہ کی اذان کو سنا، پھر جمعہ کی نماز کے لیے نہیں آیا، یا اس کا جواب نہیں دیا، پھر تیسری مرتبہ جمعہ کی اذان کو سنا، پھر جمعہ کی نماز کے لیے نہیں آیا، یا اس کا جواب نہیں دیا، تو اللہ عزّ وجلّ اس کے دل پر مہر لگا دیتا ہے، پھر اس کا دل منافق والا دل بنا دیا جاتا ہے (ابویعلیٰ)

حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: مَنْ تَرَكَ ثَلَاثَ جُمُعَاتٍ مِنْ غَيْرِ عُذْرٍ كُتِبَ مِنَ الْمُنَافِقِيْنَ (المعجم الكبير للطبرانى، رقم الحديث ۴۲۲، ج۱ ص ۱۷۰) [1]

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص تین جمعے (کی نمازیں) بغیر عذر کے ترک کر دے، تو وہ منافقین میں سے لکھ دیا جائے گا (طبرانی)

اہلِ علم حضرات کے بقول یہاں نفاق سے عملی نفاق مراد ہے، اور مطلب یہ ہے کہ بغیر عذر تین جمعے کی نمازیں چھوڑ دینے والا عملی اعتبار سے منافق ہو جاتا ہے، کہ یہ منافقوں والا عمل ہے۔ [2]

اور اگر نعوذ باللہ تعالیٰ جمعہ کی نماز کی اہمیت ہی دل میں نہ ہو، اور اس کو دل سے فرض نہ سمجھے، بلکہ اس کی تحقیر دل میں ہو، تو پھر اعتقاد کے اعتبار سے بھی منافق ہونے میں کوئی شبہ نہیں رہے گا، البتہ اعتقاد، دل میں چھپی ہوئی چیز ہے، اس لئے جمعہ چھوڑنے کے ظاہری عمل کی بنیاد پر کسی کو اعتقادی اعتبار سے منافق اور کافر قرار دینا درست نہیں ہوتا۔

حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ سے موقوفاً روایت ہے کہ:

قَالَ: مَنْ تَرَكَ الْجُمُعَةَ ثَلَاثَ جُمَعٍ مُتَوَالِيَاتٍ فَقَدْ نَبَذَ الْإِسْلَامَ

---

[1] قال المنذرى: رواه الطبرانى فى الكبير من رواية جابر الجعفى وله شواهد (الترغيب و الترهيب للمنذرى، تحت رقم الحديث ۱۰۸۹)

[2] أراد النفاق العملى (فيض القدير، تحت رقم الحديث ۸۵۹۰)

وَرَاءَ ظَهْرِهٖ (مسند ابی یعلیٰ، رقم الحدیث ۲۷۱۲، ج۵ص ۱۰۲، اول مسند ابنِ عباس) [1]

ترجمہ: حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جس نے تین جمعے لگا تار چھوڑ دیئے، تو اس نے اسلام کو اپنی پشت کے پیچھے ڈال دیا (ابویعلیٰ)

معلوم ہوا کہ جمعہ کی نماز چھوڑنے اور بطورِ خاص لگا تار تین مرتبہ جمعہ کی نماز چھوڑنے پر سخت وعیدیں آئی ہیں، اس لئے بلاعذر جمعہ کی نماز چھوڑنے کے طرزِ عمل سے بچنا چاہئے۔

حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ يَقُوْلُ هَلَاكُ أُمَّتِيْ فِي الْكِتَابِ وَاللَّبَنِ قَالُوْا يَارَسُوْلَ اللهِ مَاالْكِتَابُ وَاللَّبَنُ؟قَالَ: يَتَعَلَّمُوْنَ الْقُرْآنَ فَيَتَأَوَّلُوْنَهٗ عَلٰى غَيْرِمَااَنْزَلَ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ وَيُحِبُّوْنَ اللَّبَنَ فَيَدَعُوْنَ الْجَمَاعَاتِ وَالْجُمَعَ وَيَبْدُوْنَ (مسند احمد، رقم الحدیث ۱۷۴۱۵؛ مسند ابویعلیٰ رقم الحدیث ۱۷۰۶، شعب الایمان للبیهقی، رقم الحدیث ۲۷۴۹) [2]

---

[1] قال حسین سلیم أسد الدارانی:

إسناده صحیح إلی ابن عباس وهو موقوف علیه (حاشیة مسند ابی یعلیٰ)

و قال الهیثمی:

رواه أبو یعلی ورجاله رجال الصحیح (مجمع الزوائد، تحت رقم الحدیث ۳۱۷۷)

[2] قال شعیب الارنؤوط:

اسناداه حسنان (حاشیة مسند احمد)

وقال الهیثمی:

رواه أبو یعلی وأحمد وفیه ابن لهیعة وقال أبو قبیل :لم أسمع من عقبة إلا هذا الحدیث (مجمع الزوائد، تحت رقم الحدیث ۳۱۸۳، باب فیمن فاتته الجمعة)

و قال الالبانی:

قلت :وهذا الحدیث من أحادیث ابن لهیعة الصحیحة، لأنه من روایة أبی عبد الرحمن عنه، واسمه عبد الله بن یزید المقریء المکی، وهو ثقة من رجال الشیخین ومن کبار

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

ترجمہ: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا کہ میری امت کی ہلاکت کتاب اور دودھ کی وجہ سے ہوگی، صحابۂ کرام نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! کتاب اور دودھ سے کیا مراد ہے؟ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قرآن سیکھ کر پھر (اس کے بعد بعض) لوگ اس کے ایسے معنیٰ بیان کریں گے، جو اللہ عزوجل کی مراد نہیں، اور وہ دودھ کی محبت کی وجہ سے جمعہ اور جماعت کی نماز چھوڑ دیں گے، اور وہ ہلاک ہو جائیں گے (مسند احمد)

مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ جانوروں کے دودھ کی وجہ سے جمعہ کی نماز اور جماعت کو چھوڑ دیں گے، اور جانوروں کے پاس وقت گزاریں گے، جس کی وجہ سے ہلاکت میں مبتلا ہوں گے، اور وہ ہلاکت دنیا کے اعتبار سے بھی ہو سکتی ہے، اور آخرت کے اعتبار سے بھی۔ [1]

امُّ المومنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ:

أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: رَوَاحُ الْجُمُعَةِ وَاجِبٌ عَلٰى كُلِّ مُحْتَلِمٍ (سنن النسائی، رقم الحدیث ۱۳۷۱، کتاب الجمعة، باب التشدید فی التخلف عن الجمعة، ابن حبان، رقم الحدیث ۱۲۲۰) [2]

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾ شیوخ البخاری، وقد ذکروا أنه من العبادلة الذین رووا عن ابن لهیعة قبل احتراق کتبه وأنه صحیح الحدیث فیما رووه عنه. وقد روی هذا بإسنادین: الأول: عن أبی قبیل عن عقبة. والآخر: عن یزید بن أبی حبیب عن أبی الخیر عن عقبة. وهذا إسناد صحیح، لأن من فوق ابن لهیعة ثقتان من رجال الشیخین أیضا وأبو الخیر اسمه مرثد بن عبد الله الیزنی. وأما إسناده الأول فحسن لأن أبا قبیل واسمه حیی بن هانی المعافری وثقه جماعة منهم أحمد، وضعفه بعضهم، وقال الحافظ فی "التقریب": "صدوق یهم". فهو حسن الحدیث علی الأقل، والله أعلم (سلسلة الاحادیث الصحیحة، تحت رقم الحدیث ۲۷۷۸)

[1] قال بعض العلماء والمراد أن الشیطان یحبب إلیهم اللبن فیخرجون إلی البادیة ویترکون الجمعة والجماعة (الآداب الشرعیة والمنح المرعیة لابن مفلح، ج۳ص۲۹۸، فصل فتن المال والنساء والبداوة والأمراء المضلین والعلماء المنافقین)

[2] قال شعیب الارنؤوط: إسناده صحیح، یزید بن موهب ثقة، وباقی رجال الإسناد علی شرط الصحیح (حاشیة ابنِ حبان)

ترجمہ: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جمعہ کے لیے جانا، ہر بالغ (مرد) پر واجب ہے (نسائی)

مطلب یہ ہے کہ ہر بالغ مرد پر جمعہ کی نماز واجب ہے، جبکہ جمعہ کی نماز واجب ہونے کی دیگر شرائط پائی جائیں، جن کا دیگر احادیث وروایات میں ذکر پایا جاتا ہے، اوران شرائط میں مسلمان ہونے کے ساتھ ساتھ مرد وغیرہ ہونا بھی داخل ہے۔ [1]

حضرت طارق بن شہاب سے روایت ہے کہ:

عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: اَلْجُمُعَةُ حَقٌّ وَاجِبٌ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ فِيْ جَمَاعَةٍ إِلَّا أَرْبَعَةٍ: عَبْدٍ مَمْلُوْكٍ، أَوْ اِمْرَأَةٍ، أَوْ صَبِيٍّ، أَوْ مَرِيْضٍ (سنن أبی داؤد، رقم الحديث ١٠٦٧، كتاب الصلاة، ابواب الجمعة، باب الجمعة للمملوك والمرأة) [2]

ترجمہ: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر مسلمان پر جماعت کے ساتھ جمعہ کی نماز ادا کرنا ضروری حق ہے، سوائے چار قسم کے لوگوں کے، ایک غلام جو کسی کا مملوک ہو، دوسرے عورت، تیسرے نابالغ بچہ، چوتھے مریض (ابوداؤد)

حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، قَالَ: اَلْجُمُعَةُ حَقٌّ وَاجِبٌ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ فِيْ جَمَاعَةٍ إِلَّا أَرْبَعَةٍ: عَبْدٍ مَمْلُوْكٍ، أَوْ اِمْرَأَةٍ، أَوْ صَبِيٍّ، أَوْ

---

[1] (على كل محتلم) أى بالغ (رواح الجمعة) إذا توفرت الشروط المذكورة فى الفروع (وعلى كل من راح الجمعة) أى أراد الرواح إليها (الغسل) لها قال القاضى :إنما ذكر هذا اللفظ تأكيدا للسنة وتحريضا لهم عليه(د عن حفصة) أم المؤمنين بإسناد صالح(فيض القدير للمناوى، تحت رقم الحديث ٥٤٦٢)

[2] قال شعيب الارنؤوط:إسناده صحيح .طارق بن شهاب اتفق على أنه رأى رسولَ الله -صلَّى الله عليه وسلم -، لكن اختُلف هل سمع منه أم لا؟ وعلى تقدير أنه لم يسمع منه تكون روايته مرسل صحابى، وهو حجة بالإجماع إلا من شذَّ، كما قال ابنُ الملقن فى "البدر المنير(حاشية سنن ابى داؤد)

مَرِيُضٍ (مستدرک حاکم، رقم الحدیث ۱۰۶۲، کتاب الجمعۃ) [1]

ترجمہ: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر مسلمان پر جماعت کے ساتھ جمعہ کی نماز ادا کرنا ضروری حق ہے، سوائے چار قسم کے لوگوں کے، ایک غلام جو کسی کا مملوک ہو، دوسرے عورت، تیسرے نابالغ بچہ، چوتھے مریض (حاکم)

اس سے معلوم ہوا کہ جمعہ کی نماز واجب (بمعنیٰ فرض) ہے، لیکن کیونکہ اس کو عام نمازوں کی طرح بغیر جماعت کے ادا نہیں کیا جاسکتا، اوراس کے لئے (خاص شرائط کے ساتھ) جماعت ضروری ہے، اس لئے جمعہ کی نماز کو (دن رات کی پانچ نمازوں کی طرح) ہر عاقل، بالغ مسلمان پر فرض نہیں کیا گیا، اوراس سے بعض لوگوں کو مستثنیٰ کیا گیا ہے، جن میں سے بعض کا ذکر مذکورہ احادیث میں ہے۔ [2]

جہاں ایک طرف جمعہ کی نماز چھوڑنے پر احادیث میں سخت وعیدیں اور تنبیہات آئی ہیں، اسی کے ساتھ دوسری طرف جمعہ کی نماز ادا کرنے کے مختلف فضائل بھی آئے ہیں۔

جمعہ کی نماز کے فضائل سے متعلق چند احادیث وروایات ملاحظہ فرمائیں۔

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: مَنِ اغْتَسَلَ يَوْمَ الْجُمُعَةِ، وَتَطَهَّرَ بِمَا اسْتَطَاعَ مِنْ طُهْرٍ، ثُمَّ ادَّهَنَ أَوْ مَسَّ مِنْ طِيْبٍ، ثُمَّ رَاحَ

---

[1] قال الحاكم: هذا حديث صحيح على شرط الشيخين فقد اتفقا جميعا على الاحتجاج بهريم بن سفيان ولم يخرجاه ورواه ابن عيينة، عن إبراهيم بن محمد بن المنتشر ولم يذكر أبا موسى في إسناده، وطارق بن شهاب ممن يعد في الصحابة.

و قال الذهبي في التلخيص: صحيح.

[2] (الجمعة حق واجب على كل مسلم مكلف) زاد في رواية يؤمن بالله واليوم الآخر (في جماعة) فيشترط أن تقام في جماعة (إلا على أربعة) بالنصب لأنه استثناء من موجب (عبد مملوك) فلا جمعة عليه لشغله بخدمة سيده (أو امرأة) ومثلها الخنثى (أو صبي) ولو مراهقا (أو مريض) وكذا مسافر وكل من له عذر مرخص في ترك الجماعة (فيض القدير للمناوي، تحت رقم الحديث ٣٦٣٠)

فَلَمْ يُفَرِّقْ بَيْنَ اثْنَيْنِ، فَصَلّٰى مَا كُتِبَ لَهُ، ثُمَّ إِذَا خَرَجَ الْإِمَامُ أَنْصَتَ، غُفِرَ لَهُ مَا بَيْنَهُ وَبَيْنَ الْجُمُعَةِ الْأُخْرٰى (صحيح البخارى، رقم الحديث ٩١٠، كتاب الجمعة، باب :لا يفرق بين اثنين يوم الجمعة)

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے جمعہ کے دن غسل کیا، اور حسبِ استطاعت پاکی کا اہتمام کیا، پھر اس نے تیل، یا خوشبو لگائی، پھر جمعہ کے لئے چلا، اور (مسجد میں جا کر) دو آدمیوں کے درمیان تفریق (وجدائی) نہیں ڈالی، پھر اس نے (مسجد میں پہنچنے کے بعد) حسبِ توفیق (نفل سنت) نماز پڑھی، پھر جب امام (خطبہ کے لئے) آیا، تو وہ خاموش ہو گیا، تو اس کے اِس جمعہ سے دوسرے جمعہ تک گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں (بخاری)

کئی احادیث میں کبیرہ گناہوں سے بچنے کی شرط لگی ہوئی ہے، جیسا کہ آگے آتا ہے، اور ان سے معلوم ہوتا ہے کہ جمعہ کی نماز سے کبیرہ گناہ معاف نہیں ہوتے، البتہ صغیرہ گناہ معاف ہوتے ہیں، اور صغیرہ گناہوں کی معافی بھی بڑی نعمت ہے، کیونکہ وہ کثرت سے ہوتے رہتے ہیں، اور اس حیثیت سے ان کی معافی کی ضرورت، زیادہ ہوتی ہے۔

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے ہی روایت ہے کہ:

قَالَ لِيَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: أَتَدْرِيْ مَا يَوْمُ الْجُمُعَةِ ؟ قُلْتُ: هُوَ الْيَوْمُ الَّذِيْ جَمَعَ اللّٰهُ فِيْهِ أَبَاكُمْ، قَالَ: لٰكِنِّيْ أَدْرِيْ مَا يَوْمُ الْجُمُعَةِ، لَا يَتَطَهَّرُ الرَّجُلُ فَيُحْسِنُ طُهُوْرَهُ، ثُمَّ يَأْتِي الْجُمُعَةَ، فَيَنْصِتُ حَتّٰى يَقْضِيَ الْإِمَامُ صَلَاتَهُ، إِلَّا كَانَ كَفَّارَةً لَهُ مَا بَيْنَهُ وَبَيْنَ الْجُمُعَةِ الْمُقْبِلَةِ مَا اجْتُنِبَتِ الْمَقْتَلَةُ (مسند احمد، رقم الحديث ٢٣٧١٨) [1]

---

[1] قال شعيب الارنؤوط: حديث صحيح رجاله ثقات (حاشية مسند احمد)

ترجمہ: مجھے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم جانتے ہو کہ جمعہ کا دن کیا ہے؟ میں نے عرض کیا کہ یہ وہ دن ہے کہ جس میں اللہ نے تمہارے باپ (حضرت آدم) کو جمع (و پیدا) کیا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں جانتا ہوں کہ جمعہ کا دن کیا ہے، جو آدمی بھی پاکی حاصل کرتا ہے، اور اچھے طریقہ سے پاکی حاصل کرتا ہے، پھر وہ جمعہ کے لیے آتا ہے، اور خاموش رہتا ہے، یہاں تک کہ امام نماز مکمل کر لیتا ہے، تو یہ اس جمعہ سے لے کر، اگلے جمعہ تک گناہوں کا کفارہ ہو جاتا ہے، بشرطیکہ ہلاکت خیز (یعنی کبیرہ گناہوں) سے اجتناب کرے (مسند احمد)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: اَلصَّلَاةُ الْخَمْسُ وَالْجُمُعَةُ اِلَى الْجُمُعَةِ كَفَّارَةٌ لِمَابَيْنَهُنَّ مَا لَمْ تُغْشَ الْكَبَائِرُ (صحیح مسلم، رقم الحدیث ۲۳۳ "۱۴" کتاب الطهارة، باب الصلوات الخمس والجمعة الى الجمعة ورمضان الى رمضان)

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پانچوں نمازیں اور ایک جمعہ (کی نماز) اگلے جمعہ (کی نماز) تک اُن گناہوں کا جو اِن کے درمیان ہوتے ہیں، کفارہ ہے، جب تک کہ کبیرہ گناہ نہ کئے جائیں (مسلم)

اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی کی ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ:

أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَقُوْلُ اَلصَّلٰوٰتُ الْخَمْسُ وَالْجُمُعَةُ اِلَى الْجُمُعَةِ وَرَمَضَانُ اِلٰى رَمَضَانَ مُكَفِّرَاتٌ مَابَيْنَهُنَّ اِذَا اجْتَنَبَ الْكَبَائِرَ (صحیح مسلم، رقم الحدیث ۲۳۳ "۱۶" کتاب الطهارة، باب الصلوات الخمس والجمعة الى الجمعة ورمضان الى رمضان)

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ بات فرمایا کرتے تھے کہ پانچ نمازوں میں

سے ہر نماز دوسری نماز تک اور ایک جمعہ (کی نماز) دوسرے جمعہ (کی نماز) تک اور ایک رمضان دوسرے رمضان تک درمیانی مدت کے گناہوں کا کفارہ بن جاتے ہیں، جب تک کہ وہ کبیرہ گناہ نہ کرے (مسلم)

اس طرح کی حدیث حضرت انس رضی اللہ عنہ کی سند سے بھی مروی ہے۔ [1]

مذکورہ حدیثوں سے جمعہ کی نماز کی یہ فضیلت معلوم ہوئی کہ اس کی برکت سے ہفتہ بھر کے صغیرہ گناہ معاف کردیئے جاتے ہیں، مگر کبیرہ گناہ اس سے معاف نہیں ہوتے۔

اور اس کی وجہ یہ ہے کہ کبیرہ گناہوں کی معافی کے لئے توبہ ضروری ہے۔ [2]

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

عَنْ نَبِيِّ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: إِذَا تَطَهَّرَ الرَّجُلُ فَأَحْسَنَ الطُّهُوْرَ، ثُمَّ أَتَى الْجُمُعَةَ فَلَمْ يَلْغُ، وَلَمْ يَجْهَلْ حَتّٰى يَنْصَرِفَ الْإِمَامُ، كَانَتْ كَفَّارَةً لِمَا بَيْنَهَا وَبَيْنَ الْجُمُعَةِ، وَفِي الْجُمُعَةِ سَاعَةٌ لَا يُوَافِقُهَا رَجُلٌ مُؤْمِنٌ يَسْأَلُ اللّٰهَ شَيْئًا إِلَّا أَعْطَاهُ إِيَّاهُ، وَالْمَكْتُوْبَاتُ كَفَّارَاتٌ لِمَا بَيْنَهُنَّ (مسند احمد، رقم الحديث ١١٣٤٧) [3]

---

[1] عن أنس، فذكر حديثا بهذا، ثم قال :وبإسناده عن النبى صلى الله عليه وسلم قال: الصلوات الخمس والجمعة إلى الجمعة كفارات لما بينهن ما اجتنبت الكبائر.
وقال :من الجمعة لساعة لا يوافقها مسلم ولا مسلمة يسأل الله فيها خيرا إلا أعطاه(كشف الأستار عن زوائد البزار، رقم الحديث ٣٤٧)
عن أنس قال :قال رسول الله صلى الله عليه وسلم :الصلوات الخمس والجمعة إلى الجمعة كفارات لما بينهن ما اجتنبت الكبائر (بغية الباحث عن زوائد مسند الحارث، رقم الحديث ١٠٩، ج ا ص ٢٤٠، كتاب الصلاة، باب فضل الصلاة)

[2] معناه أن الذنوب كلها تغفر إلا الكبائر فإنها لا تغفر وليس المراد أن الذنوب تغفر مالم تكن كبيرة (شرح النووى على مسلم، ج٣ص ١٢٢، كتاب الطهارة، باب فضل الوضوء والصلاة عقبه)

[3] قال شعيب الارنؤوط: حديث صحيح، وهذا إسناد ضعيف لضعف عطية، وهو ابن سعد العوفى، وبقية رجاله ثقات رجال الشيخين غير هشام -وهو ابن معاوية القصار الأزدى -فمن رجال مسلم، وهو مختلف فيه حسن الحديث(حاشية مسند احمد)

ترجمہ: اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب آدمی پاکی حاصل کرتا ہے، اور اچھی طرح پاکی حاصل کرتا ہے، پھر نمازِ جمعہ کے لیے آتا ہے، اور کوئی لغو حرکت نہیں کرتا، اور نہ ہی جہالت والا کام کرتا ہے، یہاں تک کہ امام نماز سے فارغ ہوجائے، تو یہ اس جمعہ سے دوسرے جمعہ تک گناہوں کا کفارہ ہوجاتا ہے، اور جمعہ کے دن ایک ساعت ایسی ہے کہ جس میں کوئی مومن آدمی بھی اللہ سے کسی چیز کا سوال کرے، تو اللہ اس کو ضرور عطا فرماتا ہے، اور فرض نمازیں، ایک دوسرے کے درمیانی اوقات کے گناہوں کا کفارہ ہوجاتی ہیں (مسنداحمد)

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، قَالَ: مَنِ اغْتَسَلَ يَوْمَ الْجُمُعَةِ فَأَحْسَنَ الْغُسْلَ وَتَطَهَّرَ فَأَحْسَنَ الطُّهُوْرَ، وَلَبِسَ مِنْ خَيْرِ ثِيَابِهِ، وَمَسَّ مِمَّا كَتَبَ اللّٰهُ لَهُ مِنْ طِيْبٍ أَوْ دُهْنِ أَهْلِهِ، وَلَمْ يُفَرِّقْ بَيْنَ اثْنَيْنِ إِلَّا غَفَرَ اللّٰهُ لَهُ إِلَى الْجُمُعَةِ الْأُخْرٰى (مستدرک حاکم، رقم الحديث ۱۰۷۴، ج ۱ ص ۴۲۸، کتاب الجمعة) [1]

ترجمہ: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے جمعہ کے دن غسل کیا، اور اچھی طرح غسل کیا، اور پاکیزگی حاصل کی، اور اچھے طریقہ سے پاکیزگی حاصل کی، اور اچھا لباس پہنا، اور اللہ نے جو اس کو خوشبو، یا جو گھر میں تیل عطا کیا، اس کو لگایا، اور (پھر جمعہ کی نماز کے لیے آنے کے بعد) دو آدمیوں کے درمیان (گھس کر) تفریق (وجدائی) نہیں ڈالی، تو اللہ، اس کے دوسرے جمعہ تک گناہ معاف فرمادیتا ہے (حاکم)

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی اس حدیث کو تھوڑے بہت الفاظ کے فرق کے ساتھ امام احمد نے

---

[1] قال الحاكم: هذا حديث صحيح على شرط مسلم، ولم يخرجاه.
و قال الذهبي في التلخيص: على شرط مسلم.

بھی روایت کیا ہے۔ [1]

حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ: مَنْ اِغْتَسَلَ يَوْمَ الْجُمُعَةِ، وَمَسَّ مِنْ طِيْبٍ إِنْ كَانَ عِنْدَهُ، وَلَبِسَ مِنْ أَحْسَنِ ثِيَابِهٖ، ثُمَّ خَرَجَ حَتّٰى يَأْتِيَ الْمَسْجِدَ فَيَرْكَعَ إِنْ بَدَا لَهُ، وَلَمْ يُؤْذِ أَحَدًا، ثُمَّ أَنْصَتَ إِذَا خَرَجَ إِمَامُهُ حَتّٰى يُصَلِّيَ، كَانَتْ كَفَّارَةً لِمَا بَيْنَهَا وَبَيْنَ الْجُمُعَةِ الْأُخْرٰى (مسند احمد، رقم الحديث ۲۳۵۷۱) [2]

ترجمہ: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ جس نے جمعہ کے دن غسل کیا، اور اگر اس کے پاس خوشبو ہو، تو وہ لگائی، اور اچھا لباس پہنا، پھر نکل کر مسجد پہنچا، پھر جتنی چاہی نماز پڑھی، اور کسی کو تکلیف نہیں پہنچائی، پھر امام کے نکلنے اور نماز سے فارغ ہونے تک خاموش رہا، تو یہ اس جمعہ سے دوسرے جمعہ تک گناہوں کا کفارہ ہو جائے گا (مسند احمد)

حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: مَنْ اِغْتَسَلَ يَوْمَ الْجُمُعَةِ، ثُمَّ لَبِسَ ثِيَابَهُ، وَمَسَّ طِيْبًا إِنْ كَانَ عِنْدَهُ، ثُمَّ مَشٰى إِلَى الْجُمُعَةِ وَعَلَيْهِ السَّكِيْنَةُ، وَلَمْ يَتَخَطَّ أَحَدًا، وَلَمْ يُؤْذِهٖ، وَرَكَعَ مَا قُضِيَ لَهُ، ثُمَّ انْتَظَرَ

---

[1] عن أبى ذر، عن النبى صلى الله عليه وسلم قال " :من اغتسل أو تطهر، فأحسن الطهور، ولبس من أحسن ثيابه، ومس ما كتب الله له من طيب أو دهن أهله، ثم أتى الجمعة، فلم يلغ ولم يفرق بين اثنين، غفر له ما بينه وبين الجمعة الأخرى "(مسند احمد، ۲۱۵۳۹)

قال شعيب الارنؤوط:

حديث صحيح(حاشية مسند احمد)

[2] قال شعيب الارنؤوط:صحيح لغيره،

وهذا إسناد حسن(حاشية مسند احمد)

حَتّٰی یَنْصَرِفَ الْإِمَامُ، غُفِرَ لَهٗ مَا بَیْنَ الْجُمُعَتَیْنِ (مسند احمد، رقم الحدیث ۲۱۷۲۹) [1]

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے جمعہ کے دن غسل کیا، پھر کپڑے پہنے، اور اگر اس کے پاس خوشبو ہو، تو وہ لگائی، پھر جمعہ کی طرف سکون اور وقار کے ساتھ چلا، اور کسی کی گردن کو نہیں پھلاندا، اور نہ ہی کسی کو تکلیف دی، پھر جتنی توفیق ہوئی (نفل وسنت) نماز پڑھی، پھر انتظار کیا، یہاں تک کہ امام (خطبہ سے اور) نماز پڑھا کر فارغ ہوگیا، تو اس کے دو جمعوں کے درمیان کے گناہ معاف کردیئے جائیں گے (مسند احمد)

حضرت نبیشہ ہذلی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ: أَنَّ الْمُسْلِمَ إِذَا اغْتَسَلَ یَوْمَ الْجُمُعَةِ، ثُمَّ أَقْبَلَ إِلَی الْمَسْجِدِ، لَا یُؤْذِیْ أَحَدًا، فَإِنْ لَمْ یَجِدِ الْإِمَامَ خَرَجَ، صَلّٰی مَا بَدَا لَهٗ، وَإِنْ وَجَدَ الْإِمَامَ قَدْ خَرَجَ، جَلَسَ فَاسْتَمَعَ وَأَنْصَتَ، حَتّٰی یَقْضِیَ الْإِمَامُ جُمُعَتَهٗ وَكَلَامَهٗ، إِنْ لَّمْ یُغْفَرْ لَهٗ فِیْ جُمُعَتِهٖ تِلْكَ ذُنُوْبُهٗ كُلُّهَا، أَنْ تَكُوْنَ كَفَّارَةً لِلْجُمُعَةِ الَّتِیْ تَلِیْهَا

(مسند احمد، رقم الحدیث ۲۰۷۲۱) [2]

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مسلمان جب جمعہ کے دن غسل کرتا

---

[1] قال شعیب الارنؤوط: صحیح لغیرہ (حاشیة مسند احمد)

[2] قال شعیب الارنؤوط: صحیح لغیرہ، وهذا إسناد ضعیف لانقطاعه، فإن عطاء -وهو ابن أبی مسلم- الخراسانی روایته عن الصحابة مرسلة.

وله شاهد من حدیث أبی هریرة وأبی سعید الخدری جمیعاً، سلف برقم (۱۱۷۶۸)

ومن حدیث أبی ذر الغفاری، وأبی الدرداء، وأبی أیوب الأنصاری، وسلمان الفارسی، ستأتی فی "المسند" علی التوالی (۲۱۵۳۹) و۵/۱۹۸ و۴۲۰ و۴۳۸.

ولقوله ": أن تكون كفارة للجمعة التی تلیها" شاهد من حدیث عبد الله بن عمرو، سلف برقم (۷۰۰۲) وإسناده حسن (حاشیة مسند احمد)

ہے، پھر وہ مسجد کی طرف آتا ہے، کسی کو تکلیف نہیں پہنچاتا، پھر اگر امام کو (خطبہ کے لیے) نکلا ہوا نہیں پاتا، تو حسبِ منشا (نفل وسنت) نماز پڑھ لیتا ہے، اور اگر امام کو (خطبہ کے لیے) نکلا ہوا پاتا ہے، تو بیٹھ جاتا ہے، اور (خطبہ) سنتا ہے، اور خاموش رہتا ہے، یہاں تک کہ امام جمعہ اور خطبہ کو مکمل کر لے، تو اگر اس کے اس جمعہ کے سارے گناہ معاف نہ ہوئے، تو آئندہ آنے والے جمعہ تک اس کے گناہوں کا کفارہ ضرور بن جائے گا (مسند احمد)

مذکورہ احادیث وروایات سے معلوم ہوا کہ جب کوئی غسل کر کے اور بعض دوسری چیزوں کا اہتمام کر کے جمعہ کی نماز ادا کرتا ہے، تو اس کے اگلے جمعہ تک گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں، لیکن اس سے پہلے کئی احادیث میں یہ بات گزر چکی ہے کہ کبیرہ گناہوں سے بچے، جس سے معلوم ہوا کہ مذکورہ احادیث میں صغیرہ گناہوں کا معاف ہونا مراد ہے، اور کبیرہ گناہوں کے معاف ہونے کے لیے توبہ کا ہونا ضروری ہے۔

گزشتہ احادیث وروایات میں تو ایک ہفتہ کے گناہوں کی معافی کا ذکر ہے، جبکہ بعض احادیث وروایات میں ایک ہفتہ کے گناہ معاف ہونے کے بجائے، دس دن کے گناہ معاف ہونے کا ذکر آیا ہے، جن کا ذیل میں ذکر کیا جاتا ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، قَالَ :مَنْ اِغْتَسَلَ ثُمَّ اَتَى الْجُمُعَةَ فَصَلّٰى مَاقُدِّرَ لَهُ ثُمَّ أَنْصَتَ حَتّٰى يَفْرُغَ مِنْ خُطْبَتِهٖ ثُمَّ يُصَلِّيْ مَعَهُ غُفِرَ لَهُ مَابَيْنَهُ وَبَيْنَ الْجُمُعَةِ الْأُخْرٰى وَفَضْلَ ثَلَاثَةِ أَيَّامٍ (صحيح مسلم، رقم الحديث ٨٥٧ "٢٦" كتاب الجمعة، باب فضل من استمع وأنصت فى الخطبة)

ترجمہ: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے غسل کیا، پھر جمعہ کے لیے حاضر ہوا، پھر اُس نے جو مقدر میں ہوئی (سنت ونفل) نماز پڑھی، پھر خاموش رہا، یہاں

تک کہ امام اپنے خطبہ سے فارغ ہوگیا، پھر امام کے ساتھ جمعہ کی نماز پڑھی، تو (ان اعمال کی برکت سے) اُس شخص کے دوسرے جمعہ تک اور تین دن مزید کے (صغیرہ) گناہ معاف کردیے جائیں گے (مسلم)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ہی روایت ہے کہ:

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ: مَنْ اِغْتَسَلَ یَوْمَ الْجُمُعَۃِ فَأَحْسَنَ غُسْلَہٗ وَلَبِسَ مِنْ صَالِحِ ثِیَابِہٖ وَمَسَّ مِنْ طِیْبِ بَیْتِہٖ أَوْ دُھْنِہٖ، غُفِرَ لَہٗ مَا بَیْنَہٗ وَبَیْنَ الْجُمُعَۃِ الْأُخْرٰی وَزِیَادَۃَ ثَلَاثَۃِ أَیَّامٍ مِنَ الَّتِیْ بَعْدَھَا (صحیح ابن حبان، رقم الحدیث ۲۷۸۰، کتاب الصلاۃ، باب صلاۃ الجمعۃ) [1]

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے جمعہ کے دن غسل کیا، اور اچھی طرح غسل کیا، اور اچھے کپڑے پہنے، اور اپنے گھر کی خوشبو، یا تیل لگایا، تو اس کے اس جمعہ سے دوسرے جمعہ تک کے گناہ معاف کردیئے جاتے ہیں، اور اس کے بعد مزید تین دن کے بھی (ابن حبان)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی ایک روایت میں غسل کے بجائے اچھی طرح وضو کرنے کا ذکر ہے، جس سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی کسی عذر سے جمعہ کے دن غسل نہ کرے، بلکہ وضو کرے، اور باقی چیزوں کا اہتمام کرے، تو اس کو بھی یہ فضیلت حاصل ہوجاتی ہے۔ [2]

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اَلصَّلَوٰتُ الْخَمْسُ کَفَّارَۃٌ

---

[1] قال شعیب الارنؤوط: إسنادہ صحیح علی شرط مسلم (حاشیۃ ابن حبان)

[2] عن أبی صالح، عن أبی ھریرۃ، قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: من توضأ فأحسن الوضوء، ثم أتی الجمعۃ، فاستمع وأنصت، غفر لہ ما بینہ وبین الجمعۃ، وزیادۃ ثلاثۃ أیام، ومن مس الحصی فقد لغا (مسلم، رقم الحدیث ۸۵۷ ''۲۷'')

لِمَابَيْنَهُنَّ مَا اجْتُنِبَتِ الْكَبَائِرُ وَالْجُمُعَةُ اِلَى الْجُمُعَةِ وَزِيَادَةِ ثَلاثَةِ أَيَّامٍ (حلية الاولياء لابی نعيم، ج۹، ص ۲۴۹، تحت ترجمة محمد بن اسلم،ذكر طوائف من جماهير النساك والعباد؛ مصنف عبدالرزاق، رقم الحديث ۵۵۸۸؛بغية الباحث عن زوائد مسند الحارث، رقم الحديث ۱۹۵) [1]

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پانچوں نمازیں، اِن کے (باہمی اوقات کے) درمیان ہونے والے گناہوں کا کفارہ ہیں، جبکہ کبیرہ گناہوں سے بچا جائے، اور ایک جمعہ، اگلے جمعہ تک اور تین دن مزید کے گناہوں کا کفارہ ہے (جب تک کہ کبیرہ گناہ نہ کرے) (ابونعیم، عبدالرزاق، مسند حارث)

اس طرح کی احادیث وروایات حضرت ابوذر اور حضرت ابواُمامہ رضی اللہ عنہما کی سندوں سے بھی مروی ہیں۔ [2]

---

[1] قال الالباني: الصلوات الخمس كفارات لما بينهن ما اجتنبت الكبائر والجمعة إلى الجمعة وزيادة ثلاثة أيام ."أخرجه أبو نعيم في "الحلية (۹/۲۴۹ ـ ۲۵۰) "عن عبد الحكيم عن أنس بن مالك أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال :فذكره.
قلت :وهذا إسناد ضعيف، عبد الحكيم هذا هو ابن عبد الله القسملي وهو ضعيف كما في " التقريب ."وتابعه زياد النميري عن أنس به دون قوله "وزيادة ثلاثة أيام ."أخرجه البزار (رقم۳۴۷)عن زائدة بن أبي الرقاد عنه، وقال : "زائدة ضعيف، وزياد النميري ليس به بأس ."كذا قال، وزياد -وهو ابن عبد الله النميري -ضعفه الأكثرون، وقال في "التقريب " :"ضعيف ." لكن الحديث قد صح من حديث أبي هريرة مرفوعا دون الزيادة .أخرجه مسلم وفي رواية له بلفظ : "من توضأ فأحسن الوضوء ، ثم أتى الجمعة فاستمع وأنصت غفر له ما بينه وبين الجمعة وزيادة ثلاثة أيام ومن مس الحصا فقد لغا ."وأخرجه أبو داود أيضا وغيره وهو مخرج في "صحيح أبي داود (۹٦۴)"
وبالجملة فالحديث بهذا الشاهد صحيح .والله أعلم(سلسلة الأحاديث الصحيحة، تحت رقم الحديث ۱۹۲۰)

[2] عن أبي ذر قال من اغتسل يوم الجمعة فأحسن غسله ولبس من صالح ثيابه ومس ما كتب الله له من طيب أهله أو دهنه ثم راح إلى الجمعة فلم يفرق بين اثنين غفر له ما بين الجمعتين وزيادة ثلاثة أيام (مصنف عبدالرزاق، رقم الحديث ۵۵۸۹)
عن أبي أمامة، قال :قال رسول الله صلى الله عليه وسلم :اغتسلوا يوم الجمعة فإنه من اغتسل يوم الجمعة فله كفارة ما بين الجمعة إلى الجمعة وزيادة ثلاثة أيام(مسند الشاميين،للطبراني، رقم الحديث ۸۸۱)

مطلب یہ ہے کہ جمعہ کے دن مذکورہ اعمال کی برکت سے مجموعی طور پر دس دنوں کے صغیرہ گناہ معاف کئے جاتے ہیں۔

اور بعض روایات میں دس دن کے گناہ معاف ہونے کی وجہ یہ منقول ہے کہ ایک نیکی کا ثواب دس کے برابر حاصل ہوتا ہے، اس وجہ سے ان اعمال کی برکت سے دس دن کے گناہ معاف ہوتے ہیں۔

چنانچہ حضرت ابو ہریرہ اور حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ:

سَمِعْنَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، يَقُوْلُ: مَنِ اغْتَسَلَ يَوْمَ الْجُمُعَةِ وَاسْتَنَّ وَمَسَّ مِنْ طِيْبٍ، إِنْ كَانَ عِنْدَهُ وَلَبِسَ أَحْسَنَ ثِيَابِهِ، ثُمَّ جَاءَ إِلَى الْمَسْجِدِ، وَلَمْ يَتَخَطَّ رِقَابَ النَّاسِ، ثُمَّ رَكَعَ مَا شَاءَ اللّٰهُ أَنْ يَّرْكَعَ، ثُمَّ أَنْصَتَ إِذَا خَرَجَ إِمَامُهُ حَتّٰى يُصَلِّيَ كَانَتْ لَهُ كَفَّارَةً لِمَا بَيْنَهَا وَبَيْنَ الْجُمُعَةِ الَّتِيْ كَانَتْ قَبْلَهَا يَقُوْلُ أَبُوْ هُرَيْرَةَ: وَثَلَاثَةُ أَيَّامٍ زِيَادَةٌ، إِنَّ اللّٰهَ قَدْ جَعَلَ الْحَسَنَةَ بِعَشْرِ أَمْثَالِهَا (مستدرک حاکم، رقم الحديث ۱۰۴۶، كتاب الجمعة)[1]

ترجمہ: ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ جس نے جمعہ کے دن غسل کیا، اور مسواک کی، اور اگر اس کے پاس خوشبو ہو، تو اس کو لگایا، اور اپنے پاس موجود اچھا لباس پہنا، پھر مسجد کی طرف آیا، اور لوگوں کی گردنوں کے اوپر سے نہیں پھلاندا، پھر جتنی اللہ نے چاہی، اس نے (سنت ونفل) نماز پڑھی، پھر (امام کے خطبہ کے لئے) نکل کر نماز پڑھنے تک خاموش رہا، تو اس کے اس جمعہ سے گزشتہ جمعہ تک گناہوں کا کفارہ ہوجائے گا، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے یہ بھی فرمایا کہ مزید تین دن کا بھی کفارہ ہوجائے گا، کیونکہ اللہ نے نیکی کا

---

[1] قال الحاكم: إسماعيل ابن علية من الثقات الذى أجمعا على إخراجه.

ثواب دس درجہ اضافی مقرر فرما رکھا ہے(حاکم)

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: يَحْضُرُ الْجُمُعَةَ ثَلَاثَةُ نَفَرٍ، رَجُلٌ حَضَرَهَا يَلْغُو وَهُوَ حَظُّهُ مِنْهَا، وَرَجُلٌ حَضَرَهَا يَدْعُو، فَهُوَ رَجُلٌ دَعَا اللّٰهَ عَزَّ وَجَلَّ إِنْ شَاءَ أَعْطَاهُ، وَإِنْ شَاءَ مَنَعَهُ، وَرَجُلٌ حَضَرَهَا بِإِنْصَاتٍ وَسُكُوتٍ، وَلَمْ يَتَخَطَّ رَقَبَةَ مُسْلِمٍ، وَلَمْ يُؤْذِ أَحَدًا فَهِيَ كَفَّارَةٌ إِلَى الْجُمُعَةِ الَّتِي تَلِيهَا، وَزِيَادَةِ ثَلَاثَةِ أَيَّامٍ، وَذٰلِكَ بِأَنَّ اللّٰهَ عَزَّ وَجَلَّ يَقُولُ: مَنْ جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ عَشْرُ أَمْثَالِهَا (سنن أبی داود، رقم الحديث ١١١٣، كتاب الصلاة، ابواب الجمعة، باب الكلام والإمام يخطب، مسند احمد، رقم الحديث ٧٠٠٢) [1]

ترجمہ: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جمعہ کی نماز میں تین قسم کے لوگ حاضر ہوتے ہیں، ایک وہ آدمی، جو حاضر ہوکر لغو حرکت کرتا ہے، تو اس کو تو اس کا گناہ ملتا ہے، اور ایک وہ آدمی، جو حاضر ہوکر دعاء کرتا ہے، تو یہ ایسا آدمی ہے، جو اللہ عزوجل سے دعاء کررہا ہے، اگر اللہ چاہے، تو اسے دے، اور اگر چاہے تو نہ دے، اور ایک آدمی وہ ہے، جو حاضر ہوکر خاموشی اور سکون اختیار کرتا ہے، اور کسی مسلمان کی گردن کو نہیں پھلاندتا، اور نہ کسی کو ایذاء پہنچاتا ہے، تو یہ عمل اس جمعہ سے دوسرے جمعہ تک اور مزید تین دن کے گناہوں کا کفارہ ہوجاتا ہے، جس کی وجہ (سورہ انعام میں) اللہ عزوجل کا یہ ارشاد ہے کہ "**مَنْ جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ عَشْرُ أَمْثَالِهَا**" (جو ایک نیکی لائے گا، تو اس کو اس کے دس درجہ اضافی نیکیوں کے برابر اجر ملے گا) (ابوداؤد، مسند احمد)

---

[1] قال شعيب الارنؤوط: إسناده حسن(حاشية ابی داوٗد)
وقال ایضاً: إسناده حسن(حاشية مسند احمد)

اس طرح کی حدیث حضرت ابو مالک رضی اللہ عنہ کی سند سے بھی مروی ہے۔ [1]

مذکورہ احادیث میں جمعہ کی نماز سے دس دنوں کے گناہ معاف ہونے کا ذکر کیا گیا ہے، اور اس کی وجہ یہ بیان فرمائی گئی ہے کہ ایک نیکی کا ثواب اللہ تعالیٰ دس کے برابر عطا فرماتا ہے۔

اور یہ بھی ممکن ہے کہ جمعہ کی نماز کا اہتمام (مثلاً جلدی، یا دیر سے جانے، غسل وغیرہ کرنے نہ کرنے) اور اس میں اخلاص کے کم وبیش ہونے سے اس کی فضیلت اور گناہوں کے معاف ہونے کے عرصہ اور دنوں میں بھی کمی بیشی کر دی جاتی ہو۔ واللہ أعلم۔ [2]

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: مَنْ غَسَّلَ وَاغْتَسَلَ، وَغَدَا وَابْتَكَرَ، وَدَنَا فَاقْتَرَبَ، وَاسْتَمَعَ وَأَنْصَتَ كَانَ لَهُ بِكُلِّ خُطْوَةٍ يَخْطُوهَا أَجْرُ قِيَامِ سَنَةٍ وَصِيَامِهَا (مسند احمد، رقم الحديث ۶۹۵۴) [3]

---

[1] عن أبي مالک، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم ": الجمعة كفارة لما بينها وبين الجمعة التي قبلها وزيادة ثلاثة أيام، وذلک بأن الله عز وجل قال: (من جاء بالحسنة فله عشر أمثالها) (المعجم الكبير للطبراني، رقم الحديث ۳۴۵۹، ج۳ص۲۹۸)

[2] (الصلوات الخمس كفارة لما بينهن) من الصغائر (ما اجتنبت الكبائر والجمعة إلى الجمعة) أى كفارة لما بينهما ما اجتنبت الكبائر (وزيادة ثلاثة أيام) وذلک لأن العبد وإن توقى لا بد له من تدنيسه بالذنوب وهو تعالى قدوس لا يقربه إلا قديس طاهر فجعل أداء الفرائض تطهيرا له من أدناسه (إن الحسنات يذهبن السيئات) فإذا تطهر العبد بهذه الطهارة صلح لدار الطهارة وقرب القدوس >تنبيه< قال ابن بزيزة: هنا إشكال صعب وهو أن الصغائر بنص القرآن مكفرة باجتناب الكبائر فما الذى يكفره الصلوات؟ وأجاب البلقينى بأن معنى (إن تجتنبوا) الموافاة على هذه الحال من الإيمان أو التكليف إلى الموت والذى فى الحديث أن الصلوات الخمس تكفر ما بينها أى فى يومها إذا اجتنبت الكبائر فى ذلک اليوم فالسؤال غير وارد وبفرض وروده فالتخلص منه أنه لا يتم اجتناب الكبائر إلا بفعل الخمس فمن لم يفعلها لم يجتنب لأن تركها من الكبائر فيتوقف التكفير على فعلها وأحوال المكلف بالنسبة لما يصدر منه من صغيرة وكبيرة خمسة: أحدها أن لا يصدر منه شيء فهذا ترفع درجاته. الثانية يأتى بصغائر بلا إصرار فهذا يكفر عنه جزما. الثالثة مثله لكن مع الإصرار فلا يكفر لأن الإصرار كبيرة. الرابعة يأتى بكبيرة واحدة وصغائر. الخامسة يأتى بكبائر وصغائر وفيه نظر يحتمل إذا لم يجتنب أن تكفر الصغائر فقط والأرجح لا تكفر أصلا إذ مفهوم المخالفة إذا لم يتعين جهته لا يعمل به (فيض القدير للمناوى، تحت رقم الحديث ۵۱۷۱)

[3] قال شعيب الارنؤوط: حسن لغيره (حاشية مسند احمد)

ترجمہ: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص (جمعہ کے دن) غسل کرائے، اور خود بھی غسل کرے، اور (جمعہ کے لئے) سویرے جائے، اور خطبہ کے شروع کو پائے، اور (امام کے) خوب قریب ہو، اور توجہ سے سنے، اور خاموش رہے، تو اسے ہر اُٹھنے والے قدم پر ایک سال رات بھر کی عبادت اور دن بھر کے روزوں کا ثواب ملتا ہے (مسند احمد)

غسل کرانے کا کیا مطلب ہے؟ اس کا ذکر آگے آتا ہے۔

حضرت اوس بن اوس ثقفی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ: مَنْ اِغْتَسَلَ یَوْمَ الْجُمُعَةِ وَغَسَّلَ، وَبَکَّرَ وَابْتَکَرَ، وَدَنَا وَاسْتَمَعَ وَأَنْصَتَ، کَانَ لَہٗ بِکُلِّ خُطْوَةٍ یَخْطُوْھَا أَجْرُ سَنَةٍ صِیَامُھَا وَقِیَامُھَا (سنن الترمذی، رقم الحدیث ۴۹۶، ابواب الجمعة، باب ما جاء فی فضل الغسل یوم الجمعة) [1]

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے جمعہ کے دن غسل کیا، اور غسل کرایا، اور جمعہ کے دن سویرے گیا، اور خطبہ کے شروع میں شریک ہوا، اور امام کے قریب ہوا، اور سنتا رہا اور خاموش رہا، تو اس کو ہر اٹھنے والے قدم پر ایک سال کے روزوں اور ایک سال کی عبادت کا ثواب ملے گا (ترمذی)

حضرت اوس بن اوس ثقفی رضی اللہ عنہ سے ہی روایت ہے کہ:

سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ: مَنْ غَسَّلَ یَوْمَ الْجُمُعَةِ وَاغْتَسَلَ، ثُمَّ بَکَّرَ وَابْتَکَرَ، وَمَشٰی وَلَمْ یَرْکَبْ، وَدَنَا مِنَ

---

[1] قال الترمذی: قال محمود: قال وکیع: اغتسل ھو وغسل امرأته، ویروی عن ابن المبارک: أنه قال فی ھذا الحدیث " من غسل واغتسل: یعنی غسل رأسه واغتسل "وفی الباب عن أبی بکر، وعمران بن حصین، وسلمان، وأبی ذر، وأبی سعید، وابن عمر، وأبی أیوب: حدیث أوس بن أوس حدیث حسن، وأبو الأشعث الصنعانی اسمه شراحیل بن آدة.

الْإِمَامِ فَاسْتَمَعَ وَلَمْ يَلْغُ كَانَ لَهُ بِكُلِّ خُطْوَةٍ عَمَلُ سَنَةٍ أَجْرُ صِيَامِهَا وَقِيَامِهَا (سنن ابی داؤد، رقم الحدیث ۳۴۵، کتاب الصلاۃ، ابواب الجمعۃ، باب فی الغسل یوم الجمعۃ، ابن ماجہ، رقم الحدیث ۱۰۸۷، مسند احمد، رقم الحدیث ۱۶۱۷۳) ۱؎

ترجمہ: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ جس نے جمعہ کے دن غسل کرایا، اور غسل کیا، پھر سویرے چلا، اور خطبہ کے شروع میں شریک ہوا، اور پیدل گیا، سوار ہو کر نہیں گیا، اور امام کے قریب رہا، پھر اس نے (خطبہ کو) توجہ سے سنا، اور کوئی لغو حرکت نہیں کی، تو اس کو ہر قدم پر ایک سال (دن بھر) کے روزوں کا اور ایک سال (رات بھر) کی عبادت کا ثواب حاصل ہوگا (ابوداؤد، ابنِ ماجہ، مسند احمد)

حضرت اوس بن اوس ثقفی رضی اللہ عنہ سے ہی روایت ہے کہ:

عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: إِذَا كَانَ يَوْمُ الْجُمُعَةِ فَغَسَلَ أَحَدُكُمْ رَأْسَهُ، وَاغْتَسَلَ، ثُمَّ غَدَا أَوْ اِبْتَكَرَ، ثُمَّ دَنَا فَاسْتَمَعَ، وَأَنْصَتَ، كَانَ لَهُ بِكُلِّ خُطْوَةٍ خَطَاهَا، كَصِيَامِ سَنَةٍ، وَقِيَامِ سَنَةٍ

(مسند احمد، رقم الحدیث ۱۶۱۶۱) ۲؎

ترجمہ: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب جمعہ کا دن ہو، پھر تم میں سے کوئی اپنے سر کو دھوئے، اور غسل کرے، پھر صبح سویرے جمعہ کے لیے جائے، اور خطبہ کے شروع سے شریک ہو، پھر امام کے قریب ہو، پھر توجہ سے سنے، اور خاموش

۱؎ قال شعیب الارنؤوط: إسنادہ صحیح (حاشیۃ ابی داؤد)
وقال ایضاً: إسنادہ صحیح (حاشیۃ ابنِ ماجہ)
وقال ایضاً: إسنادہ صحیح، رجالہ ثقات رجال الصحیح، غیر أن صحابیہ لم یخرج لہ إلا أصحاب السنن (حاشیۃ مسند احمد)

۲؎ قال شعیب الارنؤوط: حدیث صحیح (حاشیۃ مسند احمد)

رہے، تو اسے ہر اٹھنے والے قدم پر ایک سال کے روزوں اور ایک سال کی عبادت کا ثواب ملتا ہے (مسند احمد)

اس طرح کی حدیث اور سندوں سے بھی مروی ہے۔ [1]

جن روایات میں غسل کرانے کا لفظ آیا ہے، اس سے بعض حضرات نے یہ مراد لیا ہے کہ اس نے اپنی بیوی سے صحبت کی، جس کی وجہ سے اس کی بیوی نے بھی غسل کیا، کیونکہ صحبت کرنے کے بعد جمعہ کی نماز ادا کرنے اور دوسرا کوئی نیک عمل کرنے میں نظر اور دل کی پاکیزگی زیادہ حاصل ہوتی ہے۔

اور بعض حضرات نے یہ مراد لیا ہے کہ اس نے غسل کے دوران سر کو اچھی طرح دھویا، یعنی بالوں کو غسل کرایا، جس کا بعض روایات میں ذکر بھی پایا جاتا ہے، کیونکہ سر میں میل کچیل زیادہ جمع رہتا ہے، اس لئے غسل کے ساتھ سر دھونے کا الگ سے ذکر کیا گیا، تاکہ اس کا زیادہ اہتمام کیا جائے۔ [2]

---

[1] يحيى بن شعبة قال :سمعت إسحاق بن عبد الله بن أبي طلحة يحدث عن أبيه، عن جده، قال :قال رسول الله صلى الله عليه وسلم :من غسل واغتسل وغدا وابتكر ودنا من الإمام فأنصت ولم يلغ في يوم الجمعة كتب الله له بكل خطوة خطاها إلى المسجد صيام سنة وقيامها(المعجم الكبير للطبراني، رقم الحديث ٤٧٢٦)

قال الهيثمي: رواه الطبراني في الكبير وفيه إبراهيم بن محمد بن جناح، ولم أجد من ذكره وبقية رجاله ثقات (مجمع الزوائد، تحت رقم الحديث ٣٠٨٨)

[2] من غسل روى مشددا ومخففا قيل أى جامع امرأته قبل الخروج إلى الصلاة لأنه أغض للبصر فى الطريق من غسل امرأته بالتشديد والتخفيف إذا جامعها وقيل أراد غسل غيره لأنه إذا جامعها أحوجها إلى الغسل وقيل أراد غسل الأعضاء للوضوء وقيل غسل رأسه كما فى رواية أبى داود وأفرد بالذكر لما فيه من المؤنة لأجل الشعر أو لأنهم كانوا يجعلون فيه الدهن والخطمى ونحوهما وكانوا يغسلونه أولا ثم يغتسلون واغتسل أى للجمعة وقيل هما بمعنى والتكرار للتأكيد وغدا أى خرج إلى الجمعة أول النهار وابتكر أى أدرك أول الخطبة ودنا أى قرب ولم يلغ لم يتكلم فإن الكلام حال الخطبة لغو أو استمع الخطبة ولم يغيرها صيامها الظاهر أنه بالرفع بدل من العمل (حاشية السندى على سنن النسائى، ج٣ص٩٥، تحت رقم الحديث ١٣٨١، كتاب الجمعة)

قوله (من اغتسل وغسل) روى بالتشديد والتخفيف قيل أراد به غسل رأسه وبقوله اغتسل غسل

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

اس فصل کا خلاصہ

مذکورہ اور اس جیسی احادیث وروایات سے نمازِ جمعہ کی فضیلت واہمیت اور نمازِ جمعہ کو حتی الامکان ترک نہ کرنے کے موضوع پر روشنی پڑتی ہے۔

اس قسم کی احادیث وروایات اور نمازِ جمعہ کی فرضیت وتاکید کی وجہ سے فقہائے کرام رحمہم اللہ نے نمازِ جمعہ کے قائم کرنے کی شرائط میں ممکنہ حد تک نرمی اختیار فرمائی، اور جس مقام میں جمعہ کی نماز قائم کرنے نہ کرنے میں اختلاف اور شک ہو، وہاں بھی احتیاطاً نمازِ جمعہ کو ادا کر لینے اور شک وشبہ دُور کرنے کے لئے بعد میں ''احتیاطُ الظهر'' پڑھ لینے کے عمل کو تجویز کیا۔

نیز نمازِ جمعہ کی عمومی تاکید واہمیت کے دلائل کے پیشِ نظر جمہور فقہائے کرام، شافعیہ، حنابلہ، مالکیہ نے تو گاؤں ودیہات میں بھی چند ہلکی پھلکی شرائط کے ساتھ نمازِ جمعہ کا حکم فرمایا ہے۔

اور حنفیہ، جوکہ جمعہ کی نماز کے حکم کو شہر کے ساتھ خاص رکھتے ہیں، انہوں نے بھی اس حکم میں رفتہ رفتہ نرمی اور سہولت کے پہلو پر عمل درآمد کیا، جس کے نتیجہ میں مخصوص گاؤں اور دیہاتوں میں بھی نمازِ جمعہ کے جواز کا حکم نکل آیا، جس کی تفصیل آگے اپنے اپنے مقامات پر آتی ہے۔

﴿ گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ ﴾

سائر بدنه وقيل جامع زوجته فأوجب عليها الغسل فكأنه غسلها واغتسل وقيل كرر ذلك للتأكيد.
ويرجح التفسير الأول ما في رواية أبي داود في هذا الحديث بلفظ من غسل رأسه واغتسل وما في البخاري عن طاوس قلت لابن عباس ذكروا أن النبي صلى الله عليه وسلم قال اغتسلوا واغسلوا رؤوسكم الحديث (وبكر) بالتشديد على المشهور أي راح في أول الوقت (وابتكر) أي أدرك أول الخطبة ورجحه العراقي وقيل كرره للتأكيد وبه جزم بن العربي.
وقال الجزري في النهاية بكر أتى الصلاة في أول وقتها وكل من أسرع إلى شيء فقد بكر إليه.
وأما ابتكر فمعناه أدرك أول الخطبة وأول كل شيء باكورته وابتكر الرجل إذا أكل باكورة الفواكه وقيل معنى اللفظتين واحد وإنما كرر للمبالغة والتوكيد كما قالوا أجاد مجد انتهى (تحفة الاحوذي، ج٣، ص٣، ابواب الجمعة، باب ما جاء في فضل الغسل يوم الجمعة)

(فصل نمبر 3)

نمازِ جمعہ باجماعت اور شہر وغیرہ میں پڑھنے کا حکم

مذکورہ تفصیل کے بعد اب اس مسئلہ کی تحقیق وتفصیل ذکر کی جاتی ہے، کہ نمازِ جمعہ کا باجماعت پڑھنا اور نمازِ جمعہ میں کتنے افراد کا ہونا اور نمازِ جمعہ کا شہر، یا گاؤں میں ہونا کیا حکم رکھتا ہے، جس سے ان شاء اللہ تعالیٰ گاؤں، دیہات میں نمازِ جمعہ کا حکم معلوم ہو سکے گا۔

اس سلسلے میں فقہائے کرام کے اقوال

جمعہ کی نماز کے لیے جماعت کا ہونا شرط ہے، اور جماعت کے بغیر تنہا کسی شخص کا جمعہ کی نماز پڑھنا درست نہیں ہوتا، اور جمعہ کے معنیٰ میں بھی جماعت کا شرط ہونا پایا جاتا ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جمعہ کی نماز کبھی بھی جماعت کے بغیر ادا فرمانا ثابت نہیں۔[1]

اور جمعہ کی نماز کے لیے حنفیہ کے نزدیک شہر کا ہونا شرط ہے۔

حنفیہ کے علاوہ دیگر جمہور فقہائے کرام یعنی مالکیہ، شافعیہ اور حنابلہ کے نزدیک جمعہ کی نماز قائم کرنے کے لئے اس جگہ کا شہر ہونا شرط نہیں، بلکہ گاؤں اور دیہات میں بھی مخصوص لوگوں کو جمعہ کی نماز پڑھنا جائز اور واجب ہے۔

پہلے یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ آبادیاں مختلف نوعیت کی ہوتی ہیں، بعض بڑی اور بعض چھوٹی، اوران کو عربی زبان میں مختلف ناموں سے تعبیر وموسوم کیا جاتا ہے۔

---

[1] أما بالنسبة لصلاة الجمعة فإن الجماعة شرط فى صحتها، فلا تصح بغير جماعة، وهذا باتفاق الفقهاء (الموسوعة الفقهية الكويتية، ج ٢٧، ص ١٦٧، مادة "صلاة الجماعة")

الثانى :الجماعة:قال فى البدائع :ودليل شرطيتها، أن هذه الصلاة تسمى جمعة، فلا بد من لزوم معنى الجمعة فيها، اعتبارا للمعنى الذى أخذ اللفظ منه . . .ولهذا لم يؤد رسول الله صلى الله عليه وسلم الجمعة إلا جماعة، وعليه إجماع العلماء (الموسوعة الفقهية الكويتية، ج ٢٧، ص ٢٠٢، مادة "صلاة الجمعة")

چنانچہ بعض آبادیوں کو عربی زبان میں ''قریہ'' سے تعبیر کیا جاتا ہے، جس سے مراد عام دیہات اور گاؤں ہوتا ہے (جسے انگریزی زبان میں ''Village'' کہا جاتا ہے) جہاں عدالت، کچہری، پولیس تھانہ اور بازار وغیرہ قائم نہ ہوں۔

اور بعض اوقات قریہ بول کر شہر (یعنی City) بھی مراد لیا جاتا ہے، البتہ بعض حضرات نے فرمایا کہ بعض اوقات قریہ بول کر ایسا شہر مراد لیا جایا کرتا ہے، جو کہ بڑے شہر سے چھوٹا ہو۔[1]

اور عربی زبان میں لغت کے اعتبار سے ''مصر'' عموماً ایسے شہر کو کہا جاتا ہے کہ جہاں مثلاً گلی کوچے اور بازار ہوں، یا وہاں عدالت، کچہری، پولیس تھانہ وغیرہ جیسے ادارے اور محکمے قائم ہوں۔[2]

---

[1] ملحوظ رہے کہ جو آبادی کسی جگہ، جنگل میں، یا شہر و گاؤں کی آبادی سے ہٹ کر چند گھروں پر مشتمل ہوتی ہے، اس کو ''ڈھوک'' یا ''گوٹ'' یا ''چک'' اور پشتو زبان میں ''بانڈہ'' کہا جاتا ہے، یہ آبادی گاؤں کے مفہوم میں داخل نہیں کہلاتی، بلکہ اس سے چھوٹی ہوتی ہے، البتہ بعض اوقات کوئی ڈھوک، یا چک وغیرہ آگے چل کر کسی بڑی آبادی (مثلاً شہر) کا حصہ بن جاتا ہے، اور ایک طرح سے اس کا محلّہ بن جاتا ہے، مگر نام پھر بھی اس کا وہی ڈھوک وغیرہ رہتا ہے۔

القرية فى اللغة :كل مكان اتصلت به الأبنية واتخذ قرارا.

وتطلق القرية على المدن وغيرها، والقريتان المذكورتان فى قوله تعالى (وقالوا لولا نزل هذا القرآن على رجل من القريتين عظيم) هما مكة المكرمة شرفها الله والطائف، كما تطلق على المساكن والأبنية والضياع .

واصطلاحا :عرفها القليوبى من الشافعية بأنها العمارة المجتمعة التى ليس فيها حاكم شرعى ولا شرطى ولا أسواق للمعاملة .

وعرفها الكاسانى من الحنفية بأنها البلدة العظيمة إلا أنها دون المصر(الموسوعة الفقهية الكويتية، ج ٣٣، ص ١٦٠ ، مادة "قرية")

[2] البتہ مصر کے خاص فقہی اصطلاحی معنیٰ میں اقوال مختلف ہیں، جن کا ذکر آگے اپنے مقام پر آتا ہے۔

المصر فى اللغة :اسم لكل بلد محصور أى محدود تقام فيها الدور والأسواق والمدارس وغيرها من المرافق العامة، ويقسم فيها الفىء والصدقات.

واختلفوا فى معناها الاصطلاحى، فعن أبى حنيفة رحمه الله :أن المصر بلدة كبيرة فيها سك وأسواق، ولها رساتيق وفيها وال يقدر على إنصاف المظلوم من الظالم بحشمه وعلمه أو علم غيره، والناس يرجعون فى الحوادث إليه.

قال الكرخى :إن المصر الجامع ما أقيمت فيه الحدود ونفذت فيه الأحكام.

وقال القليوبى :المصر العمارة المجتمعة الذى فيه حاكم شرعى وشرطى وأسواق للمعاملات.

والمصر أعظم من القرية(الموسوعة الفقهية الكويتية، ج ٣٣، ص ١٦١ ، مادة "قرية")

اورعربی زبان میں ''بلد'' ایسی آبادی کو کہا جاتا ہے، جو عام دیہات اور گاؤں سے تو بڑی ہو، لیکن مصر والی نوعیت کے شہر سے چھوٹی ہو، جس کو کہ آج کل قصبہ (اور انگریزی زبان میں Town) اور تحصیل وغیرہ کہا جاتا ہے۔

اور بڑا گاؤں بھی، جس میں بازار وغیرہ ہو، مصر و بلد کا ہی حکم رکھتا ہے۔ [1]

ذیل میں شہر اور گاؤں میں نمازِ جمعہ اور باجماعت نمازِ جمعہ سے متعلق فقہائے کرام کے اقوال کا خلاصہ ذکر کیا جاتا ہے۔

حنفیہ کے موقف کا خلاصہ

جمعہ کی نماز صحیح ہونے کے لئے حنفیہ کے راجح قول کے مطابق جمعہ کی نماز میں امام کے علاوہ کم از کم تین آدمیوں کا جمعہ کے خطبہ کے شروع سے موجود ہونا ضروری ہے، اگرچہ وہ تین آدمی جو خطبے کے وقت تھے اور لوگ ہوں اور نماز کے وقت دوسرے لوگ ہوں، مگر یہ شرط ہے کہ یہ تین آدمی ایسے ہوں، جو امامت کرانے کی اہلیت رکھتے ہوں، یعنی عاقل بالغ مرد ہوں۔

پس اگر یہ افراد صرف عورت، یا نابالغ لڑکے ہوں، تو جمعہ کی نماز صحیح نہ ہوگی، البتہ مسافر ہوں، تو درست ہو جائے گی۔ [2]

---

[1] ب -البلد:

البلد فی اللغة :اسم للمكان المختط المحدود المتأنس باجتماع قطانه وإقامتهم فيه، ويستوطن فيه جماعات ويسمى المكان الواسع من الأرض بلدا.

والبلد أكبر من القرية (الموسوعة الفقهية الكويتية، ج ٣٣، ص ١٦١ ، مادة "قرية")

وعبارة القهستاني تقع فرضا في القصبات والقرى الكبيرة التي فيها أسواق(ردالمحتار، ج ٢ ص ١٣٨ ، كتاب الصلاة ، باب الجمعة)

[2] اگر پہلی رکعت کا پہلا سجدہ کرنے سے پہلے لوگ چلے جائیں اور تین آدمیوں سے کم باقی رہ جائیں، یا کوئی نہ رہے، تو نماز فاسد ہو جائے گی۔ ہاں اگر سجدہ کرنے کے بعد چلے جائیں، تو پھر کچھ حرج نہیں۔

پھر حنفیہ کے نزدیک جمعہ کی نماز صحیح ہونے کے لئے امام کے علاوہ تین افراد کی موجودگی کا قول مشہور اور راجح ہے، جبکہ ایک قول کے مطابق امام کے علاوہ صرف دو افراد کا موجود ہونا کافی ہے۔

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

اور حنفیہ کے نزدیک نمازِ جمعہ واجب ہونے کے لئے مقیم ہونا تو شرط ہے، لیکن استیطان، یعنی وہاں کا مستقل باشندہ ہونا شرط نہیں۔[1]

اور حنفیہ کے نزدیک جمعہ کی نماز صحیح اور واجب ہونے کے لیے یہ شرط ہے کہ جس مقام پر جمعہ کی نماز قائم کی جائے، وہ ''مصر'' یا ''بلد یعنی شہر (City) ہو، جس میں قصبہ کو بھی داخل مانا گیا

﴿ گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ ﴾ الجماعة شرط، لما رواه أبو داود :الجمعة حق واجب على كل مسلم في جماعة .. وانعقد الإجماع على ذلك .وأقل الجماعة عند أبي حنيفة ومحمد في الأصح :ثلاثة رجال سوى الإمام، ولو كانوا مسافرين أو مرضى؛ لأن أقل الجمع الصحيح إنما هو الثلاث، والجماعة شرط مستقل في الجمعة، لقوله تعالى :(فاسعوا إلى ذكر الله) والجمعة مشتقة من الجماعة، ولا بد لهم من مذكر وهو الخطيب .فإن تركوا الإمام أو نفروا بعد التحريمة قبل السجود، فسدت الجمعة، وصليت الظهر .وإن عادوا وأدركوا الإمام راكعاً، أو بقي ثلاثة رجال يصلون مع الإمام .أو نفروا بعد الخطبة وصلى الإمام بآخرين، صحت الجمعة، فوجود الجماعة : شرط انعقاد الأداء ، لا شرط دوام وبقاء إلى آخر الصلاة، ولا يتحقق الأداء إلا بوجود تمام الأركان وهي القيام والقراءة والركوع والسجود، فلو نفروا بعد التحريمة قبل السجود فسدت الجمعة، ويستقبل (يستأنف) لظهر، كما بينا (الفقه الاسلامي وادلتهٔ للزحيلي، ج۲ص۱۲۹۵ و ۱۲۹۶، الباب الثاني ، الفصل العاشر، المبحث الثاني، المطلب الخامس)

ويتعلق ببيان كيفية هذا الشرط ثلاثة أبحاث:

أولها :حضور واحد سوى الإمام -على الصحيح من مذهب الحنفية -وقيل :ثلاثة سوى الإمام، قال في مجمع الأنهر :لأنها أقل الجمع، وقد ورد الخطاب للجمع، وهو قوله تعالى :(فاسعوا إلى ذكر الله فإنه يقتضي ثلاثة سوى الخطيب، هذا مذهب أبي حنيفة ومحمد (الموسوعة الفقهية الكويتية، ج ۲۷، ص ۲۰۲، مادة ''صلاة الجمعة'')

(قوله وأقلها ثلاثة رجال) أطلق فيهم فشمل العبيد والمسافرين والمرضى والأميين والخرسى لصلاحيتهم للإمامة في الجمعة، إما لكل أحد أو لمن هو مثلهم في الأمي والأخرس فصلحا أن يقتديا بمن فوقهما، واحترز بالرجال عن النساء والصبيان فإن الجمعة لا تصح بهم وحدهم لعدم صلاحيتهم للإمامة فيها بحال بحر عن المحيط (قوله ولو غير الثلاثة الذين حضروا الخطبة) أي على رواية اشتراط حضور ثلاثة في الخطبة أما على رواية عدم الاشتراط أصلا أو أنه يكفي حضور واحد فأظهر (قوله سوى الإمام) هذا عند أبي حنيفة ورجح الشارحون دليله واختاره المحبوبي والنسفي كذا في تصحيح الشيخ قاسم (رد المحتار، ج۲، ص ۱۵۱، كتاب الصلاة، باب الجمعة)

[1] قال الحنفية ....تجب الجمعة على من يسكن المصر، أو ما يتصل به، فلا تجب على أهل السواد (القرى) ولو كان قريبا، وتجب الجمعة على مسافر نوى الإقامة لمدة خمسة عشر يوما، وليس الاستيطان (دوام الإقامة) شرطا لوجوب الجمعة (الفقه الإسلامي وأدلته، ج۲،ص۱۲۸۷، القسم الاول،الباب الثاني،الفصل العاشر،المبحث الثاني، المطلب الثالث)

ہے، اور حنفیہ کے نزدیک عام قریہ، یعنی دیہات اور گاؤں (Village) میں جہاں شہر کی تعریف صادق نہ آئے، جمعہ کی نماز کا پڑھنا واجب نہیں ہوتا، اور اگر کوئی پڑھے تو جمعہ کی نماز صحیح اور درست بھی نہیں ہوتی۔ [1]

البتہ جو جگہ شہر (City) کے تابع یا شہر کی "فِناء" یعنی شہر وقصبہ کی ضروریات ومصالح میں داخل ہو، مثلاً شہر وقصبہ کا بس اڈہ، ریلوے اسٹیشن، ائر پورٹ، کھیل کا میدان، عید گاہ، جنازہ گاہ اور گھوڑ دوڑ کی جگہ وغیرہ، تو حنفیہ کے نزدیک ان مقامات کو جمعہ کی نماز قائم ہونے کے اعتبار سے شہر وقصبہ کا حکم حاصل ہوتا ہے، اور اس لیے ان مقامات میں شہر وقصبہ کے اندرونی مقامات کی طرح جمعہ وعیدین کی نماز کا قائم کرنا جائز اور درست ہوتا ہے۔ [2]

---

[1] الشرط الأول :اشترطه الحنفية، وهو أن يكون المكان الذى تقام فيه (مصرا)(الموسوعة الفقهية الكويتية، ج ۲۷، ص ۱۹۶، مادة "صلاة الجمعة")

اختلف الفقهاء فى حكم وجوب الجمعة على أهل القرى فذهب الحنفية إلى أنه لا تجب الجمعة على أهل القرى التى ليست من توابع المصر، ولا يصح أداء الجمعة فيها(الموسوعة الفقهية الكويتية، ج ۳۳، ص ۱۶۱، مادة "قرية")

[2] المصر أو فناء ه شرط جواز الجمعة(ردالمحتار، ج۲ ص ۱۳۹، كتاب الصلاة، باب الجمعة)

وأما الفناء وهو المكان المعد لمصالح البلد كركض الدواب ودفن الموتى وإلقاء التراب، فإن اتصل بالمصر اعتبر مجاوزته وإن انفصل بغلوة أو مزرعة فلا كما يأتى، بخلاف الجمعة فتصح إقامتها فى الفناء ولو منفصلا بمزارع لأن الجمعة من مصالح البلد بخلاف السفر(ردالمحتار، ج۲ ص ۱۲۱، كتاب الصلاة، باب صلاة المسافر)

ويلحق الفناء بالمصر لصحة صلاة الجمعة من مصالح المصر وفناء المصر ملحق بالمصر فيما هو من حوائج المصر وأداء الجمعة منها وقصر الصلاة ليس من حوائج أهل المصر فلا يلحق فناء المصر بالمصر فى حق هذا الحكم أى قصر الصلاة "والفناء المكان المعد لمصالح البلد كركض الدواب ودفن الموتى "وإلقاء التراب(مراقى الفلاح شرح نورالايضاح، ص ۱۶۲، كتاب الصلاة، باب صلاة المسافر)

أما المصر الجامع فشرط وجوب الجمعة وشرط صحة أدائها عند أصحابنا حتى لا تجب الجمعة إلا على أهل المصر ومن كان ساكنا فى توابعه وكذا لا يصح أداء الجمعة إلا فى المصر وتوابعه فلا تجب على أهل القرى التى ليست من توابع المصر ولا يصح أداء الجمعة فيها وقال الشافعى المصر ليس بشرط للوجوب ولا لصحة الأداء فكل قرية يسكنها أربعون رجلا من الأحرار المقيمين لا يظعنون عنها شتاء ولا صيفا تجب عليهم الجمعة ويقام بها الجمعة(بدائع الصنائع، ج ۱ ص ۲۵۹، كتاب الصلاة، فصل بيان شرائط الجمعة)

شافعیہ وحنابلہ کے موقف کا خلاصہ

شافعیہ وحنابلہ کے نزدیک جمعہ کی نماز میں ایسے چالیس افراد کا موجود ہونا ضروری ہے کہ جن پر جمعہ کی نماز واجب ہو۔

اوران حضرات کے نزدیک اگر مطلوبہ افراد مقیم نہ ہوں، بلکہ سب، یا چالیس سے کم افراد مسافر ہوں، توان سے جمعہ کی نماز منعقد نہیں ہوتی۔

اوراگر مقیم تو ہوں، لیکن وہاں کے مستقل باشندے نہ ہوں، بلکہ وہاں عارضی طور پر مقیم ہوں، جیسا کہ چار دن سے زیادہ کے لئے کوئی مسافر مقیم ہو، یا مثلاً وہ لوگ خانہ بدوش ہوں، توان حضرات کے نزدیک ان کے ذریعہ سے جمعہ منعقد نہیں ہوتا۔ [1]

پھر شافعیہ کے نزدیک اگر کوئی جگہ شہر ہو، یا مستقل گاؤں ہو، اوراس میں کم از کم چالیس مرد رہائش پذیر ہوں، جو وہاں کے مستقل باشندے ہوں، تو ایسی صورت میں شافعیہ کے نزدیک یہ گاؤں بھی جمعہ قائم ہونے کے اعتبار سے شہر کا حکم حاصل کر لیتا ہے۔

اوراگر کوئی گاؤں بہت چھوٹا ہو، جس میں مذکورہ تعداد میں لوگ آباد نہ ہوں، اوروہ گاؤں، کسی

---

[1] واشترط الشافعية والحنابلة أن لا يقل المجمعون عن أربعين رجلا تجب في حقهم الجمعة .
قال صاحب المغني :أما الأربعون فالمشهور في المذهب أنه شرط لوجوب الجمعة وصحتها (الموسوعة الفقهية الكويتية، ج ۲۷، ص ۲۰۲، مادة "صلاة الجمعة")

وقال الشافعية والحنابلة :تقام الجمعة بحضور أربعين فأكثر بالإمام من أهل القرية المكلفين الأحرار الذكور المستوطنين، بحيث لا يظعن منه أحدهم شتاء ولاصيفاً إلا لحاجة، ولو كانوا مرضى أو خرساً أو صماً، لا مسافرين، لكن يجوز كون الإمام مسافراً إن زاد العدد عن الأربعين، ولا تنعقد الجمعة بأقل من أربعين (الفقه الاسلامي وادلتهٔ للزحيلي، ج۲ص ۱۲۹۶،القسم الاول، الباب الثاني ، الفصل العاشر، المبحث الثاني، المطلب الخامس)

ولكن (عند الشافعية)لا تنعقد الجمعة بالعدد المطلوب وهوأربعون بالمسافر، بل لا بد من كون الأربعين متوطنين، فالاستيطان شرط الانعقاد لا شرط الوجوب للجمعة.........

ومذهب الحنابلة :تجب الجمعة على مستوطنين ببناء أو ماقاربه من الصحراء (الفقه الاسلامي وادلتهٔ للزحيلي، ج۲،ص۱۲۸۷، القسم الاول،الباب الثاني،الفصل العاشر،المبحث الثاني ، المطلب الخامس)

شہر یا مذکورہ صفت والے گاؤں کے متصل واقع ہو، اور وہاں عام حالات میں شہر، یا دوسرے گاؤں سے جمعہ کی اذان کی آواز پہنچتی ہو، تو شافعیہ کے نزدیک وہاں کے لوگوں کو (خواہ وہ وہاں کے مستقل باشندے ہوں، یا کم از کم چار دن قیام کرنے کی وجہ سے مقیم ہو گئے ہوں، یا خانہ بدوش ہونے کی حیثیت سے مقیم ہوں، ان سب کو) اس قریبی شہر، یا گاؤں میں جا کر جمعہ کی نماز پڑھنا واجب ہو جاتا ہے۔

اگر کسی آبادی و بستی میں نہ تو مذکورہ تعداد میں لوگ آباد ہوں، اور نہ ہی وہاں عام حالات میں شہر، یا مذکورہ صفت والے گاؤں کے جمعہ کی اذان کی آواز پہنچتی ہو، تو پھر شافعیہ کے نزدیک ان پر جمعہ کی نماز واجب نہیں ہوتی، اور نہ ہی ان کو جمعہ کی نماز پڑھنا درست ہوتا ہے۔

لے فأما الشافعية :فاكتفوا باشتراط إقامتها فى خطة أبنية سواء كانت من بلدة أو قرية، قال صاحب المهذب :لا تصح الجمعة إلا فى أبنية يستوطنها من تنعقد بهم الجمعة من بلد أو قرية (الموسوعة الفقهية الكويتية، ج ٢٧، ص ١٩٦، مادة "صلاة الجمعة")

وذهب الشافعية إلى أن أهل القرية إن كان فيهم جمع تصح به الجمعة وجبت عليهم الجمعة لأن القرية فى هذه الحالة كالمدينة، وكذا إن بلغهم صوت من مؤذن يؤذن فى البلدة المجاورة بصورة عادية فى الأوقات الهادئة لقول النبى صلى الله عليه وسلم :الجمعة على من سمع النداء .

ولو سمع أهل القرية النداء من بلدين مجاورين فعليهم حضور الأكثر جماعة فإن استويا فمراعاة الأقرب أولى كنظيره فى الجماعة، وقيل :الأولى مراعاة الأبعد لكثرة الأجر بسبب المشى الزائد.

أما إذا لم يوجد فى القرية الجمع المذكور ولم يبلغهم نداء الأذان من بلد مجاور فلا جمعة عليهم، قالوا :حتى لو كانت قريتان أو قرى متقاربة يبلغ بعضها نداء بعض، وكل واحدة منها ينقص أهلها عن أربعين لم تجب الجمعة عليهم ولم تصح منهم باجتماعهم فى إحدى قراهم؛ لأنهم غير متوطنين فى محل الجمعة (الموسوعة الفقهية الكويتية، ج ٣٣، ص ١٢٢ ، مادة "قرية")

وقال الشافعية :تجب الجمعة على المقيم فى بلد، مصر أو قرية، سمع النداء أو لم يسمعه، وعلى من فى خارجه إن سمع النداء ، لقوله صلّى الله عليه وسلم :الجمعة على من سمع النداء فلا جمعة على الحصادين، إلا إذا سمعوا النداء .والاعتبار فى سماع النداء :أن يقف المؤذن فى طرف البلد، والأصوات هادئة، والريح ساكنة، وهو مستمع، فإذا سمع النداء لزمه، وإن لم يسمع لم يلزمه.

وتجب الجمعة على مسافر نوى الإقامة أربعة أيام، أو سافر يوم الجمعة بعد فجر يومها، فإن سافر قبل الفجر فلا جمعة عليه، ولكن لا تنعقد الجمعة بالعدد المطلوب وهوأربعون بالمسافر، بل لا بد من كون الأربعين متوطنين، فالاستيطان شرط الانعقاد لا شرط الوجوب للجمعة، كما أن شرط صحة الجمعة هو وقوعها فى بناء لا صحراء (الفقه الاسلامى وادلتهٔ للزحيلى، ج٢ص١٢٨٧ ،القسم الاول، الباب الثانى ، الفصل العاشر، المبحث الثانى، المطلب الثالث)

اور حنابلہ کے نزدیک شہر میں اور گاؤں کے قریب جنگل میں بھی جمعہ کی نماز قائم کرنا جائز ہے، اور اگر کوئی ایسی جگہ موجود ہو، اور وہ مقیم ہو، تو اس پر نمازِ جمعہ واجب بھی ہے۔ [1]

پھر حنابلہ کے نزدیک آبادی کے قریب اور دور ہونے کا دارومدار عرف پر ہے، یعنی عرف میں جو لوگ آبادی سے دور سمجھے جاتے ہوں، وہ دور شمار ہوں گے، اور جو قریب سمجھے جاتے ہوں، وہ قریب شمار ہوں گے۔ [2]

اگر کچھ لوگ ایسی جگہ رہائش پذیر ہوں کہ ان کے اور شہر وغیرہ کے درمیان ایک فرسخ (یعنی تین میل) سے زیادہ کا فاصلہ ہو، تو حنابلہ کے نزدیک ایسی صورت میں ان لوگوں کی حالت اپنی ذات میں معتبر سمجھی جاتی ہے، پس وہ اگر کم از کم چالیس افراد ہوں، اور وہ جمعہ کے اہل ہوں، مثلاً مسافر نہ ہوں اور وہاں کے مستقل باشندے ہوں، تو ان پر جمعہ کی نماز واجب ہوتی ہے، لیکن ان کو اختیار ہوتا ہے کہ وہ خود اپنے گاؤں وبستی میں جمعہ قائم کریں، یا شہر وغیرہ میں

---

[1] وأما الحنابلة :فلم يشترطوا ذلک أيضا، وصححوا إقامتها فی الصحاری، وبين مضارب الخيام .قال صاحب المغنی :ولا يشترط لصحة الجمعة إقامتها فی البنيان ويجوز إقامتها فيما قاربه من الصحراء (الموسوعة الفقهية الكويتية، ج ۲۷، ص ۱۹۶، مادة "صلاة الجمعة")

فصل :ولا يشترط لصحة الجمعة إقامتها فی البنيان، ويجوز إقامتها فيما قاربه من الصحراء .وبهذا قال أبو حنيفة وقال الشافعی :لا تجوز فی غير البنيان؛ لأنه موضع يجوز لأهل المصر قصر الصلاة فيه، فأشبه البعيد.

ولنا، أن مصعب بن عمير جمع بالأنصار فی هزم النبيت فی نقيع الخضمات، والنقيع :بطن من الأرض يستنقع فيه الماء مدة، فإذا نضب الماء نبت الكلأ.

ولأنه موضع لصلاة العيد، فجازت فيه الجمعة، كالجامع، ولأن الجمعة صلاة عيد، فجازت فی المصلی كصلاة الأضحی، ولأن الأصل عدم اشتراط ذلک، ولا نص فی اشتراطه، ولا معنى نص، فلا يشترط(المغنی لابنِ قدامة، ج۲ص ۲۴۶، كتاب صلاة الجمعة، فصل لا يشترط للجمعة المصر)

[2] (وتصح) الجمعة (فيما قارب البنيان من الصحراء) ولو بلا عذر، فلا يشترط لها البنيان، لصلاة أسعد بن زرارة فی نقيع الخضمات، وهو على ميل من المدينة، لكن قال ابن عقيل إذا صلى بالصحراء استخلف من يصلی بالضعفة.

و (لا) تصح الجمعة (فيما بعد) عن البنيان، (ويتجه :عرفا) ، قال فی "المبدع "لشبههم حينئذ بالمسافرين، وهو متجه(مطالب اولی النهیٰ فی شرح غاية المنتهیٰ، ج ۱ ص ۷۶۴، كتاب الصلاة، باب صلاة الجمعة ، فصل شروط صحة الجمعة)

جا کر جمعہ کی نماز ادا کریں، البتہ انہیں اپنے گاؤں وبستی میں جمعہ کی نماز قائم کرنا زیادہ فضیلت کا باعث ہے، تاکہ وہاں کے سب لوگوں کو جمعہ میں شرکت کرنا آسان ہو۔

اگر وہ لوگ جمعہ کے اہل نہ ہوں، مثلاً چالیس افراد سے کم ہوں، یا مسافر ہوں، تو ان کو شہر وغیرہ میں جمعہ کی نماز کے لیے جانے، یا اپنے مقام پر رہتے ہوئے ظہر پڑھنے، ان دونوں میں سے ہر ایک کا اختیار حاصل ہوتا ہے۔

اور اگر اس گاؤں اور شہر کے درمیان ایک فرسخ (یعنی تین میل) یا اس سے کم کا فاصلہ ہو، اور ان لوگوں کی تعداد ایسے چالیس افراد سے کم ہو کہ جو جمعہ کے اہل ہوں، تو ان پر شہر وغیرہ میں جا کر جمعہ پڑھنا واجب ہو جاتا ہے۔

لے أما الحنابلة فذهبوا إلى أن أهل القرية لا يخلون من حالين :إما أن يكون بينهم وبين المصر أكثر من فرسخ أو لا؟ فإن كان بينهم وبين المصر أكثر من فرسخ لم يجب عليهم السعى إلى المصر، وحالهم معتبر بأنفسهم فإن كانوا أربعين واجتمعت فيهم شرائط الجمعة، فعليهم إقامة الجمعة وهم مخيرون بين السعى إلى المصر وبين إقامتها فى قريتهم، والأفضل إقامتها فى قريتهم لأنه إذا سعى بعضهم أخل على الباقين الجمعة، وإذا أقاموها فى قريتهم حضرها جميعهم؛ ولأن إقامتها بموضعهم تكثير لجماعات المسلمين.

وإن كانوا ممن لا تجب عليهم الجمعة بأنفسهم فهم مخيرون بين السعى إليها وبين أن يصلوا ظهرا، والأفضل السعى إليها لينالوا فضل الساعى إلى الجمعة ويخرجوا من الخلاف.

والحال الثانى :أن يكون بين قريتهم وبين المصر فرسخ فما دون فينظر فيهم فإن كانوا أقل من أربعين -من أهل الجمعة -فعليهم السعى إلى الجمعة لقوله تعالى (يا أيها الذين آمنوا إذا نودى للصلاة من يوم الجمعة فاسعوا إلى ذكر الله)الآية.

وإن كانوا ممن تجب عليهم الجمعة بأنفسهم وكان موضع الجمعة القريب منهم قرية أخرى لم يلزمهم السعى إليها وصلوا فى مكانهم إذ ليست إحدى القريتين بأولى من الأخرى، وإن أحبوا السعى إليها جاز ولكن الأفضل أن يصلوا فى مكانهم، فإن سعى بعضهم فنقص عدد الباقين لزمهم السعى لئلا يؤدى ذلك إلى ترك الجمعة.

وإن كان موضع الجمعة القريب مصرا فهم مخيرون أيضا بين السعى إلى المصر وبين إقامة الجمعة فى قريتهم.

وعن أحمد أن السعى إلى المصر يلزمهم إلا أن يكون لهم عذر فيصلوا جمعة فى قريتهم، والأول أصح لأن أهل القرى يقيمون الجمع فى بلاد الإسلام وإن كانوا قريبين من المصر من غير نكير.

وإذا كان أهل المصر دون الأربعين فجاء هم أهل القرية فأقاموا الجمعة فى المصر لم يصح؛ لأن

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

مالکیہ کے موقف کا خلاصہ

مالکیہ کے نزدیک جمعہ کی اہلیت رکھنے والے اور وہاں کے مستقل باشندوں کی شکل میں کم از کم بارہ افراد کی موجودگی ضروری ہے، اگر ان بارہ افراد میں کوئی ایک مسافر، یا خانہ بدوش ہو، تو ان کے نزدیک جمعہ منعقد نہیں ہوتا، اگرچہ ان لوگوں کی دوسرے مستقل باشندوں کے ساتھ جمعہ میں شرکت درست ہوجاتی ہے۔

لیکن اس پر شافعیہ، حنابلہ و مالکیہ سب کا اتفاق ہے کہ اگر کوئی مسافر کسی ایسی جگہ چار دن سے زیادہ کا قیام کرے کہ وہاں کے باشندوں پر جمعہ کی نماز واجب ہوتی ہے (جس کی تفصیل آگے آتی ہے) تو اس پر جمعہ کی نماز کا پڑھنا واجب ہوجائے گا، کیونکہ وہ اب ان کے نزدیک مسافر نہیں رہا، بلکہ مقیم ہوگیا۔ [1]

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

أهل القرية غير مستوطنين فى المصر وأهل المصر لا تنعقد بهم الجمعة لقلتهم.

وإن كان أهل القرية ممن تجب عليهم الجمعة بأنفسهم لزم أهل المصر السعى إليهم، إذا كان بينهم أقل من فرسخ كما يلزم أهل القرية السعى إلى المصر إذا أقيمت به، وكان أهل القرية أقل من أربعين.

أما إن كان فى كل واحد من المصر والقرية دون الأربعين لم تجز إقامة الجمعة فى واحد منهما (الموسوعة الفقهية الكويتية، ج ٣٣، ص ١٦٢ الٰى ١٦٤ ، مادة "قرية")

[1] یہ بات ملحوظ رہے کہ حنفیہ کے نزدیک کسی جگہ مسافر کے پندرہ دن قیام کی نیت کرنے سے، انسان مقیم ہوتا ہے، جبکہ دیگر جمہور فقہائے کرام کے نزدیک صرف چار دن، یا اس سے زیادہ کے قیام سے مقیم ہوجاتا ہے، جس کی تفصیل ہم نے اپنی دوسری تالیفات ومضامین میں ذکر کردی ہے۔ محمد رضوان

وقال المالكية :يشترط حضور اثنى عشر رجلاً للصلاة والخطبة، لما روى عن جابر أن النبى صلّى الله عليه وسلم كان يخطب قائماً يوم الجمعة، فجاء ت عِير (إبل تحمل التجارة) من الشام، فانفتل الناس إليها، حتى لم يبق إلا اثنا عشر رجلاً، فأنزلت هذه الآية التى فى الجمعة :(وإذا رأ وا تجارة أو لهواً، انفضوا إليها، وتركوك قائماً)

ويشترط لهذا الشرط شرطان أيضاً:

الأول ــ أن يكون العدد من أهل البلد، فلا تصح من المقيمين به لنحو تجارة، إذا لم يحضرها العدد المذكور من المستوطنين بالبلد.

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

اور مالکیہ کے نزدیک بھی شافعیہ وحنابلہ کی طرح جمعہ کی نماز شہر اور گاؤں میں قائم کرنا درست ہے، بشرطیکہ وہاں لوگ مستقل وطن بنا کر رہتے ہوں، اور جو مقام مستقل آبادی نہ ہو، بلکہ عارضی خیموں وغیرہ کی شکل میں قائم ہو، مثلاً خیمہ بستی، تو اس میں جمعہ کی نماز قائم کرنا جائز نہیں۔

مالکیہ کے نزدیک گاؤں والوں پر نمازِ جمعہ واجب ہونے کے لیے گاؤں میں لوگوں کی مخصوص تعداد کا آباد ہونا شرط نہیں، البتہ مالکیہ کے نزدیک یہ شرط ہے کہ وہاں اتنے لوگ رہائش پذیر ہوں کہ جتنے لوگوں کی وجہ سے کسی جگہ کو گاؤں، یا دیہات سمجھا جاتا ہے، اور وہ لوگ اپنی دفاعی حفاظت کے ساتھ وہاں رہائش رکھتے ہوں، نیز مالکیہ کے نزدیک اگر وہاں صرف تین اور چار افراد ہوں، تو ان پر جمعہ واجب نہیں ہوتا، اور چالیس افراد سے کم کی صورت میں جمعہ منعقد ہو جاتا ہے، اور بعض مالکیہ کا کہنا یہ ہے کہ جس گاؤں یا دیہات میں کم از کم چالیس مرد ہوں، اور وہ جمعہ قائم کریں، تو بہت اچھا ہے، اور اگر بارہ افراد بھی جمعہ کی نماز میں شریک ہوں، تب بھی جمعہ کی نماز جائز ہو جاتی ہے، کیونکہ ان کے نزدیک اس آبادی کے کم از کم بارہ

﴿ گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ ﴾

الثـانـي ـ أن يكونوا باقين مع الإمام من أول الخطبة حتى السلام من صلاتها، فلو فسدت صلاة واحد مـنهـم، ولـو بـعـد سـلام الإمـام، بـطـلـت الجمعة، أي أن بقاء الجماعة إلى كمال الصلاة شرط على الـمشهـور(الـفقه الاسلامي وادلتهٔ للزحيلي، ج۲ص ۱۲۹۶، الـقسـم الاول، الباب الثاني، الفصل العاشر، المبحث الثاني، المطلب الخامس)

وقال المالكية :تـجـب الـجـمعة على مسافر نوى الإقامة أربعة أيام صحاح فأكثر، وإن لم تنعقد به. وتـجـب الـجـمـعة على مقيم ببلد الجمعة، وعلى المقيم بقرية أو خيمة بعيدة عن بلد الجمعة بنحو فرسخ أو ثلاثة أميال وثلث، لا أكثر، وتقدر المسافة من المنارة التي في طرف البلد .ولا يشترط في بـلـد الـجـمعة أن يكون مصرا، فتصح في القرية، وفي الأخصاص (وهي بيوت الجريد أو القصب)، ولا تـصـح ولا تـجـب فـي بيـوت الشـعـر؛ لأن الغالب عليهم الارتحال، إلا إذا كانوا قريبين من بلد الـجمعة، كما لا تصح ولا تجب على من أقام مؤقتا في مكان ولو لشهر مثلاً، إذ لا بد من الاستيطان: وهـو الإقـامة في بلد على التأبيد(الـفقه الاسلامي وادلتهٔ للزحيلي ،ج۲،ص۱۲۸۷، القسم الاول، الباب الثاني،الفصل العاشر،المبحث الثاني ، المطلب الثالث)

12 ایسے افراد کی شرکت ضروری قرار دی گئی ہے، جو وہاں کے مستقل باشندے ہوں۔ ل

ل وأما المالكية :فإنـما شرطوا أن تقام فی مكان صالح للاستيطان .فتصح إقامتها فی الأبنية، أو الأخـصـاص؛ لصلاحها للاستيطان فيها مدة طويلة .ولا تـصح فی الخيم لعدم صلاحيتها لذلک فی الغالب.

قال فی الجواهر الزكية فی تعداد شروطها :مـوضع الاستيطان، ولو كان بأخصاص لا خيم، فلا تقام الـجـمعة إلا فـی موضع يستوطن فيه بأن يقيم فيه صيفا وشتاء (الموسوعة الفقهية الكويتية، ج ۲۷، ص ۱۹۶ ، مادة ”صلاة الجمعة“)

وذهب المالكية إلی وجوب الجمعة علی أهل القرية بشرط أن يوجد فيها عدد تتقری بهم القرية من أهـل الـجـمـعة، يمكنهم الإقامة آمنين مستغنين عن غيرهم فی الدفاع عن أنفسهم وعن قريتهم، ولم يحددوا ذلک بعدد معين بل قالوا :إن ذلک العدد يختلف بالنسبة إلی الجهات والأوطان فی كثرة الأمـن والـخـوف، فـفـی الـجهـات الآمـنة تتـقـری القرية بالنفر اليسير بخلاف غيرها مما يتوقع فيه الـخـوف، إلا أنهـم اتـفـقـوا فی المذهب علی أنها لا تجب علی الثلاثة والأربعة وعلی أنها تنعقد بما دون الأربـعيـن، قال المواق بعدما استعرض أقوال علماء المالكية فی عدد الذين تتقری بهم القرية : وقـد حـصل من هذا صحة ما صدرت منی بها فتيا وهی :أن مـن شرط إقامة الجمعة أن تكون القرية بهـا ثلاثون رجلا فإن حضروا فبها ونعمت، وإلا صلوا ظهرا فإن صلوا جمعة أجزأتهم، إن كانوا اثنی عشـر رجـلا فـأكثـر، فأجزت الصلاة مراعاة لقول ابن العربی وغيره -فـی هذا المجال(الموسوعة الفقهية الكويتية، ج ۳۳، ص ۱۶۲ ، مادة ”قرية“)

وقـال الـمالكية :كـونهـا فـی مـوضـع الاستيـطـان، وهـو إمـا بلد أو قرية، مبنية بأحجار ونحوها، أو بـأخـصـاص مـن قـصب أو أعواد شجر، لا خيم من شعر أو قماش؛ لأن الغالب علی أهلها الارتحال، فـأشبهوا المسافرين .وهـذا شـرط صـحة ووجوب عند المالكية؛ لأن الصحيح عندهم أن الشروط الأربـعة وهی الإمام والجماعة والمسجد وموضع الاستيطان هی شروط وجوب وصحة معاً، ولا بد أن تستـغـنـی القرية بأهلها عادة، بالأمن علی أنفسهم، والاكتفاء فی معاشهم عن غيرهم .ولا يحدون بـحـد كـمـئة أو أقل أو أكثر (الفقه الاسلامی وادلتهٔ للزحيلی، ج۲ص ۱۲۹۴، القسم الاول، الباب الثانی ، الفصل العاشر، المبحث الثانی، المطلب الخامس)

وقال المالكية :يشتـرط حـضور اثنی عشر رجلا للصلاة والخطبة، لما روی عن جابر أن النبی صلی الـله عليه وسلم كان يخطب قائما يوم الجمعة، فجاء ت عير (إبل تحمل التجارة) من الشام، فانفتل الـناس إليها، حتی لم يبق إلا اثنا عشر رجلا، فأنزلت هذه الآية التی فی الجمعة :(وإذا رأوا تجارة أو لهوا، انفضوا إليها، وتركوک قائما)

ويشترط لهذا الشرط شرطان أيضا:

الأول ـ أن يـكون العدد من أهل البلد، فلا تصح من المقيمين به لنحو تجارة، إذا لم يحضرها العدد المذكور من المستوطنين بالبلد.

الثـانـی ـ أن يكونوا باقين مع الإمام من أول الخطبة حتی السلام من صلاتها، فلو فسدت صلاة واحد مـنهـم، ولـو بـعـد سـلام الإمـام، بـطـلت الجمعة، أی أن بقاء الجماعة إلی كمال الصلاة شرط علی الـمشهـور(الـفـقـه الاسـلامـی وادلتهٔ، ج۲ص ۱۲۹۶، القسم الاول، الباب الثانی ، الفصل العاشر، المبحث الثانی، المطلب الخامس)

مذکورہ تفصیل سے معلوم ہوا کہ گاؤں، دیہات میں جمعہ کی نماز کو ائمۂ اربعہ میں سے صرف حنفیہ ناجائز قرار دیتے ہیں، اور باقی جمہور فقہائے کرام، یعنی مالکیہ، شافعیہ وحنابلہ ہلکی پھلکی قید کے ساتھ جائز قرار دیتے ہیں۔ [1]

---

[1] (ولا تصح الجمعة إلا فی أبنية يستوطنها من تنعقد بهم الجمعة من بلد أو قرية لانه لم تقم الجمعة فی عهد رسول الله صلى الله عليه وسلم ولا فی أيام الخلفاء الا فی بلد أو قرية ولم ينقل أنها أقيمت فی بدو فان خرج أهل البلد إلى خارج البلد فصلوا الجمعة لم يجز لانه ليس بوطن فلم تصح فيه الجمعة كالبدو وإن انهدم البلد فاقام أهله على عمارته فحضرت الجمعة لزمهم إقامتها لانهم فی موضع الاستيطان.

(الشرح) قال أصحابنا يشترط لصحة الجمعة أن تقام فی أبينة مجتمعة يستوطنها شتاء ا وصيفا من تنعقد بهم الجمعة قال الشافعي والأصحاب سواء كان البناء من أحجار أو أخشاب أو طين أو قصب أو سعف أو غيرها وسواء فيه البلاد الكبار ذوات الأسواق والقرى الصغار والأسراب المتخذة وطنا فإن كانت الأبنية متفرقة لم تصح الجمعة فيها بلا خلاف لأنها لا تعد قرية ويرجع فی الاجتماع والتفرق إلى العرف وقد أهمل المصنف اشتراط كونها مجتمعة مع أنه ذكره فی التنبيه واتفقوا عليه(المجموع شرح المهذب، ج۴، ص ۵۰۱، كتاب الصلاة ،باب صلاة الجمعة)

(مسألة إذا لم يكن فی القرية أربعون رجلا عقلاء لم تجب عليهم الجمعة)

مسألة :قال :(وإذا لم يكن فی القرية أربعون رجلا عقلاء ، لم تجب عليهم الجمعة) وجملته أن الجمعة إنما تجب بسبعة شرائط :إحداها، أن تكون فی قرية .والثانی، أن يكونوا أربعين .والثالث، الذكورية .والرابع، البلوغ .والخامس، العقل .والسادس، الإسلام .والسابع، الاستيطان.

وهذا قول أكثر أهل العلم، فأما القرية فيعتبر أن تكون مبنية بما جرت العادة ببنائها به، من حجر أو طين أو لبن أو قصب أو شجر ونحوه، فأما أهل الخيام وبيوت الشعر والحركات فلا جمعة عليهم، ولا تصح منهم؛ لأن ذلك لا ينصب للاستيطان غالبا، وكذلك كانت قبائل العرب حول المدينة، فلم يقيموا جمعة، ولا أمرهم بها النبی -صلى الله عليه وسلم -ولو كان ذلك لم يخف، ولم يترك نقله، مع كثرته وعموم البلوى به، لكن إن كانوا مقيمين بموضع يسمعون النداء ، لزمهم السعی إليها، كأهل القرية الصغيرة إلى جانب المصر.ذكره القاضی ويشترط فی القرية أيضا أن تكون مجتمعة البناء بما جرت العادة فی القرية الواحدة، فإن كانت متفرقة المنازل تفرقا لم تجر العادة به، لم تجب عليهم الجمعة، إلا أن يجتمع منها ما يسكنه أربعون، فتجب الجمعة بهم، ويتبعهم الباقون ولا يشترط اتصال البنيان بعضه ببعض، وحكی عن الشافعی أنه شرط، ولا يصح؛ لأن القرية المتقاربة البنيان قرية مبنية على ما جرت به عادة القرى، فأشبهت المتصلة، ومتى كانت القرية لا تجب الجمعة على أهلها بأنفسهم، وكانوا بحيث يسمعون النداء من مصر، أو من قرية تقام فيها الجمعة، لزمهم السعی إليها، لعموم الآية(المغنی لابن قدامة، ج۲، ص ۲۴۲، ۲۴۳، كتاب صلاة الجمعة)

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

لہٰذا بعض حضرات کی طرف سے گاؤں میں جمعہ کی نماز پڑھنے کے خلاف اتنا سخت حکم لگانا کہ ایسے لوگوں کو فاسق وفاجر اور فرائض کا تارِک اور محرّمات کا مُرتکب قرار دینا، معتدل طریقہ نہیں، اس طرح کے طرزِ عمل سے اجتناب کرنا چاہئے، کیونکہ مجتہَد فیہ اُمور میں اس طرح نکیر وانکار سے فقہائے کرام نے منع فرمایا ہے، البتہ علمی وفقہی دلائل سے اپنے موقف کا معتدل طریقہ پر اظہار کرنے میں حرج نہیں۔

ظاہر ہے کہ اگر گاؤں میں جمعہ کی نماز کے جواز کی کسی طرح گنجائش نہ ہوتی، اور اس کے دلائل یکطرفہ ہوتے، تو جمہور فقہائے کرام، اس کی خلاف ورزی کے مرتکب نہ ہوتے۔

لہٰذا اس مسئلہ میں زیادہ سختی وتشدد کر کے بحالاتِ موجودہ ہر قسم کے گاؤں، دیہات میں نمازِ جمعہ کے ناجائز ہونے پر اصرار کرنا اور کسی قول، یا فقہی مذہب کے مطابق گنجائش نہ دینا، مناسب طریقہ معلوم نہیں ہوتا۔

﴿ گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ ﴾

وقال مالک فی القرية المجتمعة التی قد اتصلت دورها كان عليها وال أو لم يكن، قال :أرى أن يجمعوا الجمعة.

قلت :فهل حد مالک فی عظم القرية حدا؟

قال لا، إنه قال :مثل المناهل التی بين مكة والمدينة مثل الروحاء وأشباهها .قال :وقد سمعته غير مرة يقول فی القرى المتصلة البنيان التی يكون فيها الأسواق يجمع أهلها، وقد سمعته غير مرة يقول فی القرية المتصلة البنيان يجمع أهلها ولم يذكر الأسواق .قال :وقد سأله أهل المغرب عن الخصوص المتصلة وهم جماعة واتصال تلک الخصوص كاتصال البيوت، وقالوا ليس لنا وال؟

قال :يجمعون الجمعة وإن لم يكن لهم وال.

قال :وقال مالک فی أهل مصر أو قرية يجمع فی مثلها الجامع مات واليهم ولم يستخلف فبقی القوم بلا إمام؟

قال :إذا حضرت صلاة الجمعة قدموا رجلا منهم فخطب بهم وصلى الجمعة.

قال مالک :وكذلک القرى التی ينبغی لأهلها أن يجمعوا فيها الجمعة لا يكون عليهم وال، فإنه ينبغی لهم أن يقوموا رجلا فيصلی بهم الجمعة يخطب ويصلی .وقال مالک :إن لله فرائض فی أرضه لا ينقصها شیء إن وليها وال أو لم يلها نحوا من هذا يريد الجمعة(المدونة،لمالک بن أنس،ج ١،ص ٢٣٣،كتاب الصلاة الثانی،من تجب عليه الجمعة)

اس سلسلے میں فقہائے کرام کے دلائل پر ایک نظر

اس کے بعد چند ایسے دلائل ذکر کیے جاتے ہیں، جن سے فقہاء وعلماء نے اپنے اپنے طور پر شہر، یا گاؤں وغیرہ میں جمعہ کی نماز کے جائز و ناجائز اور اور واجب ہونے نہ ہونے پر استدلال کیا ہے، اوران سے واضح ہوتا ہے کہ جس طرح گاؤں میں جمعہ کے جائز نہ ہونے پر حنفیہ کے دلائل ہیں، اسی طرح حنفیہ کے مقابلے میں جمہور فقہائے کرام کے بھی دلائل ہیں، اوران کا قول بھی دلائل کی رُو سے بے وقعت شمار نہیں ہوتا، اور کم حیثیت نہیں رکھتا۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ. ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (سورة الجمعة، رقم الآية ۹)

ترجمہ: اے ایمان والو! جب ندا (یعنی اذان) دی جائے نماز کے لئے یومِ جمعہ کی، تو سعی کرو تم اللہ کے ذکر کی طرف، اور چھوڑ دو تم بیع کو، یہ بہتر ہے تمہارے لئے، اگر تم جانتے ہو (سورہ جمعہ)

اس آیت سے جمعہ کی نماز کی فرضیت اور وجوب کا حکم ثابت ہے، لیکن اس آیت میں شہر وغیرہ کی کسی قید کا ذکر نہیں، جس سے استدلال کرتے ہوئے، بہت سے فقہاء وعلماء نے فرمایا کہ جمعہ کی نماز جس طرح شہر والوں پر واجب ہے، اسی طرح گاؤں والوں پر بھی واجب ہے۔[1] جبکہ بعض حنفی علمائے کرام نے فرمایا کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے خرید وفروخت چھوڑنے کا جو ذکر فرمایا ہے، اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ جمعہ ہر جگہ نہیں ہوتا، بلکہ وہاں ہوتا ہے

---

[1] ولنا، قول الله تعالى :(إذا نودى للصلاة من يوم الجمعة فاسعوا إلى ذكر الله)وهذا يتناول غير أهل المصر إذا سمعوا النداء، وحديث عبد الله بن عمرو، ولأن غير أهل المصر يسمعون النداء، وهم من أهل الجمعة، فلزمهم السعي إليها، كأهل المصر (المغنى لابن قدامة، ج۲، ص۲۶۷، كتاب صلاة الجمعة، مسألة تجب الجمعة على من بينه وبين الجامع فرسخ)

جہاں کے لوگ عموماً تجارت اور خرید وفروخت میں مشغول رہتے ہوں، اور یہ بات شہر میں ہوتی ہے، دیہات کے لوگ عموماً کھیتی وغیرہ میں مشغول ہوتے ہیں، تجارت اور خرید و فروخت کے لئے گاؤں والے عموماً شہر میں آ کر اپنی ضرورت پوری کرتے ہیں، لہٰذا اس سے شہر میں ہی جمعہ کا ہونا معلوم ہوتا ہے۔ [1]

لیکن دوسرے حضرات کا فرمانا یہ ہے کہ اس سے گاؤں میں خرید وفروخت کے عمل کا غیر موجود ہونا لازم نہیں آتا، کیونکہ گاؤں، دیہات میں بھی اپنی اپنی حیثیت کے مطابق خرید وفروخت ہوتی ہے، ورنہ مختلف اوقات میں وہاں اشیائے ضرورت، فروخت کرنے والے لوگوں کی آمد ورفت ہوتی ہے، جیسا کہ مذکورہ آیت کے مابعد کی آیت کے شانِ نزول کے موقع پر تاجروں کا قافلہ باہر سے ہی آیا تھا۔

لہٰذا محض اس چیز کو گاؤں، دیہات میں نمازِ جمعہ کی ممانعت کا یقینی مستدل نہیں سمجھا جا سکتا۔ [2]

حضرت طارق بن شہاب سے روایت ہے کہ:

عَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ، أَنَّ رَجُلًا، مِّنَ الْيَهُوْدِ قَالَ لَهُ: يَا أَمِيْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ، آيَةٌ فِيْ كِتَابِكُمْ تَقْرَءُوْنَهَا، لَوْ عَلَيْنَا مَعْشَرِ الْيَهُوْدِ نَزَلَتْ، لَاتَّخَذْنَا ذٰلِكَ الْيَوْمَ عِيْدًا قَالَ: أَيُّ آيَةٍ؟ قَالَ : اَلْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِيْنًا. قَالَ عُمَرُ: قَدْ عَرَفْنَا ذٰلِكَ الْيَوْمَ، وَالْمَكَانَ الَّذِيْ نَزَلَتْ فِيْهِ عَلَى النَّبِيِّ

---

[1] ففی هذه الآیة ایماء علی ان اقامة الجمعة مختصة بمحل التجارة وهو المصر الجامع ولهذا لا تجوز فی الصحاری والبوادی ومناهل الاعراب بالاجماع (التعلیق الصبیح علٰی مشکاة المصابیح للکاندهلوی، جلد ۲ صفحه ۱۳۸، کتاب الصلاة، باب وجوب الجمعة، الفصل الثانی)

[2] عن سالم بن أبی الجعد، قال :حدثنا جابر بن عبد الله، قال " :بینما نحن نصلی مع النبی صلی الله علیه وسلم إذ أقبلت عیر تحمل طعاما، فالتفتوا إلیها حتی ما بقی مع النبی صلی الله علیه وسلم إلا اثنا عشر رجلا، فنزلت هذه الآیة :(وإذا رأوا تجارة أو لهوا انفضوا إلیها وترکوک قائما(صحیح البخاری، رقم الحدیث ۹۳۶)

صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، وَهُوَ قَائِمٌ بِعَرَفَةَ يَوْمَ جُمُعَةٍ (صحيح البخاری، رقم الحديث ۴۵، كتاب الايمان، باب زيادة الإيمان ونقصانه)

ترجمہ: حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے ایک یہودی آدمی نے کہا کہ اے امیرُ المومنین! تم اپنی کتاب (یعنی قرآن مجید) میں ایک آیت کو پڑھتے ہو، مگر وہ ہمارے یہودیوں کے گروہ پر نازل ہوتی، تو ہم اس دن کو عید قرار دے دیتے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ وہ کون سی آیت ہے؟ تو اس آدمی نے کہا کہ (سورۂ مائدہ کی) یہ آیت ہے کہ:

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا.

’’آج کے دن مکمل کر دیا میں نے تمہارے لیے تمہارے دین کو، اور تمام کر دی تم پر اپنی نعمت، اور راضی ہو گیا میں تمہارے لیے اسلام کے دین ہونے سے‘‘

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہمیں اس دن کا علم ہے، اور اس جگہ کا بھی علم ہے، جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ آیت نازل ہوئی تھی، نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت عرفات میں جمعہ کے دن تشریف فرما تھے (بخاری)

اس سے معلوم ہوا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں حجۃُ الوداع کے موقع پر، وقوفِ عرفہ، جمعہ کے دن واقع ہوا تھا۔

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

سَارَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَتّٰى أَتٰى عَرَفَةَ، فَوَجَدَ الْقُبَّةَ قَدْ ضُرِبَتْ لَهُ بِنَمِرَةَ فَنَزَلَ بِهَا، حَتّٰى إِذَا زَاغَتِ الشَّمْسُ أَمَرَ بِالْقَصْوَاءِ فَرُحِلَتْ لَهُ، حَتّٰى إِذَا انْتَهٰى إِلٰى بَطْنِ الْوَادِيْ خَطَبَ النَّاسَ، ثُمَّ أَذَّنَ بِلَالٌ، ثُمَّ أَقَامَ فَصَلَّى الظُّهْرَ، ثُمَّ أَقَامَ فَصَلَّى الْعَصْرَ،

وَلَمْ يُصَلِّ بَيْنَهُمَا شَيْئًا (سنن النسائی، رقم الحديث ۶۰۴، كتاب المواقيت، باب الجمع بين الظهر والعصر بعرفة)

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چلے، یہاں تک کہ عرفہ کے میدان میں پہنچ گئے، آپ نے ایک خیمہ پایا، جو مسجدِ نمرہ میں لگادیا گیا تھا، آپ اس میں تشریف لے گئے، یہاں تک کہ جب سورج ڈھل گیا (یعنی زوال ہوگیا) تو آپ نے قصواء اونٹنی لانے کا حکم فرمایا، جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے کجاوہ کَس دیا گیا۔

یہاں تک کہ آپ وادی کے درمیان میں تشریف لائے، لوگوں کو خطبہ دیا، پھر حضرت بلال نے اذان دی، پھر اقامت کہی، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ظہر کی نماز پڑھائی، پھر اقامت کہی، پھر عصر کی نماز پڑھائی، اور دونوں نمازوں کے درمیان کوئی (نفل وسنت) نماز نہیں پڑھی (سنن نسائی)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر میدانِ عرفات میں جمعہ کے دن، نمازِ جمعہ کے بجائے، ظہر کی نماز ادا فرمائی، کیونکہ ایک تو آپ مسافر تھے، دوسرے اس زمانہ میں میدانِ عرفات، بیابان جنگل اور آبادی سے غیر معمولی فاصلہ پر تھا۔

جس سے معلوم ہوا کہ مسافر پر جمعہ واجب نہیں، اور نہ ہی بیابان جنگل میں اور آبادی سے دور نمازِ جمعہ کا حکم ہے۔ [1]

---

[1] ومما يحتج به فى إسقاط الجمعة عن المسافر أن النبى صلى الله عليه وسلم قد مر بـه فـى أسـفـاره جمع لا محالة ، فلم يبلغنا أنه جمع وهو مسافر ، بل قد ثبت عنه أنه صلى الـظـهـر بـعـرفة وكان يوم الجمعة ، فدل ذلک من فعله على أن لا جمعة على المسافر ؛ لأنـه الـمبيـن عـن الـلـه عـز وجـل مـعـنى ما أراد بكتابه ، فسقطت الجمعة عن المسافر استدلالا بفعل النبى صلى الله عليه وسلم ، وهذا كالإجماع من أهل العلم(الأوسط لابن الـمـنذر، ج۴ص ۲۰ ۴ ،تحت رقم الحديث ۱۷۳۶ ، كتاب صفة الصلاة،جماع أبواب مـن تجب عليه الجمعة ومن يسقط عنه،ذكر وجوب الجمعة على المسافر واختلفوا فى وجوب الجمعة على المسافر)

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

ام المومنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ:

أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ:رَوَاحُ الْجُمُعَةِ وَاجِبٌ عَلٰى كُلِّ مُحْتَلِمٍ (سنن النسائی، رقم الحدیث ۱۳۷۱، کتاب الجمعة، باب التشدید فی التخلف عن الجمعة، ابن حبان، رقم الحدیث ۱۲۲۰) [1]

ترجمہ: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جمعہ کے لیے جانا ہر بالغ (مرد) پر واجب ہے (نسائی)

اس حدیث میں شہر کی قید نہیں، جس سے استدلال کرتے ہوئے بہت سے فقہاء وعلماء نے گاؤں، دیہات والوں پر بھی نمازِ جمعہ کو واجب قرار دیا ہے، لیکن حنفیہ نے فرمایا کہ یہ حکم گاؤں والوں کو شامل نہیں۔

حضرت طارق بن شہاب سے روایت ہے کہ:

عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ:اَلْجُمُعَةُ حَقٌّ وَاجِبٌ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ فِيْ جَمَاعَةٍ إِلَّا أَرْبَعَةٍ:عَبْدٍ مَمْلُوْكٍ، أَوِ امْرَأَةٍ، أَوْ صَبِيٍّ، أَوْ

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

احتج بہ بن المنذر علی سقوط الجمعة عن المسافر بکونه صلی الله علیه وسلم صلی الظهر والعصر جمیعا بعرفة وکان یوم جمعة فدل ذلک من فعله علی أنه لا جمعة علی مسافر فهو عمل صحیح(فتح الباری لابنِ حجر، ج۲ص ۳۹۱، کتاب الجمعة ، قوله باب المشی إلی الجمعة وقول الله جل ذکره فاسعوا إلی ذکر الله)

وقال ابن المنذر :وفی صلاة رسول الله -صلی الله علیه وسلم -الظهر بعرفة، وکان یوم الجمعة دلیل علی أن لا جمعة علی مسافر.

قلت :هذا وهم منه، فإن عرفات مفازة، ولا تقام الجمعة فی المفازة عند الأئمة الأربعة خلافا للظاهریة ولا یعتد بخلافهم(البنایة شرح الهدایة، ج۳ص ۷۰، کتاب الصلاة، باب صلاة الجمعة)

[1] قال شعیب الارنؤوط:

إسناده صحیح، یزید بن موهب ثقة، وباقی رجال الإسناد علی شرط الصحیح (حاشیة ابنِ حبان)

مَرِیْضٌ (سنن أبی داؤد ، رقم الحدیث ١٠٦٧ ، کتاب الصلاۃ، ابواب الجمعۃ، باب الجمعۃ للمملوک والمرأۃ) [1]

ترجمہ: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر مسلمان پر جماعت کے ساتھ جمعہ کی نماز ادا کرنا ضروری حق ہے، سوائے چار قسم کے لوگوں کے، ایک غلام جو کسی کا مملوک ہو، دوسرے عورت، تیسرے نابالغ بچہ، چوتھے مریض (ابوداؤد)

اس طرح کی حدیث دوسری معتبر سندوں سے بھی مروی ہے۔ [2]

اس طرح کی احادیث میں عورت اور مریض وغیرہ کی طرح قریہ اور گاؤں والوں کو جمعہ کی نماز سے مستثنیٰ نہیں کیا گیا، جس سے استدلال کرتے ہوئے بہت سے فقہاء وعلماء نے گاؤں

---

[1] قال شعیب الارنؤوط:إسنادہ صحیح .طارق بن شهاب اتفِق علی أنه رأی رسولَ الله -صلَّی الله علیه وسلم -، لکن اختُلف هل سمع منه أم لا؟ وعلی تقدیر أنه لم یسمع منه تکون روایته مرسل صحابی، وهو حجة بالإجماع إلا من شذَّ، کما قال ابنُ الملقن فی "البدر المنیر(حاشیة سنن ابی داؤد)

[2] عن طارق بن شهاب، عن أبی موسی، عن النبی صلی الله علیه وسلم، قال ": الجمعة حق واجب علی کل مسلم فی جماعة إلا أربعة :عبد مملوک، أو امرأة، أو صبی، أو مریض (مستدرک حاکم، رقم الحدیث ١٠٦٢)

قال الحاکم:هذا حدیث صحیح علی شرط الشیخین فقد اتفقا جمیعا علی الاحتجاج بهریم بن سفیان ولم یخرجاہ ورواہ ابن عیینة، عن إبراهیم بن محمد بن المنتشر ولم یذکر أبا موسی فی إسنادہ، وطارق بن شهاب ممن یعد فی الصحابة .

و قال الذهبی فی التلخیص: صحیح.

حدثنی أبو حازم، عن مولی لآل الزبیر یرفعه إلی النبی صلی الله علیه وسلم أنه قال ": الجمعة واجبة علی کل حالم، إلا علی أربعة، علی الصبی، والمملوک، والمرأة، والمریض "(السنن الکبریٰ للبیهقی، رقم الحدیث ٥٦٣٥)

قال الالبانی:

رواہ البیهقی(١٨٤/٣)من طریق أخری عن حسن یعنی ابن صالح به .قلت :وهذا سند صحیح رجاله کلهم ثقات غیر المولی فلم أعرفه ,فإن کان من الصحابة فلا تضر جهالته ,وهو الأرجح لأن راویه عنه أبو حازم هو سلمان الأشجعی الکوفی تابعی ,وإن کان غیر صحابی فالسند ضعیف لجهالته (ارواء الغلیل فی تخریج احادیث منار السبیل، ج٣ص٥٦، تحت رقم الحدیث ٥٩٢، کتاب الصلاۃ، باب صلاۃ الجمعة)

والوں پر بھی جمعہ کی نماز کو واجب اور گاؤں میں جمعہ کی نماز کو جائز قرار دیا ہے۔ ۱

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم قَالَ: اَلْجُمُعَةُ عَلٰى مَنْ سَمِعَ النِّدَاءَ

(سنن ابی داؤد، رقم الحدیث ۱۰۵۶، کتاب الصلاۃ، ابواب الجمعۃ، باب من تجب علیہ الجمعۃ) ۲

ترجمہ: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جمعہ کی نماز اس شخص پر واجب ہے، جو نداء (یعنی اذان) سنے (ابوداؤد)

اور بھی کئی احادیث میں جمعہ کی اذان سُننے والے کو جمعہ کی نماز کے لئے جانے کا حکم دیا گیا ہے، اور اذان سُننے کے باوجود جمعہ کی نماز کے لئے نہ جانے پر سخت وعید سنائی گئی ہے۔ ۳

---

۱ والدلالة على صحة قولنا وفساد قوله :قوله تعالى :يأيها الذين آمنوا إذا نودى للصلاة من يوم الجمعة فاسعوا إلى ذكر الله وذروا البيع (الجمعة :) . فكان عموم الظاهر يقتضي إيجاب السعي إليها عند سماع النداء :لأنه جعل النداء علما لها ، ودل على ذلك عموم قوله صلى الله عليه وسلم :تجب الجمعة على كل مسلم إلا امرأة أو صبيا أو مملوكا .فاستثنى بعد عموم الإيجاب من لا تلزمه الجمعة من المرأة والصبي ، والمملوك ، فدخل من كان خارج المصر في عموم الإيجاب ، ولم يدخل خصوص الاستثناء ، والاعتماد على هذه الدلالة جيد(الحاوى فى فقه الشافعى - الماوردى، ج ۲،ص ۴۰۵، كتاب الجمعة وغيرها من أمرها)

۲ قال شعيب الارنؤوط:حسن لغيره(حاشية ابى داؤد)

۳ عن عبد الله بن كعب بن مالك، عن أبيه، عن رسول الله صلى الله عليه وسلم، قال :لينتهين أقوام يسمعون النداء يوم الجمعة ثم لا يأتونها أو ليطبعن الله على قلوبهم ثم ليكونن من الغافلين(المعجم الكبير للطبرانى، رقم الحديث ۱۹۷ ،ج۱۹ ص ۹۹)

قال المنذرى: رواه الطبرانى فى الكبير بإسناد حسن (الترغيب و الترهيب للمنذرى، تحت رقم الحديث ۱۰۹۰)

و قال الهيثمى: رواه الطبرانى فى الكبير وإسناده حسن (مجمع الزوائد، تحت رقم الحديث ۳۱۸۱)

عن محمد بن عبد الرحمن قال :سمعت عمي يحدث، عن النبى صلى الله عليه وسلم قال :من سمع النداء يوم الجمعة فلم يأت، أو لم يجب، ثم سمع النداء فلم يأت، أو فلم يجب، ثم سمع النداء فلم يأت، أو لم يجب، طبع الله عز وجل على قلبه، فجعل قلب منافق(مسند ابى يعلىٰ ، رقم الحديث ۷۱۶۷ ،ج۱۳ ص ۱۰۸)

قال حسين سليم أسد الدارانى: إسناده حسن(حاشيه مسند ابى يعلىٰ)

حضرت یحییٰ بن اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: مَنْ سَمِعَ النِّدَاءَ يَوْمَ الْجُمُعَةِ فَلَمْ يَأْتِ، أَوْ لَمْ يُجِبْ، ثُمَّ سَمِعَ النِّدَاءَ فَلَمْ يَأْتِ، أَوْ فَلَمْ يُجِبْ، ثُمَّ سَمِعَ النِّدَاءَ فَلَمْ يَأْتِ، أَوْ لَمْ يُجِبْ، طَبَعَ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ عَلٰى قَلْبِهٖ، فَجُعِلَ قَلْبَ مُنَافِقٍ (مسند ابی یعلیٰ ، رقم الحديث ٧١٦٧ ، ج١٣ ص١٠٨) [1]

ترجمہ: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے جمعہ کی اذان کو سنا، پھر جمعہ کی نماز کے لیے نہیں آیا، یا (یہ فرمایا کہ) اس کا (عمل سے) جواب نہیں دیا، پھر دوبارہ جمعہ کی اذان کو سنا، پھر جمعہ کی نماز کے لیے نہیں آیا، یا اس کا جواب نہیں دیا، پھر تیسری مرتبہ جمعہ کی اذان کو سنا، پھر جمعہ کی نماز کے لیے نہیں آیا، یا اس کا جواب نہیں دیا، تو اللہ عزّ وجلّ، اس کے دل پر مہر لگا دیتا ہے، پھر اس کا دل منافق والا دل بنا دیا جاتا ہے (ابویعلیٰ)

اس قسم کی احادیث سے استدلال کرتے ہوئے بہت سے فقہاء وعلماء نے فرمایا کہ یہ حکم گاؤں والوں کو بھی شامل ہے، اور اس سے گاؤں، دیہات میں نمازِ جمعہ کا حکم ثابت ہوتا ہے، اور ان کو نمازِ جمعہ چھوڑنے کی وعید معلوم ہوتی ہے، کیونکہ شہر والوں پر تو بغیر اذانِ جمعہ سنے بھی جمعہ کی نماز واجب ہے۔ [2]

---

[1] قال حسین سلیم أسد الدارانی: إسناده حسن (حاشية مسند ابی یعلیٰ)

[2] والذی ذهب إليه الجمهور أنها تجب على من سمع النداء أو كان فى قوة السامع سواء كان داخل البلد أو خارجه ومحله كما صرح به الشافعی ما إذا كان المنادی صيتا والأصوات هادئة والرجل سميعا وفى السنن لأبی داود من حديث عبد الله بن عمرو مرفوعا إنما الجمعة على من سمع النداء وقال إنه اختلف فی رفعه ووقفه وأخرجه الدارقطنی من وجه آخر عن عمرو بن شعيب عن أبيه عن جده مرفوعا ويؤيده قوله صلى الله عليه وسلم لابن أم مكتوم أتسمع النداء قال نعم قال فأجب وقد تقدم فی صلاة الجماعة ذكر من احتج به على وجوبها فيكون فی الجمعة أولى لثبوت الأمر بالسعی إليها (فتح الباری للعسقلانی، ج٢ ص٣٨٥، كتاب الجمعة ،قوله باب من أين تؤتى الجمعة وعلى من تجب لقول الله تعالى إذا نودی للصلاة من يوم الجمعة فاسعوا إلى)

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

جبکہ حنفیہ نے اس طرح کی احادیث کو شہر کی اذان کے ساتھ خاص رکھا ہے۔ [1]
جس سے معلوم ہوا کہ گاؤں، دیہات میں نمازِ جمعہ کے واجب ہونے کے قول کا بھی مستدل مضبوط ہے۔

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾ عن أبی سلمة بن نبیه عن عبد الله بن هارون عن عبد الله بن عمرو بن العاص أن النبی صلى الله علیه وسلم قال :تجب الجمعة على كل من سمع النداء وهذا نص فیمن كان خارج المصر :لأن سماع النداء اعتباره فی الجمعة فی أهل المصر غیر معتبر ، فإن قیل : الخبر موقوف على عبد الله بن عمرو بن العاص ، غیر مسند إلى رسول الله صلى الله علیه وسلم . قلنا :أبو داود رواه عن سفیان موقوفا على عبد الله بن عمرو بن العاص وقد أسنده قبیصة وهو ثقة ، والخبر عندنا إذا رواه راو تارة موقوفا وتارة مسندا ، حمل الموقوف على فتواه وحمل المسند على روایته .ویدل على ذلک أیضا ما روى عن النبی صلى الله علیه وسلم أنه قال :لینتهین أقوام یسمعون النداء فلا یحضرون الجمعة أو لیطبع الله تعالى على قلوبهم ولأن أبا حنیفة خالف إجماع الصحابة ، رضی الله عنهم :لأن عبد الله بن عمرو بن العاص قال :الاعتبار بسماع النداء وابن عمر وأبو هریرة وأنس قالوا إن الاعتبار بالإیواء إلى الوطن .ولم یرو عنهم غیر هذا .والصحابة إذا أجمعت على قولین فی مسألة فإحداث قول ثالث محرم ، كما إذا أجمعوا على قول واحد كان إحداث قول ثان محرما ، ولأنه متمكن من سماع النداء مع ارتفاع العوارض ، فوجب أن تلزمه الجمعة كأهل المصر ، ولأنها صلاة مفروضة فلم یختص بها أهل الأمصار كالظهر ، ولأنها عبادة على البدن شرط فیها الحریة ، فجاز أن یشترط فیها قطع مسافة كالحج .فأما الجواب عن قوله "لا جمعة إلا على أهل مصر جامع "فهو مروی عن علی ، رضی الله عنه ، وموقوف علیه ، ولو صح مسندا لحمل على من لم یسمع النداء ، وخص بقوله صلى الله علیه وسلم "الجمعة على كل من سمع النداء "لأنه عام ، وهذا خاص منه .وأما قولهم أنه صلى الله علیه وسلم لم یأمر أهل العوالی والسواد بها فبهت مع نص كتاب الله تعالى :وسنة رسول الله صلى الله علیه وسلم :لأن الله تعالى قد أمرهم بها بقوله تعالى :فاسعوا إلى ذكر الله (الجمعة :) . ورسول الله صلى الله علیه وسلم قد ندبهم إلیها فی قوله صلى الله علیه وسلم :تجب الجمعة على كل مسلم .وأما قیاسهم فالمعنى فی أصله :أنه لم یبلغهم شعار الجمعة .وأما قولهم لما بطل اعتبار النداء فی وجوب الجمعة فی البلد بطل اعتباره خارج البلد وهو نداء الجامع فلا یعتبر فی أهل البلد ولا فی الخارجین عنه ، والنداء الذی اعتبرناه خارج البلد اعتبرناه فی البلد وهو النداء فی كل موضع منه فاستویا .
وأما قولهم ما قرب من البلد فی حكم ما بعد عنه ، فغیر صحیح :لأنه لو نوى سفر ما قرب لم یقصر، ولو نوى سفر ما بعد جاز أن یقصر ، فعلم أن حكم ما قرب قد یخالف حكم ما بعد .فإذا صح ما ذكرناه فهو حجة على جمیع من خالفنا (الحاوی فی فقه الشافعی -الماوردی، ج۲،ص۴۰۶، ۴۰۷،كتاب الجمعة وغیرها من أمرها)

[1] قوله :(سمعت النداء أو لم تسمعه) وهذا لداخل البلد(فیض الباری على صحیح البخاری، ج۲ص ۴۲۸، كتاب الجمعة، باب من أین تؤتى الجمعة وعلى من تجب)

حضرت عبدالرحمٰن بن کعب اپنے والد حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کے بارے میں روایت کرتے ہیں کہ:

أَنَّهُ كَانَ إِذَا سَمِعَ النِّدَاءَ يَوْمَ الْجُمُعَةِ تَرَحَّمَ لِأَسْعَدَ بْنِ زُرَارَةَ، فَقُلْتُ لَهُ: إِذَا سَمِعْتَ النِّدَاءَ تَرَحَّمْتَ لِأَسْعَدَ بْنِ زُرَارَةَ، قَالَ: لِأَنَّهُ أَوَّلُ مَنْ جَمَّعَ بِنَا فِي هَزْمِ النَّبِيتِ مِنْ حَرَّةِ بَنِي بَيَاضَةَ فِي نَقِيعٍ، يُقَالُ لَهُ: نَقِيعُ الْخَضِمَاتِ، قُلْتُ: كَمْ أَنْتُمْ يَوْمَئِذٍ، قَالَ: أَرْبَعُونَ (سنن أبی داؤد، رقم الحديث ۱۰۶۹، كتاب الصلاة، ابواب الجمعة، باب الجمعة فی القری) [1]

ترجمہ: ان کے والد جمعہ کے دن اذان سنتے، تو اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ کے لئے دعاء کرتے، میں نے ان سے عرض کیا کہ آپ جب جمعہ کی اذان سنتے ہیں، تو اسعد بن زرارہ کے لیے کیوں دعاء کرتے ہیں؟ تو انہوں نے فرمایا کہ اسعد بن زرارہ پہلے شخص ہیں کہ جنہوں نے ''نقیع میں بنی بیاضہ کے هــزْم البیــت'' میں ہمیں جمعہ پڑھایا ہے، جس کو ''نقیعُ الخضمات'' کہا جاتا تھا، میں نے عرض کیا کہ تم اس وقت کتنے لوگ تھے؟ تو انہوں نے جواب میں فرمایا کہ چالیس لوگ تھے

(ابوداؤد)

اس روایت کو اور محدثین نے بھی بیان کیا ہے۔ [2]

---

[1] قال شعيب الارنؤوط: إسناده حسن (حاشية ابی داؤد)

[2] عن محمد بن إسحاق، قال: حدثنی محمد بن أبی أمامة بن سهل، عن أبيه، عن عبد الرحمن بن كعب، قال: كنت قائد أبی حين ذهب بصره، إذ خرجت به إلى الجمعة فسمع الأذان صلى على أبی أمامة أسعد بن زرارة واستغفر له، فمكثت كثيرا لا يسمع أذان الجمعة إلا فعل ذلک، فقلت: يا أبی أرأيت استغفارک لأبی أمامة كلما سمعت الأذان للجمعة ما هو؟ قال: أی بنی، كان أول من جمع بنا بالمدينة فی هزم النبت من حرة بنی بياضة يقال لها نقيع الخضمات. قال: قلت: كم كنتم يومئذ؟ قال: أربعين رجلا (مستدرک حاكم، رقم الحديث ۱۰۳۹)

قال الحاكم: هذا حديث صحيح على شرط مسلم ولم يخرجاه.

و قال الذهبی فی التلخيص: على شرط مسلم.

’’نقیعُ الخضمات ‘‘ کے بارے میں بعض حضرات نے فرمایا کہ یہ مدینہ منورہ کے قریب ایک بستی، یا گاؤں کی شکل کی آبادی تھی، جس سے استدلال کرتے ہوئے ان حضرات نے یہ قرار دیا کہ شہر کے علاوہ گاؤں، دیہات کی آبادی میں بھی نمازِ جمعہ قائم کرنا جائز ہے۔ [1]

جبکہ اس سلسلہ میں حنفیہ کا فرمانا یہ ہے کہ یہ مقام مدینہ منورہ کی حدود میں داخل تھا، لہٰذا اس

---

[1] وفی حدیث کعب بن مالک وذکر الجمعة فی نقیع یقال له نقیع الخضمات وهو موضع بنواحی المدینة(النهایة فی غریب الحدیث والاثر ،لابن الاثیر، ج۲ ص۴۴، مادة ”خضم“حرف الخاء، باب الخاء مع الضاد)

وفی الحدیث :(أول جمعة جمعت فی الإسلام بالمدینة، فی هزم بنی بیاضة) ، قال ابن الأثیر :هو موضع، قلت :وهو فی معجم الطبرانی :فی هزم من حرة بنی بیاضة، فی نقیع الخضمات، ومثله فی کتاب الصحابة لأبی نعیم، وابن منده، والاستیعاب لابن عبد البر، والآثار للبیهقی .ووقع فی الروض للسهیلی:(عند هزم البیت) ، وهو جبل علی برید من المدینة، ففی سیاقه خلافان، الأول :قوله) :(البیت) وکلهم قال :بیاضة،و (الثانی) قوله " :جبل "والهزم بإجماع أهل اللغة :المنخفض من الأرض، وذکر بعضهم، جمعا بین القولین، "أنه جمع فی هزم بنی النبیت، من حرة بنی بیاضة، فی نقیع یقال له نقیع الخضمات ."والنبیت، وبیاضة :بطنان من الأنصار(تاج العروس للزبیدی، ج۳۴ص۹۸، ۹۹، فصل الهاء مع المیم، مادة ”هـ ز م“)

وفی الحدیث من الفقه أن الجمعة جوازها فی القری کجوازها فی المدن والأمصار لأن حرة بنی بیاضة یقال قریة علی میل من المدینة، وقد استدل به الشافعی علی أن الجمعة لا تجزیء بأقل من أربعین رجلا أحرارا مقیمین وذلک أن هذه الجمعة کانت أول ما شرع من الجمعات فکان جمیع أوصافها معتبرة فیها لأن ذلک بیان لمجمل واجب، وبیان المجمل الواجب واجب(معالم السنن،للخطابی ،ج ا ص ۲۴۵، کتاب الصلاة، ومن باب فی الجمعة فی القری)

ولا یشترط لها المصر، وبه قال مالک والشافعی .وعن أبی حنیفة :لا جمعة ولا تشریق إلا فی مصر جامع .ولنا :قول کعب بن مالک " :أول من جمع بنا :أسعد بن زرارة فی هزم النبیت، من حرة بنی بیاضة، فی نقیع یقال له :الخضمات ."رواه أبو داود .قال ابن جریج :قلت لعطاء :أکان بأمر النبی صلی الله علیه وسلم؟ قال :نعم .قال الخطابی : حرة بنی بیاضة :قریة علی میل من المدینة .وحدیث ابن عباس " :فی جواثا "(مختصر الإنصاف والشرح الکبیر ’’مطبوع ضمن مجموعة مؤلفات الشیخ محمد بن عبد الوهاب، الجزء الثانی‘‘،ص۱۹۳ ،کتاب الصلاة، باب صلاة الجمعة، الناشر: مطابع الریاض – الریاض)

واقعہ سے شہر ہی میں نمازِ جمعہ کا قائم کرنا معلوم ہوتا ہے۔ [1]

بہرحال مذکورہ واقعہ بھی کسی ایک فریق کا حتمی ویقینی مستدل نہیں، اور دونوں فریقوں کے لیے اس واقعہ سے استدلال کی گنجائش موجود ہے، کیونکہ اس زمانے میں مدینہ منورہ شہر کی آبادی اور رقبہ کی کوئی خاص تحدید وتعیین، متعین اور یقینی طور پر معلوم کرنا مشکل ہے، اور استدلال کا کسی ایک، یا خاص جہت، یا مخصوص اجتہاد کی رو سے راجح یا مرجوح ہونا، اس کے مستدل بننے کے لیے مانع نہیں ہوا کرتا، ورنہ تو احتمال آنے پر استدلال باطل ہونے کی وجہ سے اصل کی طرف رجوع کیا جائے گا، اور اصل حکم، جمعہ کی فرضیت کا ہے۔

امام بیہقی رحمہ اللہ نے معاذ بن موسیٰ اور محمد بن اسحاق سے روایت کیا ہے کہ:

أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حِيْنَ رَكِبَ مِنْ بَنِيْ عَمْرِو بْنِ عَوْفٍ فِيْ هِجْرَتِهٖ إِلَى الْمَدِيْنَةِ مَرَّ عَلٰى بَنِيْ سَالِمٍ، وَبَنِيْ قُرَّةَ بَيْنَ قُبَاءَ، وَالْمَدِيْنَةِ فَأَدْرَكَتْهُ الْجُمُعَةُ فَصَلّٰى فِيْهِمُ الْجُمُعَةَ، وَكَانَتْ أَوَّلَ جُمُعَةٍ صَلَّاهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حِيْنَ قَدِمَ (معرفة السنن والآثار للبيهقي، رقم الحديث ٦٣٢٠، كتاب الجمعة، باب العدد الذين إذا كانوا في قرية وجبت عليهم الجمعة)

---

[1] قوله " :في هزم النبيت "الهزم -بفتح الهاء، وسكون الزاى، وبعدها ميم :-موضع بالمدينة؛ والنبيت -بفتح النون، وكسر الباء الموحدة،وبعدها ياء آخر الحروف ساكنة، وبعدها تاء ثالث الحروف :-حي من اليمن.

قوله " :من حرة بني بياضة -"بالحاء المهملة -هي قرية على ميل من المدينة، وبنو بياضة/ بطن من الأنصار منهم :سلمى بن صخر البياضي، له صحبة.

قوله " :في نقيع "النقيع -بفتح النون، وكسر القاف، وسكون الياء آخر الحروف، وفي آخره عين مهملة -بطن من الأرض يستنقع فيه الماء مدة، فإذا نضب الماء أنبت الكلأ، ومنه حديث عمر -رضي الله عنه -أنه حمى النقيع لخيل المسلمين .وقد يصحفه بعض الناس فيروونه بالباء، والبقيع بالباء بالمدينة موضع القبور، وهو بقيع الغرقد.

قوله " :يقال له نقيع الخضمات "الخضمات :بفتح الخاء وكسر الضاد المعجمتين .قال ابن الأثير :نقيع الخضمات موضع بنواحي المدينة(شرح سنن أبي داود،لبدر الدين العيني،ج٤، ص٦٩٥، ٣٩٦، كتاب الصلاة، باب :الجمعة في القرى)

ترجمہ: نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ کی طرف ہجرت کرتے ہوئے بنی عمرو بن عوف سے سوار ہوئے، تو آپ بنی سالم اور بنی قُرہ قبیلوں پر گزرے، قباء اور مدینہ کے درمیان، جہاں جمعہ کی نماز کا وقت آ گیا، تو آپ نے اُن لوگوں کے درمیان جمعہ کی نماز پڑھی، اور یہ رسولُ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کے وقت سب سے پہلی جمعہ کی نماز تھی (بیہقی)

یہ واقعہ دوسری اسناد سے بھی مروی ہے۔ [1]

---

[1] وأخبرنا أبو الحسن بن الفضل القطان، قال :حدثنا عبد الله بن جعفر، قال :حدثنا يعقوب بن سفيان، قال :حدثنا حسن بن الربيع، قال :حدثنا ابن إدريس، قال :حدثنا ابن إسحاق، عن محمد بن جعفر، عن عروة بن الزبير، عن عبد الرحمن بن عويم، قال : أخبرني بعض قومي، قال :قدم رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم وذلك يوم الإثنين لاثنتي عشرة ليلة مضت من شهر ربيع الأول فأقام بقباء الإثنين والثلاثاء والأربعاء والخميس فأسس المسجد وصلى فيه تلك الأيام حتى إذا كان يوم الجمعة خرج على ناقته القصواء وبنو عمرو بن عوف يزعمون أنه لبث فيهم ثمان عشرة ليلة، ثم خرج وقد اجتمع الناس فأدركته الصلاة في بني سالم، فصلاها بمن معه في المسجد الذي ببطن الوادي، فكانت أول جمعة صلاها بالمدينة(دلائل النبوة ،للبيهقي، ج٢،ص٥١٢، جماع أبواب المبعث،باب ذكر التاريخ لمقدم النبي صلى الله عليه وآله وسلم المدينة وكم مكث بعد البعث بمكة)

حدثنا أبو غسان، عن ابن أبي يحيى، عن عبد الرحمن بن عتبان، عن أبان بن عثمان، عن كعب بن عجرة رضي الله عنه، أن النبي صلى الله عليه وسلم جمع في أول جمعة حين قدم المدينة في مسجد بني سالم في مسجد عاتكة (تاريخ المدينة لابن شبة، ج ١، ص٦٨، ذكر المساجد والمواضع التي صلى فيها رسول الله صلى الله عليه وسلم)

حدثنا موسى بن زكريا التستري، ثنا شباب العصفري، ثنا بكر بن سليمان، عن ابن إسحاق، ووهب بن جرير، عن أبيه، عن ابن إسحاق قال: " نزل رسول الله صلى الله عليه وسلم بقباء على كلثوم بن هرم أخي بني عمرو بن عوف، ويقال: بل نزل على سعد بن خيثمة، فأقام في بني عمرو بن عوف يوم الاثنين والثلاثاء والأربعاء والخميس، وأسس مسجدهم، وخرج من بني عمرو بن عوف، فأدركته الجمعة في بني سالم بن عوف، فصلى الجمعة في المسجد الذي ببطن الوادي "

قال ابن إسحاق: ثم نزل رسول الله صلى الله عليه وسلم على أبي أيوب، وأمر رسول الله صلى الله عليه وسلم ببناء مسجده في تلك السنة(المعجم الكبير للطبراني، رقم الحديث ٥٤١٤، ج٦ص ٣٠)

قال الهيثمي:رواه الطبراني، ورجاله ثقات(مجمع الزوائد، رقم الحديث ٩٩٢٢،باب الهجرة إلى المدينة)

اس حدیث سے استدلال کرتے ہوئے بہت سے فقہاء وعلماء نے فرمایا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ سے باہر بستی میں جمعہ کی نماز ادا فرمائی، اور اس زمانہ میں قباء کا علاقہ مدینہ منورہ سے خارج تھا، جس سے گاؤں، دیہات میں جمعہ کے درست ہونے کا ثبوت ہوا۔ [1]

---

[1] "قباء على ثلاثة أميال من المدينة، وأصله اسم بئر هنالك، وألفه واو، يمد ويقصر، ويصرف ولا يصرف، وأنكر البكرى القصر فيه، ولم يحك فيه أبو على سوى المد، وقال الخليل :هو مقصور، قال :وهو قرية بالمدينة(مطالع الأنوار على صحاح الآثار،لابن قرقول،ج۵،ص۲۱۸،حرف القاف، القاف مع الياء، أسماء المواضع)

فإن قالوا: قد كان أهل العوالى يشهدون مع النبى – صلى الله عليه وسلم – الجمعة.

قلنا: نعم وقد كان أهل ذى الحليفة يجمعون معه أيضا – عليه السلام –، روينا ذلك من طريق الزهرى، ولا يلزم هذا عندكم، وقد كانوا يشهدون معه – عليه السلام – سائر الصلوات، ولم يكن ذلك دليلا على أن سائر قومهم لا يصلون الجماعات فى مساجدهم، ولم يأت قط نص بأنهم كانوا لا يجمعون سائر قومهم فى مساجدهم، ولا يحدون هذا أبدا؟ ومن البرهان القاطع على صحة قولنا: أن الله تعالى إنما افترض فى القرآن السعى إلى صلاة الجمعة إذا نودى لها، لا قبل ذلك، وبالضرورة أن من كان على نحو نصف ميل، أو ثلثى ميل لا يدرك الصلاة أصلا إذا راح إليها فى الوقت الذى أمره الله تعالى بالرواح إليها.

فصح ضرورة أنه لا بد لكل طائفة من مسجد يجمعون فيه إذا راحوا إليه فى الوقت الذى أمروا بالرواح إليه فيه أدركوا الخطبة والصلاة، ومن قال غير هذا فقد أوجب الرواح حين ليس بواجب، وهذا تناقض وإيجاب ما ليس عندهم واجبا.

ومن أعظم البرهان عليهم: أن رسول الله – صلى الله عليه وسلم – أتى المدينة وإنما هى قرى صغار مفرقة، بنو مالك بن النجار فى قريتهم حوالى دورهم أموالهم ونخلهم، وبنو عدى بن النجار فى دارهم كذلك، وبنو مازن بن النجار كذلك، وبنو سالم كذلك، وبنو ساعدة كذلك، وبنو الحارث بن الخزرج كذلك، وبنو عمرو بن عوف كذلك، وبنو عبد الأشهل كذلك، وسائر بطون الأنصار كذلك، فبنى مسجده فى بنى مالك بن النجار، وجمع فيه فى قرية ليست بالكبيرة، ولا مصر هنالك.

فبطل قول من ادعى أن لا جمعة إلا فى مصر، وهذا أمر لا يجهله أحد لا مؤمن ولا كافر، بل هو نقل الكواف من شرق الأرض إلى غربها، وبالله تعالى التوفيق .

وقول عمر بن الخطاب، "حيثما كنتم "إباحة للتجميع فى جميع المساجد؟ وروينا عن عمرو بن دينار أنه قال: إذا كان المسجد تجمع فيه للصلاة فلتصل فيه الجمعة.

ومن طريق عبد الرزاق عن ابن جريج: قلت لعطاء بن أبى رباح: أرأيت أهل البصرة لا يسعهم المسجد الأكبر كيف يصنعون؟ قال: لكل قوم مسجد يجمعون فيه ثم يجزء ذلك عنهم.

وهو قول أبى سليمان، وبه نأخذ؟(المحلى بالاثار لابن حزم، ج۳،ص۲۵۸، ۲۵۹، كتاب الصلاة،صلاة الجمعة)

جبکہ حنفیہ نے فرمایا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موقعہ پر جمعہ کی نماز، دراصل مدینہ منورہ کی حدود میں ادا فرمائی تھی، جس سے جمعہ کا گاؤں میں قائم کرنا ثابت نہیں ہوتا۔ [1]

اور بعض احادیث میں مدینہ منورہ پر بھی قریہ کا اطلاق کیا گیا ہے۔ [2]

بہر حال مذکورہ حدیث میں بھی دونوں فریقوں کے لیے استدلال کی گنجائش موجود ہے، جس کی وجہ سے یہ مسئلہ مجتہد فیہ درجہ میں ہی برقرار رہتا ہے۔

حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

إِنَّ أَوَّلَ جُـمُـعَةٍ جُـمِّـعَتْ فِي الْإِسْلَامِ بَعْدَ جُمُعَةٍ جُمِّعَتْ فِيْ مَسْجِدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِالْمَدِيْنَةِ، لَجُمُعَةٌ جُمِّعَتْ بِجَوُثَاءَ، قَـرْيَةٌ مِنْ قُرٰى الْبَحْرَيْنِ، قَالَ عُثْمَانُ: قَرْيَةٌ مِنْ قُرٰى عَبْدِ الْقَيْسِ (سنن ابی داؤد ، رقم الحديث ١٠٦٨، كتاب الصلاة، ابواب الجمعة، باب الجمعة فی القُرٰی، بخاری، رقم الحديث ٨٩٢) [3]

ترجمہ: پہلا جمعہ، جو اسلام میں قائم کیا گیا، اس جمعہ کے بعد، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد میں مدینہ میں قائم کیا گیا تھا، وہ جمعہ ہے، جو ''جـواثـا'' میں پڑھا گیا، جو کہ بحرین کے قریوں میں سے ایک قریہ ہے، عثمان (راوی نے) نے فرمایا کہ عبدُ القیس کے قریوں میں سے ایک قریہ ہے (ابوداؤد، بخاری)

---

[1] فـنزل بأعلى المدينة فی حی يقال لهم بنو عمرو بن عوف، فقام فيهم أربع عشرة ليلة، ثم خرج يـوم الـجـمـعة، فـأدركته الجمعة فی بنی سالم بن عوف فی المسجد الذی فی بطن الوادی، وكانت أول جـمـعـة صـلاهـا بـالمدينة(عمدة القاری،لبدر الدين العينی،ج ١،ص ٢٤٤، كتاب الإيمان،باب الصلاة من الإيمان)

[2] عن يحيى بن سعيد، قال :سمعت أبا الحباب سعيد بن يسار، يقول :سمعت أبا هـريرة رضی الله عنه، يقول :قـال رسـول الله صلى الله عليه وسلم :أمرت بقرية تأكل الـقرى، يقولون يثرب، وهی المدينة، تنفی الناس كما ينفی الكير خبث الحديد(صحيح البخاری،رقم الحديث ١٨٧١)

[3] قال شعيب الارنؤوط: إسناده صحيح(حاشية ابی داؤد)

اس حدیث سے استدلال کرتے ہوئے بہت سے فقہاء وعلماء نے شہر کے علاوہ قریہ، یعنی گاؤں میں بھی جمعہ کو جائز قرار دیا ہے، کیونکہ اس حدیث میں ''قـــــــــرية'' کا لفظ استعمال ہوا ہے، جس کے اصل معنیٰ گاؤں کے آتے ہیں، البتہ بعض حضرات کے بقول یہ ''قریہ'' بعد میں شہر بن گیا تھا۔ [1]

---

[1] قوله بجواثی بضم الجيم وتخفيف الواو وقد تهمز ثم مثلثة خفيفة قوله من البحرين فی رواية وكيع قرية من قرى البحرين وفی أخرى عنه من قرى عبد القيس وكذا للإسماعيلی من رواية محمد بن أبی حفصة عن بن طهمان وبه يتم مراد الترجمة .

ووجه الدلالة منه أن الظاهر أن عبد القيس لم يجمعوا إلا بأمر النبی صلى الله عليه وسلم لما عرف من عادة الصحابة من عدم الاستبداد بالأمور الشرعية فی زمن نزول الوحی ولأنه لو كان ذلک لا يجوز لنزل فيه القرآن كما استدل جابر وأبو سعيد على جواز العزل بأنهم فعلوه والقرآن ينزل فلم ينهوا عنه وحكى الجوهری والزمخشری وبن الأثير أن جوائی اسم حصن بالبحرين وهذا لا ينافی كونها قرية وحكى بن التين عن أبی الحسن اللخمی أنها مدينة وما ثبت فی نفس الحديث من كونها قرية أصح مع احتمال أن تكون فی الأول قرية ثم صارت مدينة وفيه اشعار بتقديم إسلام عبد القيس على غيرهم من أهل القرى وهو كذلک كما قررته فی أواخر كتاب الإيمان(فتح الباری شرح صحيح البخاری، للعسقلانی، ج۲، ص ۳۸۰، ۳۸۱، كتاب الجمعة ، قوله باب الجمعة فی القرى والمدن)

واشترط الحنفية لإقامتها المصر أو فناء ه، لقوله عليه الصلاة والسلام" :لا جمعة ولا تشريق إلا فی مصر جامع ."رواه عبد الرزاق.

وأجابوا عن قوله جؤاثی :إنها مدينة، كما قاله البكری، وقول امرء القيس:

ورحنا كأنا من جؤاثی عشية ...نعالی النعاج بين عدل ومحقب.

يريد :كأنا من تجار جؤاثی لكثرة ما معهم من الصيد، وأراد :كثرة أمتعة تجار جؤاثی، وكثرة الأمتعة تدل غالبا على كثرة التجار، وكثرة التجار تدل على أن جؤاثی مدينة قطعا، لأن القرية لا يكون فيها تجار غالبا عادة، ولئن سلمنا أنها قرية، فليس فی الحديث أنه عليه الصلاة والسلام اطلع على ذلک وأقرهم عليه .اهـ.

وقد سبق فی نفس الحديث من رواية وكيع :أنها قرية من قرى البحرين، وفی أخرى عنه :من قرى عبد القيس .وكذا للإسماعيلی من رواية محمد بن أبی حفصة، عن ابن طهمان، وهو نص فی موضع النزاع، فالمصير إليه أولى من قول البكری وغيره، على أنه يحتمل أنها كانت فی الأول قرية، ثم صارت مدينة.

والظاهر أن عبد القيس لم يجمعوا إلا بأمر النبی -صلى الله عليه وسلم-، لما عرف من عادة الصحابة من عدم الاستبداد بالأمور الشرعية فی زمن الوحی، ولأنه لو كان ذلک لا يجوز لنزل فيه

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

جبکہ اس سلسلہ میں حنفیہ کا فرمانا یہ ہے کہ اس حدیث میں مذکور قریہ سے مراد شہر ہے، کیونکہ ''قریہ'' کا اطلاق بعض اوقات شہر پر بھی کیا جاتا ہے، اور قرآن مجید میں بھی اس طرح کا

﴿ گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ ﴾

القرآن، كما استدل جابر وأبو سعيد على جواز العزل، بأنهم فعلوه والقرآن ينزل، فلم ينهوا عنه(إرشاد السارى لشرح صحيح البخارى للقسطلانى، ج۲ ص۱۶۷، كتاب الجمعة ،باب الجمعة فى القرى والمدن)

قوله :(من قرى البحرين) فيه جواز إقامة الجمعة فى القرى، لأن الظاهر أن عبد القيس لم يجمعوا إلا بأمر النبى -صلى الله عليه وسلم -لما عرف من عادة الصحابة من عدم الاستبداد بالأمور الشرعية فى زمن نزول الوحى،ولأنه لو كان ذلك لا يجوز لنزل فيه القرآن كما استدل بذلك جابر وأبو سعيد فى جواز العزل بأنهم فعلوا والقرآن ينزل فلم ينهوا عنه.

وحكى الجوهرى والزمخشرى وابن الأثير :أن جواثى اسم حصن البحرين .قال الحافظ :وهذا لا ينافى كونها قرية .وحكى ابن التين عن أبى الحسن اللخمى أنها مدينة، وما ثبت فى نفس الحديث من كونها قرية أصح مع احتمال أن تكون فى أول الأمر قرية ثم صارت مدينة.

وذهب أبو حنيفة وأصحابه، وبه قال زيد بن على والباقر والمؤيد بالله، وأسنده ابن أبى شيبة عن على -عليه السلام -وحذيفة وغيرهما أن الجمعة لا تقام إلا فى المدن دون القرى .واحتجوا بما روى عن على -عليه السلام -مرفوعا :لا جمعة ولا تشريق إلا فى مصر جامع وقد ضعف أحمد رفعه وصحح ابن حزم وقفه، وللاجتهاد فيه مسرح فلا ينتهض للاحتجاج به.

وقد روى ابن أبى شيبة عن عمر :أنه كتب إلى أهل البحرين أن جمعوا حيث ما كنتم .وهذا يشمل المدن والقرى، وصححه ابن خزيمة .وروى البيهقى عن الليث بن سعد :أن أهل مصر وسواحلها كانوا يجمعون على عهد عمر وعثمان بأمرهما وفيها رجال من الصحابة وأخرج عبد الرزاق عن ابن عمر بإسناد صحيح أنه كان يرى أهل المياه بين مكة والمدينة يجمعون فلا يعتب عليهم، فلما اختلفت الصحابة وجب الرجوع إلى المرفوع(نيل الأوطار، ج۳،ص۲۷۷،۲۷۸،أبواب الجمعة،باب انعقاد الجمعة بأربعين وإقامتها فى القرى)

(بجواثا قرية من قرى البحرين) بضم الجيم وتخفيف الواو وقد تهمز ثم مثلثة خفيفة وهى قرية من قرى عبد القيس أو مدينة أو حصن أو قرية من قرى البحرين.

وفيه جواز إقامة الجمعة فى القرى لأن الظاهر أن عبد القيس لم يجمعوا إلا بأمر النبى لما عرف من عادة الصحابة من عدم الاستبداد بالأمور الشرعية فى زمن نزول الوحى ولأنه لو كان ذلك لا يجوز لنزل فيه القرآن كما استدل بذلك جابر وأبو سعيد فى جواز العزل بأنهم فعلوا والقرآن ينزل فلم ينهوا عنه وحكى الجوهرى والزمخشرى وبن الأثير أن جواثى اسم حصن البحرين.

قال الحافظ وهذا لا ينافى كونها قرية.

وحكى بن التين عن أبى الحسن اللخمى أنها مدينة وما ثبت فى نفس الحديث من كونها قرية أصح

﴿ بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں ﴾

اطلاق کیا گیا ہے، اور جواثی میں بعض مورخین کے مطابق بڑی منڈی تھی، جس سے جمعہ قائم کرنے کے وقت ہی سے اس کا شہر ہونا معلوم ہوتا ہے۔ [1]

بعض مشاہدہ کاروں کے بقول، موجودہ دور میں بھی مسجدِ جواثا، مشرقی سعودی عرب میں، ہفوف شہر سے تقریباً 14 کیلومیٹر دور ''الــکــلابیـــہ'' (Al-Kilabiyah) نامی گاؤں میں واقع ہے، اور اس مسجد کے آثار آج بھی باقی ہیں، جس میں بیس آدمی بھی مشکل سے سَماتے ہیں۔ [2]

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

مع احتمال أن تكون في أول الأمر قرية ثم صارت مدينة.

وذهب أبو حنيفة وأصحابه وأسنده بن أبي شيبة عن علي وحذيفة وغيرهما أن الجمعة لا تقام إلا في المدن دون القرى واحتجوا بما روى عن علي مرفوعا لا جمعة ولا تشريق إلا في مصر جامع وقد ضعف أحمد رفعه وصحح بن حزم وقفه وللاجتهاد فيه مسرح فلا ينهض للاحتجاج به.

وقد روى بن أبي شيبة عن عمر أنه كتب إلى أهل البحرين أن جمعوا حيث ما كنتم وهذا يشمل المدن والقرى وصححه بن خزيمة.

وروى البيهقي من طريق الوليد بن مسلم سألت الليث بن سعد فقال كل مدينة أو قرية فيها جماعة أمروا بالجمعة فإن أهل مصر وسواحلها كانوا يجمعون على عهد عمر وعثمان بأمرهما وفيهما رجال من الصحابة.

وأخرج عبد الرزاق عن بن عمر بإسناد صحيح أنه كان يرى أهل المياه بين مكة والمدينة يجمعون فلا يعيب عليهم فلما اختلف الصحابة وجب الرجوع إلى المرفوع، كذا في فتح الباري. ويؤيد عدم اشتراط المصر حديث أم عبد الله الدوسية الآتي ويجيء بسط الكلام فيه في آخر الباب(عون المعبود شرح سنن أبي داود، ج٣، ص ٢٨٠، ٢٨١، كتاب الصلاة، باب الجمعة في القرى)

[1] قلنا :لا نسلم أنها قرية، بل هي مدينة كما حكينا عن البكري وغيره، حتى قيل :كان يسكن فيها فوق أربعة آلاف نفس، والقرية لا تكون كذلك، وإطلاق القرية عليها من الوجه الذي ذكرناه. ولئن سلمنا أنها قرية فليس في الحديث أنه صلى الله عليه وسلم اطلع على ذلك وأقرهم عليه(عمدة القاري للعيني، ج٦ ص١٨٧، كتاب الجمعة، باب الجمعة في القرى والمدن)

[2] الكلابية (بكسر الكاف وفتح اللام)، هي قرية سعودية تقع شرق مدينة المبرز، وتبعد عن مدينة الهفوف بنحو 14 كيلومتر وجميع أهل الكلابية من أهل السنة والجماعة .يوجد حول الكلابية مسجد جواثا الاثري وقصر عين بنت قنيص (الكلابية، https://www.marefa.org/)

وعن ابن عباس رضي الله عنهما قال:(أول جمعة جمّعت بعد جمعة >في <مسجد رسول الله صلى الله عليه وسلم في مسجد عبد القيس بجُواثى البحرين) أخرجه البخاري في الصحيح وغيره.

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

بہر حال، جو کچھ بھی ہو، مذکورہ روایت سے گاؤں میں نمازِ جمعہ کے قیام پر استدلال کیا گیا ہے، جو کہ گاؤں، دیہات میں نمازِ جمعہ کے لیے معقول مستدل ہے، جب تک اس کے مقابلہ میں گاؤں میں جمعہ کی نفی کسی مضبوط دلیل سے ثابت نہ ہو۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

أَنَّهُمْ كَتَبُوْا إِلٰى عُمَرَ يَسْأَلُوْنَهُ عَنِ الْجُمُعَةِ ؟ فَكَتَبَ: جَمِّعُوْا حَيْثُمَا

﴿ گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ ﴾

وفی روایة أبی داود :(بجواثی قریة من قری البحرین)

قلت ومازالت جدران هذا المسجد قائمة إلى وقتنا هذا وقد صليتُ فيه فوجدته لا يتسع لعشرين رجلا(فتوى بخصوص صلاة الجمعة فى القرى، لمحمد الحسن بن الددو الشنقيطى، الموقع العلمى لفضيلة الشيخ محمد الحسن الددو الشنقيطى)

(https://dedewnet.com/index.php/news/852.html)

يحظى مسجد جواثا التاريخى بالأحساء بأهمية خاصة لكونه ثانى مسجد صليت فيه صلاة الجمعة فى الإسلام بعد مسجد رسول الله صلى الله عليه وسلم.

ويقع المسجد على بعد نحو 20 كلم باتجاه الشمال الشرقى لمدينة الهفوف، وقد بنى هذا المسجد أول مرة فى عهد الرسول محمد صلى الله عليه وسلم، حيث قام ببنائه (بنو عبد قيس) الذين كانوا يسكنون الأحساء آنذاک .ولا تزال قواعد هذا المسجد قائمة إلى وقتنا الحالى.

ويعود تاريخ المسجد إلى بداية العصر الإسلامى حيث كانت تقطن المنطقة قبيلة بنى عبد القيس الذين كان لهم السبق فى اعتناق الإسلام والعمل بتعاليمه والجهاد تحت رايته .إذ يذكر أن حاكم عبد القيس المنذر بن عائذ الملقب بالأشج فور علمه بظهور النبى صلى الله عليه وسلم، أوفد رسولاً إلى مكة لاستجلاء الأمر .وحين وصل بالعلم اليقين أسلم وأسلم جميع أفراد قبيلته، وأقام مسجد جواثا .وقد ذكرت جواثا فى معظم الكتب التاريخية فقد ذكرها الهمدانى فى وصفه جزيرة العرب وكذلک ذكرها البكرى، واشتهرت فى كتب التاريخ والجغرافيا والأدب بمدينة الرخاء .

وعرف عن جواثا أنها مركز تجارى تقصدها القوافل التجارية وتعود منها محملة ببضائع التمور والمنتجات الزراعية والعطور وربما كانت سوقاً تجارية ترد إليها تجارة جنوب الجزيرة العربية لموقعها المميز حيث تقع على طريق القوافل المتنقلة من الساحل إلى وسط الجزيرة العربية .وقد استمر عمرانها خلال الفترات الإسلامية المبكرة.

ويقول الشيخ حمد الجاسر فى كتابه المعجم الجغرافى للمنطقة الشرقية اختفاء آثار المسجد يعود إلى زحف الرمال، وعلى الرغم من وقوع جواثا فى مرتفع من الأرض إلا أن الرمال المتموجة قد داهمت القرية من جهتها الغربية وغطت معظم منازلها، وأشار إلى أن طول المسجد يبلغ 20ذراعاً وعرضه 10أذرع.

(http://www.alriyadh.com/1686856)

کُنْتُمْ (مُصنف ابن أبی شیبة ،رقم الحدیث ۵۱۰۸، کتاب الصلاة، باب من کان یری الجمعة فی القری وغیرها)

ترجمہ: لوگوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کولکھ کر جمعہ کے بارے میں سوال کیا، تو ان کوحضرت عمر رضی اللہ عنہ نے لکھ کر یہ جواب بھیجا کہ تم جہاں بھی ہو، جمعہ پڑھ لیا کرو (ابن ابی شیبہ)

اس روایت میں چونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے شہر کی قید نہیں لگائی، جس سے استدلال کرتے ہوئے بہت سے فقہاء وعلماء نے شہر اور گاؤں میں جمعہ کی نماز کو درست اور جائز قرار دیا ہے۔ [1]

لیکن اس سلسلہ میں حنفیہ کا فرمانا یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مطلب یہ تھا کہ تم جس شہر میں بھی ہو، وہاں نمازِ جمعہ پڑھ لیا کرو، کیونکہ انہوں نے یہ مکتوب اپنے عاملوں (یعنی گورنروں) کولکھا تھا، اور عامل (اور گورنر) عموماً شہروں میں ہوتے ہیں۔ [2]

---

[1] وقد روى ابن أبی شیبة عن عمر :أنه کتب إلی أهل البحرین أن جمعوا حیث ما کنتم .وهذا یشمل المدن والقری، وصححه ابن خزیمة .وروی البیهقی عن اللیث بن سعد :أن أهل مصر وسواحلها کانوا یجمعون علی عهد عمر وعثمان بأمرهما وفیها رجال من الصحابة وأخرج عبد الرزاق عن ابن عمر بإسناد صحیح أنه کان یری أهل المیاه بین مکة والمدینة یجمعون فلا یعتب علیهم(نیل الاوطار للشوکانی، ج۳ص ۲۷۸،ابواب الجمعة، باب انعقاد الجمعة بأربعین وإقامتها فی القری)

ودلیلنا مع ما ذکرناه من الظواهر المتقدمة قوله صلی الله علیه وسلم :جمعوا حیث کنتم ولم یخص بلدا من قریة ، فکان علی عمومه ، وروی أن النبی صلی الله علیه وسلم کتب إلی قریة مزنیة أن یصلوا الجمعة والعیدین وروی أن أسعد بن زرارة صلی أول جمعة فی الإسلام بالمدینة ، فی حرة بنی بیاضة ، بموضع یقال له الخضمات ولم یکن مصرا(الحاوی فی فقه الشافعی للماوردی، ج۲ص ۴۰۸، کتاب الجمعة وغیرها من امرها)

[2] قلنا :أما الجواب عن الأول :فمعناه :جمعوا حیث ما کنتم من الأمصار، ألا تری أنها لا تجوز فی البراری(شرح ابی داؤد للعینی، ج۴ص ۳۹۳، کتاب الجمعة ، باب الجمعة فی القریٰ)

وأما أثر عمر رضی الله تعالی عنه :جمعوا حیث ما کنتم فخطاب للولاة، وکانوا یکونون فی الأمصار دون القری(فیض الباری علی صحیح البخاری، ج۲ص ۴۲۵، کتاب الجمعة، باب الجمعة فی القری والمدن)

لیکن اس کے جواب میں یہ کہنا ممکن ہے کہ اس زمانے میں نمازِ جمعہ کے انتظامات عاملوں کے ذمہ تھے اور جس طرح ان کی ضرورت شہر میں موجود ہونے کی ہوسکتی ہے، اسی طرح ضرورت گاؤں دیہات میں موجود ہونے کی بھی پیش آسکتی ہے، اور جب "جہاں بھی تم ہو" کا حکم موجود ہے، تو صرف ایک احتمال سے اس عام حکم میں تخصیص پیدا کرنا زیادہ اہم نہ ہوگا۔

بہر حال اس واقعہ میں دونوں فریقوں نے اپنی اپنی اجتہادی آراء قائم فرمائیں، جو دلائل، نیک نیتی اور اخلاص پر مبنی ہیں، اور مسئلہ بہر حال مجتہَد فیہا ہے۔

حضرت مالک بن انس رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ:

كَانَ أَصْحَابُ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ هٰذِهِ الْمِيَاهِ بَيْنَ مَكَّةَ وَالْمَدِيْنَةِ يُجَمِّعُوْنَ (مُصنف ابن أبی شیبة ، رقم الحدیث ۵۱۱۱۹، کتاب الصلاة، باب من کان یری الجمعة فی القری وغیرها)

ترجمہ: محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم، مکہ اور مدینہ کے درمیان ان چشموں کے قریب بستیوں میں جمعہ قائم فرماتے تھے (ابنِ ابی شیبہ)

اس روایت سے استدلال کرتے ہوئے بہت سے فقہاء وعلماء نے گاؤں میں نمازِ جمعہ کو درست قرار دیا ہے، کیونکہ ان چشموں کے قریب بستیوں سے مراد گاؤں ہی ہیں۔ [1]

اور یہ بات معلوم ہے کہ اگر صحابۂ کرام کے علم کے مطابق، گاؤں، دیہات میں نمازِ جمعہ کی کسی طرح گنجائش نہ ہوتی، تو وہ اس طرح کے مقامات میں نمازِ جمعہ قائم نہ فرماتے۔

حضرت نافع رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ:

---

[1] عن عمر أنه كتب إلى أهل البحرين أن جمعوا حيثما كنتم وهذا يشمل المدن والقرى أخرجه بن أبي شيبة أيضا من طريق أبي رافع عن أبي هريرة عن عمر وصححه بن خزيمة وروى البيهقي من طريق الوليد بن مسلم سألت الليث بن سعد فقال كل مدينة أو قرية فيها جماعة أمروا بالجمعة فإن أهل مصر وسواحلها كانوا يجمعون الجمعة على عهد عمر وعثمان بأمرهما وفيهما رجال من الصحابة وعند عبد الرزاق بإسناد صحيح عن بن عمر أنه كان يرى أهل المياه بين مكة والمدينة يجمعون فلا يعيب عليهم فلما اختلف الصحابة وجب الرجوع إلى المرفوع (فتح الباری لابنِ حجر، ج۲ص ۳۸۰، کتاب الجمعة ، قوله باب الجمعة فی القری والمدن)

عَنْ اِبْنِ عُمَرَ: أَنَّہٗ کَانَ یَرٰی أَھْلَ الْمِیَاہِ بَیْنَ مَکَّۃَ وَالْمَدِیْنَۃَ یُجَمِّعُوْنَ فَلَا یُعِیْبَ ذٰلِکَ عَلَیْھِمْ (الأوسط فی السنن والإجماع والاختلاف، ج۴ ص۲۶،رقم الحدیث ۱۷۴۷، کتاب صفة الصلاة، باب ذکر اختلاف أھل العلم فی القری التی یجب علی أھلھا الجمعة)

ترجمہ: حضرت ابنِ عمر رضی اللہ عنہ مکہ اور مدینہ کے درمیان پانی والے (یعنی چشموں کے قریب آباد) لوگوں کو جمعہ پڑھتے ہوئے دیکھتے تھے، اوران پرکوئی عیب نہیں لگاتے تھے (الاوسط)

مکہ ومدینہ کے درمیان چشموں کے قریب آباد گاؤں والوں کے جمعہ قائم کرنے کو دیکھ کر حضرت ابنِ عمر رضی اللہ عنہ کے اعتراض نہ کرنے سے استدلال کرتے ہوئے بہت سے فقہاء وعلماء نے گاؤں میں نمازِ جمعہ کو درست قرار دیا ہے، جیسا کہ پہلے گزرا۔

حضرت ابوعبدالرحمٰن سلمی رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ:

أَنَّ عَلِیًّا رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ: لَا جُمُعَۃَ وَلَا تَشْرِیْقَ إِلَّا فِیْ مِصْرٍ جَامِعٍ (الجمعة وفضلھا للمروزی، ص۸۹،رقم الحدیث ۶۹،باب ما جاء فیمن مات یوم الجمعة أو لیلة الجمعة، مصنف ابنِ ابی شیبة، رقم الحدیث ۵۰۹۸، من قال :لا جمعة ، ولا تشریق إلا فی مصر جامع)

ترجمہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ نہیں ہے جمعہ اور تشریق، مگر مصرِ جامع میں (مروزی، ابن ابی شیبہ)

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اس روایت کو متعدد حضرات نے سند کے اعتبار سے صحیح قرار دیا ہے۔ [1]

---

[1] ومن ذلک حدیث علی لا جمعة ولا تشریق إلا فی مصر جامع أخرجه أبو عبید بإسناد صحیح إلیه موقوفا ومعناه لا صلاة جمعة ولا صلاة عید(فتح الباری لابنِ حجر، ج ۲ ص۴۵۷،ابواب العیدین، باب فضل العمل فی ایام التشریق)

فقد صح عن علی -رضی الله عنه :-لا جمعة ولا تشریق إلا فی مصر جامع(المحلیٰ بالآثار لابنِ حزم، ج۳ ص۲۵۶، کتاب الصلاة، باب صلاة الجمعة)

اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی یہ روایت ایک اور سند سے بھی مروی ہے، جس میں یہ الفاظ ہیں:

”لا جمعة ، ولا تشريق ، ولا صلاة فطر ، ولا أضحى ، إلا في مصر جامع ، أو مدينة عظيمة“

”نہیں ہے جمعہ، اور نہ تشریق، اور نہ عید کی نماز، اور نہ عیدالاضحیٰ کی نماز، مگر مصرِ جامع میں، یا بڑے شہر میں“ [1]

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اس روایت کو بعض حنفیہ نے مرفوع حدیث کا درجہ دیا ہے، جبکہ بعض دیگر حضرات نے اس کو مرفوع حدیث کا درجہ دینے سے اختلاف کیا ہے، اور بعض نے اس کی بعض اسناد کو ضعیف قرار دیا ہے۔ [2]

---

[1] حدثنا عباد بن العوام ، عن حجاج ، عن أبي إسحاق ، عن الحارث ، عن علي ، قال :لا جمعة ، ولا تشريق ، ولا صلاة فطر ، ولا أضحى ، إلا في مصر جامع ، أو مدينة عظيمة .

قال حجاج :وسمعت عطاء يقول مثل ذلك(مصنف ابنِ ابی شیبة، رقم الحديث ۵۰۹۸،۵۰۹۹، كتاب الصلاة،باب من قال :لا جمعة ، ولا تشريق إلا في مصر جامع)

[2] ثم يجب أن يحمل على كونه سماعا ;لأن دليل الافتراض من كلام الله تعالى يفيده على العموم في الأمكنة، فإقدامه على نفيها في بعض الأماكن لا يكون إلا عن سماع ;لأنه خلاف القياس المستمر في مثله(مرقاة المفاتيح ، ج ۳، ص ۱۰۵۰ ،كتاب الصلاة،باب الخطبة والصلاة)

واحتجوا بما روى عن علي -عليه السلام -مرفوعا :لا جمعة ولا تشريق إلا في مصر جامع وقد ضعف أحمد رفعه وصحح ابن حزم وقفه، وللاجتهاد فيه مسرح فلا ينتهض للاحتجاج به. وقد روى ابن أبي شيبة عن عمر :أنه كتب إلى أهل البحرين أن جمعوا حيث ما كنتم .وهذا يشمل المدن والقرى، وصححه ابن خزيمة .وروى البيهقي عن الليث بن سعد :أن أهل مصر وسواحلها كانوا يجمعون على عهد عمر وعثمان بأمرهما وفيها رجال من الصحابة وأخرج عبد الرزاق عن ابن عمر بإسناد صحيح أنه كان يرى أهل المياه بين مكة والمدينة يجمعون فلا يعتب عليهم، فلما اختلفت الصحابة وجب الرجوع إلى المرفوع.

ويؤيد عدم اشتراط المصر حديث أم عبد الله الدوسية المتقدم .وذهب الهادي إلى اشتراط المسجد، قال :لأنها لم تقم إلا فيه (نيل الاوطار للشوكاني، ج۳، ص۲۷۸، ابواب الجمعة، باب انعقاد الجمعة بأربعين وإقامتها في القرى)

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اس روایت سے استدلال کرتے ہوئے حنفیہ نے فرمایا کہ جمعہ کی نماز شہر کے ساتھ خاص ہے، اور گاؤں میں جمعہ کی نماز واجب نہیں، اور درست بھی نہیں۔

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

"لا جمعة ولا تشريق إلا فی مصر جامع ."لا أصل له مرفوعا.
فيما علمت .إلا قول أبی يوسف فی "كتاب الآثار "له رقم (296) " : وزعم أبو حنيفة أنه بلغه عن النبی صلى الله عليه وسلم أنه قال " ....فذكره مرفوعا، وهذا وهم، وإليه أشار أبو يوسف بقوله " :وزعم أبو حنيفة "مع أنه إمام، على أنه معضل، وقد أشار إلى ما ذكرنا الحافظ الزيلعی فی "نصب الراية "بقوله (2/159) " : غريب مرفوعا، وإنما وجدناه موقوفا على علی ."وأوهم الحافظ ابن حجر أنه مرفوع، فقال فی "التلخيص "(132) " حديث علی :لا جمعة ولا تشريق إلا فی مصر، ضعفه أحمد ."وقال النووی فی "المجموع "(4/488) " : ضعيف جدا ."كذا قالا، ولم يذكرا من خرجه، ولا إسناده لينظر فيه، وما أظنه إلا وهما منهما، ومما يؤيد ذلک أن الإمام أحمد إنما ضعف الموقوف على علی، وأما المرفوع فما ذكره، ولا أعتقد أنه سمع به. !
قال إسحاق بن منصور المروزی فی "مسائله عن الإمام أحمد "(ص 219) " : ذكرت له قول علی " :لا جمعة ولا تشريق إلا فی مصر جامع "؟ قال :الأعمش لم يسمعه من سعد ."
قلت :سعد هذا هو ابن عبيدة، وقد أخرجه ابن أبی شيبة فی "المصنف "(1/ 204 /1) " : أخبرنا أبو معاوية عن الأعمش عن سعد بن عبيدة عن أبی عبد الرحمن السلمی عن علی قال :فذكره .ورواه علی بن الجعد الجوهری فی "حديثه "(12/ 1/178) من طريق أبی جعفر الرازی عن الأعمش به، وأعله أحمد بالانقطاع بين الأعمش وسعد بن عبيدة .قلت :لكن لم يتفرد به الأعمش، بل تابعه طلحة وهو ابن مصرف عند ابن أبی شيبة، وزبيد اليامی عند الطحاوی فی "مشكل الآثار "(2/54) والبيهقی أيضا فی "السنن "(3/179) كلاهما عن سعد بن عبيدة به .وسعد بن عبيدة ثقة من رجال الستة، ومثله أبو عبد الرحمن السلمی فالسند صحيح موقوفا، وصححه ابن حزم فی "المحلى "(5/53) وهو مقتضى كلام أبی جعفر الطحاوی، ولكنه قال " :لم يقله علی رضی الله عنه رأيا، إذ كان مثله لا يقال بالرأی، وإنما قاله بتوقيف عن رسول الله صلى الله عليه وسلم!
كذا قال، وفيه نظر واضح، فإن القلب يشهد أن ذلک يقال بالرأی والاجتهاد، ولذلک ظلت المسألة من موارد النزاع، وقد صح خلافه عن عمر بن الخطاب أفيقال :إنه توقيف أيضا مع أنه هو الصواب؟ !فروى ابن أبی شيبة فی باب من كان يرى الجمعة فی

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

جبکہ بعض دیگر حضرات نے اس روایت میں مصرِ جامع سے قریہ، یعنی گاؤں، دیہات کو مراد لیا ہے، کیونکہ مصرِ جامع بول کر بعض اوقات اکٹھی وجمع شدہ شکل کی آبادی بھی مراد لی جایا کرتی ہے۔

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

القرى وغيرها، من طريق أبى رافع عن أبى هريرة أنهم كتبوا إلى عمر يسألونه عن الجمعة، فكتب " :جمعوا حيثما كنتم ."

قلت :وإسناده صحيح على شرط الشيخين، وأبو رافع هذا اسمه نفيع بن رافع الصائغ المدنى، واحتج بهذا الأثر الإمام أحمد على تضعيف أثر على وزاد " :وأول جمعة جمعت بالمدينة، جمع بهم مصعب بن عمير، فذبح لهم شاة، فكفتهم، وكانوا أربعين، وليس ثم أحكام تجرى ."قال إسحاق المروزى " :قلت له :أليس ترى فى قرى مرولو جمعوا؟ قال :نعم ."ثم روى ابن أبى شيبة (1/ 204 /2) بسند صحيح عن مالك قال " :كان أصحاب محمد صلى الله عليه وسلم فى هذه المياه بين مكة والمدينة يجمعون ."وروى البخارى (2/ 316 بشرح الفتح) وأبو داود (1068) وغيرهما عن ابن عباس قال :لجمعة جمعت بـ (جوثاء) ، قرية من قرى البحرين، وفى رواية: قرية من قرى عبد القيس ."وترجم له البخارى وأبو داود بـ "باب الجمعة فى القرى ".

قال الحافظ " :ووجه الدلالة منه أن الظاهر أن عبد القيس لم يجمعوا إلا بأمر النبى صلى الله عليه وسلم لما عرف من عادة الصحابة من عدم الاستبداد بالأمور الشرعية فى زمن نزول الوحى، ولأنه لوكان ذلك لا يجوز لنزل فيه القرآن، كما استدل جابر وأبو سعيد على جواز العزل بأنهم فعلوه والقرآن ينزل، فلم ينهو اعنه ."

قلت :وفى هذه الآثار السلفية عن عمر ومالك وأحمد من الاهتمام العظيم اللائق بهذه الشعيرة الإسلامية الخالدة :صلاة الجمعة حيث أمروا بأدائها والمحافظة عليها حتى فى القرى وما دونها من أماكن التجمع، وهذا -دون أثر على -هو الذى يتفق مع عمومات النصوص الشرعية وإطلاقها، وبالغ التحذير من تركها وهى معروفة، وحسبى الآن أن أذكر بآية من القرآن :(يا أيها الذين آمنوا إذا نودى للصلاة من يوم الجمعة فاسعوا إلى ذكر الله وذروا البيع) ، وصلاة الظهر بعدها ينافى تمامها :(فإذا قضيت الصلاة فانتشروا فى الأرض وابتغوا من فضل الله).

ولما سافرت فى رمضان سنة 1396إلى بريطانيا سرنى جدا أننى رأيت المسلمين فى لندن يقيمون صلاة الجمعة والعيد أيضا، وبعضهم يصلون الجمعة فى بيوت اشتروها أو استأجروها وجعلوها (مصليات) يصلون فيها الصلوات الخمس والجمعات، فقلت فى نفسى :لقد أحسن هؤلاء بالمحافظة على هذه العبادة العظيمة هنا فى بلاد الكفر، ولو

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

اور بعض حضرات نے فرمایا کہ اس کے مقابلہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور بعض دیگر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا ارشاد وعمل بھی ہے، لہٰذا ان کے پیشِ نظر گاؤں میں جمعہ قائم کر لینا درست ہے۔ [1]

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

تعصبوا لمذهبهم وجلهم من الحنفية -لعطلوها وصلوها ظهرا !فازددت يقينا بأنه لا سبيل إلى نشر الإسلام والمحافظة عليه إلا بالاستسلام لنصوص الكتاب والسنة، واتباع السلف الصالح، المستلزم الخروج عن الجمود المذهبى إلى فسيح دائرة الإسلام، الذى بنصوصه التى لا تبلى يصلح لكل زمان ومكان، وليس بالتعصب المذهبى، والله ولى التوفيق(سلسلة الأحاديث الضعيفة والموضوعة، تحت رقم الحديث ٩١٧)

[1] وأما أبو حنيفة فإنه يستدل بقوله -صلى الله عليه وسلم :-لا جمعة ولا تشرين إلا فى مصر جامع وقد أجيب عن هذا بأنه موقوف على على ابن أبى طالب رضى الله عنه . وأيضًا فإنه مرسل فإن الأعمش رواه عن سعيد ولم يصله .وأيضًا فإن كل قرية هى قرار، لأهلها مصر، كما أن كل مصر قرية *كلا وقد سمى الله مصر قرية لقوله تعالى :(واسأل القرية التى كنا فيها).

وتسمى مكة أم القرى .وليس على العرف الآن :على ترک تسمية القرية مصرًا يوجب کون ذلک هو عرف العرب أو لسانهم .ويستدل أبو حنيفة أيضًا بأن الصحابة فتحوا البلدان والقرى ولم يشتغلوا ابنصب المنابر فى القرى ولا أمروا بإقامة الجمعات فيها، ولو كانت واجبة لما أعرضوا عنها

وهى من أظهر شعار الإِسلام .ولأن السلطان شرط فى إقامتها .ومقام السلطان فى الأمصار على غالب العادات ولأن أمر الجمعة مبنى على العموم .ولهذا لا يحل لأحد من أهلها أن يتخلف عنها، ولا أن تقام الجماعات حتى تصلى الجمعة .وهذا يشعر بأنها من شعار الإِسلام العامة .فلهذا لا تقام بكل مكان كسائر الصلوات .وإذا كان هذا هكذا وجب أن تخص بمكان جامع للعامة ليتحقق معنى .الشعار للعموم بذلک الاختصاص . وهذا لا يحصل إلا فى الأمصار الجامعة.

والذى قدمناه من الجمع بجؤاثى يرد هذا الذى قاله .وأما ما أشرنا إليه من الاختلاف فيما كان فيه جماعة استقروا وفقد الشبه من ناحية الأبنية .فإن ما قدمناه من الإشارة يطلع منها على سبب الاختلاف .وأيضًا فإن قبائل العرب كانت حول المدينة ولم ينقل أن النبى -صلى الله عليه وسلم -أمرهم بإقامة الجمعة .وهذا فيه أيضًا رد لمذهب أبى ثور ويرده أيضًا أن النبى -صلى الله عليه وسلم -وقف بعرفة، وكان يوم جمعة، ولم يجمّع .وتعلقه بأن عمر كتب إلى أبى هريرة رضى الله عنهما أن جمّعوا حيث كنتم.

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

اوربعض حضرات نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مذکورہ روایت میں اس معنیٰ کا احتمال قرار دیا

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

محمله على المواضع التى تقام فيها الجمعة بدليل ما ذكرناه من الأدلة المتقدمة(شرح التلقين،لابى عبد الله محمد بن على بن عمر التميمى المازرى المالكى ،ج ا ص ٩٥١، ٩٥٢، كتاب الطهارة، باب الجمعة)

وروى ابن أبى شيبة عن عبد الله بن إدريس عن سعيد عن عطاء عن أبى ميمون عن أبى رافع عن أبى هريرة أنهم كتبوا إلى عمر رضى الله عنه يسألونه عن الجمعة فكتب جمعوا حيث ما كنتم وليس فى هذا الأثر عن عمر رضى الله عنه تعرض للتعدد وإنما فيه إجازته الجمعة فى أى مكان كان من القرى والمدن.

وروى ابن أبى شيبة عن غندر عن شعبة عن مغيرة عن إبراهيم قال لا جمعة ولا تشريق إلا فى مصر جامع .

وعن أبى معاوية عن الأعمش عن سعد بن عبيدة عن عبد الرحمن السلمى عن على رضى الله عنه قال لا تشريق ولا جمعة إلا فى مصر .

وهذا مع الأول يقتضى الحكم بصحة ذلك عن على رضى الله عنه وإن كان سفيان رضى الله عنه أيضا مدلسا لكنه جليل ورأيت فى علل الحديث التى رواها الأثرم عن أحمد قلت لأبى عبد الله وروى أبو إسرائيل شيئا غريبا فقال أبو عبد الله نعم لا جمعة ولا تشريق إلا فى مصر جامع وهذا من أحمد يقتضى التوقف فى تصحيحه وعلى تقدير صحته فهذا اختلاف بين عمر وعلى رضى الله عنهما فى اشتراط المصر(فتاوىٰ السبكى،لأبى الحسن تقى الدين على بن عبد الكافى السبكى، ج ا ص ١٧١، كتاب الصلاة، باب الجمعة ،الاعتصام بالواحد الأحد من إقامة جمعتين فى بلد)

والذى عليه الجمهور كمالك والشافعى وأحمد أن الجمعة تقام فى القرى ؛ لأن فى الصحيح عن ابن عباس أنه قال " :أول جمعة جمعت فى الإسلام بعد جمعة المدينة جمعة "بجواثى "قرية من قرى البحرين "وكان ذلك على عهد رسول الله صلى الله عليه وسلم حين قدم عليه وفد عبد القيس .وكذلك كتب عمر بن الخطاب إلى المسلمين يأمرهم بالجمعة حيث كانوا .

وكان عبد الله بن عمر يمر بالمياه التى بين مكة والمدينة وهم يقيمون الجمعة فلا ينكر عليهم .وأما قول على رضى الله عنه لا جمعة ولا تشريق إلا فى مصر جامع .فلو لم يكن له مخالف لجاز أن يراد به أن كل قرية مصر جامع كما أن المصر الجامع يسمى قرية .وقد سمى الله مكة قرية بل سماها "أم القرى "بل وما هو أكبر من مكة كما فى قوله :(وكأين من قرية هى أشد قوة من قريتك التى أخرجتك أهلكناهم فلا ناصر لهم) وسمى مصر القديمة قرية بقوله :(واسأل القرية التى كنا فيها والعير التى أقبلنا فيها) . ومثله فى القرآن كثير والله أعلم (مجموع الفتاوىٰ لابنِ تيمية، ج٢٤ ص ٢١٠، كتاب الفقه، الصلاة،باب صلاة الجمعة)

ہے کہ گاؤں والوں پر جمعہ کی نماز کا پڑھنا واجب نہیں، نہ یہ کہ اگر وہ جمعہ پڑھیں، تو صحیح بھی نہیں، مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب دہلوی رحمہ اللہ کا رجحان بھی اسی طرف ہے۔ [1]

جس کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی طرف سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مذکورہ روایت کے ذریعے حنفیہ نے یہ بھی استدلال کیا ہے کہ گاؤں والوں پر تکبیرِ تشریق واجب نہیں۔ [2]

---

[1] چنانچہ مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب دہلوی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ:

"لاجمعة ولا تشريق الخ" حنفیہ نے اس میں "لا" سے نفیِ صحت مراد لی ہے، مگر محتمل ہے کہ نفیِ وجوب مراد ہو (کفایت المفتی مدلل ومکمل، ج۳ص۲۴۲، کتاب الصلاۃ، مطبوعہ: دارالاشاعت، کراچی، سنِ طباعت: جولائی 2001ء)

مزید لکھتے ہیں کہ:

شرطیتِ مصر وجوبِ جمعہ کے لیے تو صحیح ہے، لیکن جواز کے لیے بھی ہو، یہ میں نہیں سمجھ سکا (ایضاً ج۳ص ۲۵۴)

مفتی کفایت اللہ صاحب رحمہ اللہ کے مذکورہ موقف کے مطابق ان تمام روایات اور واقعات کی بھی تطبیق ہوجاتی ہے، جن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام کے زمانہ میں بہت سے دیہات میں نمازِ جمعہ کا قائم کرنا ثابت نہیں، کیونکہ عدمِ ثبوت سے عدمِ وجوب کا حکم تو ثابت ہوتا ہے، عدمِ صحت کا ثابت نہیں ہوتا، اور جن روایات سے ثبوت ملتا ہے، وہ صحت کو ثابت کرتی ہیں، اور کوئی صحیح وصریح مرفوع حدیث ایسی موجود نہیں، جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے گاؤں میں جمعہ کی صحت کی نفی فرمائی ہو، اس صورت میں "لاجمعة الخ" کا مطلب یہ ہوگا کہ "لايجب الجمعة الا فى مصر جامع" واللہ اعلم۔

[2] مسألة :(من تجب عليه تكبيرات التشريق)

قال :(وقال أبو حنيفة :هذا التكبير على المقيمين فى جماعات المكتوبات فى الأمصار، وليس على منفرد، ولا فى السواد، ولا على المسافرين، ولا عل النساء إذا صلين وحدهن.

وقال أبو يوسف ومحمد :على كل مصلى فرض، كائنًا من كان.

قال أبو بكر :لأبى حنيفة ما روى عن النبى صلى الله عليه وسلم، وعن على رضى الله عنه" :لا جمعة ولا تشريق إلا فى مصر جامع."

واسم التشريق يتناول صلاة العيد وتكبير التشريق والأضحية، وعموم اللفظ ينفى ذلک كله فى غير مصر.

ويدل على أن التكبير مراد به، ما ذكر فى خبر آخر" :لا جمعة، ولا تشريق، ولا (صلاة فطر)، ولا أضحى إلا فى مصر جامع."

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

اور امام محمد رحمہ اللہ کی ”کتابُ الاصل“ میں مذکور، امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی ایک عبارت

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

وإذا ثبت أنه مخصوص بالمصر، وجب أن يكون مخصوصًا بالجماعة، وبمن تجب عليه الجماعة كالجمعة(شرح مختصر الطحاوى،للجصاص، ج٢،ص١٦٦، كتاب الصلاة،باب صلاة العيدين)

قال أبو حنيفة :من شرط تكبير التشريق المصر والإقامة.

وقال أبو يوسف ومحمد :يكبر المسافر.

وهو قول الشافعي.

لنا :قول -عليه السلام :-(لا جمعة ولا تشريق ولا أضحى ولا فطر إلا فى مصر جامع). والمراد بالتشريق تكبيره؛ لأنه مأخوذ من الظهور .ولا يجوز أن يقال :إن الأصمعى قال :التشريق الصلاة؛ لأنها تفعل عند إشراق الشمس؛ لأن الصلاة قد فهمت من قوله: (لا فطر ولا أضحى)، فلم يحمل اللفظ على التكرار .ولا يجوز أن يحمل على تشريق اللحم؛ لأن الأضحية لا تختص بالمصر .ولأنه ذكر زائد يلى الصلاة ويختص بها فاختص ببعض الأماكن، كالخطبة .ولا يلزم التثويب؛ لأنه لا يلى الصلاة .ولا التلبية؛ لأنها لا تختص الصلاة .ولأن الأذكار تارة تتقدم الصلاة وتارة تتأخر، فإذا كان ما يتقدم يجوز أن يختص ببعض الأماكن فالمتأخر مثله(التجريد للقدورى، ج٢،ص٩٩٣،كتاب الصلاة،من شرط تكبير التشريق المصر والإقامة)

وأما الكلام فيمن يجب عليه هذا التكبير فنقول :على قول أبى حنيفة رحمه الله :لا تجب هذه التكبيرات مقصودا إلا على الرجال المقيمين فى الأمصار عقيب الصلوات المكتوبات بالجماعة، وهو مذهب عبد الله بن عمر رضى الله عنهما.

وقال أبو يوسف، ومحمد رحمهما الله :يجب على كل من تجب عليه الصلاة المكتوبة فى أيام التشريق، الرستاقى والبلدى والمسافر والمقيم والذى يصلى وحده والذى يصلى بجماعة سواء ، وهو قول إبراهيم، وعامر.

فوجه قولهما :أن التكبير تبع للمكتوبة فيجب على كل من تجب عليه المكتوبة بطريق التبعية.

وجه قول أبى حنيفة رحمه الله :قوله عليه السلام :لا جمعة ولا تشريق إلا فى مصر جامع والمراد من التشريق تكبير أيام التشريق هكذا قاله النضر بن شميل، والخليل بن أحمد وهما كانا من أئمة اللغة، ولأن التشريق حقيقته تقديد اللحم؛ لأنه تفعيل من شرق تشريقا إذا قطع وأظهر للشمس سمى تقديد اللحم تشريقا؛ لأن فى ذلك تقطيعه وإظهاره للشمس والحقيقة وهو التقديد ليس بمراد؛ لأنه لا يختص بالمصر وله مجاز أن الصلاة والتكبير فى أدبار الصلوات لأن فى ذلك إظهار شعار الإسلام فإن أمكن حمله عليهما يحمل عليهما ويكون هذا تبعا للصلاة والتكبير إلا فى مصر جامع، وإن لم

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

کے انداز سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ [1]

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

یمکن حمله علیهما یحمل علی التکبیر لأن نفی صلاة العید إلا فی المصر استفید بروایة أخری، وهو قوله علیه السلام والتحیة :لا جمعة ولا تشریق ولا فطر ولا أضحی إلا فی مصر جامع والمراد من الفطر والأضحی صلاة الفطر والأضحی فلو حمل التشریق المذکور فی هذه الروایة علی الصلاة کان تکرارا ومهما أمکن حمل اللفظ علی فائدة جدیدة لا یحمل علی التکرار، وإذا ثبت أن المصر شرط وجب أن یشترط القوم الخاص والجماعة کما فی الجمعة وصلاة العیدین (المحیط البرهانی فی الفقه النعمانی، ج۲،ص۱۱۸، ۱۱۹، کتاب الصلاة،الفصل السابع والعشرون فی تکبیر أیام التشریق)

ولأبی حنیفة -رحمه الله تعالی -قول النبی -صلی الله علیه وسلم -لا جمعة ولا تشریق إلا فی مصر جامع وقول علی -رضی الله عنه -لا جمعة ولا تشریق ولا فطر ولا أضحی إلا فی مصر جامع.

والمراد من التشریق هو رفع الصوت بالتکبیر هکذا قال النضر بن شمیل وکان من أرباب اللغة فیجب تصدیقه، ولأن التصدیق فی اللغة هو الإظهار، والشروق هو الظهور یقال :شرقت الشمس إذا طلعت وظهرت سمی موضع طلوعها وظهورها مشرقا لهذا، والتکبیر نفسه إظهار لکبریاء الله وهو إظهار ما هو من شعار الإسلام فکان تشریقا، ولا یجوز حمله علی صلاة العید؛ لأن ذلک مستفاد بقوله :ولا فطر ولا أضحی فی حدیث علی -رضی الله عنه -ولا علی إلقاء لحوم الأضاحی بالمشرقة؛ لأن ذلک لا یختص بمکان دون مکان فتعین التکبیر مرادا بالتشریق ولأن رفع الصوت بالتکبیر من شعائر الإسلام، وإعلام الدین وما هذا سبیله لا یشرع إلا فی موضع یشتهر فیه ویشیع ولیس ذلک إلا فی المصر الجامع ولهذا یختص به الجمع والأعیاد وهذا المعنی یقتضی أن لا یأتی به المنفرد والنسوان؛ لأن معنی الاشتهار یختص بالجماعة دون الأفراد ولهذا لا یصلی المنفرد صلاة الجمعة والعید، وأمر النسوان مبنی علی الستر دون الإشهار(بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع، ج۱،ص۱۹۸، کتاب الصلاة،فصل بیان حکم التکبیر أیام التشریق)

[1] چنانچہ اس کی وہ عبارت یہ ہے:

قلت: أرأیت أهل السواد من لم یکن فی مصر ولا مدینة هل علیهم الخروج یوم الفطر أو یوم النحر؟ قال: لا، ولا یجب ذلک إلا علی أهل الأمصار والمدائن .قلت: ولم؟ قال: للأثر الذی بلغنا عن رسول الله – صلی الله علیه وسلم – أنه قال: " لا جمعة ولا تشریق إلا فی مصر جامع "(کتابُ الأصل، ج۵ص۴۱۳، کتاب الصید والذبائح، باب من تجب علیه الأضحیة)

مذکورہ عبارت میں ”ولا یجب ذلک إلا علی أهل الأمصار والمدائن“ مذکور ہے۔ محمد رضوان۔

اور جب مذکورہ روایت کے ایک حصے میں واجب نہ ہونا مراد ہے، تو اس روایت کے دوسرے حصے میں بھی واجب نہ ہونے کو مراد لینا درست ہوگا، ہمارا رجحان بھی مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب دہلوی رحمہ اللہ کے بیان کردہ مذکورہ موقف کی طرف ہی ہوا۔

بہرحال مذکورہ روایت میں گاؤں، دیہات میں جمعہ کی نماز کے قطعی وحتمی طور پر، ناجائز اور غیر صحیح ہونے پر استدلال اتنا واضح نہیں، جتنا کہ بعض اصحابِ علم کی طرف سے سمجھا جاتا ہے، اور اس میں دوسرے احتمالات کی اجتہادی طور پر گنجائش موجود ہے۔

پس اس قسم کے اجتہادی مستدلات کو حتمی وقطعی دلیل کا درجہ دینا، مختلف فتنہ وفسادات کا باعث ہوا کرتا ہے، اور اس کے نتیجے میں فریقِ مخالف کی طرف تضلیل وتفسیق کی نسبت لازم آجایا کرتی ہے، جو سلف کا طریقہ نہیں۔

حضرت ابراہیم نخعی رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ:

عَنْ حُذَيْفَةَ ، قَالَ:لَيْسَ عَلٰى أَهْلِ الْقُرٰى جُمُعَةٌ ، إِنَّمَا الْجُمُعَةُ عَلٰى أَهْلِ الْأَمْصَارِ ، مِثْلِ الْمَدَائِنِ (مُصنف ابن أبی شيبة ،رقم الحديث ٥١٠٠، كتاب الصلاة، باب من قال لاجمعة ولاتشريق الا فی مصر جامع)

ترجمہ: حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ گاؤں والوں پر جمعہ نہیں، بلکہ شہر والوں پر ہی ہے، جیسے (بغداد کا) مدائن نامی شہر (ابن ابی شیبہ)

اس روایت سے استدلال کرتے ہوئے حنفیہ نے گاؤں میں نمازِ جمعہ کی نفی کی ہے، جبکہ دیگر حضرات نے اس کے مقابلہ میں دوسرے صحابہؓ کرام کے قول اور دیگر روایات اور دلائل کو ترجیح دی، اور بعض نے یہ مطلب بیان کیا کہ گاؤں والوں پر نمازِ جمعہ واجب نہیں، لیکن اگر پڑھیں، تو درست ہے، کیونکہ اس روایت میں ’’**لیس علی اھل القریٰ**‘‘ کے الفاظ ہیں، جن کا متبادر مفہوم، واجب نہ ہونے پر دلالت کرتا ہے، جیسا کہ پہلے گزرا۔

امام شافعی رحمہ اللہ نے، حضرت ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ کے پوتے عبید اللہ بن عبد اللہ بن عتبہ

کا یہ قول روایت کیا ہے کہ:

كُلُّ قَرْيَةٍ فِيهَا أَرْبَعُونَ رَجُلا فَعَلَيْهِمُ الْجُمُعَةُ (مسند الإمام الشافعي ۔ ترتيب السندى، ج ا ص ۱۳۰،رقم الحديث ۳۸۶، كتاب الصلاة،الباب الحادى عشر فى صلاة الجمعة ،الناشر: دار الكتب العلمية، بيروت – لبنان)

ترجمہ: ہر وہ گاؤں، جس میں چالیس مرد ہوں، تو ان پر جمعہ کی نماز واجب ہے (مسند الشافعی)

امام بیہقی رحمہ اللہ نے ''الخلافیات'' میں فرمایا کہ:

''عبید اللہ بن عبد اللہ بن عتبہ (جو مذکورہ روایت کے راوی ہیں، وہ) اکابرِ تابعین میں سے ہیں، اور اسی کے مثل عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ سے مروی ہے۔

اور ولید بن مسلم سے روایت ہے کہ میں نے لیث بن سعد سے جمعہ کے متعلق سوال کیا، تو انہوں نے فرمایا کہ ہر شہر، یا گاؤں، جس میں جماعت ہو، اور ان پر امیر مقرر ہو، تو ان کو جمعہ کا حکم دیا جائے گا کہ وہ ان کو جمعہ پڑھائے، کیونکہ ''اسکندریہ'' اور ''مصر'' کے شہروں اور ان کے سَواحل کے شہروں کے لوگ حضرت عمر بن خطاب اور عثمان بن عفان رضی اللہ عنہما کے زمانے میں ان کے حکم سے جمعہ کی نماز پڑھا کرتے تھے، جن میں کئی صحابۂ کرام بھی ہوا کرتے تھے۔

اور سعید بن عاص کی آل کے آزاد کردہ ایک غلام سے مروی ہے کہ اس نے حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مکہ اور مدینہ کے درمیان واقع گاؤں میں جمعہ کے متعلق سوال کیا، تو انہوں نے جواب میں فرمایا کہ جب ان کا امیر ہو، تو وہ ان کو جمعہ پڑھائے گا۔

اور جعفر بن برقان سے مروی ہے کہ عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ نے عدی بن عدی کندی کو یہ لکھ کر بھیجا کہ وہ ہر ایسے گاؤں والوں کو دیکھیں، جو وہاں کے مستقل باشندے ہوں، اور وہ خانہ بدوش نہ ہوں، اور ان پر ایک امیر کو مامور کریں، جو اُن

کو جمعہ کی نماز پڑھائے۔

اس کے بعد امام بیہقی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ ان حضرات کی امیر سے مراد، وہ امام ہے، جو ان کو جمعہ پڑھائے، اور ان کو خطبہ دے، اور ان کو نماز پڑھائے، اور یہ بات جمعہ کے قیام کے لیے کافی ہے، اور سلف کے اقوال اور افعال کے زیادہ مشابہ یہ بات ہے کہ جمعہ کو ان گاؤں میں قائم کیا جائے، جہاں کے لوگ مستقل طور پر رہائش پذیر ہوں، اور وہ خانہ بدوش اور اہلِ خیمہ نہ ہوں، جو وہاں سے منتقل ہو جائیں، اور حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی وہ روایت، جس میں مصرِ جامع کے اندر ہی جمعہ اور تشریق کا حکم مروی ہے، اس سے اسی قسم کی مستقل آبادیاں مراد ہیں، اور یہ روایت، حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ثابت ہے، لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا ثبوت صحیح نہیں ہے''۔انتہٰی۔ [1]

---

[1] وروى عن عبيد الله بن عبد الله بن عتبة بن مسعود – وهو من أكابر التابعين – أنه قال: كل قرية فيها أربعون رجلا فعليهم الجمعة .

ومثله عن عمر بن عبد العزيز – رحمه الله – .

أخبرنا أبو بكر بن الحارث الفقيه، أنا أبو محمد بن حيان، ثنا إبراهيم بن محمد بن الحسن الأصبهاني، ثنا أبو عامر موسى بن عامر، ثنا الوليد بن مسلم، قال: سألت الليث بن سعد، فقال: كل مدينة أو قرية فيها جماعة وعليهم أمير أمروا بالجمعة فليجمع بهم، فإن أهل الإسكندرية ومدائن مصر ومدائن سواحلها كانوا يجمعون الجمعة على عهد عمر بن الخطاب وعثمان بن عفان – رضى الله عنهما – بأمرهما، وفيها رجال من الصحابة .

وبإسناده قال: ثنا الوليد، قال: وأخبرني شيبان، قال: حدثني مولى لآل سعيد بن العاص، أنه سأل عبد الله بن عمر بن الخطاب عن القرى التى بين مكة والمدينة، ما ترى فى الجمعة؟ قال: نعم، إذا كان عليهم أمير فليجمع .

وأخبرنا أبو بكر الأردستانى، أنا أبو نصر العراقى، ثنا سفيان بن محمد الجوهرى، ثنا على بن الحسن، ثنا عبد الله بن الوليد، عن سفيان، عن جعفر بن برقان، قال: كتب عمر بن عبد العزيز إلى عدى بن عدى الكندى: انظر كل قرية أهل قرار ليسوا هم بأهل عمود يتنقلون ، فأمر عليهم أميرا فليجمع بهم .

وأرادوا بالأمير من يكون إماما يجمعهم ، ويخطب بهم، ويصلى بهم، ويكون كافيا

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

مذکورہ روایات سے شافعیہ اور حنابلہ نے اپنے قول پر استدلال کیا ہے۔

اس طرح کی اور بھی مختلف روایات بعض تابعین ومحدثین کے بارے میں مروی ہیں۔ [1]

ایک حدیث میں یہ مضمون آیا ہے کہ جمعہ ہر قریہ پر واجب ہے، اگر چہ چار ہی افراد کیوں نہ ہوں۔

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

للقيام بها .والأشبه بأقاويل السلف وأفعالهم فى إقامة الجمعة فى القرى التى أهلها أهل قرار ليسوا بأهل عمود ينتقلون أن ذلك مراد على بن أبى طالب – رضى الله عنه – بما رواه أبو عبد الرحمن السلمى عن على بن أبى طالب – رضى الله عنه –؛ أنه قال: لا تشريق ولا جمعة إلا فى مصر جامع.

وهو عنه ثابت، ولا يصح عن النبى – صلى الله عليه وسلم –(الخلافيات بين الإمامين الشافعى وأبى حنيفة وأصحابه،للبيهقى، ج۴ص ۱۱، ۱۲،،كتاب الجمعة ، مسألة:والجمعة تجب على أهل القرية إذا بلغوا أربعين، وكانوا مستوطنين)

[1] حدثنا ابن إدريس ، عن هشام ، عن الحسن ، ومحمد ؛ أنهما قالا :الجمعة فى الأمصار (مُصنف ابن أبى شيبة، رقم الحديث ۵۱۰۱، باب من قال لاجمعة ولاتشريق الا فى مصر جامع)

حدثنا هشيم ، قال :أخبرنا يونس ، عن الحسن ؛ أنه سئل :على أهل الأبلة جمعة ؟ قال :لا (ايضاً، رقم الحديث ۵۱۰۲)

حدثنا غندر ، عن شعبة ، عن مغيرة ، عن إبراهيم ، قال :لا جمعة ، ولا تشريق إلا فى مصر جامع (ايضاً، رقم الحديث ۵۱۰۵)

حدثنا وكيع ، عن جعفر بن برقان ، قال :كتب عمر بن عبد العزيز إلى عدى بن عدى ، أيما أهل قرية ليسوا بأهل عمود ينتقلون ، فأمر عليهم أميرا يجمع بهم(ايضاً، رقم الحديث ۵۱۰۹، باب من كان يرى الجمعة فى القرى وغيرها)

حدثنا ابن إدريس ، عن معقل ، عن عطاء ، قال :إذا كانت قرية لازقة بعضها ببعض ، جمعوا(ايضاً ، رقم الحديث ۵۱۱۰)

أخبرنا أبو بكر بن الحارث الفقيه، أنبأ أبو محمد بن حيان، ثنا إبراهيم بن محمد بن الحسن الأصبهانى، ثنا أبو عامر موسى بن عامر، ثنا الوليد بن مسلم قال :سألت الليث بن سعد، فقال " :كل مدينة أو قرية فيها جماعة وعليهم أمير أمروا بالجمعة فليجمع بهم .فإن أهل الإسكندرية ومدائن مصر، ومدائن سواحلها كانوا يجمعون الجمعة على عهد عمر بن الخطاب وعثمان بن عفان رضى الله عنهما بأمرهما، وفيها رجال من الصحابة(السنن الكبرى للبيهقى، رقم الحديث ۵۶۷۸)

مگر یہ حدیث سند کے اعتبار سے انتہائی کمزور معلوم ہوتی ہے۔ [1]

اسی طرح ایک حدیث میں یہ مضمون مذکور ہے کہ پانچ قسم کے افراد پر جمعہ کی نماز لازم نہیں، عورت، مسافر، غلام، نابالغ بچہ اور گاؤں والے۔

مگر تحقیق کرنے سے اس حدیث کی سند میں غیر معمولی ضعف معلوم ہوا۔ [2]

---

[1] حدثنی أبو بكر النيسابوری ,ثنا محمد بن يحيى ,ثنا محمد بن وهب بن عطية , ثنا بقية بن الوليد ,ثنا معاوية بن يحيى ,ثنا معاوية بن سعيد التجيبى ,ثنا الزهری ,عن أم عبد الله الدوسية ,قالت :قال رسول الله صلى الله عليه وسلم :الجمعة واجبة على كل قرية ,وإن لم يكن فيها إلا أربعة .يعنى بالقرى :المدائن ,لا يصح هذا عن الزهرى(سنن الدارقطنى، رقم الحديث ۱۵۹۲)

حدثنا أبو عبد الله محمد بن على بن إسماعيل الأبلى ,ثنا عبد الله بن محمد بن خنيس الكلاعى ,ثنا موسى بن محمد بن عطاء ,ثنا الوليد بن محمد ,ثنا الزهرى ,حدثتنى أم عبد الله الدوسية ,قالت :قال رسول الله صلى الله عليه وسلم :الجمعة واجبة على كل قرية فيها إمام وإن لم يكونوا إلا أربعة .الوليد بن محمد الموقرى متروك ,ولا يصح هذا عن الزهرى كل من رواه عنه متروك(سنن الدارقطنى، رقم الحديث ۱۵۹۳)

[2] حدثنا أحمد بن محمد بن الحجاج بن رشدين بن سعد المصرى قال :نا إبراهيم بن حماد بن أبى حازم المدينى قال :نا مالك بن أنس، عن أبى الزناد، عن الأعرج، عن أبى هريرة قال :قال رسول الله صلى الله عليه وسلم :خمسة لا جمعة عليهم :المرأة، والمسافر، والعبد، والصبى، وأهل البادية.

لم يرو هذا الحديث عن مالك إلا إبراهيم بن حماد بن أبى حازم (المعجم الأوسط للطبرانى، رقم الحديث ۲۰۲)

قال الهيثمى: رواه الطبرانى فى الأوسط وفيه إبراهيم بن حماد ضعفه الدارقطنى(مجمع الزوائد، تحت رقم الحديث ۳۰۳۳)

وقال الالبانى: (خمسة لا جمعة عليهم :المرأة، والمسافر، والعبد، والصبى، وأهل البادية). ضعيف جدا.

أخرجه الديلمى عن حفص بن سالم السمرقندى :حدثنا مالك بن أنس، عن أبى الزناد، عن الأعرج، عن أبى هريرة مرفوعا.

ومن طريق إبراهيم بن حماد مولى هاشم بن المسور بن مخرمة :حدثنا مالك بن أنس به.

قلت :وهذا ضعيف جدا؛ آفته حفص بن سالم (كذا الأصل، وفى كتب الرجال :سلم) السمرقندى، يكنى بأبى مقاتل، قال الذهبى":وهاه قتيبة شديدا، وكذبه ابن مهدى."

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

اس فصل کا خلاصہ

مذکورہ تفصیل کا خلاصہ یہ نکلا کہ شہر میں تو بالاتفاق جمعہ کی نماز جائز اور واجب ہے، البتہ گاؤں میں جمعہ کے قائم کرنے نہ کرنے اور جائز ہونے نہ ہونے کا مسئلہ مختلف فیہ اور مجتہد فیہ ہے، حنفیہ غیر واجب اور ناجائز اور دوسرے جمہور فقہائے کرام، شافعیہ، حنابلہ اور مالکیہ جائز اور واجب قرار دیتے ہیں، جس میں دلائل دونوں طرف پائے جاتے ہیں، وہ الگ بات ہے کہ کسی کے نزدیک کس طرف کے دلائل راجح ہیں، اور کس طرف کے مرجوح، اس میں اصحابِ فقہ و اجتہاد کے درمیان اختلافِ رائے کا امکان پایا جاتا ہے، جو کہ مجتہد فیہ مسائل کا خاصہ ہے۔

اور یہ بات بھی معلوم ہوگئی کہ گاؤں، دیہات میں نمازِ جمعہ کے ناجائز و نادرست ہونے کی قطعی وحتمی دلیل نہیں۔

پس یہ بات ضروری ہے کہ مجتہد فیہ مسائل کو اپنے درجے پر رکھا جائے، اور ان کو اپنے درجے سے بڑھا چڑھا کر حق و باطل کے اختلاف کا درجہ نہ دیا جائے، جیسا کہ آج کل بہت سے اہلِ علم حضرات کا وطیرہ ہوگیا ہے کہ وہ اپنے خاص فقہ کے اجتہادی دلائل کو راجح اور دوسرے دلائل کو مرجوح قرار دے کر یہ سمجھتے ہیں کہ اس کی خلاف ورزی گمراہی وضلالت ہے، اور اسی وجہ سے وہ دوسرے موقف کو اختیار کرنے اور ترجیح دینے والے، یا اس فتوے کے مطابق عمل کرنے والے کے عمل کو باطل، یا فاسد قرار دینے کی کوشش کرتے ہیں، موجودہ حالات میں ہم اس طرزِ عمل کو قابلِ اصلاح سمجھتے ہیں۔

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

وقال الحاكم والنقاش":حدث عن مسعر وأيوب وعبيد الله بأحاديث موضوعة."

وقد تابعه في الطريق الأخرى إبراهيم بن حماد، ولكنه ضعيف، ولعله سرقه منه؛ فقد أخرجه من طريقه :الدارقطني في "الغرائب "وقال":تفرد به إبراهيم، وكان ضعيفا."

كذا قال !وكأنه لن يطلع على الطريق الأولى(سلسلة الأحاديث الضعيفة والموضوعة، تحت رقم الحديث ٣٥٥٥)

(فصل نمبر 4)

مشائخِ حنفیہ کے نزدیک شہر اور گاؤں کی تعریف

حنفیہ کے نزدیک، شہر، جس میں جمعہ کی نماز، جائز ہے، اس کی تعریف وتحقیق میں مختلف اقوال ہیں، کسی نے کسی قول کو، اور کسی نے کسی قول کو ترجیح دی ہے، اور مختلف زمانوں اور علاقوں کے لحاظ سے بھی عرف ورواج اور تمدنی ومعاشرتی حالات کے مختلف ہونے سے اس میں اختلاف ہوتا رہا ہے۔ اس سلسلے میں چند اقوال اور فتاویٰ وعبارات ذکر کی جاتی ہیں۔

شہر کے متعلق مشائخِ حنفیہ کے مختلف اقوال

نمازِ جمعہ قائم کرنے کے اعتبار سے حنفیہ کے نزدیک مصر، یعنی شہر کا حکم، کون سی آبادی پر لاگو ہوگا، جہاں، جمعہ کی نماز جائز ہے؟

اس بارے میں مشائخِ حنفیہ کے کئی اقوال ہیں:

ایک قول کے مطابق، جس آبادی میں دین ودنیا کے مختلف شعبوں کے لوگ آباد ہوں، وہاں نمازِ جمعہ جائز ہے۔ [1]

دوسرے قول کے مطابق، جس آبادی کے لوگ اپنی قوت اور شوکت کے لحاظ سے اپنے دشمنوں کی مدافعت پر قادر ہوں، وہاں نمازِ جمعہ جائز ہے۔ [2]

---

[1] اس قول کے مطابق، جس آبادی کے لوگ تجارت، ملازمت، کاشت کاری وغیرہ کے مختلف شعبوں سے منسلک ہوں، وہاں نمازِ جمعہ جائز ہے، خواہ اس کو "قریہ" کیوں نہ قرار دیا جاتا ہو۔ محمد رضوان۔

[2] اس قول کے مطابق، جس گاؤں کے لوگوں کو مذکورہ قدرت حاصل ہو، ان کو نمازِ جمعہ جائز ہوگی، اور اس قدرت کا مدار، ظاہر ہے کہ صرف، کثرتِ تعداد پر نہیں رکھا جاسکتا، کیونکہ بعض لوگوں کو کم تعداد میں ہوتے ہوئے بھی اپنے مخصوص اتحاد واتفاق، یا جسمانی، ذہنی، یا مادی صلاحیتوں، یا آبادی کی مخصوص کیفیت ونوعیت اور محلِ وقوع وغیرہ کے لحاظ سے بھی اس کی قدرت حاصل ہوتی ہے، جو اُن کے مقابلے میں کثیر آبادی والوں کو حاصل نہیں ہوتی۔ محمد رضوان۔

تیسرے قول کے مطابق، جس آبادی کا رقبہ اتنا ہو کہ جتنے رقبہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جمعہ قائم فرمایا (جیسا کہ ابتدائی نبوی دور کا مدینہ شہر) وہاں نمازِ جمعہ جائز ہے۔ [1]

چوتھے قول کے مطابق، جس آبادی کو لوگ اپنے عرف وعادت میں شہر سمجھیں، وہاں نمازِ جمعہ جائز ہے۔ [2]

پانچویں قول کے مطابق، جس جگہ جمعہ کی نماز کے مکلّف لوگ اتنی تعداد میں آباد ہوں کہ وہ سب وہاں کی بڑی مسجد میں نہ سَما سکیں، وہاں نمازِ جمعہ جائز ہے، آخری زمانہ کے بعض مشائخِ حنفیہ کا اسی پر فتویٰ ہے، جیسا کہ آگے آتا ہے۔

چھٹے قول کے مطابق، جس آبادی میں مختلف قبیلے وجماعتیں آباد ہوں، اور بازار اور گلیاں ومحلے ہوں، وہاں نمازِ جمعہ جائز ہے، بعض حضرات نے اس پر فتویٰ دیا ہے، جیسا کہ آگے آتا ہے۔

ساتویں قول کے مطابق، جس مقام کی آبادی دس ہزار لوگوں کے لگ بھگ ہو، وہاں نمازِ جمعہ جائز ہے۔ [3]

آٹھویں قول کے مطابق، جس آبادی میں قاضی وحاکم ہو، جو اسلامی سزاؤں کو قائم ونافذ کرتا ہو، یا اس کی قدرت رکھتا ہو، وہاں نمازِ جمعہ جائز ہے۔

اور اس آخری قول کو حنفیہ کا ظاہرِ مذہب یا ظاہرُ الروایہ قرار دیا گیا ہے، لیکن اس قول کا

---

[1] البتہ اس میں اختلاف ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ''قبا'' اور بعض دوسرے علاقے، مدینہ منورہ کا حصہ تھے، یا وہ مدینہ منورہ کے دیہی علاقوں میں شامل تھے، اسی بنیاد پر مدینہ منورہ کی آبادی کے رقبہ کا دارومدار ہے، یہاں تک کہ بعض حضرات نے خود مدینہ منورہ کو بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں ایک ''قریہ'' قرار دیا ہے، اور بعض احادیث میں مدینہ منورہ پر بھی ''قریہ'' کا اطلاق کیا گیا ہے، جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔محمد رضوان۔

[2] اور عرف، علاقہ اور زمانے کے مختلف ہونے سے مختلف ہوسکتا ہے۔محمد رضوان۔

[3] اس قول پر بھی بعض حضرات نے فتویٰ دیا ہے، لیکن بعض حضرات نے فرمایا کہ یہ پہلے زمانے اور پہلے دور کی بات ہے۔محمد رضوان۔

موجودہ دور کے بہت سے ملکوں اور شہروں پر صادق آنا مشکل ہے، جیسا کہ آگے آتا ہے۔ ل

ل وإذا ثبت أن المصر شرط لإقامة الجمعة نحتاج إلى بيان حد المصر الذى تقام فيه الجمعة، وقد تكلموا فيه على أقوال :روى عن أبى حنيفة رحمه الله :أن المصر الجامع ما يجتمع فيه مرافق أهلها دينا ودنيا، وعن أبى يوسف رحمه الله ثلاث روايات، فى رواية قال :كل موضع فيه منبر وقاضى ينفذ الأحكام ويقيم الحدود فهو مصر جامع، وهو رواية عن أبى حنيفة رحمه الله، وفى رواية أخرى عنه كل موضع أهلها بحيث لو اجتمعوا فى أكبر مساجدهم لم يسعهم ذلك فهو مصر جامع، وفى رواية أخرى قال :كل موضع يسكن فيه عشرة آلاف نفر، فهو مصر جامع.
ومن العلماء من قال :المصر الجامع ما يعيش فيه كل صانع لصنعته، ولا يحتاج إلى العود من صنعة إلى صنعة، وعن محمد رحمه الله أنه قال :كل موضع مصر للإمام فهو مصر حتى أن الإمام إذا بعث إلى قرية نائبا لإقامة الحدود فيهم وقاضيا يقضى بينهم صار ذلك الموضع مصرا، وإذا عزله ودعاه إلى نفسه عادت قرية كما كانت، وقال بعض العلماء :كل مصر بلغت مساحته مصرا جمع فيه رسول الله عليه السلام، فهو مصر جامع.
ومن العلماء من قال :كل موضع كان لأهله من القوة والشوكة، ما لو توجه إليهم عدو دفعوه عن نفسهم، فهو مصر جامع.
وقال سفيان الثورى رحمه الله :المصر الجامع ما يعده الناس مصرا عند ذكر الأمصار المطلقة كبخارى أو سمرقند، فعلى هذا القول لا يجوز إقامة الجمعة بكرمينة وكشانية.
قال شمس الأئمة السرخسى رحمه الله :وظاهر المذهب أن المصر الجامع أن يكون فيه جماعات الناس، وجامع وأسواق للتجارات وسلطان أو قاضى يقيم الحدود، وينفذ الأحكام، ويكون فيه مفتى إذا لم يكن الوالى أو السلطان مفتيا(المحيط البرهانى فى الفقه النعمانى، ج۲،ص۶۵، ۶۶،كتاب الصلاة،الفصل الخامس والعشرون فى صلاة الجمعة)
أما المصر الجامع فقد اختلفت الأقاويل فى تحديده ذكر الكرخى أن المصر الجامع ما أقيمت فيه الحدود ونفذت فيه الأحكام، وعن أبى يوسف روايات ذكر فى الإملاء كل مصر فيه منبر وقاض ينفذ الأحكام ويقيم الحدود فهو مصر جامع تجب على أهله الجمعة، وفى رواية قال :إذا اجتمع فى قرية من لا يسعهم مسجد واحد بنى لهم الإمام جامعا ونصب لهم من يصلى بهم الجمعة، وفى رواية لو كان فى القرية عشرة آلاف أو أكثر أمرتهم بإقامة الجمعة فيها، وقال بعض أصحابنا :المصر الجامع ما يتعيش فيه كل محترف بحرفته من سنة إلى سنة من غير أن يحتاج إلى الانتقال إلى حرفة أخرى، وعن أبى عبد الله البلخى أنه قال :أحسن ما قيل فيه إذا كانوا بحال لو اجتمعوا فى أكبر مساجدهم لم يسعهم ذلك حتى احتاجوا إلى بناء مسجد الجمعة فهذا مصر تقام فيه الجمعة، وقال سفيان الثورى :المصر الجامع ما يعده الناس مصرا عند ذكر الأمصار المطلقة، وسئل أبو القاسم الصفار عن حد المصر الذى تجوز فيه الجمعة فقال :أن تكون لهم منعة لو جاء هم عدو قدروا على

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

اور مذکورہ اقوال میں سے کسی بھی قول پر عمل کرنے والے کو گمراہ یا فاسق قرار دینا درست نہیں۔
ماضی قریب کے اصحابِ افتاء حضرات میں سے مفتیِ ہند، حضرت مولانا مفتی محمد کفایتُ اللہ صاحب دہلوی رحمہ اللہ نے ہماری نظر میں اس مسئلے کی نزاکت کو اپنے زمانے میں محسوس فرمایا، اور اس پر مختلف و متعدد فتاویٰ جاری فرمائے، جن کو موجودہ دور کے بعض اصحابِ افتاء تو شاید زیادہ اہمیت نہ دیتے ہوں، لیکن ہمارے نزدیک وہ نہایت اہمیت وتوجہ کے حامل ہیں۔
چنانچہ مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب رحمہ اللہ کی ''کفایتُ المفتی'' میں ایک مقام پر ہے کہ:

> گاؤں میں (جس پر مصر کی کوئی تعریف صادق آتی ہو) جمعہ پڑھنے والوں کو غیر مقلد نہیں کہا جاسکتا، زیادہ سے زیادہ ان کے فعل کو مرجوح کہا جاسکتا ہے، چونکہ ایسے گاؤں کے مصر ہونے، نہ ہونے میں اختلاف ہے، اس لئے جمعہ پڑھنے والے اور ظہر پڑھنے والے دونوں مؤوّل ہیں، کوئی دوسرے کی تضلیل، یا تفسیق نہیں کرسکتا، ہاں ہر ایک اپنے فعل کو راجح اور دوسرے فعل کو مرجوح ثابت کرنا چاہے، تو کرسکتا ہے، نفسانیت، امرِ مخفی ہے، اس کا الزام کوئی دوسرے پر نہیں لگاسکتا (کفایت المفتی مدلل ومکمل، ج۳ص ۲۲۸، ۲۲۹، کتاب الصلاۃ، پانچواں باب: نمازِ جمعہ، مطبوعہ: دارالاشاعت، کراچی، سنِ طباعت: جولائی 2001ء)

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

دفعه فحينئذ جاز أن يمصر وتمصره أن ينصب فيه حاكم عدل يجرى فيه حكما من الأحكام، وهو أن يتقدم إليه خصمان فيحكم بينهما.
وروى عن أبى حنيفة أنه بلدة كبيرة فيها سكك وأسواق ولها رساتيق وفيها وال يقدر على إنصاف المظلوم من الظالم بحشمه وعلمه أو علم غيره والناس يرجعون إليه فى الحوادث وهو الأصح(بدائع الصنائع ،ج ا ،ص ۲۵۹، ۲۶۰،كتاب الصلاةفصل بيان شرائط الجمعة)
وظاهر المذهب فى بيان حد المصر الجامع أن يكون فيه سلطان أو قاض لإقامة الحدود وتنفيذ الأحكام .وقد قال بعض مشايخنا رحمهم الله تعالى أن يتمكن كل صانع أن يعيش بصنعته فيه ولا يحتاج فيه إلى التحول إلى صنعة أخرى وقال ابن شجاع -رضى الله تعالى عنه -أحسن ما قيل فيه إن أهلها بحيث لو اجتمعوا فى أكبر مساجدهم لم يسعهم ذلك حتى احتاجوا إلى بناء مسجد الجمعة فهذا مصر جامع تقام فيه الجمعة (المبسوط للسرخسى، ج ٢، ص ٢٣، كتاب الصلاة، باب صلاة الجمعة)

دو، یا دو سے زائد مخصوص مساجد، ہونے کا قول

لوگوں کی طرف سے دین کے احکام میں سستی اور غفلت اور جمعہ کی اہمیت اور اس کے ساتھ مسلمانوں کی دینی وابستگی کے پیشِ نظر، بہت سے متاخرینِ حنفیہ کا فتویٰ اس پر ہے کہ جس جگہ جمعہ کی نماز کے مکلّف لوگ اتنی تعداد میں آباد ہوں کہ وہ سب وہاں کی بڑی مسجد میں نہ سَما سکیں، وہاں جمعہ کی نماز قائم کرنا جائز ہے، خواہ وہ قریہ اور گاؤں ہی کیوں نہ کہلاتا ہو، بلکہ بعض حنفیہ نے تو شہر کی تعریف بھی اسی کے ساتھ بیان کردی ہے۔ [1]

بعض حضرات نے اس قول کو دوسرے اقوال کے مقابلے میں اکثر مشائخِ حنفیہ کے اختیار کرنے کی تصریح فرمائی ہے۔ [2]

---

[1] البلد:أی کونها فی مصر جامع، أو فی مصلی المصر عند الحنفیة :وهو کل موضع له أمیر وقاض ینفذ الأحکام ویقیم الحدود، هذا فی مشهور المذهب الحنفی، لکن المفتی به عند أکثر الحنفیة، أن المصر کما قدمنا :هو ما لا یسع أکبر مساجدها أهلها المکلفین بالجمعة .وهذا شرط وجوب وصحة، فلا یصح أداء الجمعة إلا فی المصر وتوابعه، ولا تجب علی أهل القری التی لیست من توابع المصر، ولا یصح أداء الجمعة فیها(الفقه الاسلامی وادلتہٗ، ج۲ص ۱۲۹۴، القسم الاول، الباب الثانی ، الفصل العاشر، المبحث الثانی، المطلب الخامس)

المصر :ما لا یسع أکبر مساجده أهله(کتاب التعریفات،للجرجانی،ص۲۱۶،باب المیم)

[2] تعریف المصر:

فأما المصر فان فیه خمسة أقاویل.

قال بعض الفقهاء المصر هو الذی فیه ثلاثة أشیاء السوق القائم والسلطان وجری الاحکام والحدود.

وقال بعضهم المصر هو الذی له رساتیق لأن المصر یقال له القصبة والقصبة انما تکون ذات اغصان کذلک المصر یکون ذا رساتیق.

وقال بعضهم المصر الذی لا ینسب الی غیره ولا یضاف الی مکان بل یکون له اسم بذاته فحسب

وقال بعضهم المصر الذی یوجد فیه جمیع الحرف .

وقال بعضهم المصر الذی لا یتسع اکبر مساجدها العامة لاهلها وعلی هذا أکثر الفقهاء.

وعند أبی عبد الله وأهل الحدیث إذا کان فی قریة أربعون رجلا تجوز فیها الجمعة(النتف فی الفتاوی، ج۱،ص ۹۱،۹۲،کتاب الصلاة، مطلب صلاة الجمعة)

''محمد بن شجاع ثلجی'' نے اس قول کو نہایت عمدہ قرار دیا ہے۔ [1]

اور صاحبِ ''الدُّرُّ المختار'' نے فرمایا کہ اکثر فقہائے حنفیہ کا اس پر فتویٰ ہے، شرعی احکام میں سستی واقع ہونے کی وجہ سے۔

اور علامہ ابنِ عابدین شامی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ:

''یہ تعریف بہت سے گاؤں پر بھی صادق آتی ہے''فتاویٰ''الولوالجیة'' میں اس کو صحیح قول قرار دیا ہے، اور''الوقایة'' اور''متن المختار'' اور اس کی شرح میں اسی کو لیا گیا ہے، اور''الدر المختار'' کے متن میں اس قول کو دوسرے اقوال پر مقدم رکھا گیا ہے، جس سے اس قول کی ترجیح ظاہر ہوتی ہے، اور شریعت کے احکام میں غفلت اور سستی واقع ہوجانے کی وجہ سے''صدرُ الشریعة'' نے اس قول کی تائید کی ہے''۔انتہٰی۔ [2]

---

[1] ولا تقام إلا فی المصر (ف) أو مصلاه، والمصر ما لو اجتمع أهله فی أكبر مساجده لم يسعهم (المختار، ج ۱، ص ۸۲، باب صلاة الجمعة)

والمصر ما لو اجتمع أهله فی أكبر مساجده لم يسعهم) روى ذلک عن أبی يوسف .قال محمد بن شجاع الثلجی :هذا أحسن ما قيل فيها(الاختيار لتعليل المختار، ج ۱، ص ۸۲، كتاب الصلاة ،باب صلاة الجمعة)

[2] (ويشترط لصحتها) سبعة أشياء :

الأول :(المصر وهو ما لا يسع أكبر مساجده أهله المكلفين بها) وعليه فتوى أكثر الفقهاء مجتبى لظهور التوانی فی الأحكام وظاهر المذهب أنه كل موضع له أمير وقاض يقدر على إقامة الحدود كما حررناه فيما علقناه على الملتقى.

وفی القهستانی :إذن الحاكم ببناء الجامع فی الرستاق إذن بالجمعة اتفاقا على ما قاله السرخسی وإذا اتصل به الحكم صار مجمعا عليه فليحفظ(الدر المختار)

(قوله ما لا يسع إلخ)هذا يصدق على كثير من القرى ط (قوله المكلفين بها) احترز به عن أصحاب الأعذار مثل النساء والصبيان والمسافرين ط عن القهستانی (قوله وعليه فتوى أكثر الفقهاء إلخ) وقال أبو شجاع :هذا أحسن ما قيل فيه .وفی الولوالجية وهو صحيح بحر، وعليه مشى فی الوقاية ومتن المختار وشرحه وقدمه فی متن الدرر على القول الآخر وظاهره ترجيحه وأيده صدر الشريعة بقوله لظهور التوانی فی أحكام الشرع سيما فی إقامة الحدود فی الأمصار(رد المحتار على الدر المختار، ج۲، ص۱۳۷، ۱۳۸، كتاب الصلاة ،باب الجمعة)

ملا علی قاری رحمہ اللہ نے بھی اسی قول کا اصح ہونا نقل کیا ہے۔ [1]

اور ”شرحُ الوقاية“ میں اسی قول کو اختیار کیا گیا ہے۔ [2]

اور صاحبِ ”البحرُ الرائق“ اور صاحبِ ”البناية شرح الهداية“ نے بھی اس پر اکثر فقہاء کے فتویٰ ہونے اور ایسے مقام کے مصرِ جامع ہونے کی تصریح کی ہے۔ [3]

---

[1] (وما لا يسع أكبر مساجده أهله) الذى يجب عليهم الجمعة (مصر) روى ذلك عن أبي يوسف .وفيه إشكال، حيث لم يصدق على المساجد الثلاثة، اللهم إلا أن يقال: إنها مستثناة معلومة من الشريعة، أو يقال :هذا إذا كانت المساجد متعددة، ولا تعدد فى مكة والمدينة والقدس .وعنه :كل موضع له أمير وقاض ينفذ الأحكام، ويقيم حدود الإسلام .قال فى الهداية :وهو الظاهر ـ أى من المذهب ـ وعليه أكثر الفقهاء ، واختاره الكرخى.

وعن أبى حنيفة :كل بلد لها سكك، وأسواق، ووال لدفع المظالم، وعالم يرجع إليه فى الحوادث .قيل :هو الأصح .واختار الثلجى الأول لظهور التوانى فى أحكام الشرع، لا سيما فى إقامة الحدود .وقال محمد :هو كل موضع مصره الإمام بإرسال نائب لإقامة الحدود والقصاص، حتى إذا عزله يلحق بالقرى(شرح النقاية،لعلى بن سلطان محمد القارى الحنفى، ج ا ،ص ۴۰۳، كتاب الصلاة، باب فى صلاة الجمعة،فصل فى شروط وجوب الجمعة،شروط أداء الجمعة، الناشر: شركة دارالارقم بن ابى الارقم، بيروت، لبنان، الطبعةُ الاولىٰ: ۱۴۱۸ھ۔۱۹۹۷م)

[2] اختلفوا فى تفسير المصر:فعند البعض:هو موضع له أميروقاض ينفذ الأحكام، ويقيم الحدود . وعند البعض:هو موضع إذا اجتمع أهله فى أكبر مساجده لم يسعهم، فاختار المصنف هذا القول، فقال :(وما لا يسع أكبر مساجده أهله مصر)

وإنما اختار هذا دون التفسير الأول؛ لظهور التوانى فى أحكام الشرع لاسيما إقامة الحدود فى الأمصار(شرح الوقاية، ج ۲ ص ۱۷۹، ۱۸۰، كتاب الصلاة ،باب صلاة الجمعة، الناشر: مؤسسة الوراق للنشر والتوزيع، عمان ، الاردن، الطبعة الاولىٰ: ۲۰۰۶ م)

[3] وفى المجتبى وعن أبى يوسف أنه ما إذا اجتمعوا فى أكبر مساجدهم للصلوات الخمس لم يسعهم، وعليه فتوى أكثر الفقهاء وقال أبو شجاع هذا أحسن ما قيل فيه، وفى الولوالجية وهو الصحيح(البحر الرائق شرح كنز الدقائق، ج۲،ص ۱۵۲ ، كتاب الصلاة ،باب صلاة الجمعة)

(قوله ما إذا اجتمعوا فى أكبر مساجدهم) يعنى من تجب عليهم الجمعة لإسكانه مطلقا كذا فى الدرر أى لا كل من سكن ذلك الموضع من صبيان ونسوان وعبيد كما فى النهاية(منحة الخالق على البحرالرائق، ج۲،ص ۱۵۲ ، كتاب الصلاة ،باب صلاة الجمعة)

(إذا اجتمعوا فى أكبر مساجدهم لم يسعهم) ش :فإذا كان كذلك يكون مصرا جامعا(البناية شرح الهداية، ج۳،ص ۴۶، كتاب الصلاة ،باب صلاة الجمعة)

اورصاحبِ ''بدائعُ الصنائع'' نے بھی اسی قول کو صحیح قرار دیا ہے۔ [1]

البتہ بعض حضرات نے اس قول کو ضعیف قرار دیا ہے، کیونکہ یہ تعریف بہت سے گاؤں پر بھی صادق آتی ہے۔

لیکن ظاہر ہے کہ متعدد اور جلیل القدر فقہائے حنفیہ کے اس قول کو راجح قرار دینے اور اس پر فتویٰ ہونے کی تصریح کے ہوتے ہوئے، اس قول کی حنفیہ کے نزدیک اہمیت کم نہیں ہوتی، کیونکہ انہوں نے خود احکامِ شریعت میں سستی اور غفلت واقع ہونے کی وجہ سے اس کو اختیار، اور اس کے بہت سے گاؤں پر صادق آنے کی تصریح کی ہے، جبکہ اس کے مقابلہ میں ظاہر الروایہ پر عمل کا موجودہ حالات میں امکان بھی نہیں، جیسا کہ آگے آتا ہے۔

پس اگر مذکورہ نوعیت والے مقام پر نمازِ جمعہ کو قائم کیا جائے، تو بہت سے حنفیہ کے فتوے کے مطابق وہاں جمعہ کی نماز درست اور اداء ہو جاتی ہے، اور اگر کوئی اس قول کے مطابق فتویٰ دے، اور لوگ اس پر عمل کریں، تو ان پر کسی حنفی کا نکیر کرنا درست نہیں۔

چنانچہ مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب کی ''کفایتُ المفتی'' میں ہے کہ:

> اگر آپ کے موضع میں عرصے سے جمعہ جاری ہے، اور متعدد مساجد، یعنی دو، یا دو سے زائد مسجدیں ہوں، اور ان میں سے بڑی مسجد میں موضع کے مکلّف بالجمعہ اشخاص نہ سَما سکیں، تو وہاں جمعہ پڑھتے رہنے میں مضائقہ نہیں، اور فرض ظہر ذمہ سے ساقط ہو جائے گا، شرح وقایہ کی یہ تعریف قابلِ عمل ہے۔ محمد کفایت اللہ کان اللہ لہٗ، ۱۵ شوال ۱۳۵۲ھ، 31 جنوری 1934ء (کفایت المفتی مدلل ومکمل، ج ۳ ص ۲۳۲، کتاب الصلاۃ، پانچواں باب: نمازِ جمعہ، مطبوعہ: دارالاشاعت، کراچی، سنِ طباعت: جولائی 2001ء)

کفایتُ المفتی میں ایک اور مقام پر ہے کہ:

---

[1] وعنه لو اجتمعوا فی أکبر مساجدهم لم یسعهم، قال البلخی :وهذا أحسن شیء سمعته، وعلیه فتوی الفقهاء ، کذا فی (المجتبی) وفی (البدائع) :إنه صحیح واعتمده برهان الشریعة(النهر الفائق شرح کنز الدقائق،ج ۱ ،ص ۳۵۳، کتاب الصلاة،باب صلاة الجمعة)

شرطیتِ مصر میں فقہاء نے بہت تنزل کرلیا ہے، حتی کہ ''**مالا یسع اکثر مساجده اهله المكلفين بها**'' تک اتر آئے، اوراس تعریف پر خالص کافر حکومت کے شہر، مثلاً لندن وغیرہ بھی مصر میں داخل ہوجاتے ہیں، نیز بہت سے دیہات بھی مصر میں شامل ہوجاتے ہیں، ۱۸، ذیقعدہ ۱۳۵۴ھ (کفایت المفتی مدلل ومکمل، ج۳ص۲۴۰، کتاب الصلاۃ، پانچواں باب: نمازِ جمعہ)

اور جب فقہائے حنفیہ نے اس قول پر فتویٰ دیا، اوراس قول کے بہت سے گاؤں، دیہات پر صادق آنے کا اعتراف فرمایا، تو اس سے صاف ظاہر ہوا کہ فقہائے حنفیہ نے ''مصرِ جامع'' کی تعریف میں بہت سے گاؤں، دیہات کو بھی شامل کرلیا ہے، اوراس طرح ان کا دوسرے جمہور فقہائے کرام سے اس باب میں اختلاف زیادہ شدید نہیں رہا۔

لیکن افسوس کہ موجودہ دور کے بعض اصحابِ افتاء نے پھر اس سلسلہ میں سختی شروع کردی، اور فقہائے کرام کی طرف سے جاری کی گئی تخفیف اوراس کی تعلیل کو نظرانداز کرنا شروع کردیا۔

ان حضرات کی نیک نیتی اوراخلاص اپنی جگہ، لیکن فقہی مسائل میں اختلاف، یا اتفاق کا مدار، شرعی وفقہی دلائل پر ہوا کرتا ہے، محض کسی کے مخلص ونیک نیت ہونے پر نہیں۔

کفایتُ المفتی ہی میں ایک اور مقام پر ہے کہ:

''**مالایسع اکبر مساجده**'' پر بہت سے مشائخِ حنفیہ نے فتویٰ دیا ہے، تنفیذِ احکام واقامتِ حدود والی تعریف آج کل (یعنی انگریزوں کے دورِ حکومت میں) کسی شہر پر صادق نہیں ہے، اور قدرت **علی التنفیذ** کی تاویل بھی اقامتِ حدود میں صحیح نہیں، کیونکہ حدودِ شرعیہ قانونِ مروجہ کے ماتحت ممتنعُ الاقامت ہیں، کوئی حاکم حتّٰی کہ وئسرائے بھی، رجم پر قدرت نہیں رکھتا، قطعِ ید پر قدرت نہیں رکھتا، اس لئے اس کو جوازِ جمعہ کے لئے مدارِ حکم ٹھہرانا، کسی بھی طرح درست نہیں، ۲۶، شوال ۱۳۵۵ھ (کفایت المفتی مدلل ومکمل، ج۳ص۲۴۵، کتاب الصلاۃ، پانچواں باب: نمازِ جمعہ)

یہی بات ملا علی قاری حنفی رحمہ اللہ کے حوالے سے بھی آ گئے''**احتیاطُ الظہر**'' کے بیان میں آتی ہے۔

اور کفایتُ المفتی ہی میں ایک اور مقام پر ہے کہ:

''**مالایسع اکبر مساجدہ اھلہ**''اس تعریف پر بہت سے مشائخ نے فتویٰ دیا ہے، اور امام اعظم کی روایت پر بالاتفاق عمل متروک ہے، کیونکہ اجراءِ احکام اور تنفیذِ حدود تو بہت سے ممالکِ اسلامیہ میں نہیں، چہ جائیکہ ہندوستان میں، نیز فقہاء کی اس تصریح نے کہ دار الحرب میں بھی جمعہ ادا ہوسکتا ہے''**بلاد علیھا ولاۃ کفار یجوز للمسلمین اقامۃ الجمع والاعیاد فیھا**''مصر کی تعریف میں اجراءِ احکام وتنفیذِ حدود کی شرط کو نظر انداز کر دیا، اسی طرح باقی شروط بھی **مالایسع** والی تعریف میں نظر انداز کر دی گئیں، اور اس پر بہت سے مشائخ نے فتویٰ دے دیا ہے، اور آج کل اقامتِ جمعہ، بہت سے مصالحِ عظیمہ اسلامیہ کی وجہ سے اہم ہے، اس لئے بھی اور اس نظریے سے بھی کہ جمعہ قدیمہ کو بند کرنا بہت سے فتنہ ہائے شدیدہ کا موجب ہے، **مالایسع** والی روایت پر عمل کرنا لازم ہے، ۲۳ رجب ۱۳۵۶ھ (کفایت المفتی مدلل ومکمل، ج ۳ ص ۲۴۶، ۲۴۷، کتاب الصلاۃ، پانچواں باب: نمازِ جمعہ)

بعض حنفیہ کی تصریح پہلے گزر چکی ہے کہ مندرجہ بالا تعریف بہت سے گاؤں پر بھی صادق آتی ہے۔

اور کفایتُ المفتی میں ہی ہے کہ:

یہ صحیح ہے کہ حنفیہ کا مذہب یہی ہے کہ نمازِ جمعہ کے لئے مصر شرط ہے، گاؤں میں نمازِ جمعہ نہیں ہوتی، لیکن مصر کی تعریف میں جو تدریجی تنزل فقہاء ومشائخِ حنفیہ کرتے رہے ہیں، وہ بھی ہمارے سامنے ہے، پہلے ظاہرِ روایت کی بناء پر مصر کی تعریف یہ

تھی کہ مصروہ مقام ہے کہ جہاں امیرِ اسلام ہو، اور حدودِ شرعیہ کی تنفیذ اور احکامِ اسلام کا اجراء ہو، ظاہر ہے کہ اگر اس تعریف کا اعتبار کیا جائے، تو آج دہلی، لاہور اور ہندوستان کے کسی بڑے سے بڑے شہر میں بھی جمعہ جائز نہیں، کیونکہ اس تعریف کے بموجب کوئی شہر مصر نہیں، اس لئے فقہائے کرام نے امام ابویوسف رحمہ اللہ کی دوسری تعریف ''**مالایسع اکبر مساجدہ اھلہ المکلفین بھا** '' کو معتبر اور معمول اور مفتیٰ بہ بنالیا، اور فقہاء کا خود اقرار ہے کہ یہ تعریف بہت سے قریٰ (اور دیہات) پر صادق آتی ہے ''**ویصدق علی کثیر من القریٰ**'' (**ردالمحتار**) پس اگر مسئول عنہ موضع پر یہ تعریف صادق آتی ہو کہ اس میں کم از کم دو مسجدیں ہوں، اور ان میں سے بڑی مسجد میں موضع کے مکلفین بالجمعہ نہ سما سکیں، تو اس میں مذہبِ حنفی مفتیٰ بہ کے موافق نمازِ جمعہ جائز ہے، اور امام ابوحنیفہ کے قول اور ان سے جو تعریفِ مصر مروی ہے، اس کے موافق تو دہلی، لاہور میں بھی جائز نہیں، ۲۰ صفر ۱۳۶۱ھ (کفایت المفتی مدلل ومکمل، ج۳ص ۲۵۲، کتاب الصلاۃ، پانچواں باب: نمازِ جمعہ)

اور کفایت المفتی ہی میں ہے کہ:

ہمارے فقہائے حنفیہ نے اقامتِ جمعہ کو اس قدر اہم لکھا ہے کہ ظاہرِ روایت کی تمام شرائط کا گلا گھونٹ کے ان کو **کالعدم** بنادیا، شرطیتِ مصر یقیناً متفق علیہ ہے، یعنی متون اس پر متفق ہیں، لیکن مصر کی تعریف ظاہرُ الروایۃ میں یہ تھی کہ وہاں امیر وقاضی ہو، جو تنفیذِ احکام واقامتِ حدود کرتا ہو، لیکن اسلامی زمانے میں ہی تنفیذِ احکام واقامتِ حدود میں سستی واقع ہوئی، تو انہوں یہ دیکھ کر کہ جمعہ بند ہوجائے گا، فوراً ''**ینفذ ویقیم** '' کی جگہ ''**یقدر علی التنفیذ والاقامۃ** '' کردیا، اور جب بلادِ اسلامیہ پر کفار کی حکومت ہوگئی، تو انہوں نے ''**بلاد علیھا ولاۃ کفار یجوز للمسلمین اقامۃ الجمع والاعیاد فیھا** '' کہہ دیا، یعنی ظاہر روایت

کی تعریف کے بموجب، وہاں مصریت باطل ہوجانے کے بعد بھی جمعہ قائم رکھا، اسی طرح سلطان کی قید وشرط کا گلا گھونٹ دیا، اور سب سے آخر میں "**مالایسع اکبر مساجدہ اهله**" کہہ کر اور بلادِ محکومہ کفار میں اجازت دے کر دونوں شرطوں کو عملاً باطل کردیا، اس کے علاوہ شرطیتِ مصر، وجوبِ جمعہ کے لئے تو صحیح، لیکن جواز کے لئے بھی ہو، یہ میں نہیں سمجھ سکا (کفایت المفتی مدلل ومکمل، ج۳ص۲۵۳، ۲۵۴، کتاب الصلاۃ، پانچواں باب: نمازِ جمعہ)

اور کفایتُ المفتی ہی میں ایک مقام پر ہے کہ:

جس قصبہ میں تین مسجدیں ہوں، اور بڑی مسجد میں وہاں کے مکلّف بالجمعہ اشخاص نہ سماسکیں، تو وہاں جمعہ پڑھا جائے (کفایت المفتی مدلل ومکمل، ج۳ص۲۵۵، کتاب الصلاۃ، پانچواں باب: نمازِ جمعہ)

اور کفایتُ المفتی ہی میں ایک فتویٰ درجِ ذیل ہے کہ:

اس بستی میں جمعہ پڑھنا جائز ہے، حنفیہ کے مذہب میں بھی اس کی گنجائش ہے، کیونکہ حدِ مصر میں "**مالایسع اکبر مساجده**" پر بہت سے فقہائے حنفیہ نے فتویٰ دیا ہوا ہے (کفایت المفتی مدلل ومکمل، ج۳ص۲۵۷، کتاب الصلاۃ، پانچواں باب: نمازِ جمعہ)

اور کفایتُ المفتی ہی میں ہے کہ:

جس جگہ کم ازکم دو مسجدیں ہوں، اور ان میں سے بڑی مسجد میں وہاں کے مسلمان مکلّف بالجمعہ نہ سماسکیں، وہ شہر کا حکم رکھتی ہے (کفایت المفتی مدلل ومکمل، ج۳ص۲۵۷، کتاب الصلاۃ، پانچواں باب: نمازِ جمعہ)

اور کفایتُ المفتی ہی میں ہے کہ:

ہاں یہ تعریف بھی "**مالایسع اکبر مساجده اهله المكلفين بها**" بہت سے فقہائے عظام کے نزدیک معتبر اور مفتیٰ بہ ہے، اس لئے اس کے موافق عمل

کرنے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں ہے (کفایت المفتی مدلل ومکمل، ج۳ص۲۵۸، کتاب الصلاۃ، پانچواں باب: نمازِ جمعہ)

معلوم ہوا کہ موجودہ دور میں لوگوں کے دین کی حفاظت کے لئے مذکورہ تعریف کے مطابق جمعہ کے جواز کی گنجائش دی جانی چاہئے، اور ایسے مقام پر قائم ہونے والی نمازِ جمعہ کو بعض حنفی اہلِ علم حضرات کا باطل اور اس کے نتیجے میں ظہر کے فریضہ کا تارک قرار دینا اور اس میں تشدد اور سختی اختیار کرنا ہمارے نزدیک راجح نہیں ہے۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب اس سلسلہ میں لکھتے ہیں کہ:

شہر (مصر) سے کیا مراد ہے؟ یہ حدیث میں متعین نہیں، فقہاء نے اپنے ذوق ومزاج اور اپنے عہد کے عرف کو ملحوظ رکھتے ہوئے مصر کا مفہوم متعین کرنے کی کوشش کی ہے، اور اس میں خاصا اختلاف ہے، فقہاء کے نزدیک شہر کا جو مفہوم راجح ہے، وہ یہ ہے کہ اگر اس جگہ کے تمام لوگ وہاں کی بڑی مسجد میں جمع ہو جائیں، تو مسجد نا کافی ہو جائے، اور یہ شہر کا ایسا مفہوم ہے کہ اس کے اعتبار سے شہر کا دائرہ بہت وسیع ہو جاتا ہے، اور ضرورت اس وقت یہی ہے کہ شہر کا ایسا مفہوم متعین ہو کہ زیادہ سے زیادہ مقامات پر نمازِ جمعہ کی گنجائش نکل آئے، کیوں کہ جمعہ نہ صرف ایک عبادت ہے، بلکہ یہ تذکیر وموعظت کا بھی بہترین موقعہ ہے، اور بعض علاقوں میں جمعہ ہی کی وجہ سے اسلام سے اپنی وابستگی محسوس کرتے ہیں

(کتاب الفتاویٰ، تیسرا حصہ، ص۳۶، ۳۷، نماز سے متعلق سوالات، مطبوعہ: زمزم پبلشرز، کراچی، سنِ طباعت: جنوری 2008ء)

اور یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ گزشتہ زمانوں میں دین کے احکام میں غفلت اور سستی، جس نوعیت کی مسلمانوں میں پائی جاتی تھی، موجودہ زمانے میں اس کے اندر انحطاطِ زمانہ کے باعث اضافہ ہی ہوا ہے، اور عام مسلمانوں کا دین سے تعلق کافی حد تک کمزور ہو گیا ہے، بہت

سے لوگوں کو مساجد اور نماز کی طرف رُخ کرنے کی سال بھر بھی توفیق نہیں ہوتی، الا یہ کہ جمعہ و عیدین وغیرہ کا موقع ہو، لہٰذا اس علت کا تقاضا یہ ہوا کہ مسئلہ ہٰذا میں مزید توسع اور گنجائش کا راستہ نکالا جائے، نہ یہ کہ اس میں مزید سختی وتشدد سے کام لیا جائے، اور اس کے نتیجے میں دین کے احکام میں مزید غفلت و سستی میں اضافہ وترقی ہوتی چلی جائے، جیسا کہ ہمارے دور، و دیار کے بعض حضرات کا طرزِ عمل ہے۔

اور جب سائل کے موضع میں سے بڑی مسجد میں وہاں کے تمام عاقل، بالغ مرد بیک وقت نہیں سَما سکتے، جس کی سوال میں تصریح ہے، تو وہاں حنفیہ کے ایک مفتیٰ بہٖ قول کے مطابق بھی جمعہ کی نماز جائز ہے، جس سے منع کرنے کے کوئی معنیٰ نہیں، جبکہ حنفیہ کے علاوہ دیگر فقہائے کرام کے نزدیک تو بدرجۂ اولیٰ آپ کے یہاں جمعہ کی نماز جائز ہے، کیونکہ وہاں کے مقامی باشندے، چالیس افراد سے زیادہ نمازِ جمعہ میں شریک ہوتے ہیں۔

اس تفصیل کے مطابق آپ کے یہاں حنفیہ، شافعیہ، مالکیہ اور حنابلہ، سب فقہائے کرام کے مذہب کے مطابق نمازِ جمعہ، بلکہ نمازِ عید بھی درست ہے۔

لہٰذا سب مسلمانوں کو شوق وذوق کے ساتھ نمازِ جمعہ وعیدین میں شرکت کا اہتمام کر کے عالی شان فضائل کو حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔

اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

شہر اور گاؤں ہونے کا مدار، عرف پر ہونے کا قول

بعض مشائخِ حنفیہ نے مصر اور شہر کی حقیقت کا دارومدار کسی خاص علامت پر رکھنے کے بجائے فرمایا کہ کسی آبادی کے شہر اور اس کے برعکس گاؤں ہونے کا دارومدار عرف ورواج پر موقوف ہوتا ہے، اور عرف ورواج میں، جس آبادی کو شہر سمجھا وکہا اور قرار دیا جائے، اس کو شہر کا حکم حاصل ہوتا ہے، اور وہاں نمازِ جمعہ جائز ہوتی ہے۔

چنانچہ امدادُ الفتاویٰ میں ہے کہ:

جو عرفاً شہر کہا جاوے وہ شہر ہے اور وجودِ قضاۃ (یعنی قاضیوں کا موجود ہونا) وغیرہ سب امارات (وعلامات) ہیں (امداد الفتاویٰ، ج۱ص ۵۴۸، کتاب الصلاۃ، باب صلاۃ الجمعۃ والعیدین، سوال نمبر:۶۲۴، مطبوعہ: مکتبہ دارالعلوم کراچی، طبع جدید: شعبان ۱۴۳۱ھ، جولائی 2010ء)

حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمہ اللہ، کے ''حسنُ العزیز'' نامی ملفوظات میں ہے کہ:

مصر کی تعریفات ہر زمانہ میں وہ لوگوں نے کی ہیں، جن سے اس کی شناخت ہو جائے؛ کوئی تعریف جامع نہیں ہے، رسوم اور امارات (یعنی نشانیاں) ہیں، اور اصل مدار عرف پر ہے، پس کسی خاص امارت (نشانی وعلامت) کا کسی بلد (یعنی شہر) میں نہ پایا جانا مضر نہیں، اور نہ ان تعریفات میں باہم تعارض (وٹکراؤ) ہے (حسن العزیز، حصہ چہارم، مشمولہ: ملفوظاتِ حکیم الامت، ج۲۰ص ۵۹، ۶۰، ملفوظات ۳۰ صفر ۱۳۳۵ھ، مطبوعہ: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان، تاریخِ اشاعت: صفر المظفر ۱۴۲۵ھ)

احسنُ الفتاویٰ میں ہے کہ:

جن الفاظ کے شریعت نے خود کوئی مخصوص معنٰی متعین نہیں کیے، وہ اصل لغت اور عرفِ عام پر ہی محمول ہوتے ہیں، رسولُ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عرفِ عام سے الگ مصر کے کوئی خاص معنٰی متعین نہیں فرمائے، اس لئے یہ لفظ عرفِ عام پر ہی رہے گا، حضرات فقہاء رحمہم اللہ تعالیٰ نے اپنے اپنے زمانہ میں مصر کی علامات کے مطابق مختلف تعریفیں بیان فرمائی ہیں، اس لئے نہ ان تعریفوں میں کوئی تضاد ہے اور نہ ہی ان کے وجود وعدم پر مصریت کا مدار (احسن الفتاویٰ، ج۴ص ۱۸۷، کتاب الصلاۃ، باب الجمعۃ والعیدین، ناشر: ایچ ایم سعید کمپنی، کراچی، طبع یازدہم: ۱۴۲۵ھ)

مذکورہ عبارات وفتاویٰ جات سے معلوم ہوا کہ جمعہ کے جائز ہونے کے اعتبار سے شہر کا

دارومدار، عرف پر ہے، اور عرف، زمان ومقام کے لحاظ سے مختلف ہوسکتا ہے، لہٰذا کسی ایک زمانے، یا علاقے کے عرف اور اس کے مطابق فتوے کو ہمیشہ اور ہر جگہ کے لیے معیار قرار دینا درست نہیں۔

چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں شہر، عام طور پر اتنے وسیع نہیں ہوا کرتے تھے، جتنے آج کے دور میں ہیں، اور اس دور میں مکانات اور مساجد اور عمارات، کچی مٹی اور گارے سے تعمیر ہوتی تھیں، اور آج کل کی طرح کی پختہ سڑکیں، اور موجودہ شکل کے بازار بھی نہیں ہوا کرتے تھے، اور آج بھی بعض علاقوں میں کچے مکانات وعمارات ہوتی ہیں، جبکہ بعض علاقوں میں شہروں کی عمارات عام طور پر پختہ ہوتی ہیں، جس کا تقاضا یہ ہوا کہ کسی ایک زمانے یا علاقے کے عرف کو ہر جگہ اور ہر زمانے کے لیے بنیاد نہ بنایا جائے۔

آبادی کی کثرت، اور بازار، یا ضروریات مہیا ہونے کا قول

بعض متاخرین مشائخِ حنفیہ نے آج کل کے عرف میں شہر کی دو بنیادی علامات ایسی قرار دی ہیں، جن کی بنیاد پر کسی آبادی کو جمعہ کی نماز جائز ہونے کے اعتبار سے بلا شک وشبہ شہر کا حکم حاصل ہوتا ہے۔

ایک یہ کہ اس میں آبادی کی کثرت ہو، جس کی کل (مسلم وغیر مسلم، عورتوں اور مرد حضرات کی) مردم شماری کی مقدار تین چار ہزار کے لگ بھگ ہو۔

اور دوسرے یہ کہ اس میں بازار ہو، جس میں روزمرہ کی ضروریات بآسانی دستیاب ہوں۔

البتہ بعض حضرات نے مستقل بازار کے بجائے دوکانوں میں روزمرہ کی ضروریات کا بآسانی مہیا ہونا کافی قرار دیا ہے، اور آبادی کی تعداد ومقدار کو بھی متعین نہیں فرمایا۔

اس طرح کے چند فتاویٰ ذیل میں ملاحظہ فرمائیں۔

امداد الفتاویٰ میں فارسی زبان میں ایک سوال کے جواب میں ہے کہ:

آرے نظر بر عرف واصطلاحِ حکماء وحکامِ تمدن ایں ملک کہ آبادی چہار ہزار مردم راقصبہ می شمارند مع نظر بہ قول فقہاء التی فیھا اسواق در تعریف قریۂ کبیرہ کہ صالح اقامتِ جمعہ است معمول خود در فتویٰ چنین کردہ ام کہ ہر جا کہ ہر دو شرط یافتہ شود اجازتِ اقامتِ جمعہ میدہم وزیادہ ازیں تحقیق نیست۔ ۱۲۷ شوال ۱۳۲۷ھ

(امداد الفتاویٰ، ج ۱ ص ۵۲۵، ۵۲۶، کتاب الصلاۃ، باب صلاۃ الجمعۃ والعیدین، سوال نمبر: ۵۹۰، مطبوعہ: مکتبہ دارالعلوم کراچی، طبع جدید: شعبان ۱۴۳۱ھ، جولائی 2010ء)

ترجمہ: ’’ہماری نظر اس پر ہے کہ اس ملک کے عرف اور عقلاء اور حکام کی اصطلاح یہ ہے کہ چار ہزار لوگوں کی آبادی کو قصبہ شمار کرتے ہیں، اور فقہاء کے اس قول پر بھی نظر ہے کہ شہر وہ ہے، جس میں بازار ہوں، اس قریۂ کبیرہ (قصبہ) کی تعریف کے مطابق میرا فتویٰ دینے کا معمول یہ ہے کہ ایسا مقام جمعہ کے قائم ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے، پس ہر وہ جگہ کہ جس میں یہ دو شرطیں پائی جائیں، جمعہ قائم کرنا جائز ہے اور اس سے زیادہ ہمیں تحقیق نہیں‘‘

اور امداد الفتاویٰ ہی میں ایک مقام پر ہے کہ:

اور کبیرہ وصغیرہ میں ما بہ الفرق اگر آبادی کی مقدار لی جاوے، تو اس کا مدار عرف پر ہوگا، اور عرف کے تتبع سے معلوم ہوا کہ حکامِ وقت جو کہ حکمائے تمدن بھی ہیں، چار ہزار کی آبادی کو قصبہ میں شمار کرتے ہیں، اور چار ہزار کے قریب بوجہ معتبر نہ ہونے کے کسر کے حکم میں چار ہزار کے ہے (امداد الفتاویٰ، ج ۱ ص ۴۸۸، کتاب الصلاۃ، باب صلاۃ الجمعۃ والعیدین، سوال نمبر: ۵۴۲، مطبوعہ: مکتبہ دارالعلوم کراچی، طبع جدید: شعبان ۱۴۳۱ھ، جولائی 2010ء)

امداد المفتین میں ہے کہ:

اور تعریفِ مشہور بڑے گاؤں کی یہ ہے کہ جس میں بازار اور گلی کوچے ہوں اور تمام

ضروریات، ہمیشہ وہاں ملتی ہوں (امداد المفتین ،ص۳۴۷،سوال نمبر ۲۷۴،کتاب الصلاۃ، فصل فی الجمعۃ، ناشر: دارالاشاعت، کراچی، طباعت: مئی ۲۰۰۱ء)

فتاویٰ دارالعلوم میں ہے کہ:

شہر اور قصبہ اور بڑے قریہ میں جس میں دو چار ہزار آدمی آباد ہوں اور ضروری اشیاء کی دوکانیں ہوں، وہاں جمعہ واجب ہے اور اداء ہوتا ہے (فتاویٰ دارالعلوم دیوبند، ج۵ص۷۰، سوال نمبر: ۲۳۹۷، کتاب الصلاۃ، الباب الخامس عشر: فی صلاۃ الجمعۃ، ناشر: دارالاشاعت کراچی، طباعت: ستمبر ۲۰۰۲ء)

فتاویٰ مظاہرُ العلوم میں ہے کہ:

آپ کو مولوی صاحب نے چار ہزار مردم شماری کو جو بیان کیا ہے، وہ صحیح ہے، اکثر اس قدر مردم شماری قصبہ جات میں ہوتی ہے (فتاویٰ مظاہر العلوم، ج۱ص۱۱۸، کتاب الصلاۃ، باب الجمعۃ والعیدین، ناشر: مکتبۃ الشیخ، کراچی)

فتاویٰ محمودیہ میں ہے کہ:

بڑا گاؤں وہ ہے، جس میں گلی کوچے ہوں، بازار ہو، روزمرہ کی ضروریات ملتی ہوں، تین چار ہزار کی آبادی ہو (فتاویٰ محمودیہ مبوب، جلد۸ صفحہ۱۴۵، کتاب الصلاۃ، باب صلاۃ الجمعۃ، فصل فی اشتراط المصر للجمعۃ ، ناشر: ادارۃ الفاروق، کراچی، سنِ طباعتِ بارِ سوم: ۱۴۳۰ھ، 2009ء)

لیکن اگر کسی علاقے کے خاص ماحول و معاشرے اور عرف و رواج کے باعث ان دو چیزوں کے بغیر بھی اس علاقہ کے عرف میں کسی آبادی کو شہر سمجھا جاتا ہو، مثلاً اس کی آبادی اس علاقہ کے عام گاؤں، دیہاتوں سے زیادہ ہو، نیز وہاں اصطلاحی بازار (مسلسل دورویہ دوکانوں کا سلسلہ) اور دوکانوں کی کثرت نہ ہو، مگر روزمرہ کی ضروریات وہاں مہیا ہوں، اور اردگرد کی آبادیوں کے لئے وہ آبادی مرکزی آبادی کی حیثیت رکھتی ہو، تو بھی اس میں جمعہ جائز ہوگا،

کیونکہ زمان ومقام کے اعتبار سے عرف مختلف ہوسکتا ہے، اور ہر علاقہ کا اپنا عرف معتبر ہوتا ہے۔ [1]

چنانچہ فتاویٰ محمودیہ میں ہے کہ:

آبادی کے اعداد پر مدار نہیں، جہاں کہیں آبادی کو بتایا گیا ہے، وہ تخمینی ہے، تعیین نہیں، اور مجموعی آبادی مراد ہے، نہ کہ صرف مسلم آبادی (فتاویٰ محمودیہ مبوب، ج۸ص۶۰، کتاب الصلاۃ، باب صلاۃ الجمعۃ، فصل فی اشتراط المصر للجمعۃ، ناشر: ادارۃ الفاروق، کراچی، سنِ طباعتِ بارِسوم: ۱۴۳۰ھ، 2009ء)

اور فتاویٰ محمودیہ ہی میں ہے:

تحریرِ اکابر سے جو کچھ مستفاد ہے، وہ یہ ہے کہ ایسی بستی ہونی چاہئے، جو حوائجِ اصلیہ کے لئے جامع ہو، جس کو شہر، یا قصبہ یا بڑا گاؤں کہا جائے، وہاں گلی کوچے ہوں، محلے ہوں، ضروریات ہمیشہ ملتی ہوں، حکیم، یا ڈاکٹر ہو، ڈاک خانہ ہو، حاکم، یا گرام پنچایت کا انتظام ہو، ضروری پیشہ ور ہوں، آس پاس کے دیہات والے اپنی ضروریات وہاں سے پوری کرتے ہوں، محض مردم شماری پر موقوف نہیں، یہ جملہ امور پہلے تین چار ہزار کی آبادی میں موجود ہوتے تھے، اب تمدن تیزی سے بڑھ رہا ہے، اس سے کم میں بھی یہ سب چیزیں موجود ہوجاتی ہیں، اگر وہاں یہ

---

[1] (فان قلت)العرف یتغیر مرۃ بعد مرۃ فلو حدث عرف آخر لم یقع فی الزمان السابق فھل یسوغ للمفتی مخالفۃ المنصوص واتباع العرف الحادث؟

(قلت)نعم......لکن بعد ان یکون المفتی لمن لہ رأی ونظر صحیح ومعرفۃ بقواعد الشرع حتی یمیز بین العرف الذی یجوز بناء الاحکام علیہ وبین غیرہ(شرح عقود رسم المفتی ،مشمولۃ: مجموعۃ رسائل ابنِ عابدین، ج ۱ ص ۴۵)

(وحاصلہٗ)ان حکم العرف یثبت علی اھلہٖ عاماً او خاصاً فالعرف العام فی سائر البلاد یثبت حکمہٗ علی اھل سائر البلاد والخاص فی بلدۃ واحدۃ یثبت حکمہٗ علی تلک البلدفقط (”نشر العرف فی بناء بعض الاحکام علی العرف“ مشمولۃ :مجموعۃ رسائل ابنِ عابدین جلد۲ ص ۱۳۲)

سب چیزیں موجود ہیں، تو جمعہ صحیح درست ہے (فتاویٰ محمودیہ مبوب، ج ۸ ص ۶۴، کتاب الصلاۃ، باب صلاۃ الجمعۃ، فصل فی اشتراط المصر للجمعۃ، ناشر: ادارۃ الفاروق، کراچی، سنِ طباعتِ بارِ سوم: ۱۴۳۰ھ، 2009ء)

اور فتاویٰ محمودیہ ہی میں ہے:

مردم شماری کے لحاظ سے کوئی خاص عدد لازم نہیں، یہ علامات کچھ مدت پہلے تین چار ہزار کی آبادی میں ہوتی تھیں، اب تمدن تیزی سے ترقی کر رہا ہے، اب اس سے کم آبادی میں بھی یہ علامات جمع ہو جاتی ہیں، بعض بستیوں کی آبادی دو ہزار ہے، اس میں بھی یہ علامات موجود ہیں، بعض میں نہیں (فتاویٰ محمودیہ مبوب، ج ۸ ص ۸۳، کتاب الصلاۃ، باب صلاۃ الجمعۃ، فصل فی اشتراط المصر للجمعۃ، ناشر: ادارۃ الفاروق، کراچی، سنِ طباعتِ بارِ سوم: ۱۴۳۰ھ، 2009ء)

موجودہ دور میں تمدنی و معاشرتی اعتبار سے جس قدر تیزی کے ساتھ تبدیلی واقع ہوئی ہے، اور ضروریاتِ زندگی کی دور دراز علاقوں میں رسائی ہوئی ہے، اس کا تقاضا یہ تھا کہ موجودہ دور کے اہلِ افتاء اپنے اپنے عرف اور اس کے تغیرات پر غور وفکر کر کے حکم لگاتے، اور قدیمی زمانے وعرف کے فتاویٰ پر اکتفاء نہ کرتے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ پہلے زمانوں میں طلب و رسد کے اتنے تیز ترین ذرائع اور وسائل موجود نہیں تھے، جتنے کہ موجودہ دور میں ایجاد ہو گئے ہیں، اور ان کی بناء پر اب مستقل بازار نہ ہوتے ہوئے بھی ایسے ایسے مقامات پر ضروریاتِ زندگی کی رسائی ہو چکی ہے کہ جہاں پہلے زمانوں میں نہیں تھی۔

لہٰذا اگر کوئی مستقل آبادی ہو، اور وہاں کسی نہ کسی شکل میں روزمرہ کی ضروریات میسر ہوں، وہ جگہ جمعہ کے اعتبار سے حنفیہ کے نزدیک بھی مصرِ جامع کی حامل ہونی چاہیے۔

رہا یہ کہنا کہ اگر اس کو عرف میں شہر نہ کہا جاتا ہو، تو کیا تب بھی نمازِ جمعہ کے اعتبار سے اس کو

’’مصرِ جامع‘‘ قرار دینا درست ہوگا؟

ہم اس کے جواب میں عرض کریں گے کہ یہ بات واضح ہے کہ فقہائے حنفیہ میں سے بہت سے حضرات نے بعض ایسی آبادیوں پر بھی جمعہ وعیدین کے باب میں مصرِ جامع کا حکم لگایا ہے، جن کا اطلاق ’’قریہ‘‘ اور گاؤں پر بھی ہوتا ہے، جیسا کہ پہلے گزرا، اس لیے ہم سمجھتے ہیں کہ جمعہ وعیدین کے باب میں فقہائے حنفیہ نے بھی تنزل وتوسع کے پہلو کو نظر انداز نہیں کیا۔

اور روزمرہ کی ضروریاتِ زندگی میں ایسی چیزوں کو داخل ماننے سے ہمیں اتفاق نہ ہوسکا، جن کی ضرورت، انسان کو سال، ماہ وغیرہ کے بعد پیش آتی ہے۔ [1]

اس فصل کا خلاصہ

اس فصل میں جو گفتگو کی گئی، اس کا خلاصہ یہ نکلا کہ شافعیہ، حنابلہ، اور مالکیہ کے نزدیک تو مخصوص گاؤں اور دیہات میں نمازِ جمعہ جائز ہے، اور ان کے نزدیک نمازِ جمعہ کے لیے شہر کا ہونا شرط نہیں۔

البتہ حنفیہ کے نزدیک شہر کا ہونا شرط ہے، لیکن نمازِ جمعہ کے اعتبار سے کون سی آبادی شہر کا حکم رکھتی ہے، اس میں خود حنفی فقہاء وعلماء کا اختلاف ہے، اور اس میں کئی اقوال ہیں، جن میں سے کسی کے نزدیک ایک قول اور کسی کے نزدیک دوسرا قول راجح ہے، اور زمانوں اور علاقوں کے مختلف ہونے کی وجہ سے بھی ترجیح مختلف ہوتی رہی، جس کی وجہ یہ ہے کہ لوگوں کی تمدنی ومعاشرتی زندگی علاقوں اور زمانوں کے اعتبار سے مختلف ہوتی رہتی ہے، اس لیے ہر زمانے اور ہر علاقے کے لیے کسی ایک قول کو اختیار کرلینا، خاص کر کسی مخصوص ماحول اور علاقہ، یا زمانے میں جاری کیے گئے شخصی فتوے، یا چند فتاویٰ پر ہر علاقے اور ہر زمانے میں حکم کا

---

[1] یعمل بمثل ما عملوا من اعتبار تغیر العرف وأحوال الناس وما هو إلا رفق، وما ظهر علیه التعامل وما قوی وجهه ولا یخلو الوجود ممن یمیز هذا حقیقة لا ظنا وعلی من لم یمیز أن یرجع لمن یمیز لبراءة ذمته (منحة الخالق علی البحر الرائق، ج٦، ص ۲۹۳، کتاب القضاء، فصل تقلید من شاء من المجتهدین للإفتاء)

دارومدار رکھنا، درست طرزِ عمل نہیں۔

اس طرزِ عمل سے اصحابِ افتاء کو اجتناب کرنے کی ضرورت ہے، بالخصوص ایسے مسئلے میں، جس کا کافی حد تک مدار، عرف ورواج اور مقتضائے زمانہ پر ہو۔

نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ احکامِ دین میں سستی وغفلت کو دیکھتے ہوئے، فقہائے حنفیہ نے بھی اس سلسلہ میں تنزلی اختیار کی، اوراس کی وجہ سے ظاہرُ الروایت کو بھی ترک فرمادیا، اورایسے ایسے علاقوں وآبادیوں میں بھی نمازِ جمعہ کے جائز ہونے پر بکثرت حضرات نے فتویٰ دیا کہ جو فی الجملہ قریہ اور گاؤں کہلاتے تھے، لیکن ان کی آبادی عام اور چھوٹے گاؤں، دیہات سے کچھ زیادہ اوراس نوعیت کی تھی کہ وہاں کی بڑی مسجد میں جمعہ کے مکلّف لوگ نہ سما سکیں۔

لہٰذا فقہائے حنفیہ کے اس طرزِ عمل کو سامنے رکھ کر بعد کے اصحابِ افتاء کو بھی اس سلسلہ میں نرمی وتوسع کے پہلو کو اختیار کرنا چاہئے، اوراس سلسلہ میں زیادہ سختی وتشدد کے طرزِ عمل سے بچنا چاہئے، جس کی بناء پر جمعہ کی تاکید واہمیت اوراس کے ترک کرنے کی منصوص سخت ترین وعیدوں کا ہی نظرانداز کرنا لازم آجائے۔

واللہ تعالیٰ أعلم.

(فصل نمبر 5)

گاؤں میں نمازِ جمعہ کے جواز وعدمِ جواز کی تحقیق

گزشتہ تفصیل سے اس سلسلے میں حنفیہ کا موقف معلوم ہوگیا، جس کے پیشِ نظر فقہ حنفی سے تعلق رکھنے والے اصحابِ افتاء کے ایک بڑے طبقے کی رائے یہ ہے کہ حنفیہ کے اصل مذہب کی رو سے چھوٹے گاؤں میں، جہاں حنفیہ کے کسی قول کے مطابق جمعہ کی نماز جائز نہ ہوتی ہو، وہاں جمعہ کی نماز پڑھنا درست اور صحیح نہیں، اور اگر کوئی پڑھے، تو مذکورہ اہلِ علم حضرات کے نزدیک اس میں کئی خرابیاں لازم آتی ہیں، اور اس سے ظہر کا فریضہ ذمہ سے ادا نہیں ہوتا۔ [1]

---

[1] چنانچہ امداد الفتاویٰ میں ہے کہ:

(گاؤں میں) جمعہ پڑھنے سے اپنے مذہب کے چند مکروہات کا ارتکاب بھی لازم آتا ہے اول نفل کی جماعت، دوم نوافل نہار میں جہر، سوم غیر لازم کا التزام، چہارم ترکِ جماعت، فرضِ ظہر، پنجم اگر کوئی ظہر نہ پڑھے، تو ترکِ فریضہ کہ حرام اور فسق ہے، اور یہ بھی معلوم ہے کہ مصر شرائطِ جوازِ جمعہ سے ہے، شرائطِ وجوب سے نہیں، پس یہ احتمال بھی دفع ہوگیا کہ اگر واجب نہیں تو جائز تو ہو جاوے گا۔ لہٰذا صورتِ مسئولہ میں جمعہ پڑھنا حنفیہ کے نزدیک ممنوع اور ناجائز ہے (امداد الفتاویٰ، ج ا ص ۵۰۲، کتاب الصلاۃ، باب صلاۃ الجمعۃ والعیدین، سوال نمبر: ۵۶۰، مطبوعہ: مکتبہ دار العلوم کراچی، طبع جدید: شعبان ۱۴۳۱ھ، جولائی 2010ء)

اور امداد المفتین میں ہے کہ:

گاؤں میں جمعہ جائز نہیں، اور جو لوگ پڑھتے ہیں، ان کے ذمہ فریضۂ ظہر باقی رہتا ہے، اگر ظہر ادا نہ کریں گے تو گنہگار ہوں گے، اور جمعہ ادا کرنا بھی ایسے گاؤں میں خود گناہ ہے، کیونکہ جب ظہر کی نیت نہیں اور جمعہ واجب نہیں، تو یہ نماز نفل ہوگی، اور نفلوں کا جماعت سے ادا کرنا اور دن میں جہری قراءت کرنا ناجائز ہے، اور اگر کوئی جمعہ پڑھ کر بعد میں **احتیاطُ الظهر** پڑھے، تو یہ بھی ایسے گاؤں میں بالکل ناجائز ہے، کیونکہ جمعہ تو ادا نہ ہوا، اور **احتیاطُ الظهر** میں ظہر کی نیت مشکوک ہوتی ہے، اس لیے ظہر بھی ادا نہ ہوگی۔

البتہ اگر کوئی یقینی طور پر یہی نیت کرے کہ فرض ظہر میرے ذمہ ہیں اور میں اس کو ادا کرتا ہوں، تو نمازِ ظہر درست ہوجائے گی، لیکن ظہر سے پہلے جو جمعہ پڑھا ہے، اُس کا گناہ اُس کے ذمہ باقی رہے گا، اور جبکہ جمعہ وہاں جائز نہیں، تو تبلیغِ عدمِ جواز کرتے رہنا ضروری ہے (امداد المفتین، ص ۳۳۹، سوال نمبر ۲۷۶، کتاب الصلاۃ، فصل فی الجمعۃ، ناشر: دار الاشاعت، کراچی، طباعت: مئی ۲۰۰۱ء)

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

اور آج کل ہندوستان و پاکستان اور دنیا کے بے شمار ممالک میں عام دیہات اور گاؤں میں، جو نمازِ جمعہ پڑھی جاتی ہے، اور اس کی مختلف حکمتیں و مصلحتیں بیان کی جاتی ہیں، یا حنفی فقہ کے علاوہ دوسرے فقہاء کے قول کے مطابق نمازِ جمعہ کے جائز ہونے کا حوالہ دیا جاتا ہے، تو بہت سے حنفی اہلِ علم ومشائخ حضرات نے جمعہ کے جواز پر کسی ضرورت و مصلحت کے تحت دوسرے فقہاء کے قول پر بھی فتویٰ دینے، یا عمل اختیار کر لینے کی اجازت نہیں دی۔ [1]

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

اور فتاویٰ محمودیہ میں ہے کہ:

اتنی بات تو صاف اور مسلّم ہے کہ حنفیہ کے نزدیک قریۂ صغیرہ میں جمعہ درست نہیں، بلکہ روزانہ کی طرح جمعہ کے روز بھی ظہر کی نماز فرض ہے، اور ایسی جگہ جمعہ پڑھنے سے ظہر کا فریضہ ادا نہیں ہوگا، اور جس نماز کو جمعہ سمجھ کر پڑھیں گے، وہ نماز نفل ہوگی، نفل کو فرض اعتقاد کرنا اور نفل پڑھ کر یہ سمجھنا کہ فرض ادا ہوگیا اور نفل کے لیے اذان کہنا، اقامت کہنا، جماعت سے علیٰ سبیل التداعی پڑھنا، نفلِ نہاری میں قراءت بالجہر کرنا، یہ سب محظوراتِ شرعیہ لازم آئیں گے (فتاویٰ محمودیہ مبوب، جلد ۸ صفحہ ۴۲، **کتاب الصلاۃ، باب صلاۃ الجمعۃ، فصل فی اشتراط المصر للجمعۃ**، ناشر: ادارۃ الفاروق، کراچی، سنِ طباعتِ بارِ سوم: ۱۴۳۰ھ، 2009ء)

اور احسن الفتاویٰ میں ہے کہ:

جمعہ فی القریٰ مذہبِ حنفی میں جائز نہیں، اور بعض قریٰ میں بالاجماع باطل ہے۔

گاؤں میں جمعہ پڑھنے سے ظہر کا فرض ساقط نہ ہوگا، مزید بریں مذہب سے خروج، مذہب میں تلبیس، نوافل کی جماعت، دن کے نوافل میں جہراً قراءت اور جماعتِ ظہر کے ترک کا گناہ الگ ہوگا (احسن الفتاویٰ، ج ۴ ص ۱۸۵، کتاب الصلاۃ، باب الجمعۃ والعیدین، ناشر: ایچ ایم سعید کمپنی، کراچی، طبع یازدہم: ۱۴۲۵ھ)

مذکورہ اور ان جیسے فتاویٰ اور اصحابِ فتاویٰ کا مقام ومرتبہ اپنی جگہ، لیکن حالات ودلائل کے پیشِ نظر ان سے علمی وفقہی درجہ میں اختلاف، ان حضراتِ گرامی اور فتاویٰ جات کے مقام ومرتبہ کے منافی نہیں، جس کی باحوالہ تفصیل ان شاء اللہ تعالیٰ آگے جلد ہی آتی ہے۔ محمد رضوان۔

[1] چنانچہ امداد الفتاویٰ میں ہے کہ:

دوسرے مجتہد کے قول پر عمل کرنا، یا تو اس وقت جائز ہے، جب اپنے مذہب کے مکروہ کا ارتکاب لازم نہ آوے اور یا موضعِ ضرورت میں جائز ہے اور ظاہر ہے کہ جمعہ میں نہ تو کوئی ضرورت ہے اور جو مصلحتیں لکھی ہیں، یہ حدِ ضرورت کو نہیں پہنچیں، کیونکہ ضرورت کی حقیقت یہ ہے کہ بدون اس کے کوئی ضرر لاحق ہونے لگے، اور ضرر سے مراد حرج اور تنگی اور مشقت ہے، سو یہ امور متحقق نہیں، اور جمعہ پڑھنے سے اپنے مذہب کے

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

اور بعض حضرات نے مذہبِ غیر کے مطابق جمعہ قائم کرنے کی صورت میں فرمایا کہ دوسرے

﴿ گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ ﴾

چند مکروہات کا ارتکاب بھی لازم آتا ہے (امداد الفتاویٰ، ج۱ص۵۰۲، کتاب الصلاۃ، باب صلاۃ الجمعۃ والعیدین، سوال نمبر: ۵۶۰، مطبوعہ: مکتبہ دارالعلوم کراچی، طبع جدید: شعبان ۱۴۳۱ھ، جولائی 2010ء)

مگر مفتی کفایت اللہ صاحب رحمہ اللہ نے دینی مصلحت وضرورت کے تحت اس کی اجازت دی ہے کہ اس کے ذریعہ مسلمانوں کے بڑے طبقہ کی اسلام سے وابستگی ہے، اور جبکہ ایک مرتبہ نمازِ جمعہ شروع ہو چکی ہو، اور بند کرنے میں فتنہ لازم آتا ہو، اس کو سخت دینی ودنیوی فتنہ کا باعث قرار دیا ہے، اور مکروہ کے ارتکاب کا بھی جواب دیا ہے، جس کی تفصیل آگے آتی ہے۔

امداد المفتین میں ہے کہ:

> کسی کا یہ کہنا بالکل صحیح نہیں کہ لوگ اس بہانہ سے نماز پڑھ لیتے ہیں، مسلمان تو احکامِ شرعیہ کے مامور ہیں، حدودِ مذہب کے اندر لوگوں کو نماز کے لئے جمع کرنا چاہئے، اور اگر وہ کسی ایسی صورت میں جمع ہوں، جو شرعاً جائز نہ ہو، تو ایسے اجتماع ہی سے کیا فائدہ ہے، جب نمازِ جمعہ چھوٹے گاؤں میں ادا ہی نہیں ہوگی، تو پھر ایسی نماز کے لئے اگر جمع بھی ہو گئے اور پڑھ بھی لی، تو کیا فائدہ، اس لئے مسلمانوں کو تو فتوے پر عمل کرنا چاہئے، جس کی قسمت میں نماز اور عبادت لکھی ہے اور جس کو خدا کا خوف ہے وہ پھر بھی پڑھے گا، اور جو بدقسمت نہ پڑھے، تو اس کی فکر کسی کے ذمہ نہیں وہ اپنی قبر کا خود سامان کرے گا (امداد المفتین، ص۳۳۹، سوال نمبر ۲۷۶، کتاب الصلاۃ، فصل فی الجمعۃ، ناشر: دارالاشاعت، کراچی، طباعت: مئی ۲۰۰۱ء)
>
> جو (کتب) حنفیہ کے مذہب کی صحیح اور نہایت معتمَد ومعتبر ترجمان ہیں، سب کی سب اس شرط پر متفق ہیں اور چھوٹے گاؤں میں جمعہ کو ناجائز قرار دیتے ہیں، اور ان اساطینِ امت اور ائمۂ حنفیہ کی تصریحات کے بعد اگر بالفرض کسی حنفیُ المذہب عالم، محقق کی تحقیق ان سب حضرات کے خلاف بھی واقع ہو کہ یہ شرط ضروری نہیں؛ تب بھی از روئے عقل ونقل حنفیُ المذہب مسلمانوں کا فرض یہی ہوگا کہ ان عالم محقق کی تحقیق کا احترام باقی رکھتے ہوئے ان کی طرف سے تاویل کریں اور عمل میں جمہور فقہاء کا اتباع کریں، کیونکہ یہی دستورِ امت کے سنجیدہ حضرات اہلِ سنت والجماعت کا ہے کہ اتباع ہمیشہ جمہور کا کیا جاتا ہے (امداد المفتین، ص۳۴۰، سوال نمبر ۲۷۷، کتاب الصلاۃ، فصل فی الجمعۃ، ناشر: دارالاشاعت، کراچی، طباعت: مئی ۲۰۰۱ء)

مگر اس پر غور کرنا چاہئے کہ جب کسی قطعی فرض کا ترک لازم آتا ہو، تو مجتہد فیہ مسئلہ میں اس سے بچنے کے لئے بعض حنفیہ نے دوسرے فقیہ کے قول پر عمل کی اجازت دی ہے ''کما فی الصلاۃ عند طلوع الشمس''

امداد الاحکام میں ہے کہ:

> باقی سائل نے حجۃ اللہ البالغۃ اور فیوضِ قاسمیہ وارکانِ اربعہ کی عبارت کا جو حوالہ دیا ہے، سو ان کتابوں کی عبارات اس کو نقل کرنا چاہئے تھیں، یہ کتابیں میرے پاس موجود نہیں ہیں، باقی محض سائل کا لکھ دینا کافی نہیں، کیونکہ ممکن ہے کہ اس نے سمجھنے میں غلطی کی ہو (وبعدہٗ) اور بعد تسلیم کے جواب یہ ہے کہ سائل کو معلوم

﴿ بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں ﴾

مذہب پر عمل کرنے کی صورت میں جب تک اس مذہب کی تمام متعلقہ شرائط کو نہ لیا جائے، تلفیق کا اندیشہ ہے، جس میں کسی کے نزدیک بھی جمعہ کی نماز ادا نہیں ہوتی۔ [1]

لیکن ایک تو مذکورہ حکم، اس وقت ہے، جبکہ حنفیہ کے کسی قول کے مطابق بھی وہاں جمعہ کی نماز درست نہ ہوتی ہو، دوسرے یہ حکم مذکورہ بالا حضرات کے نزدیک ہے، جو حنفیہ کے مخصوص فقہ اور خاص قول کے مطابق، جمعہ کی نماز کو گاؤں میں جائز قرار نہیں دیتے۔

جبکہ دیگر بعض حضرات نے جمعہ کی نماز کی اہمیت، اور خاص کر موجودہ دور میں جمعہ کے عام مسلمانوں کے دین کی حفاظت کا ذریعہ ہونے اور بعض دیگر مصالحِ مہمہ عالیہ اسلامیہ کے پیشِ نظر گاؤں میں نمازِ جمعہ کے قیام کی گنجائش دی ہے، بالخصوص جب کسی ایسے گاؤں میں نمازِ جمعہ شروع ہو جائے، جہاں مشائخِ حنفیہ میں سے کسی قول کے مطابق، یا امام شافعی، امام

﴿ گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ ﴾

ہونا چاہئے کہ شاہ ولی اللہ صاحب ومولانا محمد قاسم صاحب ومولانا بحر العلوم کو ہم امام شافعی وامام مالک وامام احمد بن حنبل کی خاکِ پا کے برابر بھی نہیں سمجھتے، تو جب ہم نے اس مسئلہ میں ان ائمہ ثلاثہ کے قول کے خلاف ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا قول اختیار کیا ہے، کیونکہ روایۃً ودرایۃً ان کا قول ہمارے نزدیک صحیح ہے، تو ہم ان متاخرین کے قول کو اس کے مقابلہ میں کب تسلیم کر سکتے ہیں، ان کے اقوال کو ائمہ اربعہ کے اقوال سے کیا نسبت ہے، کچھ نہیں اگر ان کی تحقیق امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے خلاف ہے ہوا کرے، ہم نے ان کی تقلید کا التزام نہیں کیا، بعد میں فیوضِ قاسمیہ کے دیکھنے سے معلوم ہوا کہ سائل نے مولانا قاسم العلوم کا مطلب بالکل نہیں سمجھا مولانا قاسم العلوم کی عبارت کا مطلب سمجھنے کے لئے بڑی عقل کی ضرورت ہے (امداد الاحکام، ج ۱ص ۷۳۰، کتاب الصلاۃ، فصل فی الجمعۃ والعیدین، بعنوان ''گاؤں میں جمعہ صحیح نہ ہونے کا بیان'' ناشر: مکتبہ دار العلوم کراچی، طبع جدید: محرم ۱۴۳۰ھ، جنوری 2009ء)

لیکن آگے آتا ہے کہ اگر کوئی فقہی بصیرت واجتہاد کی صلاحیت رکھنے والا مذہبِ غیر پر فتویٰ دے، تو اس میں کوئی برائی نہیں، اور عامی شخص کو اس پر عمل کرنا بھی جائز ہے۔محمد رضوان۔

[1] چنانچہ فتاویٰ عثمانی میں ہے کہ:

کسی ایک مسئلے میں مالکیہ، یا شافعیہ کے قول کو لینا اور باقی نماز حنفیہ کے طریقے پر پڑھنے میں تلفیق کا اندیشہ ہے، جو باجماعِ فقہاء باطل ہے اور اس سے کسی کے نزدیک نماز صحیح نہیں ہوتی؛ لہٰذا مالکیہ، یا شافعیہ کے مسلک پر عمل کر کے جمعہ ادا کر لینا کسی طرح درست نہیں (فتاویٰ عثمانی، جلد ۱ صفحہ ۵۱۶، کتاب الصلاۃ، فصل فی الجمعۃ، ناشر: مکتبہ معارف القرآن، کراچی، طبع جدید: ربیع الثانی ۱۴۳۱ھ، اپریل 2010ء)

احمد، یا امام مالک رحمہم اللہ کے نزدیک، جمعہ کی نماز درست ہو، تو مشاہدہ کی رو سے، اس کو بند کرنے میں بہت سے مفاسد لازم آتے ہیں، اس لئے اس کو جاری رکھنے کی گنجائش ہے، اور جن لوگوں کو کسی مقام میں جمعہ کی نماز جائز ہونے میں شک ہو، اُن کو فتنہ وفساد اور انتشار واضطراب پیدا کرنے کے بجائے جمعہ کی نماز کے بعد خاموشی سے احتیاطاً چار رکعات، اس وقت کے فرضوں کی نیت سے پڑھ لینے کا حکم ہے۔

گاؤں میں جمعہ کے جواز کا یہ موقف، چونکہ ہمارے یہاں کے اصحابِ افتاء کے ایک بڑے طبقے میں معروف نہیں ہے، اس لیے اس کو خاطر خواہ پذیرائی بھی حاصل نہیں، اس لیے اس موقف کو ان حضرات کی طرف سے نہ تو اہمیت دی جاتی، اور نہ ہی اس سے کوئی انسیت محسوس کی جاتی، لیکن ہماری نظر میں چونکہ بحالاتِ موجودہ یہ موقف نہایت اہمیت وتوجہ کا حامل ہے، اس لیے اس کی طرف توجہ کرنا وقت کی اہم ضرورت ہے۔

اس سلسلہ میں چند اہلِ علم حضرات کے حوالہ جات ذیل میں ذکر کیے جاتے ہیں۔

امام شافعی کا حوالہ

امام شافعی رحمہ اللہ ''کتابُ الأم'' میں فرماتے ہیں کہ:

وروى أنه كتب إلى أهل قرى عرينة أن يصلوا الجمعة والعيدين.

وروى أنه أمر عمرو بن حزم أن يصلي العيدين بأهل نجران .

(قال الشافعي) : أخبرنا إبراهيم بن محمد قال: أخبرنا عبد العزيز بن عمر بن عبد العزيز عن أبيه عن عبيد الله بن عبد الله بن عتبة قال: كل قرية فيها أربعون رجلا فعليهم الجمعة قال: قال الشافعي أخبرنا الثقة عن سليمان بن موسى أن عمر بن عبد العزيز كتب إلى أهل المياه فيما بين الشام إلى مكة جمعوا إذا بلغتم

أربعين رجلا .

(قال الشافعي) : فإذا كان من أهل القرية أربعون رجلا والقرية البناء والحجارة واللبن والسقف والجرائد والشجر؛ لأن هذا بناء كله وتكون بيوتها مجتمعة ويكون أهلها لا يظعنون عنها شتاء ولا صيفا إلا ظعن حاجة مثل ظعن أهل القرى وتكون بيوتها مجتمعة اجتماع بيوت القرى، فإن لم تكن مجتمعة فليسوا أهل قرية ولا يجمعون ويتمون إذا كانوا أربعين رجلا حرا بالغا فإذا كانوا هكذا رأيت – والله تعالى أعلم – أن عليهم الجمعة فإذا صلوا الجمعة أجزأتهم (كتاب الأم للشافعي، ج ا ص ٢١٩، كتاب الصلاة، ايجاب الجمعة، العدد الذين إذا كانوا في قرية وجبت عليهم الجمعة)

ترجمہ: اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں مروی ہے کہ آپ نے ''عرينة'' گاؤں والوں کو یہ لکھ کر بھیجا کہ وہ جمعہ اور عیدین کی نمازوں کو پڑھیں۔

اور یہ بھی مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرو بن حزم رضی اللہ عنہ کو یہ حکم فرمایا کہ وہ ''اهلِ نجران'' کو عیدین کی نماز پڑھائیں۔

امام شافعی نے فرمایا کہ ہمیں ابراہیم بن محمد نے خبر دی، وہ کہتے ہیں کہ ہمیں عبدالعزیز بن عمر بن عبدالعزیز نے اپنے والد سے روایت کرتے ہوئے خبر دی کہ عبیداللہ بن عبداللہ بن عتبہ نے فرمایا کہ ہر وہ گاؤں، جس میں چالیس آدمی ہوں، تو ان پر جمعہ کی نماز واجب ہے، امام شافعی نے فرمایا کہ ہمیں معتبر راوی نے سلیمان بن موسیٰ کے بارے میں، انہوں نے عمر بن عبدالعزیز کے بارے میں یہ خبر دی کہ انہوں نے شام اور مکہ کے درمیان ''پانی والوں'' کو یہ لکھ کر بھیجا کہ تم جب چالیس افراد ہو جاؤ، تو جمعہ پڑھ لیا کرو۔

امام شافعی نے فرمایا کہ جب گاؤں والے چالیس مرد ہوں، اور گاؤں، عمارت اور کچی اینٹوں اور چھت اور لکڑیوں اور درخت کی چھال سے تعمیر شدہ ہوتا ہے، کیونکہ یہ سب عمارات کہلاتی ہیں، اور ان کے گھر مجتمع ہوں، اور وہ گاؤں والے سردیوں اور گرمیوں میں وہاں سے کوچ نہ کرتے ہوں، سوائے ضرورت کے وقت، جیسا کہ گاؤں والے، ضرورت کے وقت کوچ کرتے ہیں، اور ان کے گھر مجتمع ہوں، گاؤں والوں کے گھروں کی طرح (تو جائز ہے) اگر ان کے گھر مجتمع نہ ہوں، تو وہ اہلِ قریہ نہیں، جو جمعہ نہیں پڑھیں گے، اور اگر وہ پورے چالیس، آزاد، بالغ افراد ہوں، تو ان پر جمعہ کی نماز واجب ہے، پھر جب وہ جمعہ کی نماز پڑھیں گے، تو میری رائے میں ان کے لیے نمازِ جمعہ کا پڑھنا جائز ہوگا، واللہ تعالیٰ اعلم (کتابُ الأم)

شافعیہ کے موقف کا خلاصہ پیچھے ذکر کیا جا چکا ہے، اوپر کی عبارت سے گاؤں میں جمعہ کے جائز ہونے کے چند دلائل بھی معلوم ہوئے۔

البتہ امام شافعی رحمہ اللہ نے جو چالیس افراد کو شرط قرار دیا ہے، اس سے بعض دوسرے فقہائے کرام نے اتفاق نہیں کیا، جیسا کہ پہلے گزرا، اور آگے بھی آتا ہے۔

”الإشراف لإبن المنذر“ کا حوالہ

امام ابنِ منذر نیسابوری (المتوفی 319 ہجری) اپنی تالیف ”الإشراف علی مذاهب العلماء“ میں فرماتے ہیں:

روينا عن ابن عمر أنه كان يرى أهل المياه بين مكة والمدينة يجمعون ولا يعيب ذلك عليهم، وروى عن عمر بن عبد العزيز أنه كتب بذلك.

وفيه قول ثان: وهو أن كل قرية عليها أميرٌ يجمع فيها، روى

ذلک عن عمر بن عبد العزیز، وبنحوه قال الأزواعی، والليث بن سعد.

وفیه قول ثالث :وهو أن لا جمعة ولا تشریق إلا فی مصر جامع، روی ذلک عن علی، وبه قال النخعی.

وقال الحسن، وابن سیرین :لا جمعة إلا فی مصر جامع، وبه قال النعمان، وابن الحسن.

وفیه قول رابع " :وهو أن الجمعة إنما تجب علی کل قریة فیها أربعون رجلاً، أحراراً بالغین، وتکون بیوتها مجتمعة لا یظعنون عنها شتاءً ولا صیفاً، إلا ظعن حاجة"، هذا قول الشافعی.

ومال أحمد، وإسحاق إلی هذا القول ولم یشترطا هذه الشروط.

وفیه قول خامس :وهو أیما قریة فیها أربعون رجلاً فصاعداً علیهم إمام حاضر یقضی بینهم، فلیخطب ولیصل بهم رکعتین.

وفیه قول سادس :وهو الروایة الرابعة عن عمر بن عبد العزیز أنه کتب :أیما قریة اجتمع فیها خمسون رجلاً فلیصلوا الجمعة.

وفیه قول سابع :وهو إذا لم یحضر الإمام إلا ثلاثة صلی بهم الجمعة، هذا قول الأوزاعی، وهو مذهب أبی ثور.

وقال مکحول :إذا کانت القریة فیها الجماعة صلوا الجمعة رکعتین.

وقال مالک :فی القریة التی تتصل دورها، أری أن یجمعوا الجمعة کان علیهم والی أو لم یکن.

وحکی عن عکرمة قال :إذا کانوا سبعة جمعوا.

قال أبو بکر :قول الأوزاعی موافق لظاهر قوله:"ذا نودی للصلاة

من یوم الجمعة فاسعوا" الآية(الإشراف على مذاهب العلماء، ج۲، ص۸۷،۸۸، کتاب الجمعة ،باب الأمصار التي يجب على أهلها الجمعة)

ترجمہ: اور ہم نے ابنِ عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ وہ مکہ اور مدینہ کے درمیان، پانی والوں کو، جمعہ پڑھتے ہوئے دیکھتے تھے، اور ان پر عیب نہیں لگاتے تھے، اور عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ انہوں نے بھی یہی تحریر فرمایا تھا۔ [1]

اور اس بارے میں دوسرا قول یہ ہے کہ ہر وہ گاؤں، جن پر امیر مقرر ہو، تو وہ ان کو جمعہ پڑھائے گا، عمر بن عبدالعزیز سے یہی مروی ہے، اور اسی کے مثل امام اوزاعی اور لیث بن سعد کا قول ہے۔

اور اس بارے میں تیسرا قول یہ ہے کہ جمعہ اور تشریق "مصرِ جامع" میں ہی ہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ سے یہ قول مروی ہے، اور یہی قول امام نخعی کا ہے۔

اور حسن بصری اور ابنِ سیرین نے فرمایا کہ جمعہ "مصرِ جامع" میں ہی ہے، یہ قول نعمان اور ابنِ الحسن کا ہے۔

اور اس بارے میں چوتھا قول یہ ہے کہ جمعہ صرف ان گاؤں والوں پر واجب ہے، جن میں چالیس بالغ مرد موجود ہوں، اور ان کے گھر مجتمع ہوں، جہاں سے وہ سردیوں اور گرمیوں میں کوچ نہ کرجاتے ہوں، سوائے ضرورت کے وقت کے، یہ امام شافعی کا قول ہے۔

اور امام احمد اور امام اسحاق، اسی قول کی طرف گئے ہیں، لیکن انہوں یہ مذکورہ شرائط نہیں لگائیں۔

اور اس بارے میں پانچواں قول یہ ہے کہ جس گاؤں میں چالیس، یا اس سے زیادہ

---

[1] پانی والوں سے وہ لوگ مراد ہیں، جو شہروں سے باہر تالابوں اور کنووں وغیرہ کے پاس رہائش پذیر ہوتے ہیں، اور وہ ضرورت مندوں کو پانی فراہم ومنتقل کرتے ہیں۔ محمد رضوان

مرد ہوں، اور ان میں امام موجود ہو، جو ان کے درمیان فیصلہ کرتا ہوں، تو وہ خطبہ دے کر انہیں جمعہ کی دو رکعتیں پڑھائے گا۔

اور اس بارے میں چھٹا قول یہ ہے، اور عمر بن عبدالعزیز سے چوتھی روایت بھی یہی ہے کہ انہوں نے یہ لکھا کہ جس گاؤں میں بھی پچاس مرد جمع ہوں، تو وہ جمعہ کی نماز پڑھیں گے۔

اور اس بارے میں ساتواں قول یہ ہے کہ جب امام کے ساتھ صرف تین افراد بھی موجود ہوں، تو وہ ان کو جمعہ کی نماز پڑھائے گا، یہ اوزاعی کا قول ہے، اور یہی ابوثور کا مذہب ہے۔

اور مکحول نے فرمایا کہ جب گاؤں میں جماعت ہو، تو وہ جمعہ کی دو رکعتیں پڑھیں۔

اور امام مالک نے فرمایا کہ جس گاؤں کے گھر، باہم متصل ہوں، تو میری رائے کے مطابق وہ جمعہ کی نماز پڑھیں گے، ان پر کوئی والی، یا امیر مقرر ہو، یا نہ ہو۔

اور عکرمہ کے بارے میں مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ جب سات افراد ہوں، تو وہ جمعہ کی نماز پڑھیں گے۔

ابوبکر (یعنی امام ابنِ منذر نیسابوری) نے فرمایا کہ اوزاعی کا قول، اللہ تعالیٰ کے اس ظاہری قول کے موافق ہے کہ ''اِذَا نُودِیَ لِلصَّلَاۃِ مِنْ یَوْمِ الْجُمُعَۃِ فَاسْعَوْا'' (یعنی جب امام کے ساتھ صرف تین افراد موجود ہوں، تو وہ جمعہ کی نماز پڑھیں گے) (الإشراف)

امام ابنِ منذر کے موقف کی مزید تفصیل آگے آتی ہے۔

''الأوسط لإبن المنذر'' کا حوالہ

امام ابنِ منذر نیسابوری (المتوفیٰ: 319ھ) اس سلسلے میں مختلف اقوال نقل کرنے کے بعد

فرماتے ہیں:

أوجب الله على الخلق اتباع كتابه وسنن نبيه صلى الله عليه وسلم، قال الله جل ذكره :(أطيعوا الله وأطيعوا الرسول وأولى الأمر منكم، فإن تنازعتم فى شىء فردوه إلى الله والرسول. .) الآية، وقال الله جل ذكره :(يا أيها الذين آمنوا إذا نودى للصلاة من يوم الجمعة فاسعوا إلى ذكر الله . .) الآية، فاتباع ظاهر كتاب الله عز وجل يجب، ولا يجوز أن يستثنى من ظاهر الكتاب جماعة دون عدد جماعة بغير حجة، ولو كان الله فى عدد دون عدد مراد لبين ذلک فى كتابه، أو على لسان نبيه صلى الله عليه وسلم، فلما عم ولم يخص كانت الجمعة على كل جماعة فى دار إقامة على ظاهر الكتاب، وليس لأحد مع عموم الكتاب أن يخرج قوما من جملته بغير حجة يفزع إليها، وهذا يلزم من مذهبه القول بعموم الكتاب، وأن لا يحال ظاهر منه إلى باطن، ولا عام إلى خاص إلا بكتاب أو سنة أو اتفاق.

وقد اختلفت الروايات فى هذا الباب عن عمر بن عبد العزيز وقد ذكرناها، ولو لم تختلف الروايات عنه ما وجب الاستثناء من ظاهر الكتاب بقوله، وليس لاحتجاج من احتج بقصة أسعد فى أن لا تجزء جمعة بأقل من أربعين حجة، إذ ليس فى شىء من الأخبار أن النبى صلى الله عليه وسلم أمرهم إذا كان عددهم كذا أن يصلوا، أو إن نقصوا من ذلک العدد لم يصلوا، إنما كتب أن يصلى بمن معه، ولو ورد كتاب النبى صلى الله عليه وسلم وعددهم أقل من أربعين فترک أن يصلى بهم، لكان تاركا لما

أمره به.

ودفع بعض أهل العلم قول من زعم أن الجمعة إنما تصلى فى مصر أو مدينة تكون فيها قاضى ينفذ الأحكام ويقيم الحدود، بأن بعض أصحابه قد صلى بالمدينة الجمعة وليس فيها منبر ولا قاضى ولا كانت الحدود تقام بها فى ذلك الوقت (الأوسط فى السنن والإجماع والاختلاف، ج۴، ص۲۷، كتاب صفة الصلاة، ذكر اختلاف أهل العلم فى القرى التى يجب على أهلها الجمعة اختلف أهل العلم فى الأمصار والقرى التى يجب على أهلها الجمعة)

ترجمہ: اللہ نے مخلوق پر اپنی کتاب اور اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کو لازم کیا ہے، اللہ جل شانہٗ کا (سورہ نساء میں) ارشاد ہے کہ ''أطيعوا اللّٰه وأطيعوا الرسول وأولى الأمر منكم، فإن تنازعتم فى شىء فردوه إلى اللّٰه والرسول ''اور اللہ جل شانہٗ کا (سورہ جمعہ میں) ارشاد ہے کہ ''يا أيها الذين آمنوا إذا نودى للصلاة من يوم الجمعة فاسعوا إلى ذكر اللّٰه ''پس اللہ عزوجل کی کتاب کے ظاہر کی اتباع واجب ہے، اور یہ بات جائز نہیں کہ ظاہرِ کتاب سے بغیر حجت ودلیل کے ایک جماعت کو چھوڑ کر دوسری جماعت کو مستثنیٰ کیا جائے، اور اگر اللہ تعالیٰ کی مراد، مخصوص تعداد ہوتی، تو اپنی کتاب میں اس کا بیان فرماتا، یا اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان کے ذریعے، اس کو بیان فرماتا، پس جب اللہ نے نمازِ جمعہ کا عام حکم بیان فرمایا، اور کوئی تخصیص نہیں فرمائی، تو جمعہ ہر جماعت پر اقامت والے مقام میں ظاہرِ کتاب کی رُو سے واجب ہوگا، اور کسی کے لیے کتاب کے عموم سے کسی مخصوص قوم کو، بغیر ایسی حجت کے خارج کرنا جائز نہیں ہوگا، جو اس کو خارج قرار دے، اس سے عمومِ کتاب والے قول کا لازم ہونا

ثابت ہوتا ہے، اور یہ لازم آتا ہے کہ اس (حکمِ الٰہی) کو ظاہر سے باطن کی طرف نہ پھیرا جائے، اور نہ عام سے خاص کی طرف پھیرا جائے، جب تک کہ کتاب، یا سنت، یا اجماع سے کوئی استثناء ثابت نہ ہو۔

اور اس باب میں عمر بن عبدالعزیز سے مختلف روایات مروی ہیں، جن کو ہم ذکر کر چکے ہیں، اور ان کی روایات سے اس سلسلے میں ان کا قول مختلف نہیں ہے، جو ظاہرِ کتاب سے استثناء کو ثابت کرے، اور جس نے حضرت اسعد رضی اللہ عنہ کے قصے سے یہ دلیل پکڑی ہے کہ چالیس سے کم تعداد ہونے کی صورت میں جمعہ کی نماز جائز نہیں، تو وہ دلیل بھی درست نہیں، کیونکہ احادیث میں یہ بات مذکور نہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو یہ حکم فرمایا ہو کہ جب ان کی اتنی تعداد ہو جائے، تو وہ جمعہ کی نماز پڑھیں، اور جب اتنی تعداد سے کم افراد ہوں، تو وہ جمعہ کی نماز نہ پڑھیں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تو صرف یہ حکم فرمایا کہ وہ اپنے ساتھیوں کو جمعہ کی نماز پڑھائیں، اور اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ہو جاتا، اور ان کی تعداد چالیس سے کم ہوتی، پھر وہ ان کو نماز نہ پڑھاتے، تو وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کو ترک کرنے والے شمار ہوتے۔

اور بعض اہلِ علم حضرات کا جو یہ گمان ہے کہ جمعہ صرف ایسے شہر میں پڑھا جائے گا، جس میں قاضی ہو، جو احکام کو نافذ کرتا ہو، اور حدود کو قائم کرتا ہو، تو اس قول کی تردید اس بات سے ہوتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے (نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم مبارک سے) مدینہ منورہ میں اس وقت (سب سے پہلا) جمعہ پڑھا، جب مدینہ منورہ میں نہ تو منبر تھا، اور نہ قاضی تھا، اور نہ اس وقت میں مدینہ منورہ میں حدود قائم کی جاتی تھیں (الاوسط)

امام ابنِ منذر رحمہ اللہ کی یہ بات وزن رکھتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے جب صحابۂ

کرام رضی اللہ عنہم نے مدینہ منورہ میں ابتدائی جمعہ قائم فرمایا، تو اس وقت نہ وہاں پر باضابطہ کوئی قاضی، اور والی تھا، اور نہ ہی حدود قائم کرنے کا سلسلہ جاری ہوا تھا، یہ سب کچھ وہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہجرت فرمانے اور قیام فرمانے کے بعد ہوا۔

اور جمعہ کی نماز کی فرضیت جتنے مضبوط دلائل اور نصوص کے ساتھ ثابت ہے، جب تک اس کے خلاف کوئی معتبر و مضبوط نص نہ آ جائے، اس وقت تک اس کے خلاف حکم لگانا، مناسب نہیں، اور جمعہ کو شہروں کے ساتھ خاص رکھنے کا قول اتنے مضبوط دلائل سے ثابت نہیں، لہٰذا اس کو شہر کے ساتھ خاص رکھنا بھی ان کے نزدیک راجح نہیں، یہی بات اور بھی کئی فقہاء واصحابِ علم حضرات نے بیان فرمائی ہے۔ [1]

یہ بھی ملحوظ رہے کہ امام ابنِ منذر رحمہ اللہ کا شمار، مستقل مجتہدین میں ہوتا ہے، جن کو فقہ واجتہاد اور علمِ حدیث اور علمِ اختلاف کی معرفت میں اعلیٰ مقام حاصل ہے۔

علامہ ذہبی رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے کہ امام ابنِ منذر کی تحقیق کا درجہ نہایت بلند ہے، اور ان کو حدیث کی معرفت میں انتہائی اعلیٰ قابلیت حاصل ہے، اور یہ کسی متعین مذہب کے دائرہ میں رہتے ہوئے اقوال کو ترجیح نہیں دیتے، بلکہ جو دلیل قوی ہو، اس کی اتباع کرتے ہیں، اور ہمارے زمانے کے جو علماء علم وتحقیق کی قدرت نہیں رکھتے، یا وہ متعصب ہیں، وہ صرف ایک ہی مذہب کے دائرہ میں رہتے ہیں، لیکن ابنِ منذر ایسے نہیں ہیں، وہ خود ایک حجت ہیں۔ [2]

---

[1] قال الجامع عفا الله تعالى عنه: هذا الذى رجحه الإمام ابن المنذر –رحمه الله– من وجوب الجمعة على كل جماعة فى مكان، سواء كان مدينة، أو قرية بدون عدد معين، هو المذهب الراجح عندى؛ لوضوح أدلته، والله تعالى أعلم بالصواب، وإليه المرجع والمآب(البحر المحيط الثجاج فى شرح صحيح الإمام مسلم بن الحجاج، لمحمد بن على بن آدم بن موسى الإتيوبى الولوى، ج۱۷ ص ۲۲، كتاب الجمعة،المسألة السابعة:فى اختلاف أهل العلم فى الأماكن التى تجب الجمعة على أهلها)

[2] محمد بن إبراهيم بن المنذر الحافظ العلامة أبو بكر النيسابورى، صاحب التصانيف، عدل صادق فيما علمت إلا ما قال فيه مسلمة بن قاسم الأندلسى :كان لا يحسن الحديث ونسب إلى العقيلى أنه كان يحمل عليه وينسبه إلى الكذب.

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

یہ بھی ملحوظ رہے کہ کسی مسئلہ میں ائمہ اربعہ کے علاوہ کسی مجتہد کی تقلید اس شرط کے ساتھ جائز

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

وكان يروى عن الربيع بن سليمان عن الشافعي.
ولم ير الربيع ولا سمع منه، وذكر غير ذلك.
توفي سنة ثمان عشرة وثلاثمائة.
ولا عبرة بقول مسلمة.
وأما العقيلي فكلامه من قبيل كلام الاقران بعضهم في بعض، مع أنه لم يذكر في كتاب الضعفاء .
وقال أبو الحسن القطان :لا يلتفت إلى كلام العقيلي فيه(ميزان الاعتدال في نقد الرجال،للذهبي، ج٣،ص ٤٥٠، ٤٥١،حرف الميم، تحت رقم الترجمة ٧١٢٣)
محمد بن إبراهيم بن المنذر، الإمام أبو بكر النيسابوري الفقيه، (المتوفى 318 :هـ)
صاحب التصانيف، نزيل مكة.
صنف كتبا لم يصنف مثلها في الفقه، وغيره، له كتاب "المبسوط في الفقه "وهو كتاب جليل، وكتاب "الإشراف في اختلاف العلماء "وهو مشهور، وكتاب "الإجماع "وكان على نهاية من معرفة الحديث والاختلاف، وكان مجتهدا لا يقلد أحدا.
سمع :محمد بن ميمون، ومحمد بن إسماعيل الصائغ، ومحمد بن عبد الله بن عبد الحكم،
روى عنه :أبو بكر ابن المقرء، ومحمد بن يحيى بن عمار الدمياطي شيخ الطلمنكي، والحسن بن علي بن شعبان، وأخوه الحسين، وآخرون.
قال أبو إسحاق الشيرازي :توفي سنة تسع أو عشر، وهذا ليس بشيء ، فإن ابن عمار لقيه سنة ست عشرة، ووجدت ابن القطان نقل وفاته في هذه السنة فليعتمد(تاريخ الإسلام، للذهبي، ج٧، ص ٣٤٤،٣٤٥،حرف الميم، تحت رقم الترجمة ٣٨٦)
ابن المنذر أبو بكر محمد بن إبراهيم النيسابوري .
الإمام، الحافظ، العلامة، شيخ الإسلام، أبو بكر محمد بن إبراهيم بن المنذر النيسابوري الفقيه، نزيل مكة، وصاحب التصانيف كـ "الإشراف في اختلاف العلماء" وكتاب "الإجماع" وكتاب "المبسوط" وغير ذلك.
ولد :في حدود موت أحمد بن حنبل.
وروى عن :الربيع بن سليمان، ومحمد بن عبد الله بن عبد الحكم، ومحمد بن إسماعيل الصائغ، ومحمد بن ميمون، وعلي بن عبد العزيز، وخلق كثير مذكورين في كتبه.
حدث عنه :أبو بكر بن المقرء، ومحمد بن يحيى بن عمار الدمياطي، والحسين والحسن؛ ابنا علي بن شعبان.
ولم يذكره الحاكم في "تاريخه" نسيه، ولا هو في "تاريخ بغداد" ولا "تاريخ دمشق" فإنه ما دخلها.
وعداده في الفقهاء الشافعية.

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

ہے کہ اس کا وہ قول معتبر وموثق سند سے ثابت ہو۔ [1]

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

قال الشيخ محيي الدين النواوي : له من التحقيق في كتبه ما لا يقاربه فيه أحد، وهو في نهاية من التمكن من معرفة الحديث، وله اختيار فلا يتقيد في الاختيار بمذهب بعينه، بل يدور مع ظهور الدليل.

قلت :ما يتقيد بمذهب واحد إلا من هو قاصر في التمكن من العلم، كأكثر علماء زماننا، أو من هو متعصب، وهذا الإمام فهو من حملة الحجة، جار في مضمار ابن جرير، وابن سريج، وتلك الحلبة -رحمهم الله.

أخبرنا عمر بن عبد المنعم، أخبرنا أبو اليمن الكندي سنة ثمان وست مائة كتابة، أخبرنا علي بن هبة الله بن عبد السلام، حدثنا الإمام أبو إسحاق في كتاب "الطبقات" قال:ومنهم أبو بكر محمد بن إبراهيم بن المنذر النيسابوري، مات بمكة، سنة تسع -أو عشر -وثلاث مائة، وصنف في اختلاف العلماء كتبا لم يصنف أحد مثلها، واحتاج إلى كتبه الموافق والمخالف، ولا أعلم عمن أخذ الفقه.

قلت :قد أخذ عن أصحاب الإمام الشافعي، وما ذكره الشيخ أبو إسحاق من وفاته، فهو على التوهم، وإلا فقد سمع منه ابن عمار في سنة ست عشرة وثلاث مائة، وأرخ الإمام أبو الحسن بن قطان الفاسي وفاته في سنة ثماني عشرة.

أخبرنا جماعة إذنا، عن عائشة بنت معمر (ح)وقال أحمد بن محمد العلائي، أخبرنا إسحاق بن أبي بكر، أخبرنا يوسف بن خليل، أخبرنا المؤيد بن الأخوة، قالا :أخبرنا سعيد بن أبي الرجاء ، أخبرنا أبو طاهر أحمد بن محمود، ومنصور بن الحسين، قالا :أخبرنا أبو بكر محمد بن إبراهيم، أخبرنا محمد بن إبراهيم بن المنذر -فقيه مكة -حدثنا محمد بن ميمون، حدثنا عبد الله بن يحيى البرلسي، عن حيوة بن شريح، عن ابن عجلان، عن أبي الزناد، عن الأعرج، عن أبي هريرة :عن النبي -صلى الله عليه وسلم -قال :(من جر لنفسه شيئا ليقتلها، فإنما يجعلها في النار، ومن طعن نفسه بشيء ، فإنما يطعنها في النار، ومن اقتحم، فإنما يقتحم في النار.غريب.

ولابن المنذر (تفسير) كبير في بضعة عشر مجلدا، يقضي له بالإمامة في علم التأويل أيضا(سير أعلام النبلاء ،للذهبي، ج۱۴ ،ص ۴۹۰ الی ۴۹۲، تحت رقم الترجمة ۲۷۵ ،الطبقة الثامنة عشر)

[1] چنانچہ حضرت شیخ مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم فرماتے ہیں:

ان ابن نجيم رحمه الله تعالىٰ انما اعتمد في هذا القول على "التحرير" لابن الهمام، ولكن ابن الهمام رحمه الله تعالىٰ لم يقل ان القضاء بغير المذاهب الاربعة غير نافذ، وانما قال انه لايجوز اليوم تقليد غير الائمة الاربعة بصفة عامة ، لأن مذاهب سواهم غير مدونة. وهذا لايستلزم أن يكون قول غيرهم لايعتبر في كون المسئلة اجتهادية. وعبارة ابن الهمام في آخر كتابه"التحرير" هكذا: "نقل الإمام في البرهان إجماع المحققين على منع العوام من تقليد أعيان الصحابة، بل من بعدهم الذين سبروا ووضعوا ودونوا،و على هذا ما ذكر بعض المتأخرين منع تقليد غير الأربعة لانضباط مذاهبهم ،

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

علامہ ابنِ تیمیہ کا حوالہ

علامہ ابنِ تیمیہ رحمہ اللہ اپنے فتاویٰ میں، ایک سوال کے جواب میں فرماتے ہیں:

فاعلموا -رحمكم الله -أن مثل هذه الصورة تقام فيها الجمعة فإن كل قوم كانوا مستوطنين ببناء متقارب لا يظعنون عنه شتاء ولا صيفا تقام فيه الجمعة إذ كان مبنيا بما جرت به عادتهم :من

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

وتقييد مسائلهم ،وتخصيص عمومها،ولم يدر مثله في غيرهم الآن لانقراض أتباعهم وهو صحيح" وقال ابنِ امير حاج تحته "وحاصل هذا أنه امتنع تقليد غير هؤلاء لتعذر نقل حقيقة مذهبهم، وعدم ثبوته حق الثبوت، لا لأنه لايقلد (اصول الافتاء لتقى العثماني، ص ۲۳۲ ،القضاء بغير المذاهب الاربعة، الناشر: مكتبة معارف القرآن كراتشي، باكستان، الطبعة: شعبان المعظم ۱۴۳۲ھ ، جولائی ۲۰۱۱ء)

ترجمہ: بے شک ابنِ نجیم رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس قول میں ابن ہمام کی ''التحریر'' پر اعتماد کیا ہے، لیکن ابنِ ہمام رحمہ اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ مذاہبِ اربعہ کے علاوہ قضائے قاضی نافذ نہیں ہوتا، بلکہ انہوں نے تو صرف یہ فرمایا ہے کہ آج کے دور میں ائمہ اربعہ کے علاوہ کسی اور کی تقلید عمومی انداز میں جائز نہیں، کیونکہ ان کے علاوہ کے مذاہب مدون نہیں ہیں، اور اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ائمہ اربعہ کے علاوہ کا قول مسئلہ کے اجتہادی ہونے میں معتبر نہ ہو، اور ابنِ ہمام کی ''التحریر'' کے اخیر کی عبارت اس طرح ہے (جس کا ترجمہ یہ ہے کہ) امام نے برہان میں محققین کا اجماع نقل کیا ہے، عوام کو اعیانِ صحابہ کی تقلید کے ممنوع ہونے پر، بلکہ ان کے بعد ان حضرات کی تقلید پر جنہوں نے گہرائی کے ساتھ مسائل وضع کیے، اور مدون کیے، اور اسی پر بعض متاخرین کا ذکر کردہ وہ مسئلہ بھی ہے کہ انہوں نے ائمہ اربعہ کے علاوہ کی تقلید سے منع کیا ہے، کیونکہ صرف ان ہی کے مذاہب منضبط ہیں، اور ان ہی کے مسائل کی قیود اور عموم کی تخصیص پائی جاتی ہے، اور اس کے مثل ان کے علاوہ دوسرے مذاہب میں آج یہ چیز نہیں پائی جاتی، کیونکہ ان کے متبعین ختم ہو چکے ہیں، اور یہ بات صحیح ہے، اور ابنِ امیر حاج نے اس کے ذیل میں فرمایا کہ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ان ائمہ اربعہ کے علاوہ کسی اور کی تقلید سے اس لیے منع کیا جائے گا کہ ان کے مذہب کی حقیقت کا نقل کرنا متعذر رہے، اور اسی طرح اس کا کما حقہ ثبوت بھی نہیں ہے، مگر اس کی یہ وجہ نہیں ہے کہ ان کی تقلید نہیں کی جاسکتی (اصول الافتاء)

پھر اس بحث کے اختتام پر حضرت شیخ موصوف فرماتے ہیں:

وهذه المسائل كلها تدل على أن نفاذ القضاء ليس خاصا بالمذاهب الاربعة، بل ينفذ

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

مـدر وخشـب أو قـصـب أو جـريـد أو سعف أو غير ذلک .فإن أجـزاء البـنـاء ومـادته لا تأثير لها فی ذلک إنما الأصل أن يكونوا مستوطنين ليسوا كأهل الخيام والحلل الذين ينتجعون فی الغالب مواقع القطر ويتنقلون فی البقاع وينقلون بيوتهم معهم إذا انتقلوا . وهذا مذهب جمهور العلماء .

وبقصة أرضكم احتج الجمهور على أبی حنيفة حيث قال :لا تقام الـجـمـعة فی القرى بالحديث المأثور عن ابن عباس -رضی الله عنهما " -أن أول جـمـعة جـمعت فی الإسلام بعد جمعة المدينة جمعة بالبحرين بقرية يقال لها جواثی من قرى البحرين "وبأن أبا هريرة -رضـی الله عنه -وكـان عـامـل عـمر رضی الله عنه على البـحـرين فكتب إلی أمير المؤمنين عمر يستأذنه فی إقامة الجمعة بقرى البحرين فكتب إليه عمر :أقيموا الجمعة حيث كنتم.

ولعل الذين قالوا لكم :إن الـجمعة لا تقام قد تقلدوا قول من يرى الـجـمـعة لا تـقـام فـی الـقرى أو اعتقدوا أن معنى قول الفقهاء فی الـكـتب المختصرة "إنـمـا تقام بقرية مبنية بناء متصلا أو متقاربا

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

اذا وافـق احـد الـمجتهدين المعتبرين، بشرط أن كان قولهم ثبت بطريق موثوق (اصول الافتـاء لتـقـی العثمانی، ص ۲۳۴،القضاء بغير المذاهب الاربعة، الناشر: مكتبة معارف القرآن كراتشی، باكستان، الطبعة: شعبان المعظم ۱۴۳۲ھ، جولائی ۲۰۱۱ء)

ترجمہ: اور یہ تمام مسائل اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ قضائے قاضی کا نفاذ، مذاہبِ اربعہ کے ساتھ خاص نہیں ہے، بلکہ جب بھی معتبر مجتہدین میں سے کسی کے بھی موافق ہو جائے، تو وہ نافذ ہو جائے گا، بشرطیکہ ان مجتہدین کا قول معتبر طریقہ سے ثابت ہو (ایضاً)

اس مسئلہ کی تفصیل ہم نے اجتہاد وتقلید اور عـمـل بـالحدیث سے متعلق دوسری تالیفات میں ذکر کردی ہے، یہاں اس کی تفصیل کا موقع نہیں۔ محمد رضوان۔

بحيث يشمله اسم واحد فاعتقدوا أن البناء لا يكون إلا بالمدر من طين أو كلس أو حجارة أو لبن.

وهـذا غـلـط مـنهم بل قد نص العلماء على أن البناء إنما يعتبر بما جـرت بـه عادة أولئک المستوطنين من أی شیء كان :قصب أو خشب ونحوه .ولهذا فالعلماء الأئمة إنما فرقوا بين الأعراب أهل الـعـمـد وبيـن الـمقيمين بأن أولئک يتنقلون ولا يستوطنون بقعة بـخلاف المستوطنين وقد كان قوم من السلف يبنون لهم بيوتا من قـصب (والنبی صلى الله عليه وسلم سقف مسجده بجريد النخل حتى كان يكف المسجد إذا نزل المطر .قالوا :يا رسول الله :لو بـنينا لک -يعـنـون بناء مشيدا -فـقال :بـل عـريـش كعريـش موسى) ."

وقد نص على مسألتكم بعينها -وهی البيوت المصنوعة من جريد أو سعف -غيـر واحـد مـن الـعـلـمـاء منهم أصحاب الإمام أحمد كـالـقـاضـی أبـی يعلى وأبی الحسن الآمدی وابن عقيل وغيرهم . فإنهـم ذكـروا أن كـل بيـوت مبـنية من آجر أو طين أو حجارة أو خشـب أو قـصـب أو جـريـد أو سـعف فـإنـه تـقام عندهم الجمعة وكذلک ذكرها غير واحد من أصحاب الشافعی رضی الله عنهم من الخراسانيين :كصاحب "الوسيط "فيما أظن ومن العراقيين أيـضـا أن بيـوت السـعف تـقـام فيهـا الـجمعة .وخـالف هؤلاء الـمـاوردی فـی الـحاوی فذكر أن بيوت القصب والجريد لا تقام فيهـا الـجـمـعة بـل تـقام فی بيوت الخشب الوثيقة .وهـذا الفرق

ضعيف مخالف لما عليه الجمهور و القياس ولما دلت عليه الآثار و كلام الأئمة .فإن أبا هريرة كتب إلى عمر بن الخطاب رضى الله عنهما يسأله عن الجمعة وهو بالبحرين فكتب إليه عمر بن الخطاب أن جمعوا حيثما كنتم .

وذهب الإمام أحمد إلى حديث عمر هذا .وعن نافع أن ابن عمر رضى الله عنهما كان يمر بالمياه التى بين مكة و المدينة وهم يجمعون فى تلك المنازل فلا ينكر عليهم .فهذا عمر يأمر أهل البحرين بالتجميع حيث استوطنوا مع العلم بأن بعض البيوت تكون من جريد ولم يشترط بناء مخصوصا و كذلك ابن عمر أقر أهل المنازل التى بين مكة و المدينة على التجميع ومعلوم أنها لم تكن من مدر وإنما هى إما من جريد أو سعف .

وقال الإمام أحمد :ليس على البادية جمعة لأنهم ينتقلون .فعلل سقوطها بالانتقال فكل من كان مستوطنا لا ينتقل باختياره فهو من أهل القرى .

والفرق بين هؤلاء وبين أهل الخيام من وجهين :

أحدهما :أن أولئك فى العادة الغالبة لا يستوطنون مكانا بعينه وإن استوطن فرق منهم مكانا فهم فى مظنة الانتقال عنه بخلاف هؤلاء المستوطنين الذين يحترثون ويزدرعون ولا ينتقلون إلا كما ينتقل أهل أبنية المدر .إما لحاجة تعرض أو ليد غالبة تنقلهم كما تفعله الملوك مع الفلاحين .

الثانى :أن بيوت أهل الخيام ينقلونها معهم إذا انتقلوا فصارت من

المنقول لا من العقار بخلاف الخشب والقصب والجريد فإن أصحابها لا ينقلونها ليبنوا بها فى المكان الذى ينتقلون إليه وإنما يبنون فى كل مكان بما هو قريب منه مع أن هذا ليس موضع استقصاء الأدلة فى المسألة وهذه المسألة "إقامة الجمعة بالقرى "أول ما ابتدأت من ناحيتكم فلا تقطعوا هذه الشريعة من أرضكم فإن الله يجمع لكم جوامع الخير (مجموع الفتاوى، لابن تيمية، ج۲۴، ص ۱٦٦ الى ۲۷۰، كتاب الفقه، تابع الصلاة - الجمعة، باب صلاة الجمعة)

ترجمہ: اللہ تم پر رحم فرمائے! یہ بات جان لو کہ اس صورت میں مذکورہ مقام پر (جہاں کچی آبادی اور گاؤں کے لوگ، مستقل طور پر رہائش پذیر ہوں) جمعہ کی نماز قائم کی جائے گی، کیونکہ ہر وہ قوم، جو ایک دوسرے کے قریب، عمارت بنا کر مستقل طور پر رہائش پذیر ہو، جہاں سے وہ لوگ نہ سردیوں میں کوچ کرتے ہوں، اور نہ گرمیوں میں، تو وہاں جمعہ کی نماز قائم کی جائے گی، جبکہ وہ عمارت، ان کی اپنی عادت وعرف کے مطابق قائم ہو، خواہ وہ مٹی کی ہو، یا لکڑی کی ہو، یا بانسوں کی ہو، یا شاخوں کی ہو، یا پتوں وغیرہ کی ہو، کیونکہ عمارت کے اجزاء اور اس کے مادے کا اس میں کوئی اثر نہیں، اصل دارومدار اس پر ہے کہ وہ مستقل باشندے ہوں، وہ اہلِ خیمہ وغیرہ کی طرح نہ ہوں، جو مختلف مقامات پر چل پھر کر رہائش پذیر ہوتے ہیں، اور وہ مختلف مقامات میں منتقل ہوتے رہتے ہیں، اور اپنے گھروں کو بھی اپنے ساتھ منتقل کرتے ہیں۔

جمہور علماء کا مذہب یہی ہے۔

اور تمہارے علاقے کے قصبے پر جمہور نے امام ابوحنیفہ کے خلاف، جن کا قول یہ

ہے کہ جمعہ، گاؤں میں قائم نہیں کیا جائے گا، اس حدیث سے دلیل پکڑی ہے، جو ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ''اسلام میں مدینہ منورہ کے جمعہ کے بعد، سب سے پہلا جمعہ بحرین کے ایک گاؤں میں پڑھا گیا، جس کو ''جواثی'' کہا جاتا تھا، جو بحرین کے گاؤں میں سے ایک گاؤں ہے'' اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی اس روایت سے بھی دلیل پکڑی ہے، جب وہ عمر رضی اللہ عنہ کے حکم سے، بحرین کے عامل تھے، انہوں نے امیر المومنین عمر رضی اللہ عنہ سے بحرین کے گاؤں میں جمعہ قائم ہونے کی اجازت طلب کی، تو ان کو عمر رضی اللہ عنہ نے یہ لکھا کہ تم جہاں بھی ہوا کرو، جمعہ قائم کرلیا کرو۔

اور جن لوگوں نے تم کو یہ بات کہی کہ تمہارے علاقے میں جمعہ قائم نہیں کیا جائے گا، شاید انہوں نے اس قول کی تقلید کی، جس کی رو سے گاؤں میں جمعہ قائم کرنا جائز نہیں، یا انہوں نے یہ سمجھا کہ فقہاء کا مختصر کتابوں میں جو یہ قول مذکور ہے کہ جمعہ ایسے گاؤں میں ہی قائم کیا جائے گا، جس کی عمارتیں متصل، یا ایک دوسرے کے قریب ہوں کہ ان کو ایک نام شامل ہو، تو انہوں نے اس کا مطلب یہ سمجھا کہ عمارت، صرف مٹی کی تعمیر، یا چونے، یا پتھر، یا لکڑی ہی کی ہوتی ہے۔

حالانکہ یہ ان کی غلط فہمی ہے، کیونکہ علماء نے اس بات کی وضاحت فرمائی ہے کہ عمارت کا اعتبار، ان مستقل باشندوں کی حسبِ عادت وعرف ہوتا ہے، جس چیز سے بھی وہ عمارت بنائیں، چاہے بانس ہو، یا لکڑی ہو، یا کچھ اور ہو، اور اسی وجہ سے علمائے ائمہ نے خیمے والوں اور مقیمین کے درمیان فرق کیا ہے کہ یہ لوگ منتقل ہوتے ہیں، اور کسی جگہ کو مستقل وطن نہیں بناتے، بخلاف مستقل وطن بنانے والوں کے، اور سلف کے حضرات اپنے گھر بانسوں سے بھی بناتے تھے'' اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد کی چھت، کھجور کی چھال کی تھی، یہاں تک کہ جب بارش ہوتی تھی،

تو مسجد کو سنبھالنا پڑتا تھا، صحابۂ کرام نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! اگر ہم آپ کے لیے عمارت بنادیں، تو کیسا ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بس ایسی چھت کافی ہے، جو موسیٰ علیہ السلام کی چھت کی طرح ہو''

اور تمہارے بعینہٖ اس مسئلے کی طرح جو لکڑی، یا پتوں سے بنائے گھر ہوں، بہت سے علماء نے تصریح کی ہے، جن میں امام احمد کے اصحاب، مثلاً قاضی ابو یعلیٰ، اور ابوالحسن آمدی اور ابنِ عقیل وغیرہ داخل ہیں، انہوں نے ذکر کیا ہے کہ وہ تمام گھر، جو پختہ، یا کچی مٹی، یا پتھر، یا لکڑی، یا بانس، یا چھال، یا پتوں وغیرہ سے تعمیر کیے جائیں، تو وہاں جمعہ کی نماز قائم کی جائے گی، اور اسی طریقے سے امام شافعی رحمہ اللہ کے کئی خراسانیین اصحاب نے بھی ذکر کیا ہے، جیسا کہ صاحبِ وسیط نے، میرے گمان کے مطابق، اور عراقیین اصحاب نے بھی ذکر کیا ہے کہ لکڑی اور پتوں کے گھروں میں جمعہ قائم کیا جائے گا، لیکن ماوردی نے''الحاوی''میں ان کی مخالفت کی ہے، چنانچہ انہوں نے یہ بات ذکر کی ہے کہ بانس اور شاخوں کے گھروں میں جمعہ قائم نہیں کیا جائے گا، بلکہ مضبوط لکڑی کے گھروں میں قائم کیا جائے گا، لیکن یہ فرق کمزور ہے، جمہور کے قول اور قیاس کے خلاف ہے، اور روایات اور ائمہ کے کلام کی دلالت کے بھی خلاف ہے، کیونکہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی طرف جمعہ کے متعلق، سوال لکھ کر بھیجا، تو ان کو عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے جواب میں لکھا کہ تم جہاں بھی ہوا کرو، جمعہ پڑھ لیا کرو۔

اور امام احمد نے بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی اس حدیث کو اختیار کیا ہے، اور حضرت نافع سے مروی ہے کہ حضرت ابنِ عمر رضی اللہ عنہما، مکہ اور مدینہ کے درمیان، پانی والوں کے پاس سے گزرتے تھے، اور وہ ان مقامات پر جمعہ کی نماز پڑھا کرتے تھے، تو وہ ان کو انکار نہیں کیا کرتے تھے، پس یہ عمر رضی اللہ عنہ ہیں، جو

اہلِ بحرین کو جمعہ کا حکم فرمارہے ہیں، جہاں بھی وہ وطن بنالیں، یہ بات معلوم ہونے کے باوجود کہ بعض گھر، چھال کے بھی ہوتے ہیں، اور آپ نے کسی مخصوص عمارت کی شرط نہیں لگائی، اور اسی طریقے سے ابنِ عمر رضی اللہ عنہ نے مکہ اور مدینہ کے درمیان کے باشندوں کو جمعہ پڑھنے پر برقرار رکھا، یہ بات معلوم ہونے کے باوجود کہ ان کے گھر پختہ نہیں تھے، بلکہ وہ چھال، یا بانس اور شاخوں کی شکل میں تھے۔

اور امام احمد نے فرمایا کہ خانہ بدوشوں پر جمعہ نہیں ہے، کیونکہ وہ منتقل ہوتے رہتے ہیں، امام احمد نے جمعہ ساقط ہونے کی علت، منتقل ہونے کو قرار دیا، پس وہ تمام لوگ جو مستقل باشندے ہوں، وہ اپنے اختیار سے منتقل نہ ہوتے ہوں، تو وہ گاؤں والوں میں داخل ہیں۔

اور ان کے درمیان اور اہلِ خیمہ کے درمیان فرق دو طرح سے ہے:

ایک تو یہ کہ اہلِ خیمہ کی اکثر عادت یہ ہے کہ وہ کسی متعین جگہ کو وطن نہیں بناتے، اور اگر ان میں سے کوئی کسی جگہ کو وطن بنانا بھی چاہے، تو ان کے منتقل ہونے کا مظنہ (یعنی غالب گمان) پھر بھی باقی رہتا ہے، بخلاف ان مستقل باشندوں کے، جو مستقل طور پر رہائش پذیر ہوتے ہیں، اور وہ اسی طرح منتقل ہوتے ہیں، جس طرح سے پختہ عمارتوں والے منتقل ہوتے ہیں، یا تو کسی ضرورت پیش آنے کی وجہ سے، یا کسی غلبہ پانے والے کے قبضے کی وجہ سے، جو ان کو منتقل کردے، جیسا کہ بادشاہ وحکمران، ملاحوں کے ساتھ کرتے ہیں۔

دوسرا فرق یہ ہے کہ اہلِ خیمہ کے گھر، ان کے ساتھ ہی منتقل ہوجاتے ہیں، جب وہ خود منتقل ہوتے ہیں، تو ان کے گھر دراصل منتقل ہونے والی چیزوں میں سے ہوگئے، غیر منقولہ عمارتوں میں داخل نہ ہوئے، بخلاف لکڑی اور بانسوں اور

چھالوں کے کہ ان سے بنائے ہوئے گھر والے لوگ ان کو منتقل نہیں کرتے، تاکہ وہ ان کو اس جگہ نصب کریں، جس جگہ وہ منتقل ہورہے ہیں، بلکہ وہ ہر جگہ میں ایسی عمارت بناتے ہیں، جیسی اس کے قریب ہوتی ہے، بہرحال یہ مقام، اس مسئلے میں دلائل کو جمع کرنے کا نہیں ہے، اور یہ مسئلہ، گاؤں میں جمعہ قائم کرنے کا، سب سے پہلے تمہارے علاقے میں شروع ہوا ہے، پس تم اپنے علاقے سے شریعت کے اس حکم کو ختم نہ کرو، کیونکہ اللہ تمہارے لیے (جمعہ کی برکت سے) بہت سی خیر کی باتوں کو جمع فرمادے گا (مجموعُ الفتاویٰ)

علامہ ابنِ تیمیہ رحمہ اللہ، ایک اور مقام پر فرماتے ہیں کہ:

والذی علیه الجمهور کمالک والشافعی وأحمد أن الجمعة تقام فی القری؛ لأن فی الصحیح عن ابن عباس أنه قال " :أول جمعة جمعت فی الإسلام بعد جمعة المدینة جمعة "بجواثی "قریة من قری البحرین "وکان ذلک علی عهد رسول الله صلی الله علیه وسلم حین قدم علیه وفد عبد القیس .وکذلک کتب عمر بن الخطاب إلی المسلمین یأمرهم بالجمعة حیث کانوا .وکان عبد الله بن عمر یمر بالمیاه التی بین مکة والمدینة وهم یقیمون الجمعة فلا ینکر علیهم .وأما قول علی رضی الله عنه لا جمعة ولا تشریق إلا فی مصر جامع .فلو لم یکن له مخالف لجاز أن یراد به أن کل قریة مصر جامع کما أن المصر الجامع یسمی قریة .وقد سمی الله مکة قریة بل سماها "أم القری "بل وما هو أکبر من مکة کما فی قوله :(وکأین من قریة هی أشد قوة من قریتک التی أخرجتک أهلکناهم فلا ناصر لهم) وسمی مصر القدیمة قریة

بقوله :(واسأل القرية التی كنا فيها والعير التی أقبلنا فيها) . ومثله فی القرآن كثير والله أعلم (مجموع الفتاوی،لابن تیمیة، ج۲۴،ص ۲۰۹، ۲۱۰، کتاب الفقه ، تابع الصلاة۔ الجمعة ،باب صلاة الجمعة)

ترجمہ: اور جمہور، جیسے امام مالک اور امام شافعی اور امام احمد کا جو مذہب ہے، وہ یہ ہے کہ جمعہ، گاؤں دیہات میں بھی قائم کیا جائے گا، کیونکہ ابنِ عباس رضی اللہ عنہ سے صحیح سند کے ساتھ مروی ہے کہ اسلام میں مدینہ کے جمعہ کے بعد سب سے پہلا جمعہ ’’جواثی‘‘ میں قائم کیا گیا، جو بحرین کے گاؤں میں سے ایک گاؤں ہے، اور یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس دور کی بات ہے، جب آپ کے پاس عبدالقیس کا وفد حاضر ہوا تھا، اور اسی طریقے سے عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے مسلمانوں کو یہ حکم لکھ کر بھیجا تھا کہ وہ جہاں بھی ہوں، جمعہ پڑھ لیا کریں، اور عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ، مکہ اور مدینہ کے درمیان پانی والوں کے قریب سے گزرتے تھے، جو جمعہ کی نماز پڑھتے تھے، اور وہ ان کو اس سے انکار نہیں کیا کرتے تھے، جہاں تک حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اس قول کا تعلق ہے کہ ’’**لا جمعة ولا تشريق الا فی مصر جامع**‘‘ تو اگر اس کا کوئی مخالف نہ بھی ہوتا، تو اس سے یہ مراد لینا جائز تھا کہ ہر گاؤں ’’مصرِ جامع‘‘ ہوتا ہے، جیسا کہ ’’مصرِ جامع‘‘ کا ’’قریہ‘‘ نام رکھا جاتا ہے، اور اللہ تعالیٰ نے ’’مکہ‘‘ کا نام ’’قریہ‘‘ رکھا ہے، بلکہ اس کا نام ’’امُّ القریٰ‘‘ رکھا ہے، بلکہ جو ’’مکہ‘‘ سے زیادہ بڑی جگہ ہے، اس کا بھی نام ’’قریہ‘‘ رکھا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس قول میں ارشاد ہے کہ ’’**وكأين من قرية هی أشد قوة من قريتک التی أخرجتک أهلكناهم فلا ناصر لهم**‘‘ اور قدیم ’’مصر‘‘ کا نام بھی ’’قریہ‘‘ رکھا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا اس قول میں ارشاد ہے کہ ’’**واسأل القرية التی كنا فيها والعير التی أقبلنا فيها**‘‘ اور

اس کی قرآن میں بہت سی مثالیں ہیں۔ واللہ أعلم (مجموعُ الفتاویٰ)

مذکورہ عبارات سے گاؤں میں جمعہ کے درست وجائز ہونے کے موقف کا راجح ہونا بھی معلوم ہوا، اور یہ بھی معلوم ہوا کہ جمعہ قائم کرنے کے لیے کسی آبادی میں پختہ عمارات، بلڈنگوں اور پختہ سڑکوں اور بڑے بڑے پلازوں وغیرہ کا ہونا ضروری نہیں، کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بھی مدینہ منورہ کے اندر یہ چیزیں نہیں تھیں، ورنہ تو مدینہ منورہ میں بھی جمعہ کا ناجائز ہونا لازم آئے گا، جس کا کوئی بھی قائل نہیں۔

شاہ ولی اللہ صاحب کا حوالہ

حضرت امام شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی رحمہ اللہ، اپنی مشہور کتاب ''حجةُ اللّٰه البالغة'' میں جمعہ کی نماز کے متعلق فرماتے ہیں:

أقول وذلک لأنه لما کان حقیقة الجمعة إشاعة الدین فی البلد وجب أن ینظر إلی تمدن وجماعة.

والأصح عندی أنه یکفی اقل ما یقال فیه قریة، لما روی من طرق شتی یقوی بعضها بعضا "خمسة لا جمعة علیهم "وعد منهم أهل البادیة قال صلی الله علیه وسلم الجمعة علی الخمسین رجلا "أقول الخمسون یتقری بهم قریة، وقال الجمعة واجبة علی کل قریة "وأقل ما یقال فیه: جماعة لحدیث الانفضاض، والظاهر أنهم لم یرجعوا والله أعلم.

فإذا حصل ذلک وجبت الجمعة ومن تخلف عنها فهو الآثم، ولا یشترط أربعون، وأن الأمراء أحق بإقامة الصلاة وهو قول علی کرم الله وجهه: أربع إلی الإمام الخ، ولیس وجود الإمام

شرطا (حجۃ اللہ البالغۃ، ج۲ ص۷۴،القسم الثانی .فی بیان معانی ما جاء عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم تفصیلا،من ابواب الصلاۃ، العیدان)

ترجمہ: میں کہتا ہوں کہ یہ اس لیے ہے کہ جب جمعہ کا مقصد، دین کی اشاعت ہے شہر میں، تو اس کے لیے جماعۃ اور (خاص) تمدن کا لحاظ ضروری ہوا۔

اور میرے نزدیک اصح (یعنی زیادہ صحیح) قول یہ ہے کہ جمعہ کی نماز کے لیے یہ کافی ہے کہ وہ کم از کم ایسا مقام ہو، جس کو قریہ (یعنی گاؤں) کہا جاتا ہو، بوجہ اس روایت کے جو مختلف سندوں سے مروی ہے، جس کے بعض کی بعض سے تقویت ہوتی ہے کہ ''جمعہ پانچ لوگوں پر واجب نہیں'' جن میں جنگل والوں کو بھی شمار کیا گیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''جمعہ پچاس افرد پر ہے'' میں کہتا ہوں کہ پچاس افراد کے ذریعہ سے قریہ بن جاتا ہے، اور فرمایا کہ ''جمعہ ہر قریہ پر واجب ہے'' اور کم سے کم جس کو جماعت کہہ سکیں، میرے نزدیک جمعہ کی صحت کے لیے کافی ہے، اور ''حدیثِ انفضاض ''اس پر دال ہے، اور بظاہر وہ لوگ لوٹ کر واپس نہیں آئے تھے، واللہ اعلم۔

پس جب اتنے لوگ موجود ہوں، تو جمعہ واجب ہوجائے گا، اور جو ان سے پیچھے رہ گیا، وہ گناہ گار ہے، اور چالیس افراد شرط نہیں، اور حکمران جمعہ کی نماز قائم کرنے کے زیادہ حقدار ہیں، یہی حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا قول ہے کہ ''چار چیزیں امام (یعنی مسلمان حکمران) کی طرف سپرد کی گئی ہیں، الخ'' اور امام کا وجود (صحتِ جمعہ کے لیے) شرط نہیں (حجۃ اللہ البالغۃ)

مذکورہ عبارت سے معلوم ہوا کہ حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کے نزدیک، جمعہ کی نماز صحیح ہونے کے لیے شہر شرط نہیں، بلکہ جس آبادی پر ''قریہ'' اور گاؤں کا اطلاق آجاتا ہو، اس میں نمازِ جمعہ جائز ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی رحمہ اللہ نے مؤطا امام مالک کی فارسی شرح ''مصفّٰی'' میں بھی مندرجہ بالا حکم اور کچھ مزید تفصیل بیان فرمائی ہے، چنانچہ فرماتے ہیں:

بیہقی از ابنِ مسعود نقل میکند ''**انہ صلی اللہ علیہ وسلم جمّع بالمدینة وکانوا اربعین رجلا**'' واین عبارت دلالت براقلیۃ این جمع میکند وحال چنان بود زیرا کہ جمعات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم واصحاب، وہلم جرًّا، بیشتر میبودند از اربعین بدرجات بسیار۔

واما وجود اربعین ضروری است درانعقاد جمعہ یا نہ، امام شافعی می گوئید ضروریست، وفیہ نظر، زیرا کہ حدیثِ انفضاض دلالت می کند کہ نہ بودند آ جا درآ خر خطبہ۔

وظاہر ازان انست کہ دراول نماز نیز مگر دوازدہ تن پس الغائے وصف اربعین ثابت شد، واحتمال عود ایشان بغیر فصل کہ دریں صورت شافعیہ پیدا کردہ اند مستندی ندارد، بلکہ ظاہر از سیاق آیۃ وسیاق قصہ آنست کہ انفضاض برائے شراءِ متاع بودہ است ، ولہٰذا خدائے تعالیٰ فرمود ''اذارأوتجارۃ أولھوا'' الایۃ، ولہٰذا بیع وشرا دریں وقت ممنوع شد، وآن فصل طویل ست وغالبا خطب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم طویل نبودند، پس اجتماع عود بی فصل درخطبہ یا دراول نماز بعید باشد۔

پس ظاہر آنست کہ در ویہی اگر دون اربعین جمعہ خواندن نماز ایشاں صحیح باشد ومتخلفان آثم شوند، واما قریہا یا شہر پس شرط جمعہ است۔

بجہۃ آنکہ درزمان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم در بدو جمعہ نمی بود، وبا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جمعی کثیر از اہلِ مکہ درعرفہ بودند ایشان را بجمعہ نفرمودند، وسفرا گر عدم تحتم درحق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم واہلِ مدینۃ میتوانند شد درحق اہلِ مکۃ علت نمی تواند شد، الابودن ایشان درصحرا، واثر حضرت عثمان کہ اذن داد اہلِ بادیۃ را برجوع پیش از وقتِ جمعہ وعمل مستمر مسلمین کہ در بدو جمعہ نیست ونہ در بریہ، ونہ دراہلِ خیام۔

وفارق میان اہلِ خیام وقریہ وجودابنیہ است، وورعوالی وقریہ قلة متوطنان۔

پس ہرجمعی کہ براجتماع ایشان اسم قریہ توان اطلاق نمود، جمعہ واجب است صدکس باشند، یازیادہ، وودربعض احادیث اقل آں پنجاکس، مردعاقل، بالغ، حرآمدہ۔

واما آنکہ درزمان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم واصحاب دریک مسجد میخواندند، منشاء آن تحقق جماعۃ عظیمہ است کہ درصورۃ تعدد جماعت میسرنمی باشد، یا تبرک باقتدای آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وخلفای کرام وحرص براستماع وعظ ایشان، وصفت نفسیہ بودن آن معلوم نیست وبرتقدیرمنشاء اول می باید کہ شہرعظیم کہ ہرطرفی ازوی مانندقریہ باشدآنجاتعددجماعات جایزبود۔

واما امامتِ خلیفہ یانائب اوپس امرمستمرہ بودومنشاء آن امراست بتقدم والی درمحل ولایتِ خودپس مخصوص باشدبحضوروالی وبطریق استحباب باشد، چنانکہ تقدیم اقرء براعلم وسائرنظائرمسئلہ واثرحضرت علی کہ اربع الی الامام ، الخ، محمول برندب تقدم والی درمحل ولایۃ خوداست (مصفّٰی، ج۱ص۱۵۲، باب التشدید علٰی من ترک الجمعۃ بغیر عذر، مطبوعہ: مطبع فاروقی، دہلی)

ترجمہ: بیہقی نے ابنِ مسعودرضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں جمعہ کا حکم فرمایا، اوروہ چالیس افراد تھے، اوریہ عبارت اس مجمع سے کم پردلالت کرتی ہے، اورواقعہ بھی یہی ہے، کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اورآپ کے اصحاب اوران کے مابعد سلسلہ بسلسلہ چالیس سے کہیں زیادہ افراد ہوا کرتے تھے۔ [1]

جہاں تک جمعہ منعقد ہونے کے لیے چالیس افراد کے ضروری ہونے کا تعلق ہے، تو امام شافعی اس کو ضروری قرار دیتے ہیں، لیکن یہ بات قابلِ غور ہے، کیونکہ

---

[1] اس کا تقاضا یہ ہوگا کہ چالیس سے زیادہ افراد شرط ہوں، جس کا کوئی قائل نہیں، لہٰذا جب عام حالات میں مجمعِ کثیر کو نظر انداز کیا گیا، تو مذکورہ واقعہ میں بھی یہ تعدادِ خاص لغو ہونی چاہیے۔ محمد رضوان۔

حدیثِ انفضاض (یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبہ دینے کے وقت بعض حاضرین کے چلے جانے کی حدیث) اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اس جگہ اتنے افراد آخر خطبہ میں نہیں تھے۔ [1]

اور اس کا ظاہر یہ ہے کہ نماز کے شروع میں بھی بارہ ہی افراد تھے، پس چالیس افراد کے وصف کا لغو ہونا ثابت ہوگیا، اور اس صورت میں شافعیہ نے جو بغیر فصل کے ان لوگوں کے لوٹنے کے احتمال کو پیدا کیا ہے، اس کی کوئی مستند دلیل نہیں، بلکہ آیت کے سیاق اور اس قصے کے سیاق سے ظاہر یہی ہوتا ہے کہ ان حضرات کا وہاں سے جانا، سامان خریدنے کے لیے تھا، اور اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ''اذا رأو تجارة أو لهوا'' آخر آیت تک، اور اسی کی وجہ سے اس وقت میں خرید وفروخت کی ممانعت ہوئی، جو طویل فصل کا متقاضی ہے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اکثر خطبے طویل نہیں ہوا کرتے تھے، پس اس مجمع کا اس درمیانی (مختصر) وقفے میں (خریداری کے عمل سے فارغ ہوکر) خطبہ کے اندر، یا نماز کے شروع میں لوٹ کرآنا بعید ہے۔

پس ظاہر یہی ہے کہ اگر دیہات میں چالیس سے کم افراد جمعہ پڑھیں، تو جمعہ صحیح ہوجائے گا، اور جمعہ سے پیچھے رہ جانے والے گناہ گار ہوں گے، البتہ گاؤں، یا شہر ہونا جمعہ کی شرط ہے۔

اس جہت کے ساتھ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں جنگل کے رہائشوں میں جمعہ نہیں ہوتا تھا، اور اس جہت کے ساتھ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اہلِ مکہ کے کثیر مجمع کے ساتھ عرفہ میں موجود تھے، لیکن ان کو جمعہ کا حکم نہیں

---

[1] عن جابر بن عبد الله، "أن النبي صلى الله عليه وسلم، كان يخطب قائما يوم الجمعة، فجاءت عير من الشام، فانفتل الناس إليها، حتى لم يبق إلا اثنا عشر رجلا، فأنزلت هذه الآية التي في الجمعة :وإذا رأوا تجارة أو لهوا انفضوا إليها وتركوك قائما(مسلم، رقم الحديث ٨٦٣"٣٦")

فرمایا، اور سفر اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور اہلِ مدینہ کے حق میں جمعہ کے لیے مانع تھا، تو اہلِ مکہ کے حق میں یہ علت نہیں تھی، سوائے اس علت کے کہ وہ صحراء میں موجود تھے، اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا اثر کہ انہوں نے اہلِ بادیہ کو جمعہ کے وقت سے پہلے رجوع کرنے کی اجازت دی، نیز مسلمانوں کا مسلسل عمل بھی یہی ہے کہ جنگل کے رہائشیوں (یعنی خانہ بدوشوں وغیرہ) پر جمعہ نہیں ہے، اور نہ ہی جنگل میں جمعہ ہے، اور نہ اہلِ خیمہ پر جمعہ ہے۔

اور اہلِ خیمہ اور گاؤں والوں کے درمیان فرق کرنے والی چیز، عمارت کا وجود ہے (خواہ وہ عمارت کچی ہو، یا پکی ہو) اور عوالی اور قریہ کے درمیان فرق کرنے والی چیز وہاں کے باشندوں کا کم ہونا ہے۔

پس ہر وہ جماعت کہ ان کے اجتماع پر قریہ کا نام صادق آنے کی صلاحیت ہو، ان پر جمعہ واجب ہے، سو افراد ہوں، یا زیادہ ہوں، اور بعض احادیث میں پچاس سے کم مرد، عاقل، بالغ، آزاد کا ذکر آیا ہے۔

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام، صرف ایک مسجد میں جمعہ پڑھا کرتے تھے؟ تو اس کا منشاء، عظیم اجتماع کا تحقق تھا، جو کہ متعدد جگہ جمعہ کی نماز پڑھنے کی صورت میں میسر نہیں آتا تھا، یا اس کا منشاء آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، اور آپ کے خلفائے کرام کی اقتداء سے برکت حاصل کرنا، اور ان کے وعظ سننے کی حرص تھی، اور ان لوگوں کی تعداد معلوم نہیں، اور پہلے منشاء (یعنی عظیم اجتماع کے تحقق) کو مقدر ماننے کی صورت میں لازم آتا ہے کہ بڑا شہر کہ جس کے اطراف میں قریہ کے مثل آبادی ہو، اس جگہ ایک سے زیادہ جمعہ کی نمازیں جائز ہوں۔

جہاں تک خلیفہ، یا اس کے نائب کی امامت کا تعلق ہے، تو یہ ایک مستقل معمول رہا

ہے، لیکن اس کی منشاء دراصل کسی بھی والی کے اپنی ولایت کے محل میں آگے بڑھنا ہے، پس یہ مستحب طریقہ پر والی کے حاضر ہونے کے ساتھ خاص ہوگا، جیسا کہ قاری کی عالم پر تقدیم کا تعلق ہے، اور جیسا کہ اس مسئلہ کی دوسری نظائر کا تعلق ہے، اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ اثر کہ چار چیزیں امام کے سپرد ہیں، الخ، تو یہ والی کے اس کی ولایت میں مقدم ہونے کے مندوب ہونے پر محمول ہے (مصفّٰی)

مذکورہ عبارات میں حضرت امام شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی رحمہ اللہ نے امام ابنِ منذر رحمہ اللہ کی طرح جمعہ کے باب میں ایک تو چالیس افراد شرط نہ ہونے کو ترجیح دی، جن کے شرط ہونے کے شافعیہ وحنابلہ قائل ہیں، دوسرے گاؤں میں جمعہ کے ناجائز قرار دینے کے حنفیہ کے قول کو بھی راجح قرار نہیں دیا، اور ''والی'' کے ہونے میں بھی حنفیہ کے مشہور قول کو راجح قرار نہیں دیا، اور اس کی توجیہ وتعلیل مصر وبلد ہونے کے بجائے ''والی'' کی تقدیم کے مستحب ہونے سے بیان فرمائی، اور تعددِ جمعہ کو بھی جائز قرار دیا، جس سے معلوم ہوا کہ حضرت امام شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی رحمہ اللہ کے نزدیک چالیس سے کم افراد ہونے کی صورت میں اور ایسی آبادی، جس کو گاؤں کہا جاسکے، اور اس میں معتدبہ لوگ، جن کے مجموعے کو ایک جماعت کہا جاسکے، آباد ہوں، نمازِ جمعہ جائز ہے۔

اس طرزِ عمل کو آج کل بعض علماء ''تلفیق'' کے عنوان سے ناجائز قرار دیتے ہیں، لیکن حضرت امام شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی رحمہ اللہ، تلفیق کے علی الاطلاق ناجائز قرار دینے سے اتفاق نہیں رکھتے، بلکہ ان کا فرمانا ہے کہ مجتہد جس مسئلہ میں اپنے اجتہاد سے کسی پہلو کو ترجیح دے، خواہ وہ جزوی مجتہد ہو، تو وہ ممنوع تلفیق میں داخل نہیں، جس کی تفصیل ہم نے اپنے دوسرے مضمون ''عمل بالحدیث کا حکم'' اور ''فقہِ ولی اللّٰہی پر ایک نظر'' میں ذکر کردی ہے۔ [1]

---

[1] وهذه طريقة أصحاب التخريج وأوسطها من كلتا الطريقتين أن يحصل له من معرفة القرآن والسنن ما يتمكن به من معرفة رء وس مسائل الفقه المجمع عليها بأدلتها التفصيلية، ويحصل له غاية العلم ببعض المسائل الاجتهادية من أدلتها وترجيح بعض الأقوال على بعض ونقد التخريجات

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

حضرت امام شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی رحمہ اللہ کی مذکورہ رائے، اگرچہ ہمارے یہاں کے موجودہ متعدد حنفی اصحابِ افتاء کے موافق نہ ہو، لیکن ایک متبحر و مجتہدانہ شان رکھنے والے محقق امام کی رائے ہے، اس لیے اگر کوئی اس رائے پر فتویٰ دے، یا عمل کرے، تو فقہی قواعد کی رو سے وہ قابلِ مذمت وقابلِ ملامت نہیں، بالخصوص جبکہ دلیل سے اس کو راجح سمجھے، یا ضرورت کی وجہ سے اس پر فتویٰ دے، یا کوئی اس کے مطابق عمل کرے۔

اور حضرت امام شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی رحمہ اللہ کے ساتھ ہندوستان و پاکستان کے مختلف علمی سلسلوں کو جو نسبت حاصل ہے، خاص طور پر مسلکِ دیوبند کو، وہ اہلِ علم حضرات سے مخفی نہیں۔

چنانچہ ترجمانِ دیوبند حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمہ اللہ اپنی تالیف ”تاریخ دارُ العلوم دیوبند“ میں تحریر فرماتے ہیں:

دارُ العلوم دیوبند کا سلسلۂ سند حضرۃُ الامام شاہ ولی اللہ صاحب فاروقی قدس سرہٗ العزیز سے گزرتا ہوا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک جا پہنچتا ہے، شاہ (ولی اللہ) صاحب اس جماعتِ دیوبند کے مورثِ اعلیٰ ہیں، جن کے مکتبۂ فکر سے اس جماعت کی تشکیل ہوئی، حضرت ممدوح نے اولاً اس وقت کے ہندوستان کے فلسفیانہ مزاج کو اچھی طرح پرکھا، پھر علومِ شریعت کو ایک مخصوص جامع عقل ونقل

﴿ گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ ﴾

ومعرفة الجيد والزيف، وإن لم يتكامل له الأدوات كما يتكامل للمجتهد المطلق، فيجوز لمثله أن يلفق من المذهبين إذا عرف دليلهما،، وعلم أن قوله ليس مما لا ينفذ فيه اجتهاد المجتهد، ولا يقبل فيه قضاء القاضي، ولا يجرى فيه فتوى المفتين، وأن يترك بعض التخريجات التى سبق الناس إليها إذا عرف عدم صحتها، ولهذا لم يزل العلماء ممن لا يدعى الاجتهاد المطلق يصنفون، ويرتبون، ويخرجون، ويرجحون، وإذا كان الاجتهاد يتجزأ عند الجمهور والتخريج يتجزأ، وإنما المقصود تحصيل الظن، وعليه مدار التكليف فما الذى يستبعد من ذلك(حجة الله البالغة، ج ا ،ص۲۶۷، تتمة ،باب حكاية حال الناس قبل المائة الرابعة وبعدها،فصل:ومما يناسب هذا المقام التنبيه على مسائل ضلت فى بواديها الافهام وزلت الأقدام، وطغت الأقلام)

طرز میں پیش فرمایا، جس میں نقل کو عقل کے جامہ میں ملبوس کر کے نمایاں کرنے کا ایک خاص حکیمانہ انداز پنہاں تھا۔

حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس سرہٗ بانی دارالعلوم دیوبند نے ولی اللّٰہی سلسلہ کے تلمذ سے اس رنگ کو نہ صرف اپنایا، جو انہیں ولی اللّٰہی خاندان سے ورثہ میں ملا تھا، بلکہ مزید تنوُّر کے ساتھ اس کے نقش ونگار میں اور رنگ بھرا، اور وہی منقولات جو حکمتِ ولی اللّٰہی میں معقولات کے لباس میں جلوہ گر تھے، حکمتِ قاسمیہ میں محسوسات کے لباس میں جلوہ گر ہوگئے (تاریخ دارالعلوم دیوبند، صفحہ ۲۰، ۲۱، مطبوعہ: دارالاشاعت، کراچی)

مزید فرماتے ہیں کہ:

اس لحاظ سے یوں سمجھنا چاہیے کہ شاہ ولی اللہ صاحب قدس سرہٗ جماعتِ دارالعلوم کے جدِ امجد ہیں (ایضاً، صفحہ ۲۱)

سید محبوب رضوی صاحب اپنی مفصل ومدلل تالیف ''تاریخِ دارالعلوم دیوبند'' میں فرماتے ہیں:

اکابر دارالعلوم کے سلسلہ میں سرِ فہرست جو شخصیت آتی ہے، وہ یہی شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ ہیں، برصغیر میں اس وقت علومِ دینیہ اور بالخصوص علمِ حدیث کے جس قدر سلسلے مروج اور موجود ہیں، تقریباً ان سب کا آغاز حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ سے ہوتا ہے (تاریخ دارالعلوم دیوبند، ص۹۲، بعنوان ''دارالعلوم کے اکابرِ علم کا سلسلۂ اسناد''، بایماءِ مجلسِ شوریٰ دارالعلوم دیوبند، حسبِ ہدایت حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب، مہتمم دارالعلوم دیوبند، مطبوعہ: ادارہ اسلامیات لاہور، کراچی)

حکیمُ الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمہ اللہ مذکورہ بالا مفصل کتاب کے مقدمہ میں تحریر فرماتے ہیں:

دارُالعلوم کا سلسلۂ اسناد محدثِ ہندوستان حضرتُ الامام شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ

اللہ علیہ سے چلتا ہے (ایضاً، ص۱۲، مقدمہ)

حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمہ اللہ اپنی تالیف ''تاریخ دارالعلوم دیوبند'' میں تحریر فرماتے ہیں:

دارُالعلوم دیوبند کے اسلاف میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب قدس سرہٗ سے لے کر حضرت نانوتوی قدس سرہٗ تک کے سارے بزرگ شمار ہوتے ہیں، کیونکہ مسلکاً اور روایتاً دارالعلوم دیوبند حضرت شاہ ولی اللہ صاحب قدس سرہٗ کی جانب منسوب ہے (تاریخِ دارالعلوم دیوبند، صفحہ۹۱، مطبوعہ: دارالاشاعت، کراچی)

سید محبوب رضوی صاحب کی مرتب کردہ مفصل تالیف ''تاریخ دارالعلوم دیوبند'' کے مقدمہ میں حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمہ اللہ دیوبند کے علمی مسلک کی توضیح وتشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

جہاں تک (دیوبند کے) علمی مسلک کا تعلق ہے، اس کا مرجعُ الامر حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کی ذاتِ گرامی ہے، جن پر منجانب اللہ یہ علمی مسلک الہامی طور پر وارد شدہ ہے، جس کی تفصیل گزر چکی ہے، اور وہ سارے علمی طبقات کے لیے اپنے کمالِ اعتدال اور جامعیت کی وجہ سے جیسے طبعاً مرکزِ کل ہے، ایسے ہی سارے اہلِ مسالک اگر انصاف سے کام لیں، تو اس پر جمع ہو سکتے ہیں، یا کم سے کم اسے اپنا مرکز تسلیم کر کے، اس سے قریب ہو سکتے ہیں (تاریخ دارالعلوم دیوبند، ص۲۸، مقدمہ)

مذکورہ مضمون ہی میں حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں کہ:

مدرسہ دیوبند کے اس جامع اور معتدل فکر یا مسلک کا مقصد اور مطمحِ نظر ہندوستان کے تمام مسالکِ حقہ اور اہلِ مسالک کو باہم جوڑنا تھا، جبکہ اس وقت ملک میں جماعتی تشتّت جزوِ مسلک بنا ہوا تھا، اور سارے مسالک اور مسالک والے مسلکی

تفاوت کی وجہ سے باہم دست و گریبان تھے، الا ماشاء اللّٰہ (تاریخ دار العلوم دیوبند، ص۲۷، مقدمہ، مطبوعہ: ادارہ اسلامیات لاہور، کراچی)

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ، کا شمار بانیٔ دیوبند، مورثِ اعلیٰ دیوبند، اور اکابر دیوبند، بلکہ دیوبند کے جدِ امجد میں ہوتا ہے، جن کی فکر سے دیوبند کی تشکیل ہوئی۔

اور دیوبند اور اس کے جامع و معتدل فکر، یا مسلک کا مقصد اور بنیادی ہدف غیر منقسم ہندوستان کے تمام مسالکِ حقہ اور اہلِ مسالک کو باہم جوڑنا اور ان کے جماعتی تشتت کو ختم کرنا تھا، اور اس دور میں اس مقصد کے لیے حضرت امام شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی رحمہ اللہ کی شخصیت اور طرزِ فکر سے زیادہ موزوں اور کوئی شخصیت نہیں تھی، کیونکہ حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کا مطمحِ نظر بھی مسالکِ حقہ، حنفیہ، شافعیہ، مالکیہ و حنابلہ وغیرہ کو باہم جوڑنا تھا، پھر فقہی الوان میں اختلاف کے باعث کسی اہلِ حق کو مسلکِ دیوبند سے خارج کیسے قرار دیا جاسکتا ہے؟

خلاصہ یہ کہ ''جمعہ فی القریٰ'' کے جائز ہونے کے باب میں حضرت امام شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ کے موقف کو اختیار کرنا، اہلِ دیوبند کے موقف سے خارج شمار نہیں ہوتا، ورنہ، خود اہلِ دیوبند ہی اپنے مورث اعلیٰ کے مخالف قرار پائیں گے۔

(تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، ہماری تالیف ''اجتہادی اختلاف اور باہمی تعصب''، مشمولہ: علمی و تحقیقی رسائل، جلد 8، مطبوعہ: ادارہ غفران، راولپنڈی)

کفایتُ المفتی کا حوالہ

جیسا کہ پہلے عرض کیا جاچکا کہ سلسلۂ ولی اللّٰہی میں حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب دہلوی رحمہ اللہ نے اس مسئلے پر اپنے دور میں بڑی بصیرت آموز روشنی ڈالی ہے، اور اس سلسلے

میں کئی فتاویٰ جاری فرمائے ہیں، جن کی روشنی میں موجودہ حالات کا تقابل کر کے، ان کی اہمیت کو مزید محسوس کیا جا سکتا ہے، کیونکہ موجودہ زمانے میں مسلمانوں کے دین وایمان کی حالت پہلے دور سے کہیں زیادہ، انحطاط پذیر ہے۔

ذیل میں مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب دہلوی کے کے چند فتاویٰ نقل کیے جاتے ہیں، جبکہ بعض فتاویٰ پہلے بھی ذکر کیے جا چکے ہیں۔

مولانا مفتی کفایتُ اللہ صاحب دہلوی رحمہ اللہ کی کفایتُ المفتی میں ہے:

اب یہ بات کہ حنفیہ کا اصل مذہب کیا ہے؟ تو یہ بات صاف صاف ہے کہ اصل مذہب، جو متون میں منقول ہے، وہ یہی ہے کہ جمعہ کے لئے مصر شرط ہے، پس جو مقام کہ مصر قرار پائے گا، وہاں جمعہ جائز ہوگا۔

مصر کی کون سی تعریف معتبر ہے؟ تو معتبر تعریف تو وہی ہے، جو امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے باختلافِ عبارات منقول ہے، اگرچہ بہت سے متاخرین نے ”**ما لا یسع اکبر مساجدہٖ اھلہٗ** “ کو اختیار کیا ہے، مصر کی شرط بے شک ظنی ہے، لیکن حنفیہ کے اصل مذہب میں مصر کا شرط ہونا ظنی نہیں ہے، اور ایک حنفی بحیثیتِ حنفی ہونے کے اس کا انکار نہیں کر سکتا۔

حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ فروع میں مذہبِ حنفیہ کے متبع تھے، لیکن چونکہ وہ ایک متبحر اور محقق عالم تھے، اس لئے انہوں نے چند مسائل میں حنفی مذہب کے خلاف بھی اظہارِ رائے کیا، اسی طرح مولانا بحر العلوم سے چند مسائل میں حنفیہ کا خلاف کرنا منقول ہے، ان بزرگوں کے قول کا یہ مطلب ہے کہ شرطِ مصر (یعنی شہر ہونے کی شرط) ہمارے نزدیک ضروری نہیں، اگرچہ حنفی مذہب اس کے اشتراط کی تصریح کرتا ہے، یہ مطلب نہیں کہ حنفیہ کے مذہب میں مصر شرط نہیں ہے۔

پس اگر کوئی حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کے اس قول کے موافق عمل کرے، یا

فتویٰ دے، اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس نے اس مسئلے میں اپنے امام کی تقلید چھوڑ کر شاہ ولی اللہ صاحب، یا مولانا بحرالعلوم کی تقلید کی، ان دونوں بزرگوں نے اس میں اگر حنفیہ کے اصل مذہب سے عدول کیا، تو حنفی ہونے سے نہ نکلیں گے، کیونکہ ان کا تبحر اور درجۂ تحقیق بہت اعلیٰ ہے (کفایت المفتی مدلل ومکمل، ج۳ص۲۲۸، کتاب الصلاۃ، پانچواں باب: نمازِ جمعہ، مطبوعہ: دارالاشاعت، کراچی، سنِ طباعت: جولائی 2001ء)

اگر چہ عصرِ حاضر وماضی کے بہت سے حنفی حضرات کا عمومی فتویٰ اس سلسلہ میں حنفیہ کے مشہور قول کے مطابق عام قریہ اور گاؤں میں جمعہ کی نماز کو ناجائز قرار دینے کا رہا ہے، لیکن حضرت امام شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی رحمہ اللہ کی طرح، مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب دہلوی رحمہ اللہ کا رجحان، اس مسئلہ میں حنفیہ کے مشہور مذہب کے بجائے حتی الامکان نرمی کرنے کا ہے، اور وہ اس مسئلہ میں شافعیہ اور دوسرے ائمہ کے قول کے مطابق ''قریہ'' اور گاؤں میں نمازِ جمعہ کی گنجائش کی طرف رجحان رکھتے ہیں، اور بحالاتِ موجودہ، جمعہ کے قیام کو اہم دینی مصالح پر مبنی سمجھتے ہیں۔

اور چونکہ یہ حضرات تبحرِ علمی کا اعلیٰ مقام رکھتے ہیں، اور ایسے صاحبِ فقہ وعلم کو ہر مسئلہ میں کسی مخصوص مسلک ومذہب کی پابندی ضروری نہیں، وہ اپنے اجتہاد سے دوسرے قول کو ترجیح دے سکتا ہے، خواہ وہ اجتہاد ان دلائل پر مبنی ہو، جو ضرورت کی شکل میں نہ ہوں، یا پھر وہ اجتہاد ضرورت پر مبنی دلائل کی شکل میں ہو، اور دوسروں کو اس کی رائے پر عمل کرنا بھی جائز ہے، جس کی تفصیل ہم نے اپنی دوسری تالیفات میں باحوالہ ذکر کردی ہے۔ [1]

---

[1] اور بعض معاصرین، یا اکابرین کی طرف سے جو یہ بات کی جاتی ہے کہ مذہبِ غیر پر فتویٰ، محض کسی ضرورتِ شدیدہ کی بناء پر ہی دیا جاسکتا ہے، تو یہ غیر متبحر وغیر مجتہد شخص کے فتوے کا حکم ہے، جو ناقلِ محض ہوتا ہے۔

ورنہ متبحر ومجتہدانہ شان رکھنے والے کو، خواہ اس نے اس خاص مسئلہ میں ہی اجتہاد کیا ہو، اس کی پابندی نہیں، نہ ہی اس مجتہد کی اتباع کرنے والے کے لیے یہ شرط ضروری ہے، بالخصوص التزامِ مذہبِ معین کے عدمِ لزوم کے قول کے مطابق۔

مخالفة من بعدهم مع موافقة واحد ممن قبلهم ليس حراما عليه فان المقلد له أن يقلد قول أى

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

اس لیے اگر کوئی مسئلہ ھٰذا میں مذکورہ اوران جیسے حضرات کی رائے اورفتوے پرعمل کرکے، نمازِ جمعہ ادا کرے، تواس کی نمازِ جمعہ درست ہے، اور جب ایسا ہے، تو کسی دوسرے کی طرف

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

مجتهد شاء(فواتح الرحموت بشرح مسلم الثبوت، ج ۲،ص ۲۶۸،الكلام على اصول الاربعة ، الاصل الثالث الاجماع، مسئلة لا عبرة عن الاجماع بالكافر ولا بوفاق من سيوجد، الناشر: دار الكتب العلمية، بيروت، لبنان، الطبعة الاولىٰ ۱۴۲۳ هـ، ۲۰۰۲م)

فلو كان حافظا للأقاويل المختلفة للمجتهدين ولا يعرف الحجة ولا قدرة له على الاجتهاد للترجيح لا يقطع بقول منها يفتى به بل يحكيها للمستفتى فيختار المستفتى ما يقع فى قلبه إنه الأصوب ذكره فى بعض الجوامع وعندى أنه لا يجب عليه حكاية كلها بل يكفيه أن يحكى قولا منها فإن المقلد له أن يقلد أى مجتهد شاء فإذا ذكر أحدها فقلده حصل المقصود نعم لو حكى الكل فالأخذ بما يقع فى قلبه أنه أصوب أولى وإلا فالعامى لا عبرة بما يقع فى قلبه من صواب الحكم وخطئه(التقرير والتحرير علىٰ تحرير الكمال بن الهمام،لابن أمير الحاج، ج۳،ص ۳۴۸، المقالة الثالثة فى الاجتهاد وما يتبعه من التقليد والإفتاء،مسألة إفتاء غير المجتهد بمذهب مجتهد)

فلو كان حافظا للأقاويل المختلفة للمجتهدين ولا يعرف الحجة ولا قدرة له على الاجتهاد للترجيح لا يقطع بقول منها يفتى به بل يحكيها للمستفتى فيختار المستفتى ما يقع فى قلبه أنه الأصوب.

ذكره فى بعض الجوامع، وعندى لا يجب عليه حكاية كلها بل يكفيه أن يحكى قولا منها فإن المقلد له أن يقلد أى مجتهد شاء ، فإذا ذكر أحدها فقلده حصل المقصود نعم لا يقطع عليه فيقول جواب مسألتك كذا، بل يقول قال أبو حنيفة حكم هذا كذا نعم لو حكى الكل فالأخذ بما يقع فى قلبه أنه أصوب أولى، وإلا فالعامى لا عبرة بما يقع فى قلبه من صواب الحكم وخطئه، وعلى هذا إذا استفتى فقيهين أعنى مجتهدين فاختلفا عليه الأولى بأن يأخذ بما يميل إليه قلبه منهما، وعندى أنه لو أخذ بقول الذى لا يميل إليه قلبه جاز؛ لأن ذلك الميل وعدمه سواء ، والواجب عليه تقليد مجتهد، وقد فعل أصاب ذلك المجتهد أو أخطأ(البحر الرائق شرح كنز الدقائق، ج٦،ص ۲۸۹،كتاب القضاء)

المنتسبون إلى مذهب إمام إما عوام فتقليدهم مفرع على تقليد الميت فقد مر، وإما مجتهدون فلا يقلدون فإن وافق اجتهاده اجتهادهم فلا بأس وإن خالفه أحيانا(البحر الرائق شرح كنز الدقائق، ج٦، ص ۲۹۰،كتاب القضاء ، فصل فى المفتى)

مسألة إذا أراد هذا المتبحر فى المذهب أن يعمل فى مسألة بخلاف مذهب إمامه مقلدا فيها لإمام آخر هل يجوز له ذلك اختلفوا فيه فمنعه الغزالى وشرذمة .

وهو قول ضعيف عند الجمهور لأن مبناه على أن الإنسان يجب عليه أن يأخذ بالدليل فإذا فات ذلك لجهله بالدلائل أقمنا اعتقاد أفضلية إمامه مقام الدليل فلا يجوز له أن يخرج من مذهبه كما لا يجوز له أن يخالف الدليل الشرعى ورد بأن اعتقاد أفضلية الإمام على سائر الأئمة مطلقا غير لازم فى صحة التقليد إجماعا لأن الصحابة والتابعين كانوا يعتقدون أن خير هذه الأمة أبو بكر ثم عمر

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

سے اس پر نکیر واعتراض کرنا، اور کسی دوسری رائے کی پابندی کا مکلّف قرار دینا بھی درست نہیں، اور یہ طرزِ عمل اصولِ فقہ پر گہری نظر نہ ہونے پر مبنی ہے۔ [1]

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

رضی الله عنهما وكانوا يقلدون فی كثير من المسائل غيرهما بخلاف قولهما ولم ينكر على ذلك أحد فكان إجماعا على ما قلناه وأما أفضلية قوله فی هذه المسألة فلا سبيل إلى معرفتها للمقلد الصرف فلا يجوز أن يكون شرطا للتقليد إذ يلزم أن لا يصح تقليد جمهور المقلدين ولو سلم ففی مسألتنا هذه هذا عليكم لا لكم لأنه كثيرا ما يطلع على حديث يخالف مذهب إمامه أو يجد قياسا قويا يخالف مذهبه فيعتقد الأفضلية فی تلك المسألة لغيره .

وذهب الأكثرون إلى جوازه منهم الآمدی وابن الحاجب وابن الهمام والنووی وأتباعه كابن حجر والرملی وجماعات من الحنابلة والمالكية ممن يفضی ذكر أسمائهم إلى التطويل.

وهو الذی انعقد عليه الإتفاق من مفتی المذاهب الأربعة من المتأخرين واستخرجوه من كلام أوائلهم ولهم رسائل مستقلة فی هذه المسألة إلا أنهم اختلفوا فی شرط جوازه فمنهم من قال لا يرجع فيما قلد اتفاقا فسره ابن الهمام فقال أی عمر به واختلف الشراح فی معنی هذه الكلمة فقيل فيما عمر به بخصوصه بأن يقضی تلك الصلوات الواقعة على المذهب الأول مثلا وهو الصحيح الذی لا يتجه غيره عند التحقيق(عقد الجيد فی أحكام الاجتهاد والتقليد،للشاه ولی الله الدهلوی، ص ۲۴، فصل فی المتبحر فی المذهب وهو الحافظ لكتب مذهبه وفيه مسائل)

[1] قلت :وفی التحرير لابن الهمام مسألة لا يرجع فيما قلد فيه أی عمل به اتفاقا، وهل يقلد غيره فی غيره المختار نعم للقطع بأنهم كانوا يستفتون مرة واحدا ومرة غيره غير ملتزمين مفتيا واحدا فلو التزم مذهبا معينا كأبی حنيفة والشافعی فهل يلزمه الاستمرار عليه فقيل نعم، وقيل لا وقيل كمن لم يلتزم إن عمل بحكم تقليدا لا يرجع عنه وفی غيره له تقليد غيره، وهو الغالب على الظن لعدم ما يوجبه شرعا، ويتخرج منه جواز اتباعه للرخص ولا يمنع منه مانع شرعی إذ للإنسان أن يسلك الأخف عليه إذا كان له إليه سبيل بأن لم يكن عمل بآخر فيه اهـ.

وللشيخ حسن الشرنبلالی رسالة سماها العقد الفريد فی جواز التقليد وذكر فيها ما حاصله أن دعوی الاتفاق على عدم الرجوع فيما قلد فيه ذكرها الآمدی وابن الحاجب، وتبعهما فی جمع الجوامع وغيره، وذكر العلامة ابن أبی شريف أن فی كلام غيرهما ما يشعر بإثبات الخلاف بعد العمل فله التقليد بعده بقول غيره، وذكر مثله عن الزركشی العلامة ابن أمير الحاج والسيد بادشاه فی شرحهما على التحرير أی فيجوز اتباع القائل بالجواز، وأيضا القول بالمنع ليس على إطلاقه؛ لأنه محمول على ما إذا بقی من آثار الفعل السابق أثر يؤدی إلى تلفيق العمل بشیء مركب من مذهبين كتقليد الشافعی فی مسح بعض الرأس والإمام مالك فی طهارة الكلب فی صلاة واحدة كذا ذكر العلامتان ابن حجر والرملی فی شرحهما على المنهاج.

وفی كلام ابن الهمام ما يفيد ذلك فی غير هذا المحل أو المراد بمنع المرجوع فيما قلد فيه اتفاقا

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

علامہ ابنِ عابدین شامی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

لو أن رجلا من أهل الاجتهاد برئ من مذهبه فی مسألة أو فی أكثر منها باجتهاد لما وضح له من دليل الكتاب أو السنة أو غيرهما من الحجج لم يكن ملوما ولا مذموما بل كان مأجورا محمودا وهو فی سعة منه وهكذا أفعال الأئمة المتقدمين(العقود الدرية فی تنقيح الفتاوی الحامدية، ج۲،ص۳۲۷،مسائل وفوائد شتی من الحظر والإباحة وغير ذلك)

ترجمہ: اگر اہلِ اجتہاد میں سے کوئی شخص اجتہاد کے ذریعہ، ایک مسئلہ میں، یا ایک سے زیادہ مسائل میں کتاب، یا سنت وغیرہ کے دلائل میں سے کسی دلیل سے واضح ہونے کے بعد اپنے سابق مذہب سے بَریٔ ہوجائے، تو وہ نہ تو قابلِ ملامت ہوگا، اور نہ قابلِ مذمت، بلکہ وہ اجر وثواب کا مستحق اور تعریف کے قابل ہوگا، کیونکہ اس نے اپنی قدرت میں جو کچھ تھا، اس کو اختیار کیا، اور یہی ائمہ متقدمین کا طرزِ عمل تھا(تنقیح فتاویٰ حامدیہ)

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

الرجوع فی خصوص العين لا خصوص الجنس، وذلك بنقض ما فعله مقلدا فی فعله إماما؛ لأنه لا يملك إبطاله بإمضائه كما لو قضى به فلو صلى ظهرا بمسح ربع الرأس ليس له إبطالها باعتقاده لزوم مسح الكل، وأما لو صلى يوما على مذهب، وأراد أن يصلی يوما آخر على غيره فلا يمنع منه اهـ.

وقد بسط الكلام فيها فراجعه وما ذكره المحقق من جواز تتبع الرخص رده ابن حجر وزعم أنه مخالف للإجماع وانتصر له العلامة خير الدين فی حاشيته هنا بكلام طويل، ومنع دعوى الإجماع فراجعه ويؤيد منعه ما فی شرح ابن أمير حاج بعد نقله الإجماع عن ابن عبد البر حيث قال إن صح احتاج إلى جواب، ويمكن أن يقال لا نسلم صحة دعوى الإجماع إذ فی تفسيق المتتبع للرخص عن أحمد روايتان وحمل القاضی أبو يعلى الرواية المفسقة على غير متأول ولا مقلد، وذكر بعض الحنابلة إن قوی دليل أو كان عاميا لا يفسق وفی روضة النووی وأصلها عن حكاية الحناطی وغيره عن أبی هريرة أنه لا يفسق به ثم لعله محمول على نحو ما يجتمع له من ذلك ما لم يقل بمجموعه مجتهد كما أشار إليه المصنف اهـ.

وسيذكر المؤلف عن الشارح أن فی فسقه وجهين أوجههما عدمه، والله سبحانه أعلم(منحة الخالق على البحر الرائق، ج۶،ص۲۸۹، ۲۹۰،كتاب القضاء)

علامہ ابنِ عابدین شامی کی مذکورہ عبارت میں دلیل کی بنا پر بریٔ ہونے کا ذکر ہے، قطع نظر مذہبِ معین کے التزام کے ضروری ہونے نہ ہونے سے، جس کا آگے ذکر آتا ہے، کیونکہ وہ دلیل ہی کا مکلّف ہے، اوراس نے اپنی تکلیف کے مطابق عمل کر کے جو کام کیا، وہ باعثِ اجر وثواب اور قابلِ تعریف ہے، خواہ آج کل کے بعض متعصبین ومتشددین کے نزدیک وہ قابلِ مذمت وقابلِ ملامت اور قابلِ مؤاخذہ وگناہ کیوں نہ شمار ہوتا ہو، ان کے قول سے مسئلہ ھٰذا کی حقیقت پر فرق نہیں پڑتا۔

یہ بھی ملحوظ رہے کہ مذہبِ معین کے التزام کا مسئلہ بھی فی نفسہٖ اختلافی واجتہادی ہے، بہت سے مجتہدین ومحققین نے عدمِ التزام کو اصح قرار دیا ہے۔

چنانچہ علامہ عبدالحیٔ لکھنوی رحمہ اللہ ایک سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

جوازِ تقلیدِ شخصی کا عقیدہ محققینِ حنفیہ کے موافق ہے، علامہ بحرالعلوم مولانا عبدالعلی فرنگی محلی حنفی رحمہ اللہ القوی ''شرح مسلم الثبوت'' میں لکھتے ہیں:

''لایجب الاستمرار ویصح الانتقال وھذا ھو الحق الذی ینبغی ان یؤمن ویعتقد به''

''ہمیشہ ایک ہی شخص کا مقلد رہنا واجب نہیں ہے، بلکہ ایک مذہب کو چھوڑ کے دوسرا مذہب اختیار کر لینا جائز ہے، اور یہی درست ہے، اس پر ایمان لانا چاہیے اور اس کا اعتقاد رکھنا چاہیے''

علامہ ابنِ ہمام حنفی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

لو التزم مذهبا معينا کابی حنیفة والشافعی رحمهما الله فقیل یلزمه وقیل لا وهو الاصح''

اگر کسی خاص مذہب کو لازم کرلیا، مثلاً ابوحنیفہ اور امام شافعی رحمہما اللہ کا مذہب تو بعضوں کے نزدیک اس مذہب کی تقلید واجب ہے، اور بعضوں کے نزدیک نہیں،

اور یہی صحیح ہے‘‘

اور علامہ شرنبلالی حنفی رحمہ اللہ نے ’’العقد الفريد ‘‘میں لکھا ہے:

’’ليس على الإنسان إلتزام مذهب معين‘‘

’’انسان پر مذہبِ معین کا التزام لازم نہیں ہے‘‘

اور یہی علامہ محمد عبدالعظیم حنفی مفتیِ مکہ وشاہ ولی اللہ محدث دہلوی وشاہ عبدالعزیز محدث دہلوی وامیر حاج سید بادشاہ وقاضی ابوعاصم رحمہم اللہ کا مختار ہے، جن کا شمار کبائرِ مشائخِ احناف میں ہے(مجموعہ فتاویٰ عبدالحی ، ج۳ص۱۹۸، ۱۹۹، کتاب التقلید، مطبوعہ: ایچ ایم سعید کمپنی، کراچی)

حضرت مولانا عبدالحیٔ لکھنوی رحمہ اللہ، ایک مقام پر فرماتے ہیں:

والى الله المشتكىٰ من جهلة زماننا حيث يطعنون علىٰ من ترك تقليد امامه فى مسألة واحدة لقوة دليلها ويخرجونه عن جماعة مقلديه ولا عجب منهم فانهم من العوام وانما العجب ممن يتشبه بالعلماء ويمشى مشيهم كالانعام (الفوائد البهية فى تراجم الحنفية ، صفحة ١١٦ ، ترجمة ’’عصام بن يوسف‘‘ باب العين)

ترجمہ: ہم اپنے زمانہ کے جاہلوں کی اللہ کے علاوہ اور کس سے شکایت کریں کہ یہ جاہل اس شخص پر سخت تنقید کرتے ہیں، جو قوتِ دلیل کی بناء پر کسی مسئلہ میں اپنے امام کے مذہب واقتداء کو ترک کر دیتا ہے، اور اس کو یہ لوگ اس کے مقلد ہونے سے خارج کر دیتے ہیں، اور یہ زیادہ تعجب کی بات نہیں، کیونکہ وہ عوام ہیں، تعجب کی بات تو یہ ہے کہ ایسا طرزِ عمل وہ لوگ اختیار کرتے ہیں، جو اپنے آپ کو علماء کہتے ہیں، حالانکہ وہ اپنے طرزِ عمل میں (عقل وفہم کے اعتبار سے) چوپاؤں کی طرح ہیں (الفوائد البہیۃ)

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

نفسِ وجوبِ تقلیدِ شخصی کے انکار سے اہلِ سنت سے خارج نہیں ہوتے، کیونکہ ہمیشہ سے مختلَف فیہ مسئلہ رہا ہے، چنانچہ بعض محدثین بھی اس کے عدمِ وجوب کے قائل ہیں (دعواتِ عبدیت، جلد ۱۹ صفحہ ۱۴۶۰، تحفۃ العلماء، جلد ۲، صفحہ ۴۸۵ ''اجتہاد و تقلید کا آخری فیصلہ'')

بلکہ خود بہت سے محققینِ حنفیہ نے بھی اسی کے راجح ہونے کی تصریح فرمائی ہے ''کما ھو مذکور فی المطولات''

حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی صاحب رحمہ اللہ ایک مقام پر فرماتے ہیں:

مسائل بعض قطعی ہوتے ہیں، ان میں اختلاف کی گنجائش نہیں ہوتی، بعضے اجتہادی وظنی ہوتے ہیں، ان میں سلف سے خلف تک شاگرد نے استاد کے ساتھ، مرید نے پیر کے ساتھ، قلیل جماعت نے کثیر جماعت کے ساتھ، واحد نے متعدد کے ساتھ اختلاف کیا ہے، اور علمائے امت نے اس پر نکیر نہیں کی، اور نہ ایک نے دوسرے کو ضال اور عاصی کہا، نہ کسی نے دوسرے کو اپنے ساتھ متفق ہونے پر مجبور کیا (تحفۃ العلماء، جلد ۲، صفحہ ۷۹، ترتیب: مولانا مفتی محمد زید صاحب، مطبوعہ: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان)

حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی صاحب رحمہ اللہ ایک اور مقام پر فرماتے ہیں:

اگر اپنے بڑوں سے بھی اختلاف نیک نیتی کے ساتھ اور محض دین کے لیے ہو، تو کچھ مضائقہ نہیں ''الافاضات الیومیہ'' (ماخوذ از: آپ بیتی نمبر ۶ یا یادِ ایام نمبر ۵، صفحہ ۳۳۰، فصل نمبر ۱۵ ''اکابر کا معمول، تنقیدات اور آپس کے اختلاف کے بارے میں'' مطبوعہ: مکتبۃ الشیخ، بہادر آباد، کراچی)

حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی صاحب رحمہ اللہ ایک اور مقام پر فرماتے ہیں:

مسائلِ اجتہادیہ میں کسی ایک شق کو صواب سمجھنا، اور دوسری شق کے اختیار کرنے پر ملامت کرنا مصداق ہے ''ومن یتعد حدود اللہ فقد ظلم نفسہ'' کا (تحفۃ العلماء، جلد ۲، صفحہ ۷۹، ترتیب: مولانا مفتی محمد زید صاحب، مطبوعہ: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان)

علامہ ظفر احمد عثمانی صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ:

جب انسان خود فقیہ ہو، تو مسئلۂ نازلہ میں اس کو اپنی رائے پر عمل کرنا واجب ہے، دوسرے فقہاء کی رائے اگر اس کے خلاف ہو، اس پر اس کو عمل جائز نہیں ہے، گو وہ شمار میں کتنے ہی ہوں (امداد الاحکام، ج۴، ص۴۸۱، کتاب المتفرقات، رسالہ ''التدقیق الاقوم فی تحقیق السواد الاعظم'' مطبوعہ: مکتبہ دار العلوم کراچی، طبع اول 1421 ہجری)

علامہ شبیر احمد عثمانی صاحب رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں کہ:

صحابہ رضی اللہ عنہم کے عہد مبارک میں کوئی صحابی دوسرے پر مسائلِ اجتہادیہ میں اختلاف رکھنے کی وجہ سے ملامت، یا طعن و تشنیع نہیں کرتا تھا، اور تضلیل، یا تبدیع تو کجا، ایک کی طرف سے دوسرے کی تاثیم بھی نہ ہوتی تھی، بلکہ ایسے اختلافات کو توسع اور رحمت جان کر ایک دوسرے کے ساتھ نہایت رواداری کا برتاؤ کرتے تھے، خود احناف کی کتابوں میں بجز ایسی صورتوں کے، جس میں فسادِ صلاۃ کا مظنہ غالب ہو، اقتداء حنفی کی شافعی کے پیچھے، اور شافعی کی حنفی کے پیچھے جائز رکھی گئی ہے، اور بعض بعض مسائل ہیں، جہاں فقہائے زمانہ کو شرعاً رخصت و تیسیر کی ضرورت محسوس ہوئی ہے، دوسرے ائمہ کی آراء کو معمول بہا بنایا گیا ہے، کیونکہ کسی خاص امام کی تقلید کے لازمی معنیٰ اگرچہ اس امام کے مذہب کو صواب اور راجح کہنا ہے، مگر پھر بھی احتمالِ خطاء کا اعتراف اور دوسرے امام کے اجتہاد کے متعلق احتمالِ صواب کی تصریح موجود ہے، اگر خاص خاص شرعی مصالح جن کا ادراک فقہاء کر سکتے ہیں، اس طرف داعی ہوں کہ بعض مسائل میں دوسرے ائمہ کے مذاہب پر فتویٰ دیا جائے، تو آخر پھر اس احتمالِ خطاء و صواب سے فائدہ اٹھانے کا اور کون سا موقع ہے؟ (رسالہ ''ہدیہ سنیہ'' ص۲۴، مشمولہ مقالاتِ عثمانی، مطبوعہ: ادارہ اسلامیات، لاہور)

بڑے بڑے جلیلُ القدر اور رفیعُ المنزلۃ ائمہ یہ یقین رکھنے کے باوجود ہر

مسئلہ میں حق صرف ایک ہوسکتا ہے، پھر بھی اپنے مخالف کے تخطئہ میں اس قدر محتاط تھے، چنانچہ جو کچھ بھی حسنِ ظن ائمۂ کرام کی نسبت آج باقی ہے، وہ ان ہی پاک نفس بزرگواروں کی احتیاط اور بے تعصبی اور فراخ دلی اور حسنِ تأدب کا نتیجہ ہے (رسالہ ''ہدیہ سنیہ'' ص۴۳، مشمولہ مقالاتِ عثمانی، مطبوعہ: ادارہ اسلامیات، لاہور)

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

جس مسئلہ میں صحابہ وتابعین اور ائمہ مجتہدین کا اختلاف ہو، اس کی کوئی جانب شرعی حیثیت سے منکر نہیں کہلائے گی، کیونکہ دونوں آراء کی بنیاد قرآن وسنت اور ان کے مسلمہ اصول پر ہے، اس لیے دونوں جانبین داخلِ معروف ہیں، زیادہ سے زیادہ ایک کو راجح اور دوسرے کو مرجوح کہا جاسکتا ہے، اس لیے ان مسائل مجتہد فیہا میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ بھی کسی پر عائد نہیں ہوتا، بلکہ غیر منکر پر نکیر کرنا خود ایک منکر ہے، یہی وجہ ہے کہ سلفِ صالحین کا بے شمار مسائل میں جواز وعدم جواز اور حرمت وحلت کا اختلاف ہونے کے باوجود کہیں منقول نہیں کہ ان میں سے ایک دوسرے پر اس طرح نکیر کرتا ہو، جیسے منکرات پر کی جاتی ہے، یا ایک دوسرے کو، یا اس کے متبعین کو گمراہی، یا فسق وفجور کی طرف منسوب کرتا ہو، یا اس کو ترکِ وظیفہ، یا ارتکابِ حرام کا مجرم قرار دیتا ہو، حافظ ابن عبدالبر رحمہ اللہ نے امام شافعی رحمہ اللہ کا جو قول نقل کیا ہے، وہ بھی اس پر شاہد ہے، جس میں فرمایا ہے کہ ایک مجتہد کو دوسرے مجتہد کا تخطیہ، یعنی اس کو خطا وار مجرم کہنا جائز نہیں (جواہر الفقہ، جلد اول، ص۴۰۸، ۴۰۹، مضمون ''وحدتِ امت'' مطبوعہ: مکتبہ دارالعلوم کراچی، طبع جدید: ذی الحجہ 1431ھ، نومبر 2010ء)

حضرت مولانا محمد یوسف بنوری صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

اصولاً کسی امام، صاحبِ مذہب کا متبع، چند جزئی مسائل میں اگر اپنے امام کے

خلاف رائے قائم کرے، تو علمائے امت میں اس کو اتباع وتقلید کے منافی نہیں سمجھا جاتا، قریباً سب مذاہب کے علماء میں کثرت سے خاص خاص مسائل میں بہت سے اختیارات اپنے ائمہ کے خلاف ملتے ہیں (ماہنامہ ''الفرقان'' بریلی، شاہ ولی اللہ نمبر، مرتبہ: مولانا محمد منظور نعمانی، جلد ۷، شمارہ نمبر ۹، ۱۰، ۱۱، ۱۲، بابت رمضان، شوال، ذیقعدہ، ذی الحجہ ۱۳۵۹ھ، صفحہ ۳٦۱ تا ۴۰۳، مضمون ''امام شاہ ولی اللہ اور حنفیت'')

حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب لدھیانوی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

قلب میں اکابر کی محبت وعظمت اور ان کے علمی وعملی بلند مقام کی وقعت کے باوجود مسائلِ شرعیہ میں دلائل کے پیشِ نظر ان سے اختلافِ رائے واجب ہے (رسالہ ''صبح صادق'' مشمولہ احسن الفتاویٰ جلد ۲ صفحہ ۱۹۰)

حضرت شیخ مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم تحریر فرماتے ہیں کہ:

الحمدللہ! جماعتِ دیوبند کی خصوصیت اور انہی بزرگوں کی تعلیم وتلقین نے ہمیں یہ صراطِ مستقیم دکھائی کہ مسائلِ شرعیہ میں آزادانہ اظہارِ رائے ترکِ ادب نہیں، بلکہ شاگردوں کا اظہارِ خیال، انہی بزرگوں کا معنوی فیض ہوتا ہے (فقہی مقالات، جلد ۲، صفحہ ۵۵، مطبوعہ: میمن اسلامک پبلشرز، کراچی، اشاعت: جولائی 1996ء)

حضرت شیخ مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم ایک مقام پر فرماتے ہیں کہ:

ائمۂ مجتہدین کے باہمی اختلاف کو حد سے بڑھا کر پیش کرنا بھی سخت غلطی ہے، بہت سے مسائل ایسے ہیں، جن میں ائمہ کے درمیان صرف افضل اور غیر افضل کا اختلاف ہے، جائز وناجائز کا، یا حلال وحرام کا اختلاف نہیں، مثلاً نماز میں رکوع کے وقت ہاتھ اٹھائے جائیں، یا نہیں؟ آمین آہستہ کہی جائے، یا زور سے؟ ہاتھ سینے پر باندھے جائیں، یا ناف پر؟ ان تمام مسائل میں ائمہ مجتہدین کا اختلاف محض افضلیت میں ہے، ورنہ یہ تمام طریقے سب کے نزدیک جائز ہیں، لہٰذا اِن

اختلافات کو حلال وحرام کی حد تک پہنچا کر، امت میں انتشار پیدا کرنا، کسی طرح جائز نہیں، اور جہاں ائمہ مجتہدین کے درمیان جائز وناجائز کا اختلاف ہے، وہاں بھی اس اختلاف کو خالص علمی حدود ہی میں رکھنا ضروری ہے، ان اختلافات کو نزاع وجدال اور جنگ و پیکار کا ذریعہ بنالینا، کسی امام کے مذہب میں جائز نہیں، نہ ان اختلافات کی وجہ سے ایک دوسرے کی عیب جوئی، یا ایک دوسرے کے خلاف بدگمانی اور بدزبانی کسی مذہب میں حلال ہے (تقلید کی شرعی حیثیت، ص ۱۵۷، ۱۵۸، بعنوان ''تقلید میں جمود'')

مذکورہ اوراس جیسی عبارات وحوالہ جات کی روشنی میں ہم حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی اور مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب دہلوی رحمہما اللہ کی تحقیق کی طرف رجحان رکھتے ہیں، جس پر کسی کا نکیر کرنا درست نہیں، پھر اگر کوئی نکیر کرے گا، تو ان شاء اللہ تعالیٰ دلائل کے ساتھ، اس پر نکیر کی جائے گی۔

کفایتُ المفتی کا دوسرا حوالہ

مولانا مفتی کفایتُ اللہ صاحب دہلوی رحمہ اللہ، ایک فتوے میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

حنفیہ کے اصول کے بموجب دیہات میں اقامتِ جمعہ درست نہیں، مصر ہونا جوازِ جمعہ کے لئے شرط ہے، لیکن مصر کی تعریفیں مختلف اور متعدد منقول ہیں، اس مسئلے میں زیادہ سختی کا موقع نہیں ہے، اوراس زمانے کے مصالحِ عامہ مہمہ اس امر کے مقتضی ہیں کہ اقامتِ جمعہ کو نہ روکا جائے، تو بہتر ہے، بالخصوص ایسی حالت میں کہ مدتِ دراز سے جمعہ قائم ہو، اس کو روکنا بہت سے مفاسدِ عظیمہ کا موجب ہوتا ہے

(کفایت المفتی مدلل ومکمل، ج۳ص۲۴۲، کتاب الصلاۃ، پانچواں باب: نمازِ جمعہ، مطبوعہ: دارالاشاعت، کراچی، سنِ طباعت: جولائی 2001ء)

مذکورہ فتوے میں جمعہ کے جائز ہونے میں زیادہ سختی کو ناپسند قرار دیا گیا ہے، اور جاری جمعہ کو نہ روکنے کو بہتر قرار دیا گیا ہے۔

کفایتُ المفتی کا تیسرا حوالہ

اپنے ایک اور فتوے میں مولانا مفتی کفایتُ اللہ صاحب دہلوی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں کہ:

چھوٹی بستیوں میں نمازِ جمعہ حنفیہ کے نزدیک نہیں ہے، لیکن انہوں نے جمعہ کی اہمیت کو قائم رکھتے ہوئے، مصر کی تعریف میں یہاں تک تنزل کیا ہے کہ **"ما لا یسع اکبر مساجدہ اھلہ المکلفین بھا"** تک لے آئے، حالانکہ ان کے اپنے اقرار (**ھذا یصدق علی کثیر من القریٰ**) سے یہ تعریف بہت سے "قریٰ" (ودیہات) پر صادق آتی ہے، پس نمازِ جمعہ کی اہمیت اور مصالحِ مہمہ عالیہ اسلامیہ کا مقتضیٰ یہ ہے کہ نمازِ جمعہ کو ترک نہ کیا جائے، اگر چہ امام شافعی کے مسلک پر عمل کے ہی ضمن میں ہو (کفایت المفتی مدلل ومکمل، ج۳ص۲۴۹، کتاب الصلاۃ، پانچواں باب: نمازِ جمعہ، مطبوعہ: دارالاشاعت، کراچی، سنِ طباعت: جولائی 2001ء)

اس سے معلوم ہوا کہ نمازِ جمعہ کی اہمیت اور اسلام کے اہم اور عالی مصالح کے تقاضوں کے پیشِ نظر نمازِ جمعہ کو ترک نہ کرنا چاہئے، اور اس سلسلہ میں شافعیہ وغیرہ کے مسلک کے مطابق بھی عمل کی گنجائش دینی چاہئے۔

ہم اس سلسلہ میں مولانا مفتی کفایتُ اللہ صاحب دہلوی رحمہ اللہ کے مذکورہ اور اس جیسے فتاویٰ کی تائید کرتے ہیں۔

کفایتُ المفتی کا چوتھا حوالہ

نیز ایک اور فتوے میں مفتی صاحب موصوف رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں کہ:

حنفی مذہب کے موافق ایسی چھوٹی بستی میں جمعہ جائز نہیں، مگر آج کل حنفی اس

مسئلہ میں شافعی مذہب کے اوپر عمل کر سکتے ہیں (کفایت المفتی مدلل ومکمل، ج۳ص۲۵۰، کتاب الصلاۃ، پانچواں باب: نمازِ جمعہ، مطبوعہ: دارالاشاعت، کراچی، سنِ طباعت: جولائی 2001ء)

کفایتُ المفتی کا پانچواں حوالہ

ایک اور فتوے میں مفتی صاحب موصوف تحریر فرماتے ہیں کہ:

اعظم پور چھوٹا سا موضع ہے، اس میں جمعہ کی نماز نہ پڑھنی چاہئے، اور اگر کوئی دینی مصلحت ہو کہ وہاں جمعہ پڑھنا مناسب ہو، تو پھر حنفیہ کے نزدیک تو جمعہ جائز نہیں، دیگر ائمہ کے قول کے موافق پڑھ لیں، تو گنجائش ہے (کفایت المفتی مدلل ومکمل، ج۳ص۲۵۳، کتاب الصلاۃ، پانچواں باب: نمازِ جمعہ، مطبوعہ: دارالاشاعت، کراچی، سنِ طباعت: جولائی 2001ء)

مذکورہ دونوں فتاویٰ میں بھی شافعیہ اور دوسرے ائمہ مثلاً مالکیہ اور حنابلہ کے قول کے مطابق جمعہ کی نماز کو جائز قرار دیا گیا ہے، اور ان فتاویٰ میں پہلے سے جاری شدہ نمازِ جمعہ کی بھی قید نہیں لگائی گئی، کیونکہ مالکیہ، شافعیہ اور حنابلہ بھی یہ قید نہیں لگاتے، جن کے اقوال کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے، اور یہ بات معلوم ہو چکی کہ یہ حضرات جمعہ کے لئے شہر کو ضروری قرار نہیں دیتے، وہ الگ بات ہے کہ پہلے سے جاری شدہ جمعہ کو بند کرنا اور بند کرانا، زیادہ مفاسد کا ذریعہ ہے۔

کفایتُ المفتی کا چھٹا حوالہ

حضرت مولانا مفتی محمد کفایتُ اللہ صاحب دہلوی رحمہ اللہ ایک اور فتوے میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

شرطیتِ مصر وجوبِ جمعہ کے لیے تو صحیح ہے، لیکن جواز کے لیے بھی ہو، یہ میں نہیں سمجھ سکا، اور اس زمانہ کی ضروریات اس کی مقتضی ہیں کہ اگر حنفی مذہب کی رُو سے

کسی طرح بھی اجازت نہ نکلے، تو دوسرے ائمہ کے مذہب پر ہی عمل کر کے، دیہات میں اقامتِ جمعہ سے نہ روکا جائے، اور قائم شدہ جمعہ کو بند کرنا، تو بہت خطرناک چیز ہے، کم از کم میں اس کی جرائت نہیں کرسکتا، اور ایک مجتہد فیہ مسئلہ میں ترکِ ظہر کی بناء پر مسلمانوں کو فاسق، یا گناہ گار کہنا امرِ عظیم ہے (کفایت المفتی مدلل ومکمل، ج۳ص۲۵۴، کتاب الصلاۃ، پانچواں باب: نمازِ جمعہ، مطبوعہ: دارالاشاعت، کراچی، سنِ طباعت: جولائی 2001ء)

مذکورہ فتوے میں صاف تصریح ہے کہ مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب رحمہ اللہ، گاؤں میں جمعہ کی نماز کو واجب تو نہیں سمجھتے، لیکن صحیح اور درست سمجھتے ہیں، امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ سے ظاہرُ الروایۃ میں جو الفاظ اس سلسلہ میں مروی ہیں، ان سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے [1]

اور وہ موجودہ زمانے کے تقاضہ کے پیشِ نظر مذہبِ حنفیہ کے علاوہ دوسرے فقہاء کے مطابق بھی دیہات میں نمازِ جمعہ سے منع نہ کرنے کی رائے رکھتے ہیں، اور خاص طور پر دیہات میں جاری شدہ جمعہ کے بند کرنے کو بہت خطرناک قرار دیتے ہیں، اور ایسی صورت میں ظہر کی نماز کے تارک اور فاسد قرار دینے کو امرِ عظیم سمجھتے ہیں۔

اور دوسرے ائمہ کے متعلق تصریحات وتوضیحات پہلے ذکر کی جا چکی ہیں کہ وہ گاؤں ودیہات میں چند ہلکی پھلکی شرائط کے ساتھ نمازِ جمعہ کا حکم فرماتے ہیں۔

اور حنفیہ کے اس مسئلہ میں تنزلی اختیار فرمانے کا ذکر بھی گزر چکا ہے۔

---

[1] چنانچہ "کتابُ الأصل" اس کی عبارت یہ ہے:

قلت: أرأيت أهل السواد من لم يكن في مصر ولا مدينة هل عليهم الخروج يوم الفطر أو يوم النحر؟ قال: لا، ولا يجب ذلك إلا على أهل الأمصار والمدائن .قلت: ولم؟ قال: للأثر الذي بلغنا عن رسول الله – صلى الله عليه وسلم – أنه قال: " لا جمعة ولا تشريق إلا في مصر جامع "(كتابُ الأصل، ج۵ ص ۴۱۳، كتاب الصيد والذبائح، باب من تجب عليه الأضحية)

مذکورہ عبارت میں "ولا یجب ذلک إلا علی أهل الأمصار والمدائن" مذکور ہے۔محمد رضوان۔

کفایتُ المفتی کا ساتواں حوالہ

حضرت مفتی صاحب موصوف ایک اور فتوے میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

قریۂ کبیرہ جس پر مصر کی کوئی تعریف بھی صادق آ جائے، مثلاً ''**مالا یسع اکبر مساجده اهله المكلفين بها** ''اس میں اقامتِ جمعہ جائز ہے، اور اگر کوئی تعریف بھی صادق نہ آئے، جب بھی اس مسئلے میں حنفیہ کے مصالحِ عامہ اسلامیہ کے لحاظ سے شوافع کے مسلک پر عمل کر لینا جائز ہے (کفایت المفتی مدلل ومکمل، ج۳ ص۲۴۱، کتاب الصلاۃ، پانچواں باب: نمازِ جمعہ، مطبوعہ: دارالاشاعت، کراچی، سنِ طباعت: جولائی 2001ء)

شوافع کا مسلک پہلے ذکر کیا جا چکا ہے، ساتھ ہی حنابلہ و مالکیہ کا بھی، اور مفتی صاحب موصوف نے مذکورہ فتوے میں واضح فرما دیا ہے کہ اگر حنفیہ کی طرف سے بیان کردہ کوئی تعریف بھی صادق نہ آئے، تو مصالحِ عامہ اسلامیہ کے لحاظ سے دوسرے مذاہب کے مسلک پر عمل کر لینا جائز ہے۔

ہم بھی اسی موقف کی تائید کرتے ہیں۔

کفایتُ المفتی کا آٹھواں حوالہ

ایک اور فتوے میں مفتی صاحب موصوف تحریر فرماتے ہیں کہ:

گاؤں میں جمعہ کا صحیح ہونا، نہ ہونا مجتہدین میں مختلف فیہ ہے، حنفیہ کے نزدیک جوازِ جمعہ کے لئے مصر ہونا شرط ہے، لیکن مصر کی تعریف میں اختلافِ عظیم ہے، تاہم جس مقام میں کہ زمانہ قدیم سے جمعہ قائم ہے، وہاں جمعہ کو ترک کرانے میں جو مفاسد ہیں، وہ ان مفاسد سے بدرجہا زیادہ سخت ہیں، جو سائل نے جمعہ پڑھنے کی صورت میں ذکر کئے ہیں، جو لوگ جمعہ کو جائز سمجھ کر جمعہ پڑھتے ہیں، ان کا فرض ادا ہو جاتا ہے، نفل کی جماعت، یا جہر بقرأت نفل نہار، یا ترکِ فرض لازم نہیں

آ تا، ۲۴ رجب ۱۳۵۲ھ (کفایت المفتی مدلل ومکمل، ج ۳ ص ۲۳۱، کتاب الصلاۃ، پانچواں باب: نمازِ جمعہ، مطبوعہ: دارالاشاعت، کراچی، سنِ طباعت: جولائی 2001ء)

مذکورہ فتوے میں صاف وضاحت ہے کہ جاری شدہ جمعہ کو ترک اور بند کرانے کے مفاسد، ان مفاسد سے بدرجہا زیادہ سخت ہیں، جو جمعہ جاری رہنے میں بیان کیے جاتے ہیں، مثلاً نفل کی جماعت، یادن کی نوافل میں جہری قرائت وغیرہ۔

کیونکہ جب کسی مجتہد کے اجتہاد، یا اس کی تقلید کی بناء پر نماز کا فریضہ ''جمعہ'' کی شکل میں ادا ہوگیا، تو نہ تو فرض نماز کا ترک کرنا لازم آیا، نہ ہی ظہر کی نماز کا ترک کرنا لازم آیا، اور نہ ہی نوافل کی جماعت اور اس میں جہری قرائت کی کراہت، لازم آئی، یہ سب خرابیاں تو اس وقت لازم آتیں، جب جمعہ کی نماز کو غیر صحیح قرار دیا جاتا، اور نوافل کی جماعت، اور اس میں جہری قرائت کو بھی مکروہ قرار دیا جاتا، البتہ اگر کوئی دوسرا ایسا سمجھے، تو وہ اس کی رائے ہے، جس کا وہ تو مکلّف و پابند ہوسکتا ہے، لیکن دوسرے سب لوگوں کو اس کا پابند و مکلّف سمجھنا درست نہیں، علامہ طحطاوی رحمہ اللہ کی اس سلسلے میں تصریح آگے آتی ہے، اور دوسرے مذہب یا قول پر عمل وفتوے کا ذکر پہلے گزر چکا ہے۔

کفایۃ المفتی کا نواں حوالہ

ایک اور فتوے میں مفتی صاحب موصوف تحریر فرماتے ہیں کہ:

> جن بستیوں میں قدیم سے جمعہ پڑھا جاتا ہے، اور جمعہ چھوڑانے سے لوگ نماز پنج وقتہ بھی چھوڑ دیتے ہیں، ایسی بستیوں میں جمعہ پڑھنا چاہیئے، تاکہ اسلام کی رونق اور شوکت قائم رہے، اور جو لوگ کہ ایسے گاؤں میں جمعہ پڑھنے کو جائز نہیں سمجھتے، وہ نہ پڑھیں، ان سے جھگڑا نہیں کرنا چاہیئے، پڑھنے والے بھی گناہگار نہیں ہیں، اور نہ پڑھنے والے بھی گناہ گار نہیں، آپس میں اختلاف اور فتنہ وفساد پیدا کرنا

حرام ہے، ہاں جن چھوٹے گاؤں میں پہلے سے جمعہ قائم نہیں ہے، وہاں قائم نہ کریں، اور جہاں پہلے سے قائم تھا، پھر چھوڑ دیا، اوراس کی وجہ سے لوگوں نے نمازِ جمعہ چھوڑ دی، وہاں پھر شروع کردیں (کفایت المفتی مدلل ومکمل، ج۳ص۲۳۵، کتاب الصلاۃ، پانچواں باب: نمازِ جمعہ، مطبوعہ: دارالاشاعت، کراچی، سنِ طباعت: جولائی 2001ء)

مطلب یہ ہے کہ اگر دیہات میں جمعہ قائم کرنے سے لوگ نماز پڑھ لیں، اوران کو دین کے دوسرے احکام بھی سننے کا موقع حاصل ہو، تو یہ مقدم ہے، بنسبت اس کے کہ لوگ بالکل ہی نماز چھوڑ دیں اور دین سے دور ہوجائیں۔

ہم بھی اسی رائے کوصواب اورراجح سمجھتے ہیں، اور جو حضرات مذکورہ مصالح کونظرانداز کرکے جمعہ کی نماز کوغیرصحیح قرار دیتے ہیں، ہم ان کا احترام کرتے ہیں، لیکن احترام کرنے سے، کسی کی رائے سے اتفاق کا ہونا لازم نہیں آتا، جیسا کہ بے شمار فقہی واجتہادی مسائل کا معاملہ ہے، جن میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے بھی اختلاف کیا جاتا ہے۔

کفایتُ المفتی کا دسواں حوالہ

مفتی صاحب موصوف ایک اورفتوے میں تحریرفرماتے ہیں کہ:

ان دونوں موضعوں میں جمعہ کی نماز حنفی مذہب کے موافق قائم نہ کرنا چاہئے، لیکن اگرقدیمُ الایام سے ان میں جمعہ قائم ہو، تو اسے بند بھی نہ کرنا چاہئے کہ دوسرے ائمہ کے مذہب کے موافق جمعہ ہوجاتا ہے، ۱۳جمادی الثانی ۱۳۵۴ھ (کفایت المفتی مدلل ومکمل، ج۳ص۲۳۸، کتاب الصلاۃ، پانچواں باب: نمازِ جمعہ، مطبوعہ: دارالاشاعت، کراچی، سنِ طباعت: جولائی 2001ء)

مذکورہ فتوے میں قدیمُ الایام سے جاری نمازِ جمعہ کو جو دیہات میں ہو، بند کرنے سے منع کیا گیا ہے، ساتھ ہی، دوسرے ائمہ کے مذاہب کے مطابق، جمعہ ادا ہونے کا حکم بھی لگایا گیا ہے۔

کفایتُ المفتی کا گیارہواں حوالہ

ایک اور فتوے میں مفتی صاحب موصوف تحریر فرماتے ہیں کہ:

حنفی مذہب کے موافق قریٰ، یعنی دیہات میں جمعہ صحیح نہیں ہوتا، اس لئے اگر کسی گاؤں میں پہلے سے جمعہ قائم نہیں ہے، تو وہاں جمعہ قائم نہ کرنا چاہئے، کیونکہ حنفی مذہب کے موافق اس میں جمعہ صحیح نہ ہوگا، اور فرض ظہر جمعہ پڑھنے سے ساقط نہ ہوگا، لیکن اگر وہاں قدیمُ الایام سے جمعہ قائم ہے، تو اس کی دوصورتیں ہیں، یا یہ کہ اسلامی حکومت میں بادشاہِ اسلام کے حکم سے قائم ہوا تھا، تو حنفی مذہب کی رُو سے بھی وہاں جمعہ صحیح ہوتا ہے، اس لئے بند کرنا درست نہیں، یا یہ کہ بادشاہِ اسلام کے حکم سے قائم ہونا ثابت نہیں، یا یہ معلوم ہے کہ مسلمانوں نے خود قائم کیا تھا، مگر ایک زمانہ دراز سے پڑھا جاتا ہے، اس صورت میں حنفی مذہب کے اصول کے موافق تو اسے بند کرنا چاہئے، یعنی بند کرنا ضروری ہے، لیکن چونکہ عرصہ دراز کے قائم شدہ جمعہ کو بند کردینے میں، جو فتنے اور مفاسد پیدا ہوتے ہیں، ان کے لحاظ سے اس مسئلے میں حنفیہ کو شوافع کے مذہب پر عمل کرلینا جائز ہے، اور جب کہ وہ شوافع کے مذہب پر عمل کرکے جمعہ پڑھیں گے، تو ظہر ساقط نہ ہونے کے کوئی معنیٰ نہیں، مسئلہ مجتہد فیہ ہے، اور مفاسدِ لازمہ، عمل بمذہب الغیر کے لئے وجہ جواز ہیں، ۱۵ جمادی الثانی ۱۳۵۴ھ (کفایت المفتی مدلل ومکمل، ج۳ص۲۳۹، کتاب الصلاۃ، پانچواں باب: نمازِ جمعہ، مطبوعہ: دارالاشاعت، کراچی، سنِ طباعت: جولائی 2001ء)

کفایتُ المفتی کا بارہواں حوالہ

مفتی صاحب موصوف ایک اور فتوے میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

اگر نمازِ جمعہ وہاں عرصہ سے قائم ہے، تو اب اس کو بند کرنے میں مذہبی ودینی فتنہ

ہے، اس لیے اس کو موقوف کرنا درست نہیں، بلکہ اس مسئلہ میں امام شافعی کے قول یا امام مالک کے قول کے موافق عمل کرلینا جائز ہے (کفایت المفتی مدلل ومکمل، ج۳ص۲۴۸، کتاب الصلاۃ، پانچواں باب : نمازِ جمعہ، مطبوعہ: دارالاشاعت، کراچی، سنِ طباعت: جولائی2001ء)

مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب دہلوی رحمہ اللہ نے اس باب میں جو رائے قائم کی، وہ اگرچہ موجودہ دور کے بہت سے مشہور اصحابِ افتاء کی رائے کے موافق نہ ہو، لیکن موجودہ حالات کے لحاظ سے بڑی اہمیت اور وزن کی حامل ہے، کیونکہ گاؤں، دیہات میں نمازِ جمعہ کے جائز ہونے کے دلائل کے فی نفسہٖ راجح ہونے سے قطع نظر، گاؤں، دیہات کے لوگوں کو جمعہ کی وجہ سے دین کے ساتھ مناسبت قائم رہتی ہے، ورنہ وہ جمعہ کے دن، نہ تو ظہر کی نماز پڑھتے اور نہ ہی مساجد کا رُخ کرتے، جبکہ بعض اوقات دوسرے مسالک کے لوگ گاؤں میں جمعہ شروع کر کے عرصۂ دراز تک وہاں کے لوگوں کو جمعہ کے دن وعظ وبیان کے ذریعے اپنے اپنے مسلک کی تبلیغ کرتے رہتے ہیں، اور جمعہ قائم نہ کرنے والوں کے خلاف ذہن سازی کر کے ان سے متنفر بھی کرتے ہیں، جس کے نتیجے میں کچھ ہی عرصہ بعد پورے علاقہ کے لوگ، گاؤں میں جمعہ کے قیام کی مخالفت کرنے والے علماء اور ان کے متبعین سے وحشت کرنے لگتے ہیں، نیز کسی گاؤں میں پہلے سے جاری جمعہ کو بند کرنے میں خود ہمارا بھی عرصۂ دراز سے مختلف مفاسد، نزاع، باہم قطع تعلقی وقطع رحمی وغیرہ لازم آنے کا مشاہدہ وتجربہ ہے، جبکہ اجتہادی واختلافی اور فقہی فروعی مسائل میں اتنی سختی کر کے مذکورہ اور ان جیسے مفاسد وفتن کو برداشت کرنا، ہمیں زیب معلوم نہیں ہوتا، کسی دوسرے کو ہو، تو ہو۔

اس لیے ہمارا ذاتی رجحان بھی حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی اور مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب دہلوی رحمہما اللہ وغیرہما کی مذکورہ رائے کی طرف ہوا۔

قدیم عرصہ اور برس ہا برس سے ہندوستان وپاکستان، بلکہ دنیا کے بیشتر ممالک کے بہت سے

گاؤں، دیہات میں جمعہ کی نماز قائم کرنے کا رواج ہے، جس کو ایک طرح سے ابتلائے عام کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے، اور عرصۂ دراز سے علماء کی کوششوں کے باوجود لوگ جمعہ کی نماز ترک کرکے، اس کی جگہ ظہر کی نماز پڑھنے کے لیے آمادہ نہیں ہوتے، اور وہاں جمعہ کی نماز کو بند کرنے میں سخت فتنہ لازم آتا ہے، سالہا سال تک گروہ بندیاں ہو کر جھگڑوں اور ایک دوسرے پر فتویٰ بازی اور قطع تعلقی و قطع رحمی کا سلسلہ قائم رہتا ہے، اور جمعہ پھر بھی بند نہیں ہوتا، اور جمعہ نہ پڑھنے کے نتیجے میں عوامُ الناس ظہر کی نماز بھی ادا نہیں کرتے۔

اور جمعہ کی نماز اور جمعہ کے دن وعظ و تذکیر کے نتیجہ میں دیہات کے بہت سے لوگوں کو اسلام کی بنیادی تعلیمات سے آگاہی حاصل ہوتی ہے، اور اس کے علاوہ وہاں عام مسلمانوں کو دین کی بنیادی تعلیمات سے آگاہ کرنے کا اور کوئی ذریعہ میسر نہیں، اور اسی وجہ سے بعض دوسرے گروہ اپنے طور پر جمعہ کی نماز قائم کرکے، عامۃُ الناس کے نظریات کو بری طرح مسخ کرتے ہیں، جو کہ سخت دینی و دنیوی فتنہ ہے، ان حالات کا ایک عرصہ سے مشاہدہ کرتے رہنے اور مسئلہ ہٰذا کے مجتہد فیہ ہونے اور بعض اہلِ علم کی تصریحات اور دلائل پر غور و فکر کرنے کے نتیجہ میں گاؤں، دیہات میں جمعہ کی نماز کے عدمِ جواز پر مصر رہنے کی طرف اب ہمارا رجحان نہیں، اور بحالتِ موجودہ ائمۂ ثلاثہ، حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی رحمہم اللہ وغیرہ اور ''کفایتُ المفتی'' کے فتاویٰ و تصریحات کے مطابق جمعہ کے جواز کی گنجائش معلوم ہوئی، بالخصوص جبکہ وہاں جمعہ قائم ہو چکا ہو، یا مسلمانوں کے دین کی حفاظت کے لئے وہاں جمعہ کے قیام کی ضرورت ہو، مگر شرط یہ ہے کہ وہ آبادی مستقل گاؤں کی شکل میں آباد ہو، عارضی خیموں وغیرہ کی شکل میں، یا صرف چند گھروں پر مشتمل بہت چھوٹی آبادی نہ ہو، جس کو گاؤں و دیہات سے تعبیر کرنے کے بجائے ''ڈھوک'' یا ''چک'' وغیرہ سے تعبیر کیا جاتا ہے، جس کی خود حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی رحمہ اللہ وغیرہ نے تصریح فرمائی ہے۔

اور اس موقع پر بعض اصحابِ علم، جو مذکورہ حالات و احوال کو نظر انداز کرکے یہ حکم لگاتے ہیں

کہ ہمیں ان چیزوں سے کوئی لینا دینا نہیں، اور ہمارے اوپر لازم آنے والے مفاسد کی ذمہ داری نہیں، ہم تو صرف اپنے فقہ اور اپنے مخصوص بزرگوں کے قول کے مطابق فتویٰ جاری کرنے کے مکلّف ہیں، اور بس۔

ہمیں اس رائے اور طرزِ عمل سے اتفاق نہ ہوسکا۔

اور ہمارے نزدیک بحالاتِ موجودہ ان کا مذکورہ طرزِ عمل اور رائے خطاء وتسامح پر مبنی ہے، جس پر نیک نیتی اور اجتہادِ بلیغ کرنے کی صورت میں، وہ تو بے شک ایک اجر وثواب کے عنداللہ مکلّف ہوں گے، لیکن جس پر اس قول کا خطاء اور دوسری رائے کا صواب ہونا ظاہر ہوجائے، اس کو اس رائے کو صواب قرار دینا جائز نہیں، اور وہ اسی رائے کا پابند ومکلّف ہے، جس کو وہ دلائل کی رو سے اپنے اور اللہ کے درمیان راجح وصواب سمجھے۔

لہٰذا اس موقع پر بعض حضرات کا دوسرے سب لوگوں کو کسی ایک، یا اپنی رائے کا مکلّف سمجھنا اور اس کی پابندی پر زور دینا، یا اصرار کرنا درست نہیں، اور صرف کسی ایک شخصیت، یا چند اشخاص وافراد ، یا کسی ادارہ میں ہی فقہ حنفی، یا کسی مسلک کی صحیح ترجمانی اور اس کے قابلِ اتباع ہونے کو منحصر سمجھنا بھی صحیح نہیں، خواہ وہ شخصیت اور ادارہ کتنا ہی مشہور اور قدیمی کیوں نہ ہو، ورنہ تو آج کے دور میں بلکہ سب زمانوں میں صرف حرمین شریفین اور وہاں کے ائمہ وعلماء کو ہی قرآن وسنت اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے صحیح ترجمان اور قابلِ اتباع سمجھنے میں انحصار لازم آئے گا، جو کہ درست نہیں۔

حضرت عکرمہ سے روایت ہے کہ:

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا، رَفَعَهُ قَالَ: لَيْسَ أَحَدٌ إِلَّا يُؤْخَذُ مِنْ قَوْلِهِ وَيَدَعُ غَيْرَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ (المعجم الكبير للطبرانی، رقم الحدیث ۱۱۹۴۱، ج ۱۱ ص ۳۳۹) [1]

---

[1] قال الهيثمي: رواه الطبراني في الكبير، ورجاله موثقون(مجمع الزوائد، تحت رقم الحديث ۸۴۰، باب الاجتهاد)

ترجمہ: حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما نے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث بیان فرمائی کہ کوئی بھی شخص نہیں، مگر اس کی بات کو قبول بھی کیا جائے، اور چھوڑا بھی جائے گا، سوائے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے (طبرانی)

حضرت مجاہد سے بھی اسی طرح کی روایت مروی ہے۔ [1]

علامہ ابنِ تیمیہ رحمہ اللہ ایک سوال کے جواب میں فرماتے ہیں:

إنما يجب على الناس طاعة الله والرسول وهؤلاء أولوا الأمر الذين أمر الله بطاعتهم فى قوله: (أطيعوا الله وأطيعوا الرسول وأولى الأمر منكم) إنما تجب طاعتهم تبعا لطاعة الله ورسوله لا استقلالا ثم قال: (فإن تنازعتم فى شيء فردوه إلى الله والرسول إن كنتم تؤمنون بالله واليوم الآخر ذلك خير وأحسن تأويلا) وإذا نزلت بالمسلم نازلة فإنه يستفتى من اعتقد أنه يفتيه بشرع الله ورسوله من أى مذهب كان ولا يجب على أحد من المسلمين تقليد شخص بعينه من العلماء فى كل ما يقول ولا يجب على أحد من المسلمين التزام مذهب شخص معين غير الرسول صلى الله عليه وسلم فى كل ما يوجبه ويخبر به بل كل أحد من الناس يؤخذ من قوله ويترك إلا رسول الله صلى الله عليه وسلم .واتباع شخص لمذهب شخص بعينه لعجزه عن معرفة الشرع من غير جهته إنما هو مما يسوغ له ليس هو مما

---

[1] محمد بن أحمد بن موسى العدوى، حدثنا إسماعيل بن سعيد الكسائى، أخبرنا سفيان، عن عبد الكريم، عن مجاهد، قال: ليس أحد إلا يؤخذ من قوله ويترك، إلا النبى صلى الله عليه وسلم (حلية الاولياء لابى نعيم الاصبهانى، ج ۲ ص ۱۳۱، تحت ترجمة "مجاهد بن حبر")

یجب علی کل أحد إذا أمکنه معرفة الشرع بغیر ذلک الطریق بل کل أحد علیه أن یتقی الله ما استطاع ویطلب علم ما أمر الله به ورسوله فیفعل المأمور ویترک المحظور (مجموع الفتاویٰ، ج۲۰ ص۲۰۸،۲۰۹، اصول الفقه "التمذهب" سئل عمن قال : ینبغی لکل مومن ان یتبع مذهبامن المذاهب)

ترجمہ: لوگوں پر صرف اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت واجب ہے، اور یہ اولی الامر جن کی اطاعت کا اللہ نے اپنے اس قول "**أطیعوا اللّٰه وأطیعوا الرسول وأولی الأمر منکم**" میں حکم فرمایا ہے، تو ان کی اطاعت صرف اللہ اور اس کے رسول کی تابع ہو کر واجب ہے، نہ کہ مستقل ہونے کی حیثیت سے، پھر اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ "**فإن تنازعتم فی شیء فردوه إلی اللّٰه والرسول إن کنتم تؤمنون باللّٰه والیوم الآخر ذلک خیر وأحسن تأویلا**" کہ "اگر کسی چیز میں تمہارا تنازع اور اختلاف ہو، تو اسے اللہ اور اس کے رسول کی طرف لوٹا دو، اگر تم اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتے ہو، یہ بہتر ہے اور تاویل کے اعتبار سے احسن ہے" پس جب مسلم کو کوئی واقعہ پیش آئے، تو وہ اس شخص سے فتویٰ طلب کرے، جس کے بارے میں وہ یہ اعتقاد رکھتا ہے کہ وہ اسے اللہ اور اس کے رسول کی شریعت کے مطابق فتویٰ دے گا، خواہ اس کا تعلق کسی بھی فقہی مذہب سے ہو، اور مسلمین میں سے کسی پر بھی شخصِ معین کے مذہب کا التزام واجب نہیں، سوائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے، ہر اس چیز میں جو اس پر واجب قرار دے، اور جس کی وہ خبر دے، بلکہ لوگوں میں سے ہر ایک کا اس کے قول کی وجہ سے مؤاخذہ ہوگا، اور اس کو چھوڑا جائے گا، سوائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے، اور کسی شخص کا متعین شخص کے مذہب کی اتباع اس وجہ سے کرنا کہ وہ

خود سے شریعت کی معرفت سے عاجز ہے، یہ اس کے لیے جائز عمل ہے، مگر ہر ایک پر واجب نہیں، جب اس کو اس طریقہ کے علاوہ شریعت کی معرفت (خود اجتہاد کرکے، یا کسی دوسرے مجتہد سے سوال کرکے) ممکن ہو، اور ہر ایک پر واجب ہے کہ وہ اپنی حسبِ استطاعت اللہ سے ڈرے، اور اللہ اور اس کے رسول نے جو حکم دیا ہے، اس کا علم طلب کرے، پھر مامور کو اختیار کرے اور محظور کو ترک کرے

(مجموع الفتاویٰ)

ایک مقام پر علامہ ابنِ تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

الحمد لله ، قد ثبت بالكتاب والسنة والإجماع أن الله سبحانه وتعالى فرض على الخلق طاعته وطاعة رسوله صلى الله عليه وسلم ولم يوجب على هذه الأمة طاعة أحد بعينه فى كل ما يأمر به وينهى عنه إلا رسول الله صلى الله عليه وسلم حتى كان صديق الأمة وأفضلها بعد نبيها يقول :أطيعونى ما أطعت الله فإذا عصيت الله فلا طاعة لى عليكم .

واتفقوا كلهم على أنه ليس أحد معصوما فى كل ما يأمر به وينهى عنه إلا رسول الله صلى الله عليه وسلم ولهذا قال غير واحد من الأئمة :كل أحد من الناس يؤخذ من قوله ويترك إلا رسول الله صلى الله عليه وسلم (مجموع الفتاوىٰ، ج٢٠ص٢١٠، ٢١١، اصول الفقه "التمذهب"سئل عمن تمذهب من الاربعة ، ثم لما اشتغل بالحديث تبين له مخالفة هذا المذهب لبعض الاحاديث الصحيحة)

ترجمہ: کتاب وسنت اور اجماع سے یہ بات ثابت ہے کہ بے شک اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے مخلوق پر اپنی اطاعت اور اپنے رسول کی اطاعت کو فرض کیا ہے، اور اس

امت پر کسی دوسرے کی متعین اطاعت کو واجب نہیں کیا کہ اس کی ہر کہی ہوئی بات کو مانا جائے گا، اور ہر منع کی ہوئی بات سے رکا جائے گا، سوائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے، یہاں تک کہ اس امت کے صدیق اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب سے افضل شخص (حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ) یہ فرمایا کرتے تھے کہ تم میری اطاعت کرو، جب تک میں اللہ کی اطاعت کروں، اور جب میں اللہ کی نافرمانی کروں، تو تم پر میری اطاعت واجب نہیں۔ [1]

اور امت کا اس پر اتفاق ہے کہ کوئی شخص ہر کہی ہوئی بات اور ہر منع کی ہوئی چیز میں معصوم نہیں ہوسکتا، سوائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے، اسی وجہ سے کئی ائمہ نے یہ بات فرمائی کہ لوگوں میں سے ہر شخص کی بات کو لیا بھی جائے گا، اور چھوڑا بھی جائے گا، سوائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے (مجموع الفتاویٰ)

---

[1] أخبرنا عبد الرزاق، عن معمر، قال :وحدثني بعض أهل المدينة، قال :خطبنا أبو بكر فقال :يا أيها الناس إني قد وليت عليكم ولست بخيركم، فإن ضعفت فقوموني، وإن أحسنت فأعينوني، الصدق أمانة، والكذب خيانة، الضعيف فيكم القوي عندي حتى أزيح عليه حقه إن شاء الله، والقوي فيكم الضعيف عندي حتى آخذ منه الحق إن شاء الله، لا يدع قوم الجهاد في سبيل الله إلا ضربهم الله بالفقر، ولا ظهرت -أو قال: شاعت -الفاحشة في قوم إلا عممهم البلاء ، أطيعوني ما أطعت الله ورسوله، فإذا عصيت الله ورسوله فلا طاعة لي عليكم، قوموا إلى صلاتكم يرحمكم الله(جامع معمر بن راشد، مشمولة مصنف عبدالرزاق، رقم الرواية ۲۰۷۰۲)

محمد بن المنكدر، حدثني محمد بن عبد الرحمن بن عوف قال:((لما ولي أبو بكر -رضي الله عنه- أمر الناس بعد رسول الله صلى الله عليه وسلم صعد المنبر فحمد الله وأثنى عليه ثم قال: يا أيها الناس إني قد وليت عليكم أمركم هذا، ولست بخيركم، فإن أحسنت فأعينوني، وإن زغت فقوموني .الصدق أمانة والكذب خيانة، أكيس الكيس التقي وأنوك النوك الفجور .الضعيف فيكم القوي عندي حتى آخذ له الحق، والقوي عندكم: الضعيف عندي حتى آخذ الحق منه، لا يدع قوم الجهاد في الله تعالى إلا ضربهم الله بالذل، ولا تشيع الفاحشة في قوم إلا عمهم الله تعالى بالبلاء .أطيعوني ما أطعت الله تعالى ورسوله، فإذا عصيت الله ورسوله فلا طاعة لي عليكم قوموا إلى صلاتكم(الترغيب والترهيب لقوام السنة، رقم الرواية ٢١٦٧)

مختلف مذاہب کے فقہاء اور خود حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی رحمہ اللہ نے بھی اس کی جابجا صراحت کی ہے، جس کی ہم نے تفصیل "عمل بالحدیث کا حکم" میں بیان کردی ہے۔ [1]

---

[1] ومن كشف عن قلبه الغطاء واستنار بنور الهداية صار فى نفسه متبوعا مقلدا فلا ينبغى أن يقلد غيره.

ولذلك قال ابن عباس رضى الله عنهما ما من أحد إلا يؤخذ من علمه ويترك إلا رسول الله صلى الله عليه وسلم وقد كان تعلم من زيد بن ثابت الفقه وقرأ على أبى بن كعب ثم خالفهما فى الفقه والقرائة جميعا.

وقال بعض السلف ما جائنا عن رسول الله صلى الله عليه وسلم قبلناه على الرأس والعين وما جائنا عن الصحابة رضى الله عنهم فنأخذ منه ونترك وما جائنا عن التابعين فهم رجال ونحن رجال وإنما فضل الصحابة لمشاهدتهم قرائن أحوال رسول الله صلى الله عليه وسلم واعتلاق قلوبهم أمورا أدركت بالقرائن فسددهم ذلك إلى الصواب من حيث لا يدخل فى الرواية والعبارة إذ فاض عليهم من نور النبوة ما يحرسهم فى الأكثر عن الخطأ(احياء علوم الدين للغزالى، ج ا ص٧٨، ٧٩، كتاب العلم، الباب السادس فى آفات العلم وبيان علامات علما الآخرة والعلماء السوء)

فإن وفيت بالغاية المنشودة للقارء أو الباحث، فهو المراد، وإن قصرت أو لم أصب الحقيقة أو المطلب، فهو خطأ غير مقصود، يثاب القارء عليه إن نبهنى إلى موضع الخطأ، قال الإمام مالک رحمه الله تعالى: كل إنسان يؤخذ من كلامه ويترك إلا صاحب هذه السارية صلى الله عليه وسلم (الفقه الاسلامى وادلتهٔ للزحيلى، ج١٠ ص٧٩٦٩، الخاتمة)

والحاصل :أن العلماء اختلفوا فى لزوم مذهب معين، وصحح كل أحد منهم ما ذهب إليه، وعدم اللزم هو الراجح كما ذكرناه بعد أن لا يخرج عن المذاهب الأربعة، والله ولى التوفيق(خلاصة التحقيق فى بيان حكم التقليد والتلفيق،لعبد الغنى النابلسى رحمه الله ،ص٣، مطلب: هل على الإنسان التزام مذهب معين أم لا؟المقصد الأول: فهل على الإنسان التزام مذهب معين أم لا؟)

قلت :ويمكن الجواب عن أبى يوسف رحمه الله تعالى أنه اجتهد فى دليل الشافعى -رحمه الله تعالى -وأخذ به، والمجتهد المقيد فى المذهب له أن يجتهد فى أصول غير إمامه، لأنه فى معنى المقلد الذى لا يلزمه التزام مذهب معين كما سبق، إذ هو ليس بمجتهد مطلق صاحب مذهب مستقل حتى يمتنع عليه ذلک(خلاصة التحقيق فى بيان حكم التقليد والتلفيق،لعبد الغنى النابلسى رحمه الله ،ص٥)

وقد علم من هذا أن مذهب العامى فتوى مفتية، وفيه أيضا فى باب قضاء الفوائت إن كان عاميا ليس له مذهب معين فمذهبه فتوى مفتية كما صرحوا به، فإن أفتاه حنفى أعاد العصر والمغرب، وإن أفتاه شافعى، فلا يعيدهما ولا عبرة برأيه وإن لم يستفت أحداء، أو صادف الصحة على مذهب مجتهد أجزأه ولا إعادة عليه (حجة الله البالغة، ج ا ،ص ٢٦٩، تتمة ،باب حكاية حال الناس قبل المائة الرابعة وبعدها،فصل:ومما يناسب هذا المقام التنبيه على مسائل ضلت فى بواديها الافهام وزلت الأقدام، وطغت الأقلام)

علامہ ”محمد بخيت المطيعى حنفى “ کا حوالہ

سابق مفتی دیارِ مصر علامہ محمد بخيت المطيعى حنفى ”المتوفیٰ:1354ہجری“ (سابق رئيس: المجلس العلمى بمحكمة مصر الكبرىٰ الشرعية ، وعضو المحكمة العليا بها سابقا) اپنے رسالہ ”احسن القرا فى صلاة الجمعة فى القرىٰ“ میں فرماتے ہیں:

صلاة الظهر بعدها: فقال الشافعية يصلى الظهر بعدها احتياطا على تفصيل ذكروه فى كتبهم ، وقد قال به ايضا متاخرو الحنفية ، وامروا به احتياطا ، لاختلاف الائمة فى اشتراط المصر وعدمه ،وفى تعريف المصر ، و جواز التعدد وعدمه ، وفى العدد الذى تنعقد به، وفى اشتراط اذن السلطان او نائبه باقامتها وعدمه.

ومن هذا كله تعلم جواب السؤال وان المقطوع به المتفق عليه هو كون الجمعة فرضا ، لايجوز تركها ، ويكفر جاحدفرضيتها، وانها من شعائر الاسلام .

وان كل موضع اختلفوا فيه سواء كان من شروطها او من غيرها، فادلته ظنية، فكان دليل الفرض قطعيا ، ودليل الاشتراط ظنيا.

ولا يخفى ان اشتراط المصر واذن الحاكم ليس لامرلا توجد الجمعة بدونه، اذ لا ملائمة بين ذلک وبين صلاة الجمعه ، وانما اشتراط اذن الحاكم لمنع التنازع على ما قالوا، واشتراط المصر لبيان الموضع الذين امرنا باقامة الجمعة فيه.

ولا يخفى ايضاً ان الله تعالىٰ قدر من رحمته وفضله ان كل ما ادى

اليـه رأى المجتهد فى محله على وجه فهو شريعة له تعالىٰ فى حق الـمـجتهـد. وكـل مـن عـمـل بــه يـكـون العمل بـه طاعة وعبادة صـحيحة، وان اخطأ ذلک المجتهد فانما يكون خطأه بالنظر الى مـا هو عندالله من الحكم، لابالنظر الى عامنا وما ادى اليه اجتهاده بل هو بالنظر الى ذلک صواب بالاجما ع.

وتـعـلـم ايـضا ان الاحوط للمكلف اذا اراد ان يخرج من عهدة ما كـلف بـه بيـقيـن ويـكـون آتيـا بـالفرض على جميع المذاهب ان يـصـلى الجمعة فى كل موضع بقول امام مجتهد لوجوبها فيه، ولو كان قرية صغيرة جداً وان يصلى الظهر بعدها ينوى به فرض اليوم فـى كـل مـوضـع قـال فيـه امـام مجتهد بعدم وجوبها فيه ، او عدم صـحتهـا لـفـقد شرط ، او غير ذلک، وذلک لما قلنا ان الجمعة فـريـضة قـطـعية ، لايـجـوز تـركهـا ولاجـحدها ولا التهاون فيها، والدليل على ذلک قطعي ، وما عداه مما جرى فيه الخلاف ظنى.

وقـد قـدمنا لک ما قاله فى فتاوىٰ الحجة. ان الاحتياط فى القرى الـصغيرة ان يصلى الجمعة ثم اربعا سنتها ، ثم ركعتين سنة الوقت ، ثـم الاربع ، الخ، ما سبق نقله ، ومراده الاربع التى ينوى بها ظهر اليوم كما سبق.

الا انـنـا نـقـول ان صـلاة الـظهـر بعدها احتياطا لايختص بالقرى الـصـغيـرة لـمـا عـلـمت ان المقصود من صلاة الظهر بعدها ،هو الاحتياط ، والخروج من عهدة الخلاف بين الائمة .

وهـذا الـمـعـنـى لايـختص بالقرى الصغيرة بل هو متحقق فى كل

موضع وجد فيه الخلاف فى صحة الجمعة او فى وجوبها فيه، والخلاف لا يختص بالقرى الصغيرة كما علمت مما سبق(احسن القرا فى صلاة الجمعة فى القرىٰ، ص۷۱ الیٰ ۹۱،الموضع السابع صلاة الظهر بعدها ، الطبعة الثانية :سنة ۱۳۵۵ ھ ،1936ء ،مطبوعة: جمعية الازهر العلمية، مصر)

ترجمہ: جمعہ کے بعد ظہر کی نماز کے متعلق شافعیہ کا قول ہے کہ جمعہ کے بعد احتیاطاً ظہر کی نماز پڑھی جائے گی ،جیسا کہ ان کی کتابوں میں اس کی تفصیل مذکور ہے،اور متاخرینِ حنفیہ بھی اس کے قائل ہیں،جس کا انہوں نے احتیاطاً حکم دیا ہے، کیونکہ جمعہ کی نماز کے لیے شہر کے شرط ہونے نہ ہونے میں ائمہ کا اختلاف ہے،اور شہر کی تعریف میں بھی اختلاف ہے،اور ایک شہر میں ایک سے زیادہ جگہ جمعہ کے جائز ہونے نہ ہونے میں بھی اختلاف ہے،اور اس تعداد میں بھی اختلاف ہے،جس کے ذریعہ سے جمعہ منعقد ہوتا ہے،اور بادشاہ ،یا اس کے نائب کی اجازت سے جمعہ کی نماز قائم ہونے کے شرط ہونے نہ ہونے میں بھی اختلاف ہے۔

پس اس تمام تفصیل سے سوال کا جواب معلوم ہوگیا،اور یہ بات بھی معلوم ہوگئی کہ قطعی بات جس پر فقہاء کا اتفاق ہے، وہ جمعہ کا فرض ہونا ہے،جس کا ترک کرنا جائز نہیں،اور اس کی فرضیت کا انکار کرنے والا کافر ہے،اور یہ اسلام کے شعائر میں سے ہے۔

اور ہر وہ مقام جس میں فقہاء کا اختلاف ہو، چاہے وہ جمعہ کی شرط ہو،یا شرط نہ ہو،تو اس کے دلائل ظنی ہیں، پس جمعہ کے فرض ہونے کی دلیل قطعی ہے،اور دوسری چیزوں کے شرط ہونے کی دلیل ظنی ہے۔

اور یہ بات مخفی نہیں کہ شہر کا شرط ہونا اور حاکم کی اجازت کا ہونا،کسی ایسی قطعی چیز کی وجہ سے نہیں ہے کہ جمعہ اس کے بغیر وجود میں نہ آتا ہو، کیونکہ اس کے اور جمعہ کی

نماز کے درمیان (ایسا کوئی حتمی) تعلق نہیں، اور حاکم کی اجازت کی شرط، جھگڑے کو روکنے کے لیے ہے، جیسا کہ فقہاء نے فرمایا (کیونکہ بڑے مجمع میں جھگڑے کا امکان زیادہ ہوتا ہے) اور شہر کی شرط اس مقام کو بیان کرنے کے لیے ہے، جس میں جمعہ قائم کرنے کا ہمیں حکم ہے (اس سے دوسری جگہ جمعہ کے قیام کا عدمِ جواز لازم نہیں آتا)

اور یہ بات بھی مخفی نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت اور فضل سے اس بات کو مقدر فرمادیا ہے کہ جس مسئلہ میں جس پہلو کی طرف مجتہد کی رائے پہنچائے، وہ اس مجتہد کے حق میں اللہ تعالیٰ کی شریعت ہوتی ہے، اور ہر وہ شخص جو اس پر عمل کرے، تو اس کا عمل، طاعت اور صحیح عبادت بنتا ہے، اگرچہ مجتہد نے اس میں خطاء کی ہو، پس مجتہد کی خطاء کا اللہ کے نزدیک جو حکم ہے، اس پر نظر کرتے ہوئے ہے، ہمارے عامیوں کی طرف اور جس کی طرف اس کا اجتہاد پہنچائے، اس کے اعتبار سے خطاء نہیں، بلکہ اس کے اعتبار سے بالاجماع صواب ہے۔

اور مذکورہ تفصیل سے یہ بات بھی معلوم ہوگئی کہ مکلّف کے لیے زیادہ احتیاط جب وہ اپنے ذمہ میں مکلّف چیز کے عہدہ سے یقین کے ساتھ نکلنا چاہے، اور تمام مذاہب کے مطابق فرض کو ادا کرنا چاہے، یہ ہے کہ وہ جمعہ کی نماز ہر اس مقام پر ادا کرے، جہاں کسی مجتہد امام کے قول پر واجب ہو، اگرچہ بہت چھوٹا گاؤں کیوں نہ ہو، اور جمعہ کی نماز کے بعد ظہر بھی پڑھ لے، جس سے ہر دن کے اس وقت کے فرض کو ادا کرنے کی نیت کرے، اس مجتہد امام کے قول کے مطابق، جو کسی شرط وغیرہ کے فوت ہونے کی وجہ سے اس جگہ جمعہ کی نماز کے واجب یا صحیح نہ ہونے کا قائل ہے، اور اس کی وجہ وہی ہے، جو ہم نے ذکر کی کہ جمعہ کی نماز یقینی فریضہ ہے، جس کا ترک کرنا جائز نہیں، اور نہ اس کا انکار کرنا جائز ہے، اور نہ اس میں سستی کرنا

جائز ہے، جس کے دلائل قطعی ہیں، اور ان کے علاوہ جن چیزوں میں اختلاف جاری ہوا ہے (مثلاً شہر کا ہونا) وہ ظنی ہیں۔

اور ہم آپ کے سامنے ''فتاویٰ الحجة'' کا یہ قول ذکر کر چکے ہیں کہ چھوٹے گاؤں میں احتیاط، جمعہ کی نماز پڑھنے، اور اس کے بعد چار سنتیں پڑھنے، پھر دو رکعت سنتِ وقت پڑھنے، پھر چار رکعت پڑھنے میں ہے، الخ ،جس کا حوالہ پہلے گزر چکا ہے،اور (بعد کی) چار رکعتوں سے مراد وہ ہیں،جن میں اس دن کے ظہر کی نیت کرے گا،جیسا کہ گزر چکا۔

البتہ ہم یہ بات کہتے ہیں کہ جمعہ کی نماز کے بعد احتیاطاً ظہر کی نماز چھوٹے گاؤں کے ساتھ خاص نہیں ہے، جیسا کہ آپ کو معلوم ہو چکا کہ جمعہ کے بعد ظہر کی نماز سے مقصود، مختلف فقہاء اور ائمہ کے درمیان اختلاف کی ذمہ داری سے خروج ہے۔

اور یہ مقصود چھوٹے گاؤں کے ساتھ خاص نہیں ہے، بلکہ وہ ہر اس مقام پر متحقق ہوتا ہے، جس میں جمعہ کے صحیح ہونے ، یا واجب ہونے میں اختلاف پایا جاتا ہو،اور یہ بات ظاہر ہے کہ اختلاف چھوٹے گاؤں کے ساتھ خاص نہیں، جیسا کہ گزشتہ تفصیل سے آپ کو معلوم ہو چکا (احسن القرا)

علامہ ''محمد بخیت المطیعی حنفی'' کا دوسرا حوالہ

شیخ موصوف آگے چل کر مزید فرماتے ہیں:

فان قلت ان مذهب كل مجتهد فى مواضع الخلاف صواب فى ظنه خطأ فى ظن غيره، فكيف يسوغ للحنفى ان يصلى الجمعة فى القرى الصغيرة وهى باطله فى مذهب ، ولايجوز الشروع فى

عمل باطل؟

قلنا ان کون مذھب غیرہ خطأ انما ھو فی ظنہ فقط لا فی الواقع ، وقولک لایجوز الشروع فی باطل محلہ فی الباطل الذی تبین بطلانہ ، والخطأ الذی تبین خطأہ ، وذلک فیما اجمع علی انہ باطل وخطأ، لانہ یکون کذلک فی الواقع ونفس الامر، فلایجوز الشروع فیہ ولا للعمل بہ بحال، وما نحن بصددہ لیس کذلک

(احسن القرا فی صلاۃ الجمعۃ فی القریٰ، ص ۲۱، ۲۲،بیان وایضاح لقول القائل ، الطبعۃ الثانیۃ :سنۃ ۱۳۵۵ ھ ،1936ء ،مطبوعۃ: جمعیۃ الازھر العلمیۃ، مصر)

ترجمہ:اگر آپ یہ شبہ کریں کہ اختلافی مسائل میں ہر مجتہد کا مذہب اس کے گمان کے مطابق صواب ہے،دوسرے کے گمان کے مطابق خطاء ہے،پس حنفی کے لیے کیسے جائز ہے کہ وہ گاؤں میں جمعہ کی نماز پڑھے، جبکہ وہ اس کے مذہب میں باطل ہے،اور باطل عمل کوشروع کرنا جائز نہیں؟

ہم اس کے جواب میں کہیں گے کہ دوسرے کے مذہب کا خطاء ہونا،صرف اس مجتہد کے ظن کے مطابق ہے، حقیقت کے مطابق نہیں، اور رہا آپ کا یہ کہنا کہ باطل عمل کوشروع کرنا جائز نہیں،تو اس کا محل وہ باطل عمل ہے،جس کا بطلان واضح ہو،اور وہ خطاء ہے،جس کی خطاءواضح ہو،اور یہ بات ان امور میں ہوتی ہے،جن کے باطل اور خطاء ہونے پر اجماع ہو، کیونکہ وہ امور واقع اور نفسُ الامر میں بھی اسی طرح باطل اور خطاء ہوتے ہیں،لہٰذا نہ تو ان کوشروع کرنا جائز ہے،اور نہ کسی حال میں ان پرعمل کرنا جائز ہے،اور ہمارا زیرِ بحث مسئلہ اس طریقہ سے نہیں ہے (کیونکہ اس کے بطلان وخطاء پر اجماع نہیں ہے)(احسن القرا)

امام ابنِ منذر کے علاوہ حضرت امام شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی رحمہ اللہ کے حوالہ سے

گاؤں میں جمعہ کی نماز کا حکم پہلے گزر چکا ہے، اور حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ دہلوی رحمہ اللہ کی مفصّل تصریحات وفتاوٰی جات بھی پہلے ذکر کیے جا چکے ہیں۔

علامہ محمد بخیت المطیعی حنفی کے موقف سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے، کہ گاؤں میں جمعہ کی نماز ادا کرنے سے منع کرنا، بنسبت ادا کر لینے کے زیادہ نقصان دہ ہے۔

علمائے حرمین شریفین کا موقف بھی یہی ہے، جیسا کہ آگے آتا ہے۔

اور اختلاف سے خروج کے مستحب ہونے اور احتیاط الظہر کا حکم آگے آتا ہے۔

”شیخ محمد بن صالح عثیمین“ کا حوالہ

عرب کے مشہور عالم شیخ محمد بن صالح عثیمین ایک سوال کے جواب میں فرماتے ہیں:

العلماء اختلفوا رحمهم الله هل يشترط للجمعة عدد معين أو لا يشترط أن يكون معينا بالأربعين؟

فمن أهل العلم من يقول :إن الجمعة لا تصح حتى يوجد أربعين من أهل وجوبها مستوطنين بالمكان الذى تقام به، وهذا هو المشهور من مذهب الإمام أحمد رحمه الله.

ومنهم من يقول :تجب إقامة الجمعة إذا وجد فى المكان اثنى عشر رجلا مستوطنا فيه.

ومنهم من يقول :تجب إقامة الجمعة إذا وجد ثلاثة فأكثر مستوطنين فى هذا المكان.

والقول الراجح :أنها تقام الجمعة إذا وجد فى القرية ثلاثة فأكثر مستوطنين؛ لأن الأدلة التى استدل بها من يشترطون الاثنى عشر، أو الأربعين ليست واضحة فى الاستدلال، والأصل وجوب

الجمعة، فلا يعدل عنه إلا بدليل بين، ذلك أن الذين استدلوا بأنه لابد من اثنى عشر استدلوا :بأن النبى صلى الله عليه وسلم كان يخطب الناس يوم الجمعة، فقدمت عير من الشام فانصرف الناس إليها وانفضوا، ولم يبق مع النبى صلى الله عليه وسلم إلا اثنى عشر رجلا.

والذين استدلوا على اشتراط الأربعين استدلوا :بأن أول جمعة جمعت فى المدينة كان عدد المقيمين بها أربعين رجلا .ومن المعلوم أن العدد فى الأول، والعدد فى الثانى إنما كان اتفاقا، بمعنى أنه أقيمت الجمعة فكان الاتفاق أى الذى وافق العدد أربعين رجلا، وكذلك الذين انصرفوا عن النبى صلى الله عليه وسلم كان الاتفاق أن يبقى منهم اثنا عشر رجلا، مثل هذا لا يمكن أن يستدل به على أنه شرط، إذ من الممكن أن يقال :لو أقيمت الجمعة وكان أقل فليس عندنا دليل على أن الجمعة لا تصح، كما أنه لو بقى أكثر من اثنى عشر، أو كان عند إقامة الجمعة أكثر من أربعين، لم يمكننا أن نقول أنه يشترط أن يزيدوا على اثنى عشر، أو يزيدوا عن أربعين، على هذا فنرجع إلى أقل جمع ممكن وهو للجمعة ثلاثة لأن الله تعالى يقول :(ياأيها الذينء امنو "ا إذا نودى للصلاة من يوم الجمعة فاسعوا إلى ذكر الله وذروا البيع ذلكم خير لكم إن كنتم تعلمون) ومعلوم أن المنادى ينادى لحضور الخطيب، فيكون المنادى، والخطيب، والمأمور يسعى إلى الجمعة، وأقل ما يمكن فى ذلك ثلاثة، وهذا اختيار شيخ

الإسلام ابن تیمیة -رحمه الله تعالی -وهو الراجح (مجموع فتاوی ورسائل فضیلة الشیخ محمد بن صالح العثیمین، ج١٦، ص٧٥، ٧٦، کتاب الصلاة، صلاة الجمعة سئل فضیلة الشیخ رحمه الله تعالی: أنا أسکن فی قریة یبلغ سکانها الخ)

ترجمہ: علمائے کرام رحمہم اللہ کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ جمعہ کے لیے کوئی متعین تعداد شرط ہے، یا متعین تعداد چالیس وغیرہ کی شرط نہیں ہے؟

پس بعض اہلِ علم یہ فرماتے ہیں کہ جمعہ اس وقت تک صحیح نہیں ہے، جب تک کہ چالیس ایسے افراد نہ پائے جائیں، جن پر جمعہ کی نماز واجب ہو، اوران کا وہ مقام وطنِ اصلی ہو، جس میں جمعہ قائم کیا جارہا ہے، امام احمد رحمہ اللہ کا مشہور مذہب یہی ہے۔

اور بعض اہلِ علم یہ فرماتے ہیں کہ جمعہ کی نماز قائم کرنا، اس وقت واجب ہے، جبکہ اس مقام میں بارہ افراد ایسے پائے جائیں، جن کا وہ مقام وطنِ اصلی ہو (یہ قول امام مالک رحمہ اللہ کا ہے)۔

اور بعض اہلِ علم حضرات یہ فرماتے ہیں کہ جمعہ کی نماز کا قائم کرنا واجب ہے، جبکہ تین، یا اس سے زیادہ افراد اس جگہ کے باشندے ہوں (یہ قول امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا ہے، جن کے نزدیک وجوبِ جمعہ کے لئے مقیم ہونا کافی ہے، وطنِ اصلی کے ساتھ مقیم ہونا ضروری نہیں)

اور راجح قول یہ ہے کہ جمعہ کی نماز گاؤں میں قائم کی جائے گی، جبکہ اس میں تین، یا زیادہ افراد مقیم ہوں، کیونکہ جن دلائل سے ان حضرات نے استدلال کیا ہے، جو بارہ افراد، یا چالیس افراد کو شرط قرار دیتے ہیں، وہ اس استدلال میں واضح نہیں ہیں، اور اصل حکم، جمعہ کی نماز واجب ہونے کا ہے، جس سے واضح دلیل ہونے کی صورت میں ہی عدول کیا جائے گا، جس کی توضیح یہ ہے کہ جن حضرات نے بارہ

افراد کے ضروری ہونے پر استدلال کیا ہے، انہوں نے اس چیز سے استدلال کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کے دن خطبہ دے رہے تھے، تو شام سے ایک (تاجروں کا) قافلہ آ گیا، لوگ اس قافلہ کی طرف چلے گئے، اور خطبہ کو ترک کر دیا، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صرف بارہ افراد باقی رہ گئے (تو یہ ایک اتفاقی واقعہ کی حکایت ہے، جس سے بارہ افراد کا جمعہ کی نماز کے لیے شرط ہونا ثابت نہیں ہوتا)

اور جن حضرات نے چالیس افراد کے شرط ہونے پر استدلال کیا ہے، انہوں نے اس چیز سے استدلال کیا ہے کہ مدینہ منورہ میں سب سے پہلا جمعہ جو قائم کیا گیا، اس میں مقیمین کی تعداد چالیس مرد حضرات پر مشتمل تھی، اور یہ بات معلوم ہے کہ پہلے واقعہ میں بارہ افراد کی تعداد اور دوسرے واقعہ میں چالیس افراد کی تعداد صرف اتفاقی تھی، اس حیثیت سے کہ جمعہ قائم کیا گیا، تو اتفاق سے چالیس مرد حضرات کی تعداد اکٹھی ہو گئی، اور اسی طریقہ سے جو لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبہ سے چلے گئے تھے، اتفاق سے بارہ مرد حضرات باقی رہ گئے تھے، اور اس طرح کے واقعات سے متعین افراد کی تعداد کے شرط ہونے پر استدلال ممکن نہیں، کیونکہ یہ کہا جانا ممکن ہے کہ اگر جمعہ قائم کیا جاتا، اور ان افراد کی تعداد تھوڑی ہوتی، تو ہمارے پاس اس بات کی کوئی دلیل نہیں ہے کہ جمعہ کو غیر صحیح کہا جاتا، جیسا کہ اگر بارہ افراد سے زیادہ باقی رہ جاتے، یا جمعہ قائم کرنے کے وقت چالیس افراد سے زیادہ ہوتے، تو بھی ہمارے لیے یہ کہنا ممکن نہیں تھا کہ بارہ افراد سے زیادہ، یا چالیس افراد سے زیادہ کو شرط قرار دیں، پس اس بناء پر ہم جمع کی کم از کم تعداد کی طرف رجوع کریں گے، جو کہ جمعہ کے لیے تین افراد کا ہونا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ "یَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا إِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلَاةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا

اِلٰی ذِکْرِ اللّٰہِ وَذَرُوْا الْبَیْعَ ''اور یہ بات معلوم ہے کہ اذان، خطیب کے حاضر ہونے کے لیے دی جاتی ہے، پس اذان دینے والا اور خطیب اور جس کو حکم دیا جائے، وہ جمعہ کی طرف سعی کے لیے مامور ہوں گے، اور اس سلسلہ میں کم از کم تعداد تین افراد کی ہے، شیخ الاسلام ابنِ تیمیہ رحمہ اللہ نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے، اور یہی راجح ہے (مجموع فتاویٰ ورسائل)

شیخ موصوف نے بھی حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ کے قریب رائے کو ترجیح دی ہے، اور گاؤں میں جمعہ کی نماز کو درست قرار دیا ہے۔

''مفتیِ اعظم عبدالعزیز بن باز'' کا حوالہ

اور سعودی عرب کے سابق مفتیِ اعظم عبدالعزیز بن باز رحمہ اللہ ایک سوال کے جواب میں فرماتے ہیں:

وقد تأملت أدلة الفريقين القائلين بوجوب إقامة صلاة الجمعة فى القرى والقائلين بعدم وجوبها وعدم صحتها، ورأيت أدلة أصحاب القول الأول وهم الجمهور أوضح وأكثر وأصح، ومما يوضح ذلک أن الله سبحانه فرض على عباده إقامة صلاة الجمعة فى قوله تعالى :(يا أيها الذين آمنوا إذا نودى للصلاة من يوم الجمعة فاسعوا إلى ذكر الله وذروا البيع) الآية.

وقول النبى صلى الله عليه وسلم :لينتهين أقوام عن ودعهم الجمعات أو ليختمن الله على قلوبهم ثم ليكونن من الغافلين رواه الإمام مسلم فى صحيحه.

ولأن النبى صلى الله عليه وسلم أقام صلاة الجمعة فى المدينة

وهـي فـي أول الهـجرة في حكم القرى، وأقر أسعد بن زرارة على إقـامة صـلاة الجمعة في نقيع الخضمات وهو في حكـم القرية ولـم يثبـت أنـه صلى الله عليه وسلم أنكر ذلك، والحديث في ذلك حسـن الإسـنـاد ومـن أعـلـه بـابـن إسحاق فقد غلط؛ لأنه قد ثبت تصريحه بالسماع فزالت شبهة التدليس.

ولأنه صلى الله عليه وسلام قال :صلوا كما رأيتموني أصلي وقد رأيـنـاه صـلى الجمعة في المدينة من حين هاجر إليها، ولأنه صلى الـله عليه وسلم أقر أهل (جواثا) وهي قرية من قرى البحرين على إقـامة صـلاة الـجـمعة، والـحـديـث بذلك مخرج في صحيح البخاري.

ولأنهـا إحـدى الـصـلوات الخمس في يوم الجمعة فوجب أداؤها عـلـى أهل القرى كأهل الأمصار، وكصلاة الظهر في حق الجميع فـي غير يوم الجمعة، وإنما تركت إقامتها في البادية والسفر لعدم أمـره صـلـى الـله عليه وسلم للبوادي والمسافرين بإقامتها .ولأنه صـلـى الـلـه عـليـه وسـلم لم يقمها في السفر فوجبت إقامتها فيما سـوى ذلك ومـعلوم أن الذي سوى ذلك هو القرى والأمصار؛ ولأن فـي إقـامتهـا مـصالح عظيمة من جمع أهل القرية في مسجد واحـد ووعـظهـم وتذكيرهم كل أسبوع بما شرع الله في خطبتي الجمعة.

وبـمـا ذكـرنـا من الأدلة يتضح لكل منصف صحة قول الجمهور وأنـه أقرب إلى الحق من قول من خالفهم، وأنه أنفع للمسلمين في

أمر دينهم ودنياهم وأقرب إلى براء ة الذمة وصلاح الأمة.

أما أثر علی رضی الله عنه فهو موقوف عليه، ولا يصح مرفوعا كما نبه على ذلک غير واحد منهم النووی رحمه الله مع أن فی صحة الموقوف نظر أيضا لأن فی إسناده عند عبد الرزاق الثوری رحمه الله ولم يصرح بالسماع وهو موصوف بالتدليس، وجابر الجعفی والحارث الأعور وكلاهما ضعيف.

وفی سنده عند ابن أبی شيبة الأعمش ولم يصرح بالسماع وهو مدلس معروف لكن عنعنته وعنعنة الثوری محمولة على السماع فيما خرجه عنهما البخاری ومسلم رضی الله عنهما فی الصحيحين .أما فی غير الصحيحين فليس هناک مانع من تعليل روايتهما بذلک إذا لم يصرحا بالسماع.

هذا ما ظهر لی وأسأل الله أن يوفقنی وإياكما وسائر إخواننا لإصابة الحق وأن يمن علينا جميعا بإيثار الحق على ما سواه وأن يعيذنا جميعا من التعصب واتباع الهوى فی جميع الأحوال إنه ولی ذلک والقادر عليه.

والسلام عليكم ورحمة الله وبركاته.

الرئيس العام لإدارات البحوث العلمية والإفتاء والدعوة والإرشاد (مجموع فتاوى العلامة عبد العزيز بن باز، ج۱۲،ص ۳٦۰ الٰی ۳٦۲، كتاب الصلاة، صلاة الجمعة، حكم إقامة صلاة الجمعة فی القرى)

ترجمہ: اور میں نے فریقین کے دلائل میں غور کیا، جن میں سے ایک فریق گاؤں میں جمعہ کی نماز کے قائم کرنے کے واجب ہونے کا قائل ہے، اور دوسرا فریق

واجب نہ ہونے اور سعی نہ ہونے کا قائل ہے، اور میں نے پہلے قول والے حضرات کے دلائل کو، جو کہ جمہور کا قول ہے، زیادہ واضح اور اکثر اور زیادہ صحیح محسوس کیا، جس کی وضاحت اس چیز سے بھی ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر جمعہ کی نماز قائم کرنے کو اپنے اس ارشاد میں فرض کیا ہے کہ ''**يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا نُودِيَ لِلصَّلَاةِ مِنْ يَوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا إِلَىٰ ذِكْرِ اللَّهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ**''

اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ لوگ جمعہ کی نماز ترک کرنے سے باز آجائیں، ورنہ اللہ، ان کے دل پر مہر لگا دے گا، پھر وہ غافل لوگوں میں سے ہو جائیں گے، جس کو امام مسلم نے اپنی صحیح میں روایت کیا ہے۔

اور ایک دلیل یہ بھی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جمعہ کی نماز کو مدینہ میں قائم فرمایا، جو کہ ہجرت کے ابتدائی وقت میں گاؤں کے حکم میں تھا، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسعد بن زرارہ کو ''نقیعُ الخضمات'' میں جمعہ کی نماز قائم کرنے پر مقرر فرمایا، جو کہ قریہ کے حکم میں تھا، اور یہ بات ثابت نہیں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر انکار فرمایا ہو، اور یہ حدیث سند کے اعتبار سے حسن ہے، اور جس نے اس میں ابنِ اسحاق کی علت بیان کی، تو اس نے غلطی کی، کیونکہ ان کے سماع کی تصریح ثابت ہے، لہٰذا تدلیس کا شبہ زائل ہو گیا۔ [1]

---

[1] عن محمد بن إسحاق، قال :حدثني محمد بن أبي أمامة بن سهل، عن أبيه، عن عبد الرحمن بن كعب، قال :كنت قائد أبي حين ذهب بصره، إذ خرجت به إلى الجمعة فسمع الأذان صلى على أبي أمامة أسعد بن زرارة واستغفر له، فمكثت كثيرا لا يسمع أذان الجمعة إلا فعل ذلك، فقلت :يا أبي أرأيت استغفارك لأبي أمامة كلما سمعت الأذان للجمعة ما هو؟ قال :أي بني، كان أول من جمع بنا بالمدينة في هزم النبت من حرة بني بياضة يقال لها نقيع الخضمات .قال :قلت :كم كنتم يومئذ؟ قال :أربعين رجلا(مستدرك حاكم، رقم الحديث ۱۰۳۹)

قال الحاكم: هذا حديث صحيح على شرط مسلم ولم يخرجاه.

و قال الذهبي في التلخيص: على شرط مسلم.

اور ایک دلیل یہ بھی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم جس طرح مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھتے ہو، اسی طرح نماز پڑھو، اور ہم نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو جمعہ کی نماز پڑھتے ہوئے دیکھا، جب آپ نے مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی، اور ایک دلیل یہ بھی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اہلِ جواثا کو جو کہ بحرین کے گاؤں میں سے ایک گاؤں ہے، جمعہ کی نماز قائم کرنے پر مقرر فرمایا، یہ حدیث صحیح بخاری میں مروی ہے۔

اور ایک دلیل یہ بھی ہے کہ جمعہ کے دن جمعہ کی نماز، پانچ نمازوں میں سے ایک ہے، لہٰذا اس کو ادا کرنا گاؤں والوں پر بھی واجب ہوگا، جیسا کہ شہر والوں پر واجب ہے، جیسا کہ ظہر کی نماز، جمعہ کے دن کے علاوہ تمام لوگوں کے حق میں واجب ہے، البتہ خانہ بدوش اور مسافروں پر اس کے قائم کرنے کو اس لیے ترک کر دیا گیا ہے، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خانہ بدوشوں اور مسافروں کو اس کے قائم کرنے کا حکم نہیں فرمایا، نیز نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سفر میں جمعہ کی نماز کو قائم نہیں فرمایا، لہٰذا ان کے علاوہ پر جمعہ کی نماز کو قائم کرنا واجب ہوگا، اور یہ بات معلوم ہے کہ خانہ بدوش اور سفر کے علاوہ، شہر اور گاؤں ہوتے ہیں، اور ایک وجہ یہ بھی ہے کہ جمعہ کی نماز کے قائم کرنے میں عظیم مصلحتیں ہیں، مثلاً گاؤں والے ایک مسجد میں جمع ہو جاتے ہیں، اور جمعہ کے خطبہ میں جس کا اللہ نے حکم فرمایا ہے، ہر ہفتہ ان کو وعظ و تذکیر ہو جاتی ہے۔ [1]

اور جو دلائل ہم نے ذکر کیے، ان سے ہر انصاف پسند کے لیے جمہور کے قول کا صحیح

[1] فأهل القرية يصلون جماعة، وأهل البادية الذين هم في بيوت شعر وصوف ويتنقلون من مكان إلى مكان عندما يقطنون(شرح سنن ابى داؤد للعباد "دروس صوتية قام بتفريغها موقع الشبكة الإسلامية"، رقم الدرس ٧٦، ص٣،باب التشديد فى ترك الجماعة، شرح حديث:ما من ثلاثة فى قرية ولا بدو لا تقام فيهم الصلاة إلا قد استحوذ عليهم الشيطان)

ہونا واضح ہو جاتا ہے، اور یہی قول حق کے زیادہ قریب ہے، ان حضرات کے مقابلہ میں، جن کا قول اس کے مخالف ہے، اور اسی میں مسلمانوں کے دین اور دنیا کے امور میں زیادہ نفع ہے، اور یہی قول فرض سے سبکدوش ہونے اور امت کی اصلاح کے زیادہ قریب ہے۔

جہاں تک حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اثر کا تعلق ہے، تو وہ موقوف ہے، جس کا مرفوع ہونا صحیح نہیں، جیسا کہ متعدد حضرات نے اس پر متنبہ کیا ہے، جن میں امام نووی رحمہ اللہ بھی ہیں، اسی کے ساتھ موقوف کے صحیح ہونے میں بھی نظر ہے، کیونکہ عبدالرزاق کی سند میں ثوری رحمہ اللہ ہیں، جنہوں نے سماع کی تصریح نہیں کی، اور وہ تدلیس کے ساتھ موصوف ہیں، اور جابر جعفی اور حارث اعور بھی دونوں ضعیف ہیں۔

اور ابنِ ابی شیبہ کی سند میں اعمش ہیں، جنہوں نے سماع کی تصریح نہیں کی، اور یہ مشہور مدلس ہیں، البتہ ان کا عنعنہ اور ثوری کا عنعنہ، صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی احادیث میں سماع پر محمول ہے، جہاں تک صحیحین کے علاوہ کی احادیث کا تعلق ہے، تو وہاں کوئی مانع نہیں کہ ان کی روایت میں اس تعلیل کو مؤثر مانا جائے، جبکہ یہ سماع کی تصریح نہ فرمائیں۔

میرے نزدیک یہی راجح ہے، اور میں اللہ سے سوال کرتا ہوں کہ وہ مجھے اور آپ کو اور ہمارے تمام بھائیوں کو اصابتِ حق کی توفیق عطاء فرمائے، اور ہم سب پر حق کو اس کے علاوہ پر ترجیح دینے کا احسان فرمائے، اور ہم سب کو تعصب سے اور خواہش کی اتباع سے، تمام حالات میں محفوظ فرمائے، وہی ذات اس کی مالک ہے، اور اس پر قادر ہے، والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔

رئیسِ عام: ادارہ بحوثِ علمیہ والافتاء والدعوۃ والارشاد (مجموع فتاویٰ عبدالعزیز بن باز)

شیخ موصوف کے مذکورہ فتوے سے معلوم ہوا کہ وہ بھی گاؤں میں جمعہ کی نماز کو غیر درست قرار دینے کو مرجوح سمجھتے ہیں۔

''مرعاۃُ المفاتیح'' کا حوالہ

عصرِ حاضر کے متعدد مشاہیر اہلِ حدیث حضرات کا قول بھی نمازِ جمعہ کے لئے افراد کی تعداد میں ابنِ منذر کے گزشتہ قول کے مطابق اور گاؤں میں جمعہ کے حوالے سے ائمۂ ثلاثہ کے قول کے مطابق ہے۔

چنانچہ ''مرعاۃُ المفاتیح'' میں ہے:

واختلفوا في أنه هل يشترط العدد المخصوص المعين أم لا، وفيه أقوال كثيرة ذكرها الحافظ في الفتح (ج4ص507) وابن حزم في المحلى (ج 5ص49 -46) والشوكاني في النيل (ج3ص109 -108)

منها أنه اثنان كالجماعة، وهو قول النخعي وأهل الظاهر .ومنها اثنان مع الإمام، وهو قول أبي يوسف ومحمد .ومنها أنه ثلاثة معه، وهو مذهب أبي حنيفة .ومنها أنه اثنا عشر، ومنها أربعون بالإمام، وهو قول الشافعي، وإليه ذهب أحمد في إحدى الروايتين عنه . ومنها خمسون في رواية عن أحمد .

والراجح عندي ما ذهب إليه أهل الظاهر أنه تصح الجمعة باثنين؛ لأنه لم يقم دليل على اشتراط عدد مخصوص، وقد صحت الجماعة في سائر الصلوات باثنين، ولا فرق بينها وبين الجمعة في ذلک، ولم يأت نص من رسول الله صلى الله عليه وسلم بأن

الـجـمعة لا تنعقد إلا بكذا .قـال الشوكاني :الـجـمعة يعتبر فيها الاجتماع، وهو لا يحصل بواحد .وأمـا الاثنان فبإنضمام أحدهما إلـى الآخـر يحصل الاجتماع .وقـد أطـلق الشارع اسم الجماعة عليهما، فقال :الاثنان فما فوقهما جماعة كما تقدم، وقد انعقدت سائر الصلوات بهما بالإجماع .والجمعة صلاة فلا تختص بحكم يـخالف غيرها إلا بدليل، ولا دليل على اعتبار عدد فيها زائد على الـمعتبـر فى غيرها .وقـد قـال عبد الحق :إنـه لا يثبـت فى عدد الـجـمعة حديث، وكذلك قال السيوطي :لـم يثبت فى شيء من الأحاديث تعيين عدد مخصوص-انتهى .

واختلفوا أيضا فى محل إقامة الجمعة.

فقال أبو حنيفة وأصحابه :لا تصح إلا فى مصر جامع.

وذهـب الأئـمة الثـلاثة إلـى جـوازها وصحتها فى المدن والقرى جميعا.

.واستـدل لأبـى حـنيـفة بما روى عن على مرفوعا :لا جمعة ولا تشـريـق إلا فـى مـصـر جامع .وقـد ضـعف أحـمـد، وغيره رفعه، وصحح ابن حزم، وغيره وقفه، وللاجتهاد فيه مسرح، فلا ينتهض لـلاحتـجـاج بـه فـضـلا عـن أن يـخصص به عموم الآية أو يقيد به إطـلاقهـا، مـع أن الـحـنـفية قـد تخبطوا فى تحديد المصر الجامع وضبـطـه عـلـى أقوال كثيرة متباينة متناقضة متخالفة جدا، كما لا يـخـفى على من طالع كتب فروعهم .وهـذا يدل على أنه لم يتعين عندهم معنى الحديث .

والراجح عندنا ما ذهب إليه الأئمة الثلاثة من عدم اشتراط المصر، وجوازها فی القری لعموم الآية وإطلاقها، وعدم وجود ما يدل على تخصيصها، ولا بد لمن يقيد ذلک بالمصر الجامع أن يأتی بدليل قاطع من كتاب أو سنة متواترة أو خبر مشهور بالمعنی المصطلح عند المحدثين، وعلى التنزل بخبر واحد مرفوع صريح صحيح يدل على التخصيص بالمصر الجامع.

ويدل أيضا على شرعيتها فی القری ما روی البخاری وغيره عن ابن عباس :أن أول جمعة جمعت بعد جمعة فی مسجد رسول الله صلى الله عليه وسلم فی مسجد عبد القيس بجواثی قرية من قری البحرين .كذا فی رواية وكيع عند أبی داود، وكذا للإسماعيلی .وهذا أولى من قول البكری وغيره :إنها مدينة؛ لأن ما ثبت فی نفس الحديث أصح مع احتمال أن تكون فی أول قرية ثم صارت مدينة .وأما ما حكى الجوهری والزمخشری والجزری أن جواثی اسم حصن بالبحرين فلا ينافی كونها قرية .والظاهر أن عبد القيس لم يجمعوا إلا بأمر النبی صلى الله عليه وسلم لما عرف من عادة الصحابة من عدم الاستبداد بالأمور الشرعية فی زمن نزول الوحی، ولأنه لو كان ذلک لا يجوز لنزل فيه القرآن، كما استدل جابر وأبوسعيد على جواز العزل، فإنهم فعلوه، والقرآن ينزل، فلم ينبهوا عنه، ولم يثبت برواية قوية أو ضعيفة أنه أسلم أهل قرية قبل عبد القيس .ومن ادعى ذلک فعليه البيان.

قال الحافظ فی شرح حديث ابن عباس المذكور :فيه إشعار

بتقدم إسلام عبد القيس على غيرهم من أهل القرى وهو كذلك، كما قررته في أواخر كتاب الإيمان، وقال في شرح حديث عبد القيس، ما لفظه :فيه دليل على تقدم إسلام عبد القيس على قبائل مضر الذين كانوا بينهم وبين المدينة، وكانت مساكن عبد القيس بالبحرين وما والاها من أطراف العراق .ويدل على سبقهم إلى الإسلام أيضا ما رواه المصنف (يعني البخاري) في الجمعة عن ابن عباس قال :إن أول جمعة جمعت الخ، قال :وإنما جمعوا بعد رجوع وفدهم إليهم، فدل على أنهم سبقوا جميع القرى إلى الإسلام-انتهى مختصرا .ويدل عليه أيضا ما روى البيهقي في المعرفة أن النبي صلى الله عليه وسلم حين ركب من بني عمرو بن عوف في هجرته إلى المدينة مر على بني سالم، وهي قرية بين قباء والمدينة، فأدركته الجمعة فصلى فيهم الجمعة، وكانت أول جمعة صلاها رسول الله صلى الله عليه وسلم حين قدم، وما روى ابن أبي شيبة وابن حزم عن عمر أنه كتب إلى أهل البحرين أن جمعوا حيثما كنتم .قال الحافظ :وهذا يشمل المدن والقرى، وما روى عبد الرزاق عن ابن عمر أنه كان يرى أهل المياه بين مكة والمدينة يجمعون فلا يعيب عليهم .وذكره ابن حزم بلفظ : فلا ينهاهم عن ذلك .وروى البيهقي (ج 3ص178) من طريق الوليد بن مسلم سألت الليث بن سعد فقال :كل مدينة أو قرية فيها جماعة أمروا بالجمعة، فإن أهل مصر وسواحلها كانوا يجمعون الجمعة على عهد عمر وعثمان بأمرهما، وفيهما رجال

من الصحابة (مرعاة المفاتيح شرح مشكاة المصابيح، ج۴، ص ۴۴۹ الیٰ ۴۵۱،
كتاب الصلاة، باب وجوب الجمعة، الفصل الثانی)

ترجمہ: اور اہلِ علم کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ جمعہ کی نماز کے لیے مخصوص تعداد متعین ہے، یا نہیں، اور اس میں بہت سے اقوال ہیں، جن کو حافظ ابنِ حجر نے ''**فتحُ الباری**'' میں اور ابنِ حزم نے ''**المحلیٰ**'' میں اور شوکانی نے ''**نیلُ الأوطار**'' میں ذکر کیا ہے۔

جن میں سے ایک قول یہ ہے کہ جمعہ کی نماز کے لیے عام جماعت کی طرح دو افراد شرط ہیں، یہ نخعی اور اہلِ ظاہر کا قول ہے، اور دوسرا قول یہ ہے کہ امام کے ساتھ مزید دو افراد شرط ہیں اور یہ امام ابو یوسف اور امام محمد کا قول ہے۔ اور تیسرا قول یہ ہے کہ امام کے ساتھ تین افراد شرط ہیں اور یہ امام ابو حنیفہ کا مذہب ہے۔ اور چوتھا قول یہ ہے کہ بارہ افراد شرط ہیں (یہ امام مالک کا قول ہے) اور پانچواں قول یہ ہے کہ امام کے ساتھ چالیس افراد شرط ہیں اور یہ امام شافعی کا قول ہے، اور اسی کی طرف امام احمد دو روایتوں میں سے ایک روایت کے مطابق گئے ہیں۔ اور چھٹا قول یہ ہے کہ پچاس افراد شرط ہیں، امام احمد کی ایک روایت یہی ہے۔

اور میرے نزدیک راجح وہ ہے، جس کی طرف اہلِ ظاہر گئے ہیں کہ جمعہ دو لوگوں کے ساتھ بھی صحیح ہے، کیونکہ کوئی دلیل مخصوص تعداد کے شرط ہونے پر قائم نہیں اور تمام نمازوں میں دو افراد سے جماعت صحیح ہو جاتی ہے اور دوسری نمازوں اور جمعہ کے درمیان اس بارے میں کوئی فرق نہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی نص ایسی نہیں آئی کہ جمعہ اتنے افراد سے ہی منعقد ہوتا ہے، شوکانی نے فرمایا کہ جمعہ میں اجتماع کا اعتبار کیا جائے گا اور اجتماع ایک شخص سے حاصل نہیں ہوتا، جہاں تک دو افراد کا تعلق ہے، تو ان میں سے ایک کے دوسرے کے ساتھ

شامل ہو جانے سے اجتماع حاصل ہو جاتا ہے اور شارع علیہ السلام نے دو افراد پر جماعت کا اطلاق فرمایا ہے، چنانچہ فرمایا کہ دو اور ان سے زیادہ جماعت ہے، جیسا کہ گزرا، اور تمام نمازیں دو افراد کے جمع ہونے سے منعقد ہو جاتی ہیں اور جمعہ بھی ایک نماز ہے، لہٰذا یہ کسی ایسے حکم کے ساتھ خاص نہیں ہوگی، جو دوسری نمازوں کے مخالف ہو، مگر جبکہ کوئی دلیل پائی جائے، اور جمعہ میں تعداد کے معتبر ہونے پر کوئی ایسی دلیل نہیں پائی جاتی، جو دوسری نمازوں سے زائد پر دلالت کرے اور عبدالحق نے فرمایا کہ جمعہ کی تعداد میں کوئی حدیث ثابت نہیں اور اسی طریقے سے سیوطی نے فرمایا کہ احادیث سے کسی مخصوص عدد کی تعیین میں کچھ ثابت نہیں۔ انتھٰی۔

اور جمعہ کی نماز قائم ہونے کے مقام میں بھی اہلِ علم کا اختلاف ہے۔

چنانچہ امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب نے فرمایا کہ جمعہ مصرِ جامع میں ہی صحیح ہے اور دوسرے تینوں ائمہ اس (نمازِ جمعہ) کے شہروں اور گاؤں دونوں میں جائز اور صحیح ہونے کی طرف گئے ہیں۔

اور امام ابوحنیفہ کے قول کے لیے اس روایت سے استدلال کیا گیا ہے، جو حضرت علی سے مرفوعاً مروی ہے کہ جمعہ اور تشریق مصرِ جامع میں ہی ہے، لیکن اس کے مرفوع ہونے کو امام احمد وغیرہ نے ضعیف قرار دیا ہے اور ابنِ حزم وغیرہ نے اس کے موقوف ہونے کو صحیح قرار دیا ہے، لیکن اس میں اجتہاد کی گنجائش ہے، پس اس سے دلیل پکڑنا مضبوط نہیں، چہ جائیکہ اس کے ذریعے سے آیت کے عموم کو خاص کیا جائے، یا اس کے اطلاق کو مقید کیا جائے، اسی کے ساتھ حنفیہ نے مصرِ جامع کی تعریف اور اس کے ضبط کرنے میں انتشار و اختلاف کیا ہے، جس میں بہت سے اقوال ہیں، جو ایک دوسرے کے مخالف و مقابل اور ایک دوسرے کے شدید

مناقض ہیں، جیسا کہ اس شخص پر مخفی نہیں، جو حنفیہ کی فروع کی کتب کا مطالعہ کرے اور یہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ ان کے نزدیک، مذکورہ حدیث کے معنیٰ متعین نہیں۔[1]

اور ہمارے نزدیک راجح قول وہ ہے، جس کی طرف ائمہ ثلاثہ گئے ہیں کہ شہر کا ہونا شرط نہیں اور گاؤں، دیہات میں بھی جمعہ کی نماز جائز ہے، آیت کے عموم اور اس کے مطلق ہونے کی وجہ سے اور ایسی دلیل کے نہ پائے جانے کی وجہ سے، جو اس کی تخصیص پر دلالت کرے، اور جو شخص اس حکم کو مصر جامع کے ساتھ مقید کرے اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ کتاب، یا سنتِ متواترہ، یا خبرِ مشہور سے، جو محدثین کی اصطلاح کے معنیٰ میں ہو، ایسی قطعی دلیل لائے، جو اس بات پر تخصیص کرے اور تنزلی کر کے کوئی خبرِ واحد لائے جو مرفوع ہو، صحیح ہو اور مصرِ جامع کی تخصیص پر دلالت کرے۔

اور جمعہ کے گاؤں، دیہات میں مشروع ہونے پر وہ حدیث بھی دلالت کرتی ہے جس کو بخاری وغیرہ نے ابنِ عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد کے بعد پہلا جمعہ جو پڑھا گیا، وہ جواثی میں عبدالقیس کی مسجد میں پڑھا گیا، جو کہ بحرین کے گاؤں میں سے ایک گاؤں ہے، ابوداؤد کی وکیع والی روایت میں اسی طرح سے ہے، اور اسی طرح سے اسماعیلی والی روایت میں ہے، جو کہ البکری وغیرہ کے اس قول سے اولیٰ ہے کہ جواثی شہر ہے، کیونکہ حدیث کے اندر جو چیز ثابت ہے، وہ زیادہ صحیح ہے، اور اس کا بھی احتمال ہے کہ پہلے وہ گاؤں ہو، پھر شہر بن گیا ہو، اور جوہری، زمخشری اور جزری نے جو یہ نقل کیا

---

[1] یہ بات اپنے مقام پر ذکر کی جا چکی ہے کہ حنفیہ کے اس سلسلے میں مختلف اقوال ہیں، بعض نے اس سلسلے میں فرمایا کہ یہ مختلف علاقوں اور زمانوں اور حالات کے اختلاف پر مبنی ہے، جبکہ بعض نے دینی احکام میں سستی اور غفلت کی وجہ سے تنزلی اختیار کی۔ واللہ تعالیٰ أعلم۔ محمد رضوان۔

ہے کہ جواثی بحرین میں ایک قلعہ کا نام ہے، تو یہ اس کے گاؤں ہونے کے منافی نہیں ہے، اور ظاہر یہ ہے کہ عبدالقیس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے ہی جمعہ پڑھا تھا، کیونکہ یہ بات معلوم ومشہور ہے کہ صحابۂ کرام کی عادت وحی نازل ہونے کے زمانے میں شرعی معاملات میں خود سے اقدام کرنے کی نہیں تھی، کیونکہ اگر ایسا ہوتا، تو یہ بات جائز نہ ہوتی کہ اس کے متعلق قرآن نازل ہو، جیسا کہ حضرت جابر اور ابو سعید نے عزل کے جواز پر استدلال کیا اور انہوں نے اس عمل کو اختیار کیا جبکہ قرآن نازل ہورہا تھا، اور کسی قوی، یا ضعیف روایت سے یہ بات ثابت نہیں کہ دوسرے اہلِ قریہ عبدالقیس سے پہلے اسلام لائے ہوں، اور جو شخص اس کا دعویٰ کرے، تو اس پر دلیل پیش کرنا لازم ہے اور حافظ ابن حجر نے حضرت ابنِ عباس کی مذکورہ حدیث کی شرح میں فرمایا کہ اس حدیث میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ گاؤں دیہات والوں میں عبدالقیس کا اسلام لانا، دوسروں کے مقابلے میں مقدم ہے اور واقعہ بھی اسی طرح سے ہے، جیسا کہ میں نے اس کو کتابُ الایمان کے آخر میں ثابت کیا ہے اور حافظ ابن حجر نے عبدالقیس کی حدیث کی شرح میں فرمایا کہ اس میں اس بات کی دلیل ہے کہ عبدالقیس کا اسلام مقدم ہے، مُضَر کے ان قبیلوں پر، جو ان کے اور مدینہ کے درمیان آباد تھے، اور عبد القیس کے گھر، بحرین میں اور ان کے قرب وجوار میں عراق کے اطراف میں واقع تھے، اور عبدالقیس کے اسلام کے مقدم ہونے کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ مصنِّف یعنی امام بخاری نے ابنِ عباس رضی اللہ عنہ سے جمعہ کے باب میں روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ سب سے پہلا جمعہ جو پڑھا گیا الـخ، اور عبد القیس نے جمعہ اس وقت پڑھا، جب ان کا وفد ان کی طرف لوٹ کر گیا، جو اس بات کی دلیل ہے کہ وہ تمام گاؤں والوں پر اسلام لانے میں مقدم ہیں۔ علامہ

ابنِ حجر کا کلام اختصار کے ساتھ ختم ہوا۔

اور اس کی ایک دلیل وہ بھی ہے، جس کو بیہقی نے **کتابُ المعرفة** میں روایت کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ منورہ کی طرف ہجرت فرماتے ہوئے بنی عمرو بن عوف سے سوار ہوئے، تو بنوسالم کے قریب سے گزرے جو کہ قباء اور مدینہ کے درمیان ایک گاؤں ہے، تو اس وقت جمعہ کی نماز کا وقت آ گیا، پھر آپ نے وہاں پر جمعہ کی نماز پڑھی، اور یہ سب سے پہلا جمعہ تھا، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آمد کے وقت پڑھا۔

اور اس کی ایک دلیل وہ بھی ہے جس کو ابنِ ابی شیبہ اور ابنِ حزم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے بحرین والوں کی طرف یہ لکھ کر بھیجا کہ تم جہاں بھی موجود ہو، وہاں جمعہ پڑھ لیا کرو، حافظ ابنِ حجر نے فرمایا کہ یہ حکم شہر اور گاؤں والوں کو شامل ہے۔

اور اس کی ایک دلیل وہ بھی ہے جس کو عبدالرزاق نے حضرت ابنِ عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ وہ پانی والوں کو مکہ اور مدینہ کے درمیان جمعہ پڑھتے ہوئے دیکھا کرتے تھے اور ان کو عیب نہیں لگایا کرتے تھے، اور ابنِ حزم نے ان الفاظ میں روایت کیا ہے کہ ان کو منع نہیں فرماتے تھے۔

اور بیہقی نے ولید بن مسلم کی سند سے روایت کیا ہے کہ میں نے لیث بن سعد سے سوال کیا، تو انہوں نے فرمایا کہ ہر شہر، یا گاؤں، جس میں جماعت ہو، ان کو جمعہ کا حکم دیا جائے گا، کیونکہ شہر اور اس کے اردگرد والے حضرت عمر اور عثمان رضی اللہ عنہما کے زمانے میں ان کے حکم سے جمعہ پڑھا کرتے تھے اور ان میں کئی صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم بھی موجود ہوتے تھے (مرعاۃ)

کسی کا اہلِ حدیث مسلک والوں کے مسائل سے اختلاف کرنا اپنی جگہ، لیکن اصل مقصود یہ

ہے کہ اس سلسلے میں ان کا موقف ونظریہ سامنے آ جائے، کیونکہ اس مسلک سے وابستہ ایک مخصوص ومحدود طبقہ بھی ہندوستان و پاکستان وغیرہ میں آباد ہے، جہاں ان کی مساجد ومدارس بھی ایک حد تک موجود ہیں، اور ان سے گاؤں، دیہات میں جمعہ کی نماز کے قیام کے مسئلے میں فقہ حنفی سے وابستہ علماء وعوام کا سابقہ پڑتا رہتا ہے، اور بہت سے گاؤں، دیہات میں ان کی طرف سے جمعہ کی نماز قائم وجاری رکھنے اور حنفیہ کی طرف سے منع اور بند کرنے کا سلسلہ جاری رہتا ہے، جو بسا اوقات شدت اختیار کر لیتا ہے، اور ایسی صورت میں حقیقت ناشناس عوام، فقہ حنفی سے وابستہ علماء وعوام کو جمعہ کا ہی منکر ٹھہرا بیٹھتے ہیں، اور طرح طرح سے ان کی مخالفت پر اُتر آتے ہیں، جو پھر مختلف قسم کے دوسرے تنازعات کا بھی ذریعہ بنتا ہے۔

فتاویٰ رضویہ کا حوالہ

جناب احمد رضا خان بریلوی صاحب نے فقہ حنفی کی اتباع میں عام دیہات اور گاؤں میں جمعہ کی نماز کے ناجائز ہونے پر مفصل کلام کیا ہے، اور اس موضوع پر مختلف فتاویٰ جات وتحریرات جاری کی ہیں، جو حنفیہ کے مشہور مذہب کے مطابق ہیں، لیکن انہوں نے اپنے فتاویٰ اور تحریرات میں کچھ مقامات پر عام دیہات وگاؤں میں عوام کے جمعہ پڑھنے کی صورت میں اُن کو منع نہ کرنے اور ایک روایت پر صحت کو ان کے لیے کافی ہونے کی وضاحت کی ہے۔

اس طرح کے چند اقتباسات ذیل میں ذکر کیے جاتے ہیں۔

ایک فتوے کے ضمن میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

> جمعہ وعیدین، دیہات میں ناجائز ہیں، اور ان کا پڑھنا گناہ، مگر جاہل عوام اگر پڑھتے ہوں، تو ان کو منع کرنے کی ضرورت نہیں کہ عوام، جس طرح اللہ ورسول کا نام لے لیں، غنیمت (فتاویٰ رضویہ، ج۸ ص۳۸۷، مسئلہ نمبر ۱۳۳۱، کتاب الصلاۃ، باب الجمعۃ،

مطبوعہ: رضا فاؤنڈیشن، جامعہ نظامیہ رضویہ، لاہور، اشاعت:1995ء)

اس فتوے میں، فقہ حنفی کے مطابق دیہات میں جمعہ وعیدین کو ناجائز، اوران کے پڑھنے کو گناہ قرار دینے کے باوجود، جاہل عوام کو منع کرنے کی ضرورت نہ ہونے کا حکم لگایا گیا ہے، اوراس کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ عوام، جس طرح اللہ اوراس کے رسول کا نام لیں، وہ غنیمت ہے۔

اور یہ بات ظاہر ہے کہ جب جمعہ کی نماز، باجماعت اور خطبہ کے ساتھ پڑھی جاتی ہے، تو امامت وخطابت کا فریضہ انجام دینے والا شخص کسی نہ کسی درجے میں علماء وغیرہ کے قبیل سے ہی ہوتا ہے، وہ بھی اس فتوے کا یقیناً مصداق ہوگا۔

فتاویٰ رضویہ کا دوسرا حوالہ

ایک اورفتوے کے ضمن میں حنفیہ کے نزدیک، گاؤں میں جمعہ کی نماز کے ناجائز ہونے کا حکم بیان کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں کہ:

دربارہ عوام، فقیر کا طریقِ عمل یہ ہے کہ ابتداءً خود انہیں منع نہیں کرتا، نہ انہیں نماز سے باز رکھنے کی کوشش پسند رکھتا ہے، ایک روایت پر صحت ان کے لیے بس ہے، وہ جس طرح خدا اور رسول کا نامِ پاک لیں، غنیمت ہے، مشاہدہ ہے کہ اس سے روکیے، تو وہ وقتی چھوڑ بیٹھتے ہیں، اللہ عزوجل فرماتا ہے:

"ارأیت الذی ینھیٰ. عبداً اذا صلّٰی"

"کیا تم نے اسے نہیں دیکھا، جو منع کرتا ہے بندے کو، جب وہ نماز ادا کرتا ہے"

(فتاویٰ رضویہ، ج۸ص۴۷۲، مسئلہ نمبر۱۳۲۵ تا۱۳۲۶، کتاب الصلاۃ، باب الجمعۃ، مطبوعہ: رضا فاؤنڈیشن، جامعہ نظامیہ رضویہ، لاہور، اشاعت:1995ء)

اس فتوے میں عوام کو دیہات میں جمعہ کی نماز پڑھنے سے خود منع نہ کرنے، اورعوام کو دیہات

میں نمازِ جمعہ سے باز رکھنے کی کوشش نہ کرنے کے طرزِ عمل کو پسند کیا گیا ہے، اور اس کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ کسی ایک روایت کے مطابق جمعہ کا صحیح ہونا، عوام کے لیے کافی ہے، اور وہ جس طرح بھی اللہ اور اس کے رسول کا نام لیں، وہ غنیمت ہے، اور مشاہدہ یہ ہے کہ عوام کو روکنے سے وہ اس وقت کی عبادت کو بھی چھوڑ بیٹھتے ہیں، یعنی وہ نہ جمعہ پڑھتے ہیں، نہ ظہر پڑھتے ہیں۔

اور ہم پیچھے اسی قسم کی توجیہات بیان کر کے ذکر کر آئے ہیں کہ حنفیہ کے جس قول کے مطابق، بلکہ ائمۂ اربعہ میں سے، جس کے مذہب کے مطابق بھی نمازِ جمعہ درست و جائز ہو، اس سے منع نہ کرنا چاہیے۔

فتاویٰ رضویہ کا تیسرا حوالہ

ایک اور فتوے میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

مذہبِ حنفی میں وہاں جمعہ وعیدین نہیں، پھر بھی جبکہ مدت سے قائم ہے، اسے اکھاڑا نہ جائے گا، نہ لوگوں کو اس سے روکے گا، مگر شہرت طلب۔

قال اللّٰہ تعالٰی:

”ارأیت الذی ینھٰی. عبداً اذا صلّٰی“

اللہ تعالٰی نے فرمایا کہ:

”بھلا دیکھو تو، جو منع کرتا ہے بندے کو، جب وہ نماز پڑھے“

(فتاویٰ رضویہ، ج۸ص۴۴۳، مسئلہ نمبر۱۳۶۲، کتاب الصلاۃ، باب الجمعۃ، مطبوعہ: رضا فاؤنڈیشن، جامعہ نظامیہ رضویہ، لاہور، اشاعت: 1995ء)

مذکورہ فتوے میں عام دیہات اور گاؤں میں جہاں مذہبِ حنفی کے مطابق جمعہ وعیدین کی نماز کا حکم نہیں ہے، لیکن وہاں مدت سے جمعہ کی نماز قائم ہے، اسے اکھاڑنے اور بند کرنے سے

منع کیا گیا ہے، اوراس سے روکنے والے کوشہرت طلب قرار دیا گیا ہے، اوراس کی دلیل میں اسی آیت کوپیش کیا گیا ہے، جو پہلے فتاویٰ میں پیش کی گئی۔

اور جن گاؤں، دیہات میں عرصے سے جمعہ وعیدین کی نماز قائم ہو، اس کو بند کرنے میں جو مفاسد لازم آتے ہیں، ان کا پہلے مولانا مفتی کفایتُ اللہ صاحب دہلوی رحمہ اللہ کے فتاویٰ کے ضمن میں تذکرہ گزر چکا ہے۔

مذکورہ فتوے میں ایک مدت سے جس مقام پر جمعہ وعیدین کی نماز قائم ہو، اور مذہبِ حنفی میں وہاں جمعہ وعیدین کی نماز جائز نہ ہو، وہاں جمعہ وعیدین کی نماز سے روکنے والے کو صاف طور پر جوشہرت طلب قرار دیا گیا ہے، کسی دوسرے کا اس سے اتفاق ضروری نہیں، لیکن یہ ایک مشہور عالم کا نقطۂ نظر ہے، جو نقل کر دیا گیا ہے۔

فتاویٰ رضویہ کا چوتھا حوالہ

ایک اورفتوے میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

> دیہات میں نمازِ جمعہ وعیدین، مذہبِ حنفی میں جائز نہیں، مگر جہاں ہوتا ہے، اسے بند کرنا جاہل کا کام ہے۔
>
> **قال اللّٰہ تعالٰی:**
>
> **"ارأیت الذی ینھٰی. عبداً اذا صلّٰی"**
>
> اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:
>
> "کیا آپ نے اس شخص کونہیں دیکھا، جو نماز پڑھنے سے روکتا ہے"
>
> اور جوانہیں کافر کہتا ہے، گمراہ وبددین ہے، نہ وہ کبیرہ ہے **"لاختلاف الائمة"** (ائمہ کے درمیان اختلاف کی وجہ سے) نہ کبیرہ پر اصرار، اہلِ سنت کے نزدیک کفر۔ **واللہ تعالیٰ اعلم۔**

(فتاویٰ رضویہ، ج۸ص۴۵۶، مسئلہ نمبر۱۳۸۴، کتاب الصلاۃ، باب الجمعۃ، مطبوعہ: رضا فاؤنڈیشن، جامعہ نظامیہ رضویہ، لاہور، اشاعت:1995ء)

مذکورہ فتوے میں، جس دیہات میں مذہبِ حنفی کے مطابق جمعہ کی نماز جائز نہیں، مگر وہاں ہوتی ہے، اسے بند کرنے کو جاہل کا کام قرار دیا گیا ہے، اور ایسے مقامات پر جمعہ کی نماز پڑھنے والوں کو کافر، بلکہ کبیرہ گناہ کے مرتکب ہونے کی بھی نفی کی گئی ہے، اور اس کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ اس میں ائمہ کا اختلاف ہے۔

اور ہم اس سلسلے میں ائمۂ اربعہ کے موقف کو باحوالہ ذکر کر چکے ہیں، لہٰذا جس گاؤں، دیہات میں ائمۂ اربعہ میں سے کسی کے مذہب کے مطابق، جمعہ کی نماز جائز اور درست ہو، اور وہاں جمعہ کی نماز جاری ہو چکی ہو، مذکورہ فتوے کے مطابق، اس فعل کے مرتکب افراد، کبیرہ گناہ کا ارتکاب کرنے والے شمار نہیں ہوں گے۔

اور ''احتیاطُ الظھر کا حکم'' بھی پہلے گزر چکا ہے، مزید ذکر آگے آتا ہے۔

یہ بھی ملحوظ رہے کہ حنفی فقہ سے منسلک و منتسب کسی شخص کا، دلیل، یا ضرورت کی وجہ سے، امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے اختلاف کرنا، مذموم نہیں ہے، جس کی باحوالہ تفصیل اسی فصل میں ''کفایتُ المفتی'' کے پہلے حوالے کے ضمن میں گزر چکی ہے۔

اور بریلوی مکتبۂ فکر کے مشہور عالمِ دین، علامہ غلام رسول سعیدی صاحب (سابق شیخ الحدیث، دارُالعلوم نعیمیہ، کراچی) تحریر فرماتے ہیں کہ:

> جن مواضع میں، میں نے امام اعظم کے قول، یا دوسرے علمائے احناف سے اختلاف کیا ہے، اس کی وجہ نظریۂ ضرورت ہے، اور ہمارے فقہائے احناف نے ضرورت کی بناء پر دوسرے ائمہ کے قول پر فتویٰ دینے کو جائز قرار دیا ہے۔
>
> یا اس کی وجہ اتباعِ حدیث ہے(......پھر آگے چل کر تحریر فرماتے ہیں کہ......)
>
> بہت سے مسائل میں ہمارے فقہاء نے امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی رائے سے

اختلاف کیا ہے۔

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا ہمارے مسلّم عالم ہیں، انہوں نے کئی مسائل میں امام اعظم کے قول کے برخلاف کہا ہے (شرح صحیح مسلم، جلد اول، ص۴۰، و۴۲، بلفظہٖ تقدیم، ناشر: فرید بک سٹال، اردو بازار، لاہور، الطبع العاشر: صفر ۱۴۲۴ ہجری/ اپریل 2003 عیسوی)

ہم نے ماقبل میں بحمد اللہ تعالیٰ، حنفیہ، شافعیہ، مالکیہ اور حنابلہ کے علاوہ اہلِ دیوبند، اہلِ بریلوی اور اہلِ حدیث حضرات، اور ان کے ساتھ ساتھ عرب علماء کی اس سلسلے میں تصریحات ذکر کردی ہیں، جن کی روشنی میں تمام مکتبۂ فکر کے حضرات کے لیے اس مجتہَد فیہ مسئلے میں غور وفکر اور رہنمائی کا سامان موجود ہے۔

’’احتیاطُ الظہر‘‘ کا حکم

پہلے گزر چکا ہے کہ جس جگہ جمعہ کی نماز کے بارے میں مجتہدین کا اختلاف ہو، یا وہاں جمعہ کی نماز میں شک ہو، وہاں اختلاف سے خروج کے لیے جمعہ کی نماز کے بعد چار رکعات اس دن کے ظہر کی نیت سے پڑھ لینے میں احتیاط ہے، پھر اگر جمعہ کی نماز صحیح ادا ہوگئی، تو وہ چار رکعات نفل ہوجائیں گی، اور اگر بالفرض ایسا نہ ہو، تو وہ فرضوں کی طرف سے کفایت کرجائیں گی۔

فقہائے حنفیہ نے بھی اس کی تصریح فرمائی ہے۔ [1]

بلکہ علامہ ابنِ عابدین شامی رحمہ اللہ نے یہ بھی تصریح فرمائی ہے کہ اگر کسی گاؤں میں امام

---

[1] ثم فی کل موضع وقع الشک فی کونه مصر أو أقام أهل ذلک الموضع الجمعة بشرائطها، فینبغی لأهل ذلک الموضع أن یصلوا بعد الجمعة أربع رکعات وینوون بها الظهر احتیاطا، حتی أنه لو لم تقع الجمعة موقعها یخرجون عن عهدة فرض الوقت بأداء الظهر بیقین(المحیط البرهانی فی الفقه النعمانی، ج۲، ص۶۶، کتاب الصلاة، الفصل الخامس و العشرون فی صلاة الجمعة)

وإذا اشتبه علی الإنسان ذلک ینبغی أن یصلی أربعا بعد الجمعة ینوی بها آخر فرض أدرکت وقته ولم أؤده بعد، فإن لم تصح الجمعة وقعت ظهره وإن صحت کانت نفلا، وهل تنوب عن سنة الجمعة؟ قدمنا الکلام فی باب شروط الصلاة فارجع إلیه.

وکذا إذا تعددت الجمعة وشک فی أن جمعته سابقة أو لا ینبغی أن یصلی ما قلنا(فتح القدیر، لابن الهمام، ج۲، ص۵۳، کتاب الصلاة، باب صلاة الجمعة)

شافعی رحمہ اللہ کے مذہب کے مطابق، جمعہ کی نماز قائم ہو، تو اس میں شریک ہو جانا چاہیے، اور پھر ''احتیاطُ الظھر'' پڑھ لینی چاہیے۔ [1]

[1] لو حضر رجل فی قریة تقام بها الجمعة علی مذهب الشافعی یحضر معهم لئلا یظن به السوء لاعتقادهم فرضیتها أو جهلهم بحکم مذهبه وینوی صلاة الإمام ویصلی الظهر أیضا قبلها أو بعدها..........والاحتیاط فی القری أن یصلی السنة أربعا، ثم الجمعة، ثم ینوی أربعا سنة الجمعة، ثم یصلی الظهر، ثم رکعتین سنة الوقت فهذا هو الصحیح المختار اهـ .ملخصا ونقل العبارة بتمامها فی الفتاوی الخیریة فراجعها (منحة الخالق علی البحر الرائق، ج ۲، ص ۱۵۳، کتاب الصلاة، باب صلاة الجمعة)

هو مبنی علی أن ذلک الاحتیاط أی الخروج عن العهدة بیقین لتصریحه بأن العلة اختلاف العلماء فی جوازها(منحة الخالق علی البحر الرائق، ج ۲، ص ۱۵۴، کتاب الصلاة ،باب صلاة الجمعة)

وإذا وقع الشک فی صحة أداء الجمعة لفقد بعض الشرائط، ینبغی أن یصلی بعد الجمعة أربع رکعات احتیاطا، ولو بالحرمین الشریفین، وینوی ظهر یومه، أو آخر ظهر علیه۔ وهو أحسن۔ لأنه إن لم تجزیء الجمعة فعلیه الظهر، وإن أجزأت کانت الأربع عن ظهر علیه إن کان علیه، وإلا فیقع نفلا .والأحوط أن یقول :نویت آخر ظهر أدرکت وقته ولم أصله بعد .لأن ظهر یومه إنما یجب علیه بآخر الوقت ، ولأنه یفید الترتیب أیضا .والأصح أن یقرأ بالفاتحة والسورة فی أربع احتیاطا لاحتمال أن یکون نفلا .وکذا من یقضی الصلوات احتیاطا(شرح النقایة، ج ۱، ص ۴۰۴، کتاب الصلاة ،باب فی صلاة الجمعة،شروط اداء الجمعة ، الناشر: الشرکة دارالارقم بن ابی الارقم، بیروت، لبنان، الطبعة الاولٰی: ۱۴۱۸ھـ، ۱۹۹۷م)

ثم کل موضع وقع الشک فی جواز الجمعة بتفویت شرطها ینبغی أن یصلی أربع رکعات وینوی بها الظهر لیخرجوا عن فرض الوقت بیقین لو لم تقع الجمعة موقعها کما فی الکافی۔

وفی القنیة عن بعض المشایخ لما ابتلی أهل مرو بإقامة جمعتین مع اختلاف العلماء فی جوازها أمرهم أئمتهم بأداء الأربع بعد الظهر حتما احتیاطا ثم اختلفوا فی نیتها فالأحسن والأحوط أن یقول: اللهم إنی أرید آخر ظهر أدرکت وقته ولم أصله بعد لأن ظهر یومه إنما یجب علیه بآخر الوقت کما فی المطلب(مجمع الأنهر فی شرح ملتقی الأبحر، ج ۱، ص ۱۶۷، ۱۶۸، کتاب الصلاة، باب صلاة الجمعة)

ثم فی کل موضع وقع الشک فی جواز الجمعة لوقوع الشک فی المصر أو غیره وأقام أهله الجمعة ینبغی أن یصلوا بعد الجمعة أربع رکعات وینووا بها الظهر حتی لو لم تقع الجمعة موقعها یخرج عن عهدة فرض الوقت بیقین، کذا فی الکافی، وهکذا فی المحیط ثم اختلفوا فی نیتها قیل : ینوی آخر ظهر علیه وهو الأحسن والأحوط أن یقول :نویت آخر ظهر أدرکت وقته ولم أصله بعد، کذا فی القنیة(الفتاوی الهندیة، ج ۱، ص ۱۴۵، کتاب الصلاة ،الباب السادس عشر فی صلاة الجمعة)

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

البتہ بعض حضرات نے اس حکم کو عوام میں فتنہ وفساد لازم آنے کی صورت میں خواص تک محدود رہنے کا حکم لگایا ہے، جس کے بعد بعض اردو فتاویٰ میں ''احتیاطُ الظهر'' سے بہر حال منع کر دیا گیا، اور اس طرح اس کے تجویز ہونے کی علت سے توجہ ہٹ گئی۔ [1]

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

قالوا فی کل موضع وقع الشک فی جواز الجمعة ینبغی أن یصلی أربع رکعات بنیة آخر ظهر أدرکت وقته ولم یسقط عنی بعد حتی إن صحت الجمعة وکان علیه ظهر یسقط عنه وإلا فنفل ، والأولی أن یصلی بعد الجمعة سنتها ثم الأربع بهذه النیة ثم رکعتین بنیة سنة الوقت فإن صحت الجمعة یکون قد أدی سنتها علی وجهها وإلا فقد صلی الظهر مع سنته(حلبی صغیر–مختصر غنیة المتملی فی شرح منیة المصلی – لابراهیم الحلبی،ص ۲۴۵، فصل فی صلاة الجمعة)

وسن صلاة الظهر احتیاطا، فالاحتیاط لمن صلی ببلد تعددت فیه الجمعة لحاجة، ولم یعلم سبق جمعته :أن یعیدها ظهرا، خروجا من خلاف من منع التعدد، ولو لحاجة .وینوی آخر ظهر بعد صلاة الجمعة أو ینوی الظهر احتیاطا، خروجا عن عهدة فرض الوقت بأداء الظهر(الفقه الاسلامی وادلتهٔ للزحیلی، ج۲ص ۱۳۰۰، القسم الاول، الباب الثانی، الفصل العاشر، المبحث الثانی ،المطلب الخامس۔ شروط صحة الجمعة)

[1] قلت: علی أنه لو سلم ضعفه فالخروج عن خلافه أولی فکیف مع خلاف هؤلاء الأئمة، وفی الحدیث المتفق علیه فمن اتقی الشبهات استبرأ لدینه وعرضه ولذا قال بعضهم فیمن یقضی صلاة عمره مع أنه لم یفته منها شیء لا یکره لأنه أخذ بالاحتیاط .وذکر فی القنیة أنه أحسن إن کان فی صلاته خلاف المجتهدین ویکفینا خلاف من مر ونقل المقدسی عن المحیط: کل موضع وقع الشک فی کونه مصرا ینبغی لهم أن یصلوا بعد الجمعة أربعا بنیة الظهر احتیاطا حتی إنه لو لم تقع الجمعة موقعها یخرجون عن عهدة فرض الوقت بأداء الظهر، ومثله فی الکافی وفی القنیة لما ابتلی أهل مرو بإقامة الجمعتین فیها مع اختلاف العلماء فی جوازهما أمر أئمتهم بالأربع بعدها حتما احتیاطا .اهـ .ونقله کثیر من شراح الهدایة وغیرها وتداولوه وفی الظهیریة: وأکثر مشایخ بخاری علیه لیخرج عن العهدة بیقین .ثم نقل المقدسی عن الفتح أنه ینبغی أن یصلی أربعا ینوی بها آخر فرض أدرکت وقته ولم أؤده إن تردد فی کونه مصرا أو تعددت الجمعة، وذکر مثله عن المحقق ابن جرباش.

قال ثم قال: وفائدته الخروج عن الخلاف المتوهم أو المحقق وإن کان الصحیح صحة التعداد فهی نفع بلا ضرر ثم ذکر ما یوهم عدم فعلها ودفعه بأحسن وجه .وذکر فی النهر أنه لا ینبغی التردد فی ندبها علی القول بجواز التعدد خروجا عن الخلاف اهـ وفی شرح الباقانی هو الصحیح .وبالجملة فقد ثبت أنه ینبغی الإتیان بهذه الأربع بعد الجمعة، لکن بقی الکلام فی تحقیق أنه واجب أو مندوب.

قال المقدسی: ذکر ابن الشحنة عن جده التصریح بالندب، وبحث فیه بأنه ینبغی أن یکون عند

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

احتیاطُ الظھر کا حکم، اختلاف سے بچنے کے مستحب ہونے کے اصول پر مبنی ہے، جس کی فقہائے کرام نے تصریح فرمائی ہے۔

چنانچہ علامہ ابنِ نجیم ''البحرُ الرائق'' میں فرماتے ہیں:

والخروج من الخلاف مستحب عندنا (البحر الرائق شرح کنز الدقائق، ج ۱، ص ۵۲، کتاب الطهارة، فرائض الغسل)

ترجمہ: اور اختلاف سے خروج، ہمارے نزدیک مستحب ہے (البحرالرائق)

علامہ حموی حنفی ''الاشباہ و النظائر'' کی شرح میں فرماتے ہیں:

قد نصوا على أن الخروج من الخلاف مندوب إليه (غمز عيون البصائر في شرح الأشباه والنظائر، ج ۲، ص ۶۳، الفن الثانى من الأشباه والنظائر وهو فن الفوائد، كتاب الزكاة)

ترجمہ: فقہاء نے اس بات کی صراحت فرمائی ہے کہ اختلاف سے خروج، مندوب و مستحب ہے (غمز)

ملا علی قاری حنفی فرماتے ہیں:

يستحب في مذهبنا الخروج من الخلاف فإنه احتياط في الدين

(مرقاة المفاتيح، ج ۲، ص ۴۱۱، كتاب الطهارة، باب سنن الوضوء)

﴿ گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ ﴾

مجرد التوهم، أما عند قيام الشك والاشتباه في صحة الجمعة فالظاهر الوجوب، ونقل من شيخه ابن الهمام ما يفيده وبه يعلم أنها هل تجزى عن السنة أم لا؟ فعند قيام الشك لا وعند عدمه نعم، ويؤيد التفصيل تعبير التمرتاشي ب لا بد وكلام القنية المذكور اهـ وتمام تحقيق المقام في رسالة المقدسي وقد ذكر شذرة منها في إمداد الفتاح، وإنما أطلنا في ذلك لدفع ما يوهمه كلام الشارح تبعا للبحر من عدم فعلها مطلقا.

نعم إن أدى إلى مفسدة لا تفعل جهارا والكلام عند عدمها ولذا قال المقدسي نحن لا نأمر بذلك أمثال هذه العوام بل ندل عليه الخواص ولو بالنسبة إليهم اهـ والله تعالى أعلم (ردالمحتار، ج ۲ ص ۱۴۵، ۱۴۶، كتاب الصلاة، باب الجمعة)

ترجمہ: ہمارے مذہب میں اختلاف سے خروج مستحب ہے، کیونکہ اس میں دین کی احتیاط پائی جاتی ہے (مرقاۃ)

ملا علی قاری حنفی ایک اور موقع پر فرماتے ہیں:

واختلفوا فی حد المصر اختلافا کثیرا قلما یتفق وقوعه فی بلد، ولذا قالوا :فی کل موضع وقع الشک فی جواز الجمعة، ینبغی أن یصلی أربعا بعد الجمعة ینوی بها آخر فرض أدرکت وقته، ولم أؤده بعد، فإن لم تصح الجمعة وقعت ظهرا، وإن صحت وکان علیه ظهر یسقط عنه، وإلا فنفل.......

الأوصاف تختلف باختلاف الأوقات، وأیضا من جملة حد المصر -علی ما صححه صاحب الهدایة -أنه الموضع الذی له أمیر وقاض ینفذ الأحکام، ویقیم الحدود.

ولا شک، ولا ریب أن القاضی المنفذ للأحکام عزیز، بل معدوم من بین الأنام ;لأن غالب القضاة یأخذون القضاء بالدراهم، واختلف فی صحة تقلده، ثم غالبهم یأخذون الرشا، واختلف فی انعزالهم مع الاتفاق علی استحقاق انعزالهم، ثم أکثرهم ما ینفذون الأحکام إما لجهلهم أو لعدم التفاتهم، ووجود فسقهم.

ولو فرض فرد منهم متصف بأوصاف القضاء ، وأرادوا إجراء الأحکام علی وفق نظام الإسلام منعهم الأمراء والحکام، والاحتیاط فی الدین من شیم المتقین (مرقاة المفاتیح شرح مشکاة المصابیح، ج۳،ص ۱۰۵۰ ، کتاب الصلاة ،باب الخطبة والصلاة)

ترجمہ: اور حنفیہ کا شہر کی تعریف میں بہت زیادہ اختلاف ہے، جس کے کسی شہر میں وقوع کا اتفاق کم ہی ہوتا ہے، اور اسی وجہ سے انہوں نے فرمایا کہ ہر وہ موضع کہ اس

میں جمعہ کے جائز ہونے میں شک واقع ہو جائے، تو مناسب یہ ہے کہ جمعہ کے بعد چار رکعت پڑھ لے، جس سے دوسرے فرض کی نیت کر لے، جس کا وقت اس نے پایا ہے، اور ابھی تک اس نے، اس کو ادا نہیں کیا، پس اگر جمعہ صحیح نہیں ہوا، تو یہ نماز، ظہر بن جائے گی، اور اگر جمعہ صحیح ہو گیا، اور اس کے ذمے کوئی ظہر کی نماز تھی، تو وہ اس سے ساقط ہو جائے گی، ورنہ تو یہ نماز، نفل بن جائے گی۔......

اوصاف، اوقات کے اختلاف سے مختلف ہو جاتے ہیں، اور نیز شہر کی تعریف میں سے اس تعریف کے مطابق، جس کو صاحبِ ہدایہ نے صحیح قرار دیا ہے کہ وہ ایسا مقام ہے، جس میں امیر اور قاضی ہو، جو احکام کو نافذ کرتا ہو، اور حدود کو قائم کرتا ہو۔

لیکن اس بات میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں کہ احکام کو نافذ کرنے والا قاضی، موجودہ دور میں مشکل ہے، بلکہ مخلوق میں معدوم ہے، کیونکہ اکثر قاضی، قضاء کے عہدے کو مال کے عوض میں حاصل کرتے ہیں، اور اس کے قاضی ہونے کی صحت میں بھی اختلاف ہے، پھر ان کے اکثر قاضی، رشوت لیتے ہیں، اور ان کے معزول کرنے کے مستحق ہونے کے اوپر اتفاق کے باوجود، ان کے معزول ہونے میں اختلاف ہے، پھر ان میں سے بھی اکثر احکام کی تنفیذ نہیں کرتے، یا تو اپنی جہالت کی وجہ سے، یا ان کے اس کو اہمیت نہ دینے کی وجہ سے، اور ان کے فاسق ہونے کی وجہ سے۔

اور اگر اس بات کو فرض بھی کر لیا جائے کہ قاضیوں میں سے کوئی فرد، قضاء کے اوصاف کے ساتھ متصف ہے، اور وہ نظامِ اسلام کے مطابق، احکام جاری کرنا چاہیں، تب بھی ان کو امراء اور حکام، اس سے منع کرتے ہیں، اور دین کے اندر احتیاط، متقیوں کا شیوہ ہے (مرقاۃُ المفاتیح)

حضرت مولانا مفتی محمد کفایتُ اللہ صاحب دہلوی رحمہ اللہ کے حوالے سے، اسی بات کا ذکر

پہلے گزر چکا ہے، اور ملا علی قاری رحمہ اللہ نے مذکورہ عبارت میں، جو اپنے دور کی حالت کا نقشہ کھینچا ہے، موجودہ دور کی حالت اس سے کم تر نہیں ہے۔

علامہ سید احمد طحطاوی ''الدرُّالمختار'' کی شرح میں فرماتے ہیں:

(قوله لكن بشرط) استدراک على ما فهم من الكلام من ان الامام يراعى مذهب من يقتدىٰ به سواء كان فى هذه المسئلة او فى غيرها و الا فالمراعاة فى المذكور هنا ليس فيها ارتكاب مكروه مذهبه، اهـ حلبى.

(قوله عدم لزوم ارتكاب مكروه، مذهبه) قال فى النهر إلا أن مراتبه تختلف بحسب قوة دليل المخالف وضعفه اه. و هل المراد ما يعم الكراهتين، او التحريمية فقط لان المكروه ذا اطلق ينصرف الى ما كراهته تحريمية يحرر.

و الظاهر ان محل ذلک عند عدم ارادة التقليد كما تقدم (حاشية الطحطاوى على الدر المختار، ج ۱، ص ۸۵، كتاب الطهارة، للعلامة السيد احمد الطحطاوى، مطبوعة: المكتبة العربية، كانسى روڈ، كوئٹه)

ترجمہ: ماتن کا یہ قول کہ ''اس شرط کے ساتھ، الخ'' یہ استدراک اس پر ہے، جو کلام سے سمجھا جاتا ہے کہ امام اپنے مقتدیوں کے مذہب کی رعایت کرے گا، خواہ اس مسئلہ میں ہو، یا دوسرے مسئلہ میں، ورنہ یہاں جو مسئلہ ذکر کیا گیا، اس میں اپنے مذہب کے مکروہ کا ارتکاب نہیں پایا جاتا، حلبی میں اسی طرح ہے۔

اور ماتن کا یہ قول کہ ''اپنے مذہب کے مکروہ کا ارتکاب لازم نہ آئے'' نہر میں فرمایا کہ اس کے مراتب، مخالف کی دلیل کے قوی اور ضعیف ہونے کی حیثیت سے مختلف ہوتے ہیں۔

اور کیا اس سے دونوں کراہتوں (یعنی مکروہ تحریمی وتنزیہی) کا عموم مراد ہے، یا

صرف مکروہ تحریمی مراد ہے، کیونکہ مکروہ جب مطلقاً بولا جاتا ہے، تو کراہتِ تحریمی
کی طرف لوٹتا ہے، اس پر غور کرلینا چاہیے۔
اور ظاہر یہ ہے کہ یہ (یعنی مذکورہ حکم) اس صورت میں ہے، جبکہ تقلید کا ارادہ نہ
کرے، جیسا کہ پہلے گزرا (حاشیة الطحطاوی)

علامہ طحطاوی رحمہ اللہ کی مذکورہ عبارت سے معلوم ہوا کہ اپنے مذہب کے مکروہ کا ارتکاب لازم نہ آنے کی شرط میں، کراہتِ تحریمی اور کراہتِ تنزیہی دونوں مراد ہونے، یا صرف کراہتِ تحریمی مراد ہونے، دونوں کا احتمال پایا جاتا ہے، لیکن جب فقہاء نے تحریمی، یا تنزیہی کی تصریح نہیں کی، تو حنفیہ کے مشہور قول کے مطابق کراہتِ تحریمی مراد ہونی چاہیے، اسی کی طرف علامہ طحطاوی کا رجحان ہے، لیکن ان کو اس پر شرح صدر نہیں، اس لیے انہوں نے غور کرنے کا مشورہ تحریر کردیا ہے۔

ہمیں غور کرنے سے اس طرف رجحان ہوا کہ تمام اختلافی مسائل میں اختلاف کی رعایت کا حکم یکساں نہیں، فقہائے کرام نے اختلاف کی مختلف صورتیں بیان فرمائی ہیں، اس لیے اختلاف کو ان اصولوں کی روشنی میں دیکھ کر ہی مراعاتِ اختلاف کے مستحب ہونے نہ ہونے پر غور کیا جائے گا، یعنی یہ دیکھا جائے گا کہ کراہتِ تنزیہی، یا تحریمی کے مقابلہ میں دوسرا قول کس درجہ کا ہے، آیا اس کے مقابل درجہ فرض کا ہے، یا واجب وغیرہ کا؟

اور جب ایک طرف مباح، یا کراہتِ تنزیہی ہو، اور دوسری طرف فرض، یا واجب، تو اس کو اختیار کرنے میں احتیاط زیادہ ہوتی ہے، بلکہ علامہ ابنِ ہمام کی آگے آنی والی تصریح کے مطابق تو کراہتِ تحریمی اور رکن کے درمیان اختلاف کی صورت میں اس عمل کو کرلینے میں احتیاط ہوتی ہے۔

اور مذکورہ عبارت میں بعد میں جو علامہ طحطاوی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ ''ظاہر یہ ہے کہ یہ (یعنی مذکورہ حکم) اس صورت میں ہے، جبکہ تقلید کا ارادہ نہ کرے'' اس کا مطلب یہ ہے کہ اختلاف

سے خروج کے مندوب ہونے کا حکم، اس صورت میں ہے، جبکہ عمل کرنے والا دوسرے قول کے قائل کی تقلید کا ارادہ نہ کرے، اور اگر وہ دوسرے قول کے قائل کی تقلید کا ارادہ کرے، تو پھر اس کی تقلید کے نتیجہ میں، اس عمل کا وہی درجہ ہوگا، جو اس قول کے قائل کے نزدیک درجہ ہے، یعنی اگر اس کے نزدیک فرض، یا مباح ہے، تو تقلید کی وجہ سے یہ بھی فرض، یا مباح سمجھ کر عمل کرے گا۔

لہٰذا جب کسی گاؤں، دیہات میں، جمعہ کی نماز غیر حنفیہ میں سے کسی امام کی تقلید کرتے ہوئے فرض، یا مباح سمجھ کر ادا کی جائے گی، تو اس میں کراہتِ تنزیہی، یا کراہتِ تحریمی لازم آنے کی بحث جاری نہ ہوگی۔

علامہ ابنِ ہمام ''فتح القدیر'' میں فرماتے ہیں:

فدارت قراء ته بين أن تكون مكروهة تحريما أو ركنا تفسد الصلاة بتركه، فالاحتياط في حقه القراء ة؛ لأن ارتكاب ترك الفرض أشد من ارتكاب المكروه تحريما (فتح القدیر، ج۲، ص ۴۰، کتاب الصلاۃ، باب صلاۃ المسافر)

ترجمہ: پس اس کی قرائت مکروہ تحریمی، یا ایسے رکن کے درمیان دائر ہوگئی، جس کے ترک سے نماز فاسد ہو جاتی ہے، پس اس کے حق میں احتیاط قرائت کرنے میں ہے، کیونکہ ترکِ فرض کا ارتکاب، مکروہ تحریمی کے ارتکاب سے زیادہ شدید ہے (فتح القدیر)

مذکورہ عبارات سے اختلاف سے خروج کے مستحب ہونے کے ساتھ ساتھ یہ بھی معلوم ہوا کہ اس میں یہ حکمت ہے کہ اس کی وجہ سے دین میں احتیاط پائی جاتی ہے۔

نیز بعض حضرات کی طرف سے جو گاؤں، دیہات میں نمازِ جمعہ کے عدمِ جواز کی یہ وجہ بیان کی جاتی ہے کہ اس سے ظہر کا فریضہ ساقط نہ ہوگا، اور کراہت بھی لازم آئے گی، اس کا جواب بھی

مذکورہ عبارات سے معلوم ہوگیا کہ اولاً تو کراہت لازم آنے کی وجہ سے احتیاط کو ترک نہیں کیا جاتا، دوسرے یہ اس وقت ہے، جب جمعہ فی القریٰ کے عدمِ جواز کے قول کو اختیار کیا جائے، جواز، یا وجوب کے قول کو اختیار اور اس کی تقلید کرنے کی صورت میں ایسا سمجھنا راجح نہیں۔ [1]

جہاں تک بعض اہلِ علم حضرات کا یہ فرمانا ہے کہ اس مسئلہ میں دوسرے فقہاء کے قول کے مطابق عمل کرنے کی صورت میں ان کے مذاہب کے مطابق صحتِ جمعہ کی تمام قیود وشرائط کی ضرورت ہوگی، ورنہ تلفیق کا اندیشہ ہے، تو مذکورہ مسئلہ میں اس بات سے اتفاق مشکل ہے، کیونکہ اولاً تو تلفیق کا عدمِ جواز، متفق علیہ نہیں، اور بر سبیلِ تسلیم بھی تلفیق اس وقت مذموم ہے، جبکہ وہ کسی ایک خاص مسئلہ میں محض اتباعِ ہویٰ پر مبنی ہو، مختلف مسائل اور محقق عالم کی طرف سے کسی معتبر دلیل، یا ضرورت اور کسی مجتہد کی تقلید پر مبنی نہ ہو، پھر عوام کی طرف سے جمعہ کا قیام کسی قطعی معصیت اور تساہل و ہوا پرستی کے بجائے عبادت کے شوق کے جذبہ وداعیہ پر مبنی ہے، یہی وجہ ہے کہ فقہا نے بعض مسائل میں تیسیر کو قوتِ دلیل پر ترجیح دی ہے، اور اس کو تساہل سے تعبیر کرنے کے کوئی معنیٰ نہیں، کیونکہ تساہل بابِ تفاعل سے ہے، جس میں بتکلف مزاجِ شریعت کے خلاف سہولت پسندی پائی جاتی ہے، بلکہ اس کو تیسیر سے تعبیر کرنا مناسب ہے، جو کہ مجتہد فیہ مسائل میں بعض اوقات محمود ومطلوب ہے، بالخصوص جبکہ لوگ دین سے دور ہوکر، اجماعِ امت سے خروج اختیار کر رہے ہوں، ایسی حالت میں فقہاء کے کسی قول کی اتباع کر لینا، اہوَن ہوا کرتا ہے، اور دیہات میں جمعہ کی نماز کے قیام کو دیگر منصوص وغیر مجتہد فیہ معاصی، مثلاً زنا وغیرہ پر قیاس کر کے تشدد کرنا، نامناسب طریقہ معلوم ہوا۔ [2]

---

[1] اس مسئلہ کی تفصیل ہم نے اپنی دوسری تالیف "نمازِ جنازہ میں سورہ فاتحہ کا حکم" میں ذکر کر دی ہے۔ محمد رضوان۔

[2] فلو كان حافظا للأقاويل المختلفة للمجتهدين ولا يعرف الحجة ولا قدرة له على الاجتهاد للترجيح لا يقطع بقول منها يفتى به، بل يحكيها للمستفتى فيختار المستفتى ما يقع فى قلبه أنه الأصوب ذكره فى بعض الجوامع .وعندى أنه لا يجب عليه حكاية كلها بل يكفيه أن يحكى قولا منها فإن المقلد له أن يقلد أى مجتهد شاء ، فإذا ذكر أحدها فقلده حصل المقصود، نعم لا يقطع

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

خلاصہ یہ کہ ہمارے نزدیک راجح یہ ہے کہ بوقتِ ضرورت دوسرے فقہائے کرام کے قول پرعمل کر لینے کی صورت میں ان کے مسلک کی تمام قیود وشرائط کا لحاظ کرنا اور قید لگانا ضروری نہیں ہوتا، بالخصوص جبکہ اس مسئلہ کو کسی دلیل سے ترجیح دی جائے، اور کسی محقق عالم کے اجتہاد سے اس مسئلہ میں گنجائش ہو، اور پیچھے امام ابنِ منذر، اور حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی رحمہما اللہ کا اس سلسلے میں موقف گزر چکا ہے، اس لیے مذکورہ مسئلے میں ممنوع ''تلفیق'' لازم آنے کے قول سے ہمیں اتفاق نہیں ہوسکا، بشرطیکہ واقعتاً تلفیق لازم آ رہی ہو، ورنہ اکثر وبیشتر صورتوں میں تلفیق کا لازم آنا ضروری بھی نہیں، جس سے اس بحث کا ہی خاتمہ ہوجاتا ہے۔

چنانچہ یہ بات گزر چکی ہے کہ اگر کسی آبادی کے مستقل رہائشی صرف بارہ افراد کی شکل میں جمعہ کی نماز کے اندر شریک ہوں، تو مالکیہ کے نزدیک جمعہ کی نماز درست ہوجاتی ہے، اور عام طور پر اور اکثر وبیشتر گاؤں میں جمعہ کی نماز میں مذکورہ تفصیل کے مطابق کم از کم بارہ افراد کی

﴿ گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ ﴾

علیه فیقول جواب مسألتک کذا بل یقول قال أبو حنیفة حکم هذا کذا، نعم لو حکی الکل فالأخذ بما یقع فی قلبه أنه الأصوب أولی.

والعامی لا عبرة بما یقع فی قلبه من صواب الحکم وخطئه، وعلی هذا إذا استفتی فقیهین :أعنی مجتهدین فاختلفا علیه الأولی أن یأخذ بما یمیل إلیه قلبه منهما .وعندی أنه لو أخذ بقول الذی لا یمیل إلیه قلبه جاز لأن میله وعدمه سواء ، والواجب علیه تقلید مجتهد وقد فعل أصاب ذلک المجتهد أو أخطأ(فتح القدیر ، ج۷، ص۲۵۷ ، کتاب أدب القاضی)

فإن أرادوا هذا الالتزام فلا دلیل علی وجوب اتباع المجتهد المعین بإلزامه نفسه ذلک قولا أو نیة شرعا، بل الدلیل اقتضی العمل بقول المجتهد فیما احتاج إلیه لقوله تعالی ''فاسألوا أهل الذکر إن کنتم لا تعلمون'' والسؤال إنما یتحقق عند طلب حکم الحادثة المعینة، وحینئذ إذا ثبت عنده قول المجتهد وجب علیه عمله به، والغالب أن مثل هذه إلزامات منهم لکف الناس عن تتبع الرخص وإلا أخذ العامی فی کل مسألة بقول مجتهد قوله أخف علیه .وأنا لا أدری ما یمنع هذا من النقل أو العقل وکون الإنسان یتبع ما هو أخف علی نفسه من قول مجتهد مسوغ له الاجتهاد ما علمت من الشرع ذمه علیه، وکان -صلی الله علیه وسلم -یحب ما خفف عن أمته، والله سبحانه أعلم بالصواب (فتح القدیر ، ج۷، ص۲۵۸ ، کتاب أدب القاضی)

شرکت ہو ہی جایا کرتی ہے، جبکہ ابنِ منذر اور بعض دیگر حضراتِ فقہاء، اتنے افراد کو بھی شرط قرار نہیں دیتے۔ [1]

---

[1] قد استفاض عند فضلاء العصر منع التلفيق فى التقليد وذلک بأن يعمل مثلا فى بعض أعمال الطهارة والصلاة أو أحداهما بمذهب إمام وفى بعض العبادات بمذهب إمام آخر لم أجد على امتناع ذلک برهانا بل قد أشار إلى عدم منعه المحقق فى التحرير وأنه لم يرد ما يمنع ونقل منع التلفيق عن بعض المتأخرين قال شارح تحريره العلامة ابن أمير حاج القائل بالمنع العلامة القرافى رحمه الله تعالى .

قلت والقرافى رجل من فضلاء الأصوليين من المالكية ولا علينا أن نأخذ بقوله خصوصا وقد وجدت عن بعض أئمتنا ما يدل على جوازه بل على وقوعه(القول السديد فى بعض مسائل الاجتهاد والتقليد،لمحمد بن عبد العظيم المكى الرومى المورى الحنفى،ص ۷۶ الیٰ ۸۷،مسائل الاجتهاد والتقليد،فصل قد استفاض عند فضلاء العصر منع التلفيق فى التقليد)

لو حصل التلفيق بالاجتهاد حكمنا بالصحة فكذلک إذا حصل التلفيق بالتقليد حكمنا بالصحة لأن الاجتهاد أصل فى العمل والتقليد فرع التكليف فى الأصل إنما هو بالاجتهاد عند عدم النص فإن عجز عن ذلک الاجتهاد نزل إلى التقليد ففى كل موضع قلنا بالصحة مع الاجتهاد نقول بها مع التقليد عند العجز عنه من غير زيادة أمر آخر ومازاد على ذلک فهو قول مخترع لا يقوم به دليل مرضى و لا تنهض به حجه((القول السديد فى بعض مسائل الاجتهاد والتقليد، ص ۹۴ ،مسائل الاجتهاد والتقليد،فصل قد استفاض عند فضلاء العصر منع التلفيق فى التقليد)

فقد تلخص من المنقول عن الأئمة أن التلفيق جائز وهو الصحيح كما صرح به فى مذهب الشافعية أن التلفيق عندهم أيضا جائز ثم بعد مدة من استنباطى جواز التلفيق من مسألتى أبى يوسف وبعض علماء خوارزم ومسألة صحة الحكم على الغائب بصحة النكاح بعد وقوعه كما سبق فى المسألة التى ذكروها واستئناسى بمقالة المحقق فى التحرير وما على الإنسان أن يختار الأسهل فى العمل ثم وجدت شيخ الإسلام خاتمة الأئمة المتأخرين مولانا العلامة زين الدين ابن نجيم صرح فى رسالة ألفها فى بيع الوقف على وجه الاستبدال بأن ما وقع فى آخر التحرير من منع التلفيق فإنما عزاه إلى بعض المتأخرين وليس هذا المذهب انتهى فحمدت الله تبارک وتعالى على موافقة ما ادعيته لما نص عليه مولانا العلامة ابن نجيم(القول السديد فى بعض مسائل الاجتهاد والتقليد،ص ۱۱۳ ، ۱۱۴ ، رد المؤلف على المانعين)

بعد تأمل أقوال الأصوليين والفقهاء فى التلفيق ,وتكرار النظر فى أدلتهم والأسئلة الواردة عليها ; تبين لى النتائج التالية:

ان من و فقه الله لبلوغ رتبة الاجتهاد واستنباط الأحكام الشرعية العملية من أد لتها التفصيلية سواء فى جميع المسائل أو بعضها لا يجوز له أن يلفق بين المذاهب ;لأن التلفيق نوع تقليد ,والقدرة على الاجتهاد تمنع التقليد ,وإنما يجب عليه أن يرفع همته إلى النصوص الشرعية ,مع الاستضاء ة

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

اور فقہی بصیرت رکھنے والے صاحبِ علم کو کسی مجتہد فیہ مسئلہ میں اپنے امام کے بجائے دوسرے

﴿ گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ ﴾

بآراء الأئمة السابقين والاستفادة منها فى التوصل إلى الصواب ,ثم إذا أداه اجتهاده إلى رأى فيه تلفيق بين قولين لإمامين من أئمة هذا الدين فى مسألة من المسائل فلاضير عليه ;لأن التلفيق حصل هنا تبعا لا بالقصد الأول(التلفيق بين المذاهب الفقهية وعلاقته بتيسير الفتوىٰ، الرأى المختار فى التلفيق بين المذاهب الفقهية ،لغازى بن مرشدبن خلف العتيبى:استاذ مساعد بقسم الشريعة بجامعة ام القرىٰ ،مكة المكرمة، مشمولة : مجلة مجمع الفقه الاسلامى،ص ۲۴۲،السنة الثالثة والعشرون ۱۴۳۱ھ،۲۰۱۰م ، العدد الخامس والعشرون)

وعلى هذا فكل من كان أهلا للنظر والاجتهاد ,إذا اجتهد فى مسألة فله أن يعمل لنفسه بما أداه إليه اجتهاده ,ولو خالف مذهبه ,ولو لزم منه التلفيق.

وبالنظر إلى ما تقدم من خلاف فقد ظهر لك أن مسألة التلفيق مسألة خلافية ,ليس فيها إجماع, وما نقل عن بعض الفقهاء فى ثنايا البحث من الإجماع على منعه ينقضه ما نقل عن الفقهاء من خلاف فيه ,فلعل ما ذكروه من إجماع محمولاً على المذهب الواحد(التلفيق وحكمه فى الفقه الإسلامى،للدكتورعبد الله بن محمد بن حسن السعيدى:الأستاذ المشارك فى قسم الثقافة الإسلامية،بجامعة الملك سعود،ص ۴۶،الترجيح، مشمولة: مجلة "دراسات اسلامية "العدد السادس عشر، محرم ۱۴۳۰ھ ، ينابر ۲۰۰۹م، وزارة الشؤون الإسلامية والدعوة والإرشاد – وكالة المطبوعات والبحث العلمى، الرياض، السعودية)

ومما ينشأ من الجهل والتعصب تفويت فرض من فروض الله تعالى مع إمكان اقامته على رأى مجتهد جليل بل رأى جمع من المجتهدين وذلك أن جهلة المتعصبين يمتنعون ويمنعون من جمع الصلاتين فى السفر الذى ذهب إلى جوازه الإمام الشافعى وغيره من صدر الإسلام رحمة الله عليهم ويؤدى ذلك إلى تفويت الفرض رأسا وذلك إنهم لما يعزمون على السير عند الزوال مثلا فيصلون الظهر لأول وقتها ويمتنعون من جمع العصر اليها فيركبون ويسيرون بناء على إنهم قد لا يتهيأ لهم النزول إلا مع المغرب أو الغروب بحيث لا يتسع الوقت إلى الطهارة والصلاة وخصوصا فى حق من تتعسر الطهارة عليه فتفوتهم الفرصة وقد كانوا يمكنهم أداؤها فى المنزل فى المكان الذى كانوا به مجموعة جمع تقديم إلى الظهر على مذهب الإمام الشافعى رحمة الله عليه وعلى مذهب غيره ممن جوز الجمع لأجل السفر فيمتنعون عن ذلك ويرضون بتفويتها ولا يرضون بفعلها على مذهب مجتهد يجوز لهم أو يجب عليهم اتباعه والحال ما قرر لأن تحصيل الفرض من وجه مقدم على تفويته من كل وجه وما هذا إلا محض التعصب والجهل وقد ذكر الإمام الأجل ظهير الدين الكبير المرغينانى عن أستاذه السيد الإمام أبى شجاع رحمه الله تعالى انه سئل شمس الأئمة الحلوانى عن كسالى بخارى أنهم يصلون الفجر والشمس طالعة فهل نمنعهم من ذلك فقال لا يمنعون لأنهم لوا منعوا يتركونها أصلا ظاهرا أى مما يظهر من حالهم ولو صلوها تجوز عند أصحاب الحديث ولا شك أن الاداء الجائز عند البعض أولى من الترك أصلا هذا جواب

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

امام کے قول کو، یا مرجوح قول کو دلیل، یا ضرورت وتیسیر وغیرہ کی وجہ سے ترجیح دینا قابلِ

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

الحلوانی وناهیک به إذ هو شیخ المذهب فی عصره تخرج به الفحول النظار من أئمتنا کشمس الأئمة السرخسی وفخر الإسلام البزودی صاحب المبسوطین وأضرابهم من رؤساء المذهب الذین هم قدماء الدهر وعظماء ما وراء النهر(القول السدید فی بعض مسائل الاجتهاد والتقلید،ص ۱۳۱ الیٰ ۱۳۶ ،فصل ومما ینشأ من الجهل والتعصب تفویت فرض من فروض الله تعالی)

فلا مانع شرعا من تقلید أئمة المذاهب والمجتهدین المشهورین والمغمورین، کما لامحذور فی الشرع من التلفیق بین أقوال المذاهب عملا بمبدأ الیسر فی الدین لقوله تعالی :(یرید الله بکم الیسر ولا یرید بکم العسر) ومن المعلوم أن أغلب الناس لامذهب لهم، وإنما مذهبهم مذهب مفتیهم، وهم حریصون علی أن یکون عملهم شرعیا (الفقه الاسلامی و ادلتهٗ للزحیلی، ج ۱ ، ص ۹۰ ، المطلب السادس: الضوابط الشرعیة للأخذ بأیسر المذاهب: تمهید)

وجواز التلفیق مبنی علی ما قررناه من أنه لا یجب التزام مذهب معین فی جمیع المسائل، فمن لم یکن ملتزما مذهبا معینا، جاز له التلفیق، وإلا أدی الأمر إلی بطلان عبادات العوام، لأن العامی لا مذهب له ولو تمذهب به، ومذهبه فی کل قضیة هو مذهب من أفتاه بها .کما أن القول بجواز التلفیق یعتبر من باب التیسیر علی الناس.

وتقلید إمام فی جزئیة أو مسألة لایمنع من تقلید إمام آخر فی مسألة أخری(الفقه الاسلامی و ادلتهٗ للزحیلی، ج ۱ ، ص ۱۰۷ ، المطلب السادس: الفرع الرابع ـ آراء الأصولیین فی مسألة اختیار الأیسر "أو تتبع الرخص" وفی التلفیق بین المذاهب)

المراد بعموم البلوی :الحالة أو الحادثة التی تشمل کثیرا من الناس ویتعذر الاحتراز عنها ، وعبر عنه بعض الفقهاء بالضرورة العامة وبعضهم بالضرورة الماسة، أو حاجة الناس.وفسره الأصولیون بما تمس الحاجة إلیه فی عموم الأحوال (الموسوعة الفقهیة الکویتیة، ج ۳۱، ص ۶ ،۷، مادة "عموم")

عندما یتعلق الأمر بالعموم، وبمصلحة اجتماعیة معتبرة، فالأولی بأهل الفتوی أن ییسروا ولا یعسروا، دون تجاوز للنصوص المحکمة، أو القواعد الثابتة.

ولهذا جعل الفقهاء من موجبات التخفیف :عموم البلوی بالشیء مراعاة لحال الناس ورفقًا بهم، هذا بالإضافة إلی أن عصرنا الحاضر خاصة أحوج ما یکون إلی التیسیر والرفق بأهله(بنوک الحلیب،لفضیلة الدکتور یوسف القرضاوی،مجلة مجمع الفقه الإسلامی التابع لمنظمة المؤتمر الإسلامی بجدة، ج۲،ص۲۶۰، موضوع: بنوک الحلیب)

ویتخرج منه: أی من جواز اتباع غیر مقلده الأول، وعدم التضییق علیه، جواز اتباع رخص المذاهب: أی أخذه من المذاهب ما هو الأهون علیه فیما یقع من المسائل، ولایمنع منه مانع شرعی، إذ للإنسان أن یسلک المسلک الأخف علیه إذا کان له إلیه سبیل، بأن لم یکن عمل

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

مذمت نہیں، بلکہ باعثِ اجر ہے، جس پر کوئی عامی شخص عمل کرے، تو اس کے لیے بھی گنجائش پائی جاتی ہے۔ [1]

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

بآخر: أی بقول آخر مخالفا لذلک الأخف فیه: أی فی ذلک المحل المختلف فیه .کذا فی ”شرح السید بادشاه علی التحریر“

وقول ابن حزم:إن متبع الرخص فاسق بالإجماع لم یؤخذ به، وهو مردود بما أفتی به العز بن عبد السلام من أنه لا یتعین علی العامی إذا قلد إماما فی مسألة أن یقلده فی سائر مسائل الخلاف؛ لأن الناس من زمن الصحابة رضی الله تعالی عنهم إلی أن ظهرت المذاهب یسألون فیما یسنح لهم العلماء المختلفین من غیر نکیر، وسواء اتبع الرخص فی ذلک أو العزائم؛ لأن من جعل المصیب واحدا، وهو الصحیح، لم یعینه، ومن جعل کل مجتهد مصیب فلا إنکار علی من قلد فی الصواب.

وأما ما حکی عن ابن حزم فلعله محمول علی من تتبعها من غیر تقلید لمن قال بها، أو علی الرخص المرکبة فی الفعل الواحد .کذا فی ((العقد الفرید)).

بل قیل: لا یصح للعامی مذهب؛ لأن المذهب لا یکون إلا لمن له نوع نظر وبصیرة بالمذهب، أو لمن قرأ کتابا فی فروع مذهب وعرف فتاوی إمامه وأقواله، وأما من لم یتأهل لذلک بل قال: أنا حنفی أو شافعی لم یصر من أهل ذلک المذهب بمجرد هذا(الدر الفرید فی بیان حکم التقلید،لاحمد بن محمد الحموی المتوفیٰ ۱۰۹۸ھ،ص۱۸،۱۹،انواع التقلید)

[1] ذکر الحنفیة، والمالکیة، والشافعیة، والحنابلة أنه لا یقلد المجتهد مجتهدا غیره، لأن القدرة علی الاجتهاد تمنع من التقلید .ومن علم أدلة القبلة لا یجوز له أن یقلد غیره مطلقا، وأما غیر المجتهد فعلیه أن یقلد المجتهد، لقوله تعالی :(فاسألوا أهل الذکر إن کنتم لا تعلمون)

وإذا کان هناک أکثر من مجتهد فالمقلد له أن یختار أحدهم، والأولی أن یختار من یثق به أکثر من غیره(الموسوعة الفقهیة الکویتیة، ج۴، ص ۷۲،۷۳، مادة ”استقبال“)

ولا تتصور معاتبة احد من الائمة إذا انتقل واحد من مقلدیهم إلی مذهب امام اخر، و قلده فی بعض المسائل لالغرض نفسانی، بل لغرض شرعی ،وقوة دلیل لاحت له، فاحفظه(إمام الکلام فی القراء ة خلف الإمام ،لعبد الحی اللکنوی، الباب الثانی فی دلائل اصحاب المذاهب الاربعة،الاصل الثانی فی الاستدلال بالسنن المرفوعة، الحدیث الثالث عشر،الایراد الثانی عشر ،مشمولة: مجموعة رسائل اللکنوی، ج۳ص ۱۹۱،۱۹۲، الناشر: ادارة القرآن ، کراتشی، الباکستان، الطبعة الأولیٰ: ۱۴۱۹ھ)

(لأنه مجتهد فیه) أی موضع اجتهاد صحیح، بمعنی أنه یسوغ فیه الاجتهاد لأنه لم یخالف کتابا ولا سنة مشهورة ولا إجماعا، إذ لو خالف شیئا من ذلک فی رأی المجتهد لم یکن مجتهدا فیه(رد المحتار علی الدر المختار، ج۳،ص ۴۴۴، کتاب الطلاق،باب الخلع)

قال فی جواهر الفتاوی :لو أن رجلا من أهل الاجتهاد برء من مذهبه فی مسألة أو فی أکثر منها

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

اس فصل کا خلاصہ

خلاصہ یہ کہ فقہ حنفی کے مطابق عام حکم تو یہی ہے کہ گاؤں، دیہات میں نمازِ جمعہ نہ پڑھی جائے، لیکن اگر کسی جگہ حنفیہ کے کسی قول کے مطابق نمازِ جمعہ جائز ہو، یا فقہائے ثلاثہ

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

باجتهاد لما وضح له من دليل الكتاب أو السنة أو غيرهما من الحجج لم يكن ملوما ولا مذموما بل كان مأجورا محمودا وهو فی سعة منه وهكذا أفعال الأئمة المتقدمين فأما الذى لم يكن من أهل الاجتهاد فانتقل من قول إلى قول من غير دليل لكن لما يرغب من غرض الدنيا وشهوتها فهو مذموم آثم مستوجب للتأديب، والتعزير لارتكابه المنكر فی الدين واستخفافه بدينه ومذهبه .اهـ

ونقل السيوطی فی رسالته المسماة بجزيل المواهب فی اختلاف المذاهب من فصل الانتقال من مذهب إلى مذهب وهو جائز إلى أن قال وأقول :للمنتقل أحوال:

الأول أن يكون السبب الحامل له على الانتقال أمرا دنيويا كحصول وظيفة أو مرتب أو قرب من الملوك وأهل الدنيا فهذا حكمه كمهاجر أم قيس لأن الأمور بمقاصدها ثم له حالان الأول أن يكون عاريا من معرفة الفقه ليس له فی مذهب إمامه سوى اسم شافعی أو حنفی كغالب متعممی زماننا أرباب الوظائف فی المدارس حتى أن رجلا سأل شيخنا العلامة الكافيجی -رحمه الله تعالى- مرة يكتب له على قصة تعليقا بولاية أول وظيفة تشغر بالشيخونية فقال له :ما مذهبک فقال: مذهبی خبز وطعام يعنی وظيفة أما فی الشافعية أو المالكية أو الحنابلة فإن الحنفية فی الشيخونية لا خبز لهم ولا طعام فهذا أمره فی الانتقال أخف لا يصل إلى حد التحريم لأنه إلى الآن عامی لا مذهب له يحققه فهو يستأنف مذهبا جديدا ثانيهما أن يكون فقيها فی مذهب ويريد الانتقال لهذا الغرض فهذا أمره أشد وعندی.أنه يصل إلى حد التحريم لأنه تلاعب بالأحكام الشرعية لمجرد غرض الدنيا.

الحال الثانی أن يكون الانتقال لغرض دينی وله صورتان :الأولى أن يكون فقيها فی مذهبه وقد ترجح عنده المذهب الآخر لما رآه من وضوح أدلته وقوة مداركه فهذا ما يجب عليه الانتقال أو يجوز كما قاله الرافعی ولهذا لما قدم الشافعی مصر تحول أكثر أهلها شافعية بعد أن كانوا مالكية، والثانية أن يكون عاريا من الفقه وقد اشتغل بمذهبه فلم يحصل منه على شیء ووجد مذهب غيره سهلا عليه سريعا إدراكه بحيث يرجو التفقه فيه فهذا يجب عليه الانتقال قطعا ويحرم التخلف لأن التفقه على مذهب إمام من الأئمة الأربعة خير من الاستمرار على الجهل وليس له من التمذهب سوى اسم حنفی أو شافعی أو مالكی فالتمذهب على مذهب أی إمام كان خير من الجهل بالفقه على كل المذاهب فإن الجهل بالفقه تقصير كبير، وقل أن تصح معه عبادة وأظن هذا هو السبب لتحول الطحاوی حنفيا بعد أن كان شافعيا فإنه كان يقرأ على خاله المزنی فاعتاص عليه الفهم يوما فحلف المزنی أنه لا يجیء منه فانتقل حنفيا ففتح عليه وصنف كتابه شرح معانی الآثار فكان إذا قرء عليه

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

’’شافعیہ، حنابلہ ومالکیہ‘‘ میں سے کسی مذہب کے مطابق نمازِ جمعہ جائز ہو، تو بحالاتِ موجودہ

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

يقول لو عاش خالي كفر عن يمينه، قال بعض العلماء وقد حكى هذه الحكاية لا حنث على المزنى لأن مراده لا يجيء منه شيء في مذهب الشافعي قلت :ولا يستنكر ذلك فرب شخص يفتح عليه في علم دون علم، وفي مذهب دون مذهب وهي قسمة من الله تعالى وكل ميسر لما خلق له وعلامة الإذن التيسير.

الحال الثالث :أن يكون الانتقال لا لغرض ديني ولا لغرض دنيوي بل مجردا عن القصد فهذا يجوز للعامي ويكره أو يمنع للفقيه لأنه قد حصل فقه ذلك المذهب ويحتاج إلى زمن آخر لتحصيل فقه هذا المذهب فيشغله ذلك عما هو الأهم من العمل بما تعلمه وقد ينقضي العمر قبل حصول المقصود من المذهب الثاني فالأولى ترك ذلك انتهت عبارة الرسالة(العقود الدرية فى تنقيح الفتاوى الحامدية، ج۲،ص۳۲۷،۳۲۸،مسائل وفوائد شتى من الحظر والإباحة وغير ذلك)

وظاهره ترجيح التيسير على قوة الدليل(رد المحتار، ج۴،ص ۵۴۰، كتاب البيوع،مطلب مهم فى أحكام النقود إذا كسدت أو انقطعت أو غلت أو رخصت)

إن وجد المستفتي أكثر من عالم، وكلهم عدل وأهل للفتيا، فقد ذهب جمهور الفقهاء إلى أن المستفتي بالخيار بينهم يسأل منهم من يشاء ويعمل بقوله، ولا يجب عليه أن يجتهد في أعيانهم ليعلم أفضلهم علما فيسأله، بل له أن يسأل الأفضل إن شاء ، وإن شاء سأل المفضول مع وجود الفاضل، واحتجوا لذلك بعموم قول الله تعالى :(فاسألوا أهل الذكر إن كنتم لا تعلمون)، وبأن الأولين كانوا يسألون الصحابة مع وجود أفاضلهم وأكابرهم وتمكنهم من سؤالهم.

وقال القفال وابن سريج والإسفرايينى من الشافعية :ليس له إلا سؤال الأعلم والأخذ بقوله(الموسوعة الفقهية الكويتية، ج۳۲، ص ۴۷،۴۸، مادة "فتوى")

ثم المختار أن المخطء مأجور كما في التحرير وشرحه .مطلب يجوز تقليد المفضول مع وجود الأفضل.ثم اعلم أنه ذكر في التحرير وشرحه أيضا أنه يجوز تقليد المفضول مع وجود الأفضل .وبه قال الحنفية والمالكية وأكثر الحنابلة والشافعية .وفي رواية عن أحمد وطائفة كثيرة من الفقهاء لا يجوز .ثم ذكر أنه لو التزم مذهبا معينا .كأبي حنيفة والشافعي، فقيل يلزمه، وقيل لا وهو الأصح اهـ وقد شاع أن العامي لا مذهب له.

إذا علمت ذلك ظهر لك أن ما ذكر عن النسفي من وجوب اعتقاد أن مذهبه صواب يحتمل الخطأ مبني على أنه لا يجوز تقليد المفضول وأنه يلزمه التزام مذهبه وأن ذلك لا يتأتى في العامي.

وقد رأيت في آخر فتاوى ابن حجر الفقهية التصريح ببعض ذلك فإنه سئل عن عبارة النسفي المذكورة، ثم حرر أن قول أئمة الشافعية كذلك، ثم قال إن ذلك مبني على الضعيف من أنه يجب تقليد الأعلم دون غيره.

والأصح أنه يتخير في تقليد أي شاء ولو مفضولا وإن اعتقده كذلك، وحينئذ فلا يمكن أن يقطع أو يظن أنه على الصواب، بل على المقلد أن يعتقد أن ما ذهب إليه إمامه يحتمل أنه الحق .قال ابن

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

بعض محققین واصحابِ افتاء اور اہلِ علم حضرات کے نزدیک اس کی گنجائش ہے، ایسی صورت میں اس پر نکیر کرنے اور اس کو بند کرانے کی کوشش کرنے سے اجتناب کرنا مناسب ہے، البتہ ایسی صورت میں کسی معلوم کرنے والے کو ''احتیاطُ الظهر'' کا حکم تجویز کردینا بہتر ہے، جس پر وہ خاموشی سے اپنے طور پر عمل کرے، اور دوسروں کے ساتھ نہ اُلجھے۔

ہمارے نزدیک یہی راجح ہے۔ [1]

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

حجر :ثم رأيت المحقق ابن الهمام صرح بما يؤيده حيث قال فى شرح الهداية :إن أخذ العامى بما يقع فى قلبه أنه أصوب أولى، وعلى هذا استفتى مجتهدين فاختلفا عليه الأولى أن يأخذ بما يميل إليه قلبه منهما .وعندى أنه لو أخذ بقول الذى لا يميل إليه جاز؛ لأن ميله وعدمه سواء ، والواجب عليه تقليد مجتهد وقد فعل .اهـ.(ردالمحتار، ج ا ص ۴۸، مقدمة)

مطلب العامى لا مذهب له قلت :وأيضا قالوا العامى لا مذهب له، بل مذهبه مذهب مفتيه، وعلله فى شرح التحرير بأن المذهب إنما يكون لمن له نوع نظر واستدلال وبصر بالمذهب على حسبه، أو لمن قرأ كتابا فى فروع ذلك المذهب وعرف فتاوى إمامه وأقواله .وأما غيره ممن قال أنا حنفى أو شافعى لم يصر كذلك بمجرد القول كقوله أنا فقيه أو نحوى اهـ وتقدم تمام ذلك فى المقدمة أول هذا الشرح(رد المحتار، ج۴،ص ۸۰، كتاب الحدود،باب التعزير)

[1] (وهل يقلد غيره) أى غير من قلد به (فى غيره) أى غير ما قلد فيه (المختار: نعم) يقلد إن شاء (لما علم من استفتائهم مرة) اماما (واحدا و) مرة (أخرى) اماما (غيره بلا نكير)من أحد فصار اجماعا، وتواتر هذه بحيث لا مجال للمماراة (ولو التزم مذهبا معينا) أى عهد من عند نفسه أنه على هذا المذهب (كمذهب أبى حنيفة أو غيره) من غير أن يكون هذا الالتزام بمعرفة دليل كل مسئلة مسئلة، وظنه راجحا على دلائل المذاهب الأخر المعلومة مفضلا، بل انما يكون العهد من نفسه بظن الفضل فيه اجمالا أو بسبب آخر (فهل يلزمه الاستمرار عليه) أم لا (فقيل :نعم)يجب الاستمرار ويحرم الانتقال من مذهب الى آخر، حتى شدد بعض المتأخرين المتكلفين ،وقالوا: الحنفى اذا صار شافعيا يعذر ،وهذا تشريع من عند أنفسهم (لان الالتزام لا يخلو عن اعتقاد غلبة الحقية فيه) فلا يترك .قلنا: لا نسلم ذلك ،فان الشخص قد يلتزم من المتساويين أمراً لنفعه له فى الحال ودفع الحرج عن نفسه .ولو سلم فهذا الاعتقاد لم ينشأ عن دليل شرعى ،بل هو هوس من هوسات المعتقد ، ولا يجب الاستمرار على هوسه فافهم وتثبت .(وقيل: لا) يجب الاستمرار، ويصح الانتقال، وهذا هو الحق الذى ينبغى أن يؤمن ويعتقد به لكن ينبغى أن لا يكون الانتقال للتلهى فان التلهى حرام قطعا فى التمذهب كان أو فى غيره (إذ لا واجب إلا ما أوجبه الله تعالى) والحكم له (ولم يوجب على أحد أن يتمذهب بمذهب رجل من الأئمة) فايجابه تشريع شرع جديد، ولك أن تستدل عليه بان اختلاف العلماء رحمة بالنص وترفيه فى حق الخلق ،فلو لزم

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

''احتیاطُ الظھر'' مسئلہ کی مزید تحقیق ہم نے اپنی دوسری تالیف''بروز جمعہ، نمازِ جمعہ وظہر کے مخصوص مسئلہ کی تحقیق'' مشمولہ ''علمی و تحقیقی رسائل، ج۱۶'' اور تقلید و تلفیق کی تحقیق ''عمل بالحدیث کا حکم'' میں ذکر کردی ہے۔

واللہ تعالیٰ أعلم.

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

العمل بمذهب كان هذا نقمة وشدة (وقيل)من التزم (كمن لم يلتزم ،فلا يرجع عما قلده فيه، وفى غيره يقلد من شاء وعليه السبكى)من الشافعية (وفى التحرير وهو الغالب على الظن لعدم ما يوجبه شرعا) أى لانه ليس للاتباع لمذهب واحد موجب شرعى ،وهذا انما يدل على جزء الدعوى هو انه يقلد من شاء ثم البيان قطعى ،إذ ما لم يوجبه الشرع باطل، لان التشريع بالرأى حرام ،وأما أنه لا يرجع عما قلد فيه فلم يلزم منه قطعا ،فلا ينطبق الدليل على الدعوى فتأمل (ويتخرج منه) أى مما ذكر أنه لا يجب الاستمرار على مذهب (جواز اتباعه رخص المذاهب) قال فى ''فتح القدير'': لعل المانعين للانتقال انما منعوا لئلا يتتبع أحد رخص المذاهب ،وقال هو رحمه الله تعالى (ولا يمنع منه مانع شرعى ،إذ للانسان أن يسلك الأخف عليه إذا كان له إليه سبيل) بأن لم يظهر من الشرع المنع والتحريم و (بأن لم يكن عمل) فيه (بآخر)هذا مبنى على منع الانتقال عما عمل به ولو مرة (وكان عليه) وعلى آله وأصحابه (الصلاة والسلام يحب ما خف عليهم انتهى) لكن لابد أن لا يكون اتباع الرخص للتلهى كعمل حنفى بالشطرنج على رأى الشافعى قصدا إلى اللهو، وكشافعى شرب المثلث للتلهى به ،ولعل هذا حرام بالإجماع لان التلهى حرام بالنصوص القاطعة فافهم (فواتح الرحموت بشرح مسلم الثبوت، ج۲،ص ۴۳۷،۴۳۸،خاتمة الاجتهاد بذل الطاقة من الفقيه، فصل التقليد: العمل بقول الغير من غير حجة،مسألة لا يرجع المقلد عما عمل به اتفاقا، الناشر: دارالكتب العلمية، بيروت، لبنان، الطبعة الاولىٰ ۱۴۲۳ھ، ۲۰۰۲م)

(خاتمہ)

خلاصۂ کلام

شروع سے اب تک جو بحث ذکر کی گئی، اس کا خلاصہ یہ نکلا کہ اسلام میں جمعہ کے دن کی بڑی فضیلت واہمیت ہے۔

اور جمعہ کی نماز فرض ہے، اوراس کی تاکیدواہمیت قرآن مجید کی آیت اور بے شماراحادیث اور اجماعِ امت سے ثابت ہے۔

اوراحادیث میں جہاں جمعہ کی نماز چھوڑنے پر سخت وعیدیں اور تنبیہات آئی ہیں، اسی کے ساتھ دوسری طرف جمعہ کی نمازادا کرنے کے مختلف فضائل بھی آئے ہیں۔

اس لئے جمعہ کی نماز کی فرضیت وادائیگی کا حتی الامکان حکم لگانا چاہئے۔

اورحنفیہ کے نزدیک امام کے علاوہ کم ازکم تین مخصوص افراد کا ہونا اور مالکیہ کے نزدیک اس آبادی کے بارہ افراد کا ہونا، جووہاں کے مستقل باشندے ہوں، اور شافعیہ وحنابلہ کے نزدیک اس طرح کے چالیس افراد کا ہونا نمازِ جمعہ کی صحت کے لئے شرط ہے۔

اورحنفیہ کے علاوہ دیگر فقہائے کرام کے نزدیک اگر مطلوبہ تعداد کے افراد صرف مسافر یا خانہ بدوش ہوں، توان کے نزدیک جمعہ درست نہیں ہوتا۔

مگر حنفیہ کے نزدیک منعقد ہوجاتا ہے، جبکہ دیگر شرائط پائی جائیں۔ [1]

---

[1] اورحنابلہ کے نزدیک مسافر کا جمعہ کی امامت کرنا بھی درست نہیں ہوتا۔

ذهب جمهور الفقهاء -المالكية والشافعية والحنابلة -إلى أن من شروط صحة صلاة الجمعة الاستيطان، فلا تصح الجمعة بالمسافر ولا تنعقد به، أى لا يكمل به نصابها.

وذهب الحنفية إلى انعقاد الجمعة بالمسافر (الموسوعة الفقهية الكويتية، ج۲۵،ص۳۷،مادة "سفر")

ويصح أن يؤم القوم من هؤلاء كل من صحت إمامته المطلقة فى باب صلاة الجماعة فتصح إمامة المريض والمسافر والعبد، دون المرأة قال فى تنوير الأبصار :ويصلح للإمامة فيها من صلح لغيرها؛ فجازت لمسافر وعبد ومريض. ﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

اور جمعہ کی نماز کے لیے حنفیہ کے نزدیک شہر کا ہونا شرط ہے، اور جو جگہ شہر کے تابع، یا شہر کی ''فِناء'' ہو، خواہ وہ جگہ شہر سے متصل ہو، یا منفصل، ان مقامات کو جمعہ کی نماز قائم ہونے کے اعتبار سے شہر کا حکم حاصل ہوتا ہے، اس لیے حنفیہ کے نزدیک ان مقامات میں شہر کے اندرونی مقامات کی طرح جمعہ کی نماز کا قائم کرنا جائز اور درست ہوتا ہے۔

جبکہ حنفیہ کے علاوہ دیگر جمہور فقہائے کرام، یعنی مالکیہ، شافعیہ اور حنابلہ کے نزدیک جمعہ کی نماز قائم کرنے کے لئے اس جگہ کا شہر ہونا ضروری نہیں، بلکہ گاؤں اور دیہات میں بھی جمعہ کی نماز پڑھنا جائز اور واجب ہے۔ [1]

اور حنفیہ کے اصل مذہب کے مطابق جمعہ کی نماز شہر، یا قصبہ، یا قریۂ کبیرہ، یعنی بڑے گاؤں میں ہی پڑھنا جائز ہے، اور عام چھوٹی بستی اور عام دیہات و گاؤں میں جمعہ کی نماز نہیں پڑھنی چاہئے۔

﴿ گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ ﴾

وأما صفة الذين تنعقد بهم الجمعة فهی :أن كل من يصلح إماما للرجال فی الصلوات المكتوبة تنعقد بهم الجمعة، فيشترط صفة الذكورة والعقل والبلوغ لا غير، فتنعقد الجمعة بعبيد ومسافرين . وهذا عند الحنفية.

ومذهب الحنابلة :أنه لا تنعقد الجمعة بأحد من هؤلاء ، ولا تصح إمامته.

أما الشافعية :فصححوا الإمامة من هؤلاء دون الانعقاد به .فلو أم المصلين مسافر وكان عددهم لا يتجاوز مع إمامهم المسافر أربعين رجلا، لم تنعقد صلاتهم.

فمن توفرت فيه هذه الشروط، حرم عليه صلاة الظهر قبل فوات الجمعة، لما فی ذلک من مخالفة الأمر بإسقاط صلاة الظهر وأداء الجمعة فی مكانها .أما بعد فواتها عليه فلا مناص حينئذ من أداء الظهر، بل يجب عليه ذلک، غير أنه يعتبر آثما بسبب تفويت الجمعة بدون عذر(الموسوعة الفقهية الكويتية، ج۲۷، ص۲۰۰، ۲۰۱، مادة "صلاة الجمعة")

[1] ذهب الحنفية إلى أن المصر الجامع شرط وجوب الجمعة وشرط صحة أدائها .ولم تشترط المذاهب الأخرى هذا الشرط(الموسوعة الفقهية الكويتية، ج۳۸ص۲۶، ۲۷، مادة "مصر")

والخلاصة :لا بد لإقامة الجمعة عند الجمهور من كونها فی مدينة أو قرية، ولابد أن تكون القرية كبيرة عند الحنفية، فلا تجب على سكان القرى الصغيرة، أی لا بد من المصر عندهم، أما عند غيرهم فلا يشترط المصر، والقرية والبلد سواء (الفقه الاسلامی وادلتهٔ للزحيلی، ج۲ص۱۲۹۵، القسم الاول، الباب الثانی، الفصل العاشر، المبحث الثانی، المطلب الخامس)

لیکن نمازِ جمعہ قائم کرنے کے اعتبار سے حنفیہ کے نزدیک شہر اور بڑا گاؤں، کون سی آبادی کہلاتی ہے؟

اس بارے میں مشائخ حنفیہ کے کئی اقوال ہیں۔

حنفی فقہ کے مطابق جمعہ کی نماز عام بستی اور گاؤں میں قائم کرنے سے پرہیز کرنا چاہئے، جہاں مشائخِ حنفیہ کے قول کے مطابق، جمعہ کی نماز درست نہ ہو اور کسی ایسی بستی و دیہات والے شخص کو جمعہ کی نماز کا شوق ہو، تو اسے اپنے قرب و جوار کے شہر، قصبہ، یا بڑے گاؤں میں جمعہ کی نماز کے لیے جانا مناسب ہے۔

اور ضرورت و مصلحت کے تحت کسی عام بستی، یا گاؤں میں جمعہ کی نماز قائم کرنا بہت سے حنفیہ کے نزدیک جائز نہیں، اور اگر ایسی جگہ جمعہ کی نماز شروع کر دی گئی ہو، تو اس کو بند کرنے کا حکم ہے، ورنہ کم از کم اپنی حد تک اس میں شرکت سے پرہیز کر کے ظہر کی نماز پڑھنی چاہئے۔

جبکہ کئی دوسرے اہلِ علم حضرات کا کہنا یہ ہے کہ جمعہ کا دن وعظ و تذکیر کا دن ہے، اور اِس دور میں عام مسلمانوں کے دین کی حفاظت کے لیے جمعہ کے دن وعظ اور جمعہ کی نماز کی بڑی اہمیت ہے، بالخصوص جبکہ اہلِ باطل کسی بستی میں جمعہ کی نماز قائم کر کے عام مسلمانوں کے دینی نظریات کو بگاڑنے میں مصروفِ عمل ہوں، تو وہاں اہلِ حق کی طرف سے جمعہ کی نماز قائم کرنی چاہئے، یا مثلاً کسی بستی میں جمعہ کی نماز قائم کر لی گئی ہو، اور اب اس کو بند کرنے میں مذہبی و دینی فتنہ ہے، تو اس کو موقوف کرنا درست نہیں، بلکہ اس مسئلہ میں امام شافعی، امام احمد، یا امام مالک کے قول کے موافق عمل کر لینا جائز ہے، جبکہ وہ آبادی مستقل ہو، عارضی یا خیمہ بستی کی شکل میں نہ ہو، اور عرف میں وہ آبادی ایک مستقل گاؤں و قریہ کی حیثیت رکھتی ہو، عام جنگل نہ ہو، اور اسی طرح چند گھرانوں پر مشتمل نہ ہو، جس کو پوٹھوہاری زبان میں ''ڈھوک'' یا ''چک'' اور سندھی زبان میں ''گوٹ'' اور پشتو زبان میں ''بانڈہ'' وغیرہ کہا جاتا ہے۔

اتنی بات واضح ہے کہ یہ مسئلہ مجتہد فیہ ہے، جس میں اہلِ فقہ و اجتہاد حضرات کے لیے کسی ایک

جانب کو راجح وقابلِ عمل اور دوسری جانب کو مرجوح قرار دینے کی گنجائش پائی جاتی ہے، بشرطیکہ دوسرے کی تذلیل وتحقیر اور تفسیق نہ کی جائے۔

اور چونکہ دونوں طرف کے اہلِ علم حضرات، اہل فقہ واجتہاد ہیں، اس لیے ان کی اور ان کے متبعین کی طرف ہوا پرستی اور فِسق وفجور وغیرہ کی نسبت کرنے سے پرہیز کرنا چاہئے۔ [1]

اور مالکیہ کے نزدیک کسی گاؤں میں جمعہ کی نماز کے جواز کے لئے بارہ افراد کی شرکت کافی ہے، پس اگر کوئی مستقل گاؤں ہو، جہاں کے کم از کم بارہ عاقل بالغ افراد جمعہ کی نماز میں شرکت کریں، تو ان کے نزدیک نمازِ جمعہ درست قرار پاتا ہے۔

اور جن لوگوں کو کسی ایسے مقام میں جمعہ کی نماز جائز ہونے میں شبہ ہو، جہاں جمعہ کی نماز جاری ہو، اور وہاں مشائخِ حنفیہ میں سے کسی قول کے مطابق، یا امام شافعی، امام احمد، امام مالک کے نزدیک، جمعہ کی نماز درست ہو، تو اُن کو فتنہ وفساد اور انتشار واضطراب پیدا کرنے اور جمعہ کی

---

[1] چنانچہ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ، اپنے رسالہ ''احکامُ الایتلاف فی احکام الاختلاف'' میں فرماتے ہیں کہ:

جو اختلاف ایسے امرِ دینی میں ہو، جو فروع میں سے ہے، اور دلیل سے ہو، خواہ دلیل نص ہو، یا اپنا اجتہاد ہو، یا اپنے کسی متبوع صالح للمتبوعية (یعنی ایسے مجتہد ومحقق، یا مفتی) کا اجتہاد، یا فتویٰ ہو (جو اتباع وتقلید کی صلاحیت واہلیت رکھتا ہو)

اور یہی ہے وہ اختلاف، جو امتِ مرحومہ کی جماعتِ حقہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک سے اس وقت تک چلا آ رہا ہے۔

اور مبنیٰ اس اختلاف کا اسبابِ متعددہ ہیں، جو کتبِ اصول وتصانیف حضرت شاہ ولی اللہ ورسالہ رفع الکلام لابن تیمیة وغیرہا میں مدون ہیں۔

نیز فرماتے ہیں کہ:

اس اختلاف کا حکم یہ ہے کہ باتفاق واجماعِ علمائے امت محمود ومقبول ہے...... اور اس اختلاف کا ایک یہ بھی حکم ہے کہ جب یہ محمود ومقبول ہے، تو اس میں ایک کا دوسرے سے عداوت کرنا اور کسی کی تضلیل وتفسیق کرنا، جیسا آج کل غلاۃ میں تحریراً وتقریراً معمول ہے، سخت بدعت ومعصیت وتعصب ومخالفتِ سلف ہے (ملاحظہ ہو ''اجتہادی اختلاف اور باہمی تعصب'' مشمولہ: علمی وتحقیقی رسائل، ج ۸، صفحہ ۱۰۸، و۱۱۲، مطبوعہ: ادارہ غفران، راولپنڈی)

نماز سے روکنے کے بجائے، جمعہ کی نماز کے بعد خاموشی سے احتیاطاً چار رکعات ظہر کے فرضوں کی نیت سے پڑھ لینا مناسب ہے۔

مندرجہ بالا تفصیل کی روشنی میں سوال میں معلوم کیے گئے موضع میں نمازِ جمعہ کا حکم بھی معلوم ہوگیا کہ اس میں مالکیہ، شافعیہ، حنابلہ، ان تینوں فقہائے کرام کے نزدیک تو جمعہ کی نماز بلاشبہ درست طریقہ پر ادا ہو رہی ہے، اور حنفیہ کے بعض اقوال کے مطابق بھی درست ہو رہی ہے کہ اس موضع کی بڑی مسجد میں وہاں کے تمام عاقل، بالغ افراد بیک وقت نمازِ جمعہ میں نہیں سما سکتے۔ پھر آپ کے یہاں عرصہ چالیس سال سے جمعہ کی نماز پڑھی جارہی ہے، اور اس کی وجہ سے لوگوں کو دین کی تبلیغ وتعلیم کا سلسلہ بھی جاری ہے۔

لہٰذا ہمارے نزدیک آپ حضرات بلاکھٹک نمازِ جمعہ کو جاری رکھ سکتے ہیں، جس میں تردد کی ضرورت نہیں۔

البتہ جن لوگوں کو وہاں نمازِ جمعہ میں شک ہے، تو ان کو چاہیے کہ وہ کوئی اختلاف ڈالے اور انتشار پیدا کیے بغیر خاموشی سے نمازِ جمعہ کے بعد چار رکعت ''**احتیاطُ الظھر** '' کے طور پر پڑھ لیا کریں، اور بس۔

پھر بھی اگر کچھ لوگ ایسے ہوں کہ جن کو وہاں نمازِ جمعہ پڑھنا کسی طرح گوارا نہیں، تو وہ کسی دوسرے شہر میں جا کر جمعہ کی نماز پڑھ لیا کریں، لیکن دوسروں کو نمازِ جمعہ سے روک کر اور منع کر کے یا نمازِ جمعہ پڑھنے والوں کی نمازِ جمعہ کو ناجائز قرار دے کر فتنہ وفساد کا ذریعہ نہ بننا چاہئے، ایسی صورت میں ان کا فتنہ وفساد پیدا کرنا، اس سے کہیں زیادہ خطرناک ہے کہ وہ نمازِ جمعہ پڑھ کر بعد میں خاموشی سے ''**احتیاطُ الظھر**'' پڑھ لیں۔

ائمہ وخطباء سے دردمندانہ گزارش

اس موقع پر ان اہلِ علم اور مقتداء حضرات سے، جو جمعہ وغیرہ میں امامت وخطابت کا فریضہ

سرانجام دیں، ایک دردمندانہ گزارش یہ ہے کہ وہ امامت وخطابت کو ایک اہم دینی فریضہ اور عبادت سمجھ کر سرانجام دیں، اور اس کو صرف ایک پیشہ کے طور پر اختیار نہ کریں۔

امامت وخطابت سے متعلق جو شریعت کی طرف سے نازک ذمہ داری اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نیابت اور وراثت کا جو پُرخطر اور عظیم منصب، ان کو حاصل ہے، اس کو سمجھیں، اور قدر کریں، اور اس کے مطابق عمل کریں۔

اور لوگوں کی مخلصانہ اصلاح اور تعمیری کردار کو اپنا نصبُ العین بنائیں، اور آج کل جو بہت سے پیشہ ور حضرات نے اس منصب اور اہم شعبے میں گڑبڑ اور بے اعتدالی پیدا کردی ہے، اور ایک دوسرے کے خلاف منافرت پھیلانے اور منازعت پیدا کرنے کی جو جدوجہد شروع کردی ہے، اس کے بجائے مسلمانوں کو دین کی بنیادی اور اہم چیزوں کی طرف انتہائی شفقت ومودّت کے ساتھ متوجہ کرنے اور امتِ مسلمہ میں اتحاد واتفاق پیدا کرنے کی کوشش کریں، اور دوسروں کے خلاف بے جا بدزبانی وبدکلامی کے طرزِ عمل سے اجتناب فرمائیں، خواہ دوسرے کسی مسلک کی شکل میں ہوں، یا افراد کی شکل میں، اور عوام کی شکل میں ہوں، یا حکمرانوں کی شکل میں۔

البتہ علمی وفقہی دلائل کے پیشِ نظر سنجیدہ طریقہ پر اپنے نزدیک راجح موقف کا اظہار، اور احقاقِ حق وابطالِ باطل کا حکمت وبصیرت اور موعظۂ حسنہ کے ساتھ فریضہ سرانجام دینا، اپنی جگہ ایک مسلّمہ مسئلہ ہے، جس سے کسی کو اختلاف کی گنجائش نہیں۔

اللہ تعالیٰ حق واعتدال کو قائم رکھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

فقط۔ وَاللّٰہُ سُبۡحَانَہٗ وَتَعَالٰی اَعۡلَمُ وَعِلۡمُہٗ اَتَمُّ وَاَحۡکَمُ۔

محمد رضوان خان

15/ ذوالحجہ/ 1440ھ 17/ اگست/ 2019ء بروز ہفتہ

ادارہ غفران، راولپنڈی، پاکستان

(ضمیمہ)

نمازِ عید کا حکم

آخر میں یہ سمجھ لینا بھی ضروری ہے کہ عید کے دن کو جمعہ کے دن کے ساتھ بعض چیزوں میں مشابہت حاصل ہے۔

لیکن عید کی نماز کا وہ درجہ نہیں، جو درجہ جمعہ کی نماز کا ہے، کیونکہ جمعہ کی نماز تو فرض ہے، اور اس کے فرض ہونے پر فقہائے کرام کا اتفاق ہے، جبکہ عید کی نماز فرض نہیں، اور اس کے واجب یا سنت ہونے میں فقہائے کرام کا اختلاف ہے۔

چنانچہ حنفیہ کے مفتیٰ بہ قول کے مطابق عید کی نماز واجب ہے۔

اور شافعیہ اور مالکیہ کے نزدیک عید کی نماز سنتِ مؤکدہ ہے۔

جبکہ حنابلہ کے نزدیک عید کی نماز فرضِ کفایہ ہے۔ [1]

---

[1] صلاة العيدين واجبة على القول الصحيح المفتى به عند الحنفية -والمراد من الواجب عند الحنفية :أنه منزلة بين الفرض والسنة -ودليل ذلک :مواظبة النبى صلى الله عليه وسلم عليها من دون تركها ولو مرة، وأنه لا يصلى التطوع بجماعة -ما خلا قيام رمضان وكسوف الشمس وصلاة العيدين فإنها تؤدى بجماعة،فلو كانت سنة ولم تكن واجبة لاستثناها الشارع كما استثنى التراويح وصلاة الخسوف.

أما الشافعية والمالكية :فقد ذهبوا إلى القول بأنها سنة مؤكدة .ودليلهم على ذلک :قوله صلى الله عليه وسلم فى الحديث الصحيح للأعرابى -وكان قد ذكر له الرسول صلى الله عليه وسلم الصلوات الخمس فقال له :هل على غيرهن؟ قال لا، إلا أن تطوع.

قالوا :ولأنها صلاة ذات ركوع وسجود لم يشرع لها أذان فلم تجب بالشرع، كصلاة الضحى .

وذهب الحنابلة إلى القول بأنها فرض كفاية؛ لقوله تعالى :(فصل لربک وانحر) ولمداومة الرسول صلى الله عليه وسلم على فعلها(الموسوعة الفقهية الكويتية،ج٢٧،ص ٢٤٠،مادة ”صلاة العيدين“)

اختلف الفقهاء فى حكم صلاة العيد .فذهب المالكية والشافعية إلى أنها سنة مؤكدة، لحديث الأعرابى الذى ذكر له النبى صلى الله عليه وسلم الصلوات الخمس فقال :هل على غيرهن؟ قال :

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

پھر حنفیہ کے نزدیک عید کی نماز واجب ہونے کی بعینہٖ وہی شرائط ہیں، جو جمعہ کی نماز واجب ہونے کی ہیں۔

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

"لا، إلا أن تطوع وذلك مع فعل النبی صلی الله علیه وسلم لها ومداومته علیها.

وذهب الحنفیة -علی المفتی به عندهم -إلی أنها واجبة، لمواظبة النبی صلی الله علیه وسلم علیها من دون ترکها ولو مرة؛ ولأنها تؤدی بجماعة، فلو کانت سنة ولم تکن واجبة لاستثناها الشارع، کما استثنی التراویح وصلاة الخسوف.

وذهب الحنابلة إلی أنها فرض کفایة لقوله تعالی :(فصل لربک وانحر) ولمداومة النبی صلی الله علیه وسلم علی فعلها(الموسوعة الفقهیة الکویتیة، ج ۳۱،ص ۱۱۴ ،مادة "عید")

یتردد حکم صلاة العید بین آراء ثلاثة :کونها فرض کفایة، أو واجبا، أو سنة.

فقال الحنابلة فی ظاهر المذهب :صلاة العید فرض کفایة، إذا قام بها من یکفی سقطت عن الباقین، أی کصلاة الجنازة، للآیة السابقة (فصل لربک وانحر) وهی صلاة العید فی المشهور فی السیر، وکان النبی صلی الله علیه وسلم والخلفاء بعده یداومون علیها، ولأنها من أعلام الدین الظاهرة، فکانت واجبة کالجهاد، ولم تجب عینا علی کل مسلم، لحدیث الأعرابی الآتی :إلا أن تطوع المقتضی نفی وجوب صلاة، سوی الخمس، وإنما وجب العید بفعل النبی صلی الله علیه وسلم، ومن صلی معه.

فإن ترکها أهل بلد یبلغون أربعین بلا عذر، قاتلهم الإمام کالأذان؛ لأنها من شعائر الإسلام الظاهرة، وفی ترکها تهاون بالدین.

وقال الحنفیة فی الأصح :تجب صلاة العیدین علی من تجب علیه الجمعة بشرائطها المتقدمة سوی الخطبة، فإنها سنة بعدها.

ودلیلهم علی الوجوب :مواظبة النبی صلی الله علیه وسلم علیها.

وقال المالکیة والشافعیة :هی سنة مؤکدة تلی الوتر فی التأکید، لمن تجب علیه الجمعة :وهو الذکر البالغ الحر المقیم ببلد الجمعة، أو النائی عنه کبعد فرسخ (5544م) منه، ولا تندب عند المالکیة لصبی وامرأة وعبد ومسافر لم ینو إقامة تقطع حکم السفر، وندبت لغیر المرأة الشابة، ولا تندب لحاج ولا لأهل منی، ولو غیر حاجین.

وتشرع عند الشافعیة للمنفرد کالجماعة، والعبد والمرأة والمسافر والخنثی والصغیر، فلا تتوقف علی شروط الجمعة من اعتبار الجماعة والعدد وغیرهما .وهی أفضل فی حق غیر الحاج بمنی من ترکها بالإجماع.

ودلیلهم علی سنیتها :قوله صلی الله علیه وسلم للأعرابی السائل عن الصلاة :خمس صلوات کتبهن الله تعالی علی عباده، قال له :هل علی غیرها؟ قال :لا، إلا أن تطوع وکونها مؤکدة : لمواظبته صلی الله علیه وسلم علیها(الفقه الإسلامی وأدلتہ للزحیلی، ج۲،ص۱۳۸۷، ۱۳۸۸، القسم الأول :العبادات،الباب الثانی:الفصل العاشر:،المبحث الرابع ۔ صلاة العیدین)

چنانچہ حنفیہ کے نزدیک جمعہ کی نماز واجب ہونے کے لئے بعض دوسری شرائط کے ساتھ ساتھ شہر کا ہونا بھی شرط ہے۔

اور حنابلہ کے نزدیک عید کی نماز فرض ہونے کے لئے جمعہ کی نماز کی طرح مستقل طور پر مقیم ہونا اور جمعہ کی نماز والی تعداد کے مطابق کم از کم چالیس افراد کا ہونا شرط ہے، جس کا ذکر جمعہ کی نماز کے حکم میں گزر چکا ہے۔

اور مالکیہ کے نزدیک عید کی نماز کے سنتِ مؤکدہ ہونے کے لئے بھی مکمل طور پر انہی شرائط کا پایا جانا ضروری ہے، جو نمازِ جمعہ کے واجب ہونے کی شرائط ہیں، البتہ ان کے نزدیک عورت اور مسافر کو عید کی نماز پڑھنا مستحب ہے، ان کے ذمہ تاکیدی سنت نہیں۔

اور شافعیہ کے نزدیک عید کی نماز، ہر مکلّف مسلمان کے حق میں سنتِ مؤکدہ ہے، خواہ وہ مرد ہو، یا عورت ہو، مقیم ہو، یا مسافر ہو۔

جس سے معلوم ہوا کہ حنفیہ کے علاوہ دوسرے مذکورہ جمہور فقہائے کرام کے نزدیک عید کی نماز کے حکم کے لئے شہر کا ہونا ضروری نہیں۔ [1]

---

[1] شروط وجوب صلاة العيدين عند الحنفية :هی بعينها شروط وجوب صلاة الجمعة .فيشترط لوجوبها الإمام المصر الجماعة الوقت الذكورة الحرية صحة البدن الإقامة.

إلا الخطبة، فإنها سنة بعد الصلاة.

قال الكاسانی فی بدائع الصنائع -وهو يقرر أدلة هذه الشروط :-أما الإمام فشرط عندنا لما ذكرنا فی صلاة الجمعة، وكذا المصر لما روينا عن علی -رضی الله عنه -أنه قال :لا جمعة ولا تشريق ولا فطر ولا أضحى إلا فی مصر جامع .ولم يرد بذلک نفس الفطر ونفس الأضحى ونفس التشريق؛ لأن ذلک مما يوجد فی كل موضع، بل المراد من لفظ الفطر والأضحى صلاة العيدين؛ ولأنها ما ثبتت بالتوارث من الصدر الأول إلا فی الأمصار .والجماعة شرط لأنها ما أديت إلا بجماعة، والوقت شرط فإنها لا تؤدى إلا فی وقت مخصوص، به جرى التوارث وكذا الذكورة والعقل والبلوغ والحرية وصحة البدن، والإقامة من شروط وجوبها كما هی من شروط وجوب الجمعة؛ لما ذكرنا فی صلاة الجمعة، ولأن تخلف شرط من هذه الشروط يؤثر فی إسقاط الفرض فلأن تؤثر فی إسقاط الواجب أولی(الموسوعة الفقهية الكويتية، ج۲۷،ص ۲۴۱،مادة "صلاة العيدين")

وأما الحنابلة -وصلاة العيدين عندهم فرض كفاية كما سبق بيانه -فإنما شرطوا لفرضيتها : الاستيطان، والعدد المشترط للجمعة .

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

جہاں تک عید کی نماز صحیح ہونے کی شرائط کا تعلق ہے، تو حنفیہ کے نزدیک اس کے صحیح ہونے کی شرائط وہی ہیں، جو جمعہ کی نماز صحیح ہونے کی شرائط ہیں۔

اور حنابلہ کے نزدیک عید کی نماز صحیح ہونے کے لئے عید کی نماز کا وقت ہونا اور جماعت کا ہونا شرط ہے۔

اور مالکیہ اور شافعیہ کے نزدیک عید کی نماز صحیح ہونے کے لئے وقت کے علاوہ مذکورہ چیزوں میں سے کوئی چیز شرط نہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ حنفیہ کے علاوہ دیگر جمہور فقہائے کرام کے نزدیک عید کی نماز صحیح ہونے کے لئے بھی شہر کا ہونا ضروری نہیں۔ [1]

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

والمالكية -وهم من القائلين بأن صلاة العيدين سنة مؤكدة -شرطوا لذلك، أى لتأكيد سنيتها: تكامل شروط وجوب الجمعة، وأن لا يكون المصلى متلبسا بحج .فإذا فقد أحد الشروط نظر :فإن كان المفقود هو عدم التلبس بالحج فصلاة العيد غير مطلوبة بأى وجه من وجوه الطلب، وإن كان المفقود هو أحد شروط وجوب الجمعة، كالمرأة والمسافر، فهى فى حقهم مستحبة وليست بسنة مؤكدة .قال الصفتى :وهى سنة فى حق من يؤمر بالجمعة وجوبا إلا الحاج فلا تسن له ولا تندب، وأما المرأة والصبى والمسافر فتستحب فى حقهم

وذهب الشافعية إلى أنها سنة مؤكدة فى حق كل مكلف ذكرا كان أو أنثى، مقيما أو مسافرا، حرا أو عبدا، ولم يشترطوا لسنيتها شرطا آخر غير التكليف.وقالوا باشتراط عدم التلبس بالحج لأدائها جماعة، أى فالحاج تسن له صلاة العيد منفردا لا جماعة(الموسوعة الفقهية الكويتية، ج٢٧، ص ٢٤٢، مادة "صلاة العيدين")

[1] شروط الصحة:

كل ما يعتبر شرطا فى صحة صلاة الجمعة، فهو شرط فى صحة صلاة العيدين أيضا، ما عدا الخطبة فهى هنا ليست شرطا فى صحة العيدين وإنما هى سنة.

ويستثنى -أيضا -شرط عدم التعدد (راجع صلاة الجمعة) فلا يشترط ذلك لصلاة العيد، قال الحصكفى :وتؤدى بمصر واحد فى مواضع كثيرة اتفاقا، وقال ابن عابدين :مقررا هذا الكلام: والخلاف إنما هو فى الجمعة، فيشترط لصحتها الإمام والمصروالجماعة والوقت.

وقد مر أنها شروط للوجوب أيضا .هذا عند الحنفية.

أما الحنابلة فقد اشترطوا الوقت والجماعة.

ولم يشترط المالكية والشافعية لصحة صلاة العيدين شيئا من هذه الشروط إلا الوقت.

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

اورعید کی نماز کے لئے مسجد کا ہونا ضروری نہیں، بلکہ مسجد کے علاوہ بھی کسی جگہ میں عید کی نماز کا پڑھنا جائز ہے، بلکہ شافعیہ کے نزدیک اگر مسجد وسیع ہو، جس میں وہاں کے لوگ سما سکیں، تو غیر مسجد میں پڑھنے کے بجائے، مسجد ہی میں عید کی نماز پڑھنا افضل ہے۔ ۱؎

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

أمـا الشروط التى هى قدر مشترک فى صحة الصلوات المختلفة من طهارة واستقبال قبلة . . .إلخ فليس فيها من خلاف(الموسوعة الفقهية الكويتية، ج۲۷،ص ۲۴۲،مادة "صلاة العيدين")

شرائط وجوبها وجوازها:

قال الحنفية :كل ما هو شرط وجوب الجمعة وجوازها فهو شرط وجوب صلاة العيدين، وجوازها، مـن الإمـام والجماعة، والمصر، والوقت، إلا الخطبة فإنها سنة بعد الصلاة، ولو تركها جازت صلاة العيد.

أما الإمام أى حضور السلطان أو الحاكم أو نائبه :فهو شرط أداء العيد كالجمعة، لما ثبت فى السنة، ولأنـه لـو لـم يشتـرط السلطان، لأدى إلى الفتنة، بسبب تجمع الناس، وتنازعهم على التقدم للإمامة لما فيها من الشرف والعلو والرفعة.

وأما المصر :فلقول على موقوفا عليه :لا جمعة ولا تشريق، ولا صلاة فطر، ولا أضحى، إلا فى مصر جامع أو مدينة عظيمة .

وأما الجماعة :فلأنها ما أديت إلا بجماعة.

وأما الوقت :فإنها لا تؤدى إلا فى وقت مخصوص، كما جرى به التوارث عن السلف.

والـذكورة والعقل والبلوغ والحرية وصحة البدن والإقامة من شرائط وجوبها، كما هى من شرائط وجـوب الـجمعة، فلا تجب على النسوان والصبيان والمجانين والعبيد بدون إذن مواليهم، ولا على الزمنى والمرضى والمسافرين، كما لاتجب عليهم الجمعة.

أما الحنابلة فقالوا :يشتـرط لـصحة صلاة العيد استيطان أربعين عدد الجمعة ولا يشترط لها إذن، ويـفـعـلـهـا الـمـسـافـر والـعـبـد والـمـرأة والـمـنـفـرد تبعـا لأهل وجوبهـا(الفقـه الإسلامى وأدلتهٔ للزحيلى،ج۲،ص ۱۳۸۹،القسم الأول :العبادات،الباب الثانى :الفصل العاشر :،المبحث الرابع۔ صلاة العيدين)

۱؎ مكان أدائها:

كـل مـكان طاهر، يصلح أن تؤدى فيه صلاة العيد، سواء كان مسجدا أو عرصة وسط البلد أو مفازة خارجها .إلا أنـه يسن الخروج لها إلى الصحراء أو إلى مفازة واسعة خارج البلد تأسيا بما كان يفعله رسول الله صلى الله عليه وسلم.

ولا بـأس أن يستـخـلف الإمـام غيـره فـى الـبـلـدة ليـصـلى فى المسجد بالضعفاء الذين لا طاقة لهم بالخروج لها إلى الصحراء .

ولم يخالف أحد من الأئمة فى ذلک، إلا أن الشافعية قيدوا أفضلية الصلاة فى الصحراء بما إذا كان مسجد البلد ضيقا۔

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

فقہائے کرام کے سلسلہ کی کتب میں ان چیزوں کی تفصیلات مذکور ہیں، جن کو اصحابِ علم ملاحظہ فرما سکتے ہیں، ان کی تفصیلات کا یہ موقع نہیں۔ [1]

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

وإن كان المسجد واسعا لا يتزاحم فيه الناس، فالصلاة فيه أفضل؛ لأن الأئمة لم يزالوا يصلون صلاة العيد بمكة فى المسجد؛ ولأن المسجد أشرف وأنظف .ونقل صاحب المهذب عن الشافعي قوله : إن كان المسجد واسعا فصلى فى الصحراء فلا بأس، وإن كان ضيقا فصلى فيه ولم يخرج إلى الصحراء كرهت؛ لأنه إذا ترك المسجد وصلى فى الصحراء لم يكن عليهم ضرر، وإذا ترك الصحراء وصلى فى المسجد الضيق تأذوا بالزحام، وربما فات بعضهم الصلاة(الموسوعة الفقهية الكويتية، ج۲۷،ص۲۴۵،مادة "صلاة العيدين")

[1] أما بيان شرائط وجوبها فكل ما هو شرط وجوب الجمعة فهو شرط وجوب صلاة العيدين من الإمام والمصر والجماعة إلا الخطبة فإنها سنة بعد الصلاة بإجماع الصحابة.

وشرط الشيء يكون سابقا عليه أو مقارنا له (تحفة الفقهاء للسمرقندى، ج ۱، ص ۱۶۶، كتاب الصلاة، باب صلاة العيدين)

وأجمع المسلمون على صلاة العيدين .وصلاة العيد فرض على الكفاية، فى ظاهر المذهب، إذا قام بها من يكفى سقطت عن الباقين، وإن اتفق أهل بلد على تركها قاتلهم الإمام .وبه قال بعض أصحاب الشافعي.

وقال أبو حنيفة :هى واجبة على الأعيان، وليست فرضا، لأنها صلاة شرعت لها الخطبة، فكانت واجبة على الأعيان، وليست فرضا .كالجمعة .وقال ابن أبى موسى :قيل إنها سنة مؤكدة غير واجبة .وبه قال مالك، وأكثر أصحاب الشافعي(المغنى لابن قدامة، ج۲،ص۲۷۲، كتاب الصلاة، باب صلاة العيدين)

فصل :ويشترط الاستيطان لوجوبها؛ لأن النبى -صلى الله عليه وسلم -لم يصلها فى سفره .ولا خلفاؤه وكذلك العدد المشترط للجمعة؛ لأنها صلاة عيد، فأشبهت الجمعة .وفى إذن الإمام روايتان :أصحهما، ليس بشرط.

ولا يشترط شيء من ذلك لصحتها، لأنها تصح من الواحد فى القضاء ، وقال أبو الخطاب فى ذلك كله روايتان .وقال القاضى :كلام أحمد يقتضى روايتين :إحداهما، لا يقام العيد إلا حيث تقام الجمعة وهذا مذهب أبى حنيفة إلا أنه لا يرى ذلك إلا فى مصر، لقوله :لا جمعة ولا تشريق إلا فى مصر جامع .والثانية، يصليها المنفرد والمسافر، والعبد والنساء ، على كل حال.

وهذا قول الحسن والشافعي، لأنه ليس من شرطها الاستيطان فلم يكن من شرطها الجماعة، كالنوافل، إلا أن الإمام إذا خطب مرة، ثم أرادوا أن يصلوا، لم يخطبوا وصلوا بغير خطبة، كى لا يؤدى إلى تفريق الكلمة، والتفصيل الذى ذكرناه أولى ما قيل به، إن شاء الله تعالى(المغنى لابن قدامة، ج۲،ص ۲۹۱، كتاب الصلاة،باب صلاة العيدين،فصل شرط صلاة العيدين الاستيطان)

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

مذکورہ بالا تفصیل سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ گزشتہ مضمون میں جس جگہ جمعہ کی نماز پڑھنے کا جائز ہونا ذکر کیا گیا، اس جگہ عید کی نماز کا پڑھنا بھی جائز ہے، بلکہ حنفیہ کے علاوہ دیگر فقہائے

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

وأجمع المسلمون على أن صلاة العيد مشروعة وعلى أنها ليست فرض عين ونص الشافعى وجمهور الأصحاب على أنها سنة وقال الإصطخرى فرض كفاية فإن قلنا فرض كفاية قوتلوا بتركها وإن قلنا سنة لم يقاتلوا على أصح الوجهين وقال أبو إسحاق المروزى يقاتلون وقد ذكر المصنف دليل الجميع ووجه الدلالة من الحديث للمذهب أن النبى صلى الله عليه وسلم أخبره أنه لا فرض سوى الخمس فلو كان العيد فرض كفاية لما أطلق هذا الإطلاق لأن فرض الكفاية واجب على جميعهم ولكن يسقط الحرج بفعل البعض ولهذا لو تركوه كلهم عصوا وقوله لأنها صلاة مؤقتة احتراز من الجنازة وقوله لا تشرع لها الإقامة احتراز من الصلوات الخمس وقوله فلم تجب بالشرع احتراز من المنذورة وجماهير العلماء من السلف والخلف أن صلاة العيد سنة لا فرض كفاية (وأما قول) الشافعى فى المختصر من وجب عليه حضور الجمعة وجب عليه حضور العيدين (فقال) أصحابنا هذا ليس على ظاهره فإن ظاهره أن العيد فرض عين على كل من تلزمه الجمعة وهذا خلاف إجماع المسلمين فيتعين تأويله قال أبو إسحاق من لزمته الجمعة حتما لزمه العيد ندبا واختيارا وقال الإصطخرى معناه من لزمته الجمعة فرضا لزمه العيد كفاية قال أصحابنا ومراد الشافعى أن العيد يتأكد فى حق من تلزمه الجمعة(المجموع شرح المهذب، ج۵،ص ۲، ۳، كتاب الصلاة،باب صلاة العيدين)

واختلفوا فيمن تجب عليه صلاة العيد -أعنى :وجوب السنة -فقالت طائفة :يصليها الحاضر والمسافر، وبه قال الشافعى والحسن البصرى، وكذلك قال الشافعى :إنه يصليها أهل البوادى، ومن لا يجمع حتى المرأة فى بيتها .وقال أبو حنيفة وأصحابه :إنما تجب صلاة الجمعة والعيدين على أهل الأمصار والمدائن .وروى عن على أنه قال :لا جمعة ولا تشريق إلا فى مصر جامع .وروى عن الزهرى أنه قال :لا صلاة فطر ولا أضحى على مسافر.

والسبب فى هذا الاختلاف :اختلافهم فى قياسها على الجمعة، فمن قاسها على الجمعة كان مذهبه فيها على مذهبه فى الجمعة، ومن لم يقسها رأى أن الأصل هو أن كل مكلف مخاطب بها حتى يثبت استثناؤه من الخطاب.

قال القاضى :قد فرقت السنة بين الحكم للنساء فى العيدين والجمعة، وذلك أنه ثبت أنه -عليه الصلاة والسلام -أمر النساء بالخروج للعيدين، ولم يأمر بذلك فى الجمعة .

وكذلك اختلفوا فى الموضع الذى يجب منه المجىء إليها كاختلافهم فى صلاة الجمعة من الثلاثة الأميال إلى مسيرة اليوم التام(بداية المجتهد ونهاية المقتصد، ج ۱،ص ۲۲۹، كتاب الصلاة الثانى، الباب الثامن فى صلاة العيدين)

وصلاة العيدين سنة مسنونة لا ينبغى تركها وهى على جميع أهل الآفاق وأهل الأمصار وأهل القرى

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

کرام کے نزدیک عید کی نماز کی شرائط، جمعہ کی نماز سے بھی ہلکی ہیں، جن کے پیشِ نظر عید کی نماز ادا کر لینے میں ہی احتیاط ہے، اور یہاں عید کی نماز پڑھ لینے میں کسی فرض کے ترک کا بھی شبہ نہیں۔

جہاں تک اس موقف سے بعض اصحابِ علم واہلِ افتاء کے اختلاف کا تعلق ہے، تو اس کے متعلق، جمعہ کے باب میں کافی کچھ گزر چکا ہے، ہم یہاں اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں سمجھتے۔

فقط

وَاللّٰہُ سُبْحَانَہٗ وَتَعَالٰی اَعْلَمُ وَعِلْمُہٗ اَتَمُّ وَاَحْکَمُ.

محمد رضوان خان

17 / ذوالحجہ/ 1440ھ 19 / اگست/ 2019ء بروز پیر

ادارہ غفران، راولپنڈی، پاکستان

﴿ گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ ﴾

وأهل البادية يبرزون إلى مصلاهم فيصلونها هناك ولا تصلى فى المسجد إلا من ضرورة إلا أهل مكة فسنتهم صلاتها فى المسجد الحرام وليست على المسافرين ولا على أهل منى والحاج لأنهم مسافرون مشغولون بغير ذلك(الكافى فى فقه أهل المدينة، ج ١ ،ص ٢٦٣ ،باب صلاة العيدين)

(لمأمور الجمعة)ش :يعنى أن صلاة العيدين إنما هى سنة فى حق من يؤمر بالجمعة يريد وجوبا وأما من لا تجب عليه الجمعة من أهل القرى الصغار والمسافرين والنساء والعبيد ومن عقل الصلاة من الصبيان فليست فى حقهم سنة ولكنه يستحب لهم إقامتها كما سيأتى عند قوله :وإقامة من لم يؤمر بها.

(فرع) قال فى النوادر ولو تركوا الجمعة وهى عليهم فعليهم أن يصلوا العيد بخطبة وجماعة انتهى. ودخل فى قوله :لمأمور الجمعة من كان على ثلاثة أميال، قال فى النوادر وينزل إليها من على ثلاثة أميال انتهى(مواهب الجليل فى شرح مختصر خليل، ج٢، ص١٨٩، ١٩٠ ،كتاب الصلاة، فصل صلاة العيدين)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

علمی وتحقیقی سلسلہ

عید کے دن

مصافحہ ومعانقہ کا حکم

عیدین کے موقع پر مبارک باد کہنے اور مصافحہ ومعانقہ کرنے کا حکم

اس سلسلے میں وارِد شدہ متعدد احادیث وروایات

فقہائے کرام اور علمائے عظام کے مختلف اقوال وفتاویٰ

نکاح کے موقع پر اور تعزیت کے وقت معانقہ کرنے کا حکم

اجتہادی واختلافی مسئلے میں تشدد ونکیر سے اجتناب کا حکم

مؤلف

مفتی محمد رضوان خان

ادارہ غفران راولپنڈی پاکستان

www.idaraghufran.org

فہرست

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تمہید

(از مؤلف)

اس سے قبل بندہ محمد رضوان نے اپنی بعض تالیفات، مثلاً ''شوال اور عیدُ الفطر کے فضائل واحکام'' وغیرہ میں کچھ تفصیل کے ساتھ عید کے دن مصافحہ ومعانقہ کرنے کا حکم تحریر کیا تھا، اور اس سلسلے میں ہندوستان و پاکستان کے متعدد مشہور فتاویٰ کی روشنی میں عید کے دن مروَّجہ مصافحہ ومعانقہ کی نفی کی گئی تھی، اور اس کے برعکس، جواز کے قول کی پرزور انداز میں تردید اور اس عمل پر نکیر کی گئی تھی۔

بعد میں اس مسئلے کے متعلق بعض دوسرے فقہائے کرام واہلِ علم حضرات کے ایسے اقوال نظر سے گزرے کہ جن کی رُو سے اس مسئلے میں گنجائش اور توسع کا پہلو پایا جاتا تھا، اور جس بنیاد پر بندہ کی طرف سے اس مسئلے کا تردیدی انداز میں یک طرفہ حکم بیان کیا گیا تھا، اس میں بھی فقہائے کرام کا اختلاف موجود تھا، نیز پہلے بندے کی طرف سے بعض دوسرے مسائل کی طرح اس قسم کے اجتہادی واختلافی مسائل میں عدمِ تشدد ونکیر کا اصول پیشِ نظر نہ ہونے کی وجہ سے اس کو بھی ملحوظ نہیں رکھا گیا تھا۔

پھر اس اصول اور زیرِ بحث مسئلہ میں پائے جانے والے دیگر اقوال کو ملاحظہ کرنے کے بعد مناسب معلوم ہوا کہ اس مسئلے کی مذکورہ اقوال اور اصول کی روشنی میں وسیع تر انداز میں معتدل تحقیق کر دی جائے۔

جس کے بعد بندہ کی طرف سے اس مسئلے کی جو تحقیق کی گئی، وہ آئندہ اوراق میں پیش کی جارہی ہے، جس میں بندہ نے اس مسئلے کے متعلق اپنے سابق تشدد اور نکیر والے طرزِ عمل سے رجوع کیا ہے، ساتھ ہی بعض دوسرے مواقع، مثلاً نکاح اور تعزیت کے موقع پر مصافحہ و معانقہ پر بھی ضمناً کلام کیا ہے۔

اور مصافحہ ومعانقہ سے متعلق کئی احادیث وروایات اور آثار، اور ان کی اسناد پر بھی کسی قدر تفصیل کے ساتھ گفتگو کی گئی ہے۔

جن کے پیشِ نظر عید کے دن مبارکباد دیتے ہوئے، مصافحہ ومعانقہ کرنے کا جواز، بلکہ بعض جہات سے استحباب ثابت ہوتا ہے۔

ممکن ہے کہ یکطرفہ، یا تشدد پر مبنی طرزِ عمل پسند واختیار کرنے والوں کو بندہ کی موجودہ تحقیق پسند نہ آئے، اور ان کی طبعِ خاطر کو ناگوار گزرے، جس پر بندہ پیشگی معذرت خواہ ہے، لیکن جب بندہ کو اپنی ایسی رائے سے رجوع کرنے میں کوئی عار نہیں، جو بندہ کی بعض تالیفات اور مضامین میں شائع ہوتی رہی، اور بندہ اس رجوع اور وضاحت کو اپنی دینی ذمہ داری اور ایک فریضہ سمجھتا ہے، اور اس طرزِ عمل کو اختیار کرنے پر اللہ کا شکر ادا کرتا ہے، تو دیگر حضرات کو بھی یہ طرزِ عمل ناگوار نہیں گزرنا چاہیے، بلکہ دیگر حضرات کو بھی ہر قسم کے مذہبی ومسلکی تعصب و تحزب سے بالاتر ہوکر، اپنی آراء پر نظرِ ثانی اور رجوع وغیرہ کے طرزِ عمل کو اپنا کر، ان بے شمار فقہائے مجتہدین ومحققین کی اتباع وپیروی کرنی چاہیے، جو آخری دم تک اپنی آراء پر نظرِ ثانی اور رجوع کا طرزِ عمل اختیار فرماتے رہے، زمانۂ قریب کے مشائخ واکابر کو بھی اگر اپنی کسی رائے کا مرجوح یا اجتہادی خطاء پر مبنی ہونا، واضح ہو جاتا، تو وہ بھی اس سے رجوع کرنے میں عار محسوس نہ فرماتے۔

مگر آج کے دور میں اس بات کی بہت زیادہ کمی پائی جاتی ہے، جو قابلِ اصلاح ہے۔

اللہ تعالیٰ حق واعتدال کو سمجھنے اور اختیار کرنے کی توفیق عطا فرمائے، اور اجتہادی واختلافی مسائل میں تشدد اور نکیر کے طرزِ عمل سے حفاظت فرمائے اور حق وصواب کی طرف رجوع کی توفیق مرحمت فرمائے۔ آمین۔

محمد رضوان خان 29/ محرم الحرام/ 1441 ہجری۔ بمطابق 29/ ستمبر/ 2019ء بروز اتوار

ادارہ غفران راولپنڈی پاکستان

(فصل نمبر 1)

مصافحہ ومعانقہ سے متعلق احادیث وروایات

مصافحہ اور معانقہ کرنے یعنی ہاتھ ملانے اور گلے ملنے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا عام معمول یہ تھا کہ جب آپس میں ملاقات ہوتی، تو سلام کرتے اور عذر نہ ہو، تو سلام کے ساتھ مصافحہ کرتے اور جب سفر سے آتے، تو معانقہ کرتے، البتہ بعض اوقات فرحت ومسرت اور محبت ومودت کے اظہار کے مواقع پر بھی سفر وغیرہ کے بغیر معانقہ کرنے کا ثبوت ملتا ہے، جن سے مختلف فقہائے کرام وعلمائے عظام نے استدلال فرمایا ہے۔

اس سلسلہ میں چند احادیث وروایات ذکر کی جاتی ہیں، جن کے ضمن میں ان کی اسناد پر بھی کچھ روشنی ڈالی گئی ہے، جس کے بعد اس سلسلہ میں مختلف فقہائے کرام وعلمائے عظام کے اقوال اور عبارات وفتاویٰ جات اور ان سے حاصل شدہ مختصر فوائد کا بھی ذکر کیا جائے گا۔

ان شاء اللّٰہ تعالیٰ۔

انس رضی اللہ عنہ کی حدیث

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

عَنْ نَبِيِّ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: مَا مِنْ مُسْلِمَيْنِ الْتَقَيَا، فَأَخَذَ أَحَدُهُمَا بِيَدِ صَاحِبِهِ، إِلَّا كَانَ حَقًّا عَلَى اللّٰهِ أَنْ يَحْضُرَ دُعَاءَهُمَا، وَلَا يُفَرِّقَ بَيْنَ أَيْدِيهِمَا حَتّٰى يَغْفِرَ لَهُمَا (مسند احمد، رقم الحديث ۱۲۴۵۱)[1]

---

[1] قال شعيب الارنؤوط: صحيح لغيره، وهذا إسناد حسن (حاشية مسند احمد)

ترجمہ: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو بھی دو مسلمان آپس میں ملتے ہیں، اور اُن میں سے ایک اپنے ساتھی کا ہاتھ پکڑ (کر مصافحہ کر) تا ہے، تو اللہ پر حق ہے کہ اُن دونوں کی دعاء قبول فرمائے، اور اُن کے ہاتھ جدا ہونے سے پہلے اُن دونوں کی مغفرت فرمادے (مسند احمد)

مذکورہ حدیث سے مسلمان سے ملاقات کے وقت، مصافحہ کرنے کی عظیمُ الشان فضیلت معلوم ہوئی، اور ساتھ ہی مصافحہ کے وقت دعاء کا بھی ثبوت ہوا۔

اور سلام بھی ایک طرح کی دعاء ہے، لہٰذا اگر سلام کے ساتھ مصافحہ کیا جائے، تو بھی دعاء کا مقصد حاصل ہوجاتا ہے، جبکہ کوئی دوسری دعاء بھی جائز ہے، اور عید، روزہ، رمضان، نکاح وغیرہ کی مبارکباد دینا بھی ایک طرح کی دعاء ہے، اس لیے وہ بھی مذکورہ حدیث کا مصداق بننے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

نیز بعض روایات میں مصافحہ کو "سلام والی دعاء کا تکملہ" بھی قرار دیا گیا ہے، جس سے اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ مصافحہ دراصل دعاء کا تکملہ ہے، جیسا کہ آگے آتا ہے۔ [1]

انس رضی اللہ عنہ کی دوسری حدیث

حضرت قتادہ سے روایت ہے کہ انہوں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے عرض کیا کہ:

أَكَانَتِ الْمُصَافَحَةُ فِيْ أَصْحَابِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ؟ قَالَ: نَعَمْ (صحيح البخاری، رقم الحديث ۶۲۶۳، کتاب الاستئذان، باب المصافحة)

ترجمہ: کیا مصافحہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں رائج تھا؟ تو حضرت انس رضی

---

[1] ففيه تأكيد أمر المصافحة والحث عليها، نعم يستثنى من عموم الأمر بالمصافحة المرأة الأجنبية والأمرد الحسن (دليل الفالحين لطرق رياض الصالحين، ج۶ ص ۳۶۳، تحت رقم الحديث ۸۸۷، كتاب السلام، باب استحباب المصافحة)

وفيه سنية المصافحة عند الملتقى وأنه يستحب عند المصافحة حمدالله تعالى والاستغفار (تحفة الأحوذي بشرح جامع الترمذي، ج۷، ص ۴۲۹، كتاب الاستئذان، باب ما جاء في المصافحة)

اللہ عنہ نے فرمایا کہ جی ہاں (بخاری)

مطلب یہ ہے کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین، مختلف مواقع پر ایک دوسرے سے مصافحہ فرمایا کرتے تھے، اور صحابۂ کرام کے مابین مصافحہ، کوئی اجنبی عمل نہ تھا۔

اور یہ بات ظاہر ہے کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا یہ عمل، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت سے ہی تھا۔

انس رضی اللہ عنہ کی تیسری حدیث

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے ہی روایت ہے کہ:

كَانَ أَصْحَابُ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا تَلَاقَوْا تَصَافَحُوْا، وَإِذَا قَدِمُوْا مِنْ سَفَرٍ تَعَانَقُوْا (المعجم الاوسط للطبرانی، رقم الحديث ٩٧، ج ١ ص ٣٧، باب الالف) [1]

ترجمہ: نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابۂ کرام، جب آپس میں ملاقات کرتے تھے، تو مصافحہ کرتے تھے، اور جب کسی سفر سے آتے تھے، تو معانقہ کرتے تھے (طبرانی)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا عام معمول اور عادت یہ تھی کہ ملاقات

---

[1] قال الهيثمي:
رواه الطبراني في الأوسط، ورجاله رجال الصحيح (مجمع الزوائد، ج٨ص ٣٦، تحت رقم الحديث ١٢٧٦٥)

وقال الالباني:
قلت: فالإسناد جيد (سلسلة الأحاديث الصحيحة وشيء من فقهها وفوائدها، تحت رقم الحديث ٢٦٤٧)

و قال ابو حذيفه نبيل بن منصور بن يعقوب بن سلطان البصارة الكويتي:
قلت: شيخ الطبراني ذكره الذهبي في "تاريخ الإسلام "ولم يذكر فيه جرحا ولا تعديلا، ويحيى بن سليمان الجعفي مختلف فيه، وثقه الدارقطني وغيره، وقال النسائي: ليس بثقة. والصواب أنه حسن الحديث فقد احتج به البخاري في صحيحه, والباقون كلهم ثقات (انيس الساري تخريج احاديث فتح الباري، ج٦ ص ٣٩٤٣، تحت رقم الحديث ٢٧١٥، حرف الكاف)

کے وقت مصافحہ اور سفر کے موقع پر معانقہ کیا کرتے تھے۔

اور اگر کسی حدیث و روایت سے کسی دوسرے موقع پر مصافحہ، یا معانقہ ثابت ہو، تو وہ اس کے منافی نہیں ہوگا۔

البتہ بعض حضرات نے سفر وغیرہ کے علاوہ دوسرے مواقع پر معانقہ کو مکروہ تنزیہی قرار دیا ہے، اور اس سلسلہ میں بعض احادیث و روایات سے استدلال کیا ہے، جن کا ذکر آگے آتا ہے۔

انس رضی اللہ عنہ کی چوتھی حدیث

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے ہی روایت ہے کہ:

قَالَ رَجُلٌ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَلرَّجُلُ مِنَّا يَلْقٰى أَخَاهُ أَوْ صَدِيْقَهٗ أَيَنْحَنِىْ لَهٗ؟ قَالَ: لَا، قَالَ: أَفَيَلْتَزِمُهٗ وَيُقَبِّلُهٗ؟ قَالَ : لَا، قَالَ: أَفَيَأْخُذُ بِيَدِهٖ وَيُصَافِحُهٗ؟ قَالَ : نَعَمْ (سنن الترمذی، رقم الحدیث ۲۷۲۸، ابواب الاستئذان والآداب، باب ماجاء المصافحة)

ترجمہ: ایک آدمی نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! ہم میں سے ایک آدمی اپنے بھائی، یا دوست سے ملاقات کرتا ہے، کیا وہ اس کے لئے جھکے گا؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نہیں، اس نے عرض کیا کہ کیا وہ اس سے چمٹے گا (یعنی معانقہ کرے گا) اور اس کو بوسہ دے گا؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نہیں، اس نے عرض کیا کہ کیا اس کا ہاتھ پکڑ کر مصافحہ کرے گا؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جی ہاں (ترمذی)

امام ترمذی نے مذکورہ حدیث کی سند کو ''حسن'' قرار دیا ہے۔ [1]

لیکن بعض حضرات نے اس حدیث کی سند کو ''حسن'' قرار دینے سے اختلاف کیا ہے، اور اس حدیث کو انہوں نے ''ضعیف'' قرار دیا ہے، کیونکہ اس روایت کی سند میں ایک راوی

[1] قال الترمذی: هذا حديث حسن (سنن الترمذی، تحت رقم الحديث ۲۷۲۸)

''حنظلة بن عبید اللّٰہ بصری سدوسی'' پر محدثین نے جرح کی ہے اور ان کو ضعیف، منکرُ الحدیث، متروک اور اختلاط کا شکار وغیرہ قرار دیا ہے۔ ۱؎

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی اس حدیث کو ابنِ ماجہ نے بھی روایت کیا ہے۔ ۲؎

لیکن مذکورہ روایت کی سند میں بھی ''حنظلة بن عبید اللّٰہ بصری سدوسی'' راوی پائے جاتے ہیں، جن کے بارے میں پہلے ذکر گزرا۔ ۳؎

۱؎ قال ابن الملقن:

قلت :وفي حسنه نظر؛ لأن في إسناده :حنظلة بن عبيد الله البصري (السدوسي) راوي هذا الحديث عن أنس، وليس له في ت ق غير هذا الحديث، وقد ضعفوه ونسبوه إلى الاختلاط، قال أحمد :هو ضعيف منكر الحديث، يحدث بأعاجيب ومناكير، منها: قلنا :أينحني بعضنا لبعض؟ وقال يحيى بن سعيد :تركته على (عمد) وكان قد اختلط، ونسبه ابن معين وابن حبان (إلى الاختلاط أيضا، زاد ابن حبان) وأنه اختلط حديثه (القديم بحديثه) الأخير .لكنه خالف فذكره في ثقاته أيضا، وقال البيهقي في سننه :هذا حديث تفرد به حنظلة هذا، وكان قد اختلط، تركه يحيى القطان لاختلاطه .وقال عبد الحق في أحكامه :حنظلة هذا يروي مناكير، وهذا الحديث مما أنكر عليه وكان قد اختلط.

تنبيه :وقع لبعض (الأكابر) في الحديث وهم غريب، فذكره فيما وضعه على (المنهاج) بلفظ :أيصافح بعضنا بعضا؟ قال :نعم .قال :أينحني بعضنا لبعض؟ قال :لا .

ثم عزاه إلى صحيح مسلم وهو فاحش، ثم ناقض بعد ذلك بأسطر، فقال :وفي الحديث :يلتزمه ويقبله؟ قال :لا قال :وفي إسناده مقال .وهذا عجيب؛ فهذا طرف من الحديث السالف الذي عزاه أولا إلى صحيح مسلم فتنبه لذلك(البدر المنير في تخريج الأحاديث والأثار الواقعة في الشرح الكبير،لابن الملقن،ج۷،ص۵۱۷، ۵۱۸،كتاب النكاح، باب: ما جاء في استحباب النكاح للقادر على مؤنه ،الحديث السابع عشر)

۲؎ حدثنا علي بن محمد، حدثنا وكيع، عن جرير بن حازم، عن حنظلة بن عبد الرحمن السدوسي عن أنس بن مالك، قال: قلنا: يا رسول الله، أينحني بعضنا لبعض؟ قال: " لا "قلنا: أيعانق بعضنا بعضا؟ قال: " لا، ولكن تصافحوا (سنن ابنِ ماجه، رقم الحديث ۳۷۰۲، باب المصافحة)

۳؎ قال شعيب الارنؤوط:

إسناده ضعيف لضعف حنظلة السدوسي.

وأخرجه الترمذي (2925)من طريق عبد الله بن المبارك، والبيهقي 100 /7من

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

نیز مذکورہ حدیث کو امام احمد نے بھی روایت کیا ہے۔ ١

لیکن مذکورہ حدیث کی سند میں بھی وہی راوی پائے جاتے ہیں، جن کا ذکر پہلے گزرا، اس لیے مذکورہ حدیث کو بھی سند کے اعتبار سے بعض اہلِ علم حضرات نے ضعیف ہی قرار دیا ہے۔

نیز معانقہ کا ثبوت کئی معتبر احادیث میں پایا جاتا ہے، بلکہ خود حضرت انس رضی اللہ عنہ کی احادیث ہی میں اس کا ثبوت مذکور ہے، جیسا کہ پہلے گزرا۔

اس لیے بعض حضرات نے مذکورہ حدیث کے مقابلہ میں معانقہ کے ممنوع ومکروہ ہونے کے بجائے، جائز ہونے والی احادیث وروایات ہی کو ترجیح دی ہے۔ ٢

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

طريق حماد بن زيد، كلاهما عن حنظلة بهذا الإسناد، وقال البيهقي بإثره وهذا ينفرد به حنظلة السدوسي وقد كان اختلط، تركه يحيى القطان لاختلاطه.

وهو في "مسند أحمد (13044) "، وانظر تمام الكلام عليه هناك، ففيه رد على الشيخ الألباني الذي حسنه بمتابعات لا يفرح بها (حاشية سنن ابن ماجه)

١ حدثنا مروان بن معاوية، حدثنا حنظلة بن عبد الله السدوسي، قال: حدثنا أنس بن مالك قال: قال رجل: يا رسول الله، أحدنا يلقى صديقه أينحني له؟ قال: فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: " لا ."قال: فيلتزمه ويقبله؟ قال: " لا ."قال: فيصافحه؟ قال: " نعم إن شاء (مسند احمد، رقم الحديث ١٣٠٤٤)

٢ قال شعيب الارنؤوط:

إسناده ضعيف لضعف حنظلة بن عبد الله السدوسي، وقيل: ابن عبيد الله، وقيل: ابن عبد الرحمن، وقيل: ابن أبي صفية، وقد استنكر الإمام أحمد له هذا الحديث كما في "الجرح والتعديل 3/241 "

وأخرجه ابن أبي شيبة 8/619، وعبد بن حميد (1217)، والترمذي و (2728)، وابن ماجه (3702)، وأبو يعلى (4287)، والطحاوي في "شرح معاني الآثار" 4/281، وابن عدي في "الكامل 2/828 "، والبيهقي في "السنن 7/100 "، وابن عبد البر في "التمهيد 21/15 "و16، والمزي في ترجمة حنظلة من "تهذيب الكمال" 7/450 من طرق عن حنظلة السدوسي، بهذا الإسناد .وحسنه الترمذي!

وأخرجه ابن عدي 6/2086 من طريق كثير بن عبد الله الأبلي أبي هاشم، عن أنس. وهذا إسناد ضعيف جدا لا يصلح للمتابعة، كثير بن عبد الله قال فيه البخاري وأبو حاتم والنسائي وأبو أحمد الحاكم: منكر الحديث .زاد أبو حاتم: ضعيف الحديث جدا،

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

اور اگر مذکورہ حدیث کو سند کے اعتبار سے ایک درجہ میں معتبر مانا جائے، تو مذکورہ حدیث میں معانقہ کی ممانعت، کراہتِ تنزیہی پر محمول ہوگی، وہ بھی اس وقت جب کہ کراہت کی کوئی وجہ پائی جائے، مثلاً جب معانقہ، شہوت، یا تملّق و تعظیم وغیرہ کے طریقہ پر ہو، یا اس پر موقع

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

شبه المتروک .وقال النسائی أیضا: متروک.

وذکر الألبانی فی "صحیحته (160) "لهذا الحدیث طریقین آخرین من "المنتقی" للضیاء، وهما ضعیفان جدا لا یصلحان للمتابعة: الأول: من طریق أبی بلال الأشعری، عن قیس بن الربیع، عن هشام بن حسان، عن شعیب بن الحبحاب، عن أنس .ولم یسق الإسناد ممن دون أبی بلال.

وأبو بلال هذا: اسمه مرداس بن محمد بن الحارث بن عبد الله بن أبی بردة، ذکره ابن حبان فی "الثقات 9/199 "، وقال: یغرب ویتفرد، وضعفه الدارقطنی فی "السنن" 1/220، وقال ابن القطان فی "الوهم والإیهام :3/227 "لا یعرف البتة .یعنی فی باب التوثیق، ونقل ابن حجر فی "لسان المیزان 6/14 "عن الحاکم أنه لینه، وذکره الذهبی فی "المیزان 4/88 "واستنکر له خبره فی التسمیة علی الوضوء .قلنا: والحدیث لا یحفظ إلا من طریق حنظلة.

الثانی: من طریق عبد العزیز بن أبان، عن إبراهیم بن طهمان، عن المهلب ابن أبی صفرة، عن أنس.

وعبد العزیز هذا متفق علی ترکه، واتهمه غیر واحد بالوضع.

قلنا: لکن ثبتت مشروعیة المصافحة عن أنس فی غیر هذا الحدیث، فقد أخرج البخاری (6263)، والترمذی (2729)، وأبو یعلی (2871)، وابن حبان (792)، والبیهقی 7/99 من طریق قتادة: قلت لأنس: أکانت المصافحة فی أصحاب النبی صلی الله علیه وسلم؟ قال: نعم.

وأخرجه الطبرانی فی "الأوسط (97) "بلفظ: کان أصحاب النبی صلی الله علیه وسلم إذا تلاقوا تصافحوا، وإذا قدموا من سفر تعانقوا.

وسلف فی الحدیث (12582)أن الأشعریین حین قدموا المدینة کانوا أول من أحدث المصافحة، وانظر أیضا ما سلف برقم . (12451)

وفی الباب عن أبی ذر الغفاری، سیأتی .5/162

وعن عطاء بن أبی مسلم الخراسانی مرسلا رواه عنه مالک فی "الموطأ .2/908" ولفظه:" تصافحوا یذهب الغل، وتهادوا تحابوا، وتذهب الشحناء."

قال شعیب: کنت حسنت حدیث أنس هذا فی "شرح السنة 12/290 "، وقد تبین لی الآن أنه لا یمکن أن یرقی إلی الحسن بهذه الطرق، فیستدرک (حاشیه مسند احمد، تحت رقم الحدیث ۱۳۰۴۴)

بے موقع دوام والتزام وغیرہ ہو۔

ورنہ اگر سفر سے آمد، یا رخصت ہوتے وقت، یا طویل وقت کے بعد ملاقات کے موقع پر، یا کسی دوسرے موقع پر مخلصانہ للّٰہی، محبت اور اظہارِ سرور وغیرہ کی وجہ سے ہو، یا اتفاقاً ہو، اور فتنہ سے بھی امن ہو، تو پھر مذکورہ کراہت بھی نہیں ہوگی، ان چیزوں کی مختلف محدثین اور اہلِ علم حضرات نے تصریح فرمائی ہے۔ [1]

---

[1] قوله: (أيعانق بعضنا بعضا) أى: على الدوام فلذا قال لا، وإلا فالمعانقة أحيانا إظهار لشدة المحبة المعانقة قد جاء والله أعلم (حاشية السندى على سنن ابن ماجه، ج۲، ص ۳۹۸، كتاب الادب، باب المصافحة)

ايعانق بعضنا بعضا الخ قال لادبه قال أبو حنيفة انه يكره المعانقة وما روى الترمذى انه صلى الله عليه وسلم اعتنق زيد بن حارثة حين قدم المدينة فيدل على جوازها لكن للقادم من السفر فيجوز للقادم ولا يجوز نعيره وقال النووى المعانقة وتقبيل الوجه مكروهان صرح به البغوى للحديث الصحيح فى النهى عنهما كراهة تنزيهة انتهى وقال الشيخ اما المعانقة فالصحيح انها جائزة ان لم يكن هناک خوف فتنة لما ورد فى حديث قصة زيد بن حارثة وجعفر بن أبى طالب ونقل عن الشيخ أبى المنصور الماتريدى فى التوفيق بين الأحاديث ان المكروه من المعانقة ما كان على وجه الشهوة وأما على وجه البر والكرامة فجائزة (ما يليق من حل اللغات وشرح المشكلات على سنن ابنِ ماجه، لفخر الحسن بن عبد الرحمن الحنفى الكنكوهى، ص ۲۶۳، كتاب الادب ، باب المصافحة ، الناشر:قديمى كتب خانة – كراتشى، الباكستان،مطبوعة : ۱۴۰۷هـ)

استدل بهذا من كره المعانقة والتقبيل، قيل :المكروه ما كان على وجه التملق والتعظيم فى الحضر، وأما المأذون فيه فعند التوديع، والقدوم من السفر، وطول العهد بالصاحب، وشدة الحب فى الله تعالى، مع أمن النفس، ومن قبل فلا يقبل الفم بل اليد والجبهة والرأس، وقيل :لا يكره التقبيل لزهد وعلم وكبر سن(شرح مصابيح السنة للإمام البغوى،لابن المَلَک، ج۵،ص ۱۷۶ ، كتاب الأدب، باب المصافحة والمعانقة)

وقوله: (قال: أفيلتزمه ويقبله؟ قال: لا) وهذا متمسک ما روى عن أبى حنيفة ومحمد من كراهة المعانقة والتقبيل، وقيل: المكروه إنما هو ما كان على سبيل التملق والتعظيم، والجائز ما كان عند التوديع والقدوم، أو لطول عهد الملاقاة، أو شدة الحب فى الله، وعند الأمن من الفتنة، وإن قبل لا يقبل الفم بل اليد أو الجبهة، والصحيح أنه عند القدوم جائز بالاتفاق (لمعات التنقيح، لعبد الحق المحدث الدّهلوى، ج۸، ص ۴۶، كتاب الآداب، باب المصافحة والمعانقة)

براء رضی اللہ عنہ کی حدیث

حضرت براء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ: مَا مِنْ مُسْلِمَیْنِ یَلْتَقِیَانِ، فَیَتَصَافَحَانِ إِلَّا غُفِرَ لَھُمَا قَبْلَ أَنْ یَّفْتَرِقَا (سنن ابی داؤد، رقم الحدیث ۵۲۱۲، کتاب الادب، باب فی المصافحۃ) [1]

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو بھی دو مسلمان آپس میں ملتے ہیں، پھر ایک دوسرے سے مصافحہ کرتے ہیں، تو اُن دونوں کے جدا ہونے سے پہلے، ان کی مغفرت کردی جاتی ہے (ابوداؤد)

اس حدیث سے مسلمان سے ملاقات کے وقت مصافحہ کرنے کی عظیم الشان، فضیلت معلوم ہوئی۔

اور ملاقات کا مفہوم وسیع ہے، جس میں کہیں اور کسی دوسری جگہ سے چل کر آنا ضروری نہیں، بلکہ جس طرح تھوڑی سی جدائیگی کے بعد سلام کا ثبوت اور جواز ہے، اسی طرح مصافحہ بھی جائز ہوگا۔

براء رضی اللہ عنہ کی دوسری حدیث

حضرت براء رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ:

مِنْ تَمَامِ التَّحِیَّۃِ أَنْ تُصَافِحَ أَخَاکَ (الادب المفرد للبخاری، رقم الحدیث ۹۶۸، باب المصافحۃ، مکتبۃ المعارف للنشر والتوزیع، الریاض) [2]

ترجمہ: آپ کا اپنے (مومن) بھائی سے مصافحہ کرنا، سلام کو مکمل کرنے کی چیز ہے (ادب المفرد)

---

[1] قال شعیب الارنؤوط: صحیح لغیرہ، وھذا إسناد ضعیف (حاشیۃ سنن ابی داؤد)

[2] قال الالبانی: صحیح ۔ الإسناد موقوفاً (حوالہ بالا)

اس قسم کا مضمون مرفوع حدیث اور بعض صحابہ وتابعین کے آثار میں بھی مروی ہے۔ [1]
اور اگر چہ ان روایات کی سند میں کلام ہے، لیکن مجموعی طور پر یہ مضمون درست ہے، اور حضرت براء رضی اللہ عنہ کی موقوف سند صحیح ہے۔ [2]
مطلب یہ ہے کہ سلام کے ساتھ اگر مصافحہ بھی کرلیا جائے، تو یہ زیادہ فضیلت اور افادیت کا باعث ہے۔
کیونکہ خود سلام ہی مسلمانوں میں محبت کا ذریعہ ہے، اور مصافحہ کی وجہ سے اس میں مزید اضافہ ہوتا ہے، جبکہ غرضِ فاسد نہ ہو۔
یہ بھی ملحوظ رہے کہ بعض روایات میں مصافحہ کے ساتھ دعاء کی بھی خاص فضیلت کا ذکر آیا ہے، اور سلام بھی ایک طرح کی دعاء ہے، جیسا کہ پہلے گزرا۔

---

[1] حدثنا أحمد بن عبدة الضبى قال :حدثنا يحيى بن سليم الطائفى، عن سفيان، عن منصور، عن خيثمة، عن رجل، عن ابن مسعود، عن النبى صلى الله عليه وسلم قال :من تمام التحية الأخذ باليد(سنن الترمذى،رقم الحديث ٢٧٣٠)

قال الترمذى: هذا حديث غريب ولا نعرفه إلا من حديث يحيى بن سليم عن سفيان .سألت محمد بن إسماعيل، عن هذا الحديث فلم يعده محفوظا، وقال :إنما أراد عندى حديث سفيان عن منصور، عن خيثمة، عمن سمع ابن مسعود عن النبى صلى الله عليه وسلم، قال :لا سمر إلا لمصل أو مسافر قال محمد وإنما يروى عن منصور عن أبى إسحاق عن عبد الرحمن بن يزيد، أو غيره، قال: من تمام التحية الأخذ باليد.

عن أبى أمامة ، قال : قال رسول الله صلى الله عليه وسلم : تمام تحيتكم المصافحة (مصنف ابنِ ابى شيبة،رقم الحديث ٢٦٢٣٨)

عن ابن الأسود ، قال : إن من تمام التحية المصافحة(مصنف ابنِ ابى شيبة،رقم الحديث ٢٦٢٣٦)

عن الأسود ، قال : إن من تمام التحية المصافحة (مصنف ابنِ ابى شيبة، رقم الحديث٢٦٢٣٧)

[2] قلت :وجملة القول أن طرق هذا الحديث كلها واهية، وبعضها أشد ضعفا من بعض،فليس فيها ما يمكن الاعتماد عليه كشاهد صالح، فالذى أستخير الله فيه أنه ضعيف مرفوعا، صحيح موقوفا .والله أعلم(سلسلة الأحاديث الضعيفة ،تحت رقم الحديث ١٢٨٨)

حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ کی حدیث

حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: إِنَّ الْمُؤْمِنَ إِذَا لَقِيَ الْمُؤْمِنَ فَسَلَّمَ عَلَيْهِ، وَأَخَذَ بِيَدِهِ، فَصَافَحَهُ، تَنَاثَرَتْ خَطَايَاهُمَا، كَمَا يَتَنَاثَرُ وَرَقُ الشَّجَرِ (المعجم الاوسط للطبرانی، رقم الحدیث ۲۴۵، ج ۱ ص ۸۴، باب الالف) [1]

ترجمہ: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب ایک مؤمن، دوسرے مؤمن سے ملتے ہوئے اُسے سلام کرتا ہے، اور اُس کا ہاتھ پکڑ کر اُس سے مصافحہ کرتا ہے، تو اُن دونوں (مصافحہ کرنے والے افراد) کی خطائیں، اس طرح جھڑ جاتی ہیں، جس طرح درخت کے پتے جھڑ جاتے ہیں (طبرانی)

اور حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ سے ہی روایت ہے کہ:

أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ عَلَيْهِ السَّلَامُ لَقِيَهُ، فَقَالَ: "يَا حُذَيْفَةُ، نَاوِلْنِيْ يَدَكَ فَقَبَضَ يَدَهُ، ثُمَّ الثَّانِيَةَ، ثُمَّ الثَّالِثَةَ فَقَالَ: مَا يَمْنَعُكَ؟" فَقَالَ: إِنِّيْ

---

[1] قال المنذری:

رواه الطبرانی فی الأوسط ورواته لا أعلم فیهم مجروحا (الترغیب والترهیب، تحت رقم الحدیث ۴۱۱۵، الترغیب فی المصافحة والترهیب من الإشارة فی السلام وما جاء فی السلام علی الكفار)

وقال الهیثمی:

رواه الطبرانی فی الأوسط، ویعقوب بن محمد بن الطحلاء، روی عنه غیر واحد ولم یضعفه أحد، وبقیة رجاله ثقات (مجمع الزوائد، تحت رقم الحدیث ۱۲۷۶۶، باب المصافحة والسلام ونحو ذلک)

وقال الالبانی:

قلت: وله شواهد یرقی بها إلی الصحة (سلسلة الاحادیث الصحیحة، تحت رقم الحدیث ۱۶)

جُنُبٌ، فَقَالَ: إِنَّ الْمُؤْمِنَ إِذَا لَقِيَ الْمُؤْمِنَ فَأَخَذَ بِيَدِهِ تَحَاتَّتْ خَطَايَاهُ كَمَا تَحَاتُّ وَرَقُ الشَّجَرِ (الجامع لابن وهب، رقم الحديث ٢٥٠، ص ٣٥٥، الإخاء في الله ،الناشر: دار ابن الجوزي – الرياض ،الطبعة: الأولى 1416 هـ - 1995م) [1]

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ان سے ملاقات ہوئی، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے حذیفہ! آپ اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیجیے (یعنی مجھ سے مصافحہ کیجیے) تو حضرت حذیفہ نے اپنے ہاتھ کو کھینچ لیا، پھر دوسری دفعہ ایسا ہی ہوا، پھر تیسری دفعہ ایسا ہی ہوا، اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آپ کو کس چیز کی وجہ سے رکاوٹ ہے؟ تو حضرت حذیفہ نے جواب میں کہا کہ میں جنابت کی حالت میں ہوں، اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مومن جب مومن سے ملاقات کرتا ہے، پھر اس کا ہاتھ پکڑتا ہے (یعنی مصافحہ کرتا ہے) تو اس کے گناہ اس طرح سے جھڑ جاتے ہیں، جس طرح سے درخت کے پتے جھڑ جاتے ہیں (ابن وہب)

مذکورہ احادیث وروایات سے مصافحہ کرنے کی عظیم فضیلت معلوم ہوئی۔

بعض دوسری احادیث میں بے وضو یا جنابت کی حالت میں مصافحہ کا جائز ہونا بھی مذکور ہے، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ جنابت کی حالت میں، مصافحہ کرنا جائز ہے۔ [2]

---

[1] قال الالبانی:

قلت: وهذا إسناد جيد رجاله ثقات رجال مسلم إلا أنه إنما أخرج لابن لهيعة – واسمه عبد الله – مقرونا بغيره وهو صحيح الحديث إذا كان من رواية العبادلة عنه، كهذا على ما هو مقرر في ترجمته (سلسلة الاحاديث الصحيحة، تحت رقم الحديث ٥٢٦)

[2] عن أبي بردة، عن حذيفة قال: كان رسول الله صلى الله عليه وسلم إذا لقي الرجل من أصحابه ماسحه ودعا له. قال: فرأيته يوما بكرة فحدت عنه، ثم أتيته حين ارتفع النهار فقال: إني رأيتك فحدت عني .فقلت: إني كنت جنبا فخشيت أن تمسني .فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: إن المسلم لا ينجس (سنن النسائي، رقم الحديث ٢٦٧)

ابواُمامہ رضی اللہ عنہ کی حدیث

حضرت ابواُمامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: إِذَا تَصَافَحَ الْمُسْلِمَانِ لَمْ تَفْرُقْ أَكُفُّهُمَا حَتّٰى يُغْفَرَ لَهُمَا (المعجم الكبير للطبرانی، رقم الحديث ٨٠٧٦، ج٨ص٢٨٠) [1]

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب دو مسلمان آپس میں مصافحہ کرتے ہیں، تو اُن کی ہتھیلیوں کے جُدا ہونے سے پہلے، اُن کی مغفرت کردی جاتی ہے (طبرانی)

اس حدیث سے بھی مصافحہ کرنے کی زبردست فضیلت معلوم ہوئی۔

جبکہ اس طرح کی بعض دوسری احادیث وروایات، پہلے بھی ذکر کی جاچکی ہیں۔

ابنِ عباس رضی اللہ عنہ کی حدیث

حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

ضَمَّنِي النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِلٰى صَدْرِهٖ، وَقَالَ: اَللّٰهُمَّ عَلِّمْهُ الْحِكْمَةَ (صحيح البخاری، رقم الحديث ٣٧٥٦، كتاب اصحاب النبی صلی الله عليه وسلم، باب ذكر ابن عباس رضی الله عنهما)

ترجمہ: مجھے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے سینے سے ملایا، اور فرمایا کہ اے اللہ! اس کو حکمت کا علم عطاء فرمائیے (بخاری)

---

[1] قال الهيثمی: رواه الطبرانی، وفيه مهلب بن العلاء، ولم أعرفه، وبقية رجاله ثقات (مجمع الزوائد، تحت رقم الحديث ١٢٧٧٢، باب المصافحة والسلام ونحو ذلك)

وقال الالبانی: صحيح (صحيح الجامع الصغير وزيادته، تحت رقم الحديث ٤٣٣)

اس حدیث سے علامہ عینی وغیرہ نے معانقہ کے مستحب ہونے پر استدلال کیا ہے۔

اور فرمایا کہ مکروہ معانقہ وہ ہے، جو شہوت کے طریقے پر ہو، لیکن جب نیک نیتی، مومن سے حسنِ سلوک اور اس کے اکرام کے طور پر ہو، تو جائز ہے۔

اور یہ بات واضح ہے کہ مذکورہ واقعہ میں سفر وغیرہ کی قید مذکور نہیں، جس کا تقاضا یہ ہے کہ اگر کسی موقعہ پر سفر کے بغیر نیک نیتی کے ساتھ دوسرے کے اکرام وحسنِ سلوک کی ضرورت ہو، تو اس وقت بھی معانقہ جائز ہے، جیسا کہ آج کل پاس بیٹھے اور گفت وشنید کرتے ہوئے، مختلف افراد میں مصالحت ومفاہمت وغیرہ کے بعد، ایک دوسرے سے معانقہ کرنے کو اختیار کیا جاتا ہے۔ [1]

جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

لَـمَّـا قَدِمَ جَعْفَرُ مِنَ الْحَبَشَةِ عَانَقَهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ (مسند ابی یعلیٰ الموصلی، رقم الحدیث ۱۸۷۶، ج۳ص۳۹۸، مسند جابر)

ترجمہ: جب حضرت جعفر رضی اللہ عنہ حبشہ سے آئے، تو ان سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے معانقہ فرمایا (ابی یعلیٰ)

بعض اہلِ علم حضرات نے مذکورہ حدیث کی سند کو ضعیف قرار دیا ہے۔ [2]

---

[1] فیہ استحباب الضم، وھو إجماع للطفل والقادم من سفر ولغیرھما، ومکروہ عند البغوی، والمختار جوازہ، ومحل ذلک إذا لم یؤد إلی تحریک شھوۃ .ھذا مذھب الشافعی، ومذھب أبی حنیفۃ أن ذلک یجوز إذا کان علیہ قمیص، وقال الإمام أبو منصور الماتریدی :المکروہ من المعانقۃ ما کان علی وجہ الشھوۃ، وأما علی وجہ البر والکرامۃ فجائز (عمدۃ القاری شرح صحیح البخاری، ج۲،ص۶۷، کتاب العلم، باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم :اللھم علمہ الکتاب)

[2] قال حسین سلیم أسد الدارانی:

إسنادہ ضعیف (حاشیۃ مسند ابی یعلیٰ)

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کا مذکورہ واقعہ، حضرت شعبی سے مرسلاً بھی مروی ہے۔ [1]

لیکن اس کی سند کو بھی بعض اہلِ علم حضرات نے ضعیف قرار دیا ہے۔ [2]

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

و قال الهيثمی:

رواه أبو يعلى، وفيه مجالد بن سعيد، وهو ضعيف وقد وثق، وبقية رجاله رجال الصحيح (مجمع الزوائد، تحت رقم الحديث ١٥٤٩٠)

و قال البوصيری:

هـذا إسـنـاد ضـعيف؟ لـضعف مجالد بن سعيد(اتحاف الخيرة المهرة بزوائد المسانيد العشرة،تحت رقم الحديث ٥٢٨٢، ج٦ ص ١٤١،كتاب الأدب وغيره،باب المصافحة والمعانقة والقبلة والترهيب من الإشارة فی السلام)

[1] حدثنا أبو بكر بن أبی شيبة ، عن علی بن مسهر ، عن الأجلح بن عبد الله الكندی ، عـن الشـعبـی ، أن الـنبی صلی الله عليه وسلم تلقی جعفر بن أبی طالب فالتزمه وقبل ما بين عينيه قال أبو داود :روی هـذا ، مسندا ولم يصح(مراسيل أبی داود، رقم الحديث ٤٩١، ص٣٣٧)

حـدثـنـا أبو داود ، ثنا أبو بكر بن أبی شيبة قال :ثـنـا عـلی بن مسهر ، عن الأجلح ، عن الشعبی : أن الـنبـی صلی الله تعالی عليه وسلم تلقی جعفر بن أبی طالب فالتزمه ، وقبل مـا بيـن عـيـنيـه(الـقبـل والـمـعانقة والمصافحة لابن الأعرابی، تحت رقم الحديث ٣٨، ص٦٨ ،باب قبلة ما بين العينين)

[2] قال د.سعد بن ناصر بن عبد العزيز الشَّثری:

حـدثـنـا عثمان بن أبی شيبة، حدثنا إسماعيل بن مجالد، عن أبيه، عن عامر هو الشعبی ، عن جابر رضی الله عنه، قال :لما قدم جعفر رضی الله عنه، من الحبشة عانقه رسول الله -صلی الله عليه وسلم.

الحكم عليه:

هذا إسناد ضعيف علته مجالد بن سعيد.

وذكره البوصيری فی الإتحاف (ج /2ق 139ب مختصر) وقال :رواه أبو يعلی بسند ضعيف.

وذكره الهيثمی فی المجمع (272 /9) وقال :رواه أبو يعلی وفيه مجالد بن سعيد وهو ضعيف وقد وثق.

تخريجه:

هو فی مسند أبی يعلی (398 /3) بنفس الإسناد والمتن.

وهذا الحديث مداره الشعبی واختلف عليه فيه:

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

البتہ ہمیں راجح یہ معلوم ہوا کہ مذکورہ واقعہ مختلف اسناد سے مروی ہونے کی وجہ سے سند کے

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

- 1فروی عنه، عن جابر، وله عن الشعبي طريقان:
الأولى :عن الأجلح بن عبد الله الكندى، عن الشعبى، عن جابر.
أخرجه الحاكم (2/ 624)، (3/ 211)، وعنه البيهقى فى الدلائل .(4/ 246)
وفـى إسناده الحسن بن الحسين العرنى .قال أبو حاتم :لـم يكن بصدوق عندهم، كان من رؤساء الشيعة، وقال ابن عدى :لا يشبه حديثه حديث الثقات .وقال ابن حبان :يأتى عـن الأثبـات بـالـملزقات، ويروى المقلوبات .ميزان الاعتدال .(1/ 483)فـالإسناد ضعيف جدا.
الثانية :عن مجالد بن سعيد، عن الشعبى، عن جابر.
أخرجه أبو يعلى (3/ 398)وتقدم أنه ضعيف لضعف مجالد.
- 2وروى عنه، عن عبد الله بن جعفر، عن أبيه.
أخرجه البزار كما فى الكشف (3/ 285)، والطبرانى فى الكبير (9/ 102)، وأبو نعيم فـى الـمعرفة (ج /1ق 119ب) كـلهـم مـن طـريـق مـجـالد بن سعيد، عن الشعبى به . ومجالد ضعيف.
- 3وروى عنه، عن جعفر به.
أخـرجه البزار كما فى الكشف (3/ 285) مـن طريق يحيى بن هانىء، حدثنا أجلح، عن الشعبى به .ويـحيـى ابـن هـانـىء هـو يحيى بن محمد بن عباد بن هانىء، قال فى التقريب (ص 596) :ضعيف، وكان ضريرا يتلقن.
- 4وروى عنه، عن عبد الله بن جعفر به.
أخـرجه البيهقى فى الكبرى (7/ 101)، وفى الشعب (6/ 477)، وفى سنده مجالد بن سعيد تقدم أنه ضعيف.
- 5وروى عنه مرسلا وله عن الشعبى طريقان:
الأولى :عن أجلح بن عبد الله الكندى، عن الشعبى مرسلا.
أخرجه ابن أبى شيبة (8/ 621)، وعـنـه ابن أبى عاصم فى الآحاد والمثانى (1/ 276)، وأبو داود (131 /14العـون)، ومن طريق ابن أبى شيبة أخرجه ابن الأعرابى فى كتاب الـقبـل والمعانقة (ح 37)، والـطبـرانى فى الكبير (2/ 108) عـن عـلى بن مسهر، عن أجلح به.
وأخـرجـه ابـن سـعـد فـى الـطبقات، وابن الأعرابى فى كتاب القبل والمعانقة (ح 38)، والبيهـقـى فـى الـكبرى (7/ 101)، وفى الآداب (ح 296) كـلهـم مـن طـريق سفيـان الثورى، عن أجلح به.
وأخرجه سفيان بن عيينة فى جامعه كما فى الفتح (11/ 59) عن أجلح به.

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

اعتبار سے حسن درجہ میں داخل ہونے کی صلاحیت وگنجائش رکھتا ہے۔

﴿ گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ ﴾

وأخرجه البزار كما في الكشف (3/ 285) من طريق خالد بن عبد الملك، عن أجلح به.

ومدار هذه الأسانيد على أجلح بن عبد الله الكندي، قال في التقريب (ص 96): صدوق، شيعي.

الثانية والثالثة :عن إسماعيل بن أبي خالد، وزكريا بن أبي زائدة، عن الشعبي مرسلا. أخرجه الحاكم في المستدرك .(3/ 211)

وقال الحاكم :هذا حديث صحيح، إنما ظهر بمثل هذا الإسناد الصحيح مرسلا، وقد وصله أجلح بن عبد الله .وقال الذهبي :وهو الصواب أي المرسل.

قلت :الصواب كما قال الذهبي المرسل إذ رواه جمع من الثقات عن أجلح، عن الشعبي مرسلا وتابع أجلح إثنان كما تقدم.

وللحديث شواهد عن عائشة، وأبي جحيفة، وعلي رضي الله عنهم:

أما حديث عائشة رضي الله عنها قالت :لما قدم جعفر وأصحابه استقبله النبي -صلى الله عليه وسلم -فقبله بين عينيه.

فأخرجه ابن أبي الدنيا في الإخوان (ح 123)، وابن عدي في الكامل (6/ 220)، ومن طريقه البيهقي في الشعب (6/ 477)، والبغوي في معجم الصحابة كما في الفتح (7/ 60).

ومدار أسانيدهم على محمد بن عبد الله بن عبيد بن عمير المكي، ضعفه ابن معين، وقال البخاري :منكر الحديث، وقال النسائي :متروك، ميزان الاعتدال (3/ 591)، فالإسناد ضعيف جدا.

وأما حديث أبي جحيفة بنحو حديث عائشة.

فأخرجه ابن أبي عاصم في الآحاد والمثاني (1/ 277)، والطبراني في الكبير 102 /7)، 100 /25(، وفي الأوسط كما في المجمع (9/ 271)، وفي الصغير (ح 30) .

وقال الطبراني في الأوسط والصغير :لم يروه عن معمر إلا مخلد بن يزيد، تفرد به الوليد بن عبد الملك .وفي سند الطبراني في الصغير أحمد بن خالد بن مسرح الحراني قال الدارقطني :ليس بشيء، ميزان الاعتدال (1/ 95)، وبقية رجاله بين ثقة وصدوق .وفي سند الطبراني في الكبير في الموضع الثاني أنس بن مسلم الخولاني له ترجمة في تهذيب تاريخ دمشق .(3/ 138)ولم يورد فيه ابن عساكر جرحا ولا تعديلا. وروى عنه جماعة فهو مستور.

وأما حديث علي رضي الله عنه، قال :قدم جعفر من أرض الحبشة في يوم فتح خيبر فقبله رسول الله -صلى الله عليه وسلم.-

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

جس کی بعض اہلِ علم حضرات نے توضیح وتفصیل بیان کی ہے۔ [1]

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

فأخرجه ابن عدى فى الكامل .(5/ 243)وفى إسناده عيسى بن عبد الله بن محمد، قال الدارقطني :متروك الحديث، وقال ابن حبان :يروى عن آبائه أشياء موضوعة، وقال ابن عدى :عامة ما يرويه لا يتابع عليه.

الكامل (5/ 243)، وميزان الاعتدال .(3/ 315)(حاشية المطالب العالية ، تحت رقم الحديث ٢٧٠٣، ج ١١،ص ٨٢١ الٰى ٨٢٣،كتاب الأدب،باب الالتزام والمعانقة والمصافحة)

[1] قال سعد بن ناصر بن عبد العزيز الشَّثرى:

وقال أبو يعلى حدثنا عثمان بن أبى شيبة، ثنا (إسماعيل)) بن مجالد، عن أبيه، عن عامر، عن جابر رضى الله عنه قال " :لما قدم جعفر رضى الله عنه من الحبشة عانقه النبى -صلى الله عليه وسلم."-

درجته:

ضعيف بهذا الإسناد لضعف مجالد بن سعيد، والله أعلم.

وقد سكت عنه البوصيرى (/59 /3ب)

وقال الهيثمى فى المجمع (9/ 275)، رواه أبو يعلى وفيه مجالد بن سعيد وهو ضعيف وقد وثق وبقية رجاله رجال الصحيح.

تخريجه:

هذا الحديث مداره على الشعبى واختلف عليه فيه على ثلاثة أوجه:

الوجه الأول :مرفوعا عنه عن جابر رضى الله عنه:

رواه الحاكم فى المستدرك (3/ 211)، عن على بن عبد الرحمن بن عيسى السبيعى، عن الحسين بن الحاكم الحيرى، عن الحسن بن الحسين العرنى، عن أجلح بن عبد الله، عن الشعبى عن جابر رضى الله عنه قال :لما قدم رسول الله -صلى الله عليه وسلم -من خيبر قدم جعفر رضى الله عنه من الحبشة تلقاه رسول الله -صلى الله عليه وسلم -فقبل جبهته ثم قال" :والله ما أدرى بأيهما أنا أفرح بفتح خيبر أم بقدوم جعفر."

ويأتى كلام الحاكم رحمة الله عليه عند ذكر المرسل.

ورواه من طريقه البيهقى فى الدلائل (4/ 246) به، بنحوه.

ورواه الحاكم أيضا فى المستدرك (2/ 624)، فى كتاب التاريخ، عن أبى الحسن على بن محمد بن عقبة الشيبانى، عن الهيثم بن خالد، عن أبى غسان النهدى، عن الأجلح به، بنحوه.

وقال الحاكم :هذا حديث صحيح الإسناد ولم يخرجاه.

وأقره الذهبى.

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

اور بڑی تفصیل کے ساتھ اس واقعہ کی مختلف اسناد پر کلام کیا ہے، جو اہلِ علم حضرات کے لیے

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

وقد تابع الشعبی فی روایته عن جابر أبو الزبیر : أخرج حدیثه البیهقی فی الدلائل (4/ 246)، عن أبی عبد الله الحافظ، عن أبی الحسن بن أبی إسماعیل العلوی، عن أحمد بن محمد البیروتی، عن محمد بن أحمد بن أبی طیبة، عن مکی بن إبراهیم الرعینی، عن سفیان الثوری، عن أبی الزبیر، عن جابر رضی الله عنه بنحوه.

لکن قال البیهقی رحمه الله :فی إسناده إلی الثوری من لا یعرف.

الوجه الثانی :عن الشعبی، عن عبد الله بن جعفر رضی الله عنهما.

رواه البیهقی فی شعب الإیمان (477 /6)، عن أبی الحسین بن عبدان، عن أحمد بن عبید، عن إسماعیل بن الفضل، عن خلیفة بن خیاط، عن زیاد بن عبد الله البکائی، عن مجالد، عن الشعبی، عن عبد الله بن جعفر بنحوه لکن قال :فقبل شفتیه.

قال البیهقی :هکذا وجدته وروایة بین عینیه وإن کانت مرسلة أصح.

ورواه فی السنن الکبری (101 /7)- کتاب النکاح -باب ما جاء فی قبلة ما بین العینین، عن أبی سعد الزاهد، عن علی بن بندار الصوفی، عن عبدان الجوالیقی، عن خلیفة بن خیاط به، بنحوه مختصرا.

وقال :والمحفوظ هو الأول مرسل.

ورواه البزار فی مسنده کما قال الزیلعی فی نصب الرایة (255 /4)، عن أحمد بن عبد الله بن شبیب، عن إسماعیل بن أبی یونس، عن محمد بن إسماعیل بن أبی فدیک، عن عبد الرحمن بن أبی ملیکة، عن إسماعیل بن عبد الله بن جعفر، عن أبیه بنحوه.

ونقل عن البزار أنه قال :لا نعلمه یروی عن عبد الله بن جعفر، عن النبی -صلی الله علیه وسلم -إلا من هذا الوجه وقد رواه الشعبی عن عبد الله بن جعفر عن أبیه.

الوجه الثالث :عن الشعبی مرسلا.

رواه ابن سعد فی الطبقات (26 /4)، عن عبد الله بن نمیر، عن الأجلح، عن الشعبی بنحوه.

ورواه أیضا عن الفضل بن دکین، عن سفیان، عن الأجلح، عن الشعبی بنحوه لکنه قال : وضمه إلیه.

ورواه أیضا عن محمد بن ربیعة الکلابی، عن سفیان به، بنحوه.

ورواه البیهقی فی السنن الکبری (101 /7)- کتاب النکاح -باب ما جاء فی قبلة ما بین العینین، عن أبی القاسم زید بن أبی هاشم العلوی، عن أبی جعفر محمد بن علی بن دحیم، عن إبراهیم بن إسحاق القاضی، عن قبیصة، عن سفیان به، بنحوه.

ورواه أیضا عن أبی القاسم عبد الواحد بن محمد النجار المقرء، عن أبی جعفر محمد بن علی بن دحیم به، بنحوه.

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

قابلِ ملاحظہ ہے۔

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

وقال :هذا مرسل.

ورواه ابن أبى شيبة فى المصنف (8/ 433: 5780)، عن على بن مسهر، عن الأجلح، عن الشعبى بنحوه.

ورواه أيضا فى المصنف (12/ 106: 12254 و12/ 535: 15529 و14/ 349: 18490)، به بنحوه.

ورواه من طريقه أبو داود فى سننه (5/ 392: 5220)- كتاب الأدب -باب فى قبلة ما بين العينين به، بلفظ أن النبى -صلى الله عليه وسلم -تلقى جعفر بن أبى طالب فالتزمه وقبل ما بين عينيه.

ورواه الطبرانى فى الكبير (2/ 108: 1469)، عن محمد بن عثمان بن أبى شيبة، عن عمه أبى بكر به، بنحوه.

ورواه الحاكم فى المستدرك (3/ 211)، عن على بن عيسى الحيرى، عن إبراهيم بن أبى طالب، عن ابن أبى عمر، عن سفيان، عن ابن أبى خالد، عن الشعبى، بنحوه.

قال الحاكم :هذا حديث صحيح إنما ظهر بمثل هذا الإسناد الصحيح مرسلا وقد وصله أجلح ابن عبد الله.

وقال الذهبى :وهو الصواب.

والراجح من هذه الأوجه الثلاثة هو :الإرسال كما رجح هذا الحاكم والبيهقى والذهبى فيما تقدم من كلامهم، والله أعلم.

لكن لهذا المرسل شواهد مرفوعة من حديث أبى جحيفة وعائشة وعلى رضى الله عنهم .فحديث أبى جحيفة أخرجه الطبرانى فى الكبير (2/ 108: 1470)، بنحو لفظ حديث الشعبى لكن لم يذكر التقبيل، ورواه أيضا فى الكبير .(22/ 100: 244)

ورواه فى الأوسط كما فى نصب الراية (4/ 255)، وفى الصغير (1/ 19)، وقال بعده: تفرد به الوليد بن عبد الملك.

قلت :وأحمد بن خالد بن مسرح شيخ الطبرانى فيه قال عنه الدارقطنى :ليس بشىء .

(وانظر :ميزان الاعتدال 95 /1)، والمغنى فى الضعفاء (1/ 38: 280)، ولسان الميزان .(1/ 165)

وتابعه أبو عقيل أن بن سالم الخولانى عند الطبرانى .(22/ 100: 244)

لكن قال الهيثمى فى المجمع (9/ 275)، وفى رجال الكبير أنس بن سالم ولم أعرفه.

وأما حديث عائشة رضى الله عنها فرواه البغوى وابن السكن، كما قال الحافظ فى الإصابة (1/ 239)، من طريق محمد بن عبد الله بن عبيد بن عمير، عن يحيى بن سعيد، عن القاسم، عن عائشة رضى الله عنها قالت :لما قدم جعفر وأصحابه استقبله رسول الله -صلى الله عليه وسلم -فقبل ما بين عينيه.

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

ناصر الدین البانی صاحب نے بھی ''سلسلةُ الاحادیث الصحیحة'' میں مذکورہ حدیث کا ''حسن'' ہونا، مفصل انداز میں تحریر کیا ہے۔ [1]

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

ومحمد بن عبد الله بن عبيد بن عمير الليثى المكى ضعفه ابن معين وقال عنه البخارى: منكر الحديث .وقال النسائى :متروك .(وانظر :الميزان 36 /5، 37).

ورواه أيضا ابن عدى فى الكامل (220 /6)، من طريق محمد بن عبد الله هذا.

وقال ابن عدى :ورواه أبو قتادة الحرانى، عن الثورى، عن يحيى بن سعيد، عن عمرة، عن عائشة.

ومن طريقه رواه البيهقى فى شعب الإيمان .(477 /6)

قال الدارقطنى فى العلل -كما فى نصب الراية (255 /4)، هذا حديث يرويه يحيى بن سعيد الأنصارى واختلف عنه فرواه الثورى، عن يحيى بن سعيد، عن عمرة، عن عائشة، رواه أبو قتادة الحرانى عنه، وخالفه محمد بن عبد الله بن عبيد بن عمير فرواه عن يحيى، عن القاسم، عن عائشة رضى الله عنها وكلاهما غير محفوظ وهما ضعيفان .اهـ.

وأما حديث على رضى الله عنه فرواه ابن عدى فى الكامل (243 /5)، من طريق عيسى بن عبد الله بن محمد بن عمر بن على بن أبى طالب، عن أبيه، عن جده، عن على رضى الله عنه.

وعيسى هذا قال عنه الدارقطنى :متروك الحديث واتهمه ابن حبان بالوضع.

(وانظر :الميزان 235 /4، واللسان 399 /4).

وحديث أبى جحيفة وحديث عائشة رضى الله عنهما وإن كانا ضعيفين فمرسل الشعبى يرتقى بهما إلى الحسن، والله أعلم(حاشية المطالب العالية ،تحت رقم الحديث ۴۰۳۸، ج۱۶،ص ۳۹۹ الٰی ۴۰۳،كتاب المناقب،باب فضل جعفر بن أبى طالب وزيد بن حارثة)

[1] لما قدم جعفر من الحبشة عانقه النبى صلى الله عليه وسلم ."

أخرجه أبو يعلى فى "مسنده "(3/ 398 /1876) من طريق إسماعيل بن مجالد عن أبيه عن عامر عن جابر قال :فذكره .قلت :وهذا إسناد مرشح للتحسين،مجالد -وهو ابن سعيد -ليس بالقوى، وبه أعله الهيثمى، فقال (9/272):

.."وهو ضعيف، وقد وثق، وبقية رجاله رجال الصحيح ."وأقول :ولكن إسماعيل هذا، وإن كان من رجال البخارى فقد تكلم فيه بعضهم من قبل حفظه.

وقال الذهبى فى "الكاشف " :"صدوق ."وكذا قال الحافظ فى "التقريب "،وزاد " :يخطىء ."

قلت :وهذا أصح، فمثله وسط، يدور حديثه بين أن يكون حسنا لذاته أو حسنا لغيره، فإن توبع لم يتوقف الباحث عن تحسينه، وهذا هو الواقع هنا فقد تابعه مثله أو قريب منه، وهو أسد بن عمرو

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

اس واقعہ سے سفر سے آنے والے کے ساتھ معانقہ کرنا معلوم ہوا، اور کسی دوسرے واقعہ سے

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

عن مجالد بن سعيد به.أخرجه الطحاوى فى "شرح المعانى "(4/281).
وأسد هذا اختلفوا فيه أيضا،وهو من رجال اللسان "، وتجد أقوال الأئمة فيه مفصلا، وفيه أن بعضهم تكلم فيه لأنه كان من أصحاب الرأى، وقد وثقه جمع منهم أحمد وابن معين، وعن هذا رواية أخرى من طريق أحمد بن سعيد بن أبى مريم عنه قال " :كذوب ليس بشىء ."
وأشار الذهبى إلى رفض هذه الرواية، ولعل ذلك لجهالة أحمد بن سعيد هذا، فإنى لم أجد له ترجمة .وهى فى نقدى حرية بالرفض لمخالفتها لكل أقوال الأئمة الموثقين والمضعفين، أما الموثقين فواضح، وأما المضعفين، فلأن أكثرهم أطلق الضعف، والآخرون غمزوه بضعف الحفظ، أو أن عنده مناكير، وابن عدى الذى جاء من بعدهم، ختم ترجمته بقوله فيه " :له أحاديث كثيرة عن الكوفيين، ولم أر فى أحاديثه شيئا منكرا، وأرجو أن حديثه مستقيم، وليس فى أهل الرأى بعد أبى يوسف أكثر حديثا منه ."قلت :فحرى بمن كان كثير الحديث مثله، وليس فيها ما ينكر أن يكون ثقة، ولئن وجد -كما ذكر بعضهم -فهو لقلته مغتفر .والله أعلم.
وبالجملة فالحديث بهذه المتابعة صحيح إلى مجالد بن سعيد، ولكنه بحاجة إلى ما يدعمه، وقد وجدته، فقال الأجلح عن الشعبى " :أن النبى صلى الله عليه وسلم استقبل جعفر بن أبى طالب حين جاء من أرض الحبشة، فقبل ما بين عينيه وضمه إليه (وفى رواية :واعتنقه) ." أخرجه ابن سعد (4/35) وابن أبى شيبة (12/106) ومن طريقه أبو داود (5220) .
قلت :وهذا إسناد جيد مرسل،الأجلح -وهو ابن عبد الله -صدوق، فيه كلام يسير لا يضر، ولذلك قال الذهبى فى "المغنى " :"شيعى، لا بأس بحديثه، ولينه بعضهم ."
وقال الحافظ فى "التقريب " :"شيعى صدوق ."وزاد ابن أبى شيبة فى أوله " :ما أدرى بأيهما أفرح؟ بقدوم جعفر، أو بفتح خيبر ."وبهذه الزيادة أخرجه البيهقى فى "السنن "(7/101) و " شعب الإيمان "(6/ 477 /8968) وقال " :هذا مرسل ."
ثم رواه من طريق زياد بن عبد الله :حدثنا مجالد بن سعيد عن عامر الشعبى عن عبد الله بن جعفر قال :فذكر حديث الترجمة، وقال " :والمحفوظ هو الأول،مرسل ."
قلت :وهذه متابعة ثالثة من زياد بن عبد الله، وهو البكائى، وفيه لين، وقد خالف، فجعله من مسند عبد الله بن جعفر، والصحيح عن مجالد من حديث جابر كما تقدم .وقد وصله الحاكم (3/211) من طريق آخر عن الأجلح عن الشعبى عن جابر به لكن ليس فيه (المعانقة) .
ثم رواه من طريق ثقتين عن الشعبى مرسلا ، وقال " :هذا حديث صحيح، إنما ظهر بمثل هذا الإسناد الصحيح مرسلا ."قال الذهبى عقبه ":وهو الصواب ."وهكذا مرسلا ذكره الذهبى فى ترجمة (جعفر)من كتابه "السير "(1/213) . لكنه عاد فذكر فيما بعد الزيادة المشار إليها آنفا، فقال (1/216) " : وروى من وجوه أن النبى صلى الله عليه وسلم لما قدم جعفر قال :لأنا بقدوم جعفر أسر منى بفتح خيبر ."فأشار إلى أن للحديث أكثر من طريق واحد، ولم ينتبه لهذه

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

غیر سفر کے موقع پر معانقہ ثابت ہو، تو وہ اپنی جگہ درست ہوگا اور دونوں قسم کے واقعات میں درحقیقت کوئی تعارض وٹکراؤ نہ ہوگا۔

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

الإشارة القوية المعلق عليه، فقال :سبق تخريجه فى الصفحة (213) تعليق (1) ." وإذا رجعت إلى التعليق المشار إليه، فلا تجد فيه سوى العزو لابن سعد والحاكم .ونقل كلامه المتقدم، وتعقيب الذهبى عليه بأن المرسل هو الصواب !

وقد وجدت للحديث وجهين آخرين لعل الذهبى -وهو الحافظ النحرير -أشار إليهما :الأول :عن عون بن أبى جحفة عن أبيه قال " :لما قدم جعفر على رسول الله صلى الله عليه وسلم من أرض الحبشة،قبل رسول الله صلى الله عليه وسلم ما بين عينيه، ثم قال :ما أدرى أنا بقدوم جعفر أسر، أو بفتح خيبر؟ ."أخرجه الطبرانى فى "المعجم الكبير "(22/244/ 100) : حدثنا أبو عقيل أنس بن سلم (الأصل :سالم) الخولانى وأحمد بن خالد بن مسرح قالا :حدثنا الوليد بن عبد الملك بن مسرح الحرانى حدثنا مخلد بن يزيد عن عون بن أبى جحيفة به .

قلت :وهذا إسناد جيد :مخلد وعون ثقتان من رجال الشيخين .والوليد بن عبد الملك الحرانى، روى عنه جمع غير المذكورين منهم أبو زرعة -ولا يروى إلا عن ثقة -وأبو حاتم، وقال " :صدوق ."وذكره ابن حبان فى "الثقات "(9/227) وقال " :مستقيم الحديث ."وأخرج له فى "صحيحه "عدة أحاديث، فانظر "التيسير ."وأبو عقيل أنس بن سلم الخولانى، هو من الشيوخ المكثرين من الرواية، فقد ترجمه الحافظ ابن عساكر فى "تاريخ دمشق "(3/140) فذكر أنه حدث بدمشق سنة (289)عن جمع من الشيوخ سماهم، منهم هشام بن عمار قارب عددهم العشرين شيخا .وروى عنه جمع من الشيوخ جاوز عددهم العشرة، منهم الطبرانى وابن عدى .ولم يذكر فيه جرحا ولا تعديلا، ولكن رواية هؤلاء عنه تعديل له، ولاسيما وقد أكثر الطبرانى عنه، فروى له فى كتاب "الدعاء "فقط تسعة أحاديث (انظر المجلد الأول من "الدعاء "تحقيق الدكتور محمد سعيد البخارى) وروى له فى "المعجم الأوسط "(1/ 171 /3190 - 3188)ثلاثة أحاديث، أحدهما فى "المعجم الصغير "أيضا (رقم " - 689الروض النضير ") . وأما قرينه (أحمد بن خالد بن مسرح) فقال الدارقطنى كما فى "اللسان ":"ليس بشىء ."ومن طريقه وحده أخرجه الطبرانى فى "المعجم الكبير "أيضا (107 /2)وزاد فى "الكبير " :"فعانقه ." والوجه الآخر من الوجهين المشار إليهما ما ذكره الإمام البغوى فى "شرح السنة "(12/292) عقب الحديث المرسل " :وعن البياضى أن النبى صلى الله عليه وسلم تلقى جعفر بن أبى طالب، فالتزمه، وقبل ما بين عينيه ."والبياضى هذا لم أعرفه، وينسب إليها جمع من الصحابة فانظر "الأنساب "و "تاج العروس "، ولم أقف على إسناده إليه، وقد وهم المعلق على "شرح السنة " وهما فاحشا، فقال " :أخرجه أبو داود (5220) فى الأدب:باب فى قبلة ما بين العينين، ورجاله ثقات، لكنه مرسل ."وإنما عند أبى داود فى الباب والرقم المشار إليهما حديث الشعبى المتقدم

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

شعبی کی حدیث

حضرت شعبی رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ:

كَانَ أَصْحَابُ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا الْتَقَوْا صَافَحُوْا، فَإِذَا قَدِمُوْا مِنْ سَفَرٍ عَانَقَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا (السنن الكبرىٰ للبيهقي، رقم الحديث ١٣٧٠٦، كتاب النكاح، باب ما جاء في معانقة الرجل الرجل، إذا لم تكن مؤدية إلى تحريك شهوة) [1]

ترجمہ: محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم، جب آپس میں ملاقات کرتے تھے، تو مصافحہ کرتے تھے، اور جب کسی سفر سے آتے تھے، تو ایک دوسرے سے معانقہ کرتے تھے (بیہقی)

اس طرح کی روایت حضرت انس رضی اللہ عنہ کی سند سے بھی گزر چکی ہے، جس سے معلوم

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

معزوا إلى جمع منهم أبو داود بالرقم نفسه !وثمة وجه ثالث لا يصلح للاستشهاد به، أذكره بيانا لحاله، وإلا ففيما تقدم كفاية، وهو من رواية محمد بن عبد الله بن عبيد بن عمير عن يحيى بن سعيد عن القاسم بن محمد عن عائشة قالت " :لما قدم جعفر وأصحابه استقبله النبى صلى الله عليه وسلم فقبله بين عينيه ."أخرجه ابن عدى (6/220) ومن طريقه البيهقى، وقال ابن عدى " :رواه أبو قتادة الحرانى عن الثورى عن يحيى بن سعيد :وقال :عن عمرة عن عائشة ."قلت :فذكر الحرانى (عمرة) مكان (القاسم بن محمد) فى رواية محمد بن عبد الله بن عبيد، وهو متروك كالحرانى .هذا وقد كنت منذ بعيد لا أرى تقبيل ما بين العينين لضعف حديث جعفر هذا بسبب الإرسال، وعدم وقوفى على شاهد معتبر له، فلما طبع "المعجم الكبير "، ووقفت فيه على إسناده من طريق (أنس بن سلم) ، وعلى ترجمته عند ابن عساكر، وتبين لى أنه شاهد قوى للحديث المرسل، رأيت أنه من الواجب على نشره فى هذه السلسلة، أداء للأمانة العلمية، ولعلمى أن الكثيرين من أمثالى لم تقع أعينهم عليه فضلا عن غيرهم، فأحببت لهم أن يكونوا على بصيرة منه. والحمد لله الذى هدانا لهذا وما كنا لنهتدى لولا أن هدانا الله .وللمعانقة فى السفر شاهد قوى تقدم برقم (2647). (سلسلة الأحاديث الصحيحة، رقم الحديث ٢٦٥٧)

[1] قال الالبانى:أخرجه البيهقى فى سننه بإسناد جيد كما قال الحافظ ابن مفلح الحنبلى فى "الآداب الشرعية" (سلسلة الأحاديث الصحيحة ، تحت رقم الحديث ٢٦٤٧)

ہوتا ہے کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا عام معمول، ملاقات کے وقت مصافحہ کرنے اور سفر سے آمد کے وقت معانقہ کرنے کا تھا، اور یہ بھی پہلے گزر چکا ہے کہ اس طرح کی روایات سے کسی دوسرے خوشی اور محبت وغیرہ کے موقع پر معانقہ کرنے کا عدمِ جواز، بلکہ عدمِ ثبوت لازم نہیں آتا، بالخصوص جبکہ دیگر احادیث وروایات سے دوسرے مواقع پر معانقہ کا ثبوت بھی ملتا ہو۔

ابنِ عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث

حضرت ابنِ عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا وَدَّعَ رَجُلًا أَخَذَ بِيَدِهٖ، فَلَا يَدَعُهَا حَتّٰى يَكُوْنَ الرَّجُلُ هُوَ يَدَعُ يَدَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، وَيَقُوْلُ: اِسْتَوْدِعِ اللّٰهَ دِيْنَكَ وَأَمَانَتَكَ وَآخِرَ عَمَلِكَ (سنن الترمذی، رقم الحديث ۳۴۴۲، ابواب الدعوات، باب ما يقول إذا ودع إنسانا) [1]

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی آدمی کو رخصت فرماتے، تو اس کا ہاتھ پکڑ لیتے، اور اس کے ہاتھ کو اس وقت تک نہیں چھوڑتے تھے، جب تک کہ وہ خود ہی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ کو نہیں چھوڑ دیتا تھا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعاء کرتے تھے کہ میں آپ کے دین کو اور آپ کی امانت کو اور آپ کے آخری عمل کو، اللہ کے حوالے کرتا ہوں (ترمذی)

اس طرح کا مضمون بعض دوسری احادیث وروایات میں بھی آیا ہے۔ [2]

---

[1] قال الترمذی: هذا حديث غريب من هذا الوجه، وروى هذا الحديث من غير وجه عن ابن عمر

[2] عن أنس بن مالك، قال: جاء رجل إلى النبي صلى الله عليه وسلم، فقال له: يا نبي الله، إني أريد السفر. فقال له: متى؟ قال: غدا إن شاء الله. قال: فأتاه، فأخذ بيده، فقال له: في حفظ الله، وفي كنفه، زودك الله التقوى، وغفر لك ذنبك، ووجهك للخير أينما توخيت، أو أينما توجهت شك سعيد في إحدى الكلمتين (سنن الدارمی، رقم الحديث: ۲۷۱۳)

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

حضرت شعبی رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ:

بَلَغَ ابْنَ عُمَرَ وَهُوَ بِمَالٍ لَهُ أَنَّ الْحُسَيْنَ بْنَ عَلِيٍّ قَدْ تَوَجَّهَ إِلَى الْعِرَاقِ، فَلَحِقَهُ عَلٰى مَسِيْرَةِ يَوْمَيْنِ أَوْ ثَلَاثَةٍ، فَقَالَ: إِلٰى أَيْنَ؟ فَقَالَ: هٰذِهٖ كُتُبُ أَهْلِ الْعِرَاقِ وَبَيْعَتُهُمْ، فَقَالَ: لَا تَفْعَلْ، فَأَبٰى، فَقَالَ لَهُ ابْنُ عُمَرَ: أَنَّ جِبْرِيْلَ عَلَيْهِ السَّلَامُ أَتَى النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَخَيَّرَهُ بَيْنَ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ فَاخْتَارَ الْآخِرَةَ، وَلَمْ يُرِدِ الدُّنْيَا، وَإِنَّكَ بَضْعَةٌ مِّنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، كَذٰلِكَ يُرِيْدُ مِنْكُمْ، فَأَبٰى، فَاعْتَنَقَهُ ابْنُ عُمَرَ، وَقَالَ: أَسْتَوْدِعُكَ اللّٰهَ، وَالسَّلَامُ (صحيح ابنِ حبان، رقم الحديث ٦٩٦٨، كتاب إخباره صلى الله عليه وسلم عن مناقب الصحابة رضى الله عنهم أجمعين، مناقب الصحابة رضى الله عنهم أجمعين) لے

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

قال حسين سليم أسد الدارانى: إسناده جيد (حاشية سنن الدارمى)

عن أنس بن مالك، قال: كان النبى -صلى الله عليه وسلم- إذا لقى الرجل فكلمه، لم يصرف وجهه عنه حتى يكون هو الذى ينصرف، وإذا صافحه لم ينزع يده من يده حتى يكون هو الذى ينزعها(سنن ابن ماجه، رقم الحديث ٢١)

قال شعيب الارنؤوط: حسن (حاشية سنن ابن ماجه)

لے قال شعيب الارنؤوط: رجاله ثقات رجال الصحيح، غير يحيى بن إسماعيل بن سالم، فقد وثقه المؤلف 7/610، وروى عنه جمع، وأورده ابن أبى حاتم 9/126ولم يذكر فيه جرحا ولا تعديلا.

وأخرجه البزار "2643"عن إسماعيل بن أبى الحارث، والبيهقى فى "دلائل النبوة - 6/470 " 471من طريق محمد بن عبد الملك بن زنجويه كلاهما عن شبابة بن سوار، بهذا الإسناد.

وقد وقع فى إسناد البزار تحريف يصحح من هنا.

وأورده الهيثمى فى "المجمع 9/192 "وقال رواه الطبرانى فى "الأوسط "والبزار، ورجاله ثقات.

وأخرجه ابن عساكر فى "تاريخ دمشق" "تهذيبه "4/332من طريق البيهقى.

وأخرجه البزار "2644"عن محمد بن معمر، عن أبى داود -وهو الطيالسى -عن يحيى بن إسماعيل، به .وقد وقع فى المطبوع "الحسن بن إسماعيل "وهو تحريف ,ونسبه أيضا ابن كثير فى"شمائل الرسول "ص 449إلى أبى داود الطيالسى فى "مسنده "عن يحيى بن إسماعيل بن سالم، به.

وأخرجه مختصرا البيهقى فى "السنن 7/48 "من طريق يحيى ﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

ترجمہ: حضرت ابنِ عمر رضی اللہ عنہ کو یہ بات معلوم ہوئی کہ حضرت حسین بن علی رضی اللہ عنہ، عراق جارہے ہیں، تو ابنِ عمر رضی اللہ عنہ، دو یا تین دن کی مسافت طے کر کے حضرت حسین بن علی رضی اللہ عنہ سے آ کر ملے، اور اُن سے پوچھا کہ آپ کہاں جارہے ہیں؟ حضرت حسین بن علی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ یہ اہلِ عراق کی دعوت اور بیعت کے خطوط ہیں (لہٰذا ان کی دعوت پر عراق جارہا ہوں) حضرت ابنِ عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ایسا مت کریں، حضرت حسین بن علی رضی اللہ عنہ نے حضرت ابنِ عمر رضی اللہ عنہ کی بات قبول نہیں کی، تو حضرت ابنِ عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ جبریل علیہ السلام، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے، اور آپ کے سامنے دنیا اور آخرت میں سے کسی ایک کو قبول کرنے کی پیش کش کی، تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے آخرت کو اختیار فرمایا، اور دنیا کو اختیار نہ فرمایا، اور آپ (یعنی حضرت حسین بن علی) رسولُ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد میں سے ہیں (لہٰذا اہلِ عراق کو نظر انداز فرمادیں) اس طرح حضرت ابنِ عمر رضی اللہ عنہ نے، حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو عراق جانے سے روکنے کی کوشش کی، مگر حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے انکار فرمادیا، بالآخر حضرت ابنِ عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت حسین بن علی رضی اللہ عنہ سے معانقہ کیا، اور کہا کہ میں آپ کو اللہ کے حوالہ کرتا ہوں، والسلام (ابنِ حبان)

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾ بن أبی طالب، عن شبابة بن سوار عن يحيى بن إسماعيل بن سالم، قال: سمعت الشعبی يحدث عن ابن عمر رضی الله عنه قال: إن جبريل عليه السلام أتى النبی صلى الله عليه وسلم، فخيره بين الدنيا والآخرة فاختار الآخرة ولم يرد الدنيا(حاشية ابنِ حبان)

وقال العراقی:

رواه الطبرانی مقتصرا على المرفوع رواه فی الأوسط بذكر قصة الحسين مختصرة ولم يقل: على مسيرة ثلاثة أيام. وكذا رواه البزار بنحوه وإسنادهما حسن(المغنی عن حمل الأسفار فی الأسفار، فی تخريج ما فی الإحياء من الأخبار، ج ا ص ۵۴۶، كتاب آداب العزلة، الباب الثانی فی فوائد العزلة وغوائلها، الناشر: مكتبة طبرية، الرياض، السعودية، الطبعة الاولٰی: ۱۴۱۵ھ، ۱۹۹۵م)

اس طرح کی احادیث وروایات سے رخصت ہوتے ، یا دوسرے کو رخصت کرتے وقت مصافحہ ومعانقہ کرنا ثابت ہوتا ہے۔

سعید بن زید رضی اللہ عنہ کی حدیث

حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ احْتَضَنَ حَسَنًا، ثُمَّ قَالَ: اللّٰهُمَّ إِنِّيْ قَدْ أَحْبَبْتُهُ فَأَحِبَّهُ (المعجم الكبير، للطبراني، رقم الحديث ۲۵۸۱، ج۳ص ۳۱) [1]

ترجمہ: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حسن کو اپنے سینے سے لگایا، پھر فرمایا کہ اے اللہ! میں اس سے محبت کرتا ہوں، آپ بھی اس سے محبت کیجیے (طبرانی)

اس حدیث سے سفر کے بغیر، مخلصانہ شدتِ محبت وشفقت کے موقع پر معانقہ کرنا ثابت ہوا، جس کی تائید حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی آگے آنے والی احادیث وروایات سے بھی ہوتی ہے۔

اور محدثینِ عظام وفقہائے کرام نے مذکورہ واقعہ سے معانقہ کے مشروع ہونے پر استدلال فرمایا ہے۔ [2]

---

[1] قال الهيثمي: رواه الطبراني، ورجاله رجال الصحيح غير يزيد بن يحنس، وهو ثقة(مجمع الزوائد، تحت رقم الحديث ۱۵۰۴۲)

[2] احتضن يحتضن، احتضانا، فهو محتضن، والمفعول محتضن.

احتضن الشيء :حضنه، ضمه إلى صدره، أو عانقه (معجم اللغة العربية المعاصرة،ج ۱،ص ۵۱۵، حرف الحاء،مادة، ح ض ن)

فدل ذلک علی أن ما روی عن رسول الله صلی الله علیه وسلم من إباحة المعانقة کان متأخرا عما روی عنه من النهی عن ذلک،وفی (التلویح) : معانقته صلی الله علیه وسلم للحسن إباحة ذلک.وأما معانقة الرجل للرجل فاستحبها سفیان و کرهها مالک، قال :هی بدعة، وتناظر مالک وسفیان فی ذلک فاحتج سفیان بأن النبی صلی الله علیه وسلم فعل ذلک بجعفر، قال مالک :هو خاص له، فقال :ما یخصه بغیر ذلک؟ فسکت مالک .وقال صاحب (الهدایة) : الخلاف فی المعانقة فی إزار واحد، وأما إذا کان علی المعانق قمیص أو جبة لا بأس باتفاق أصحابنا، وهو الصحیح(عمدة القاری شرح صحیح البخاری، ج ۱۱،ص ۲۴۰، کتاب البیوع،باب ما ذکر فی الأسواق)

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

خَرَجَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ طَائِفَةِ النَّهَارِ، لاَ يُكَلِّمُنِيْ وَلاَ أُكَلِّمُهُ، حَتّٰى أَتٰى سُوْقَ بَنِيْ قَيْنُقَاعَ، فَجَلَسَ بِفِنَاءِ بَيْتِ فَاطِمَةَ، فَقَالَ أَثَمَّ لُكَعُ، أَثَمَّ لُكَعُ فَحَبَسَتْهُ شَيْئًا، فَظَنَنْتُ أَنَّهَا تُلْبِسُهُ سِخَابًا، أَوْ تُغَسِّلُهُ، فَجَاءَ يَشْتَدُّ حَتّٰى عَانَقَهُ، وَقَبَّلَهُ وَقَالَ: اَللّٰهُمَّ أَحْبِبْهُ وَأَحِبَّ مَنْ يُحِبُّهُ (صحيح البخاري، رقم الحديث ۲۱۲۲، كتاب البيوع، باب ما ذكر في الأسواق)

ترجمہ: نبی صلی اللہ علیہ وسلم دن کے ایک حصے میں نکلے، نہ تو آپ نے مجھ سے کوئی بات کی، اور نہ میں نے آپ سے کوئی بات کی، یہاں تک کہ آپ بنی قینقاع کے بازار میں پہنچے، پھر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے گھر کے صحن میں (تشریف لے جا کر) بیٹھ گئے اور فرمایا کہ کیا یہاں بچہ ہے؟ کیا یہاں بچہ ہے؟ (یعنی حضرت حسن) حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے ان (یعنی حضرت حسن) کو تھوڑی دیر روکے رکھا، میں نے گمان کیا کہ شاید، وہ ان کو ہار پہنا رہی ہیں، یا وہ ان کو نہلا رہی ہیں، پھر وہ (یعنی حضرت حسن) دوڑے ہوئے آئے، یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے معانقہ کیا، اور ان کو بوسہ دیا اور فرمایا کہ اے اللہ! آپ اس سے محبت فرمائیے، اور اس سے بھی محبت فرمائیے، جو اس سے محبت رکھے (بخاری)

اس واقعہ کو امام مسلم نے بھی اپنی صحیح مسلم میں روایت کیا ہے، جس میں معانقہ سے متعلق یہ الفاظ ہیں کہ:

”حَتّٰى اعْتَنَقَ كُلُّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا صَاحِبَهُ“

''یہاں تک کہ اُن دونوں میں سے ہرایک نے دوسرے سے معانقہ کیا'' [1]

نیز اس واقعہ کو ابو یعلیٰ نے بھی اپنی ''مسند'' میں روایت کیا ہے، جس میں معانقہ سے متعلق یہ الفاظ ہیں کہ:

''فَاعْتَنَقَهٗ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ''

''پھر حضرت حسن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معانقہ فرمایا'' [2]

اور سنن ابنِ ماجہ میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ان الفاظ میں روایت ہے کہ:

أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ –، قَالَ لِلْحَسَنِ: ''اللّٰهُمَّ إِنِّي أُحِبُّهٗ، فَأَحِبَّهٗ وَأَحِبَّ مَنْ يُحِبُّهٗ'' قَالَ: وَضَمَّهٗ إِلٰى صَدْرِهٖ (سنن ابن ماجه، رقم الحديث ۱۴۲، ابواب السنة، باب فی فضائل اصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم، فضائل الحسن والحسين ابنی علی بن أبی طالب رضی الله عنهم) [3]

ترجمہ: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حسن کے بارے میں فرمایا کہ اے اللہ! میں اس سے محبت کرتا ہوں، پس آپ بھی اس سے محبت فرمایئے، اور جو شخص اس سے محبت کرے، اس سے بھی محبت فرمایئے، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حسن کو اپنے سینے سے لگا لیا (ابن ماجہ)

---

[1] عن أبی هريرة، قال: خرجت مع رسول الله صلى الله عليه وسلم فی طائفة من النهار، لا يكلمنی ولا أكلمه، حتى جاء سوق بنی قينقاع، ثم انصرف، حتى أتى خباء فاطمة فقال: أثم لكع؟ أثم لكع؟ يعنی حسنا فظننا أنه إنما تحبسه أمه لأن تغسله وتلبسه سخابا، فلم يلبث أن جاء يسعى، حتى اعتنق كل واحد منهما صاحبه، فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: اللهم إنی أحبه، فأحبه وأحب من يحبه(مسلم، رقم الحديث ۲۴۲۱"۵۷")

[2] عن أبی هريرة قال :خرج النبی صلى الله عليه وسلم حتى أتى بيت فاطمة، فخرجت معه فقال :أثم لكع؟، قال :فاحتبس، فظننت أنها تلبسه سخابا أو تغسله قال : فجاء يعنی الحسن يشتد فاعتنقه رسول الله صلى الله عليه وسلم وقال :اللهم إنی أحبه فأحبه، وأحب من يحبه(مسند أبی يعلی، رقم الحديث ۶۳۹۱)

قال حسين سليم أسد: إسناده صحيح (حاشية مسند ابی يعلیٰ)

[3] قال شعيب الارنؤوط:إسناده صحيح (حاشية سنن ابن ماجه)

سینے سے لگانے سے مراد، معانقہ فرمانا ہے، جس کی دوسری روایات میں تصریح آئی ہے، اور فقہاء ومحدثین نے مذکورہ احادیث سے معانقہ کی مشروعیت پر استدلال فرمایا ہے۔

اور مذکورہ واقعہ میں سفر کی قید وشرط نہیں، بلکہ روایات کے مجموعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت اپنے یہاں مدینہ منورہ سے ہی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے یہاں تشریف لائے تھے، لہٰذا اس واقعہ سے معانقہ کی مشروعیت کے ساتھ ساتھ غیر سفر کے موقع پر معانقہ کی مشروعیت بھی ثابت ہوتی ہے۔

خلاصہ یہ کہ مذکورہ احادیث سے غیر سفر کے موقع پر معانقہ کرنا ثابت ہوا، جیسا کہ پہلے بھی گزرا۔ [1]

---

[1] وعلم من هذا الحديث جواز المعانقة في غير حالة القدوم؛ إظهارا لشدة المحبة والعناية(لمعات التنقيح فى شرح مشكاة المصابيح،لعبد الحق الدّهلوى، ج۸، ص۴۸، كتاب الآداب،باب المصافحة والمعانقة)

(حتى اعتنق كل واحد منهما صاحبه) أى طالب صحبته .قال ابن الملك: فيه جواز المعانقة .وقال النووى: فيه استحباب ملاطفة الصبى فى معانقته ومداعبته رحمة ولطفا واستحباب التواضع مع الأطفال وغيرهم(مرقاة المفاتيح، ج۹ص ۳۹۶۹، كتاب المناقب والفضائل، باب مناقب أهل بيت النبى صلى الله عليه وسلم رضى الله عنهم)

"حتى اعتنق كل واحد منهما صاحبه"؛ أى: اعتنق النبى – صلى الله عليه وسلم – حسنا، وحسن النبى – صلى الله عليه وسلم –، وهذا دليل كون المعانقة سنة.

قال محيى السنة فى "شرح السنة :"قد جاء عن النبى – صلى الله عليه وسلم –: أنه نهى عن المعانقة والتقبيل.

وجاء: أنه عانق جعفر بن أبى طالب وقبله عند قدومه من أرض الحبشة، وأمكن من يده حتى قبلها، وفعل ذلك أصحاب النبى – صلى الله عليه وسلم –، وليس ذلك بمختلف، ولكل وجه عندنا:

أما المكروه من المعانقة والتقبيل: ما كان على وجه التملق والتعظيم فى الحضر.

فأما المأذون منه: فعند التوديع، وعند القدوم من السفر، وطول العهد بالصاحب، وشدة الحب فى الله.

ومن قبل فلا يقبل الفم، ولكن اليد والرأس والجبهة .وإنما كره ذلك فى الحضر فيما يرى؛ لأنه يكثر ولا يسترحبه كل أحد، فإن فعل الرجل ببعض الناس دون بعض تأذى الذين تركهم، وظنوا أنه قصر بحقوقهم(المفاتيح فى شرح المصابيح، لحسين بن محمود حنفى مظهرى، ج۵ص۱۳۳، ۱۳۴، كتاب الآداب، باب المصافحة والمعانقة)

"فقال: أثم لكع؟ "بضم اللام وفتح الكاف، وهو الصغير قدرا أو جثة، والثانى هو المراد

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی دوسری حدیث

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک لمبی حدیث میں روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے ساتھ، حضرت ابوہیثم انصاری رضی اللہ عنہ کے گھر تشریف لے گئے، اور اُن کی بیوی سے پوچھا کہ:

أَيُنَ صَاحِبُكِ؟ فَقَالَتُ : اِنُطَلَقَ يَسُتَعُذِبُ لَنَا الُمَاءَ، فَلَمُ يَلُبَثُوا أَنُ جَاءَ أَبُو الُهَيُثَمِ بِقِرُبَةٍ يَزُعَبُهَا فَوَضَعَهَا ثُمَّ جَاءَ يَلُتَزِمُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيُهِ وَسَلَّمَ (سنن الترمذی، رقم الحدیث ۲۳۶۹، ابواب الزهد، باب ماجاء فی معیشة أصحاب النبی صلی الله علیه وسلم) [1]

ترجمہ: آپ کے شوہر کہاں ہیں؟ ان کی بیوی نے عرض کیا کہ وہ ہمارے (پینے وغیرہ کے) لئے میٹھا پانی لینے گئے ہیں، تھوڑی ہی دیر میں ابوہیثم ایک بھری ہوئی مشک اٹھائے ہوئے آ گئے، اور وہ مشک رکھی، پھر وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ لپٹ گئے (یعنی معانقہ کیا) (ترمذی)

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾ هنا". یعنی: حسنا، فلم یلبث أن جاء یسعی حتی اعتنق کل واحد منهما صاحبه :"وهذا یدل علی جواز المعانقة(شرح المصابیح لابن الملک، ج۵ص ۱۷۴، کتاب الآداب، باب المصافحة والمعانقة)

(قوله: حتی اعتنق کل واحد منهما صاحبه) فیه ما یدل علی تواضع النبی۔ صلی الله علیه وسلم۔ ورحمته بالصغار، وإکرامه ومحبته للحسن، ولا خلاف – فیما أحسب – فی جواز عناق الصغار کما فعل النبی۔ صلی الله علیه وسلم۔، وإنما اختلف فی عناق الکبیر فی حالة السلام، وکرهه مالک، وأجازه سفیان بن عیینة، وغیره، واحتج سفیان علی مالک فی ذلک بعناق النبی۔ صلی الله علیه وسلم۔ جعفرا لما قدم علیه، فقال مالک: ذلک مخصوص بجعفر .وقال سفیان: ما یخص جعفرا یعمنا، فسکت مالک، ویدل سکوت مالک علی أنه ظهر له ما قاله سفیان من جواز ذلک .قال القاضی عیاض: وهو الحق حتی یدل دلیل علی تخصیص جعفر بذلک(المفهم لما اشکل من تلخیص کتاب مسلم، للقرطبی، ج۶ص ۳۰۰،کتاب النبوات وفضائل نبینا محمد صلی الله علیه وسلم،باب فضائل الحسن والحسین)

[1] قال الترمذی:هذا حدیث حسن صحیح غریب.
وقال الالبانی: صحیح (مختصر الشمائل المحمدیة، تحت رقم الحدیث ۱۱۳)

اس واقعہ کو امام حاکم نے بھی اپنی ''مستدرک'' میں روایت کیا ہے، اور اس کو سند کے اعتبار سے بخاری ومسلم کی شرط پر صحیح قرار دیا ہے، جس کی علامہ ذہبی نے بھی موافقت کی ہے۔ [1]

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں پینے کے صاف اور میٹھے پانی کے وسائل اور ذرائع بہت کم تھے، اس لیے اس طرح کا پانی لانے کے لیے دائیں بائیں، کنووں، یا چشموں وغیرہ پر جانا پڑتا تھا۔

اور مذکورہ واقعہ سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوہیثم شرعی سفر پر نہیں گئے تھے، بلکہ گھر سے باہر پانی لینے کے لیے گئے تھے، لیکن انہوں نے اپنی آمد پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے معانقہ کیا،

---

[1] عن أبي سلمة بن عبد الرحمن، عن أبي هريرة رضي الله عنه، قال :
خرج رسول الله صلى الله عليه وسلم في ساعة لا يخرج فيه ولا يلقاه فيها أحد فأتاه أبو بكر رضي الله عنه فقال :ما جاء بک يا أبا بكر؟ فقال :خرجت للقاء رسول الله صلى الله عليه وسلم والنظر في وجهه والسلام عليه فلم يلبث أن جاء عمر رضي الله عنه فقال له :ما جاء بک يا عمر؟ قال : الجوع يا رسول الله .قال :وأنا قد وجدت بعض ذاک فانطلقوا إلى منزل أبي الهيثم بن التيهان الأنصاري وكان رجلا كثير النخل والشاء ولم يكن أحد من خدم فلم يجدوه فقالوا لامرأته :أين صاحبک؟ فقالت :انطلق يستعذب لنا الماء ، فلم يلبثوا أن جاء أبو الهيثم بقربة يزعبها فوضعها ثم جاء فالتزم رسول الله صلى الله عليه وسلم ويفديه بأبيه وأمه فانطلق بهم إلى حديقة فبسط لهم بساطا ثم انطلق إلى نخلة فجاء بقنو فوضعه فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم :أفلا انتقيت لنا من رطبة؟ فقال :يا رسول الله إني أردت أن تخيروا من بسره ورطبه فأكلوا وشربوا من ذلک الماء فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم :هذا والله النعيم الذي أنتم عنه مسئولون يوم القيامة ظل بارد ورطب طيب وماء بارد فانطلق أبو الهيثم ليصنع لهم طعاما فقال له رسول الله صلى الله عليه وسلم: لا تذبحن ذات در فذبح لهم عناقا أو جديا فأتاهم به فأكلوا فقال له رسول الله صلى الله عليه وسلم: هل لک خادم؟ قال :لا، قال :فإذا أتاني سبي فأتنا فأتي رسول الله صلى الله عليه وسلم برأسين ليس معهما ثالث فأتاه أبو الهيثم فقال :يا رسول الله خادم فقال له :اختر منهما فقال :يا رسول الله اختر لي، فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم :المستشار مؤتمن خذ هذا فإني رأيته يصلي واستوص به معروفا فانطلق أبو الهيثم بالخادم إلى امرأته فأخبرها بقول رسول الله صلى الله عليه وسلم فقالت له امرأته :ما أنت ببالغ ما قال فيه رسول الله صلى الله عليه وسلم إلا أن تعتقه فقال: هو عتيق .فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم :إن الله تعالى لم يبعث نبيا ولا خليفة إلا وله بطانتان بطانة تأمره بالمعروف وتنهاه عن المنكر وبطانة لا تألوه خبالا من يوق بطانة السوء فقد وقى(مستدرک حاكم، رقم الحديث ٧١٧٨)
قال الحاكم: هذا حديث صحيح الإسناد على شرط الشيخين ولم يخرجاه "وقد رواه يونس بن عبيد، وعبد الله بن كيسان، عن عكرمة، عن ابن عباس، أتم وأطول من حديث أبي هريرة هذا.
وقال الذهبي في التلخيص:على شرط البخاري ومسلم.

اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر نکیر نہیں فرمائی، جو تقریری حدیث کا درجہ رکھتا ہے۔

اور یہ معانقہ فرحت ومسرت اور محبت ومودّت کی غرض سے تھا، جس سے غیر سفر کے موقع پر بھی معانقہ کرنے کا ثبوت ہوا۔ [1]

عائشہ رضی اللہ عنہا کا واقعہ

حضرت زہری رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ:

حَدَّثَنِیُ عَوْفُ بْنُ مَالِکِ بْنِ الطُّفَیْلِ هُوَ ابْنُ الحَارِثِ، -وَهُوَ ابْنُ أَخِیُ عَائِشَةَ زَوْجِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لِأُمِّهَا -أَنَّ عَائِشَةَ، حُدِّثَتْ:أَنَّ عَبْدَ اللّٰهِ بْنَ الزُّبَیْرِ قَالَ:فِیُ بَیْعٍ أَوْ عَطَاءٍ أَعْطَتْهُ عَائِشَةُ: وَاللّٰهِ لَتَنْتَهِیَنَّ عَائِشَةُ أَوْ لَأَحْجُرَنَّ عَلَیْهَا، فَقَالَتْ:أَهُوَ قَالَ هٰذَا؟ قَالُوا:نَعَمْ، قَالَتْ:هُوَ لِلّٰهِ عَلَیَّ نَذْرٌ، أَنْ لاَ أُکَلِّمَ ابْنَ الزُّبَیْرِ أَبَدًا.: فَاسْتَشْفَعَ ابْنُ الزُّبَیْرِ إِلَیْهَا، حِیْنَ طَالَتِ الهِجْرَةُ، فَقَالَتْ:لاَ وَاللّٰهِ لاَ أُشَفِّعُ فِیْهِ أَبَدًا، وَلاَ أَتَحَنَّثُ إِلٰی نَذْرِیُ .فَلَمَّا طَالَ ذٰلِکَ عَلَی ابْنِ الزُّبَیْرِ، کَلَّمَ المِسْوَرَ بْنَ مَخْرَمَةَ، وَعَبْدَ الرَّحْمٰنِ بْنَ الأَسْوَدِ بْنِ عَبْدِ یَغُوْثَ، وَهُمَا مِنْ بَنِیُ زُهْرَةَ، وَقَالَ لَهُمَا:أَنْشُدُکُمَا بِاللّٰهِ لَمَّا أَدْخَلْتُمَانِیُ عَلٰی عَائِشَةَ، فَإِنَّهَا لاَ یَحِلُّ لَهَا أَنْ تَنْذِرَ قَطِیْعَتِیُ .فَأَقْبَلَ بِهِ المِسْوَرُ وَعَبْدُ الرَّحْمٰنِ مُشْتَمِلَیْنِ بِأَرْدِیَتِهِمَا، حَتّٰی اسْتَأْذَنَا عَلٰی عَائِشَةَ، فَقَالاَ:السَّلاَمُ عَلَیْکِ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَکَاتُهُ أَنَدْخُلُ؟ قَالَتْ عَائِشَةُ:ادْخُلُوْا، قَالُوْا:کُلُّنَا؟ قَالَتْ:نَعَمْ، ادْخُلُوْا کُلُّکُمْ، وَلاَ تَعْلَمُ أَنَّ مَعَهُمَا ابْنَ الزُّبَیْرِ، فَلَمَّا دَخَلُوْا دَخَلَ ابْنُ الزُّبَیْرِ الحِجَابَ، فَاعْتَنَقَ عَائِشَةَ (صحیح البخاری،رقم الحدیث ۶۰۷۳، کتاب الأدب، باب الهجرة)

---

[1] (یلتزم النبی صلی الله علیه وسلم) أی یضمه إلی نفسه ویعانقه(تحفة الاحوذی، ج۷ص۳۰، ابواب الزهد، باب ماجاء فی معیشة أصحاب النبی صلی الله علیه وسلم)

ترجمہ: عوف بن مالک بن طفیل بن حارث، جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجۂ مطہرہ ،حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بھتیجے ہیں، انہوں نے مجھ سے حدیث بیان کی کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے سامنے ذکر کیا گیا کہ کسی خرید وفروخت، یا عطیہ کے معاملہ سے متعلق، جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کسی سے کیا تھا، حضرت عبداللہ بن زبیر (جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بھانجے تھے) نے کہا کہ قسم ہے اللہ کی! حضرت عائشہ یا تو اس سے باز آ جائیں، ورنہ میں ان پر سختی کروں گا، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے پوچھا کہ کیا واقعی انہوں نے ایسا کہا ہے؟ لوگوں نے کہا کہ جی ہاں! حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ میں اللہ کے واسطے عہد کرتی ہوں کہ میں ابنِ زبیر سے کبھی کلام نہ کروں گی، جب اس جدائی کو بہت عرصہ گزر گیا، تو حضرت ابنِ زبیر نے سفارش کرائی، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ اللہ کی قسم! میں نہ کسی کی سفارش قبول کروں گی، اور نہ میں اپنی قسم توڑوں گی، پھر حضرت ابنِ زبیر پر یہ بات شاق گزری، تو انہوں نے مسور بن مخرمہ اور عبدالرحمٰن بن اسود بن عبد یغوث سے (جو بنی زہرہ میں سے تھے) گفتگو کی، اور ان دونوں سے کہا کہ میں تم دونوں کو اللہ کا واسطہ دیتا ہوں کہ مجھ کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس لے چلو، اس لئے کہ ان کے لئے مناسب نہ تھا کہ مجھ سے قطع تعلق کے لئے نذر (ومنت) مانتیں۔

حضرت مسور اور عبدالرحمٰن اپنی اپنی چادر اوڑھ کر حضرت ابنِ زبیر کے ساتھ چلے، یہاں تک کہ دونوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے داخلہ کی اجازت مانگی، دونوں نے کہا کہ السلام علیک ورحمتہ اللہ وبرکاتہٗ! کیا ہم اندر آ جائیں؟ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اندر داخل ہونے کی اجازت دے دی، ہم نے عرض کیا کہ کیا ہم سب اندر آ جائیں؟ تو حضرت عائشہ نے فرمایا کہ جی ہاں سب اندر آ جاؤ،

حضرت عائشہ کو ابنِ زبیر کے ان دونوں کے ساتھ ہونے کا علم نہ تھا پھر جب وہ سب اندر داخل ہوئے، تو حضرت ابنِ زبیر نے پردے کے اندر گھس کر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے معانقہ کیا (بخاری)

اس واقعہ کو ابنِ حبان نے بھی اپنی صحیح میں روایت کیا ہے۔ [1]

اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ غیر سفر کے موقع پر اور ترکِ تعلق کو ختم کرنے اور اظہارِ ہمدردی و محبت کے طور پر بھی معانقہ کرنا جائز ہے، اور یہ بھی معلوم ہوا کہ محرم عورت سے بھی معانقہ کرنا جائز ہے، جبکہ کسی قسم کے فتنے کا اندیشہ نہ ہو۔

---

[1] عن الزهرى، عن عوف بن الحارث وهو ابن أخى عائشة لأمها -أن عائشة حدثت أن عبد الله بن الزبير قال فى بيع أو عطاء أعطته :والله لتنتهين عائشة أو لأحجرن عليها، قالت عائشة حين بلغها ذلك :إن لله على نذرا أن لا أكلم ابن الزبير أبدا، فاستشفع ابن الزبير حين طالت هجرتها له إليها، فقالت عائشة :والله لا أشفع فيه أحدا ولا أحنث فى نذرى الذى نذرت أبدا، فلما طال ذلك على ابن الزبير كلم المسور بن مخرمة وعبد الرحمن بن الأسود بن عبد يغوث، وهما من بنى زهرة، فقال لهما : نشدتكما بالله إلا أدخلتمانى على عائشة، فإنه لا يحل لها أن تنذر فى قطيعتى، فأقبل المسور بن مخرمة وعبد الرحمن بن الأسود بعبد الله بن الزبير وقد اشتملا عليه بـرديهما حتى استأذنا على عائشة.فقالا :السلام على النبى صلى الله عليه وسلم، إيه ندخل يا أم المؤمنين؟ فقالت عائشة :ادخلا، فقالا :كلنا؟ قالت :نعم ادخلوا كلكم، ولا تعلم عائشة أن معهما ابن الزبير، فلما دخلوا اقتحم ابن الزبير الحجاب ودخل على عائشة فاعتنقها وطفق يناشدها ويبكى، وطفق المسور وعبد الرحمن يناشدان عائشة، ويقولان لها :إن رسول الله صلى الله عليه وسلم قد نهى عما عملتيه، وإنه لا يحل لمسلم أن يهجر أخاه فوق ثلاث، فلما أكثرا على عائشة التذكرة، طفقت تذكرهم وتبكى، وتقول :إنى نذرت والنذر شديد، فلم يزالا بها حتى كلمت ابن الزبير، ثم أعتقت عن نذرها ذلك أربعين رقبة، ثم كانت بعدما أعتقت أربعين رقبة تبكى حتى تبل دموعها خمارها.

قال أبو حاتم :عائشة هى خالة عبد الله بن الزبير لأن أم عبد الله بن الزبير أسماء بنت أبى بكر أخت عائشة(صحيح ابن حبان، رقم الحديث ٥٦٦٢،ذكر الزجر عن الهجران بين المسلمين أكثر من ثلاث ليال)

قال شعيب الارنؤوط:حديث صحيح .ابن أبى السرى متابع ومن فوقه ثقات من رجال الشيخين(حاشية صحيح ابنِ حبان)

لہٰذا جو حضرات، معانقہ کو سفر کے ساتھ خاص رکھتے ہیں، اور غیر سفر کے موقع پر معانقہ کو بہرحال ممنوع یا مکروہ قرار دیتے ہیں، ہمیں تحقیق کے بعد ان کے قول سے اتفاق نہ ہوسکا۔

عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث

امام ترمذی نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ، مدینہ منورہ تشریف لائے، تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے معانقہ فرمایا۔

امام ترمذی نے اس حدیث کو ’’حسن غریب‘‘ قرار دیا ہے۔ [1]

اور بعض دیگر اہلِ علم حضرات نے بھی مذکورہ حدیث کو سند کے اعتبار سے ضعیف قرار دیا ہے۔ [2]

---

[1] حدثنا محمد بن إسماعيل قال :حدثنا إبراهيم بن يحيى بن محمد بن عباد المدينى قال :حدثنى أبى يحيى بن محمد، عن محمد بن إسحاق، عن محمد بن مسلم الزهرى، عن عروة بن الزبير، عن عائشة، قالت :قدم زيد بن حارثة المدينة ورسول الله صلى الله عليه وسلم فى بيتى فأتاه فقرع الباب، فقام إليه رسول الله صلى الله عليه وسلم عريانا يجر ثوبه، والله ما رأيته عريانا قبله ولا بعده، فاعتنقه وقبله :هذا حديث حسن غريب لا نعرفه من حديث الزهرى إلا من هذا الوجه(سنن الترمذى، رقم الحديث ٢٧٣٢)

[2] قال ابوحذيفة نبيل بن منصور البصارة الكويتى:

عن عائشة قالت :قدم زيد بن حارثة المدينة ورسول الله صلى الله عليه وسلم فى بيتى فقرع الباب، فقام إليه النبى -صلى الله عليه وسلم -عريانا يجر ثوبه، فاعتنقه وقبله.

قال الحافظ :وأخرج الترمذى عن عائشة قالت :فذكره، وقال :حديث حسن".

وذكره فى موضع آخر وسكت عليه .

ضعيف

أخرجه الترمذى (2732) والعقيلى (428 - 427 /4) والطحاوى فى "المشكل" (1384)

وفى "شرح المعانى "(281 /4) والمحاملى (157) وابن المقرى فى "تقبيل اليد" (22) وأبو نعيم فى "الدلائل "(462) والبغوى فى "شرح السنة "(3327) وفى "الشمائل"(407) من طرق عن إبراهيم بن يحيى بن محمد بن عباد بن هانء الشجرى المدنى ثنى أبى عن محمد بن إسحاق عن الزهرى عن عروة عن عائشة قالت :قدم زيد بن حارثة المدينة ورسول الله -صلى الله عليه وسلم -فى بيتى، فأتاه فقرع الباب، فقام

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

اور اگر اس حدیث کی سند کو معتبر مانا جائے، تو اس سے بھی سفر سے آمد کے موقع پر معانقہ کرنا ثابت ہوتا ہے، اور غیر سفر کے مواقع سے، اس طرح کی احادیث وروایات ''ساکت'' ہیں، جبکہ دوسری احادیث وروایات ''ناطق'' ہیں، کما مرَّ مراراً۔

کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کی حدیث

حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

وَانْطَلَقْتُ إِلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ، فَیَتَلَقَّانِیْ النَّاسُ فَوْجًا فَوْجًا، یُھَنُّوْنِیْ بِالتَّوْبَۃِ، یَقُوْلُوْنَ: لِتَھْنِکَ تَوْبَۃُ اللّٰہِ عَلَیْکَ، قَالَ کَعْبٌ: حَتّٰی دَخَلْتُ الْمَسْجِدَ، فَإِذَا رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

إليه رسول الله -صلى الله عليه وسلم -عريانا يجر ثوبه، والله ما رأيته عريانا قبله ولا بعده فاعتنقه وقبله .اللفظ للترمذى.

ولفظ العقيلي وغيره "بلغ رسول الله -صلى الله عليه وسلم -أن امرأة من بنى فزارة يقال لها :أم قرفة جهزت ثلاثين راكبا من ولدها، وولد ولدها، فقالت :اقدموا المدينة فاقتلوا محمدا، فقال "اللهم اثكلها ولدها "وبعث إليهم زيد بن حارثة فقتل بنى فزارة، وقتل ولد أم قرفة، وبعث بدرعها إلى رسول الله -صلى الله عليه وسلم -فنصبه بين رمحين.قالت عائشة :فأقبل زيد حتى قدم المدينة، ورسول الله -صلى الله عليه وسلم -تلك الليلة فى بيتى فقرع الباب فخرج إليه يجر ثوبه عريانا، والذى بعثه بالحق ما رأيت عريته قبل ذلك ولا بعدها حتى اعتنقه وقبله.

قال الترمذى :هذا حديث حسن غريب لا نعرفه من حديث الزهرى إلا من هذا الوجه"

وقال العقيلي :لا يعرف هذا الحديث إلا بيحيى بن محمد بن عباد بن هانء الشجرى، وفى أحاديثه مناكير وأغاليط وكان ضريرا فيما بلغنى أنه يلقن"

وقال الذهبى :هذا حديث منكر، تفرد به إبراهيم عن أبيه "الميزان 407 /4

قلت :إبراهيم بن يحيى قال أبو حاتم :ضعيف، وذكره ابن حبان فى "الثقات."

وأبوه ضعفه أبو حاتم والذهبى فى "الكاشف "والحافظ فى "التقريب"، وذكره ابن حبان فى "الثقات."

وابن إسحاق مدلس ولم يذكر سماعا من الزهرى(أَنِيسُ السَّارى فى تخريج احاديث فتح البارى، ،ج۵،ص ۳۷۹۱،۳۷۹۲،تحت رقم الحديث ۲۵۸۹،حرف القاف)

وَسَلَّمَ جَالِسٌ حَوْلَهُ النَّاسُ، فَقَامَ إِلَيَّ طَلْحَةُ بْنُ عُبَيْدِ اللّٰهِ يُهَرْوِلُ حَتّٰى صَافَحَنِيْ وَهَنَّانِيْ، وَاللّٰهِ مَا قَامَ إِلَيَّ رَجُلٌ مِنَ الْمُهَاجِرِينَ غَيْرَهُ، وَلاَ أَنْسَاهَا لِطَلْحَةَ (صحیح البخاری، رقم الحدیث ۴۴۱۸، کتاب المغازی، باب حدیث کعب بن مالک، وقول اللہ عز وجل:"وعلی الثلاثۃ الذین خلفوا")

ترجمہ: میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جانے لگا، راستہ میں لوگ جوق در جوق مجھ سے مِل رہے تھے، اور مجھے توبہ قبول ہونے کی مبارکباد دے رہے تھے، اور کہہ رہے تھے کہ آپ کو اللہ کے حضور توبہ قبول ہونے کی مبارک ہو، کعب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں مسجد میں داخل ہوا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے اور دوسرے لوگ بھی بیٹھے ہوئے تھے، طلحہ بن عبیداللہ مجھے دیکھ کر دوڑے، مجھ سے مصافحہ کیا اور مجھے مبارک باد دی، حضرت کعب فرماتے ہیں کہ اللہ کی قسم! مہاجرین میں سے کوئی شخص بھی حضرت طلحہ کے علاوہ میری طرف کھڑا نہیں ہوا، اور میں حضرت طلحہ کی یہ بات نہیں بھول سکتا (بخاری)

مذکورہ حدیث سے خوشی کے موقع پر مصافحہ کرنے اور مبارک باد دینے کا ثبوت ہوتا ہے۔

لہٰذا دوسرے کو خوشی کے موقع پر مبارک باد دیتے ہوئے، مصافحہ کرنا جائز ہے، اور پہلے ایسی احادیث گزر چکی ہیں، جن میں مصافحہ کے وقت، دعاء کرنے کی عظیم فضیلت بھی آئی ہے، اور مبارک باد بھی دراصل ایک دوسرے کے لیے برکت کی دعاء ہے۔

لہٰذا اس حیثیت سے یہ واقعہ ان گزشتہ احادیث کے مطابق ہوگا۔ [1]

---

[1] قوله (فقام طلحة بن عبيد الله يهرول حتى صافحني وهنأني) فيه استحباب مصافحة القادم والقيام له إكراما والهرولة إلى لقائه بشاشة وفرحا قوله صلى الله عليه وسلم (أبشر بخير يوم مر عليك منذ ولدتك أمك) معناه سوى يوم إسلامك إنما لم يستثنه لأنه معلوم لابد منه (شرح النووی علیٰ مسلم، ج۱۷ ص۹۶، کتاب التوبة، باب حديث توبة كعب بن مالك وصاحبيه)

باب المصافحة: وقال ابن مسعود: علمني النبي –صلى الله عليه وسلم– التشهد وكفي بين كفيه وقال كعب بن مالك: دخلت المسجد فإذا برسول الله –صلى الله عليه وسلم– فقام إلى طلحة

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

بعض صحابہ وتابعین کے آثار

بعض صحابۂ کرام وتابعینِ عظام سے بھی مصافحہ کا ثبوت ملتا ہے۔ ل

نیز ان حضراتِ گرامی سے معانقہ کا بھی ثبوت ملتا ہے۔

چنانچہ امام طحاوی رحمہ اللہ نے حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ سے، حضرت سلمان رضی اللہ عنہ کے معانقہ کرنے کو روایت کیا ہے۔ ۲

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

بن عبيد الله يهرول حتى صافحني وهنأني . (باب) مشروعية (المصافحة) وهي الإفضاء بصفحة اليد إلى صفحة اليد (ارشاد السارى لشرح صحيح البخارى للقسطلانى، ج۹، ص ۱۵۴، كتاب الاستئذان، باب المصافحة)

المصافحة حسنة عند عامة العلماء ، وقد استحبها مالك بعد كراهة، وهي مما تنبت الود وتؤد المحبة، ألا ترى قول كعب بن مالك في حديثه الطويل حين قام إليه طلحة وصافحه :(فوالله لا أنساها لطلحة أبدا) فأخبر بعظيم موقع قيام طلحة إليه من نفسه ومصافحته له وسروره بذلك، وكان عنده أفضل الصله والمشاركة له، وقد قال أنس :إن المصافحة كانت في أصحاب رسول الله، وهم الحجة والقدوة الذين يلزم اتباعهم، وقد ورد في المصافحة أثار حسان(شرح صحيح البخارى لابن بطال، ج۹، ص ۴۴، كتاب الاستئذان، باب المصافحة)

ل حدثنا معاذ بن معاذ ، قال :سألت ابن عون ، عن المصافحة ، قال :كان محمد لا يفعله بنا ، ولا نفعله به ، وكان إذا مد رجل يده ,لم يمنع يده من أحد.

حدثنا ابن فضيل ، عن ليث ، عن ابن الأسود ، قال :إن من تمام التحية المصافحة.

حدثنا شريك ، عن أبي إسحاق ، عن الأسود ، قال :إن من تمام التحية المصافحة(مصنف ابن ابى شيبة، كتاب الأدب، باب في المصافحة عند السلام ، من رخص فيها)

۲ عن أم الدرداء، قالت: قدم علينا سلمان , فقال: أين أخي؟ قلت في المسجد , فأتاه , فلما رآه اعتنقه فهؤلاء أصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم قد كانوا يتعانقون .فدل ذلك على أن ما روي عن رسول الله صلى الله عليه وسلم من إباحة المعانقة , متأخر عما روي عنه من النهي عن ذلك .فبذلك نأخذ , وهو قول أبي يوسف رحمه الله (شرح معانى الآثار، رقم الحديث ۶۹۰۹)

قال الالبانى:

قلت :وإسناده حسن (سلسلة الأحاديث الصحيحة وشيء من فقهها وفوائدها، تحت رقم الحديث ۲۶۴۷)

اور حضرت عتبہ بن ابی عثمان سے روایت ہے کہ:

أَنَّ عُـمَـرَ اِعْتَنَقَ حُذَيْفَةَ (مصنف ابن ابی شیبة، رقم الحدیث ۲۶۲۴۴، کتاب الأدب، باب فی المعانقة عندما یلتقی الرجلان)

ترجمہ: حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے، حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے معانقہ کیا (ابنِ ابی شیبہ)

اور سلیمان بن داؤد سے مروی ہے کہ:

رَأَيْتُ الثَّوْرِيَّ، وَمَعْمَرًا حِيْنَ اِلْتَقَيَا اِحْتَضَنَا وَقَبَّلَ كُلُّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا صَاحِبَهُ (جامع معمر بن راشد، رقم الحدیث ۲۰۹۵۱، مشمولة : مصنف عبد الرزاق، باب تقبیل الرأس والید وغیر ذلک)

ترجمہ: میں نے حضرت ثوری اور حضرت معمر کو دیکھا، جب انہوں نے ملاقات کی، تو ایک دوسرے سے معانقہ کیا، اور ان میں سے ہر ایک نے دوسرے کی تقبیل کی (عبدالرزاق)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے مذکورہ الفاظ ''احتضن'' کے ساتھ معانقہ کرنے کی حدیث پہلے گزر چکی ہے۔[1]

حضرت ابوبلج سے روایت ہے کہ:

رَأَيْتُ عَمْرَو بْنِ مَيْمُوْنٍ وَالْأَسْوَدَ بْنَ هِلَالٍ اِلْتَقَيَا وَاعْتَنَقَ كُلَّ مِّنْهُمَا صَاحِبَهُ (مصنف ابن ابی شیبة، رقم الحدیث ۲۶۲۴۵، فی المعانقة عندما یلتقی الرجلان)

ترجمہ: میں نے عمرو بن میمون اور اسود بن ہلال کو دیکھا کہ انہوں نے ملاقات کی، اور اُن دونوں نے ایک دوسرے سے معانقہ کیا (ابنِ ابی شیبہ)

---

[1] احتضن یحتضن، احتضانا، فھو محتضن، والمفعول محتضن.

احتضن الشیء: حضنه، ضمه إلی صدره، أو عانقه (معجم اللغة العربیة المعاصرة، ج ۱، ص ۵۱۵، حرف الحاء، مادة، ح ض ن)

بعض دوسرے تابعین وغیرہ کے بارے میں بھی اس طرح کی روایات مروی ہیں۔ [1]

مذکورہ اور اس جیسی احادیث وروایات سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم، اور صحابۂ کرام وتابعینِ عظام سے مختلف مواقع پر مصافحہ ومعانقہ کرنے کا ثبوت ملتا ہے، جن کا انکار کرنا درست نہیں۔

یہ بھی ملحوظ رہے کہ اس طرح کے مواقع پر بعض احادیث وروایات میں ''التزام'' اور بعض میں سینے سے لگانے کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں، جس سے مراد معانقہ کرنا ہی ہے۔

لہٰذا معانقہ میں دوسرے کے ساتھ گردن ملانے کے ساتھ، اگر سینہ بھی ملا لیا جائے اور شہوت وغیرہ کا خوف نہ ہو، نہ ہی نامحرم عورت، یا بے ریش خوبصورت لڑکا ہو، تو یہ بھی جائز ہے، اور بعض حضرات کی طرف سے اس پر سختی وتشدد کرنا اور معانقہ میں گردن سے گردن لگانے تک حکم کو محدود رکھنا، ہمیں راجح معلوم نہ ہوسکا۔ [2]

واللّٰہ تعالٰی أعلم.

---

[1] عن عباد بن عباد، قال: رأيت أبا مجلز وخالدا الأثبج التقيا، فاعتنق كل منهما صاحبه (مصنف ابن ابی شیبة، رقم الحديث ٢٦٢٤٦،باب فی المعانقة عندما يلتقی الرجلان)

عن معاذة العدوية، قالت: كان أصحاب صلة بن أشيم إذا دخلوا عليه يلتزم بعضهم بعض (مصنف ابن ابی شیبة، رقم الحديث ٢٦٢٤٨، باب فی المعانقة عند ما يلتقی الرجلان)

[2] (فالتزمنی) أی :فعانقنی، ولما كان الالتزام بمعنى المعانقة(مرقاة المفاتيح شرح مشكاة المصابيح، ج٧،ص ٢٩٦٦،كتاب الآداب،باب المصافحة والمعانقة)

فالتزمنی) أی عانقنی (بذل المجهود فی حل سنن أبی داود، ج١٣،ص ٥٩٩، كتاب الأدب،باب فی المعانقة)

ويعنى بالالتزام :المعانقة(التوضيح لشرح الجامع الصحيح،لابن الملقن، ج٢٨،ص ٩٩،كتاب اللباس،باب السخاب للصبيان)

والالتزام :المعانقة(المحيط فی اللغة، لإسماعيل بن عباد ،ج٢،ص ٣٠٠، باب الزای واللام والميم ، مادة "زلم")

والتزمته اعتنقته فهو ملتزم ومنه يقال لما بين باب الكعبة والحجر الأسود الملتزم لأن الناس يعتنقونه أی يضمونه إلى صدورهم(المصباح المنير فی غريب الشرح الكبير، ج٢،ص ٥٥٢، كتاب اللام، باب اللام مع الزای وما يثلثهما،مادة"ل ز م")

(فصل نمبر 2)

عید کی مبارکباد کا حکم

جہاں تک عید کی مبارک باد کا تعلق ہے، تو بعض اہلِ علم حضرات، عید کی مبارک باد دینے کو ایک جائز ومباح کام قرار دیتے ہیں، ان کا کہنا یہ ہے کہ یہ ایک دعائیہ کلمہ ہے، جو فی نفسہٖ جائز ہے۔

اور بعض حضرات کا کہنا یہ ہے کہ خود سے مبارک بادی نہ دے، اور اگر کوئی دوسرا مبارک بادی دے تو اس کے جواب میں مبارک دے دے۔

اور بعض حضرات اس کو مکروہ عمل قرار دیتے ہیں، ان کا کہنا یہ ہے کہ یہ یہودیوں کا طریقہ ہے۔

اور بعض حضرات اس کو بدعت قرار دیتے ہیں، ان کا کہنا یہ ہے کہ یہ قرآن وسنت اور شرعی دلائل سے ثابت نہیں۔

جبکہ بعض حضرات فی نفسہٖ اس کو مستحب عمل قرار دیتے ہیں، ان کا کہنا یہ ہے کہ یہ دعاء ہے اور ایک مؤمن کا اپنے مؤمن بھائی کو دعاء دینا مستحب ہے، جبکہ اس کے ساتھ کوئی خرابی شامل نہ ہو اور صحابہ وتابعین کے کئی اقوال وافعال سے عید کی مبارک باد ثابت ہے۔ [1]

---

[1] أخبرنا الحسين بن أحمد السمرقندی؛ أنا أبو العباس المستغفری، أنا أبو أحمد محمد بن أحمد بن أبی توبة المروزی، ثنا عبد الله بن محمود، ثنا یحیی بن أکثم، ثنا حاجب بن الولید، ثنا مبشر بن إسماعیل الحلبی، عن صفوان بن عمرو السکسکی قال: سمعت عبد الله بن بسر وعبد الرحمن بن عائذ، وجبیر بن نفر وخالد بن معدان یقال لهم فی أیام الأعیاد: تقبل الله منا ومنکم، ویقولون ذلک لغیرهم (الترغیب و الترهیب لقوام السنة، للأصبهانی، رقم الحدیث ۳۸۱، باب فی الترغیب فی الأضحیة والعمل فی أیام العشرة)

عن خالد ابن معدان قال: لقیت واثلة بن الأسقع فی یوم عید فقلت: تقبل الله منا ومنک .فقال: نعم، تقبل الله منا ومنک .

قال واثلة: لقیت رسول الله –صلی الله علیه وسلم– یوم عید، فقلت: تقبل الله منا

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

اس سلسلہ میں ہمارے نزدیک راجح یہی آخری قول ہے کہ فی نفسہٖ عید وغیرہ کے موقع پر مبارکباد دینا جائز، بلکہ مستحب عمل ہے، لہٰذا اگر عید کی مبارک باد، منکرات اور غلو سے خالی ہو، تو عید کی مبارک باد نہ صرف یہ کہ جائز ہے بلکہ مستحب اور ثواب ہے۔ [1]

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾ ومنک .فقال:" نعم، تقبل الله منا ومنک "(السنن الكبرى للبيهقي، رقم الحديث ٦٣٦٦)

حدثني حبيب بن عمر الأنصاري، أخبرني أبي قال: " لقيت واثلة يوم عيد فقلت: تقبل الله منا ومنک فقال: نعم، تقبل الله منا ومنک "(المعجم الكبير للطبراني، رقم الحديث ١٢٣، ج٢٢ص ٥٢)

حدثنا عبد السلام البزاز، عن أدهم، مولى عمر بن عبد العزيز، قال: " كنا نقول لعمر بن عبد العزيز في العيدين: تقبل الله منا ومنک يا أمير المؤمنين، فيرد علينا ولا ينكر ذلک علينا "(شعب الإيمان للبيهقي، رقم الحديث ٣٤٤٦)

عن راشد بن سعد، أن أبا أمامة الباهلي، وواثلة بن الأسقع، رضي الله عنهما لقياه في يوم عيد فقالا: تقبل الله منا ومنک(الدعاء للطبراني، رقم الحديث ٩٢٨)

ذكره من طريق محمد بن ابراهيم الشامي عن بقية ثم قال (قال أبو احمد بن عدى هذا منكر لا اعلم يرويه عن بقية غير محمد بن ابراهيم هذا) ثم قال البيهقي (رأيته باسناد آخر عن بقية موقوفا ولا اراه محفوظ)قلت في هذا الباب حديث جيد .

اغفله البيهقي وهو حديث محمد بن زياد قال كنت مع ابى امامة الباهلي وغيره من اصحاب النبي صلى الله عليه و سلم فكانوا إذا رجعوا يقول بعضهم لبعض تقبل الله منا ومنک قال احمد بن حنبل اسناده اسناد جيد (الجوهر النقي لابن التركماني، ج٣ص ٣١٩، ٣٢٠،باب قول الناس في العيد تقبل الله منا ومنک)

وقد روى بن عدى من حديث واثلة أنه لقي رسول الله صلى الله عليه وسلم يوم عيد فقال تقبل الله منا ومنک فقال نعم تقبل الله منا ومنک وفي إسناده محمد بن إبراهيم الشامي وهو ضعيف وقد تفرد به مرفوعا وخولف فيه فروى البيهقي من حديث عبادة بن الصامت أنه سأل رسول الله صلى الله عليه وسلم عن ذلک فقال ذلک فعل أهل الكتابين وإسناده ضعيف أيضا وكأنه أراد أنه لم يصح فيه شيء وروينا في المحامليات بإسناد حسن عن جبير بن نفير قال كان أصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم إذا التقوا يوم العيد يقول بعضهم لبعض تقبل الله منا ومنک(فتح الباري لابنِ حجر، ج٢ص ٤٤٦،قوله باب سنة العيدين لأهل الإسلام)

[1] علامہ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ نے ''مبارک بادی'' کے ثبوت پر ایک مستقل رسالہ تحریر فرمایا ہے، جس کا نام ہے ''وصول الاماني باصول التهاني'' ۔علامہ سیوطی رحمہ اللہ اس رسالے میں عید کے موقعہ پر مبارک بادی کے ثبوت پر کلام کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ:

أخرج الطبراني في الكبير وزاهر بن طاهر في تحفة عيد الأضحى عن حبيب بن عمر

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

اس سلسلہ میں چند حوالے جات ذیل میں پیش کیے جاتے ہیں۔

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

الأنصاری قال: حدثنی أبی قال: لقیت واثلة رضی الله عنه یوم عید فقلت: تقبل الله منا ومنک، فقال: تقبل الله منا ومنک .وأخرج الأصبهانی فی الترغیب عن صفوان بن عمرو السکسکی قال: سمعت عبد الله بن بشر وعبد الرحمن بن عائذ وجبیر بن نفیر وخالد بن معدان یقال لهم فی أیام الأعیاد: تقبل الله منا ومنکم، ویقولون ذلک لغیرهم. وأخرج الطبرانی فی الدعاء والبیهقی عن راشد بن سعد أن أبا أمامة وواثلة لقیاه فی یوم عید فقالا: تقبل الله منا ومنک.

وأخرج زاهر بن طاهر فی کتاب تحفة عید الفطر، وأبو أحمد الفرضی فی مشیخته بسند حسن عن جبیر بن نفیر قال: کان أصحاب رسول الله صلی الله علیه وسلم إذا التقوا یوم العید یقول بعضهم لبعض: تقبل الله منا ومنکم، وأخرج زاهر أیضا بسند حسن عن محمد بن زیاد الألهانی قال: رأیت أبا أمامة الباهلی یقول فی العید لأصحابه: تقبل الله منا ومنکم.

وأخرج البیهقی من طریق أدهم مولی عمر بن عبد العزیز قال: کنا نقول لعمر بن عبد العزیز فی العیدین: تقبل الله منا ومنک یا أمیر المؤمنین، فیرد علینا مثله ولا ینکر ذلک، وأخرج الطبرانی فی الدعاء عن شعبة بن الحجاج قال: لقیت یونس بن عبید فقلت: تقبل الله منا ومنک، فقال لی مثله.

وأخرج الطبرانی فی الدعاء من طریق حوشب بن عقیل قال: لقیت الحسن البصری فی یوم عید فقلت: تقبل الله منا ومنک.

وأخرج ابن حبان فی الثقات عن علی بن ثابت قال: سألت مالکا عن قول الناس فی العید تقبل الله منا ومنک، فقال: ما زال الأمر عندنا کذلک، لکن أخرج ابن عساکر من حدیث عبادة بن الصامت قال: سألت رسول الله صلی الله علیه وسلم عن قول الناس فی العیدین: تقبل الله منا ومنکم، فقال: (کذلک فعل أهل الکتابین) وکرهه، وفی إسناده عبد الخالق بن خالد بن زید بن واقد الدمشقی، قال فیه البخاری: منکر الحدیث، وقال أبو حاتم: ضعیف، وقال النسائی: لیس بثقة، وقال الدارقطنی: متروک، وقال أبو نعیم: لا شیء (الحاوی للفتاویٰ ،الجزء الاول، ص ۹۳و ۹۴، الفتاویٰ الفقهیة ،کتاب الصلاة، الرسالة ”وصول الأمانی بأصول التهانی“ التهنئة بالعید)

وفی استحباب التهنئة بالعید قوله" :عن جبیر بن نفیر قال :کان أصحاب النبی صلی الله علیه وسلم إذا التقوا یوم العید یقول بعضهم لبعض :تقبل الله منا ومنک .قال الحافظ :إسناده حسن."

قلت :المراد بـ "الحافظ "عند الإطلاق ابن حجر العسقلانی ولم أقف علی هذا التحسین فی شیء من کتبه وإنما وجدته للحافظ السیوطی فی رسالته" :وصول الأمانی فی أصول التهانی "ص 109

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

’’الموسوعةُ الفقهية الكويتية‘‘ کا حوالہ

’’الموسوعةُ الفقهية الكويتية‘‘ میں ہے کہ:

التهنئة مستحبة فی الجملة؛ لأنها مشاركة بالتبريک والدعاء – من المسلم لأخيه المسلم فيما يسره ويرضيه؛ ولما فی ذلک من التواد، والتراحم، والتعاطف بين المسلمين .وقد جاء فی القرآن الكريم تهنئة المؤمنين على ما ينالون من نعيم، وذلک فی قوله

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

من الجزء الأول من "الحاوی للفتاوی "وقد عزاه لزاهر بن طاهر فی "كتاب تحفة عيد الفطر " وأبی أحمد الفرضی.

ورواه المحاملی فی "كتاب صلاة العيدين 2 "/ 129 / 2 بإسناد رجاله كلهم ثقات رجال "التهذيب "غير شيخه المهنى بن يحيى وهو ثقة نبيل كما قال الدارقطنی وهو مترجم فی "تاريخ بغداد 13 "/ 268 - 266 فالإسناد صحيح لكن خالفه حاجب بن الوليد فی إسناده فلم يرفعه إلى أصحاب النبی صلى الله عليه وسلم

فقال :حدثنا مبشر بن إسماعيل الحلبی عن صفوان بن عمرو السكسكی قال":سمعت عبد الله بن بسرو عبد الرحمن بن عائذ وجبير بن نفير وخالد بن معدان يقال لهم فی أيام الأعياد :تقبل الله منا ومنكم .ويقولون ذلک لغيرهم."أخرجه أبو القاسم الأصبهانی فی كتابه "الترغيب والترهيب "ق 41/ 42 - 2 /.1 فإن صح السند بهذا إلى الحاجب فإن فی الطريق إليه من يحتاج إلى الكشف عن حاله فلعل مبشر بن إسماعيل حدث بهذا وهذا وبخاصة أن عبد الله بن بسر هذا -وهو المازنی -صحابی صغير ولأبيه صحبة فيبعد أن يقول هو والتابعون المذكورون معه شيئا دون أن يتلقوه عن الصحابة فتكون الروايتان صحيحتين فالصحابة فعلوا ذلک فاتبعهم عليه التابعون المذكورون. والله سبحانه وتعالى أعلم.

ويؤيد الرواية الأولى ما ذكره ابن التركمانی فی "الجوهر النقی 3 "/ 320 من رواية محمد بن زياد قال :كنت مع أبی أمامة الباهلی وغيره من أصحاب النبی صلى الله عليه وسلم فكانوا إذا رجعوا يقول بعضهم لبعض :تقبل الله منا ومنک .قال أحمد بن حنبل :إسناده جيد.

ولم يذكر من رواه وقد عزاه السيوطی لزاهر أيضا بسند حسن عن محمد بن زياد الألهانی قال: رأيت أبا أمامة الباهلی يقول فی العيد لأصحابه :تقبل الله منا ومنكم.

ثم كتب بعض إخواننا الطلاب تعليقا على نفيی المتقدم فقال:بل قال الحافظ فی "الفتح 2 "/ 446":وروينا فی المحامليات بإسناد حسن عن جبير بن نفير ." ...ثم ذكره .(تمام المنة فی التعليق على فقه السنة،للألبانی،ص ۳۵۴ الٰی ۳۵۶،ومن باب صلاة العيدين)

تعالى"كلوا واشربوا هنيئا بما كنتم تعملون"

والتهنئة تكون بكل ما يسر ويسعد مما يوافق شرع الله تعالى، ومن ذلك: التهنئة بالنكاح، والتهنئة بالمولود، والتهنئة بالعيد والأعوام والأشهر، والتهنئة بالقدوم من السفر، والتهنئة بالقدوم من الحج أو العمرة، والتهنئة بالطعام، والتهنئة بالفرج بعد الشدة.............

ذهب جمهور الفقهاء إلى مشروعية التهنئة بالعيد من حيث الجملة(الموسوعة الفقهية ج۱۴،ص۹۷ الٰی ۹۹ ملخصاً، حرف التاء،مادة "تهنئة") ؎

؎ اور جمہور فقہاء کے اقوال کی تشریح کرتے ہوئے آگے"الموسوعةُ الفقهية" میں مذکور ہے کہ:

فقال صاحب الدر المختار – من الحنفية – إن التهنئة بالعيد بلفظ "يتقبل الله منا ومنكم "لا تنكر.

وعقب ابن عابدين على ذلك بقوله: إنما قال – أي صاحب الدر المختار – كذلك لأنه لم يحفظ فيها شيء عن أبي حنيفة وأصحابه، وقال المحقق ابن أمير حاج: بل الأشبه أنها جائزة مستحبة في الجملة، ثم ساق آثارا بأسانيد صحيحة عن الصحابة في فعل ذلك، ثم قال: والمتعامل في البلاد الشامية والمصرية: عيد مبارك عليك ونحوه، وقال: يمكن أن يلحق بذلك في المشروعية والاستحباب لما بينهما من التلازم، فإن من قبلت طاعته في زمان كان ذلك الزمان عليه مباركا، على أنه قد ورد الدعاء بالبركة في أمور شتى فيؤخذ منه استحباب الدعاء بها هنا أيضا.

أما عند المالكية فقد سئل الإمام مالك عن قول الرجل لأخيه يوم العيد: تقبل الله منا ومنك يريد الصوم وفعل الخير الصادر في رمضان، وغفر الله لنا ولك فقال: ما أعرفه ولا أنكره .قال ابن حبيب: معناه لا يعرفه سنة ولا ينكره على من يقوله؛ لأنه قول حسن لأنه دعاء، حتى قال الشيخ الشبيبي يجب الإتيان به لما يترتب على تركه من الفتن والمقاطعة .ويدل لذلك ما قالوه في القيام لمن يقدم عليه، ومثله قول الناس لبعضهم في اليوم المذكور: عيد مبارك، وأحياكم الله لأمثاله، لا شك في جواز كل ذلك بل لو قيل بوجوبه لما بعد؛ لأن الناس مأمورون بإظهار المودة والمحبة لبعضهم.

أما الشافعية فقد نقل الرملي عن القمولي،قوله: لم أر لأصحابنا كلاما في التهنئة بالعيد

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

ترجمہ: مبارک بادی فی الجملۃ مستحب ہے، اس لیے کہ یہ برکت میں ایک دوسرے کو شریک کرنا ہے، اور ایک مسلمان کی طرف سے اُس کے مسلمان بھائی کے لیے اُس چیز میں دعاء ہے، جس چیز سے اُس کو خوشی حاصل ہو اور وہ جس چیز سے راضی ہو، اور ایک وجہ یہ ہے کہ اس میں مسلمانوں کے درمیان محبت ورحمت اور ہمدردی کا پہلو پایا جاتا ہے، اور مؤمنین کا اُن نعمتوں پر مبارک باد دینا، جو وہ جنت میں پائیں گے، قرآنِ کریم (کی سورہ مرسلات) میں اللہ تعالیٰ کے اس قول میں مذکور ہے کہ:

"كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِيْئًا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ"

اور مبارک بادی ہر اُس چیز کے ساتھ ہوتی ہے، جو خوشی والی ہو اور نیک بخت ہو،

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾ والأعوام والأشهر كما يفعله الناس، لكن نقل الحافظ المنذرى عن الحافظ المقدسى أنه أجاب عن ذلك بأن الناس لم يزالوا مختلفين فيه، والذى أراه أنه مباح لا سنة فيه ولا بدعة.

ثم قال الرملى: وقال ابن حجر العسقلانى: إنها مشروعة، واحتج له بأن البيهقى عقد لذلك بابا فقال: باب ما روى فى قول الناس بعضهم لبعض فى يوم العيد: تقبل الله منا ومنك، وساق ما ذكره من أخبار وآثار ضعيفة لكن مجموعها يحتج به فى مثل ذلك، ثم قال: ويحتج لعموم التهنئة لما يحدث من نعمة أو يندفع من نقمة بمشروعية سجود الشكر والتعزية، وبما فى الصحيحين عن كعب بن مالك فى قصة توبته لما تخلف عن غزوة تبوك أنه لما بشر بقبول توبته ومضى إلى النبى صلى الله عليه وسلم قام إليه طلحة بن عبيد الله فهنأه .وكذلك نقل القليوبى عن ابن حجر أن التهنئة بالأعياد والشهور والأعوام مندوبة .قال البيجورى: وهو المعتمد.

وجاء فى المغنى لابن قدامة: قال أحمد رحمه الله: ولا بأس أن يقول الرجل للرجل يوم العيد: تقبل الله منا ومنك، وقال حرب: سئل أحمد عن قول الناس فى العيدين: تقبل الله منا ومنكم قال: لا بأس به، يرويه أهل الشام عن أبى أمامة، قيل: وواثلة بن الأسقع؟ قال: نعم، قيل: فلا تكره أن يقال هذا يوم العيد؟ قال: لا.

وذكر ابن عقيل فى تهنئة العيد أحاديث منها أن محمد بن زياد قال: كنت مع أبى أمامة الباهلى وغيره من أصحاب النبى صلى الله عليه وسلم فكانوا إذا رجعوا من العيد يقول بعضهم لبعض: تقبل الله منا ومنك، وقال أحمد: إسناد حديث أبى أمامة جيد (الموسوعة الفقهية ج١٤،ص٩٩، ١٠٠، حرف التاء،مادة "تهنئة")

اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق ہو(گناہ والا کام نہ ہو)اوراسی خوشی والی چیزوں میں سے نکاح کی مبارک بادبھی ہےاور بچے کی ولادت کی مبارک بادبھی ہےاورعید کی مبارک بادبھی ہےاورسال اورمہینوں کے آغاز کی مبارک بادبھی ہےاورسفر سے آنے کی مبارک بادبھی ہےاورحج وعمرے سے آنے کی مبارک بادبھی ہےاور کھانے کی مبارک بادبھی ہے اور پریشانی دُور ہونے کی مبارک بادبھی ہے .... جمہورفقہاء کے نزدیک عید کے موقعہ پر مبارک باد دینا مجموعی طور پر مشروع ہے(الموسوعۃ الفقھیۃ)

’’حاشیۃُ البجیرمی‘‘ کا حوالہ

سلیمان بن محمد بجیرمی شافعی فرماتے ہیں کہ:

قوله: (تقبل الله إلخ) قضية هذا أن هذا من التهنئة، ومنه: أعاده الله عليكم بخير، والمراد: تقبل الله منكم صلاة العيد والأضحى والقيام (حاشية البجيرمي على الخطيب، ج۲ص۲۲۶، كتاب الصلاة، فصل في صلاة العيدين)

ترجمہ: یہ الفاظ کہ’’اللہ تعالیٰ آپ سے قبول فرمائے‘‘ان الفاظ کا معاملہ یہ ہے کہ یہ مبارک بادی کے الفاظ ہیں(اورمستحب ہیں)اورمبارک بادی ہی کے الفاظ یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کوآپ کے لیے بھی لوٹائے،خیر کے ساتھ اوراللہ تعالیٰ آپ سے قبول فرمائے،سے مرادیہ ہے کہ عیدین کی نمازاورتراویح وغیرہ قبول فرمائے(حاشیہ بجیرمی)

’’عیدمبارک‘‘ کے بھی یہی معنیٰ ہیں۔

’’حاشیۃُ الشروانی‘‘ کا حوالہ

شافعیہ کی کتاب’’حاشیۃُ الشروانی‘‘میں ہے کہ:

قوله مر تقبل الله إلخ أى ونحو ذلك مما جرت به العادة فى التهنئة ومنه المصافحة ويؤخذ من قوله فى يوم العيد أنها لا تطلب فى أيام التشريق وما بعد يوم عيد الفطر لكن جرت عادة الناس بالتهنئة فى هذه الأيام ولا مانع منه؛ لأن المقصود منه التودد وإظهار السرور ويؤخذ من قوله يوم العيد أيضا أن وقت التهنئة يدخل بالفجر لا بليلة العيد خلافا لما فى بعض الهوامش اهـ وقد يقال لا مانع منه أيضا إذا جرت العادة بذلك لما ذكره من أن المقصود منه التودد وإظهار السرور ويؤيده ندب التكبير فى ليلة العيد وعبارة شيخنا وتسن التهنئة بالعيد ونحوه من العام والشهر على المعتمد مع المصافحة إن اتحد الجنس فلا يصافح الرجل المرأة ولا عكسه ومثلها الأمرد الجميل وتسن إجابتها بنحو تقبل الله منكم أحياكم الله لأمثاله كل عام وأنتم بخير اهـ (حاشية الشروانى،علٰى تحفة المحتاج فى شرح المنهاج، ج٣،ص ٥٦، كتاب الصلاة،باب صلاة العيدين)

ترجمہ: اورعید کے دن مبارک باد دیتے وقت "تقبل اللّٰہ منا، الخ" اوراس کے مثل دوسرے الفاظ، جن کا لوگوں میں رواج ہو، وہ کہنا جائز اور مستحب ہے، اور مصافحہ بھی (اس مبارک باد کے موقع پر مستحب ہے) اورعید کے دن کی قید سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ ایامِ تشریق میں اور عیدالفطر کے دن کے بعد مبارک باد اور مصافحہ نہیں کیا جائے گا، لیکن ان دنوں میں بھی لوگوں کی عادت، مبارک باد دینے اور مصافحہ کی جاری ہے، اوراس میں کوئی ممانعت نہیں، کیونکہ اس سے مقصود محبت اور خوشی کا اظہار کرنا ہے، اور جو یہ فرمایا کہ عید کے دن اس سے یہ بات سمجھی جاتی ہے

کہ مبارک باد کا وقت، عید کے دن فجر کے وقت داخل ہوتا ہے، عید کی رات میں داخل نہیں ہوتا، لیکن بعض اہلِ حواشی کا اس میں اختلاف ہے (کہ ان کے نزدیک رات کے وقت ہی مبارک باد کا وقت شروع ہوجاتا ہے) اور بسا اوقات یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس میں بھی کوئی ممانعت کی وجہ نہیں، کیونکہ اس کی بھی لوگوں میں عادت جاری ہے، اور اس کی وجہ وہی ہے، جو ذکر کی گئی کہ اس سے مقصود محبت اور سرور وخوشی کا اظہار ہے، جس کی تائید، عید کی رات میں تکبیر کے مستحب ہونے سے بھی ہوتی ہے، اور ہمارے شیخ کی عبارت یہ ہے کہ عید وغیرہ کے موقع پر، جیسا کہ سال کے شروع اور مہینے کے شروع میں معتمد قول کے مطابق مصافحہ کے ساتھ عید کی مبارک باد سنت ہے، بشرطیکہ جنس متحد ہو، پس مرد کا عورت سے مصافحہ کرنا اور عورت کا مرد سے مصافحہ کرنا، درست نہیں، اور یہی حکم بے ریش خوبصورت لڑکے کا بھی ہے، اور عید کی مبارک باد کا جواب ''تقبل اللّٰہ منکم أحیاکم اللّٰہ '' یا اس کے مثل ''کل عام و أنتم بخیر '' وغیرہ جیسے الفاظ سے دینا سنت ہے (حاشیۃ الشروانی)

''بغیۃُ المسترشدین'' کا حوالہ

شافعیہ کی کتاب ''بغیۃُ المسترشدین'' میں ہے کہ:

التهنئة بالعيد سنة ، ووقتها للفطر غروب الشمس ، وفى الأضحى فجر عرفة كالتكبير اهـ. زاد ش ق. وكذا بالعام والشهر على المعتمد مع المصافحة عند اتحاد الجنس والخلوّ عن الريبة ، كامرأة وأمرد أجنبيين والبشاشة والدعاء بالمغفرة ، وقد جعل الله للمؤمنين ثلاثة أيام: عيد الجمعة والفطر والأضحى ، وكلها بعد

إكمال العبادة (بغية المسترشدين فی تلخيص فتاوی بعض الائمة من العلماء المتاخرين للسيد باعلوی الحضرمی، ص ۱۴۶، كتاب الصلاة، العيدان، الناشر: دار الفكر، بيروت، لبنان، مطبوعة: ۱۴۱۴ھ، 1994م)

ترجمہ: عید کی مبارک باد دینا سنت ہے، جس کا وقت عید الفطر کے سورج غروب ہونے کے وقت (یعنی چاند رات کو) ہو جاتا ہے، اور عید الاضحیٰ میں عرفہ (یعنی نو ذوالحجہ) کے دن فجر کے وقت ہو جاتا ہے، جیسا کہ اس وقت میں تکبیر کا بھی وقت ہو جاتا ہے، اور اسی طریقہ سے سال اور مہینے کے شروع ہونے پر بھی معتمد قول کے مطابق مبارک باد، مصافحہ کے ساتھ سنت ہے، بشرطیکہ جنس متحد ہو، اور شہوت کا شبہ بھی نہ ہو، جیسا کہ عورت اور بے ریش لڑکا، جبکہ یہ دونوں اجنبی ہوں، اور (مصافحہ و مبارک بادی کے وقت) خوشی کا اظہار کرنا، اور مغفرت کی دعاء کرنا بھی سنت ہے، اور اللہ تعالیٰ نے مومنین کے لیے تین دن، عید کے بنا دیئے ہیں، ایک جمعہ کا دن، اور ایک عید الفطر کا دن، اور ایک عید الاضحیٰ کا دن، اور یہ تمام کام عبادت مکمل کرنے کے بعد ہیں (بغية المسترشدين)

”المنتقٰی شرحُ الموطا“ کا حوالہ

موطا امام مالک کی شرح ”المنتقٰی“ میں ہے کہ:

وسئل مالک أيكره للرجل أن يقول لأخيه إذا انصرف من العيد تقبل الله منا ومنک وغفر لنا ولک ويرد عليه أخوه مثل ذلک قال لا يكره (المنتقٰی شرح الموطا، ج ۱، ص ۳۲۲، باب: ما جاء فی التكبير والقرائة فی صلاة العيدين، فصل: غدو الإمام يوم العيد وانتظار الخطبة)

ترجمہ: اور امام مالک سے سوال کیا گیا کہ کیا عید کی نماز سے لوٹنے کے بعد اپنے

مسلمان بھائی کو یہ کہنا کہ ’’تقبل اللّٰہ منا ومنک وغفر لنا ولک ‘‘اور اس کے جواب میں دوسرے کا اسی طرح کہنا مکروہ ہے؟

امام مالک نے اس کے جواب میں فرمایا کہ مکروہ نہیں ہے (المنتقٰی)

’’التاج والأکلیل ‘‘ کا حوالہ

مالکیہ کی کتاب ’’التاج والأکلیل ‘‘میں ہے:

قول الناس یوم العید بعضهم لبعض: غفر الله لنا ولک تقبل الله منا ومنک قال مالک: لا أعرفه ولا أنکره.

قال ابن حبیب: ورأیت أصحابه لا یبتدئون به ویعیدونه علی قائله، ولا بأس بابتدائه (التاج والأکلیل لمختصر خلیل، ج۲، ص ۵۸۴، کتاب الصلاة، باب فی صلاة العیدین)

ترجمہ: لوگوں کا عید کے دن ایک دوسرے کو یہ کہنا کہ ’’غفر اللّٰہ لنا ولک تقبل اللّٰہ منا ومنک ‘‘امام مالک نے فرمایا کہ نہ میں اس کی معرفت رکھتا ہوں، اور نہ اس کا انکار کرتا ہوں۔

ابنِ حبیب مالکی نے فرمایا کہ میں نے امام مالک کے اصحاب کو دیکھا کہ وہ خود ان الفاظ کے کہنے میں ابتداء نہیں کرتے تھے، اور جو ان کو یہ الفاظ کہتا تھا، اس کو جواب میں یہ الفاظ کہہ دیتے تھے، اور دوسرے کو ابتداءً یہ الفاظ کہنے میں بھی حرج نہیں (التاج والأکلیل)

امام ابنِ تیمیہ کا حوالہ

امام ابنِ تیمیہ رحمہ اللہ کے فتاویٰ میں ہے کہ:

وسئل – رحمه الله تعالی –:

هل التهنئة في العيد وما يجري على ألسنة الناس: " عيدک مبارک "وما أشبهه هل له أصل في الشريعة؟ أم لا؟ وإذا كان له أصل في الشريعة فما الذي يقال؟ أفتونا مأجورين.

فأجاب:

أما التهنئة يوم العيد يقول بعضهم لبعض إذا لقيه بعد صلاة العيد: تقبل الله منا ومنكم وأحاله الله عليک ونحو ذلک فهذا قد روى عن طائفة من الصحابة أنهم كانوا يفعلونه ورخص فيه الأئمة كأحمد وغيره .لكن قال أحمد: أنا لا أبتدء أحدا فإن ابتدأني أحد أجبته وذلک لأن جواب التحية واجب وأما الابتداء بالتهنئة فليس سنة مأمورا بها ولا هو أيضا مما نهى عنه فمن فعله فله قدوة ومن تركه فله قدوة .والله أعلم(مجموع الفتاویٰ، ج۲۴ ص۲۵۳، کتاب الصلاۃ، باب صلاۃ الجمعۃ)

ترجمہ: (امام ابنِ تیمیہ سے) سوال کیا گیا کہ: کیا عید کے دن مبارک باد دینا اور وہ الفاظ جو عام طور پر لوگ استعمال کرتے ہیں، یعنی ''عید مبارک'' اور اس جیسے دوسرے الفاظ، کیا ان کی شریعت میں کوئی اصل ہے، یا نہیں؟ اور اگر اس کی شریعت میں کوئی اصل ہے، تو وہ کیا الفاظ ہیں؟ ہمیں اس پر فتویٰ دیجیے اور ثواب حاصل کیجیے۔

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ: عید کے دن مبارک باد دینا اس طرح کہ ایک دوسرے سے عید کی نماز کے بعد جب ملاقات کریں، تو یوں کہیں کہ ''اللہ تعالیٰ ہماری طرف سے اور آپ کی طرف سے قبول فرمائے اور اللہ تعالیٰ اس کو آپ کے لیے بہتر کرے'' اور اس جیسے دوسرے الفاظ، تو یہ صحابہ کی ایک جماعت سے مروی ہے کہ وہ

ایسا کیا کرتے تھے اور اس کی ائمہ فقہاء، مثلاً امام احمد وغیرہ نے اجازت دی ہے۔ لیکن امام احمد نے یہ بھی فرمایا کہ میں کسی کے ساتھ اس کی ابتداء نہیں کرتا، البتہ اگر کوئی میرے ساتھ ابتداء کرتا ہے، تو میں اس کا جواب دیدیتا ہوں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ سلام کا جواب واجب ہے اور مبارک بادی کی ابتداء کرنا ایسی سنت نہیں ہے، جس کا شریعت نے حکم دیا ہو اور نہ وہ ایسی چیز ہے کہ جس سے شریعت نے منع کیا ہو؛ لہٰذا جو شخص اس کو کرتا ہے، اس کے لیے بھی دلیل موجود ہے اور جو نہیں کرتا، اس کے لیے بھی موجود ہے۔ واللہ اعلم (مجموعُ الفتاویٰ)

”المغنی لابنِ قدامة“ کا حوالہ

علامہ ابنِ قدامہ حنبلی ”المغنی“ میں فرماتے ہیں کہ:

قال أحمد، – رحمه الله –: ولا بأس أن يقول الرجل للرجل يوم العيد: تقبل الله منا ومنك .وقال حرب: سئل أحمد عن قول الناس في العيدين تقبل الله ومنكم .قال: لا بأس به، يرويه أهل الشام عن أبي أمامة.

قيل: وواثلة بن الأسقع؟ قال: نعم .قيل: فلا تكره أن يقال هذا يوم العيد .قال: لا .وذكر ابن عقيل في تهنئة العيد أحاديث، منها، أن محمد بن زياد، قال: كنت مع أبي أمامة الباهلي وغيره من أصحاب النبي – صلى الله عليه وسلم – فكانوا إذا رجعوا من العيد يقول بعضهم لبعض: تقبل الله منا ومنك .وقال أحمد: إسناد حديث أبي أمامة إسناد جيد.

وقال علي بن ثابت: سألت مالك بن أنس منذ خمس وثلاثين

سنة، وقال: لم يزل يعرف هذا بالمدينة .وروى عن أحمد أنه قال: لا أبتدى به أحدا، وإن قاله أحد رددته عليه (المغنى لابن قدامة، ج۲، ص ۲۹۵، ۲۹۶، کتاب الصلاة، باب صلاة العيدين، فصل قول الناس فی العيدين تقبل الله منا ومنكم)

ترجمہ: امام احمد رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اس میں کوئی حرج نہیں کہ ایک آدمی، دوسرے آدمی کوعید کے دن یہ کہے کہ ’’**تقبل اللّٰہ منا ومنک**‘‘،اورحرب نے فرمایا کہ امام احمد سے عیدین میں لوگوں کے’’**تقبل اللّٰـہ منا ومنکم**‘‘ کے بارے میں سوال کیا گیا،توانہوں نے فرمایا کہ اس میں کوئی حرج نہیں،اس کو اہلِ شام نے ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔

امام احمد سے یہ سوال کیا گیا کہ کیا واثلہ بن اسقع نے بھی روایت کیا ہے؟امام احمد نے جواب میں فرمایا کہ جی ہاں،امام احمد سے سوال کیا گیا کہ کیا عید کے دن یہ الفاظ کہنا مکروہ تو نہیں؟امام احمد نے فرمایا کہ نہیں۔

اورابنِ عقیل نے’’**تهنئة العيد**‘‘میں چنداحادیث ذکر کی ہیں،جن میں سے ایک حدیث یہ ذکر کی ہے کہ محمد بن زیاد کہتے ہیں کہ میں ابوامامہ باہلی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دوسرے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ ہوتا تھا، یہ حضرات جب عید سے لوٹ کرآتے تھے،توایک دوسرے کو یہ کہتے تھے کہ’’**تقبل اللّٰہ منا ومنک**‘‘امام احمد نے فرمایا کہ ابوامامہ کی حدیث کی سند عمدہ ہے۔

اورعلی بن ثابت نے فرمایا کہ میں نے مالک بن انس سے پینتیس سال ہوئے، اس کے بارے میں سوال کیا،تو انہوں نے فرمایا کہ مدینہ میں یہ الفاظ برابر معروف ومشہور(یعنی رائج) ہیں،اورامام احمد سے ایک روایت یہ مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ میں کسی کوابتداءً یہ الفاظ نہیں کہتا،اوراگرکوئی یہ الفاظ کہے،تو

میں اس کے جواب میں یہ الفاظ ہی کہہ دیتا ہوں (المغنی)

”حلبی کبیر“ کا حوالہ

حنفیہ کی کتاب ”حلبی کبیر“ میں ہے کہ:

والاظهر انه لا بأس به لما فيه من الاثر (حلبی کبیر، صفحه ۵۷۳، کتاب الصلاة ،فروع فی صلاة العيد،الناشر: سهيل اکادمی، لاهور، الباکستان)

ترجمہ: اور راجح بات یہ ہے کہ عید کی مبارک باد میں کوئی حرج نہیں، کیونکہ اس بارے میں (بعض صحابۂ کرام کا) اثر وروایت موجود ہے (حلبی کبیر)

”البحرُ الرائق“ کا حوالہ

حنفیہ کی کتاب ”البحرُ الرائق“ میں ہے کہ:

والتهنئة بقوله تقبل الله منا ومنكم لاتنكر (البحرالرائق،ج۲ص ۱۷۱، کتاب الصلاة، باب العيدين، ،الدرالمختار مع شرحه رد المحتار جلد۲ صفحه ۱۶۹، کتاب الصلاة ، باب العيدين)

ترجمہ: اور مبارک بادی دینا، ان الفاظ میں کہ ” تَقَبَّلَ اللّٰہُ مِنَّا وَمِنْکُمْ “ کوئی بُری (اور قابلِ نکیر) چیز نہیں (البحرُ الرائق)

”حاشیۃُ الطحطاوی علی المراقی“ کا حوالہ

حنفیہ کی کتاب ”حاشیۃُ الطحطاوی علی المراقی“ میں ہے کہ:

والتهنئة بقوله تقبل الله منا ومنكم لا تنكر بل مستحبة لورود الأثر بها..........قول الرجل لصاحبه عيد مبارك عليك ونحوه ويمكن أن يلحق هذا اللفظ بذلك في الجواز الحسن واستحبابه

لما بينهما من التلازم(حاشية الطحطاوى على المراقى ص ۵۳۰، ملخصاً، كتاب الصلاة ،باب احكام العيدين)

ترجمہ: اور عید کے دن مبارک باد دینا، ان الفاظ میں کہ اللہ تعالیٰ ہماری اور آپ کی طرف سے قبول فرمائے، اس کو ممنوع قرار نہیں دیا جائے گا، بلکہ مستحب قرار دیا جائے گا......(اور کچھ آگے چل کر ہے)......

آدمی کا اپنے ساتھی کو یہ کہنا کہ آپ کو عید مبارک ہو، یا اس سے ملتا جلتا لفظ، ان الفاظ کے جائز اور مستحب ہونے کا وہی حکم ہے، جو پہلے الفاظ کا گزرا، کیونکہ دونوں ایک دوسرے کی طرح ہیں (حاشیۃ طحطاوی)

’’أحكامُ التهنئة بالعيدين‘‘ کا حوالہ

دکتور احمد بن حمد بن عبدالعزیز الونیس (**قسم الفقه كلية الشريعة: جامعة الإمام محمد بن سعود الإسلامية، الرياض ، السعودية**) نے ’’**أحكامُ التهنئة بالعيدين**‘‘ کے نام سے ایک مضمون تحریر فرمایا ہے، اس میں وہ مبارکبادی کے متعلق مختلف اقوال اور ان کے دلائل تحریر کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ:

بعد إيراد أدلة الأقوال والمناقشات الواردة عليها يترجح والله أعلم القول باستحباب ابتداء التهنئة بالعيد، للأوجه الآتية:

الأول: ثبوت ذلک عن جماعة من الصحابة رضى الله عنهم، ولا يُعلَم لهم مخالف.

الثانى: أنه وإن كان الأصل فى التهانى الإباحة إلا أن التهنئة بالعيد يترتب عليها من المصالح ما يلحقها بالمستحبات؛ لما فيها من جلب الألفة والمودة بين المسلمين.

الثالث: يستأنس لذلک بأن التهنئة بالعيد جرى عليها عمل كثير من السلف فى القرون المفضلة، من التابعين ومن بعدهم من أئمة الهدى.

الرابع: لعل القائلين بأن التهنئة بالعيد بدعة محدثة إن ثبت ذلک عنهم – وكذا من كره ذلک من العلماء لم يطلعوا على الآثار الثابتة عن الصحابة رضى الله عنهم فى ذلک.

ومع ترجيح القول بالاستحباب إلا أنه إن ترتب على ترک التهنئة بالعيد لبعض الأشخاص حصول المقاطعة والشحناء فى القلوب صارت التهنئة واجبة حينئذٍ؛ لدفع هذه المفسدة، والله أعلم

(''أحكام التهنئة بالعيدين''مشمولة: مجلة العلوم الشرعية ، الرياض، السعودية، العدد السادس والثلاثون ،رجب 1436هـ ،صفحة ۴۸ و ۴۹)

ترجمہ: مبارکبادی کے متعلق مختلف اقوال کے دلائل اور مناقشات ذکر کرنے کے بعد راجح یہ ہے، واللہ أعلم، کہ عید کی مبارکباد میں ابتداء کرنا مستحب ہے، جس کی وجوہات مندرجہ ذیل ہیں۔

پہلی وجہ یہ ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت سے اس کا ثبوت ملتا ہے، اور صحابہ رضی اللہ عنہم کی طرف سے اس کی مخالفت کا ثبوت نہیں پایا جاتا۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ مبارکبادی کے اندر اصل مباح ہونا ہے، مگر عید کی مبارکبادی پر اس طرح کے مصالح مرتب ہوتے ہیں، جو اس کو مستحبات کے ساتھ لاحق کر دیتے ہیں، کیونکہ اس میں مسلمانوں کے درمیان الفت اور محبت کا پیدا ہونا پایا جاتا ہے۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ عید کی مبارکبادی کی تائید، اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ تابعین اور ان کے بعد ائمۂ ہدیٰ سے افضل زمانوں میں بہت سے سلف کا اس پر

عمل جاری رہا ہے۔

چوتھی وجہ یہ ہے کہ عید کی مبارکبادی کو بدعتِ محدثہ قرار دینے کے قائلین، اگر ان سے یہ بات ثابت ہو، اوراسی طریقہ سے جن علماء نے اس کومکروہ قرار دیا، شاید وہ اس سلسلہ میں صحابہ رضی اللہ عنہم سے ثابت شدہ آثار پر مطلع نہیں ہو پائے۔

اور مبارکبادی کے مستحب ہونے کے قول کو راجح قرار دینے کے بعد یہ ملحوظ رہنا بھی ضروری ہے کہ اگر عید کی مبارکبادی ترک کرنے پر بعض لوگوں سے قطع تعلقی اور دلوں میں بغض وعداوت کا پیدا ہونا مرتب ہو، تو اس وقت میں مبارکبادی واجب ہوجائے گی، تا کہ اس مفسدہ کو دور کیا جاسکے۔ واللہ أعلم (مجلّہ علومِ شرعیہ)

اور بھی کئی اہلِ علم حضرات نے عید کی مبارکبادی کو جائز یا مستحب قرار دیا ہے۔ [1]

اور آگے بھی مصافحہ ومعانقہ کے مسئلہ کے ذیل میں بعض عبارات وحوالہ جات، آتے ہیں۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ راجح یہ ہے کہ عید کے موقع پر ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان کو مبارکباد دینے میں حرج نہیں، بلکہ یہ مستحب اور بعض حضرات کے نزدیک سنت عمل ہے، اور یہ دراصل ایک دوسرے کے لیے اظہارِ شکر وسرور کی دعاء ہے، جب کہ عیدین کے موقع پر اظہارِ سرور وبشاشت کا خاص حکم ہے، جیسا کہ اگلی فصل میں آتا ہے۔

واللہ أعلم.

---

[1] چنانچہ مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ:

''عید مبارک'' کہنا درست ہے، فقہاء نے لکھا ہے (حسن العزیز، حصہ سوم، مشمولہ: ملفوظاتِ حکیم الامت، ج۱۹ص۹۴، ملفوظات ۳۰ رمضان ۱۳۳۶ھ، مطبوعہ: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان، تاریخِ اشاعت: صفر المظفر ۱۴۲۵ھ)

مولانا مفتی عبدالکریم گمتھلوی صاحب فرماتے ہیں کہ:

عید کے روز باہم ایک دوسرے کو اس لفظ سے تہنیت دینا ''تَقَبَّلَ اللّٰہُ مِنَّا وَمِنۡکُمۡ'' یا اس کے ہم مضمون لفظ سے جیسا ''عید مبارک'' وغیرہ، جائز اور فی الجملہ مستحب ہے، بشرطیکہ بطورِ رسم کے پابندی کے ساتھ نہ ہو (بارہ مہینوں کے فضائل واحکام صفحہ ۵۳، مطبوعہ: ادارۂ اسلامیات، لاہور۔ تاریخ طبع جمادی الاولیٰ ۱۴۰۶ھ)

(فصل نمبر 3)

عید کے دن اظہارِ سرور وبشاشت کا حکم

مصافحہ ومعانقہ سے متعلق احادیث وروایات اور عید کی مبارکباد کا ثبوت ملاحظہ کر لینے کے بعد عرض ہے کہ مسلمان کو جائز طریقے پر خوش کرنا، ویسے ہی احادیث کی رو سے باعثِ ثواب عمل ہے، اور احادیث میں عید کے دنوں میں خاص طور پر سرور اور بشاشت کے اظہار کی گنجائش دی گئی ہے، جس کی اور دنوں میں گنجائش نہیں دی گئی۔

اسی وجہ سے محدثینِ عظام اور فقہائے کرام نے بھی عید کے دنوں میں اظہارِ سرور وبشاشت کی خاص اہمیت بیان کی ہے، بلکہ بہت سے حضرات نے اس کو دین کے شعار میں داخل مانا ہے۔

جس کی ذیل میں کچھ تفصیل ذکر کی جاتی ہے۔

بعض صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی حدیث

حضرت عبداللہ بن دینار رحمہ اللہ، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے روایت کرتے ہیں کہ:

قِيْـلَ: يَـا رَسُـوْلَ الـلّٰـهِ مَنْ أَحَبُّ النَّاسِ إِلَى اللّٰهِ؟ قَالَ: أَنْفَعُهُمْ لِلنَّاسِ، وَإِنَّ أَحَـبَّ الْأَعْمَالِ إِلَى اللّٰهِ سُرُوْرٌ تُدْخِلُهُ عَلٰى مُؤْمِنٍ، تَكْشِفُ عَنْهُ كَـرْبًا، أَوْ تَقْضِيْ عَنْهُ دَيْنًا، أَوْ تَطْرُدُ عَنْهُ جُوْعًا، وَلَأَنْ أَمْشِيَ مَعَ أَخِي الْـمُسْـلِـمِ فِـيْ حَاجَةٍ أَحَبُّ إِلَيَّ مِنْ أَنْ أَعْتَكِفَ شَهْرَيْنِ فِيْ مَسْجِدٍ، وَمَـنْ كَفَّ غَـضَبَـهٗ سَتَـرَ الـلّٰـهُ عَوْرَتَهٗ، وَمَنْ كَظَمَ غَيْظَهٗ، وَلَوْ شَاءَ أَنْ

يُمْضِيَهُ أَمْضَاهُ، مَلَأَ اللّٰهُ قَلْبَهُ رِضًى، وَمَنْ مَشٰى مَعَ أَخِيهِ الْمُسْلِمِ فِيْ حَاجَةٍ حَتّٰى يُثْبِتَهَا لَهُ ثَبَّتَ اللّٰهُ قَدَمَيْهِ يَوْمَ تَزِلُّ الْأَقْدَامُ، وَإِنَّ سُوْءَ الْخُلُقِ لَيُفْسِدُ الْعَمَلَ كَمَا يُفْسِدُ الْخَلُّ الْعَسَلَ (قضاء الحوائج لابنِ ابی الدنيا، رقم الحديث ٣٦، ص٤٧، باب فی قضاء الحوائج، الناشر: مكتبة القرآن، القاهرة) [1]

ترجمہ: عرض کیا گیا کہ اے اللہ کے رسول! لوگوں میں اللہ کو سب سے زیادہ محبوب کون ہے؟ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو لوگوں کو سب سے زیادہ نفع (اور فائدہ) پہنچانے والا ہو، اور اللہ کو اعمال میں سب سے زیادہ محبوب

---

[1] قال الالبانی:

أخرجه الطبرانی فی "المعجم الكبير (٣/٢/٢٠٩) "وابن عساكر فی "التاريخ (٢/١/١٨) "عن عبد الرحمن بن قيس الضبی أنبأنا سكين ابن أبی سراج أنبأنا عمرو بن دينار عن ابن عمر " :أن رجلا جاء إلى النبی صلى الله عليه وسلم فقال :يا رسول الله أی الناس أحب إلى الله وأی الأعمال أحب إلى الله؟ فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم " :فذكره .

وليس فيه الجملة التی بين المعكوفتين وليس عند ابن عساكر قوله " :ولأن أمشی ... الخ".

قلت :وهذا إسناد ضعيف جدا سكين هذا اتهمه ابن حبان، فقال " :يروی الموضوعات ."وقال البخاری " :منكر الحديث ."وعبد الرحمن بن قيس الضبی مثله أو شر منه، قال الحافظ فی "التقريب " :"متروك، كذبه أبو زرعة وغيره ."

لكن قد جاء بإسناد خير من هذا، فرواه ابن أبی الدنيا فی "قضاء الحوائج " (ص٨٠رقم٣٦) وأبو إسحاق المزكی فی "الفوائد المنتخبة (١/٢/١٤٧) " ببعضه - وابن عساكر(١١/١/٤٤٤)من طرق عن بكر بن خنيس عن عبد الله بن دينار عن بعض أصحاب النبی صلى الله عليه وسلم (كذا قال ابن أبی الدنيا، وقال الآخران :عن عبد الله بن عمر -قال :قيل يا رسول الله من أحب الناس إلى الله " ...وفيه الزيادة . قلت: وهذا إسناد حسن، فإن بكر بن خنيس صدوق له أغلاط كما قال الحافظ . وعبد الله بن دينار ثقة من رجال الشيخين.

فثبت الحديث .والحمد لله تعالى(سلسلة الاحاديث الصحيحة ، تحت رقم الحديث ٩٠٦)

وہ خوشی ہے، جو آپ، مومن کو پہنچائیں، جس میں آپ اس کی تکلیف کو دور کردیں، یا آپ اس کا قرض اداء کردیں، یا آپ (نقدی، غلہ، کھانا وغیرہ فراہم کرکے) اس کی بھوک کو دور کردیں، اور میں اپنے مسلمان بھائی کے ساتھ کسی ضرورت (پوری کرنے) کے لئے چلوں، یہ مجھے اس سے زیادہ محبوب ہے کہ میں کسی مسجد میں دو مہینے کا اعتکاف کروں، اور جو شخص اپنے غصہ کو روکتا ہے، تو اللہ اس کے عیب کو چھپاتا ہے، اور جو شخص اپنے غصہ کو پیتا ہے، حالانکہ اگر وہ چاہے، تو اپنے غصہ پر عمل درآمد بھی کرسکتا ہے، تو اللہ، اس کے دل کو اپنی رضا سے بھر دیتا ہے، اور جو شخص اپنے مسلمان بھائی کی ضرورت (پوری کرنے) کے لئے چلتا ہے، یہاں تک کہ وہ اس ضرورت کو پوری کردیتا ہے، تو اللہ اس کے قدموں کو اس (قیامت کے) دن ثابت قدم رکھے گا، جس دن لوگوں کے قدم ڈگمگا جائیں گے، اور برے اخلاق، عمل کو اس طرح سے خراب کردیتے ہیں، جس طرح سے کہ سرکہ، شہد کو خراب کردیتا ہے (ابنِ ابی الدنیا)

ابنِ عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث

اس طرح کی حدیث حضرت ابنِ عمر رضی اللہ عنہ کی سند سے بھی مروی ہے، جس کی سند میں ضعف پایا جاتا ہے، لیکن گزشتہ اور آگے آنے والی احادیث، اس کی تائید کرتی ہیں۔ [1]

---

[1] حدثنا محمد بن عبد الرحيم الشافعي الحمصي، ثنا القاسم بن هاشم السمسار، ثنا عبد الرحمن بن قيس الضبي، ثنا سكين بن أبي سراج، ثنا عمرو بن دينار، عن ابن عمر أن رجلا جاء إلى النبي صلى الله عليه وسلم ,فقال :يا رسول الله ,أي الناس أحب إلى الله؟ وأي الأعمال أحب إلى الله؟ فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم :أحب الناس إلى الله تعالى أنفعهم للناس، وأحب الأعمال إلى الله تعالى سرور تدخله على مسلم، أو تكشف عنه كربة، أو تقضي عنه دينا، أو تطرد عنه جوعا، ولأن أمشي مع أخي في حاجة أحب إلي من أن أعتكف في هذا المسجد -يعني مسجد المدينة شهرا -ومن كف

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

ابنِ منکدِر کی مرسل حدیث

ابنِ منکدِر سے مرسلاً روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

مِنْ أَفْضَلِ الْعَمَلِ إِدْخَالُ السُّرُوْرِ عَلَى الْمُؤْمِنِ: يَقْضِيْ عَنْهُ دَيْنًا، يَقْضِيْ لَهُ حَاجَةً، يُنَفِّسُ عَنْهُ كُرْبَةً (شعب الایمان للبیهقی، ج ۱۰ ص ۱۳۰، رقم الحدیث ۷۲۷۴، التعاون علی البر والتقوی) [1]

ترجمہ: افضل عمل، مومن پر خوشی کو داخل کر دینا ہے، مثلاً اس کا قرض ادا کر دینا،

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

غضبه ستر الله عورته، ومن كظم غيظه، ولو شاء أن يمضيه أمضاه ملأ الله قلبه رجاء يوم القيامة، ومن مشى مع أخيه في حاجة حتى يتهيأ له أثبت الله قدمه يوم تزول الأقدام (المعجم الكبير للطبراني، رقم الحديث ۱۳۶۴۶، ج ۱۲ ص ۴۵۳، المعجم الاوسط للطبراني، رقم الحديث ۶۰۲۶، المعجم الصغير للطبراني، رقم الحديث ۸۶۱، الترغيب والترهيب لقوام السنه، رقم الحديث ۱۱۶۲)

قال الهيثمي: رواه الطبراني في الثلاثة، وفيه مسكين بن سراج، وهو ضعيف (مجمع الزوائد، تحت رقم الحديث ۱۳۷۰۸، باب فضل قضاء الحوائج)

[1] قال الالبانی:

من أفضل الأعمال إدخال السرور على المؤمن، تقضي عنه دينا، تقضي له حاجة، تنفس له كربة."

أخرجه البيهقي في "شعب الإيمان" (2/ 452/ 2) من طريقين عن أبي العباس محمد بن يعقوب حدثنا الحسن بن علي بن عثمان -لعله عفان :- حدثنا الحسن بن علي الجعفي عن سفيان بن عيينة عن ابن المنكدر يرفعه إلى النبي صلى الله عليه وسلم.

قال سفيان :وقيل لابن المنكدر فما بقي مما يستلذ؟ قال :الإفضال على الإخوان.

قلت :وهذا إسناد مرسل، رجاله ثقات، غير الحسن بن علي الجعفي، فلم أعرفه، ومن المحتمل أنه الحسن بن عطية القرشي الكوفي، فإنه من شيوخ علي بن الحسن، ونسخة "الشعب "سيئة، فإن يكن هو، فهو صدوق كما قال أبو حاتم، ويحتمل أنه الحسن بن علي بن الوليد الجعفي، فإنه من هذه الطبقة، ولعله أقرب ، وهو ثقة، فإن ثبت هذا فالإسناد صحيح مرسل .والحسن بن علي بن عثمان أظنه ابن عفان تحرف على الناسخ إلى ابن عثمان، وابن عفان ثقة .

وللحديث شاهد من حديث ابن عمر بسند حسن سبق تخريجه برقم 906(سلسلة الاحاديث الصحيحة، تحت رقم الحديث ۲۲۹۱)

اس کی کوئی ضرورت پوری کر دینا، یا اس کی کوئی تکلیف دور کر دینا (جس میں بھوک، پیاس مٹانا اور قرض ادا کرنا سب داخل ہے) (بیہقی)

مذکورہ اور اس جیسی احادیث سے مومن کو خوش کرنے کی عظیم فضیلت معلوم ہوتی ہے، لہٰذا مومن کو جائز و مباح طریقہ پر خوش کرنا، عظیم اجر و ثواب کا باعث ہے، جس میں خندہ پیشانی سے پیش آنا وغیرہ بھی داخل ہے۔

اور بعض احادیث میں خاص عید کے دنوں میں خوشی و سرور کے اظہار کا ذکر ملتا ہے۔

عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث

چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ:

دَخَلَ أَبُوْ بَكْرٍ وَعِنْدِيْ جَارِيَتَانِ مِنْ جَوَارِيِ الْأَنْصَارِ تُغَنِّيَانِ بِمَا تَقَاوَلَتِ الْأَنْصَارُ يَوْمَ بُعَاثٍ، قَالَتْ: وَلَيْسَتَا بِمُغَنِّيَتَيْنِ، فَقَالَ أَبُوْ بَكْرٍ: أَمَزَامِيْرُ الشَّيْطَانِ فِيْ بَيْتِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم وَذٰلِكَ فِيْ يَوْمِ عِيْدٍ، فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: يَا أَبَا بَكْرٍ، إِنَّ لِكُلِّ قَوْمٍ عِيْدًا وَهٰذَا عِيْدُنَا (صحيح البخاري، رقم الحديث ٩٥٢، ابواب العيدين، باب سنة العيدين لأهل الإسلام)

ترجمہ: حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ آئے اور میرے پاس (اس وقت) انصار کی دو بچیاں، جنگِ بعاث کے دن کا شعر گا رہی تھیں، اور وہ بچیاں گانے بجانے والی نہیں تھیں، تو ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یہ شیطانی باجہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں؟ اور وہ عید کا دن تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے ابوبکر! ہر قوم کی عید ہوتی ہے اور آج ہماری عید ہے (لہٰذا بچیوں کو کھیل کود کرنے دو) (بخاری)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ہی روایت ہے کہ:

دَخَلَ عَلَيْنَا أَبُوْ بَكْرٍ فِيْ يَوْمِ عِيْدٍ، وَعِنْدَنَا جَارِيَتَانِ تَذْكُرَانِ يَوْمَ بُعَاثَ، يَوْمٌ قُتِلَ فِيْهِ صَنَادِيْدُ الْأَوْسِ وَالْخَزْرَجِ، فَقَالَ أَبُوْبَكْرٍ: عِبَادَ اللّٰهِ، أَمَزْمُوْرُ الشَّيْطَانِ عِبَادَ اللّٰهِ، أَمَزْمُوْرُ الشَّيْطَانِ عِبَادَ اللّٰهِ، أَمَزْمُوْرُ الشَّيْطَانِ قَالَهَا ثَلَاثًا، فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: يَا أَبَا بَكْرٍ، إِنَّ لِكُلِّ قَوْمٍ عِيْدًا، وَإِنَّ الْيَوْمَ عِيْدُنَا (مسند احمد، رقم الحديث ٢٥٠٢٨) [1]

ترجمہ: ایک مرتبہ عید کے دن حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ میرے ہاں آئے، تو وہاں دو بچیاں جنگِ بعاث کا ذکر کر رہی تھیں، جس میں اوس وخزرج قبیلوں کے بڑے بڑے رؤساء مارے گئے تھے، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے انہیں ڈانٹا کہ اے اللہ کی بندیو! شیطانی باجا، کرتی ہو! اے اللہ کی بندیو! شیطانی باجا کرتی ہو! اے اللہ کی بندیو! شیطانی باجا کرتی ہو! حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے یہ بات تین مرتبہ فرمائی، تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے ابوبکر! ہر قوم کی ایک عید ہوتی ہے اور آج کے دن ہماری عید ہے (مسند احمد)

اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ:

أَنَّ أَبَا بَكْرٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ، دَخَلَ عَلَيْهَا، وَعِنْدَهَا جَارِيَتَانِ فِيْ أَيَّامِ مِنًى تُغَنِّيَانِ، وَتُدَفِّفَانِ، وَتَضْرِبَانِ، وَالنَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مُتَغَشٍّ بِثَوْبِهٖ، فَانْتَهَرَهُمَا أَبُوْ بَكْرٍ، فَكَشَفَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ وَجْهِهٖ، فَقَالَ: دَعْهُمَا يَا أَبَا بَكْرٍ، فَإِنَّهَا أَيَّامُ عِيْدٍ وَتِلْكَ الْأَيَّامُ أَيَّامُ مِنًى (صحيح البخارى، رقم الحديث ٣٥٢٩، كتاب المناقب، باب قصة الحبش، وقول النبى صلى الله عليه وسلم :يا بنى أرفدة)

---

[1] قال شعيب الارنؤوط: إسناده صحيح على شرط مسلم (حاشية مسند احمد)

ترجمہ: حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ، عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس آئے اور ان کے پاس ایامِ منیٰ (یعنی عیدالاضحیٰ کے دنوں) میں دو بچیاں تھیں، جو (سادہ انداز میں) دف بجا کر (اشعار) گا رہی تھیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے منہ پر کپڑا اڑھا ئے ہوئے تھے، حضرت ابوبکر نے ان دونوں کو ڈانٹا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے چہرے سے کپڑا ہٹایا اور فرمایا کہ اے ابوبکر! ان دونوں بچیوں کو چھوڑ دو، اس لئے کہ یہ عید کے دن ہیں، اور یہ دن منیٰ کے (یعنی عیدالاضحیٰ کے دن) تھے (بخاری)

اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ عید کے آگے پیچھے کے چند دن بھی خوشی و سرور کے دن ہیں۔

عائشہ رضی اللہ عنہا کی دوسری حدیث

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ:

كَانَتِ الْحَبَشَةُ يَلْعَبُوْنَ يَوْمَ عِيدٍ، فَدَعَانِىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَكُنْتُ أَطَّلِعُ مِنْ عَاتِقِهِ فَأَنْظُرُ إِلَيْهِمْ، فَجَاءَ أَبُوْ بَكْرٍ فَقَالَ النَّبِىُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ دَعْهَا فَإِنَّ لِكُلِّ قَوْمٍ عِيْدًا وَهٰذَا عِيْدُنَا (مسند أحمد، رقم الحديث ٢٥٥٣٤، مؤسسة الرسالة، بيروت) [1]

ترجمہ: حبشہ کے لوگ عید کے دن (جنگی مشق کا) کھیل کود کیا کرتے تھے، پس مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بلایا، تو میں آپ کے کندھے کے پیچھے سے جھانک کر ان کو دیکھنے لگی، پھر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ آئے (جنہوں نے اس پر ناگواری کا اظہار فرمایا) تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جانے دیجئے، ہر قوم کی عید کا دن ہوتا ہے، اور یہ ہماری عید کا دن ہے (مسند احمد)

---

[1] قال شعيب الارنؤوط: رجاله ثقات رجال الشيخين (حاشية مسند احمد)

عائشہ رضی اللہ عنہا کی تیسری حدیث

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی ایک روایت میں ہے کہ:

فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ: مَا مِنْھُمْ أَحَدٌ إِلَّا الشَّیْطَانُ آخِذٌ بِثَوْبِہٖ، یَقُوْلُ: اُنْظُرْ فَلَمَّا جَاءَ عُمَرُ تَفَرَّقَتِ الشَّیَاطِیْنُ قَالَتْ: وَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِلْعَبُوْا یَا بَنِیْ أَرْفَدَۃَ تَعْلَمَ الْیَھُوْدُ وَالنَّصَارٰی أَنَّ فِیْ دِیْنِنَا فُسْحَۃً (مسند الحمیدی، رقم الحدیث ۲۵۶، ج ا ص ۲۸۵، احادیث عائشۃ اُمُّ المؤمنین رضی اللہ عنہا) [1]

ترجمہ: تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ان میں سے ہر ایک کا شیطان نے کپڑا پکڑ رکھا تھا، جو یہ کہہ رہا تھا کہ تم اس کھیل کو دیکھو، پھر جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ آ گئے، تو شیاطین بھاگ کھڑے ہوئے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے بنوارْ فدہ! تم کھیلتے رہو، یہود اور نصاریٰ یہ بات جان لیں کہ ہمارے دین میں وسعت ہے (مسند الحمیدی)

اور مسند احمد کی روایت میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ:

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَوْمَئِذٍ "لِتَعْلَمَ یَھُوْدُ أَنَّ فِیْ دِیْنِنَا فُسْحَۃً إِنِّیْ أُرْسِلْتُ بِحَنِیْفِیَّۃٍ سَمْحَۃٍ (مسند احمد، رقم الحدیث: ۲۴۸۵۵) [2]

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دن فرمایا کہ تاکہ یہود یہ بات جان لیں کہ ہمارے دین میں وسعت ہے، مجھے سیدھا، آسان دین دے کر بھیجا گیا ہے (مسند احمد)

---

[1] ورجالہ ثقات فھو صحیح إن سلم من الانقطاع بین التیمی وعائشۃ .محمد رضوان.

[2] قال شعیب الارنؤوط: حدیث قوی، وھذا سند حسن. (حاشیۃ مسند احمد)

محدثینِ عظام نے مذکورہ اوران جیسی احادیث کی تشریح کرتے ہوئے اورفقہائے کرام نے ان احادیث سے استدلال کرتے ہوئے عید کے دنوں میں، سرور وخوشی اورفرحت وبشاشت کومستحب، بلکہ بہت سے حضرات نے دین کا شعارقرار دیا ہے،اس طرح کی چند عبارات و حوالہ جات ذیل میں ذکر کیے جاتے ہیں۔

’’فتحُ الباری‘‘ کا حوالہ

صحیح بخاری کی شرح’’فتحُ الباری‘‘میں ہے کہ:

یوم عید أی یوم سرور شرعی فلا ینکر فیه مثل هذا کما لا ینکر فی الأعراس (فتح الباری شرح صحیح البخاری، ج۲،ص ۴۴۲، ابواب العیدین، قوله باب الحراب والدرق یوم العید)

ترجمہ: عید کا دن ہے، یعنی خوشی کا دن ہے، تو اس میں نکیر نہیں کی جائے گی، جس طرح شادیوں کے موقع پر نکیر نہیں کی جاتی (فتح الباری)

اورایک مقام پر ہے کہ:

وفیه أن إظهار السرور فی الأعیاد من شعار الدین (فتح الباری شرح صحیح البخاری، ج۲،ص ۴۴۳، ابواب العیدین،قوله باب الحراب والدرق یوم العید)

ترجمہ: اس حدیث سے یہ بات معلوم ہوئی کہ عید کے دنوں میں خوشی کا اظہار کرنا، دین کے شعارمیں سے ہے (فتح الباری)

’’عمدةُ القاری‘‘ کا حوالہ

صحیح بخاری کی شرح’’عمدةُ القاری‘‘میں ہے کہ:

(وهذا عیدنا) تقریر منه لما وقع من الجاریتین فی هذا الیوم الذی

هو يوم السرور والفرح (عمدة القارى شرح صحيح البخارى، ج٦، ص ٢٧٤، كتاب العيدين،باب سنة العيدين لأهل الإسلام)

ترجمہ: نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمانا کہ یہ ہماری عید کا دن ہے، یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اس طرزِ عمل کو جائز رکھنا ہے، جو اس دن میں بچیوں کی طرف سے واقع ہوا تھا کہ عید کا دن خوشی اور فرحت کا دن ہے(عمدة القارى)

”ارشادُ السارى“ کا حوالہ

صحیح بخاری کی شرح ”ارشادُ السارى“ میں ہے کہ:

يوم عيد، أى يوم سرور شرعى .فلا ينكر فيه مثل هذا، كما لا ينكر فى الأعراس (إرشاد السارى لشرح صحيح البخارى، ج٢،ص ٢٠٥، كتاب العيدين، باب سنة العيدين لأهل الإسلام)

ترجمہ: عید کا دن ہے، یعنی خوشی کا دن ہے، تو اس میں نکیر نہیں کی جائے گی، جس طرح شادیوں کے موقع پر نکیر نہیں کی جاتی (ارشاد السارى)

مذکورہ کتاب میں ہی ایک مقام پر ہے کہ:

وهذا)اليوم (عيدنا) وإظهار السرور فيه من شعائر الدين (إرشاد السارى لشرح صحيح البخارى، ج٢،ص٢٠٧،كتاب العيدين،باب سنة العيدين لأهل الإسلام)

ترجمہ: اور یہ دن ہماری عید کا دن ہے، اور اس دن میں خوشی کا اظہار کرنا، دین کے شعائر میں سے ہے(ارشاد السارى)

”فتحُ البارى لابنِ رجب“ کا حوالہ

صحیح بخاری کی شرح ”فتحُ البارى لابنِ رجب“ میں ہے کہ:

وقوله :(هذا عيدنا) يريد أن إظهار السرور فى العيد من شعار

الدین (فتح الباری شرح صحیح البخاری، لا بن رجب، ج۸، ص ۴۳۳، ابواب العیدین، باب سنة العیدین لأهل الإسلام)

ترجمہ: اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمانا کہ یہ دن ہماری عید کا دن ہے، اس کی مراد یہ ہے کہ عید کے دن، خوشی کا اظہار کرنا، دین کے شعار میں سے ہے (فتح الباری)

’’اعلامُ الحدیث‘‘ کا حوالہ

صحیح بخاری کی شرح ’’اعلامُ الحدیث‘‘ میں ہے کہ:

وقوله :(وهذا عيدنا) يعتذر به عنها، يريد أن إظهار السرور فی العيد من شعار الدين وإعلان أمره والإشادة بذكره، وليس كسائر الأيام سواء (أعلام الحديث ،شرح صحيح البخارى،لحمد بن محمد الخطابی ، ج ۱ ، ص ۵۹۵ ، كتاب العيدين،باب سنة العيدين لأهل الإسلام)

ترجمہ: اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمانا کہ یہ دن ہماری عید کا دن ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے ذریعہ سے، اُن بچیوں کے عذر کو قبول کیا، اور آپ کی مراد یہ تھی کہ عید کے دن، خوشی کا اظہار کرنا، دین کے شعار میں سے ہے، اور عید کے حکم کا اعلان اور اس کے ذکر کی شہرت بھی، اور عید کا دن، دوسرے دنوں کی طرح برابر سرابر نہیں ہے (اعلام الحدیث)

’’منحةُ الباری‘‘ کا حوالہ

صحیح بخاری کی شرح ’’منحةُ الباری‘‘ میں ہے کہ:

(وهذا عيدنا) أى :وإظهار السرور فيه من شعائر الإسلام (منحة البارى بشرح صحيح البخارى المسمى تحفة البارى،لزكريا بن محمد الأنصارى، ج۳، ص ۲۶ ، كتاب العيدين،باب سنة العيدين لأهل الإسلام)

ترجمہ: اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمانا کہ یہ دن ہماری عید کا دن ہے، یعنی عید کے دن خوشی کا اظہار کرنا، دین کے شعائر میں سے ہے (منحة الباری)

”شرحُ الطیبی“ کا حوالہ

”مشکاةُ المصابیح“ کی شرح ”شرحُ الطیبی“ میں ہے کہ:

(هذا عيدنا) اعتذار منه بأن إظهار السرور في يوم العيدين شعار الدين، وليس كسائر الأيام (شرح الطيبي على مشكاة المصابيح، ج۴، ص۱۲۹۳، كتاب الصلاة، باب صلاة العيدين)

ترجمہ: نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمانا کہ یہ دن ہماری عید کا دن ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے ذریعہ سے، اُن کے عذر کو اس طرح قبول کیا کہ عید کے دن خوشی کا اظہار کرنا، دین کے شعار میں سے ہے، اور عید کا دن، دوسرے دنوں کی طرح نہیں ہے (شرح الطیبی)

”التوضیح لشرحِ الجامع الصحیح“ کا حوالہ

”التوضیح لشرحِ الجامع الصحیح“ میں ہے کہ:

إظهار السرور في العيدين من شعار الدين والاستراحة (التوضيح لشرح الجامع الصحيح، لابن الملقن، ج۸، ص۶۷، كتاب العيدين، باب الحراب والدرق يوم العيد)

ترجمہ: اور عیدین میں خوشی کا اظہار کرنا، دین کے شعار میں سے ہے، اور راحت (وبشاشت) حاصل کرنا بھی (التوضیح)

’’تیسیرُ العلام‘‘ کا حوالہ

’’عمدۃُ الاحکام‘‘ کی شرح ’’تیسیرُ العلام‘‘ میں ہے کہ:

والعيد فيه الفرح وإظهار السرور (تيسير العلام شرح عمدة الأحكام، ص ۳۴۳، ۳۴۴، كتاب الصلاة ،باب أفضل الصيام وغيره)

ترجمہ: اور عید کے دن فرحت اور خوشی کا اظہار کیا جاتا ہے (تیسیر العلام)

’’اللامعُ الصبیح‘‘ کا حوالہ

’’اللامعُ الصبیح بشرح الجامع الصحیح ‘‘میں ہے کہ:

"هذا عيدنا"؛ أى :نظهر فيه السرور من ظهور شعار الدين وإعلاء أمره، قيل :وفيه أن العيد للراحة وبسط النفس إلى ما يحل من الدنيا (اللامع الصبيح بشرح الجامع الصحيح،لشمس الدين البِرْماوى، ج۴، ص ۳۴۹، كتاب العيدين،باب الحراب والدرق يوم العيد)

ترجمہ: اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمانا کہ یہ دن ہماری عید کا دن ہے، یعنی ہم اس میں خوشی کا اظہار کریں گے، تاکہ دین کا شعار اور حکمِ الٰہی کا بلند ہونا ظاہر ہو، اسی وجہ سے اس بارے میں کہا گیا ہے کہ عید، راحت اور نفس کو دنیا کی حلال چیزوں کی طرف وسعت وگنجائش دینے کے لیے ہے (اللامع الصبیح)

’’شرحُ المصابیح ‘‘ کا حوالہ

’’شرحُ المصابیح ‘‘میں ہے کہ:

وهذا عيدنا"، اعتذار عنهما بأن إظهار السرور فى العيدين من شعائر الدين (شرح المصابيح ، لابن المَلَك، ج۲،ص ۲۵۱، ۲۵۲، كتاب الصلاة،باب صلاة العيد)

ترجمہ: نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمانا کہ یہ دن ہماری عید کا دن ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے ذریعہ سے، اُن بچیوں کے عذر کو اس طرح قبول کیا کہ عیدین میں خوشی کا اظہار کرنا، دین کے شعائر میں سے ہے (شرح المصابیح)

''لمعاتُ التنقیح'' کا حوالہ

''مشکاۃُ المصابیح'' کی شرح ''لمعاتُ التنقیح'' میں ہے کہ:

قال: دعهما فإنها أيام عيد، فدل الحديث على إباحة مقدار يسير منه في يوم العيد وغيره من مواضع يباح فيه السرور، ويكون ذلك من شعائر الدين كالأعراس والولائم، ومثل ذلك لعب السودان بالدرق والحراب في يوم العيد (لمعات التنقيح في شرح مشكاة المصابيح، للشيخ عبد الحق الدّهلوى، ج٣، ص ٥٥٢، كتاب الصلاة، باب صلاة العيدين)

ترجمہ: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا کہ ان بچیوں کو چھوڑ دو، کیونکہ یہ عید کے دن ہیں، اس حدیث سے یہ بات معلوم ہوئی کہ عید وغیرہ جیسے خوشی کے مواقع پر، اس طرح کی تھوڑی بہت مقدار حلال ہوتی ہے، اور یہ دین کے شعائر سے تعلق رکھتی ہے، جیسا کہ شادیوں اور ولیموں کے موقع پر، اور اسی کے مثل حبشیوں کے جنگ وحرب کے کھیل کا عید کے دن کرنا ہے (لمعاتُ التنقیح)

''سبلُ السلام'' کا حوالہ

''سبلُ السلام'' میں ہے کہ:

وفيه دليل على أن إظهار السرور في العيدين مندوب (سبل السلام، للصنعاني، ج ١، ص ٤٣٦، كتاب الصلاة، باب صلاة العيدين، إظهار السرور في العيدين)

ترجمہ: اوراس حدیث میں اس بات کی دلیل ہے کہ عیدین میں خوشی کا اظہار کرنا، مندوب ومستحب ہے (سبلُ السلام)

’’مرعاةُ المفاتیح‘‘ کاحوالہ

’’مشکاةُ المفاتیح‘‘ کی شرح’’ مرعاةُ المفاتیح ‘‘میں ہے کہ:

وفی هذا الحديث من الفوائد مشروعية التوسعة على العيال فی أيام الأعياد بأنواع ما يحصل لهم به بسط النفس وترويح البدن من كلف العبادة، وأن الإعراض عن ذلک أولى، وفيه أن إظهار السرور فی الأعياد من شعار الدين (مرعاة المفاتيح شرح مشكاة المصابيح، ج۵،ص۳۷، كتاب الصلاة،باب صلاة العيدين)

ترجمہ: اوراس حدیث میں چند فوائد ہیں، ایک تو یہ کہ عید کے دنوں میں اہل و عیال پر وسعت کرنا، مشروع ہے، مختلف قسم کی ان چیزوں کے ذریعہ سے، جن سے نفس کو بشاشت اور بدن کو راحت حاصل ہو، جو عبادت کی کلفت سے پیدا ہوگئی تھی، اور عید کے دنوں میں عبادت کی کلفت سے اعراض کرنا، بہتر ہے، اوراس حدیث میں ایک فائدہ یہ ہے کہ عید کے دنوں میں خوشی کا اظہار کرنا، دین کے شعار سے تعلق رکھتا ہے (مرعاةُ المفاتیح)

’’الدرُّ المختار‘‘ کاحوالہ

’’الدرُّ المختار‘‘میں ہے کہ:

وندب كونه من طريق آخر وإظهار البشاشة (الدر المختارمع رد المحتار، ج۲،ص۱۶۹، كتاب الصلاة،باب العيدين)

ترجمہ: اور عید کے دن راستہ بدل کر آنا، اور بشاشت کا اظہار کرنا، مندوب و مستحب ہے (الدرُّ المختار)

’’مراقیُ الفلاح‘‘ کا حوالہ

’’مراقیُ الفلاح‘‘ میں ہے کہ:

و "يظهر "البشاشة "في وجه من يلقاه من المؤمنين (مراقى الفلاح شرح متن نور الإيضاح، ص ٢٠٠، كتاب الصلاة، باب صلاة العيدين)

ترجمہ: اور بشاشت کا اظہار کرے، ان مومنین کے سامنے، جن سے ملاقات ہو (مراقیُ الفلاح)

اس قسم کی اَن گنت عبارات وحوالہ جات سے معلوم ہوتا ہے کہ عیدین کے دنوں میں مسلمانوں کے سامنے خوشی وبشاشت کا اظہار کرنا اور نفس کو تنگی سے بچانا اور بدن کو راحت دینا، شریعت میں پسند کیا گیا ہے، اور یہ حکم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث سے ماخوذ ومستنبط ہے۔[1]

اور یہ بات ظاہر ہے کہ خوشی وبشاشت کا اظہار مختلف طریقوں اور ذریعوں سے ہی ہوتا ہے، اور اس سلسلہ میں ہر قوم وعلاقے اور زمانے کے طریقے مختلف ہو سکتے ہیں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں جو طریقے اختیار کیے گئے، آپ نے ان کی گنجائش مرحمت فرمائی، لہٰذا عیدین کے موقع پر خوشی وبشاشت کے اظہار کے طریقے، جب تک گناہ کے زمرے میں

---

[1] تتأكد مشروعية التوسعة على العيال فى أيام الأعياد بأنواع ما يحصل به لهم بسط النفس وترويح البدن من كلف العبادة، كما أن إظهار السرور فى الأعياد شعار هذا الدين(الموسوعة الفقهية الكويتية، ج١٤، ص١٦٦، مادة" توسعة")

ومن آداب العيد :إظهار البشاشة والسرور فيه أمام الأهل والأقارب والأصدقاء (الموسوعة الفقهية الكويتية، ج٢٧، ص٢٥٠، مادة "صلاة العيدين")

إظهار البشاشة والفرح فى وجه من يلقاه من المؤمنين، وزيارة الأحياء من الأرحام والأصحاب، إظهارا للفرح والسرور، وتوثيقا لرابطة الأخوة والمحبة(الفقه الإسلامى وأدلتهٗ للزحيلى، ج٢، ص١٤١٥، القسم الاول، الباب الثانى، الفصل العاشر، المبحث الرابع صلاة العيدين)

داخل نہ ہوں، ان کی گنجائش ہوگی، کسی زمانہ میں لوگوں کی عادت، عید کے دن مبارک باد دینے اوراس موقع پر مصافحہ کے ذریعہ خوشی وبشاشت کے اظہار کرنے کی تھی، جس کی متعدد فقہاء نے اجازت دی، بلکہ بعض نے اس کو مستحب قرار دیا، اور موجودہ زمانے میں بہت سے لوگوں کی عادت، ایک دوسرے کو مبارک باد دیتے ہوئے، معانقہ کے ذریعہ خوشی وبشاشت کا اظہار کرنے کی ہے، لہٰذا خوشی وبشاشت کے اظہار کے طور پر مبارک باد دیتے ہوئے، مصافحہ یا معانقہ کرنے کی بھی گنجائش ہونی چاہیے، بالخصوص جب کہ عید کے دنوں میں خوشی وبشاشت کے اظہار کو دوسرے دنوں سے امتیازی درجہ حاصل اوراس میں خاص توسع ہے۔

البتہ بذاتِ خود مصافحہ، یا معانقہ کو عید کے دن کی خاص سنت، یا فرض وواجب درجہ کا حکم نہیں سمجھنا چاہیے۔

جیسا کہ روزہ رکھنے میں سحری وافطاری کے موقع پر اوراسی طرح عید کے دنوں میں مختلف علاقوں کے اعتبار سے اپنی اپنی کھانے پینے کی عادتیں مختلف ہیں، لہٰذا جب تک ان میں کوئی شرعی محظور لازم نہ آئے، وہ اپنے درجہ میں اصل کے اعتبار سے مباح شمار کی جائیں گی۔

اب اس تحقیق کے بعد ہمارے نزدیک یہی مذکورہ موقف راجح ہے، جس کی آگے مختلف اقوال میں تفصیل آتی ہے۔

واللہ تعالیٰ أعلم

(فصل نمبر 4)

عیدین وغیرہ کے مصافحہ ومعانقہ سے متعلق اقوال

مختلف احادیث و روایات سے فقہائے کرام نے مصافحہ و معانقہ کے مشروع ہونے پر استدلال فرمایا ہے۔

چنانچہ جمہور اور اکثر فقہائے کرام کے نزدیک مسلمان سے ملاقات کے وقت مصافحہ کرنا مستحب ہے، اور اس کا مستحب وقت، ملاقات کے شروع میں سلام کے وقت ہے۔ [1]

نیز دوسرے سے جدا ہوتے وقت بھی کئی فقہائے کرام کے نزدیک مصافحہ مستحب ہے، جس طرح سے اس وقت، سلام کرنا بھی سنت ہے۔ [2]

---

[1] مصافحة الرجل للرجل مستحبة عند عامة العلماء، قال النووی: اعلم أنها سنة مجمع عليها عند التلاقی ، وقال ابن بطال :أصل المصافحة حسنة عند عامة العلماء.

وقد نص على استحباب المصافحة بين الرجال كثير من فقهاء المذاهب، واستدلوا عليه بجملة من الأخبار الصحيحة والحسنة (الموسوعة الفقهية الكويتية، ج۳۷، ص۳۵٦، مادة "مصافحة")

ويستحب فی المصافحة أن تكون إثر التلاقی مباشرة من غير توان ولا تراخ وأن لا يفصل بينهما وبين اللقاء سوى البدء بالسلام، لقول الرسول صلى الله عليه وسلم .ما من مسلمين يلتقيان فيتصافحان إلا غفر لهما قبل أن يفترقا، حيث عطف المصافحة على التلاقی بالفاء، وهی تفيد الترتيب والتعقيب والفورية، فدل ذلک على أن الوقت المستحب للمصافحة هو أول اللقاء (الموسوعة الفقهية الكويتية، ج۳۷، ص۳٦۴، مادة "مصافحة")

[2] المقرر: أن المصافحة عند اللقاء سنة، وذلک على ما اتضح فيما سبق، وهی عند المفارقة مشروعة، غير أن درجتها فی المشروعية والطلب أقل من الحاصلة عند اللقاء .أی: أن المصافحة عند المفارقة أدنى رتبة من مثيلتها عند اللقاء .فقد روى الترمذی عن عبد الله بن عمر رضی الله عنه قال: " كان رسول الله صلى الله عليه وسلم إذا ودع رجلا أخذ بيده، فلا يدعها حتى يكون الرجل هو يدع يد النبی صلى الله عليه وسلم, ويقول: " استودع الله دينک وأمانتک وآخر عملک"، وفی رواية الإمام أحمد: أن ابن عمر أخذ بيد قزعة عند وداعه وقال: " أستودع الله دينک وأمانتک وخواتيم أعمالک. "

فهذا الحديث يدل دلالة واضحة على مشروعية المصافحة عند المفارقة .وفی هذا يقول الشيخ

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

پھر دوسرے سے ملاقات کے وقت سلام اور مصافحہ کے لیے یہ ضروری نہیں کہ کوئی دور سے آ کر ملاقات کرے، بلکہ ذراسی جدائیگی، جیسے درخت حائل ہونے کے بعد بھی سلام کرنا درست ہے، اور موقع ہو، تو مصافحہ بھی، لیکن اس کو لازم نہ سمجھا جائے، احادیث میں بھی درخت، یا ستون وغیرہ کے حائل ہونے کے بعد سلام کا ذکر موجود ہے۔ [1]

اور بعض حضرات نے نماز میں مشغولی کو بھی ''غیوبتِ حکمیة'' میں داخل مانا ہے، جیسا کہ آگے آتا ہے۔

اور اکثر فقہائے کرام کے نزدیک معانقہ بھی مستحب ہے، اور یہ بھی تھوڑے بہت فرق کے ساتھ فی الجملہ ملاقات کے آداب میں سے ہے۔ [2]

نیز سفر سے آنے والے اور مخصوص خوشی ونعمت کے موقع پر مبارکباد دینا بھی جائز ہے۔ [3]

البتہ امام مالک رحمہ اللہ کی طرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام سے معانقہ کرنے کے

﴿ گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ ﴾

الألباني في "سلسلة الأحاديث الصحيحة" :"فقول بعضهم:" إن المصافحة عند المفارقة بدعة "، مما لا وجه له .نعم، إن الواقف على الأحاديث الواردة في المصافحة عند المفارقة ومن كان فقيه النفس يستنتج من ذلك أن المصافحة الثانية ليست مشروعيتها كالأولى – يعني: عند اللقاء – في الرتبة؛ فالأولى سنة والأخرى –يعني: التي عند المفارقة – مستحبة .وأما أنها بدعة فلا"

وفي هذا، فالمستحب: المصافحة عند المفارقة، تحقيقا لمسلك التواصل بين المتصافحين من المسلمين عند المفارقة بينهم، وإشعارا بدوام الألفة والحب، ودفعا لدواعي القطيعة ومسالك الغل والشحناء .وفي الأثر: " تصافحوا، يذهب الغل .وتهادوا تحابوا، وتذهب الشحناء"(المصارحة في أحكام المصافحة،لعبد الناصر بن خضر ميلاد،ص ۱۲۹، ۱۳۰،المبحث الخامس :المصافحة عند المفارقة،الناشر : المكتبة الرقمية في المدينة المنورة)

[1] عن أبي هريرة، قال: إذا لقي أحدكم أخاه فليسلم عليه، فإن حالت بينهما شجرة أو جدار أو حجر، ثم لقيه، فليسلم عليه(سنن أبي داود،رقم الحديث ۵۲۰۰، باب الرجل يفارق صاحبه، ثم يلقاه، يسلم عليه؟)

قال شعيب الارنؤوط:المرفوع إسناده صحيح، والموقوف رجاله ثقات(حاشية سنن أبي داود)

[2] والصلة بين المصافحة والمعانقة: أن كلا منهما من آداب التلاقي (الموسوعة الفقهية الكويتية، ج۳۸، ص ۱۸۴، مادة "معانقه")

[3] ذهب الشافعية والحنابلة إلى أن تهنئة القادم من سفر والسلام عليه ومعانقته تحسن وتستحب (الموسوعة الفقهية الكويتية، ج۱۴ ص ۱۰۰، مادة "تهنئة")

مکروہِ تنزیہی ہونے کا قول مروی ہے۔
لیکن بعض اہلِ علم نے امام مالک کا اپنے قول سے رجوع فرمانا بھی بیان کیا ہے۔ ۱

۱ المعانقة فی اللغة :الضم والالتزام واعتنقت الأمر :أخذته بجد .وذكر صاحب الفواكه الدوانی أن المعانقة هی جعل الرجل عنقه علی عنق صاحبه.
وقد كرهها مالک كراهة تنزيه لأنها من فعل الأعاجم.
قال القرافی فی الذخيرة :كره مالک المعانقة، لأنه لم يرد عن رسول الله -صلی الله عليه وسلم - أنه فعلها إلا مع جعفر بن أبی طالب لما رجع من الحبشة، ولم يصحبها العمل من الصحابة بعده.
وأما غير المالكية من الفقهاء ، كالحنابلة فقالوا بجوازها، ففی الآداب الشرعية لابن مفلح إباحة المعانقة .ومثلها تقبيل اليد والرأس تدينا وإكراما واحتراما مع أمن الشهوة لحديث أبی ذر أن النبی صلی الله عليه وسلم عانقه . قال إسحاق بن إبراهيم سألت أبا عبد الله عن الرجل يلقی الرجل، يعانقه؟ قال :نعم فعله أبو الدرداء .
ومعانقة الأجنبية والأمرد حرام، كما ذكر الشافعية ومعانقة الرجل زوجته مكروهة فی الصوم، وكذا معانقة ذوی العاهات من برص وجذام؛ أی :مكروهة .وأما المعانقة فيما سوی ذلک، كمعانقة الرجل للرجل فهی سنة حسنة خاصة عند القدوم من السفر(الموسوعة الفقهية الكويتية، ج۲۵، ص۱۵۷،مادة "سلام")
(وكره مالک) كراهة تنزيهية (المعانقة) وهی جعل الرجل عنقه علی عنق صاحبه لأنها من فعل الأعاجم، ولم يرد عن رسول الله – صلی الله عليه وسلم – أنه فعلها إلا مع جعفر، ولم يجر العمل بها من الصحابة بعده – عليه السلام – .(وأجازها) سفيان (بن عيينة) قال فی (الذخيرة) : وجوز مالک المصافحة، ودخل عليه سفيان فصافحه وقال: يا أبا محمد لولا أنها بدعة لعانقتک، فقال سفيان: عانق من هو خير منی ومنک وهو النبی – صلی الله عليه وسلم – فإنه عانق جعفرا حين قدم من أرض الحبشة.
قال مالک: ذلک خاص به.
قال سفيان: بل عام ما يخص جعفرا يخصصنا، وما يعمه يعمنا إذا كنا صالحين، أفتأذن لی أن أحدث فی مجلسک؟ قال: نعم يا أبا محمد، قال: حدثنی عبد الله بن طاوس عن أبيه عن عبد الله بن عباس قال: لما قدم جعفر من أرض الحبشة اعتنقه رسول الله – صلی الله عليه وسلم – وقبله بين عينيه وقال: جعفر أشبه الناس بی خلقا وخلقا ما أعجب ما رأيت بأرض الحبشة .ورأی مالک أن عمل أهل المدينة علی عدم فعلها ولنفرة النفوس عنها غالبا، وإنما حدث به سفيان مع علم مالک به للإعلام بأنه من روايته، وإنما أذن له مالک بالتحديث مع علمه بالحديث لعله تطييبا لخاطره لأنه استجازه فی التحديث ومن التلطف به الإذن له (الفواكه الدوانی علی رسالة ابن أبی زيد القيروانی المالكی، ج۲، ص۳۲۶،باب فی السلام والاستئذان والتناجی، صفة السلام)
وقد كرهها مالک كراهة تنزيه لأنها من فعل الأعاجم.

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

اگر اکرام واحترام کی غرض سے کسی نیک صالح شخص سے معانقہ کیا جائے، تو بعض فقہائے کرام کے نزدیک یہ بھی جائز ہے۔ [1]

اس کے بعد عرض ہے کہ مختلف احادیث وروایات کے پیشِ نظر اگر کوئی مصافحہ اور معانقہ عید کے دن خاص عید کی وجہ سے لازم، ضروری اور سنت نہ سمجھے اور عیدین کے علاوہ سال کے باقی دنوں میں بھی سنت سمجھ کر اس کا اپنے موقع پر اہتمام کیا کرے اور پھر عیدین کے دن اپنی گزشتہ عادت کے مطابق ملاقات کے وقت سنّت کے مطابق سلام کر کے مصافحہ کر لے، تو اس میں کوئی کلام نہیں، یا جو عزیز، رشتہ دار، یا دوست عید کے دن سفر سے آئیں اور سفر سے آنے کی وجہ سے ان سے معانقہ کرے اور گلے ملے، تو بھی نہ صرف یہ کہ جائز ہے، بلکہ سنت ومستحب ہے۔

موجودہ دور میں ہمارے یہاں عید کے موقع پر عید کی وجہ سے مبارکباد دیتے ہوئے مصافحہ و معانقہ کا جو طریقہ رائج ہے، جس میں ملاقات اور سفر سے آمد کی قید کو ملحوظ نہیں رکھا جاتا، بلکہ خاص عید کی وجہ سے عید کی مبارکباد دیتے وقت، ایک دوسرے سے مصافحہ ومعانقہ کیا جاتا ہے، اور اس عمل کو عام طور پر بڑے اہتمام سے انجام دیا جاتا ہے، تو کئی مشائخ واصحابِ افتاء نے اس کو ناجائز قرار دیا ہے، اور بعض نے اس کو بدعتِ مکروہہ کے زمرے میں داخل مانا ہے اور ہم نے بھی پہلے اسی قول کی اتباع کی تھی۔

﴿ گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ ﴾

قال القرافي في الذخيرة: كره مالك المعانقة، لأنه لم يرد عن رسول الله – صلى الله عليه وسلم – أنه فعلها إلا مع جعفر بن أبي طالب لما رجع من الحبشة، ولم يصحبها العمل من الصحابة بعده. وأما غير المالكية من الفقهاء، كالحنابلة فقالوا بجوازها، ففي الآداب الشرعية لابن مفلح إباحة المعانقة .ومثلها تقبيل اليد والرأس تدينا وإكراما واحتراما مع أمن الشهوة؛ لحديث أبي ذر أن النبي صلى الله عليه وسلم عانقه. قال إسحاق بن إبراهيم سألت أبا عبد الله عن الرجل يلقى الرجل، يعانقه؟ قال: نعم فعله أبو الدرداء (الموسوعة الفقهية الكويتية، ج۲۵، ص۱۵۷، مادة "سلام")

[1] وقال الحنابلة :تباح المعانقة وتقبيل اليد والرأس تدينا وإكراما واحتراما مع أمن الشهوة، قال ابن مفلح :ظاهر هذا عدم إباحته لأمر الدنيا(الموسوعة الفقهية الكويتية، ج۳۸، ص۱۸۵ ،مادة "معانقة")

لیکن اہلِ فقہ واصحابِ افتاء کا ایک بڑا طبقہ وہ بھی ہے، جس نے بطور عادت اور اظہارِ مسرت ومودت کے طور پر اس کو جائز قرار دیا ہے، اور بعض نے اس کو بدعتِ مباحہ کے زمرے میں داخل مانا، اور عید کے موقع پر اس عمل کو انجام دینے میں کوئی حرج نہ سمجھا، بلکہ بعض نے تو مخصوص مصالح کے پیشِ نظر اس کو مستحب لغیرہ کے درجے میں شمار کیا ہے، ہم بھی اب تحقیق کے بعد اسی موقف کو راجح سمجھتے ہیں۔

اور بعض نے ان دونوں کے درمیانی موقف کو اختیار کرتے ہوئے، اگرچہ خود سے اس عمل کو مباح، یا مستحب نہیں سمجھا، لیکن عوام میں اس طرزِ عمل کے رائج ہونے اور بعض فقہاء وعلماء کی طرف سے اس میں گنجائش اور توسع ہونے کی وجہ سے اس کی نفی وتردید کرنے سے اجتناب کا حکم بیان فرمایا۔

چونکہ اس مسئلہ کے ضمن میں مخصوص نمازوں یا عام نمازوں کے بعد مصافحہ کا بھی ذکر آتا ہے، اور کئی اصحابِ افتاء نے عید کی نماز کے بعد، یا عید کے دن مصافحہ ومعانقہ کے حکم میں مذکور اسی قسم کی عبارات کو مستدل بنایا ہے۔

اس لیے آگے مختلف فقہاء وعلماء کی عبارات وفتاویٰ جات اور حوالہ جات کی روشنی میں اس کی تفصیل ذکر کی جاتی ہے۔

’’ابنِ بطال‘‘ کا حوالہ

’’صحیح البخاری‘‘ کی شرح میں علامہ ابنِ بطال فرماتے ہیں کہ:

المصافحة حسنة عند عامة العلماء ، وقد استحبها مالک بعد کراهة، وهی مما تنبت الود وتؤد المحبة، ألا تری قول کعب بن مالک فی حدیثه الطویل حین قام إلیه طلحة وصافحه :(فوالله لا أنساها لطلحة أبدا) فأخبر بعظیم موقع قیام طلحة إلیه من نفسه

ومصافحته له وسروره بذلک، وکان عنده أفضل الصله والمشارکة له، وقد قال أنس :إن المصافحة کانت فی أصحاب رسول الله، وهم الحجة والقدوة الذین یلزم اتباعهم، وقد ورد فی المصافحة أثار حسان (شرح صحیح البخاری لابن بطال، ج۹، ص ۴۴، کتاب الاستئذان، باب المصافحة)

ترجمہ: مصافحہ، عام علماء کے نزدیک اچھا عمل ہے، اور امام مالک نے کراہت کے بعد اس کو مستحب قرار دیا ہے، اور یہ اُن اعمال میں سے ہے، جو محبت کو پیدا کرتا ہے، اور محبت کی ادائیگی واظہار کا ذریعہ ہے، کیا آپ لمبی حدیث میں کعب بن مالک کے اس قول کو نہیں دیکھتے، جب ان کی طرف حضرت طلحہ کھڑے ہوئے اور انہوں نے مصافحہ کیا، تو انہوں نے فرمایا کہ ’’اللہ کی قسم! میں حضرت طلحہ کی یہ بات کبھی نہیں بھول سکتا‘‘ تو حضرت کعب نے اپنے لیے طلحہ کے کھڑے ہونے اور مصافحہ کرنے، اور خوشی کا اظہار کرنے کے عظیمُ الشان عمل ہونے کی خبر دی، کہ ان کے نزدیک یہ عمل، حسنِ سلوک اور باہمی رواداری کا افضل ذریعہ ہے، اور حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابۂ کرام میں مصافحہ کا معمول تھا، اور صحابۂ کرام خود سے دلیل اور ایسے مقتداء ہیں، جن کی اتباع لازم ہے، اور مصافحہ کے متعلق عمدہ سند کے ساتھ احادیث وروایات مروی ہیں (شرح صحیح البخاری لابن بطال)

مذکورہ عبارت سے مصافحہ کا باہم محبت ومودت اور حسنِ سلوک وغیرہ کا ذریعہ ہونا معلوم ہوا۔

’’شرحُ الطیبی‘‘ کا حوالہ

’’مشکاۃُ المصابیح‘‘ کی شرح میں علامہ طیبی فرماتے ہیں کہ:

اعلم أن المصافحة سنة مستحبة عند كل لقاء ، وما اعتاده الناس بعد صلاة الصبح والعصر، لا أصل له في الشرع على هذا الوجه، ولكن لا بأس به؛ فإن أصل المصافحة سنة .وكونهم حافظين عليها في بعض الأحوال مفرطين فيها في كثير من الأحوال لا يخرج ذلك البعض عن كونه من المصافحة التي ورد الشرع بأصلها، وهي من البدعة المباحة (شرح الطيبي على مشكاة المصابيح، ج۱۰، ص۳۰۵۸، كتاب الآداب،باب المصافحة والمعانقة)

ترجمہ: یہ بات جان لینی چاہیے کہ مصافحہ، ہر ملاقات کے وقت سنتِ مستحبہ ہے، اور جو لوگوں کی فجر اور عصر کی نماز کے بعد مصافحہ کی عادت ہے، تو اس طریقے پر شریعت میں اس کی کوئی اصل نہیں، لیکن اس میں کوئی حرج نہیں، کیونکہ اصل مصافحہ سنت ہے، اور بعض حالات میں لوگوں کا اس پر محافظت کرنا، اور اکثر احوال میں اس میں کوتاہی کرنا، اس کو اس مصافحہ سے خارج نہیں کرے گا، جس کی اصل شریعت میں وارد ہوئی ہے، لہٰذا یہ بدعتِ مباحہ میں سے ہے (شرحُ الطیبی)

جو حکم عام نمازوں، یا مخصوص نمازوں کے بعد مصافحہ کا ہے، وہی حکم عید کی نماز کے بعد کا بھی ہوگا، اور جب عید کے موقع پر دوسرے سے ملاقات ہو، تو اس ملاقات کے موقع پر سلام و مصافحہ اور مبارکباد وغیرہ دینا بھی فی نفسہٖ بدرجۂ اولیٰ جائز ہوگا۔

”مرقاةُ المفاتيح“ کا حوالہ

ملا علی قاری رحمہ اللہ نے ”مشکاةُ المصابيح“ کی شرح میں فرمایا کہ:

”مصافحہ کا مستحب، مشروع وقت، اولِ ملاقات ہے۔

اسی لیے ہمارے علماء نے ملاقات کے بغیر، محض نمازوں کے بعد مصافحہ کو مکروہ اور

بدعتِ مذمومہ قرار دیا ہے۔

البتہ اگر کوئی مسجد میں ایسے وقت داخل ہو، جب لوگ نماز (ذکر وتلاوت وغیرہ) میں مشغول ہوں، یا نماز شروع کرنا چاہتے ہوں، تو اگر نماز کے بعد ان سے مصافحہ کرلے، تو کوئی حرج نہیں، لیکن یہ شرط ہے کہ مصافحہ سے پہلے سلام کرے، ایسی صورت میں یہ مصافحہ بلاشبہ مسنون درجے میں داخل ہو جائے گا۔

لیکن یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ اگر مسلمان اپنا ہاتھ مصافحہ کے لیے بڑھائے، تو اس سے اعراض کرنا مناسب نہیں، چونکہ اس پر وہ ایذاء مرتب ہوتی ہے، جو آداب کی رعایت سے زیادہ شدید ہے، پس نمازوں کے بعد مصافحہ کی ابتداء کرنا مکروہ ہے، لیکن دوسرے کے مصافحہ کی ابتداء کرنے کے بعد اس سے مصافحہ کرنا مکروہ نہیں''۔انتھٰی۔ [1]

جب نماز سے پہلے کوئی نماز، یا ذکر وتلاوت وغیرہ میں مصروف ہو، یا مصروف ہونا چاہتا ہو، جس کی وجہ سے اس سے سلام ومصافحہ کا موقع حاصل نہ ہوا ہو، اس صورت میں جب نماز کے بعد سلام ومصافحہ کرنے میں حرج نہیں، تو جو شخص اس کے ساتھ نہ ہو، اور اس سے ملاقات بھی نہ ہوئی ہو، اس سے مصافحہ کرنا کیسے ناجائز ہو سکتا ہے۔

---

[1] إتيان السنة فى بعض الأوقات لا يسمى بدعة مع أن عمل الناس فى الوقتين المذكورين ليس على وجه الاستحباب المشروع، فإن محل المصافحة المشروعة أول الملاقاة، وقد يكون جماعة يتلاقون من غير مصافحة ويتصاحبون بالكلام ومذاكرة العلم وغيره مدة مديدة، ثم إذا صلوا يتصافحون، فأين هذا من السنة المشروعة، ولهذا صرح بعض علمائنا بأنها مكروهة حينئذ، وأنها من البدع المذمومة.

نعم لو دخل أحد فى المسجد والناس فى الصلاة أو على إرادة الشروع فيها، فبعد الفراغ لو صافحهم، لكن بشرط سبق السلام على المصافحة، فهذا من جملة المصافحة المسنونة بلا شبهة.

ومع هذا إذا مد مسلم يده للمصافحة، فلا ينبغى الإعراض عنه بجذب اليد لما يترتب عليه من أذى يزيد على مراعاة الأدب، فحاصله أن الابتداء بالمصافحة حينئذ على الوجه المشروع مكروه لا المجابرة، وإن كان قد يقال فيه نوع معاونة على البدعة والله أعلم(مرقاة المفاتيح شرح مشكاة المصابيح، ج٧،ص ٢٩٦٣، كتاب الآداب،باب المصافحة والمعانقة)

یہ بھی ملحوظ رہے کہ مذکورہ حکم، صرف مصافحہ کا ہے، لیکن عید کی نماز کے بعد جب دوسرے کو مبارک باد دی جائے اوراس موقع پر مصافحہ کیا جائے، تو وہ مصافحہ مبارکبادی کی وجہ سے ہے، نہ کہ ملاقات کی وجہ سے، جس کے جواز کی متعدد فقہاءاور خود کئی حنفیہ نے بھی تصریح کی ہے۔ لہٰذااس کا حکم محض نماز کے بعد مصافحہ سے جدا ہونا چاہیے، اسی وجہ سے اس کے جواز کی اُن متعدد فقہاء نے بھی تصریح کی ہے، جنہوں نے مخصوص نمازوں کے بعد کے جواز کا قول نہیں کیا، جیسا کہ آگے آتا ہے۔

علامہ ابنِ حجر ہیتمی کا حوالہ

علامہ ابنِ حجر ہیتمی شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ:

(وسئلت) ما حكم المصافحة بعد التدريس وفى ليالى رمضان بعد الدعاء عقب الوتر والتراويح وكذلك بعد صلاة العيد وما الأرحام وكيف كيفية صلتهم ؟

(فأجبت) بقولى الذى دلت عليه صرائح السنة وصرح به النووى وغيره أنه

حيث وجد تلاق بين اثنين سن لكل منهما أن يصافح الآخر وحيث لم يوجد ذلك بأن ضمهما نحو مجلس ولم يتفرقا لا تسن سواء فى ذلك المصافحة التى تفعل عقب الصلاة ولو يوم العيد، أو الدرس أو غيرهما.

بل متى وجد منهما تلاق ولو بحيلولة شىء بين اثنين بحيث يقطع أحدهما عن الآخر سنت وإلا لم تسن .

نعم التهنئة بالعيد والشهور سنة كما ذكره بعض أئمتنا واستدل له

ولا يلزم من ندبها ندب المصافحة فيها وإن لم يوجد شرطها السابق والمراد بالأرحام الذين يتأكد برهم وتحرم قطيعتهم جميع الأقارب من جهة الأب، أو الأم وإن بعدوا ومن ثم قال فى الأذكار يستحب استحبابا متأكدا زيارة الصالحين والإخوان والجيران والأصدقاء والأقارب وإكرامهم وبرهم وصلتهم وضبط ذلك يختلف باختلاف أحوالهم ومراتبهم وفراغهم وينبغى أن يكون زيارته لهم على وجه لا يكرهونه وفى وقت يرضونه والأحاديث والآثار فى هذا كثيرة مشهورة اهـ.

وبه علم الجواب عن قول السائل فكيف كيفية صلتهم، والله سبحانه وتعالى أعلم (الفتاوى الفقهية الكبرى،لابن حجر الهيتمى ، ج۴، ص۲۴۵، باب السير)

ترجمہ: اور مجھ سے سوال کیا گیا کہ درس وتدریس کے بعداور رمضان کی راتوں میں تراویح اور وتر کے بعد دعاء سے فارغ ہوکر، اور اسی طریقے سے عید کی نماز کے بعد، مصافحہ کا کیا حکم ہے؟اور رشتہ داروں سے صلہ رحمی اوراس کا طریقہ کیا ہے؟

تو میں نے اس کا یہ جواب دیا کہ جس بات پر صریح احادیث دلالت کرتی ہیں،اور نووی وغیرہ نے اس کی تصریح کی ہے، وہ یہ ہے کہ جب دو شخصوں کے درمیان ملاقات پائی جائے،تواس وقت دونوں کے لیے سنت ہے کہ وہ ایک دوسرے سے مصافحہ کریں اور جب ملاقات نہ پائی جائے، بایں طور کہ دونوں کسی مجلس وغیرہ میں مل کر بیٹھے ہوئے تھے اور ایک دوسرے سے علیٰحدہ نہیں ہوئے تھے،تو ایسی صورت میں مصافحہ سنت نہیں ہے،خواہ یہ مصافحہ وہ ہو، جو نماز کے بعد کیا جاتا ہے،

اگرچہ عید کے دن ہی کیوں نہ ہو، یا درس (وعظ وتقریر) وغیرہ کے بعد ہو۔

بلکہ جب بھی دو افراد کے درمیان ملاقات پائی جائے، اگرچہ دو آدمیوں کے درمیان، کسی چیز کے اس طرح حائل ہونے کے بعد ہی کیوں نہ ہو کہ وہ چیز ان دونوں میں سے ایک کو دوسرے سے جدا کردے، تو مصافحہ سنت ہے، ورنہ سنت نہیں۔

البتہ عید کے دن اور مہینوں کے آغاز پر مبارک بادی دینا سنت ہے، جیسا کہ ہمارے بعض ائمہ نے اس کا ذکر کیا ہے، اور اس کی دلیل بھی پیش کی ہے اور مبارک بادی کے مستحب ہونے سے عید کے دن اور مہینوں کے آغاز پر مصافحہ کا مستحب ہونا لازم نہیں آتا، اگرچہ سابق شرط بھی نہ پائی جائے (یعنی عید کے دن اور مہینوں کے آغاز پر مبارک بادی مستحب ہونے کے لیے ابتدائے ملاقات ضروری نہیں، بلکہ ان اوقات میں بغیر ملاقات کے بھی مبارک بادی درست ہے)

اور صلہ رحمی سے مراد یہ ہے کہ رشتہ داروں سے حسنِ سلوک کی تاکید ہے، اور ان سے قطع تعلقی حرام ہے، تمام رشتہ دار اس میں داخل ہیں، خواہ وہ والد کی طرف سے ہوں، یا ماں کی طرف سے ہوں، اگرچہ دور کے رشتہ دار ہوں، اور اسی وجہ سے ''الاذکار'' میں فرمایا کہ نیک لوگوں اور بھائیوں اور پڑوسیوں اور دوستوں اور رشتہ داروں کی زیارت، تاکیدی مستحب ہے، اور ان کا اکرام کرنا، اور ان سے حسنِ سلوک کرنا، اور ان سے صلہ رحمی کرنا، بھی تاکیدی مستحب ہے، اور ان کے احوال اور مراتب کے مختلف ہونے اور فراغت وغیرہ کی وجہ سے مذکورہ چیزوں کا حکم مختلف ہوجاتا ہے، اور مناسب یہ ہے کہ ان کی زیارت ایسے طریقے پر ہو، جو ان کو ناپسند نہ ہو، اور ایسے وقت میں ہو، جس سے وہ خوش ہوں، اور اس سلسلے میں احادیث وروایات بکثرت مشہور ہیں، انتھٰی۔

اس سے سائل کے اس قول کا جواب بھی ہوگیا کہ رشتہ داروں سے صلہ رحمی کا کیا طریقہ ہے، **واللہ سبحانهٗ وتعالٰی أعلم** (الفتاوی الفقهية الکبری)

مذکورہ عبارت میں علامہ ابنِ حجر ہیتمی نے عید کے دن اور نمازوں کے بعد، جبکہ اولِ ملاقات نہ پائی جائے، مصافحہ کے سنت اور عید کے دن مصافحہ کے مستحب ہونے کی نفی کی ہے، لیکن اس سے مباح صورت کا ناجائز ہونا لازم نہیں آتا، جیسا کہ آگے آتا ہے۔

نیز مذکورہ عبارت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ دو مسلمانوں کے درمیان ذرا سی چیز بھی حائل ہو جائے، جو ایک کو دوسرے سے جدا کردے، جیسا کہ درخت اور ستون وغیرہ، تو بھی سلام اور اس کے ضمن میں مصافحہ سنت ہے، اور احادیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

اس کی روشنی میں اگر عید کے دن، دوسرے مسلمان سے ملاقات ہونے پر سلام، مصافحہ وغیرہ کیا جائے، تو سنت ہوگا، اور جو نماز سے پہلے ساتھ موجود تھا، اور اس سے ابتدائے ملاقات کے وقت سلام ومصافحہ میں کوئی مانع نہ تھا، اس سے نماز کے بعد سلام ومصافحہ، سنت نہ ہوگا، لیکن اس سے اس کا بدعت ہونا لازم نہ آئے گا، نہ ہی خود علامہ موصوف نے اس کے بدعت ہونے کی تصریح کی، جبکہ خود متعدد شافعیہ اور بعض حنفیہ نے نماز کے بعد مصافحہ کے بدعتِ مباحہ ہونے اور مبارکبادی کے وقت مصافحہ کے جواز، بلکہ بعض نے مستحب ہونے کی تصریح کی ہے، اس قسم کی تصریحات کو سامنے رکھ کر مذکورہ عبارت کی مزید وضاحت ہوجاتی ہے۔

علامہ ابنِ حاج کا حوالہ

علامہ ابنِ حاج مالکی ''المدخل'' میں ایک مقام پر فرماتے ہیں کہ:

وينبغي له أن يمنع ما أحدثوه من المصافحة بعد صلاة الصبح وبعد صلاة العصر وبعد صلاة الجمعة، بل زاد بعضهم فی هذا الوقت فعل ذلک بعد الصلوات الخمس، وذلک کله من البدع،

وموضع المصافحة فی الشرع إنما هو عند لقاء المسلم لأخيه لا فی أدبار الصلوات الخمس، وذلک کله من البدع فحيث وضعها الشرع نضعها فينهی عن ذلک ويزجر فاعله لما أتی من خلاف السنة(المدخل، لابن الحاج، ج۲، ص۲۱۹، فصل فی البدع التی أحدثت فی المسجد والأمر بتغييرها، فصل المصافحة بعد صلاة الصبح وبعد صلاة العصر)

ترجمہ: اور مناسب ہے کہ اس عمل سے منع کیا جائے، جو لوگوں نے فجر کی نماز، اور عصر کی نماز، اور جمعہ کی نماز کے بعد مصافحہ کا طریقہ ایجاد کرلیا ہے، بلکہ بعض نے اس وقت میں اس فعل کو پانچوں نمازوں کے بعد بھی اضافہ کرلیا ہے، یہ سب طرزِ عمل، بدعت سے تعلق رکھتا ہے، اور مصافحہ کا موقع تو شریعت میں مسلمان کی اپنے بھائی سے ملاقات کے وقت ہے، نہ کہ پانچوں نمازوں کے بعد، پس یہ سب بدعت ہے، لہٰذا جہاں اس عمل کو شریعت نے رکھا ہے، ہم بھی وہی رکھیں گے، اور اس طرزِ عمل سے منع کیا جائے گا، اور اس کے فاعل کو تنبیہ کی جائے گی کہ اس نے خلافِ سنت، عمل کا ارتکاب کیا ہے (المدخل)

مذکورہ عبارت میں علامہ ابنِ حاج مالکی نے مخصوص نمازوں کے بعد مصافحہ کے متعلق بدعت کا حکم بیان فرمایا ہے، لیکن دیگر فقہاء نے اس سے اختلاف کیا کہ انہوں نے اس کو مباح وجائز قرار دیا، لہٰذا یہ اجتہادی واختلافی مسئلہ ہوا، جس میں تشدد مناسب نہیں۔

یہی وجہ ہے کہ علامہ ابنِ حاج مالکی رحمہ اللہ ہی نے عید کے دن مصافحہ کے ترک کو اولیٰ قرار دیا ہے، اور اس پر سختی نہیں کی۔

چنانچہ علامہ ابنِ حاج ''المدخل'' میں ایک اور مقام پر فرماتے ہیں کہ:

وأما المعانقة فقد کرهها مالک وأجازها ابن عيينة أعنی عند اللقاء من غيبة کانت .وأما فی العيد لمن هو حاضر معک فلا .

وأما المصافحة فإنها وضعت فی الشرع عند لقاء المؤمن لأخیه . وأما فی العیدین علی ما اعتاده بعضهم عند الفراغ من الصلاة یتصافحون فلا أعرفه .لکن قال الشیخ الإمام أبو عبد الله بن النعمان - :رحمه الله -إنه أدرک بمدینة فاس والعلماء العاملون بعلمهم بها متوافرون أنهم کانوا إذا فرغوا من صلاة العید صافح بعضهم بعضا فإن کان یساعده النقل عن السلف فیا حبذا وإن لم ینقل عنهم فترکه أولی(المدخل،لابن الحاج، ج۲،ص ۲۸۸ ،فصل فی البدع التی أحدثت فی المسجد والأمر بتغییرها، فصل فی سلام العید)

ترجمہ: جہاں تک معانقہ کا تعلق ہے، تو اس کو امام مالک نے مکروہ قرار دیا ہے، اور ابنِ عیینہ نے اس کو جائز قرار دیا ہے، یعنی جب غائب ہونے کے بعد ملاقات ہو، جہاں تک عید کے موقع کا تعلق ہے، تو اس شخص سے معانقہ کرنا، جو آپ کے پاس موجود ہے، تو یہ درست نہیں، اور جہاں تک مصافحہ کا تعلق ہے، تو وہ شریعت میں مومن کی اپنے بھائی سے ملاقات کے وقت میں رکھا گیا ہے، جہاں تک عیدین کا تعلق ہے، جس کی بعض لوگوں میں عادت ہے کہ وہ نماز سے فارغ ہونے کے بعد ایک دوسرے سے مصافحہ کرتے ہیں، تو میں اس سے واقف نہیں (یعنی میرے علم کے مطابق، اس کا شریعت سے ثبوت نہیں) لیکن شیخ امام ابوعبداللہ بن نعمان رحمہ اللہ نے فرمایا کہ انہوں نے فاس کے شہر میں ان علماء کو، جو اپنے علم پر بھرپور طریقے سے عمل کرنے والے تھے، یہ عمل کرتے ہوئے دیکھا کہ جب وہ عید کی نماز سے فارغ ہوجاتے تھے، تو ایک دوسرے سے مصافحہ کرتے تھے، پس اگر سلف کی نقل سے اس کی تائید ہوجائے، تو بہت اچھی بات ہے، اور اگر سلف سے، نقل دستیاب نہ ہو، تو اس کا ترک کرنا بہتر ہے(المدخل)

یہاں علامہ ابنِ حاج نے عید کے دن مصافحہ کو ناجائز قرار نہیں دیا، بلکہ اس کے ترک کرنے کو بہتر قرار دیا۔

چونکہ امام مالک رحمہ اللہ کا موقف معانقہ کے متعلق اتنا مثبت نہیں، جتنا مصافحہ کے متعلق ہے، اس لیے ان کی اتباع میں علامہ ابنِ حاج مالکی نے عید کے معانقہ کی نفی کی۔

لیکن نمازِ عید کے بعد مصافحہ کے ترک کو اولیٰ قرار دیا، اور پیچھے فجر، عصر اور جمعہ کی نماز کے بعد، مصافحہ کا سخت انکار کیا، جبکہ عید کی نماز کے بعد کا حکم بھی اس باب میں جمعہ کی نماز کے بعد کی طرح ہے، کیونکہ ان دونوں نمازوں میں باہم قربت ومشابہت ہے۔

لہٰذا علامہ ابنِ حاج رحمہ اللہ کی صرف پہلی عبارت کی بنیاد پر نمازوں، یا عید کی نماز کے بعد کے مصافحہ پر بدعتِ مذمومہ ومکروہہ کا حکم لگانا مناسب نہیں، بلکہ ان کی دونوں عبارات کو ملحوظ رکھ کر ترجیح وتطبیق دینے کی ضرورت ہے۔

ترجیح کی ایک صورت یہ ہوسکتی ہے کہ عید کا دن، اظہارِ سرور وغیرہ کا خاص دن ہے اور اس دن میں خاص توسع کو دوسرے دنوں کے مقابلہ میں روا رکھا گیا ہے، اس لیے اس میں تخفیف کی گئی۔

اور تطبیق کی ایک صورت یہ ہوسکتی ہے کہ ممانعت، اس صورت میں ہے، جبکہ بذاتِ خود، سنت، یا ضروری سمجھا جائے، اور اباحت اس کے بغیر بطورِ عادت وغیرہ کے اختیار کرنے میں ہے۔

کسی کی طرف سے کوئی دوسری مناسب تاویل ہو، تو اس کی بھی گنجائش ہوگی۔

”لمعاتُ التنقیح“ کا حوالہ

شیخ علامہ عبدالحق محدث دہلوی ”مشکاۃُ المصابیح“ کی شرح میں ایک حدیث کے ذیل میں فرماتے ہیں کہ:

وعلم من هذا الحديث جواز المعانقة في غير حالة القدوم؛ إظهارا

لشدة المحبة و العناية(لمعات التنقيح فی شرح مشكاة المصابيح،لعبد الحق الدّهلوی، ج۸،ص ۴۸، كتاب الآداب،باب المصافحة و المعانقة)

ترجمہ: اس حدیث سے، سفر سے آمد کی حالت کے علاوہ میں معانقہ کا جائز ہونا معلوم ہوا، شدتِ محبت وعنایت کے اظہار کے طور پر (لمعاتُ التنقیح)

اس طرح کی کئی عبارات، پہلے احادیث کے ذیل میں حواشی میں بھی ذکر کی جا چکی ہیں، جن سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ معانقہ کو سفر سے آمد، یا سفر پر روانگی کے ساتھ خاص کر کے دوسرے مواقع پر معانقہ کا سخت انکار کرنا، یا اس پر بدعتِ مذمومہ ومکروہہ کا حکم لگانا مناسب نہیں، احادیث سے غیر سفر کے موقع پر بھی معانقہ کا ثبوت ملتا ہے۔

’’البناية شرحُ الهداية‘‘ کا حوالہ

علامہ عینی نے ’’الھدایۃ‘‘ کی شرح میں فرمایا کہ:

’’جب لباس کے اوپر سے معانقہ کیا جائے، تو ہمارے تمام اصحاب کے نزدیک اس میں حرج نہیں، یہی صحیح ہے، کیونکہ معانقہ کرنا، دوسرے سے حسنِ سلوک اور اس کے اکرام پر مبنی ہوتا ہے، جو کہ لوگوں کے درمیان، قابلِ مدح فعل شمار ہوتا ہے‘‘۔انتھٰی۔ [1]

کتبِ فقہ اور خاص کر حنفیہ کی ایسی بے شمار عبارات ہیں، جن میں معانقہ کی کراہت، یا ممانعت میں شہوت، یا فتنہ لازم آنے کی وجہ کو ہی پیش کیا گیا ہے، اور بس۔

---

[1] (قالوا :الخلاف فی المعانقة فی إزار واحد) ش :أی قال المشايخ منهم :أبو منصور الخلاف المذكور فيما إذا عانق رجلا فی إزار واحد؛ لأنه سبب يفضی إلى الشهوة م :(أما إذا كان عليه) ش: أی على المعانق م :(قميص أو جبة فلا بأس بها) ش :أی بالمعانقة ذكر الضمير باعتبار العناق .م: (بالإجماع) ش :بين أصحابنا -رحمهم الله -م :(وهو الصحيح) ش :أی للذی قاله المشائخ هو الصحيح؛ لأنه -رحمه الله -يكون على وجه البر والكرامة، وهو أمر ممدوح بين الناس(البناية شرح الهداية، ج۱۲،ص ۱۹۴، كتاب الكراهية،فصل فی الاستبراء وغيره)

اس قسم کی عبارات میں معانقہ کا حکم بیان کرتے وقت، غیر سفر کی حالت کو پیش نہیں کیا گیا، جس سے بظاہر معانقہ کی سفر کے ساتھ تخصیص ثابت نہیں ہوتی، بلکہ ضمنی طور پر اس کی نفی ثابت ہوتی ہے۔

’’الفتاویٰ الکاملیة‘‘ کا حوالہ

شیخ محمد کامل بن مصطفیٰ طرابلسی حنفی (المتوفیٰ:1315ہجری)’’الفتاویٰ الکاملیة‘‘ میں فرماتے ہیں:

سئلت عن المصافحة فی یوم العید والجمعة، ماحکمها ؟

فالجواب: ان حکمها ،الاستحباب (الفتاویٰ الکاملیة، صفحة ۲۶۲، کتاب الحظر والاباحة، مطبوعة: المکتبة الحقانیة، بشاور)

ترجمہ: مجھ سے سوال کیا گیا کہ عید اور جمعہ کے دن مصافحہ کا کیا حکم ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اس کا حکم مستحب ہونے کا ہے (فتاویٰ کاملیہ)

مذکورہ عبارت سے صاف معلوم ہوا کہ عید کے دن مصافحہ مستحب ہے، خواہ ملاقات کی وجہ سے ہو، یا عید کی مبارکبادی اور اظہارِ سرور و بشاشت کی وجہ سے، اور خواہ وہ مستحب لعینہٖ ہو، یا مستحب لغیرہٖ ہو، اس بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔

’’مجمعُ الانہر‘‘ کا حوالہ

’’مجمعُ الانہر‘‘ میں ہے کہ:

والتهنئة بتقبل الله منا ومنکم؛ لا تنکر کما فی البحر وکذا المصافحة بل هی سنة عقیب الصلاة کلها وعند الملاقاة کما قال بعض الفضلاء (مجمع الأنهر فی شرح ملتقی الأبحر، ج ۱، ص ۱۷۳، کتاب الصلاة، باب صلاة العیدین)

ترجمہ: اور (عید کے موقع پر) ''**تقبل اللّٰہ منا و منکم**'' کے ذریعہ مبارک باد دینے پر نکیر نہیں کی جائے گی، جیسا کہ البحر میں ہے، اوراسی طریقہ سے (مبارکبادی کے وقت) مصافحہ کرنے پر بھی نکیر نہیں کی جائے گی، بلکہ مصافحہ کرنا تمام نمازوں کے بعد سنت ہے، اور ملاقات کے وقت بھی سنت ہے، جیسا کہ بعض فضلاء کا قول ہے (مجمع الانہر)

مذکورہ عبارت میں عید کے موقع پر مبارکباد دینے کے فعلِ منکر ہونے کی نفی کی گئی ہے، اوراس موقع پر مصافحہ پر نکیر کرنے کی بھی نفی کی گئی ہے، مبارکبادیا ''**تقبل اللّٰہ منا و منکم**'' کی حیثیت ایک دعاء کی ہے، اور مصافحہ ودعاء کو جمع کرنے کا حدیث سے ثبوت ملتا ہے، جیسا کہ گزرا۔

نیز مذکورہ عبارت میں ہر نماز کے بعد مصافحہ کو سنت قرار دیا گیا ہے، جو بظاہر اس قول پر مبنی ہے، جس کی رو سے نماز میں مشغولی کو ''**غیبوبةِ حکمیہ**'' کا حکم دیا گیا ہے، اوراس کو ''**غیبوبةِ حسية**'' کے ساتھ لاحق کیا گیا ہے، وہ بھی اس کے حق میں، جس سے نماز سے قبل ملاقات ہو چکی ہے، ورنہ جس سے نماز کے بعد ہی ملاقات ہوئی ہو، اس سے نماز کے بعد سلام ومصافحہ کے سنت ہونے میں شبہ نہیں، جیسا کہ آگے آتا ہے۔

''حاشيةُ الطحطاوی علی مراقی الفلاح'' کا حوالہ

''**حاشيةُ الطحطاوی علی مراقی الفلاح**'' میں ہے کہ:

والتهنئة بقوله تقبل الله منا ومنكم لا تنكر بل مستحبة لورود الأثر بها كما رواه الحافظ ابن حجر عن تحفة عيدالأضحى لأبی القاسم المستملی بسند حسن وكان أصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم إذا التقوا يوم العيد يقول بعضهم لبعض تقبل الله

منا ومنکم قال وأخرجه الطبرانی أیضا فی الدعاء بسند قوی اھـ.
قال والمتعامل به فی البلاد الشامية والمصرية قول الرجل لصاحبه عید مبارک علیک ونحوه ویمکن أن یلحق هذا اللفظ بذلک فی الجواز الحسن واستحبابه لما بینهما من التلازم اھـ.
وکذا تطلب المصافحة فهی سنة عقب الصلاة کلها وعند کل لقی (حاشیة الطحطاوی علی مراقی الفلاح، ص ۵۳۰، کتاب الصلاة، باب أحکام العیدین)

ترجمہ: اور (عید کے موقع پر) ''تقبل اللّٰہ منا و منکم'' کے ذریعہ مبارک باد دینے پر نکیر نہیں کی جائے گی، بلکہ یہ مستحب ہے، اس کے بارے میں روایت وارد ہوئی ہے، جیسا کہ حافظ ابنِ حجر نے ابوالقاسم مستملی کی ''تحفة عید الاضحٰی'' کے حوالے سے سندِ حسن کے ساتھ روایت کیا ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابۂ کرام، جب عید کے دن ملاقات کرتے تھے، تو ایک دوسرے کو ''تقبل اللّٰہ منا و منکم'' کہا کرتے تھے، ابنِ حجر نے فرمایا کہ اس کو طبرانی نے بھی ''الدعاء'' میں قوی سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔
علامہ ابنِ حجر نے یہ بھی فرمایا کہ شام اور مصر کے علاقوں میں یہ رواج ہے کہ آدمی اپنے ساتھی کو ''عید مبارک علیک'' یا اس جیسے الفاظ کہتا ہے، اور یہ بات ممکن ہے کہ ان الفاظ کو بھی حسنِ جواز اور استحباب کے حکم کے ساتھ لاحق کرلیا جائے، کیونکہ ان کے درمیان تلازم پایا جاتا ہے۔
اور اسی طریقہ سے (عید کے موقع پر) مصافحہ بھی مطلوب ہے، کیونکہ وہ تمام نمازوں کے بعد سنت ہے، اور ملاقات کے وقت بھی سنت ہے (حاشیة الطحطاوی)

اس عبارت سے بھی وہی بات ظاہر ہوئی، جو اس سے پہلی عبارت اور اس کے فائدہ میں گزری۔

’’حاشیۃُ الشرنبلالی‘‘ کا حوالہ

علامہ شرنبلالی کی ’’حاشیۃُ الشرنبلالی‘‘ میں ہے کہ:

والتهنئة بتقبل اللّٰه منا ومنكم لا تنكر كما فى البحر، وكذا المصافحة بل هى سنة عقب الصلوات كلها وعند كل لقى ولنا فيها رسالة سميتها سعادة أهل الإسلام بالمصافحة عقب الصلاة والسلام (حاشية الشرنبلالي،علىٰ درر الحكام شرح غرر الأحكام، ج ۱، ص ۱۴۲، كتاب الصلاة، باب صلاة العيدين)

ترجمہ: اور ’’تقبل اللّٰه منا و منكم‘‘ کے ذریعہ مبارک باد دینے، پر نکیر نہیں کی جائے گی، جیسا کہ البحر میں ہے، اور اسی طریقہ سے (مبارک باد دیتے وقت) مصافحہ کرنے پر بھی نکیر نہیں کی جائے گی، بلکہ مصافحہ کرنا، تمام نمازوں کے بعد سنت ہے، اور ملاقات کے وقت بھی سنت ہے، اور اس موضوع پر ہمارا ایک رسالہ ہے، جس کا نام میں نے ’’سعادة أهل الإسلام بالمصافحة عقب الصلاة والسلام‘‘ رکھا ہے (حاشية الشرنبلالي)

علامہ شرنبلالی، اور شیخُ الاسلام حانوتی کا حوالہ

علامہ شرنبلالی کا مذکورہ رسالہ ہم نے بھی ملاحظہ کیا، جس میں علامہ شرنبلالی نے شیخ الاسلام علامہ حانوتی کا اس سلسلہ میں ایک سوال کا جواب بھی نقل فرمایا ہے۔

علامہ شرنبلالی کے اس رسالہ کا ایک اقتباس درجِ ذیل ہے:

فالحديث الأول يقتضى مشروعية المصافحة مطلقا، أعم من أن

تكون بعد الصلوات الخمس والجمعة والعيدين أو غير ذلك، لأن النبي صلى الله عليه وسلم لم يخصها بوقت دون وقت, فإذا فعلت في أي وقت كان, كانت من مقتضيات هذه الأدلة وداخلة تحت عمومات، ولا يشترط فعل النبي صلى الله عليه وسلم المصافحة، ولا أمره عليه السلام بالمصافحة، لأن من المقتضيات ما أفاده الدليل، وإلا لما كان يمكن العمل بعموم الأدلة, مع أن الدليل العام عند الحنفية حيث لم يقع فيه تخصيص هو من الأدلة الموجبة لحكمه قطعاً, كالدليل الخاص,

حتى قالوا: أن الدليل العام يعارض الخاص لقوته، والدليل هنا عام لأن قوله صلى الله عليه وسلم: (من صافح أخاه) إلى آخر الحديث عام، لأن صيغة مَن من صيغ العموم وكذا صيغة ما, ويكفي هذا دليلاً على سنية المصافحة.

قلت: وكذلك نقل شيخ مشايخنا, الشيخ العلامة على المقدسى (رسالة سعادة أهل الإسلام بالمصافحة عقب الصلاة والسلام لأبى الإخلاص حسن الشرنبلالى، ص ٣٤" 1069-994هـ" رقم الإيداع بالمكتبة العامة: 2525/99 الطبعة الأولى، تحقيق: الدكتور أحمد محمود إبراهيم آل محمود، كلية الآداب جامعة البحرين قسم اللغة العربية والدراسات الإسلامية "1418هـ – 1997م")

ترجمہ: پس پہلی حدیث (جس میں مسلمانوں سے ملاقات کے وقت، مصافحہ کی فضیلت کا ذکر ہے) وہ مصافحہ کے مطلقاً مشروع ہونے کا تقاضا کرتی ہے، جو عام ہے، اس سے کہ مصافحہ پانچ نمازوں اور جمعہ اور عیدین کے بعد ہو، یا اس کے علاوہ ہو۔

چونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مصافحہ کو کسی مخصوص وقت کے ساتھ متعین نہیں فرمایا، پس جب بھی مصافحہ کسی وقت کیا جائے گا، تو وہ ان دلائل کے مقتضیات سے تعلق رکھے گا، اور عمومی دلائل میں داخل ہوگا، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے (خاص اس موقعہ پر) مصافحہ کا فعل شرط نہیں ہوگا، اور نہ ہی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے مصافحہ کا (خاص اس موقع پر) حکم شرط ہوگا، کیونکہ جس امر کا دلیل فائدہ دیتی ہے، وہ مقتضیات سے تعلق رکھتا ہے، ورنہ تو عمومی دلائل پر عمل کرنا، ممکن نہیں ہوگا، باوجودیکہ حنفیہ کے نزدیک، عام دلیل، جب اس میں کوئی تخصیص واقع نہ ہو، تو وہ اس کے قطعی حکم کو ثابت کرنے کی دلیل ہوا کرتی ہے، دلیلِ خاص کی طرح۔

یہاں تک کہ فقہائے کرام نے فرمایا کہ دلیلِ عام، اپنی قوت کے اعتبار سے، خاص کے معارض ہوا کرتی ہے، اور یہاں پر دلیل عام ہے، کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کہ جس نے اپنے بھائی سے مصافحہ کیا، آخر حدیث تک، یہ عام ہے، کیونکہ ''مَنْ'' کا صیغہ عموم کے صیغوں سے تعلق رکھتا ہے، اور اسی طریقہ سے ''مَا'' کا صیغہ بھی، اور مصافحہ کے سنت ہونے پر یہ دلیل کافی ہے۔

میں کہتا ہوں کہ اسی طریقہ سے ہمارے شیخ المشائخ شیخ علامہ علی مقدسی نے بھی نقل فرمایا ہے (رسالة سعادة اهل الاسلام)

مذکورہ استدلال سے کسی کا اتفاق واختلاف، اپنی جگہ، لیکن اس سے اتنا ضرور معلوم ہوا کہ عیدین کی نمازوں اور دوسری نمازوں کے بعد مصافحہ، ناجائز اور گناہ نہیں، اور دلیلِ اجتہادی کی رو سے اس کے جواز میں گنجائش اور توسع کا پہلو موجود ہے۔

شیخ عبدالغنی نابلسی کا حوالہ

شیخ عبدالغنی نابلسی دمشقی حنفی رحمہ اللہ (المتوفیٰ: 1143ھ) نے اپنی تالیف ''الحدیقۃ

الندیة، شرح الطریقة المحمدیة ‘‘میں اس بات کی وضاحت فرمائی ہے کہ جن مسائل میں فقہائے کرام کا اختلاف ہو، وہ حقیقی بدعت شمار نہیں ہوتے، اوران پر سختی ونکیر کرنا اورعوام الناس کی طرف سے فقہائے کرام میں سے کسی کے قول پر عمل ہونے کی صورت میں اس سے منع کرنا مناسب نہیں ہوتا، بلکہ عوام کا کوئی عمل، اتفاق سے فقہاء میں سے کسی کے قول کے مطابق، درست و جائز واقع ہوجائے، اس کی بھی گنجائش موجود ہوتی ہے، ان مسائل میں مخصوص نمازوں کے بعد مصافحہ کرنا بھی داخل ہے۔

چنانچہ شیخ موصوف، مذکورہ کتاب میں ایک مقام پر فرماتے ہیں کہ:

وبعض صور العبادات الواردة فی الشرع بان یزاد فی صورتها او ینقص منها مع اعتقاد ان تلک الزیادة والنقصان طاعة بمجرد الرأی ، لتخرج من البدع هذه الزیادة والنقصان الواقعة فی العبادات علی حسب اختلاف المذاهب الاربعة الیوم کتثنیة الاقامة عند ابی حنیفة رحمه الله تعالیٰ، بالنظر الی مذهب الامام شافعی رحمه الله تعالیٰ وافرادها عند الشافعی رحمه الله تعالیٰ بالنظر الی مذهب ابی حنیفة رحمه الله تعالیٰ ، وصلاة الکسوف برکوعین وسجودین وفاتحتین فی کل رکعة عند الشافعی ، لا عند ابی حنیفة رحمه الله تعالیٰ ، فان هذا او ما اشبهه لیس ببدعة فی الدین، لانه ماخوذ من الادلة الشرعیة ، لا من مجرد الرأی (الحدیقة الندیة، شرح الطریقة المحمدیة، ج ۱ ،ص۹۷، الفصل الثانی من الفصول الثلاثة من الباب الاول فی بیان اقسام البدع، مطبوعة: المکتبة الحقیقیة ، استانبول، ترکیا، 1994م)

ترجمہ: اور بدعت یہ بھی ہے کہ عبادت کی بعض صورتیں، جو شریعت میں وارِد ہیں،

ان کی صورتوں میں زیادتی کی جائے، یا ان میں کمی کی جائے، اس اعتقاد کے ساتھ کہ یہ زیادتی اور نقصان، طاعت ہے، محض رائے کی بنیاد پر، تاکہ بدعت کے مفہوم سے وہ زیادتی اور نقصان خارج ہوجائے، جو عبادات میں آج کے زمانے میں مذاہبِ اربعہ کے اختلاف کی بنیاد پر واقع ہے، جیسا کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک، اقامت کے کلمات کا دو دفعہ ہونا، امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کے مذہب کے مقابلے میں، اور اقامت کے کلمات کا امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اکہرے ہونا، امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کے مذہب کے مقابلے میں، اور سورج گرہن کی نماز میں امام شافعی کے نزدیک، ہر رکعت میں دو رکوع اور دو سجدوں، اور دو مرتبہ سورہ فاتحہ کا ہونا، نہ کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک، یہ اور ان جیسی چیزیں، دین میں بدعت شمار نہیں ہوتیں، کیونکہ یہ دلائلِ شرعیہ سے ماخوذ ہیں، محض رائے سے ماخوذ نہیں (الحدیقة الندية)

امام شیخ عبدالغنی نابلسی حنفی رحمہ اللہ، مذکورہ کتاب میں ہی ایک مقام پر فرماتے ہیں کہ:

ومن هذا القبيل نهي الناس عن حضور مجالس الذكر بالجهر، وانشاد اشعار الصالحين، وان صرح فقهاء الحنفية بكراهة الجهر بالذكر، فان ائمة الشافعية كالنووى وغيره قائلون باستحباب ذالک، ولاينبغي ان ينهى العوام عما تقول به ائمة المسلمين، ولو كان العوام زاعمين انهم مقلدون لمذهب ابى حنيفة رحمه الله، وهم غير عالمين بفروع المذهب غير مجرد القول، وقد ذكر الوالد رحمه الله تعالىٰ فى شرحه على شرح الدرر فى باب قضاء الفوائت فى مبحث الظن المعتبر، قال فى البحر شرح الكنز: والحق ان المجتهد لا كلام فيه اصلا، وان ظنه معتبر مطلقا

سواء كانت تلك الفائتة واجبة الاداء بالاجماع، او لا ، اذ لا يلزمه اجتهاد ابى حنفية ، ولا غيره ، وان كان مقلدا لابى حنيفة ، فلا عبرة برأية المخالف لمذهب امامه ، وان كان عاميا ليس له مذهب معين ، فمذهبه فتوى مفتيه كما صرحوا به ، ولاعبرة برأيه وان لم يستفت احدا ، وصادف الصحة على مجتهد اجزاه ، ولا اعادة عليه كما بسطه ثمة اهـ.

ومن هذا القبيل :نهى العوام عن المصافحة، بعد صلاة الصبح، والعصر، فإن بعض المتأخرين من الحنفية، صرح بالكراهة فى ذلك، ادعاء بأنه بدعة، مع انه داخل فى عموم سنة المصافحة مطلقا، فلا يبقى إلا مجرد التخصيص بالوقتين المذكورين، فيقتضى ابتداع ذلك.

وصرح النووى فى كتابه -الأذكار -وغيره من الشافعية، بأنها فى هذين الوقتين بدعة مباحة. فلا ينبغى للواعظ، أو المدرس، ان ينهى العوام عما أفتى بجوازه بعض أئمة الإسلام، ولو كان فى مذهب الغير، خصوصا، والعوام لا مذهب لهم، والتقليد للمذاهب الأربعة جائز لكل أحد ،كما بسطناه فى رسالتنا"خلاصة التحقيق فى بيان حكم التقليد والتلفيق" (الحديقة الندية، شرح الطريقة المحمدية، ج۲،ص۹۸،الخلق الثامن والأربعون، من الأخلاق الستين المذمومة"الفتنة" مطبوعة: المكتبة الحقيقية ، استانبول، تركيا، 1994م)

ترجمہ: اور (لوگوں کو منع نہ کیے جانے والی صورتوں کے)اسی قبیل سے لوگوں کو ذکرِ جہری کی مجالس میں حاضر ہونے اور نیک لوگوں کے اشعار پڑھنے سے منع کرنا ہے(کہ اس سے بھی صرف جہر، یا تداعی کی وجہ سے منع کرنا مناسب نہیں، جب

تک کوئی اجماعی منکر لازم نہ آئے) اگرچہ فقہائے حنفیہ نے جہری ذکر (اور تداعی) کی کراہت کی تصریح فرمائی ہے، کیونکہ ائمۂ شافعیہ، جیسا کہ نووی وغیرہ، اس کے مستحب ہونے کے قائل ہیں، اور یہ بات مناسب نہیں کہ عوام کو اُن افعال سے منع کیا جائے، جن کے ائمۂ مسلمین قائل ہیں، اگرچہ عوام اس بات کا گمان کرتے ہوں کہ وہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے مذہب کے مقلد ہیں، حالانکہ وہ مذہب کے فروع کو جانتے نہیں، سوائے قولِ محض کے۔ [1]

اور میرے والد رحمہ اللہ تعالیٰ نے ''شرحُ الدرر'' کی اپنی شرح میں ''باب قضاء الفوائت'' کے ذیل میں ظنِ معتبر کی بحث میں ذکر کیا ہے کہ ''کنز'' کی شرح ''البحر'' میں یہ مذکور ہے کہ حق بات یہ ہے کہ مجتہد کے بارے میں تو قطعاً کوئی کلام نہیں، اور اس کا گمان مطلقاً معتبر ہے، خواہ وہ فوت شدہ نماز بالاجماع، واجبُ الاداء ہو، یا نہ ہو، کیونکہ اس مجتہد کو امام ابوحنیفہ اور ان کے علاوہ کسی دوسرے مجتہد کا اجتہاد لازم نہیں۔ [2]

اور اگر وہ امام ابوحنیفہ کا مقلد ہو، تو پھر اس کے امام کے مذہب کے مخالف کی رائے کا اعتبار نہیں (جبکہ وہ عامی شخص نہ ہو، جیسا کہ آگے آتا ہے) اور اگر وہ عامی شخص ہو، تو اس کا کوئی مذہب متعین نہیں، پس اس کا مذہب، اس کے مفتی کا مذہب ہوتا ہے (خواہ اس نے حنفی مفتی سے فتویٰ لیا ہو، یا غیر حنفی مفتی سے) جیسا کہ فقہائے کرام نے تصریح فرمائی ہے، اور اس کی اپنی رائے کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا، اور اگر اس نے کسی مفتی سے استفتاء نہیں کیا، اور پھر اس کا عمل کسی بھی مجتہد کے مطابق صحیح

---

[1] جس کی وجہ سے وہ عامی لوگوں میں داخل ہیں، جن کا کوئی مذہب نہیں ہوتا، جیسا کہ فقہائے کرام نے تصریح فرمائی ہے اور ہم نے اس قسم کی تصریحات، اپنے دوسرے مضامین وتالیفات میں ذکر کردی ہیں۔ محمد رضوان۔

[2] خواہ وہ کسی خاص متعلقہ مسئلہ، یا متعلقہ مسائل میں جزوی مجتہد ہی، کیوں نہ ہو، جمہور اصولیین کے نزدیک اجتہاد متجزی ہونے کے قول کی رو سے۔ محمد رضوان۔

واقع ہوگیا، تو بھی اس کے لیے جائز ہے، اور اس پر (اس نماز وغیرہ کے عمل کا) اعادہ نہیں، جیسا کہ وہاں (یعنی البحر میں) تفصیل بیان کی گئی ہے، انتھٰی۔

اور اسی قبیل سے عوام کو فجر اور عصر کی نماز کے بعد مصافحہ سے منع کرنا ہے (کہ اس سے منع کرنا بھی مناسب نہیں) کیونکہ حنفیہ کے بعض متاخرین نے اس کی کراہت کی تصریح کی ہے، اس بات کا دعویٰ کرتے ہوئے کہ یہ بدعت ہے، حالانکہ یہ مطلق مصافحہ کی سنت کے عموم میں داخل ہے، پس مذکورہ دو وقتوں کے ساتھ صرف تخصیص ہی باقی رہ گئی، جو اس عمل کے مبتدع ہونے کا تقاضا کرتی ہے (لیکن اس میں توسّع موجود ہے)

چنانچہ شافعیہ میں سے امام نووی نے اپنی "کتابُ الاذکار" وغیرہ میں اس بات کی تصریح فرمائی ہے کہ ان دو وقتوں میں مصافحہ کرنا "بدعتِ مباحہ" ہے۔

لہٰذا واعظ، یا مدرس کے لیے یہ بات مناسب نہیں کہ وہ عوام کو ایسی چیز سے منع کرے کہ جس کے جواز کا بعض ائمۂ اسلام نے فتویٰ دیا ہے، اگرچہ وہ مذہبِ غیر میں ہی کیوں نہ ہو، خاص طور پر عوام کو، جن کا کوئی مذہب نہیں ہوتا، اور مذاہبِ اربعہ کی تقلید، ہر ایک کے لیے جائز ہے، جیسا کہ ہم نے اپنے رسالے "خلاصةُ التحقیق فی بیان حکم التقلید والتلفیق" میں اس کی تفصیل بیان کردی ہے (الحدیقة الندیة)

شیخ عبدالغنی نابلسی حنفی، ہی اپنے رسالہ "خلاصةُ التحقیق فی بیان حکم التقلید والتلفیق" میں فرماتے ہیں:

والحاصل :أن العلماء اختلفوا في لزوم مذهب معين، وصحح كل أحد منهم ما ذهب إليه، وعدم اللزم هو الراجح كما ذكرناه بعد أن لا يخرج عن المذاهب الأربعة، والله ولي

التوفیق (خلاصۃالتحقیق فی بیان حکم التقلید، لعبدالغنی النابلسی، ص۸،مطلب :

هل على الإنسان التزام مذهب معين أم لا؟)

ترجمہ: اور خلاصہ یہ ہے کہ علماء کا مذہبِ معین کے لزوم میں اختلاف ہے، اور ہر ایک نے اپنے اختیار کردہ قول کی تصحیح کی ہے، لیکن مذہبِ معین کا لازم نہ ہونا راجح ہے، جیسا کہ ہم نے ذکر کیا، بعد اس کے کہ مذاہبِ اربعہ سے خروج نہ کرے، **واللہ ولی التوفیق** (خلاصۃُ التحقیق)

مذہبِ معیّن کے لزوم اور مذاہبِ اربعہ کی تقلید کے مسئلہ کو ہم نے باحوالہ دوسرے مضامین میں تحریر کردیا ہے، بہرحال مذکورہ عبارات سے اتنی بات واضح ہوگئی کہ عوامُ النّاس، اگر عید کی نماز کے بعد، یا عید کے دن، یا کسی اور نماز کے بعد مصافحہ ومعانقہ کریں، جو بعض فقہاء کے نزدیک مباح، یا اس سے بھی بڑھ کر مستحسن وغیرہ ہے، تو اس سے منع کرنا مناسب نہیں۔

’’بریقة محمودیة‘‘ کا حوالہ

’’بریقة محمودیة‘‘ میں ہے کہ:

وأما المصافحة فی الجمعة والأعياد فعن شرح المجمع بدعة مكروهة. وفی رسالة مخصوصة للشرنبلالی جائزة وفی تلك الرسالة زيادة تفصيل (بريقة محمودية ،ج۴ص ۷۶،الباب الثانی فی الأمور المهمة فی الشريعة المحمدية، الفصل الثالث فی التقوى، النوع الثالث الأعضاء التی تجری فيها التقوى، الصنف الخامس فی آفات اليد)

ترجمہ: اور جمعہ اور عیدین کے دن مصافحہ کرنا مجمع کی شرح میں ہے کہ یہ بدعت اور مکروہ ہے۔

اور علامہ شرنبلالی کے ایک مخصوص رسالہ میں اس کا جائز ہونا مذکور ہے، اور اس

رسالہ میں زیادہ تفصیل کے ساتھ اس مسئلہ کا ذکر ہے (بریقۂ محمودیہ)

اس سے معلوم ہوا کہ عید کے دن مصافحہ کے متعلق خود حنفیہ کا بھی اختلاف ہے، علامہ شرنبلالی وغیرہ، اس کو جائز قرار دیتے ہیں۔

علامہ شرنبلالی کے حوالے سے اس مسئلہ کا حکم پہلے ذکر کیا جا چکا ہے۔

فقہائے حنفیہ کے علاوہ فقہائے شافعیہ نے بھی نماز کے بعد اور عید کے موقع پر مبارک باد اور اس کے ساتھ مصافحہ کو جائز، بلکہ بعض نے سنتِ مستحبہ قرار دیا ہے، جن کی چند عبارات آگے آتی ہیں۔

''ردُّ المحتار'' کا حوالہ

علامہ ابنِ عابدین شامی رحمہ اللہ نے ''ردُّ المحتار'' میں فرمایا کہ:

''مشائخِ حنفیہ نے فرمایا کہ معانقہ کے متعلق جو امام ابوحنیفہ اور آپ کے اصحاب میں اختلاف ہے، وہ قمیص، یا جبہ پہنے بغیر ہے، اور قمیص، یا جبہ پہن کر، یعنی جب جسم پر کپڑا حائل ہو، تو صحیح قول یہ ہے کہ اس میں حرج نہیں۔

اور عنایہ میں شیخ ابو منصور کی طرف سے مختلف احادیث کے درمیان اس طرح موافقت منقول ہے کہ جو معانقہ شہوت کے طریقہ پر ہو، وہ مکروہ ہے، اور مصنف نے اس کی تعبیر قمیص، یا جبہ کے بغیر، معانقہ کرنے سے کی ہے، کیونکہ اس کے بغیر معانقہ کرنا شہوت کا سبب ہے، لیکن جب قمیص، یا جبہ پہن کر، حسنِ سلوک اور اکرام کے طور پر معانقہ کیا جائے، تو کوئی حرج نہیں''۔ انتھٰی۔ [1]

---

[1] قالوا الخلاف فی المعانقة فی إزار واحد أما إذا كان علیه قمیص أوجبة لا بأس به بالإجماع وهو الصحیح اهـ.

وفی العناية :ووفق الشیخ أبو منصور بین الأحادیث فقال :المكروه من المعانقة ما كان علی وجه الشهوة، وعبر عنه المصنف بقوله :فی إزار واحد فإنه سبب یفضی إلیها فأما علی وجه البر والكرامة إذا كان علیه قمیص واحد فلا بأس به(رد المحتار علی الدر المختار، ج٦، ص ٣٨١، كتاب الحظر والإباحة، باب الاستبراء وغيره)

مذکورہ اور اس جیسی کئی حنفیہ کی عبارات میں امام ابوحنیفہ اور آپ کے اصحاب کے مابین معانقہ کے مسئلہ میں اختلاف کو بیان کرتے ہوئے ، مذکورہ تفصیل ہی بیان کی گئی ہے ، اور اس اختلاف کو بیان کرتے وقت ، سفر وغیر سفر وغیرہ کے ساتھ معانقہ کے جائز، یا مکروہ وغیرہ ہونے سے تعرض نہیں کیا گیا، جس سے بعض حضرات نے یہ استدلال کیا کہ عندالحنفیہ ،معانقہ کے جواز کو سفر کے ساتھ مخصوص نہیں کیا جائے گا ، بالخصوص جبکہ متعدد احادیث سے بھی غیر سفر کے موقع پر معانقہ کا ثبوت ملتا ہو، تو اس کو سفر کے ساتھ خاص کرنے کی کوئی وجہ نہیں ، وہ الگ بات ہے کہ اس کا عام معمول سفر کے موقع پر رہا ہو، لیکن اس سے غیر سفر کے مواقع پر، عدمِ جواز کا لازم آنا محلِ نظر ہے۔

اس کے علاوہ علامہ ابنِ عابدین شامی رحمہ اللہ نے ''ردُّ المحتار''میں ہی ایک مقام پر فرمایا کہ:

''امام نووی نے فجر اور عصر کے بعد مصافحہ کے بارے میں فرمایا کہ اس طرح سے مصافحہ کی شریعت میں اصل نہیں، لیکن اس میں حرج نہیں، الخ۔

شیخ ابوالحسن بکری نے فرمایا کہ فجر اور عصر کے بعد کی قید اس لیے ہے کہ ان کے زمانے میں لوگوں کی ان نمازوں کے بعد ہی مصافحہ کرنے کی عادت تھی، ورنہ تمام نمازوں کے بعد مصافحہ کرنے کا یہی حکم ہے، علامہ شرنبلالی کے مصافحہ سے متعلق رسالہ میں اسی طرح سے ہے، اور اسی کے مثل انہوں نے علامہ حانوتی کے حوالے سے ذکر کیا ہے، اور انہوں نے اسی پر فتویٰ دیا ہے، جو کہ شارح (یعنی صاحبِ ''الدُّر المختار'') کے موافق ہے، متون کے مطلق ہونے کی حیثیت سے۔

لیکن اس پر یہ اعتراض کیا جاسکتا ہے کہ خاص طور پر نمازوں کے بعد مصافحہ پر مداومت کرنا، بعض اوقات، کم علم لوگوں کو خاص ان مواقع پر مصافحہ کے سنت ہونے کی طرف پہنچانے اور اس بات کا سبب ہوسکتا ہے کہ نمازوں کے بعد مصافحہ

کی دوسرے اوقات کے مقابلہ میں کوئی اضافی خصوصیت ہے، اس کے علاوہ ان مواقع پر سلف سے بھی مصافحہ کرنا منقول نہیں۔

اور ''تبیینُ المحارم'' میں ''الملتقط'' کے حوالے سے منقول ہے کہ نماز کے بعد مصافحہ کرنا، ہر حال میں مکروہ ہے، کیونکہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے نماز کے بعد مصافحہ منقول نہیں، نیز یہ روافض کے طریقوں میں سے ہے۔

پھر ابنِ حجر ہیتمی شافعی سے یہ نقل کیا ہے کہ یہ بدعتِ مکروہہ ہے، جس کی شریعت میں کوئی اصل نہیں، اور اس کے فاعل کو پہلے متنبہ کیا جائے گا، اور پھر سزا دی جائے گی۔

پھر اس کے بعد فرمایا کہ مالکیہ میں سے ابنِ حاج نے ''المدخل'' میں فرمایا کہ یہ بدعت ہے، الخ۔

پھر ''تبیینُ المحارم'' میں اس پر لمبا کلام کیا ہے''۔ انتہیٰ۔ [1]

---

[1] (قوله كما أفاده النووى فى أذكاره) حيث قال اعلم أن المصافحة مستحبة عند كل لقاء، وأما ما اعتاده الناس من المصافحة بعد صلاة الصبح والعصر، فلا أصل له فى الشرع على هذا الوجه ولكن لا بأس به فإن أصل المصافحة سنة وكونهم حافظوا عليها فى بعض الأحوال، وفرطوا فى كثير من الأحوال أو أكثرها لا يخرج ذلك البعض عن كونه من المصافحة التى ورد الشرع بأصلها اهـ.

قال الشيخ أبو الحسن البكرى: وتقييده بما بعد الصبح والعصر على عادة كانت فى زمنه، وإلا فعقب الصلوات كلها كذلك كذا فى رسالة الشرنبلالى فى المصافحة، ونقل مثله عن الشمس الحانوتى، وأنه أفتى به مستدلا بعموم النصوص الواردة فى مشروعيتها وهو الموافق لما ذكره الشارح من إطلاق المتون.

لكن قد يقال إن المواظبة عليها بعد الصلوات خاصة قد يؤدى الجهلة إلى اعتقاد سنيتها فى خصوص هذه المواضع وأن لها خصوصية زائدة على غيرها مع أن ظاهر كلامهم أنه لم يفعلها أحد من السلف فى هذه المواضع، وكذا قالوا بسنية قرائة السور الثلاثة فى الوتر مع الترك أحيانا لئلا يعتقد وجوبها.

ونقل فى تبيين المحارم عن الملتقط أنه تكره المصافحة بعد أداء الصلاة بكل حال، لأن الصحابة — رضى الله تعالى عنهم — ما صافحوا بعد أداء الصلاة، ولأنها من سنن الروافض اهـ.

ثم نقل عن ابن حجر عن الشافعية أنها بدعة مكروهة لا أصل لها فى الشرع، وأنه ينبه فاعلها أولا ويعزر ثانيا .

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

علامہ شرنبلالی اور علامہ حانوتی اور علامہ ابنِ حجر ہیتمی اور علامہ ابنِ حاج رحمہم اللہ کا اس سلسلہ میں اصل کلام اور عبارات تو پہلے ذکر کی جا چکی ہیں، اور امام نووی کا کلام آگے آتا ہے۔

تاہم علامہ ابنِ حجر ہیتمی سے اس کا سنت ومستحب نہ ہونا تو مروی ہے، لیکن بدعت ومکروہ ہونا مروی نہیں، لہٰذا ان کی طرف مذکورہ نسبت میں تأمل ہے، نیز بندہ کو ''الملتقط'' کی طرف ایک سے زیادہ مرتبہ مراجعت کرنے کے بعد اس میں مذکورہ حکم دستیاب نہیں ہوسکا۔

جہاں تک ''تبیینُ المحارم'' کا تعلق ہے، تو یہ کتاب مطبوعہ شکل میں بندہ محمد رضوان کو کہیں سے دستیاب نہیں ہوسکی۔

اور جہاں تک بندہ نے غور کیا، تو بندہ نے اپنے زمانے میں کسی علاقے میں کسی خاص نماز، یا عام نمازوں کے بعد لوگوں کو مصافحہ پر مواظبت کرتے ہوئے نہیں پایا، اور نہ ہی بندہ کی معلومات کی حد تک اس کا روافض کا شعار ہونا، ظاہر ہوا۔

کسی دوسرے زمانے، یا علاقے میں ایسا ہو، تو الگ بات ہے۔

رہا کسی نماز کے بعد اتفاق سے کسی کا مصافحہ کر لینا، تو اس میں کوئی قباحت معلوم نہیں ہوتی، جبکہ اس کو خاص نماز کے بعد کی سنت بھی نہ سمجھا جاتا ہو۔

نیز جب بعض فقہاء سے اس کا جواز منقول ہے، یہاں تک کہ نماز میں مشغولی کے غیوبتِ حکمیہ کا درجہ ہونے کی وجہ سے نماز کے بعد مصافحہ کا مسنون ومستحب ہونا بھی مروی ہے، تو اس کو غیر اجتہادی، یعنی اجماعی بدعت کہنا ممکن نہیں، جہاں تک اجتہادی واختلافی بدعت کا تعلق ہے، تو اس کی وجہ سے یہ مسئلہ اجتہادی اختلاف سے خارج نہیں ہوتا، جیسا کہ پہلے گزرا، اور

﴿ گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ ﴾

ثم قال: وقال ابن الحاج من المالكية فى المدخل إنها من البدع، وموضع المصافحة فى الشرع، إنما هو عند لقاء المسلم لأخيه لا فى أدبار الصلوات فحيث وضعها الشرع يضعها فينهى عن ذلك ويزجر فاعله لما أتى به من خلاف السنة اهـ.

ثم أطال فى ذلك فراجعه (رد المحتار على هامش الدر المختار، ج٦، ص ٣٨١، كتاب الحظر والاباحة، باب الاستبراء وغيره)

آ گے بھی آ تا ہے، نیز علامہ ابنِ عابدین شامی کی عبارت میں مذکورہ تعلیلات پر کلام آ گے بھی آ تا ہے۔

یہ بھی ملحوظ رہے کہ ہمارے ہندوستان و پاکستان کے بہت سے اہلِ افتاء کی دوسرے متعدد مسائل کی طرح، اس مسئلہ میں بھی علامہ ابنِ عابدین شامی رحمہ اللہ کی مذکورہ عبارت میں رجحان کے مطابق رائے رہی، اور نقل در نقل اس مسئلہ میں کچھ شدت ہوتی رہی، اور اس کے مقابلہ میں فتاویٰ کے باب میں دوسری کتب کی طرف مراجعت کا اہتمام کم رہا، جس کے نتیجہ میں کئی دوسرے پہلو بعد کے اہلِ علم حضرات کی نظروں سے مخفی رہے، اور تحقیق کی نوبت بھی کم آئی اور اس طرح خاص ایک موقف اور قول کی شہرت زیادہ ہوئی۔

یہ ملحوظ رہنا بھی ضروری ہے کہ متعدد فقہائے کرام نے عید کے دن، یا عید کی نماز کے بعد مبارک باد دیتے وقت، مصافحہ کو جائز، یا مستحب قرار دیا ہے، جو کہ بظاہر مبارک بادی کی وجہ سے ہے، جو کہ ایک دعاء ہے، نہ کہ ملاقات کی وجہ سے، اور دعاء و مصافحہ کا اجتماع، حدیث سے ثابت ہے، اور عید کا دن مبارک باد کا موقع ہے، اس لیے اس مصافحہ کو عام نمازوں کے بعد والے مصافحہ پر قیاس کرنا محلِّ نظر ہوا، جبکہ خود نماز کے بعد مصافحہ کا عدمِ جواز بھی متفق علیہ نہیں۔

پس علامہ شامی کے مذکورہ موقف کی بنیاد پر عید کے دن مبارک باد کے موقع پر اظہارِ سرور و بشاشت کے طور پر مصافحہ و معانقہ کو بدعتِ مذمومہ و مکروہہ قرار دینے پر بندے کو اب اطمینان وشرح صدر نہیں رہا۔

امام نووی اور ابنِ صلاح کا حوالہ

امام نووی شافعی فرماتے ہیں کہ:

وأما هذه المصافحة المعتادة بعد صلاتی الصبح والعصر فقد ذكر الشيخ الإمام أبو محمد بن عبد السلام رحمه الله أنها من البدع

المباحة ولا توصف بكراهة ولا استحباب وهذا الذى قاله حسن والمختار أن يقال إن صافح من كان معه قبل الصلاة فمباحة كما ذكرنا وإن صافح من لم يكن معه قبل الصلاة عند اللقاء فسنة بالإجماع للأحاديث الصحيحة فى ذلک (المجموع شرح المهذب، ج۳،ص ۴۸۸، كتاب الصلاة،باب صفة الصلاة)

ترجمہ: جہاں تک فجر اور عصر کے بعد رائج اس مصافحہ کا تعلق ہے، تو شیخ الامام ابو محمد بن عبدالسلام رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے کہ یہ بدعتِ مباحہ میں سے ہے، نہ تو اس پر کراہت کا حکم لگایا جائے گا، اور نہ استحباب کا، اور ان کا یہ قول عمدہ ہے، اور مختار یہ ہے کہ یہ کہا جائے کہ اگر اس شخص کے ساتھ مصافحہ کرے، جو نماز سے پہلے اس کے ساتھ تھا، تو یہ مباح ہے، جیسا کہ ہم نے ذکر کیا، اور اگر اس شخص کے ساتھ ملاقات کے وقت، مصافحہ کرے، جو نماز سے پہلے اس کے ساتھ نہیں تھا، تو اس سلسلہ میں صحیح احادیث کی وجہ سے یہ بالاجماع سنت ہے (المجموع)

مذکورہ کتاب میں ہی امام نووی ایک مقام پر فرماتے ہیں:

وتسن المصافحة عند كل لقاء وأما ما أعتاده الناس من المصافحة بعد صلاتى الصبح والعصر فلا أصل له فى الشرع على هذا الوجه.ولكن لا بأس به فإن أصل المصافحة سنة وكونهم خصوها ببعض الأحوال وفرطوا فى أكثرها لا يخرج ذلک البعض عن كونه مشروعة فيه وقد سبق بيان هذه القاعدة فى آخر صفة الصلاة.

ويستحب مع المصافحة بشاشة الوجه (المجموع شرح المهذب، ج۴،ص ۶۳۳ الى ۶۳۵ ،باب فى السلام،الفصل الخامس فى المصافحة والمعانقة والتقبيل ونحوها)

ترجمہ: اور ملاقات کے وقت مصافحہ سنت ہے، اور فجر اور عصر کی نماز کے بعد، جو لوگوں کے مصافحہ کرنے کی عادت ہے، تو اس طریقہ پر مصافحہ کرنے کی شریعت میں کوئی اصل نہیں، لیکن اس میں کوئی حرج بھی نہیں، کیونکہ مصافحہ، بنیادی طور پر سنت ہے، اور لوگوں کا بعض احوال میں اس کو خاص کرنا، اور دوسرے اکثر حالات میں اس میں کوتاہی کرنا، اس کو خاص حالات میں مشروع ہونے سے خارج نہیں کرے گا، نماز کی صفت کے آخر میں اس قاعدے کا بیان گزر چکا ہے۔

اور مصافحہ کے ساتھ خندہ پیشانی بھی مستحب ہے (المجموع)

خندہ پیشانی سے مراد، اظہارِ بشاشت وفرحت ہے۔

مذکورہ کتاب میں ہی ایک مقام پر امام نووی فرماتے ہیں:

وأما المعانقة وتقبيل وجه غير القادم من سفر ونحوه غير الطفل فمكروهان. صرح بكراهتهما البغوى وغيره وهذا الذى ذكرنا فى التقبيل والمعانقة أنه يستحب عند القدوم من سفر ونحوه ومكروه فى غيره هو فى غير الأمرد الحسن الوجه .فأما الأمرد الحسن فيحرم بكل حال تقبيله سواء قدم من سفر أم لا (المجموع شرح المهذب، ج۴،ص۶۳۷،۶۳۸،باب فى السلام،الفصل الخامس فى المصافحة والمعانقة والتقبيل ونحوها)

ترجمہ: جہاں تک معانقہ اور چہرے کی تقبیل کا تعلق ہے، جب کہ کوئی سفر وغیرہ سے نہ آئے، اور بچہ بھی نہ ہو، تو یہ دونوں عمل مکروہ (تنزیہی) ہیں، ان کے مکروہ ہونے کی بغوی وغیرہ نے تصریح کی ہے، اور جو حکم ہم نے تقبیل اور معانقہ کا ذکر کیا کہ یہ سفر وغیرہ سے آمد کے وقت مستحب ہے، تو یہ خوبصورت اَمرد کے علاوہ کا حکم ہے، لیکن خوبصورت اَمرد کی تقبیل ہر حال میں حرام ہے، خواہ وہ سفر سے آیا

ہو، یا نہ آیا ہو(المجموع)

اورامام نووی رحمہ اللہ نے ہی ''روضۃُ الطالبین'' میں فرمایا کہ:

''سفر وغیرہ سے آنے والے کے لیے معانقہ کرنا، مسنون ہے، کیونکہ اس سلسلہ میں صحیح حدیث وارد ہے۔

البتہ جو سفر وغیرہ سے نہ آئے، اس کے لیے معانقہ مکروہ (تنزیہی) ہے۔

جہاں تک مصافحہ کا تعلق ہے، تو وہ ملاقات کے وقت سنت ہے، جس میں مقیم اور سفر سے آنے والا برابر ہے، اس سلسلہ میں کثرت سے صحیح احادیث وارد ہوئی ہیں۔

اور فجر اور عصر کی نماز کے بعد مصافحہ کی جو لوگوں کو عادت ہے، تو خاص اس عمل کی کوئی اصل نہیں، لیکن اس میں حرج بھی نہیں، کیونکہ یہ فی الجملہ مصافحہ کے قبیل سے ہے، اور شریعت نے مصافحہ کی ترغیب دی ہے، اور ابو محمد بن عبدالسلام نے اس کو بدعتِ مباحہ قرار دیا ہے، اور مصافحہ کے ساتھ خندہ پیشانی کا مظاہرہ کرنا، اور مغفرت وغیرہ کی دعاء کرنا بھی مستحب ہے''۔انتہٰی۔ [1]

اورامام ابنِ صلاح نے ''صاحبُ التهذيب'' کے معانقہ کے مکروہ ہونے کا حکم ذکر کر کے فرمایا کہ:

---

[1] وسن تقبيل وجه صاحبه إذا قدم من سفر ونحوه، ومعانقته للحديث الصحيح فيهما، وأما المعانقة وتقبيل الوجه لغير القادم من سفر ونحوه، فمكروهان، صرح به البغوى وغيره للحديث الصحيح فى النهى عنهما، وأما المصافحة، فسنة عند التلاقى، سواء فيه الحاضر والقادم من سفر، والأحاديث الصحيحة فيها كثيرة جدا.

وأما ما اعتاده الناس من المصافحة بعد صلاتى الصبح والعصر، فلا أصل لتخصيصه، لكن لا بأس به، فإنه من جملة المصافحة، وقد حث الشرع على المصافحة، وجعله الشيخ الإمام أبو محمد بن عبد السلام من البدع المباحة، ويستحب مع المصافحة البشاشة بالوجه والدعاء بالمغفرة وغيرها(روضة الطالبين وعمدة المفتين،للنووى، ج١٠،ص ٢٣٦،٢٣٧، كتاب السير، فصل فى السلام)

’’امام شافعی نے اس مسئلہ کو ذکر نہیں کیا، لیکن امام شافعی کا مذہب ثابت شدہ حدیث کی اتباع کرنا ہے، اور آدمی کے دوسرے آدمی سے معانقہ کرنے کے جائز ہونے کی جو حدیث مروی ہے، جب یہ معانقہ شہوت ابھارنے کی طرف پہنچانے والا نہ ہو، تو یہ زیادہ مضبوط ثبوت ہے، اس سلسلہ میں ممانعت والی روایت کے مقابلہ میں، جیسا کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے مروی ہے‘‘۔انتہٰی۔[1]

مذکورہ عبارات سے معلوم ہوا کہ امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک، جب شہوت وغیرہ سے امن ہو، معانقہ مکروہ نہیں، اور یہ بھی معلوم ہوا کہ شافعیہ کے نزدیک نمازوں کے بعد مصافحہ میں حرج نہیں، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عید کی نماز کے بعد بھی حرج نہ ہوگا، اور جس سے ملاقات ہوئی ہو، اس سے مصافحہ سنت ہے۔

البتہ غیر مسافر کے حق میں، جبکہ اس سے زیادہ وقت کے بعد ملاقات بھی نہ ہوئی ہو، بعض شافعیہ کے نزدیک معانقہ مکروہ تنزیہی ہے، جس میں گناہ لازم نہیں آتا، جبکہ بعض دوسرے حضرات، مکروہ بھی قرار نہیں دیتے، کیونکہ احادیث سے غیر سفر کے موقع پر بھی معانقہ کا ثبوت ملتا ہے، دلائل کی رُو سے راجح بھی یہی ہے۔

امام نووی اور ابنِ علان شافعی کا حوالہ

امام نووی رحمہ اللہ نے اپنی مشہور تالیف ’’الأذکـــار‘‘ میں بھی مصافحہ کے متعلق وہی تفصیل بیان فرمائی ہے، جو ان کے حوالے سے پہلے ذکر کی گئی، جس میں انہوں نے فجر اور عصر کے

---

[1] وأما ما ذكره صاحب "التهذيب من أنه يكره المعانقة دون المصافحة فقد ذكر ذلك شيخه، القاضي حسين - رحمه الله -ونسب ذلك إلى أبي حنيفة وقال :لم يذكر الشافعي هذه المسألة.
قلت :لكن مذهب الشافعي اتباع الأثبت من الحديث، وما روى في تجويز معانقة الرجل الرجل إذا لم تكن مؤدية إلى تحريك شهوة أثبت مما روى في النهي عنها، روينا في السنن الكبير بإسناد جيد عن الشعبي قال :كان أصحاب محمد -صلى الله عليه وسلم -إذا التقوا صافحوا فإذا قدموا من سفر عانق بعضهم بعضا والله أعلم(شرح مشكل الوسيط،لابن الصلاح،ج٣،ص ٥٣٦، ٥٣٧،كتاب النكاح)

بعد مصافحہ کو مباح قرار دیا ہے، اور مصافحہ کے وقت خندہ پیشانی کا مظاہرہ کرنے اور مغفرت وغیرہ کی دعاء کرنے کو مستحب فرمایا ہے۔ [1]

جس کی تشریح کرتے ہوئے محمد بن علان شافعی نے ''الفتوحاتُ الربانية'' میں فرمایا کہ:

''فجر اور عصر کے بعد لوگوں میں جو مصافحہ کرنے کا معمول ہے، اس کی تائید ابوجحیفہ کی اس حدیث سے بھی ہوتی ہے، جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہر اور عصر کی نماز پڑھنے کے بعد، لوگوں کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مصافحہ کرنے کا ذکر ہے۔

محبّ طبری نے نمازوں کے بعد مصافحہ کرنے کے مسئلہ میں اس حدیث سے استدلال کیا ہے، اور فجر اور عصر کے اوقات کی مخصوص فضیلت کی وجہ سے اس کی خصوصیت میں حرج نہیں، بالخصوص جبکہ نیک صالح آدمی سے تبرک حاصل کرنا، یا جائز محبت وغیرہ مقصود ہو، جبکہ حمزہ ناشری وغیرہ نے تمام نمازوں کے بعد مصافحہ کو مستحب قرار دیا ہے، اگرچہ نماز سے پہلے مصافحہ کیوں نہ کرلیا ہو، کیونکہ نماز میں

---

[1] واعلم أن هذه المصافحة مستحبة عند كل لقاء ، وأما ما اعتاده الناس من المصافحة بعد صلاتي الصبح والعصر ، فلا أصل له في الشرع على هذا الوجه، ولكن لا بأس به، فإن أصل المصافحة سنة، وكونهم حافظوا عليها في بعض الأحوال، وفرطوا فيها في كثير من الأحوال أو أكثرها، لا يخرج ذلك البعض عن كونه من المصافحة التي ورد الشرع بأصلها.

وقد ذكر الشيخ الإمام أبو محمد عبد السلام رحمه الله في كتابه "القواعد" أن البدع على خمسة أقسام :واجبة، ومحرمة، ومكروهة، ومستحبة، ومباحة.

قال :ومن أمثلة البدع المباحة :المصافحة عقب الصبح والعصر، والله أعلم.

قلت :وينبغي أن يحترز من مصافحة الأمرد الحسن الوجه، فإن النظر إليه حرام كما قدمنا في الفصل الذي قبل هذا، وقد قال أصحابنا :كل من حرم النظر إليه حرم مسه، بل المس أشد، فإنه يحل النظر إلى الأجنبية إذا أراد أن يتزوجها.

وفي حال البيع والشراء والأخذ والعطاء ونحو ذلك، ولا يجوز مسها في شيء من ذلك، والله أعلم.

فصل :ويستحب مع المصافحة، البشاشة بالوجه، والدعاء بالمغفرة وغيرها (الأذكار، للنووي، ص٢٦٦، كتاب السلام والاستئذان وتشميت العاطس وما يتعلق بها،فصل في المصافحة)

مشغولی ’’غیبةِ حکمیة ‘‘ ہے، جس کو ’’غیبةِ حسیة‘‘ کا حکم حاصل ہے۔

پھر فرمایا کہ امام نووی نے نمازوں کے بعد مصافحہ کا جو حکم بیان کیا کہ نہ تو یہ سنت و مستحب ہے، اور نہ مکروہ ہے، بلکہ مباح ہے، اس سے اس شبہ کا جواب ہوگیا، جو بعض لوگوں کی طرف سے پیدا کیا گیا ہے کہ انہوں نے اس حکم کو سنت، یا مستحب سمجھ لیا، حالانکہ امام نووی کی طرف سے اس کو صرف مباح قرار دیا گیا ہے۔

البتہ جن حضرات نے نمازوں کے بعد سنت، یا مستحب قرار دیا، ان پر مذکورہ شبہ وارد ہوتا ہے، وہ بھی اس صورت میں جبکہ نماز کو غیبو بت کا درجہ نہ دیا جائے‘‘۔

انتہٰی۔ [1]

---

[1] قوله :(وأما ما اعتاده النّاس الخ) فی صحیح البخاری من حدیث جابر بن سمرة کان -صلی الله علیه وسلم -إذا صلی أقبل علینا بوجهه وفیه قال أبو جحیفة وخرج -صلی الله علیه وسلم- بالهاجرة إلى البطحاء فتوضأ ثم صلى الظهر رکعتین والعصر رکعتین وقام النّاس فجعلوا یأخذون بیده فیمسحون بها وجوههم فأخذت بیده فوضعتها علی وجهی فإذا هی أبرد من الثلج وأطیب رائحة من المسک أورد هذین الحدیثین المحب الطبری فی غایته وأورد أحادیث کثیرة کذلک وقال :یستأنس بذلک لما تطابق علیه النّاس من المصافحة بعد الصلوات فی الجماعات لا سیما فی العصر والمغرب إذا اقترن به قصد صالح من تبرک أو تودد أو نحوه اهـ، وأفتی حمزة الناشری وغیره باستحبابها عقب الصلوات مطلقاً أی وإن صافحه قبلها لأن الصلاة غیبة حکمیة فتلحق بالغیبة الحسیة اهـ .نقله الأشخر فی فروعه، قال أبو شکیل فی شرح الوسیط یظهر لی أن تخصیص هذین الوقتین أی العصر والصبح هو لما روی أن ذینک الوقتین لنزول ملائکة وصعود آخرین إذ تنزل ملائکة اللیل عند العصر وتصعد عندها ملائکة النهار وتنزل ملائکة النهار عند صلاة الصبح وتصعد ملائکة اللیل فاستحب المصافحة للتبرک بمصافحتهم قلت :ولو قیل التخصیص بهما لمزید فضلهما لما ذکروا أن العصر هی الوسطی وقیل مثل ذلک فی الفجر وهما أوقات الفیوض فناسب تخصیصهما بنوع تکریم لکان أقرب والله أعلم.

قال بعضهم ومثل المصافحة عقب هاتین الصلاتین المصافحة عقب باقی الصلوات أی ممن اجتمع به قبلها .قوله :(فلا أصل له علی هذا الوجه) أی من کونهم یأتون بها عقب هاتین الصلاتین إذا کانوا قبلهما مجتمعین .قوله :(ولکن لا بأس به) نقل فی المرقاة عن بعض الحنفیة کراهة ذلک.

قوله :(ولکن لا بأس به) عبر بمثله فی الروضة واستحسن فی المجموع کلام ابن عبد السلام ثم قال والمختار أن مصافحة من کان معه قبل الصلاة مباحة ومن لم یکن معه قبل الصلاة سنة لأن المصافحة عند اللقاء سنة اهـ، وعلیه لا یتقید ذلک بالصبح والعصر کما هو ظاهر کما لا یتقید

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

مذکورہ عبارت میں ابوجحیفہ کی جس حدیث سے استدلال کیا گیا ہے، وہ صحیح بخاری میں مذکور ہے۔ ؎

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

بذلک فتوی الناشری بالاستحباب مطلقاً کما تقدم عنه .قوله :(فإن أصل المصافحة سنة) أی فی محلها المشروعة هی فيه وذلک عند التلاقی .قوله :(وكونهم حافظوا عليها فی بعض الأحوال) أی وإن لی تكن مشروعة فی ذلک البعض كما فی ما إذا اجتمعا قبل الصلاة ثم تصافحا عقبها (لا يخرج ذلک البعض) وإن كان مبتدعاً (عن كونه من) أفراد (المصافحة) لطبق تعريفه عليها (التی ورد الشرع بأصلها) أی بالمشروع منها وهو عند الملاقاة، وبما تقرر فی حل عبارة المصنف يندفع اعتراض صاحب المرقاة.

وقوله إن فی كلام المصنف نوع تناقض لأن الإتيان بالسنة فی بعض الأوقات لا يسمی بدعة اهـ .
ووجه اندفاعه أن المصنف لم يقل إن المصافحة فيما ذكر من السنة وإنها بدعة مباحة، بل إنها بدعة لأن المصافحة إنما تسن عند اللقاء وهو سابق فی هذه الحالة الصلاة فهی بعدها حينئذٍ بدعة لعدم ورودها كذلک عن الشارع وكانت مباحة لورود أصلها فی محله وهو عند اللقاء ، وبه يندفع أيضاً قوله معترضاً عليه مع أن عمل النّاس فی هذين الوقتين ليس علی وجه الاستحباب المشروع فإن محل المصافحة أول اللقاء وهؤلاء يتلاقون قبل الصلاة من غير مصافحة ويتصافحون عقبها فأين هذا من السنة اهـ.

ووجه اندفاعه بل عدم وروده بالكلية أن المصنف لم يقل باستحباب المصافحة فی هذه الصورة بل صرح بأنها بدعة مباحة ومع هذا التصريح فلا يبقی لهذا الإيراد وجه فضلاً عن وجه مليح، وفی المرقاة.ومع كونها من البدع فإذا مد مسلم يده إليه ليصافحه فلا ينبغی الإعراض عنه بجذب اليد لما يترتب عليه من أذی يزيد علی مراعاة الأدب وإن كان يقال إن فيه نوع إعانة علی البدعة وذلک لما فيه من المجابرة اهـ.

وكذا فهم الحافظ من كلام المصنف أنه يری أنها مستحبة فی هذين من قوله بعد نقل كلام ابن عبد السلام أصل المصافحة سنة وكونهم حافظوا عليها فی بعض الأحوال لا يخرجها عن أصل السنة قال الحافظ وللنظر فيه مجال فإن أصل صلاة النافلة سنة مرغب فيها ومع ذلک فقد كره المحققون تخصيص وقت بها دون وقت ومنهم من أطلق تحريم مثل ذلک كصلاة الرغائب التی لا أصل لها اهـ(الفتوحات الربانية علی الأذكار النواوية،لمحمد بن علان الصديقی الشافعی، ج۵، ص۳۹۷، الیٰ ۳۹۹،كتاب السلام والاستئذان وتشميت العاطس وما يتعلق بها،فصل فی المصافحة)

؎ عن الحكم، قال :سمعت أبا جحيفة، قال :خرج رسول الله صلی الله عليه وسلم بالهاجرة إلی البطحاء ، فتوضأ ثم صلی الظهر ركعتين، والعصر ركعتين، وبين يديه عنزة قال شعبة وزاد فيه عون، عن أبيه أبی جحيفة، قال :كان يمر من ورائها المرأة، وقام الناس فجعلوا يأخذون يديه فيمسحون بها وجوههم، قال فأخذت بيده فوضعتها علی وجهی فإذا هی أبرد من الثلج وأطيب رائحة من المسک(صحيح البخاری، رقم الحديث ۳۵۵۳)

مذکورہ عبارات سے بھی معلوم ہوا کہ نمازوں، یا مخصوص نمازوں کے بعد، جن میں نمازِ عید بھی داخل ہے، ملاقات کے بغیر مصافحہ جائز ہے، بلکہ بعض حضرات کے نزدیک نماز کو غیبوبت کا حکم حاصل ہونے کی وجہ سے مستحب ہے، جبکہ حسی ملاقات ہونے والے سے سنت و مستحب ہونے میں شبہ نہیں ہے۔

''بغیۃُ المسترشدین'' کا حوالہ

شافعیہ کی کتاب ''بغیۃُ المسترشدین'' میں ہے کہ:

التهنئة بالعيد سنة ، ووقتها للفطر غروب الشمس ، وفى الأضحى فجر عرفة كالتكبير اهـ. زاد ش ق.وكذا بالعام والشهر على المعتمد مع المصافحة عند اتحاد الجنس والخلوّ عن الريبة ، كامرأة وأمرد أجنبيين والبشاشة والدعاء بالمغفرة ، وقد جعل الله للمؤمنين ثلاثة أيام: عيد الجمعة والفطر والأضحى ، وكلها بعد إكمال العبادة (بغية المسترشدين فى تلخيص فتاوى بعض الائمة من العلماء المتاخرين للسيد باعلوى الحضرمي، ص ١٤٦، كتاب الصلاة، العيدان، الناشر: دارالفكر، بيروت، لبنان، مطبوعة: ١٤١٤ھ، 1994م)

ترجمہ: عید کی مبارک باد دینا سنت ہے، جس کا وقت عیدالفطر کے سورج غروب ہونے کے وقت (یعنی چاند رات کو) ہوجاتا ہے، اور عیدالاضحیٰ میں عرفہ کے دن فجر کے وقت ہوجاتا ہے، جیسا کہ اس وقت میں تکبیر کا بھی وقت ہوجاتا ہے، اور اسی طریقہ سے سال اور مہینے کے شروع ہونے پر بھی معتمد قول کے مطابق مبارک باد، مصافحہ کے ساتھ سنت ہے، بشرطیکہ جنس متحد ہو، اور اس کا شبہ بھی نہ ہو، جیسا کہ عورت اور بے ریش لڑکا، جبکہ یہ دونوں اجنبی ہوں، اور (مصافحہ ومبارک بادی

کے وقت) خوشی کا اظہار کرنا، اور مغفرت کی دعاء کرنا بھی سنت ہے، اور اللہ تعالیٰ نے مومنین کے لیے تین دن عید کے بنادیے ہیں، ایک جمعہ کا دن، اور ایک عید الفطر کا دن، اور ایک عید الاضحیٰ کا دن، اور یہ تمام کام عبادت مکمل کرنے کے بعد ہیں (بغیۃ المسترشدین)

مذکورہ عبارت سے معلوم ہوا کہ عید کی مبارک باد دیتے وقت مصافحہ کرنا، گناہ نہیں، بلکہ بعض حضرات کے نزدیک سنت ومستحب ہے، اور پیچھے گزر چکا ہے کہ ''تقبل اللّٰہ منا و منکم '' کی حیثیت ایک دعاء کی ہے، اور مصافحہ ودعاء کو جمع کرنے کا حدیث سے ثبوت ملتا ہے۔

''حاشیۃُ الشروانی'' کا حوالہ

شافعیہ کی کتاب ''حاشیۃُ الشروانی ''میں ہے کہ:

قوله مر تقبل الله إلخ أى ونحو ذلك مما جرت به العادة فى التهنئة ومنه المصافحة ويؤخذ من قوله فى يوم العيد أنها لا تطلب فى أيام التشريق وما بعد يوم عيد الفطر لكن جرت عادة الناس بالتهنئة فى هذه الأيام ولا مانع منه؛ لأن المقصود منه التودد وإظهار السرور ويؤخذ من قوله يوم العيد أيضا أن وقت التهنئة يدخل بالفجر لا بليلة العيد خلافا لما فى بعض الهوامش اهـ وقد يقال لا مانع منه أيضا إذا جرت العادة بذلك لما ذكره من أن المقصود منه التودد وإظهار السرور ويؤيده ندب التكبير فى ليلة العيد وعبارة شيخنا وتسن التهنئة بالعيد ونحوه من العام والشهر على المعتمد مع المصافحة إن اتحد الجنس فلا يصافح الرجل المرأة ولا عكسه ومثلها الأمرد الجميل وتسن إجابتها بنحو تقبل

اللہ منکم أحیاکم اللہ لأمثالہ کل عام وأنتم بخیر اھـ (حاشیة الشروانی، علٰی تحفة المحتاج فی شرح المنہاج، ج۳، ص ۵٦، کتاب الصلاة، باب صلاة العیدین)

ترجمہ: اور عید کے دن مبارک باد دیتے وقت "**تقبل اللّٰہ منا، الخ**" اور اس کے مثل دوسرے الفاظ، جن کا لوگوں میں رواج ہو، وہ کہنا جائز اور مستحب ہے، اور مصافحہ بھی (اس مبارک باد کے موقع پر مستحب ہے) اور عید کے دن کی قید سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ ایامِ تشریق میں اور عید الفطر کے دن کے بعد مبارک باد اور مصافحہ نہیں کیا جائے گا، لیکن ان دنوں میں بھی لوگوں کی عادت، مبارک باد دینے اور مصافحہ کی جاری ہے، اور اس میں کوئی ممانعت نہیں، کیونکہ اس سے مقصود محبت اور خوشی کا اظہار کرنا ہے، اور جو یہ فرمایا کہ عید کے دن اس سے یہ بات سمجھی جاتی ہے کہ مبارک باد کا وقت، عید کے دن فجر کے وقت داخل ہوتا ہے، عید کی رات میں داخل نہیں ہوتا، لیکن بعض اہلِ حواشی کا اس میں اختلاف ہے (کہ ان کے نزدیک رات کے وقت ہی مبارک باد کا وقت شروع ہوجاتا ہے) اور بسا اوقات یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس میں بھی کوئی ممانعت کی وجہ نہیں، کیونکہ اس کی بھی لوگوں میں عادت جاری ہے، اور اس کی وجہ وہی ہے، جو ذکر کی گئی کہ اس سے مقصود محبت اور سرور وخوشی کا اظہار ہے، جس کی تائید، عید کی رات میں تکبیر کے مستحب ہونے سے بھی ہوتی ہے، اور ہمارے شیخ کی عبارت یہ ہے کہ عید وغیرہ کے موقع پر جیسا کہ سال کے شروع اور مہینے کے شروع میں معتمد قول کے مطابق مصافحہ کے ساتھ عید کی مبارک باد سنت ہے، بشرطیکہ جنس متحد ہو، پس مرد کا عورت سے مصافحہ کرنا اور عورت کا مرد سے مصافحہ کرنا، درست نہیں، اور یہی حکم بے ریش خوبصورت لڑکے کا بھی ہے، اور عید کی مبارک باد کا جواب "**تقبل اللّٰہ منکم**

أحيا كم الله ''یا اس کے مثل'' **كل عام و أنتم بخير** ''وغیرہ جیسے الفاظ سے دینا سنت ہے (حاشية الشروانی)**

پیچھے ''**تقبل الله منا و منكم**'' کے دعاء ہونے اور مصافحہ ودعاء کو جمع کرنے کا ذکر گزر چکا ہے۔

مذکورہ کتاب میں ہی ایک مقام پر ہے کہ:

وتسن المصافحة هنا أيضا انتهى وهو قريب لأن فيها جبرا لأهل الميت وكسر السورة الحزن بل هذا أولى من المصافحة فى العيد ونحوه (حاشية الشروانی، علىٰ تحفة المحتاج فی شرح المنهاج، ج۳، ص ۱۷۶، كتاب الجنائز، فصل فی الدفن وما يتبعه)

ترجمہ: اور یہاں پر بھی (یعنی تعزیت کے موقع پر) مصافحہ سنت ہے، کیونکہ اس میں میت والوں کی تسلی اور غم کو ہلکا کرنے کا سامان موجود ہے، بلکہ عید وغیرہ کے موقع پر مصافحہ کے مقابلہ میں اس موقع پر مصافحہ کرنا، زیادہ بہتر ہے (حاشية الشروانی)

فقہائے شافعیہ کے دیگر حوالہ جات

شافعیہ کی اور بھی کئی کتب میں اس طرح کا حکم مذکور ہے۔ [1]

---

[1] ويدعو له بما يناسب وتسن المصافحة هنا أيضا لأن فيها جبرا لأهل الميت وكسرا لسورة الحزن أى شدته بل هذا أولى من المصافحة فى العيد (حاشية البجيرمی علىٰ شرح المنهج، ج ۱، ص ۴۹۹، كتاب الجنائز، فصل فی دفن الميت)

وقوله تقبل الله منا ومنك أى ونحو ذلك مما جرت به العادة فى التهنئة ومنه المصافحة ويؤخذ من قوله فى يوم العيد أنها لا تطلب فى أيام التشريق وما بعد يوم عيد الفطر لكن جرت عادة الناس بالتهنئة فى هذه الأيام ولا مانع منه لأن المقصود منه التودد وإظهار السرور ويؤخذ من قوله أيضا فى يوم العيد أن وقت التهنئة يدخل بالفجر لا بليلة العيد خلافا لما ببعض الهوامش اهـ .ع ش عليه.

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

مذکورہ عبارات سے معلوم ہوا کہ شافعیہ کے نزدیک عیدین کی مبارک باد دیتے وقت، مصافحہ کرنا، نہ صرف یہ کہ جائز ہے، بلکہ مستحب ہے، اوراس کی وجہ، دوسرے مسلمان سے محبت اور سرور وخوشی کا اظہار ہے، اور پہلے مستقل فصل میں گزر چکا ہے کہ عید کے دن اظہارِ سرور، نہ صرف یہ کہ جائز ہے، بلکہ بطورِ خاص عید کے ایام میں بعض امور میں زیادہ توسع ہے، یہاں تک کہ بہت سے حضرات نے عید کے دن، اظہارِ سرور کو دین کا شعار تک بھی قرار دیا ہے۔

اور جب کسی زمانے میں مصافحہ کے ذریعہ اظہارِ سرور کی عادت کو جائز، بلکہ مستحب رکھا گیا، تو کسی دوسرے زمانے میں معانقہ کی عادت کے ذریعہ سے بھی اظہارِ سرور کو جائز رکھا جانا چاہئے۔

نیز مذکورہ عبارات سے یہ بھی معلوم ہوا کہ سال اور مہینے کے شروع میں بھی مبارک باد دینے کی اجازت ہے، کیونکہ یہ خوشی کے مواقع ہیں، اسی طرح نکاح کی مبارک باد کا موقع بھی خوشی کا موقع ہے، اس اعتبار سے نکاح کے موقع پر بھی گنجائش ہوگی۔

اور مذکورہ عبارت سے تعزیت کے موقع پر بھی اظہارِ ہمدردی وازالۂ غم کے طور پر مصافحہ و معانقہ کی اجازت نکل آئی۔

”حاشیۃُ الروض المربع“ کا حوالہ

عبدالرحمٰن بن محمد بن قاسم حنبلی نجدی ”حاشیۃُ الروض المربع“ میں فرماتے ہیں:

یقول لغیرہ بعد الفراغ من الخطبۃ، تقبل اللہ منا ومنک، وأحالہ اللہ علینا وعلیک، ونحو ذلک وکالجواب لمن قال لہ ذلک

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

وعبارۃ البرماوی والتھنئۃ بالأعیاد والشھور والأعوام مستحبۃ ویستأنس لھا بطلب سجود الشکر عند حدوث نعمۃ وبقصۃ کعب وصاحبیہ حین بشر بقبول توبتہ لما تخلف عن غزوۃ تبوک وتھنئۃ أبی طلحۃ لہ وتسن الإجابۃ فیھا بنحو تقبل اللہ منکم أحیاکم اللہ لأمثالہ کل عام وأنتم بخیر (حاشیۃ الجمل علی شرح المنہج، ج۲، ص ۱۰۵، کتاب الصلاۃ، باب فی صلاۃ العیدین وما یتعلق بھا)

أن يقول له: تقبل الله منا ومنک، أو حاله الله علينا وعليک، وغير ذلک، مما جرت العادة به، ومنه المصافحة إن اتحد الجنس، لا أمرد (حاشية الروض المربع شرح زاد المستقنع، ج۲، ص ۵۲۲، كتاب الصلاة، باب صلاة العيدين)

ترجمہ: عید کی نماز کے خطبہ کے بعد دوسرے کو یہ کہے کہ ''**تقبل اللّٰه منا ومنک، وأحاله اللّٰه علينا وعليک**'' یا اس جیسے دوسرے الفاظ کہے، اور جس کو یہ الفاظ کہے جائیں، وہ اس کے جواب میں یہی کہے کہ ''**تقبل اللّٰه منا ومنک، أو حاله اللّٰه علينا وعليک**'' یا اس کے علاوہ دوسرے وہ الفاظ کہے، جو وہاں کی عادت کے مطابق رائج ہوں (مثلاً ''عید مبارک'') اور اسی (عید کی مبارک باد کے) قبیل سے مصافحہ کرنا بھی ہے، اگر جنس متحد ہو، اَمرد سے مصافحہ نہ کیا جائے (حاشية الروض المربع)

مطلب یہ ہے کہ عید کی نماز کے بعد ایک دوسرے کو مبارک باد دینا اور اس موقع پر ایک دوسرے سے مصافحہ کرنا، مندوب ہے، اور ''**تقبل اللّٰه**'' کے دعاء ہونے پر کلام پہلے گزر چکا ہے۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا حوالہ

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ موطا امام مالک کی شرح ''المسوّی'' میں امام نووی رحمہ اللہ کی فجر اور عصر کے بعد مصافحہ کے جائز ہونے کی عبارت نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

أقول: وهكذا ينبغي أن يقال في المصافحة يوم العيد (المسوّى شرح المؤطا، ج۲، ص ۳۹۳، باب يستحب المصافحة والهدية، مطبوعة: دار الكتب العلمية، بيروت، لبنان، الطبعة الاولىٰ، 1983ء)

ترجمہ: میں کہتا ہوں کہ اسی طریقہ سے مناسب ہے کہ عید کے دن مصافحہ کے

بارے میں بھی کہا جائے (کہ اس میں بھی حرج نہیں) (مسویٰ)

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، عید کے دن مصافحہ کو مباح قرار دیتے ہیں، جس کی تصریح فقہائے شافعیہ کے علاوہ، بعض فقہائے حنفیہ کی عبارات میں بھی گزر چکی ہے۔

''السعاية'' کا حوالہ

علامہ عبدالحئی لکھنوی ''شرحُ الوقاية'' کی شرح ''السعاية'' میں فرماتے ہیں کہ:

اقول انهم قد اتفقوا على ان هذه المصافحة ليس له اصل فى الشرع ثم اختلفوا فى الكراهة والاباحة والأمراذاداربين الكراهة والاباحة ينبغى الافتاء بالمنع لان دفع مضرةٍ اولى من جلب منفعةٍ فكيف لا يكون اولى من فعل امرٍ مباحٍ على ان المصافحين فى زماننا يظنونه امرًا حسنًا ويشنعون على مانعهٖ تشنيعًا بليغًا ويصرون عليه اصرارًاشديدًا وقد مران الاصرارعلى المندوب يبلغه الى حد الكراهة فكيف اصرار البدعةالتى لااصل لها فى الشرع وعلى هذافلا شک فى الكراهة وهذاهوغرض من افتى بالكراهة مع ان الكراهة انما نقلها من نقلها من عبارات المتقدمين والمحققين ، فلايوازيها روايات مثل صاحب مجمع البركات والسراج المنير ومطالب المؤمنين فان تساهل مصنفيها فى تحقق الروايات امرمشروع وجمعهم كل رطبٍ ويابسٍ معلوم عند الجمهور (السعاية فى كشف ما فى شرح الوقاية،جلد٢ صفحه ٢٦٥،باب صفة الصلاة،قبيل فصل فى القراء ة، الناشر: المطبع المصطفائى، ١٣٠٦هـ)

ترجمہ: میں کہتا ہوں کہ فقہاء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اس (نماز کے بعد)

مصافحہ کی شریعت میں کوئی اصل اور بنیاد نہیں ہے، پھر اُن کا اس مصافحہ کے مکروہ اور مباح ہونے میں اختلاف ہے، اور معاملہ کراہت اور اباحت کے درمیان دائر ہے، تو اس کے ممنوع ہونے کا فتویٰ دینا مناسب ہے، کیونکہ مضرت کو دُور کرنا اولیٰ ہے منفعت کو حاصل کرنے سے، پس مباح کام کرنے سے اولیٰ کیونکر نہیں ہوگا باوجودیکہ ہمارے زمانے میں یہ مصافحہ کرنے والے اس مصافحہ کو اچھا کام سمجھتے ہیں اور اس کے منع کرنے والے پر سخت طعن وتشنیع کرتے ہیں اور اس پر سخت اصرار کرتے ہیں اور یہ بات گزر چکی ہے کہ مندوب ومستحب کام پر اصرار کرنا اسے مکروہ کی حد تک پہنچا دیتا ہے، پس ایسی بدعت پر اصرار کرنا کیونکر درست ہوگا جس کی شریعت میں کوئی اصل نہیں اور اس کی وجہ سے اس کے مکروہ ہونے میں کوئی شک نہیں اور یہی مکروہ ہونے کا فتویٰ دینے والوں کی غرض ہے، باوجودیکہ اس مصافحہ کے مکروہ ہونے کو جس نے بھی نقل کیا ہے، اس نے متقدمین اور محققین کی عبارات کے حوالے سے نقل کیا ہے، تو صاحبِ مجمع البرکات اور سراجِ منیر اور مطالبِ مؤمنین کی روایات اس کا مقابلہ نہیں کرسکتیں اس لیے کہ ان کتابوں کے مصنفین کا روایات کی تحقیق میں تساہل اختیار کرنا ایک مشہور معاملہ ہے اور ان کا ہر رطب ویابس کا جمع کرنا جمہور کے نزدیک مشہور ہے (السعایة)

علامہ لکھنوی نے مذکورہ عبارت میں نماز، یا مخصوص نمازوں کے بعد مصافحہ کی تردید کی ہے۔
لیکن عید کے بعد مصافحہ ومعانقہ کو علامہ لکھنوی نے اپنے ایک فتوے میں خلافِ اولیٰ قرار دیا ہے، جیسا کہ آگے آتا ہے۔

مجموعہ فتاویٰ عبدالحئ کا حوالہ

علامہ عبدالحئ لکھنوی اپنے فتاویٰ میں ایک مقام پر فرماتے ہیں کہ:

مصافحہ اور معانقہ کا وقت، ابتدائے ملاقات ہے، پس عید کی نماز کے بعد مصافحہ اور معانقہ مسنون نہیں، اور علماء اس باب میں مختلف ہیں، بعض بدعتِ مباحہ کہتے ہیں، اور بعض ہر حال میں بدعتِ مکروہہ کہتے ہیں، اس کا ترک اولیٰ ہے (مجموعہ فتاویٰ عبدالحیٔ، ج ۲، ص ۲۰۱، ۲۰۲، کتاب الحظر والاباحۃ، مطبوعہ: ایچ ایم سعید کمپنی، کراچی، 1404ہجری)

علامہ لکھنوی کے مذکورہ فتوے سے معلوم ہوا کہ عید کی نماز کے بعد مصافحہ ومعانقہ میں اختلاف ہے، اور اس کا کرنا، گناہ نہیں، البتہ نہ کرنا بہتر ہے۔

علامہ لکھنوی نے اپنے مذکورہ فتوے میں بدعتِ مکروہہ ومباحہ میں اختلاف ہونے کی وجہ سے، اس کے ترک کو اولیٰ قرار دیا ہے، جب کہ اصل یہ اختلاف، خاص عید کی نماز کے بجائے، عام نمازوں، یا فجر وعصر وغیرہ کے بعد مصافحہ سے متعلق ہے، جس میں بعض حضرات نے جمعہ کی نماز کو بھی شامل کرنے کی تصریح کی ہے، اور جمعہ کی نماز کو عید کی نماز کے ساتھ مشابہت حاصل ہے، جبکہ ''السعایۃ'' کی عبارت کا تقاضا یہ ہے کہ عید کی نماز کے بعد بھی مصافحہ ممنوع ہو، اور عید کی نماز کے بعد بھی وہی کراہت واباحت والا قاعدہ جاری ہو، جو ''السعایۃ'' میں انہوں نے ذکر فرمایا، ورنہ دونوں میں فرق کی کوئی وجہ نہیں، یا پھر ''مجموعہ فتاویٰ عبدالحیٔ'' کے فتوے کو بعد کا قرار دیا جائے، جس وقت اس مسئلہ میں اختلافِ واقعی کا ہونا، علامہ لکھنوی کے سامنے متحقق ہو گیا تھا، یا پھر ضروری وغیر ضروری سمجھنے کے اعتبار سے فرق کیا جائے۔

اور اگر اس جہت سے فرق کیا جائے کہ عید کا دن خاص اظہارِ سرور وخوشی کا دن ہے، اور اس دن میں دوسرے دنوں کے مقابلہ میں خاص توسع ہے، اور مبارک باد دیتے ہوئے مصافحہ و معانقہ اسی چیز کا ذریعہ ہے، تو الگ بات ہے۔

بہر حال علامہ لکھنوی کے فتوے سے معلوم ہوا کہ عید کے دن مصافحہ ومعانقہ زیادہ سے زیادہ خلافِ اولیٰ ہے، گناہ نہیں، اس لیے اس پر تشدد اور نکیر کرنا، درست نہیں۔

فتاویٰ رشیدیہ کا حوالہ

فتاویٰ رشیدیہ میں ہے کہ:

عیدین میں معانقہ کرنا بدعت ہے (فتاویٰ رشیدیہ، ص۱۵۷، کتاب العلم، مطبوعہ: علمی مجلس تحفظِ اسلام، کراچی)

فتاویٰ رشیدیہ میں ایک اور مقام پر ہے کہ:

معانقہ ومصافحہ بوجہ تخصیص کے اس روز میں اس کو موجبِ سرور اور باعثِ مودت (یعنی خوشی ومحبت کا ذریعہ) اور ایام سے زیادہ مثل ضروری کے جانتے ہیں، بدعت ہے اور مکروہ تحریمی ہے اور علی الاطلاق (بوقتِ ملاقات) ہر روز مصافحہ کرنا سنت ہے، ایسا ہی بشرائطِ خود (یعنی ملاقات کے پائے جانے پر) یومُ العید کے ہے اور علیٰ ہذا معانقہ، جیسا بشرائطِ خود (یعنی سفر سے آمد پر) دیگر ایام میں ہے، ویسا ہی یومِ عید کے ہے، کوئی تخصیص اپنی رائے سے کرنا بدعتِ ضلالہ ہے (فتاویٰ رشیدیہ، ص۱۵۷، کتاب العلم، مطبوعہ: علمی مجلس تحفظِ اسلام، کراچی)

اس سے معلوم ہوا کہ مولانا گنگوہی کی رائے کے مطابق، عید کے دن، معانقہ ومصافحہ کو دوسرے دنوں کے مقابلہ میں زیادہ باعثِ سرور ومحبت کے ضروری کی طرح جاننا، بدعت ہے۔

لیکن پہلے باحوالہ ذکر کیا جاچکا ہے کہ عید کے دن خاص اظہارِ سرور ومودّت، مباح درجہ میں جائز ہے، بلکہ شعارِ دین ہے، تو اگر لوگ اس کو بذاتِ خود شرعی فرض، یا واجب نہ سمجھیں، البتہ اپنی عادت ورواج میں اس کو اظہارِ سرور کا ذریعہ سمجھیں، تو اس میں حرج نہیں۔

اور ہم نے جہاں تک غور کیا، عوام اور خواص، اس کو فرض، یا واجب نہیں سمجھتے، البتہ اپنی حسبِ عادت ورواج، اس کو اظہارِ سرور وبشاشت کا ذریعہ سمجھتے ہیں، جس میں کوئی قباحت نہیں۔

عوام کو اسی حقیقت سے آگاہ کرنے کی ضرورت ہے، اور اس کے بجائے اس پر بدعت کا حکم

لگانا، عوام میں تشویش کا باعث بنتا ہے، بالخصوص جبکہ مصافحہ کی عظیم الشان فضیلت، احادیث سے ثابت ہو، اور معانقہ، سفر کے علاوہ دوسرے مواقع پر بھی ثابت ہو، اور خود اس مسئلہ میں فقہائے کرام کی آراء مختلف ہوں، تو اندریں حالات، اس میں سختی وتشدد مناسب معلوم نہ ہوا۔

امداد الفتاویٰ کا حوالہ

حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی کے امداد الفتاویٰ میں ہے کہ:

قاعدہ کلیہ ہے کہ عبادات میں حضرت شارع علیہ السلام نے جو ہیئت وکیفیت معین فرمادی ہے، اس میں تغیر وتبدل جائز نہیں اور مصافحہ چونکہ سنت ہے، اس لئے عبادات میں سے ہے، تو حسبِ قاعدہ مذکورہ اس میں ھیئت وکیفیتِ منقولہ سے تجاوز جائز نہ ہوگا، اور شارع علیہ السلام سے صرف اولِ لقاء کے وقت بالاجماع، یا وِداع کے وقت بھی علی الاختلاف منقول ہے، وبس، اب اس کے لئے ان دو وقتوں کے سوا اور کوئی محل وموقع تجویز کرنا تغییرِ عبادت کرنا ہے، جو ممنوع ہے، لہٰذا مصافحہ بعد عیدین، یا بعد نماز پنج گانہ مکروہ وبدعت ہے، شامی میں اس کی تصریح موجود ہے (امداد الفتاویٰ، ج ا ص ۵۵۷، کتاب الصلاۃ، باب صلاۃ الجمعۃ والعیدین، ناشر: مکتبہ دارالعلوم کراچی، طبع جدید: شعبان ۱۴۳۱ھ، جولائی 2010)

آگے آتا ہے کہ مصافحہ، خالص عبادتِ مقصودہ نہیں، بلکہ اس میں معاشرت کا پہلو بھی موجود ہے، اس کے باہمی محبت ومودّت کا ذریعہ ہونے کی وجہ سے، اس پر اجر وثواب کو مرتب کیا گیا ہے، لہٰذا اگر کسی خاص جگہ بطورِ عادت کے اس کو اختیار کیا جائے، اور پھر محبت ومودّت اور بشاشت کا ذریعہ ہونے کی وجہ سے اس کو اجر وثواب کا ذریعہ سمجھا جائے، تو یہ مستحب لغیرہٖ ہوسکتا ہے، متعدد فقہائے حنفیہ نے بھی ملاقات، یا سفر وغیرہ کی قید کے بغیر مبارک باد کے موقع پر اس کو جائز، بلکہ مستحب قرار دیا ہے، اور کئی فقہاء نے بعد نماز، مصافحہ کو مباح قرار دیا

ہے، اور بعض نے تو نماز کو غیبوبت کا حکم حاصل ہونے کی وجہ سے اس کو سنت ومستحب قرار دیا ہے، جس سے خود اس مسئلہ کا مجتہد فیہ ومختلف فیہ ہونا ظاہر ہوتا ہے۔

امدادُ الفتاویٰ میں ہی ایک مقام پر فارسی زبان میں ہے:

مصافحہ کردن مطلقاً سنت است بوقتے خاص مخصوص نیست، پس تخصیصِ آں بروز جمعہ وعیدین وبعد نماز پنجگانہ وتراویح بے اصل است؛ ہاں اگر درہمیں اوقات بکسے بعد مدتے ملاقات شود باو مصافحہ کردن مضائقہ ندارد؛ نہ ایں کہ از خانہ یا مسجد یا عیدگاہ ہمراہ آیند وپس از نماز مصافحہ ومعانقہ کنند (امدادالفتاویٰ، ج۵ص۲۶۸، ۲۶۹، کتاب البدعات، ناشر: مکتبہ دار العلوم کراچی، طبع جدید: شعبان ۱۴۳۱ھ، جولائی 2010)

ترجمہ: مصافحہ کرنا مطلق (ملاقات کی) سنت ہے، کسی خاص وقت (صبح، شام، یا کسی دن) کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، لہٰذا اسے جمعہ اور عیدین کے دنوں کے ساتھ اور نمازِ پنجگانہ اور تراویح کے بعد خاص کرنا، بے بنیاد ہے، البتہ اگر انہیں اوقات میں کسی کے ساتھ ایک مدت بعد ملاقات ہو، تو اس کے ساتھ مصافحہ کرنے میں حرج نہیں، نہ یہ کہ گھر سے، یا مسجد سے، یا عیدگاہ سے ایک ساتھ آئیں اور نماز کے بعد مصافحہ اور معانقہ کرنے لگ جائیں (امدادُ الفتاویٰ)

اور امدادُ الفتاویٰ میں ہی ایک مقام پر ہے کہ:

اگر اس مصافحہ کو جائز رکھ کر اس کے دوام کو بدعت کہتے، تو یہ شبہ صحیح تھا، خود اس مصافحہ کو بدعت کہتے ہیں، اس لیے کہ غیر محلِ مشروع میں ہے، کیونکہ اس کا محل اوّلِ لقاء ہے، اتفاقاً، یا وداع بھی ہے، اختلافاً، اور یہاں صرف صلاۃ کی وجہ سے کیا جاتا ہے، جو کہ غیر ہے محلِ مشروع کا، اس لیے بدعت ہے......البتہ اگر مصافحہ بعد الصلاۃ ثابت ہوتا، اور پھر اس کے دوام کو منع کیا جاتا، تو وجہ فرق پوچھنا صحیح ہوتا اور اگر علاوہ مصافحہ کے یہی فرق ایسے اعمال میں پوچھا جاوے، جن کی اصل

ثابت ہے، تو وہاں یہ جواب ہوگا کہ دوام کو منع نہیں کیا جاتا، بلکہ التزامِ اعتقادی، یا عملی کو منع کیا جاتا ہے، التزامِ اعتقادی یہ کہ اس کو ضروری سمجھیں اور التزامی عملی یہ کہ اس کے ترک پر ملامت کریں (امدادالفتاویٰ، ج۵ص۳۱۳، کتاب البدعات، ناشر: مکتبہ دارالعلوم کراچی، طبع جدید: شعبان ۱۴۳۱ھ، جولائی 2010)

حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی ایک مقام پر فرماتے ہیں کہ:

عیدین اور جمعہ میں جو لوگ محض رسم جان کر مصافحہ، یا معانقہ کیا کرتے ہیں، کہیں ثابت نہیں اور عیدین اور جمعہ کو کوئی دخل نہیں، اس لیے یہ رسم بدعت ہے، اس کو ترک کر دینا چاہیے (خطباتِ حکیم الامت، بعنوان ''حقوق وفرائض'' جلد۴ صفحہ ۴۳۱، وعظ ''حقوق المعاشرت'')

حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی ایک اور مقام پر فرماتے ہیں کہ:

''عید مبارک'' کہنا درست ہے، فقہاء نے لکھا ہے، باقی مصافحہ سوا اول ملاقات کے وقت تو اتفاقاً اور وداع کے وقت اختلافاً مشروع ہے، اور عید کا مصافحہ ان دونوں سے الگ ہے، اس لیے بدعت ہے اور معانقہ اور بھی قبیح؛ لوگوں کی پھر حالت ہے کہ نمازِ عید سے پیشتر تو باتیں کر رہے تھے، نماز ختم ہوئی اور مصافحہ کرنے لگے (حسن العزیز، حصہ سوم، مشمولہ: ملفوظاتِ حکیم الامت، ج۱۹ص۹۴، ملفوظات ۳۰ رمضان ۱۳۳۶ھ، مطبوعہ: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان، تاریخِ اشاعت: صفر المظفر ۱۴۲۵ھ)

پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ مذکورہ رائے فقہاء کے ایک قول کے مطابق ہے، جبکہ دوسرا قول، جواز یا استحباب لغیرہ کا ہے، اور اجتہادی وفروعی اختلافی مسائل میں زیادہ تشدد مناسب نہیں، اور اس پر بدعتِ حقیقی کا حکم لگانا بھی قواعدِ فقہ کی رو سے محلِّ نظر ہے۔

چنانچہ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ اپنے رسالہ ''الایتلاف فی حکم الاختلاف'' میں فرماتے ہیں کہ:

فصل ششم: اختلاف کی قسمِ ششم کے بیان میں

یعنی جو اختلاف ایسے امرِ دینی میں ہو، جو اصول میں سے ہے، اور سنت و بدعت کے درجہ میں ہے، اور اس اختلاف کا حکم بھی باستثناء احکامِ مخصوصہ بالکفار وہی ہے، جو اوپر فصلِ پنجم میں ذکر کیا گیا ہے۔......

فائدہ نمبر 1:...... بدعت سے مراد وہ بدعت ہے، جو باتفاقِ اہلِ حق بدعت ہو، اور جس میں اہلِ حق کے اجتہاد کی گنجائش ہو، وہ مثلِ مسائل مختلف فیہا کے ہے، جن کا حکم فصلِ سوم میں مذکور ہوا ہے (اجتہادی اختلاف اور باہمی تعصب، صفحہ ۱۱۵، مشمولہ: علمی وتحقیقی رسائل، جلد ۸، مطبوعہ: ادارہ غفران، راولپنڈی، دسمبر 2018 عیسوی)

اور "فصلِ سوم" کی اس سلسلے میں وہ عبارت، جس کا حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے اوپر حوالہ ذکر فرمایا ہے، درجِ ذیل ہے:

فصلِ سوم: اختلاف کی قسمِ سوم کے بیان میں

یعنی جو اختلاف ایسے امرِ دینی میں ہو، جو فروع میں سے ہے، اور دلیل سے ہو، خواہ دلیل نص ہو، یا اپنا اجتہاد ہو، یا اپنے کسی متبوع صالح للمتبوعية (یعنی ایسے مجتہد و محقق، یا مفتی) کا اجتہاد یا فتویٰ ہو (جو اتباع وتقلید کی صلاحیت واہلیت رکھتا ہو)

اور یہی ہے وہ اختلاف، جو امتِ مرحومہ کی جماعتِ حقہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک سے اس وقت چلا آ رہا ہے۔

اور مبنیٰ اس اختلاف کا اسبابِ متعددہ ہیں، جو کتبِ اصول وتصانیفِ حضرت شاہ ولی اللہ ورسالہ رفع الكلام لابنِ تيمية وغیرہا میں مدون ہیں (اجتہادی اختلاف اور باہمی تعصب، صفحہ ۱۰۸، مشمولہ: علمی وتحقیقی رسائل، جلد ۸، مطبوعہ: ادارہ غفران، راولپنڈی، دسمبر 2018 عیسوی)

رہا یہ شبہ کہ خود مولانا اشرف علی تھانوی صاحب رحمہ اللہ نے اس مسئلہ کے اجتہادی و مختلف فیہ ہونے کے باوجود، اس پر بدعت کا حکم کیوں لگایا اور اس میں سختی و تشدد سے کیوں کام لیا؟

تو اس کا جواب یہ دیا جانا ممکن ہے کہ حضرت موصوف کے علم میں اس مسئلہ کا اجتہادی و اختلافی ہونا ظاہر نہ ہوا ہو، جس کی بے شمار مثالیں، فقہائے کرام کے اقوال میں ملتی ہیں، جس میں نہ کسی کی تنقیص لازم آتی، اور نہ ہی اس کی وجہ سے، اس کا عاصی و گناہ گار ہونا لازم آتا۔

لقول اللّٰہ تعالیٰ: "لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا"

امدادُ المفتین کا حوالہ

مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کے فتاویٰ میں ہے کہ:

عید کے بعد کا مصافحہ و معانقہ اور اسی طرح سویّاں اور دودھ وغیرہ، اگر ایسے التزام سے کیا جاوے، جیسے واجبات اور شعائرِ اسلام ادا کیے جاتے ہیں، تو بے شک یہ بھی ایسا ہی ناپسندیدہ ہے، جیسے شبِ برائت کا حلوا، اور جہاں یہ التزام نہ ہو، تو فی نفسہٖ مضائقہ نہیں (امداد المفتین جامع، ج۱،ص۶۲۱، فصل فی البدعات التی یتعلق بالأذان و الصلاۃ و الدعاء، مطبوعہ: ادارۃُ المعارف کراچی، طبع 2018ء)

مذکورہ کتاب میں ہی ایک اور سوال کے جواب میں ہے کہ:

آج کل جو رسمِ معانقہ و مصافحہ بعد العیدین جاری ہے، جس کو لوگوں نے ایسا بنالیا ہے کہ گویا افعالِ عید اور اس کی سنن میں داخل ہے، یہ بلاشبہ بدعت ناروا ہے، نہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے، اور نہ صحابۂ کرام کے جمِ غفیر میں کسی سے منقول ہے، البتہ احیاناً و اتفاقاً کوئی کرے، اور رسم نہ بنائے، تو جائز ہے، اور اسی درجے میں بعض سلف سے بھی کوئی نقل ہو، تو ممکن ہے، لیکن آج کل یہ رسم بن چکی ہے، تو مناسب یہی ہے کہ عام لوگوں کے سامنے اس کو

بالکلیہ ترک کیا جائے (امداد المفتین جامع، ج ۱، ص ۶۲۱، ۶۲۲، فصل فی البدعات التی یتعلق بالأذان و الصلاۃ والدعاء، مطبوعہ: ادارۃ المعارف کراچی، طبع 2018ء)

مذکورہ فتاویٰ میں جو حکم بیان کیا گیا ہے، اس کے بارے میں پہلے ذکر کیا جا چکا ہے، اور آگے بھی آتا ہے کہ جو عمل لوگوں میں بطورِ عادت کے جاری ہو، بطورِ عبادت کے جاری نہ ہو، جیسا کہ بعض علاقوں میں عید کے موقعہ پر سویّاں بنانے، اور افطار کے موقع پر پکوڑوں کے استعمال کی اور بعض دوسرے علاقوں میں کسی دوسری چیز کے بنانے و استعمال کی عادت ہے، تو یہ اصل کے اعتبار سے مباح ہے، جس پر بدعت کا حکم لگانا محلِّ تأمل ہے، البتہ شبِ برائت کے حلوے کے پیچھے مخصوص عقیدہ کارفرما ہے، جس کا شرعاً ثبوت نہیں۔ فافترقا۔

عزیزُ الفتاویٰ کا حوالہ

دارُ العلوم دیوبند کے سابق مفتی، مولانا مفتی عزیزُ الرحمٰن صاحب کے ''عزیزُ الفتاویٰ'' میں ہے کہ:

نمازِ عیدین، یا دیگر نمازوں کے بعد تخصیص مصافحہ کی کرنا اور اسی وقتِ خاص میں اس کو سنت جاننا اور معمول بہ ٹھہرانا، بعض فقہاء نے منع لکھا ہے (عزیز الفتاویٰ، صفحہ ۱۴۷، کتاب السنۃ والبدعۃ، ناشر: دارالاشاعت، کراچی، طباعت: مئی 2001ء)

بعض فقہاء نے واقعی منع لکھا ہے، جس سے معلوم ہوا کہ بعض فقہاء نے منع نہیں لکھا، لہٰذا اگر کوئی، دوسرے فقہاء کی رائے کے مطابق عمل کرے، تو اس پر نکیر نہ کی جائے گی، جیسا کہ پہلے گزرا۔

کفایتُ المفتی کا حوالہ

کفایتُ المفتی میں ہے کہ:

عیدین میں معانقہ کرنا، یا عید کی تخصیص سمجھ کر کرنا، شرعی نہیں، بلکہ محض ایک رسم ہے

(کفایت المفتی ، جلدسوم صفحہ ۳۰۲، کتاب الصلاۃ، چھٹا باب نمازِ عیدین، ناشر: دارالاشاعت، کراچی، طباعت: 2001ء)

کفایتُ المفتی میں ایک اور مقام پر ہے کہ:

عیدین کی تخصیص سے بعد نمازِ عید، مصافحہ ومعانقہ کرنا بدعت ہے (کفایت المفتی، ج۹ص۴۴، کتاب الحظر والاباحۃ، ناشر: دارالاشاعت، کراچی، طباعت: 2001ء)

نیز کفایتُ المفتی میں ہی ایک مقام پر ہے کہ:

عیدین یا جمعہ کی تخصیص سے مصافحہ ومعانقہ کرنا کئی وجہ سے مکروہ اور بدعت ہے۔ اوّل یہ کہ بسا اوقات یہ تخصیص جہلا کے فسادِ اعتقاد کا باعث ہو جاتی ہے۔ دوم یہ کہ یہ طریقہ روافض کا تھا کہ بعد نماز مصافحہ کرتے تھے اور آج ہمارے زمانے میں علاوہ مشابہت بالروافض کے مشابہت بالہنود بھی ہے کہ وہ اپنی ہولی کے روز ایک دوسرے سے گلے ملتے ہیں۔ سوم یہ کہ مصافحہ کا مسنون وقت، وقتِ ملاقات ہے

(کفایت المفتی، ج۹ص۴۶، کتاب الحظر والاباحۃ، ناشر: دارالاشاعت، کراچی، طباعت: 2001ء)

دیگر اہلِ علم حضرات کی رائے، مذکورہ رائے کے برعکس ہے، جیسا کہ پہلے گزرا، اور آگے بھی آتا ہے۔

فتاویٰ محمودیہ کا حوالہ

فتاویٰ محمودیہ میں ہے کہ:

عیدین کی نماز کے بعد مصافحہ کا طریقہ مروَّجہ بدعت ہے، اس کا ثبوت نہیں ہے

(فتاویٰ محمودیہ، جلدسوم صفحہ ۱۴۶، باب البدعات والرسوم، فرائض اور عیدین کے بعد مصافحہ کا بیان، ناشر: جامعہ فاروقیہ کراچی)

اور ایک مقام پر ہے کہ:

بعض جگہ عید کے مصافحہ کرنے کا جو رواج ہے، یہ ٹھیک نہیں ہے؛ یہ بدعت اور مکروہ ہے (فتاویٰ محمودیہ، جلد سوم صفحہ ۱۴۶، باب البدعات والرسوم، فرائض اور عیدین کے بعد مصافحہ کا بیان، ناشر: جامعہ فاروقیہ کراچی)

اور ایک اور مقام پر ہے کہ:

عیدین کا معانقہ روافض کا شعار ہے، اس سے پورا پرہیز کیا جائے، دل میں کینہ اور حسد رکھتے ہوئے محض عید کو معانقہ کر لینے سے ہرگز سینہ صاف نہیں ہوگا (فتاویٰ محمودیہ، جلد سوم صفحہ ۱۴۸، باب البدعات والرسوم، فرائض اور عیدین کے بعد مصافحہ کا بیان، ناشر: جامعہ فاروقیہ کراچی)

اور ایک مقام پر ہے کہ:

عید کا مصافحہ ومعانقہ بدعت ہے (فتاویٰ محمودیہ، جلد ہشتم صفحہ ۴۶۴، کتاب الصلاۃ، باب العیدین، ناشر: جامعہ فاروقیہ کراچی)

احسنُ الفتاویٰ کا حوالہ

احسنُ الفتاویٰ میں ہے کہ:

اصل تحیۃُ اللقاء تو صرف سلام سے اداء ہو جاتا ہے، اور تمامُ التحیہ سلام کے بعد مزید اظہارِ مسرت ومودّت سے، جس کے دو طریقے علیٰ سبیل البدل مشروع ہیں، عام حالات میں مصافحہ اور کسی محرِّک خصوص کے وقت معانقہ، اظہارِ محبت کے ان دو طریقوں میں سے کسی ایک کو تمامُ التحیہ بھی بنایا جاسکتا ہے، اور موقع تحیہ سے الگ مستقل بھی، تحیہ میں دونوں کو جمع کرنے کا واضح ثبوت نہ ملنے کی وجہ سے، یہ خلافِ سنت معلوم ہوتا ہے، البتہ مستقلاً یعنی غیر تحیہ کے موقع پر جمع کرنے میں کوئی

اشکال نہیں، اس کے لئے ثبوت کی حاجت نہیں، **والفرق ان الاول من الموارد الشرعیة دون الثانی** (احسنُ الفتاویٰ، جلد۸، صفحہ۴۱۰، و۴۱۱، کتاب الحظر والاباحۃ، مصافحہ ومعانقہ، مطبوعہ: ایچ ایم سعید کمپنی، کراچی، طبع چہارم: ۱۴۲۵ھ)

احسنُ الفتاویٰ میں ہی ہے کہ:

یہ طریقہ اختیار کرنا بدعت اور مکروہ ہے۔

یہ ممانعت فوراً بعد نماز کے لیے ہے، کیونکہ یہ فعل شارع علیہ السلام سے ثابت نہیں۔

معانقہ بھی اس میں شامل ہے، یعنی نماز کے بعد فوراً معانقہ بھی جائز نہیں، ویسے عید کے دن بوقتِ ملاقات مصافحہ ومعانقہ درست ہے۔

وموضع المصافحة فی الشرع انما هی عند لقاء المسلم لأخیه لا فی ادبار الصلوات (شامیہ، ج۵، ص ۲۷۰)

بدعت، یا کسی گناہ کا ارتکاب کسی مصلحت کے پیشِ نظر کسی مصلحت کے تحت ہرگز جائز نہیں، البتہ دوسروں کو منع کرنا اس وقت ضروری ہے، جبکہ قبول کی اُمید ہو، ورنہ نہی عن المنکر ضروری نہیں؛ غرضیکہ خود نمازِ عید کے بعد کسی سے معانقہ ومصافحہ نہ کرے، ہاں اگر کسی سے ملاقات ہی بعد نماز کے ہوئی ہو، تو اس سے جائز ہے، مگر تشبہ بالبدعة اور اس کی تائید کا ذریعہ ہونے سے، اس سے بھی اجتناب کرنا چاہیے (احسن الفتاویٰ جلد ا صفحہ ۳۵۴، کتاب الایمان والعقائد، باب ردِّ البدعات، بعنوان: نمازِ عید کے مصافحہ ومعانقہ، مطبوعہ: ایچ ایم سعید کمپنی، طبع 1425 ہجری)

مذکورہ فتاویٰ جات وعبارات میں جو حکم بیان کیا گیا ہے، وہ ایک خاص فقہی قول کے مطابق ہے، جس کی رُو سے نمازوں کے بعد مصافحہ کو بدعتِ مکروہہ ٹھہرایا گیا ہے، اور عام طور پر ''ردّ المحتار'' کی ایک عبارت کے پیشِ نظر، مذکورہ حکم بیان کیا گیا ہے۔

جبکہ ہم اس کے بدعتِ مباحہ ہونے اور اس مسئلہ کے مجتہد فیہ اور مختلف فیہ ہونے اور اس طرح کے مسائل میں تشدد ونکیر کے طریقہ کے نامناسب ہونے، نیز عید کے موقع پر مبارک باد دیتے وقت، مصافحہ ومعانقہ کے الگ مسئلہ ہونے کی تصریحات، پہلے ذکر کر چکے ہیں۔

فتاویٰ مفتی محمود کا حوالہ

فتاویٰ مفتی محمود میں ہے کہ:

واضح رہے کہ مصافحہ اور معانقہ، ابتدائے ملاقات کے وقت مسنون ہے، اور وداع کے وقت میں مختلف فیہ ہے۔

لہٰذا بعد از نمازِ عید مسنون تو ہرگز نہیں ہے، کیونکہ اس کا ثبوت حضورِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں ہے، ہاں بعض علماء اس کو بدعتِ مباحہ کہتے ہیں، اور بعض علماء اس کو بدعتِ مکروہہ کہتے ہیں، اور مولانا عبدالحیٔ صاحب اپنے فتاویٰ کے جلد 2 کے صفحہ 45 پر فرماتے ہیں "علٰی کل تقدیرٍ، ترک اس کا اولیٰ ہے"۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ اگر عید کے بعد مصافحہ کرنے کو عوام، دین کا ایک ضروری کام، یا مسنون جانتے ہوں، یا ہوتے ہوتے اس کا اندیشہ ہو، تب تو بدعتِ مکروہ ہے اور اس سے اجتناب ضروری ہے۔

اور اگر عوام دین کا ایک ضروری کام سمجھ کر نہ کرتے ہوں اور نہ اس کو مسنون جان کر کرتے ہوں، بلکہ ویسے ہی خوشی کے دن مزید مسرت اور مابین الفت ومودت پیدا کرنے کی خاطر کرتے ہوں، تب یہ عمل بدعتِ مباحہ شمار ہوگا، اور رحمتِ ایزدی سے امید ہے کہ تب مؤاخذہ نہ فرمائیں گے، کیونکہ بدعت شنیعہ کی تعریف میں یہ داخل نہیں ہوتا۔ جیسا کہ علامہ شامی اور صاحبِ درمختار عید کے دن عید مبارک باد کے کلمہ کے استعمال کو جائز قرار دیتے ہیں............ ایسے معمولی مسائل

---

[1] مولانا لکھنوی کا یہ فتویٰ پہلے گزر چکا ہے۔ محمد رضوان۔

کے سبب نزاع وفساد پیدا کرنا، اور مسلمانوں کے اتحاد کو پارہ پارہ کرنا حرام ہے، نزاع اور فساد پیدا کرنے والے، مصافحہ کرنے والوں سے زیادہ مستحق ملامت ہے، مسلمانوں کو چاہیئے کہ اس قسم کے مسائل پیدا کر کے مسلمانوں میں افتراق پیدا کرنے والوں سے بچیں (فتاویٰ مفتی محمود، جلد دوم صفحہ ۵۱۳و۵۱۴، باب فی احکام العیدین، مطبوعہ: اشتیاق اے مشتاق پریس، لاہور، مئی 2002)

یہ بات پہلے کئی مرتبہ گزر چکی ہے کہ معانقہ، سفر کے علاوہ بھی خوشی ومحبت کے موقع پر ثابت ہے، اور عید کے دن، اظہارِ سرور وبشاشت کی خاص اہمیت ہے، اور اسی غرض سے اگر لوگوں کی عادت ہو، تو اس پر نکیر کرنا درست نہیں، البتہ اسی کے ساتھ لوگوں کو اس مسئلہ کی حقیقت بتلانی چاہیئے کہ مصافحہ ومعانقہ، بذاتِ خود عید کی خاص سنت نہیں، البتہ مبارک بادی کا ایک ادب اور اظہارِ خوشی کا ایک ذریعہ ہونے کی وجہ سے جائز، اور اس مقصد سے مستحب لغیرہٖ میں داخل ہونے کی گنجائش رکھتا ہے۔

آپ کے مسائل اور ان کا حل کا حوالہ

مولانا محمد یوسف لدھیانوی صاحب کے فتاویٰ میں ہے کہ:

عیدین کا معانقہ کوئی دِینی، شرعی چیز تو ہے نہیں، محض اظہارِ خوشی کی ایک رسم ہے، اس کو سنت سمجھنا صحیح نہیں، اگر کوئی شخص اس کو کارِثواب سمجھے، تو بلاشبہ بدعت ہے، لیکن اگر کارِثواب، یا ضروری نہ سمجھا جائے، محض ایک مسلمان کی دِلجوئی کے لئے یہ رسم ادا کی جائے، تو اُمید ہے گناہ نہ ہوگا (آپ کے مسائل اور ان کا حل، ج۸ص۱۵۸، سلام ومصافحہ، عید کے روز معانقہ کرنا شرعاً کیسا ہے؟ مطبوعہ: مکتبہ لدھیانوی، کراچی، اضافہ وتخریج شدہ ایڈیشن: مئی 2011ء)

ایک اور مقام پر ہے کہ:

شرعاً اس کی کوئی اصل نہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے ثابت نہیں، اس لئے اس کو دین کی بات سمجھنا بدعت ہے، لوگ اس دن گلے ملنے کو ایسا ضروری سمجھتے ہیں کہ اگر کوئی اس رواج پر عمل نہ کرے، تو اس کو برا سمجھتے ہیں، اس لئے یہ رسم لائقِ ترک ہے (آپ کے مسائل اور ان کا حل ،ج۸ص۱۵۹،سلام ومصافحہ،عید کے روز مصافحہ اور معانقہ،مطبوعہ: مکتبہ لدھیانوی، کراچی، اضافہ وتخریج شدہ ایڈیشن: مئی 2011ء)

پہلے فتوے میں دلجوئی کی خاطر گنجائش دی گئی ہے، کیونکہ یہاں مقصد ایسا ہے، جس کی گنجائش پائی جاتی ہے، اور دوسرے فتوے میں اس کو خاص عید کی سنت، یا عید کا مخصوص عمل اور ضروری سمجھنے کی وجہ سے لائقِ ترک قرار دیا گیا ہے۔

فتاویٰ عثمانی کا حوالہ

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب ایک فتوے میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

دو مسلمانوں کی ملاقات کے وقت مصافحہ مسنون ہے، نیز کوئی شخص سفر سے آئے، تو اس سے معانقہ کرنا بھی سنت سے ثابت ہے، ان دونوں مواقع کے علاوہ سنت نہیں، لیکن اگر سنت سمجھے بغیر اتفاقاً کبھی کر لے، تو گناہ بھی نہیں، اور سنت سمجھ کر کرے، تو بدعت ہے۔ ہمارے زمانے میں چونکہ فرض نمازوں کے بعد مصافحہ اور عیدین کے بعد معانقہ کو سنت سمجھا جانے لگا ہے، حالانکہ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں، اس لئے علماء نے اس کو بدعت قرار دیا ہے اور اس سے بچنے کی تاکید فرمائی ہے، لیکن کہیں اعتقادِ سنت کی یہ علت نہ ہو، تو مباح ہے (فتاویٰ عثمانی، جلد۱ صفحہ۱۰۳،کتاب السنۃ والبدعۃ، ناشر: مکتبہ معارف القرآن، کراچی،طبع جدید: ربیع الثانی ۱۴۳۱ھ،اپریل2010ء)

متعدد فقہائے کرام وعلمائے عظام نے بھی اس کو عادت کے طور پر رائج ہونے کی وجہ سے مباح وجائز قرار دیا ہے، اور اس کے بطورِ عادت ہی جاری ہونے کی تصریح کی ہے، جیسا کہ گزرا، اور آگے بھی آتا ہے۔

فتاویٰ فریدیہ کا حوالہ

فتاویٰ فریدیہ میں ہے کہ:

کسی خاص نماز کے بعد مصافحہ کرنا مختلف فیہ ہے، امام نووی اور شمس حانوتی کے نزدیک ''**لابأس به**'' ہے، اور صاحبِ درِ مختار کا میلان بھی جواز کی طرف ہے، ابنِ حجر اور صاحبِ ملتقط کا میلان کراہیت کی طرف ہے، اور ابن الحاج المالکی نے اس کو بدعت کہا ہے''**والروايات كلها مسطورة في ردالمحتار ص ۳۳۶ جلد۵ فليراجع** ''پس احتیاط ترک میں ہے''**وهو الاقوىٰ من حيث الدليل** ''البتہ کرنے والے پر اشد انکار نہ کی جائے''**لوجود الرواية المبيحة**'' **فافهم** (فتاویٰ فریدیہ، ج۳ص۲۰۳، کتاب الصلاۃ، باب صلاۃ العیدین، بعنوان''عید کے دن مصافحہ کا حکم'' مطبوعہ: دار العلوم صدیقیہ، زروبی، صوابی، مارچ 2009ء)

فتاویٰ فریدیہ میں ہی ایک مقام پر ہے کہ:

(1) علامہ شامی نے ردالمحتار جلد خامس کے مذکورہ بالا صفحہ میں امام نووی اور شیخ ابو الحسن بکری اور شمس حانوتی وغیرہ سے اس مصافحہ (کسی خاص نماز کے بعد) کو جائز اور مباح لکھا ہے، اور صاحب درِ مختار علامہ حصکفی کا میلان بھی جواز کی طرف ہے، لہٰذا اس مسئلہ میں تشدد نہ کرنا چاہیئے، اور بہر حال نہ کرنا افضل ہے، **لان عند التعارض يرجح المحرم ولان العوام يعتقدون ان لها خصوصية زائدة على غيرها ان ظاهر كلامهم انه لم يفعلها احد من السلف**

فی هذه المواضع ۔

(2) جن فقہاء نے اس مصافحہ کو مکروہ اور بدعت کہا ہے، ان کے اقوال کی طرف مراجعت کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جب مصافحہ اولِ ملاقات کے وقت ہو، اور مصافحہ کرنے کے اوقات کے متعلق بنسبت باقی اوقات کے زیادہ خصوصیت اور زیادہ ثواب کا عقیدہ نہ ہو، تو اس مصافحہ میں کوئی حرج نہیں، کیونکہ تخصیص اعتقادی سے بچنا ضروری ہے، تخصیص عملی سے بچنا شرعاً اور عقلاً ناممکن ہے۔

(3) معانقہ کے متعلق فقہاء نے تصریح نہیں کی ہے، لیکن دلائلِ جانبین، اس میں جاری ہیں، لہٰذا مصافحہ اور معانقہ کا حکم یکساں ہوگا (فتاویٰ فریدیہ، ج۳ص۲۰۶، ۲۰۷، کتاب الصلاۃ، باب صلاۃ العیدین، بعنوان ''عید کے دن مصافحہ اور معانقہ سے منع کرنے میں تشدد زیبا نہیں''، مطبوعہ: دارالعلوم صدیقیہ، زروبی، صوابی، مارچ 2009ء)

مذکورہ عبارت میں تخصیصِ عملی سے بچنے کے ناممکن ہونے کا جو نکتہ ذکر کیا گیا، وہ خاص توجہ کا حامل ہے، چنانچہ ہمارے معاشرہ میں مثلاً روزہ افطار کرنے کے وقت پکوڑے ہونے، اور عید وغیرہ پر سویّوں میں تخصیص عملی ہے، اور مہمان کی آمد پر چائے، کولڈ ڈرنک سے ضیافت، تخصیصِ عملی ہے، اور بھی بے شمار تخصیصات موجود ہیں، ان پر بدعت ہونے کا حکم نہیں لگایا جاتا، البتہ کہیں عقیدے میں بگاڑ ہو، تو اس کی اصلاح ضروری ہے۔

فتاویٰ دارُالعلوم زکریا کا حوالہ

مولانا مفتی رضاء الحق صاحب کے ''فتاویٰ دارُالعلوم زکریا'' میں ایک سوال کے جواب میں ہے کہ:

اگر مصافحہ ومعانقۂ عیدین میں اظہارِ مسرت کا ذریعہ سمجھا جائے، تو اس کے لیے خوشی کے وقت مصافحہ ومعانقہ کا ثبوت کافی ہے، اور متعدد احادیث میں خوشی کے

وقت، مصافحہ ومعانقہ کا ثبوت ملتا ہے............

اگر عید کے دن مصافحہ ومعانقہ عید کی نماز کی وجہ سے کرتا ہو، تو نماز کے بعد مصافحہ ومعانقہ بدعت ہے، اور اگر عید کی خوشی کی وجہ سے ہو، جیسا کہ معمول ہے کہ نماز کے بعد ایک دو دن تک لوگ کرتے ہیں، تو پھر اگر سنت نہ سمجھے، تو خوشی کے اظہار کے لیے گنجائش ہے، لیکن لوگوں نے اس کو ایک رسم بنالیا ہے، لہٰذا اس کا ترک کرنا مناسب ہے (فتاویٰ دار العلوم زکریا، ج۲، ص۵۹۰ الی ۵۹۳، ملخصاً، کتاب الصلاۃ، باب ''نماز عید کا بیان''، مطبوعہ: زمزم پبلشرز، تاریخ اشاعت، نومبر 2008ء)

یہ بات پہلے گزر چکی ہے کہ مخصوص نمازوں کے بعد مصافحہ کے بدعتِ مکروہہ ومباحہ ہونے میں بھی اختلاف ہے، جس میں سختی مناسب نہیں، کیونکہ اجتہادی واختلافی مسئلہ پر عوام میں سختی درست نہیں ہوا کرتی، اور عید کے موقعہ پر مبارک باد دیتے ہوئے مصافحہ ومعانقہ کو اظہارِ بشاشت کا ذریعہ وطریقہ سمجھ کر اختیار کرنے کے مباح ہونے میں شبہ نہیں۔

تاہم اس کی تبلیغ کرنی چاہئے کہ عید کے دن مصافحہ ومعانقہ بذاتِ خود عید کی خاص سنت نہیں، بلکہ معانقہ، اظہارِ بشاشت کا ایک ذریعہ ہے، اور مصافحہ، مبارک بادی کی وجہ سے ہے، جو کہ جائز اور بعض جہات سے مستحب لغیرہٖ ہے۔

''اشرفُ التوضیح'' کا حوالہ

مولانا محمد زاہد صاحب (جامعہ اسلامیہ امدادیہ، فیصل آباد، پاکستان) ''اشرفُ التوضیح'' میں فرماتے ہیں کہ:

اگر اس کو عید کے شرعی آداب میں سے سمجھا جائے، تو ٹھیک نہیں ہے، اس لیے کہ کسی چیز کا شرعی ادب اس وقت بنتا ہے، جب کہ اس کی کوئی شرعی دلیل بھی موجود ہو، اور دلیلِ شرعی سے اس کا ثبوت نہیں ملتا کہ خاص عید کے ساتھ اس کا کوئی تعلق

ہو، ہاں البتہ اس ملاقات پر چونکہ خوشی ہوتی ہے، اس لیے معانقہ کرلیا جائے، تو کوئی حرج کی وجہ بھی نہیں بنی۔

کس ملاقات پر خوشی زیادہ ہوتی ہے، یہ امرِ عادی ہے، امرِ شرعی نہیں ہے، یعنی یہ فیصلہ کرنا شریعت کا کام نہیں ہے کہ کونسی ملاقات پر خوشی زیادہ ہوئی ہے، بعض اوقات ملاقات تو اتنی دیر سے نہیں ہوتی، البتہ خوشی کے موقع پر ملاقات ہورہی ہوتی ہے، اس لیے معانقہ کرلیا جاتا ہے، اس حیثیت سے اگر کرلیا جائے، تو کوئی حرج کی بات بھی نہیں ہے (اشرفُ التوضیح، ج۴ص۴۶۰، کتاب الآداب، باب المعانقۃ والمصافحۃ، مطبوعہ: مکتبۃُ العارفی، فیصل آباد، طبع اول: رجب ۱۴۳۴ ہجری)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی معانقہ کو خاص عید کے دن کا سنت ومستحب عمل نہ سمجھے، ویسے ہی محض خوشی کے طور پر کسی سے معانقہ کرے، تو اس کی گنجائش ہے، لہٰذا اس سلسلہ میں زیادہ سختی اور تشدد مناسب معلوم نہیں ہوتا۔

اور یہ بات ایک سے زیادہ مرتبہ گزر چکی ہے کہ عید کی مبارک باد دیتے ہوئے، اظہارِ سرور و بشاشت کا ذریعہ سمجھ کر، اس کو اختیار کیا جائے، تو پھر مستحب لغیرہٖ میں بھی داخل ہونے کی گنجائش ہے۔

''عونُ المعبود'' کا حوالہ

مسلکِ اہلِ حدیث کی مشہور کتاب ''عونُ المعبود'' میں ہے کہ:

قلت وكذا المصافحة والمعانقة بعد صلاة العيدين من البدع المذمومة المخالفة للشرع (عونُ المعبود، ج۱۴ ص۸۲، کتاب الادب، باب المصافحة)

ترجمہ: میں کہتا ہوں کہ اسی طرح سے عید کی نماز کے بعد مصافحہ اور معانقہ مذموم

بدعت ہے، جو شریعت کے مخالف ہے (عونُ المعبود)

علامہ احمد رضا خان بریلوی صاحب کا تفصیلی حوالہ

علامہ احمد رضا خان بریلوی صاحب نے ''**وِشاحُ الجید فی تحلیل معانقة العید**'' کے عنوان سے اس موضوع پر ایک مستقل رسالہ تالیف کیا ہے، جو فتاویٰ رضویہ کی آٹھویں جلد میں شاملِ اشاعت ہے، اس رسالہ میں علامہ موصوف نے عید کے معانقہ ومصافحہ کے جائز اور بعض جہات سے مستحب ہونے کے ثبوت پر مفصل کلام کیا ہے، اور اس ضمن میں بعض دلائل وشبہات پر بحث کی ہے۔

اس رسالہ کے چند اقتباسات نمبر شمار کے ساتھ ذیل میں ذکر کیے جاتے ہیں، اور ہر اقتباس کے ساتھ ''فتاویٰ رضویہ'' کا مکمل حوالہ بھی سہولت کی غرض سے درج کیا جاتا ہے۔

(1)...... احادیث میں معانقہ سفر و بے سفر، دونوں کا اثبات اور تخصیصِ سفر، تراشیدہ حضرات (فتاویٰ رضویہ، جلد۸، ص۶۰۳، باب العیدین، مطبوعہ: رضا فاؤنڈیشن، جامعہ نظامیہ رضویہ، لاہور، اشاعت: 1995ء)

اس سے معلوم ہوا کہ علامہ موصوف، معانقہ کو سفر کے ساتھ خاص نہیں سمجھتے، احادیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، اس طرح کی چند احادیث پہلے ہم بھی ذکر کر چکے ہیں۔

(2)...... کپڑوں کے اوپر سے معانقہ، بطور برّ وکرامت واظہارِ محبت، بے فسادِ نیت وموادِ شہوت، بالاجماع جائز، جس کے جواز پر احادیثِ کثیرہ وروایاتِ شہیرہ ناطق، اور تخصیصِ سفر کا دعویٰ محض بے دلیل، احادیثِ نبویہ وتصریحاتِ فقہیہ اس بارے میں بَروجہِ اطلاق وارد، اور قاعدہ شرعیہ ہے کہ مطلق کو اپنے اطلاق پر رکھنا واجب، اور بے مدرک شرعی تقیید وتخصیص مردود باطل، ورنہ نصوصِ شرعیہ سے امان اٹھ جائے، **کما لا یخفیٰ** (فتاویٰ رضویہ، جلد۸، ص۶۰۴، باب العیدین، مطبوعہ: رضا

فاؤنڈیشن، جامعہ نظامیہ رضویہ، لاہور، اشاعت: 1995ء)

علامہ موصوف نے مذکورہ حکم، چند احادیث اور فقہی عبارات کی روشنی میں بیان کیا ہے، جن سے یہ موقف ظاہر ہوتا ہے کہ معانقہ کا جواز سفر کے ساتھ خاص نہیں، اور متعلقہ شرائط کے ساتھ بعض دوسرے مواقع پر بھی جائز ہے۔

(3)...... اور کیونکر رَوا ہوگا کہ (کوئی) بے حالتِ سفر معانقہ کو مطلقاً ممنوع ٹھہرائے، حالانکہ احادیثِ کثیرہ میں سیدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے بارہا بے صورتِ مذکورہ بھی معانقہ فرمایا (فتاویٰ رضویہ، جلد۸، ص ۶۰۸، باب العیدین، مطبوعہ: رضا فاؤنڈیشن، جامعہ نظامیہ رضویہ، لاہور، اشاعت: 1995ء)

مطلب یہ ہے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سفر کے علاوہ بھی مختلف مواقع پر معانقہ کا ثبوت ملتا ہے، تو اس کے جواز کو سفر کے ساتھ خاص رکھ کر، غیر سفر کے مواقع پر معانقہ کو ممنوع قرار دینا، درست نہیں۔

(4)...... مولانا عبدالحئ لکھنوی صاحب کے ایک فتوے کے بارے میں، جس میں مولانا لکھنوی نے عیدین کے مصافحہ و معانقہ کے ترک کو اولیٰ قرار دیا ہے، علامہ احمد رضا خان صاحب بریلوی تحریر کرتے ہیں کہ:

سوم: مولوی صاحب (یعنی مولانا لکھنوی) نے اس فتویٰ میں معانقۂ عید کی نسبت، صرف اتنا حکم دیا ہے کہ ''ترک اس کا اولیٰ ہے'' اس سے ممانعت درکنار، اصلاً کراہت بھی ثابت نہیں ہوتی ''اَولیتِ ترک، نہ مشروعیت واباحت کے منافی، نہ کراہت کو مستلزم''۔

ردالمحتار میں ہے:

" والاقتصار على الفاتحة مسنون لا واجب فكان الضم خلاف الأولى وذلك لا ينافي المشروعية، والإباحة بمعنى عدم الإثم في الفعل

والترک“ (رد المحتار، ج ۱، ص ۱۱۵، کتاب الصلاۃ، باب صفۃ الصلاۃ)

اسی میں ہے:

”صرح فی البحر فی صلاۃ العید عند مسألۃ الأکل بأنہ لا یلزم من ترک المستحب ثبوت الکراھۃ إذ لا بد لھا من دلیل خاص اھـ وأشار إلی ذلک فی التحریر الأصولی، بأن خلاف الأولی ما لیس فیہ صیغۃ نھی کترک صلاۃ الضحی بخلاف المکروہ تنزیھا“ (رد المحتار، ج ۱، ص ۶۵۳، کتاب الصلاۃ، باب ما یفسد الصلاۃ وما یکرہ فیھا)

پھر اگر جناب کے نزدیک بھی حکم وہی ہے، جو مولوی صاحب (یعنی مولانا لکھنوی) نے اپنے فتویٰ میں لکھا، تو تصریح فرمادیجیے کہ عید کا معانقہ شرعاً ممنوع نہیں، نہ اس میں اصلاً کوئی حرج ہے، ہاں نہ کرنا بہتر ہے، کرلے، تو مضائقہ نہیں۔

چہارم: آپ نے جو عبارات ردالمحتار ومرقاۃ کی نقل فرمائیں، ان میں معانقۂ عید کی ممانعت کا کہیں ذکر نہیں، ان میں تو مصافحہ بعد نمازِ فجر وعصر، یا نمازِ پنجگانہ کا بیان ہے، اور جناب کو منصبِ اجتہاد حاصل نہیں کہ ایک مسئلہ کو دوسرے پر قیاس فرماسکیں، اگر فرمائیے کہ ”جو دلائل اس میں لکھے ہیں، یہاں بھی جاری“

أقول (یعنی میں اس کے جواب میں کہوں گا کہ) یہ محض ہوس ہے، ان (یعنی **مرقاۃ وردّ المحتار** کی) عبارتوں میں تین دلیلیں مذکور ہوئیں:

نمبر1 محلِ مصافحہ ابتدائے ملاقات ہے، نہ بعد صلوات۔

نمبر2 یہ مصافحہ مخصوصہ، سنتِ روافض ہے۔

نمبر3 صحابۂ کرام نے یہ خاص مصافحہ نہ کیا۔

یہ تینوں تعلیلیں اگرچہ **فی أنفسھا** خود ہی علیل اور نا قابلِ قبول ہیں، **کما**

حققناه بتوفیق اللّٰہ تعالٰی فی فتاوانا (کہ فقہائے کرام نے شہوت کے بغیر مطلقاً مصافحہ و معانقہ کو جائز و مباح قرار دیا ہے) ولہٰذا قولِ اصح یہی ٹھہرا کہ وہ مصافحہ مخصوصہ بھی جائز ومباح ہے، **کما سنذکر ان شاء اللّٰہ تعالٰی** (فتاویٰ رضویہ، جلد۸، ص ۶۲۴، باب العیدین، مطبوعہ: رضا فاؤنڈیشن، جامعہ نظامیہ رضویہ، لاہور، اشاعت: 1995ء)

مطلب یہ ہے کہ ''ردّ المحتار''اور''مرقاۃ''وغیرہ کی عبارت میں، مخصوص نمازوں کے بعد مصافحہ کا حکم بیان ہوا ہے، جن کی تعلیلات، خود محلِّ کلام ہیں، جبکہ زیرِ بحث مسئلہ کا تعلق، نماز کے بعد کے بجائے، عید کے مصافحہ ومعانقہ سے ہے، جو عید کی مبارک باد دیتے وقت کیا جاتا ہے، اور اس کو عید کی نماز کے بعد مخصوص نہیں سمجھا جاتا، بہت سے لوگوں کی اس وقت اجتماع کی وجہ سے بیک وقت، اُن سے اس سہولت کے حاصل ہونے کی بناء پر نماز کے بعد اس عمل کو اختیار کیا جاتا ہے۔

(5)......معانقہ، مثلِ تقبیل، اظہارِ سرور و بشاشت و وداد ومحبت ہے، جیسے تقبیل، خاص ابتدائے لقا سے مخصوص نہیں، یوں ہی معانقہ (فتاویٰ رضویہ، جلد۸، ص ۶۲۵، باب العیدین، مطبوعہ: رضا فاؤنڈیشن، جامعہ نظامیہ رضویہ، لاہور، اشاعت: 1995ء)

مطلب یہ ہے کہ جس طرح تقبیل کا عمل ابتدائے ملاقات کے ساتھ خاص نہیں، بلکہ اظہارِ سرور و بشاشت اور محبت ومودّت کے طور پر مشروع ہے، یہی حکم، معانقہ کا بھی ہے، کیونکہ اس کے اسباب بھی یہی ہیں۔

(6)......مصافحہ بعد نمازِ فجر وعصر اگر کسی وقت کے روافض نے ایجاد کیا، اور خاص ان کا شعار رہا ہو، اور بدیں وجہ اس وقت علماء نے اہلِ سنت کے لیے، اسے ناپسند رکھا ہو، تو معانقۂ عید کا زبردستی اس پر قیاس کیونکر ہو جائے گا، پہلے ثبوت دیجیے کہ یہ ''رافضیوں کا نکالا، اور انہیں کا شعارِ خاص ہے'' ورنہ کوئی امرِ جائز کسی بد مذہب

کے کرنے سے ناجائز، یا مکروہ نہیں ہوسکتا، لاکھوں باتیں ہیں، جن کے کرنے میں اہلِ سنت و وروافض بلکہ مسلمین و کفار سب شریک ہیں، کیا وہ اس وجہ سے ممنوع ہوجائیں گی؟

بحرالرائق و درمختار وردالمحتار وغیرہا ملاحظہ ہوں کہ ''بدمذہبوں سے مشابہت، اسی امر میں ممنوع ہے، جو فی نفسہٖ شرعاً مذموم، یا اس قوم کا شعارِ خاص، یا خود فاعل کو ان سے مشابہت پیدا کرنا مقصود ہو، ورنہ زنہار وجہ ممانعت نہیں''

رہا صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا نہ کرنا، یہ دلیلِ منع نہیں ہوسکتا (فتاویٰ رضویہ، جلد۸، ص ۶۲۵، ۶۲۶، باب العیدین، مطبوعہ: رضا فاؤنڈیشن، جامعہ نظامیہ رضویہ، لاہور، اشاعت: 1995ء)

(7)......**الحمد للّٰہ** اب حق باحسنِ وجوہ واضح ہوگیا، امید کرتا ہوں کہ جناب بھی اب تو مصافحہ مذکورہ ومعانقۂ عید کے جواز واباحت پر فتویٰ دیں گے، اور اپنے تلامذہ کو ان امورِ جائزہ کے طعن وانکار سے باز رہنے کی ہدایت کریں گے، **واللّٰہ الهادی وولیّ الأیادی۔**

ششم: الحمد للہ کہ ضمنِ تقریر میں مسئلہ مصافحہ بعد صلاۃ بھی صاف ہوگیا، اور تعلیلاتِ ثلاثہ کا علیل ہونا بھی منکشف ہولیا، ثالث پر کلام تو صراحتاً گزرا، اور اول کا جواب عبارتِ تکملہ شرح اربعین ونسیم الریاض (شرح الشفا) سے واضح ہوا کہ بعد ختم نماز ملنا بھی ابتدائے لقا ہے۔ [1]

---

[1] علامہ موصوف نے اپنے مذکورہ رسالہ میں، شہاب الدین خفاجی حنفی کی ''نسیم الریاض'' کے حوالہ سے یہ عبارت نقل کی ہے کہ:

''والأصح أنها مباحة لما فيها من الاشارة إلى أنهٗ كانّ قدم من غيبة، لأنهٗ كان عبد ربه يناجيه ففهم''.

(فتاویٰ رضویہ، جلد۸، ص ۶۳۳، باب العیدین، مطبوعہ: رضا فاؤنڈیشن، جامعہ نظامیہ رضویہ، لاہور، اشاعت: 1995ء)

اور ''مناصحة فی تحقیق مسائل المصافحة'' سے ''تكملة شرح اربعین'' کی یہ عبارت نقل کی ہے کہ:

''حالة السلام، حالة اللقاء، لأن المصلى لما أحرم صار غائباً عن الناس، مقبلاً على اللّٰہ

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

والہٰذا اس وقت سلام مشروع ہوا، تو مصافحہ کیوں نامشروع ہونے لگا، رہی تعلیلِ ثانی، اس کے جواب کا اشارہ، کلامِ فقیر میں گزرا، مشابہت صرف ان تین صورتوں میں مذموم ہے، ورنہ نہیں۔

تکمیلِ کلام: اتنا اور سن لیجیے کہ کسی طائفۂ باطلہ کی سنت جبھی تک لائقِ احتراز رہتی ہے کہ وہ ان کی سنت رہے، اور جب ان میں سے رواج اٹھ گیا، تو ان کی سنت ہونا ہی جاتا رہا، احتراز کیوں مطلوب ہوگا، مصافحہ بعد نماز اگر سنتِ روافض تھا، تو اب ان میں رواج نہیں، نہ وہ جماعت سے نماز پڑھتے ہیں، نہ بعد نماز مصافحہ کرتے ہیں، بلکہ شاید اولِ لقاء پر بھی ان کے یہاں نہ ہو کہ ان اعدائے سنن کو سنن سے کچھ کام ہی نہ رہا، تو ایسی حالت میں وہ علت، سِرے سے مرتفع ہے (فتاویٰ رضویہ، جلد۸، ص۶۳۴، ۶۳۵، باب العیدین، مطبوعہ: رضا فاؤنڈیشن، جامعہ نظامیہ رضویہ، لاہور، اشاعت: 1995ء)

(8)......**بحمد اللہ تعالیٰ** ہماری تحقیقاتِ رائقہ سے آفتابِ روشن کی طرح واضح ہوگیا کہ معانقۂ عید کو بدعتِ مذمومہ سے کچھ علاقہ نہیں، بلکہ وہ سنتِ مباح کے اندر دائر ہے، یعنی **من حیث الاصل** سنت اور **من حیث الخصوص** مباح، اور بقصدِ حسن محمود مستحسن (فتاویٰ رضویہ، جلد۸، ص۶۳۹، باب العیدین، مطبوعہ: رضا فاؤنڈیشن، جامعہ نظامیہ رضویہ، لاہور، اشاعت: 1995ء)

مذکورہ عبارات سے معلوم ہوا کہ علامہ احمد رضا خان بریلوی صاحب، نمازوں کے بعد مصافحہ کو اور عیدین کے موقع پر مصافحہ ومعانقہ کو کم از کم مباح سمجھتے ہیں، اور جب مقصد اچھا ہو، مثلاً دوسرے سے محبت ومودّت و بشاشت اور ہمدردی وغیرہ کا اظہار، تو پھر ان کے نزدیک اس

﴿ گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ ﴾

تعالیٰ، فلما أدى حقه، قيل له ارجع إلى مصالحک وسلم على إخوانک لقد ومک عن غيبتک، ولذلک ينوى القوم بسلام كما ينوى الحفظة وإذا سلم يندب المصافحة أو تسن كالسلام“

(فتاویٰ رضویہ، جلد۸، ص۶۳۰، باب العیدین، مطبوعہ: رضا فاؤنڈیشن، جامعہ نظامیہ رضویہ، لاہور، اشاعت: 1995ء)

صورت میں یہ معانقہ، مباح کے درجہ سے ترقی کرکے محمود اور مستحسن ، یا بالفاظِ دیگر مستحب لغیرہٖ کے درجہ میں داخل ہوجاتا ہے۔

علامہ موصوف نے جو مستدلات ذکر فرمائے، ان کی روشنی میں نکاح کی مبارک بادی اور تعزیت کے موقع پر اظہارِ بشاشت وہمدردی کے طور پر معانقہ کرنا بھی کم ازکم مباح ٹھہرے گا، جس سے ہمیں بھی اتفاق ہے۔

شیخ محمد بن صالح عثیمین کا حوالہ

عرب کے شیخ محمد بن صالح عثیمین نے عید کی نماز کے بعد مصافحہ کے متعلق ایک سوال کے جواب میں فرمایا کہ:

''اگر خاص اس موقع پر مصافحہ کو مشروع نہ سمجھا جائے، بلکہ دوسرے سے الفت اور محبت کی خاطر کیا جائے، تو میرے نزدیک اس میں حرج نہیں، کیونکہ یہ لوگوں کی عادات کے قبیل سے ہے، عبادات کے قبیل سے نہیں، البتہ جو اس کے (اس مخصوص موقعہ کی) سنت ہونے کا عقیدہ رکھے، تو یہ جائز نہیں''۔ انتھٰی۔ [1]

شیخ موصوف نے ایک اور سوال کے جواب میں فرمایا کہ:

''عید کی نماز کے بعد مصافحہ ومعانقہ اور مبارک باد دینے میں کوئی حرج نہیں، کیونکہ لوگ ان چیزوں کو بذاتِ خود عبادت اور تقرب الی اللہ کا ذریعہ سمجھ کر نہیں

---

[1] وسئل فضيلة الشيخ :عن حكم المصافحة فى المسجد حيث اعتاد كثير من الناس ذلك بعد الصلاة؟

فأجاب فضيلته قائلا :هذه المصافحة لا أعلم لها أصلا من السنة أو من فعل الصحابة -رضى الله عنهم -ولكن الإنسان إذا فعلها بعد الصلاة لا على سبيل أنها مشروعة، ولكن على سبيل التأليف والمودة، فأرجو أن لا يكون بهذا بأس، لأن الناس اعتادوا ذلك.

أما من فعلها معتقدا بأنها سنة فهذا لا ينبغى ولا يجوز له، حتى يثبت أنها سنة، ولا أعلم أنها سنة(مجموع فتاوى ورسائل فضيلة الشيخ محمد بن صالح العثيمين، ج۱۳،ص۲۸۷، رقم السؤال: ۵۸۱،كتاب الصلاة، باب صفة الصلاة)

کرتے، بلکہ عادت کے طریقہ پر اور ایک دوسرے کے اکرام واحترام کے طور پر کرتے ہیں، اور جب تک اس طرح کی کوئی چیز عادت کے طور پر ہو، تو شریعت کا اصل حکم اس میں مباح ہونے کا ہوتا ہے''۔ انتہٰی۔ [1]

یہی تفصیل آگے، دکتور احمد بن حمد کے حوالہ سے بھی آتی ہے۔

''شرح سنن أبی داوٗد للعباد'' کا حوالہ

شیخ عبدالمحسن بن عباد البدر نے ''**شرح سنن أبی داوٗد**'' میں ایک سوال کے جواب میں فرمایا کہ:

''عید کی نماز کے بعد مصافحہ و معانقہ کا جو طریقہ رائج ہے، اس کو عید کی نماز کے ساتھ یہ مناسبت ہے کہ اس میں ایک دوسرے کو مبارک باد دینا، اور خوشی کا اظہار کرنا پایا جاتا ہے، جس میں کوئی حرج نہیں''۔ انتہٰی۔ [2]

مطلب یہ ہے کہ عید کی مبارکباد دینا، مشروع اور ایک طرح کی دعاء ہے، اور مصافحہ کے موقع پر دعاء، احادیث کی رُو سے مشروع ہے، نیز کئی فقہائے کرام کی تصریح کے مطابق، مبارکباد دیتے وقت، مصافحہ بھی جائز، بلکہ بعض کے نزدیک مستحب ہے، اور عید کے دنوں میں اظہارِ

---

[1] سئل فضيلة الشيخ -رحمه الله تعالى: ما حكم المصافحة، والمعانقة والتهنئة بعد صلاة العيد؟

فأجاب فضيلته بقوله :هذه الأشياء لا بأس بها؛ لأن الناس لا يتخذونها على سبيل التعبد والتقرب إلى الله عز وجل، وإنما يتخذونها على سبيل العادة، والإكرام والاحترام، ومادامت عادة لم يرد الشرع بالنهى عنها فإن الأصل فيها الإباحة كما قيل: والأصل فى الأشياء حل ومنع عبادة إلا بإذن الشارع (مجموع فتاوى ورسائل فضيلة الشيخ محمد بن صالح العثيمين، ج١٦، ص ٢٠٩، كتاب الصلاة، باب صلاة العيدين)

[2] السؤال: ما حكم المصافحة والمعانقة بعد صلاة العيدين، فهذه العادة توجد فى منطقتنا حيث يتصافحون ويعانق بعضهم بعضا بعد صلاة العيد مباشرة؟

الجواب: هذا هو الذى يجرى دائما لكونها مناسبة طيبة فيها تهنئة وفرح، ويبدو أنه لا بأس بذلك(شرح سنن أبى داود،لعبد المحسن بن العباد البدر"دروس صوتية قام بتفريغها موقع الشبكة الإسلامية"رقم الدرس: ٥٩٢، ص ٤٠،حكم المعانقة بعد صلاة العيدين)

سرور و بشاشت بھی مشروع ہے، جس کا بعض صورتوں میں اظہار ایک دوسرے سے معانقہ کر کے کیا جاتا ہے، لہٰذا اس میں حرج نہیں۔

اس موقف سے ہم بھی اتفاق کرتے ہیں۔

”محمد بن محمد الشنقیطی“ کا حوالہ

شیخ محمد بن محمد الشنقیطی نے ”شرح زاد المستقنع“ میں ایک سوال کے جواب میں فرمایا کہ:

”تعزیت کے موقع پر دوسرے مسلمان سے اظہارِ محبت و ہمدردی کے طور پر اور اسی طرح خوشی (مثلاً عید اور نکاح وغیرہ) کے موقع پر اظہارِ سرور و بشاشت کے طور پر، مصافحہ اور معانقہ کرنے میں حرج نہیں“۔ انتہٰی۔ [1]

”دارُ الافتاء المصرية“ کا فتویٰ

”دارُ الافتــاء الـمصـرية“ کے فتاویٰ میں استاذ دکتور شوقی ابراہیم علام نے نماز کے بعد مصافحہ کو مشروع و مستحب قرار دیا ہے، اور اس کو مسلمانوں کی اچھی عادات میں شمار کیا ہے، اور

---

[1] السؤال: ما السنة في التعزية، هل هي بالمصافحة، أو المعانقة، أو بوضع اليد على الكتف، أثابكم الله؟

الجواب: التعزية تكون بالمصافحة، وتكون بالمعانقة، لورود السنة عن رسول الله صلى الله عليه وسلم، والمصافحة هي الأصل، وذلك بأن تصافح أخاك وتسلم عليه ثم تعزيه.

والمعانقة تكون من الرحمة، ولذلك قرر الأئمة رحمهم الله أن العناق ينظر في سببه، فإذا وجد له سبب فهو مشروع، وإذا لم يوجد له سبب فهو ممنوع، ومن هنا قرر الإمام البغوي رحمه الله في شرح السنة :أن العناق يجوز عند حصول فرح، كأن تهنئ أخاك المسلم فتضمه إليك وتعانقه، فرحاً بنعمة الله عز وجل وخاصة نعمة الدين والطاعة، ويكون أيضاً عند الحزن تضمه إليك من أجل أن تشعره بأخوتك بقوته، وتطفئ ما في قلبه، ويكون أيضاً عند السفر إذا أراد أن يسافر تلتزمه وتعانقه، وإذا قدم من سفر، وقال :على ذلك جرت السنة(شرح زاد المستقنع،لمحمد بن محمد المختار الشنقيطي”دروس صوتية قام بتفريغها موقع الشبكة الإسلامية“ ،رقم الدرس: ٣٤٣ ص١٥ ، كتاب النفقات،جواز التعزية بالعناق والمصافحة)

اس پر تشدد اور لعن طعن کرنے کی نفی کی ہے۔ [1]

عبدُ الناصر بن خضر کا حوالہ

شیخ عبدالناصر بن خضر میلاد نے ’’المصارحة فی أحكام المصافحة ‘‘ کے نام سے ایک رسالہ تالیف کیا ہے، جس میں موصوف نے نمازوں کے بعد مصافحہ سے متعلق مختلف اقوال اوران کے دلائل تحریر کرنے کے بعد فرمایا کہ:

’’یہ عمل مباح ہے، کیونکہ اس کا اتنا اہتمام نہیں کہ اگر کوئی اس عمل کو نہ کرے، تو اس کی مذمت بیان کی جاتی ہو، جیسا کہ مانعین کو خوف ہے، اور نماز کے بعد مصافحہ کرنا، مسلمانوں کے درمیان محبت ومودت پیدا کرنے کا ذریعہ ہے۔

لہٰذا اس کے متعلق تشدد کرنا درست نہیں‘‘۔انتھٰی۔ [2]

---

[1] ما رأيكم دام فضلكم فى حكم المصافحة بعد الصلاة مباشرة، وقول المصلى للمصلى الذى بجواره" :حرما"، أو "تقبل الله"؟ وجزاكم الله خيرًا .

الجواب :الأستاذ الدكتور / شوقى إبراهيم علام

المصافحةُ بين المصلين عقبَ الصَّلاةِ مشروعة مستحبة، وهى من محاسنِ العاداتِ التى درجَ عليها المسلمونَ فى كثيرٍ من الأعصارِ والأمصارِ، وهى أيضًا من السُّلوكياتِ الحسنةِ التى تبعث الأُلْفَة بين الناس، وتقوِّى أواصر المودة بينهم.

كما يُشرع دعاء المصلين لبعضهم عقب الفراغ من الصلاة بما تيسر من عبارات الدعاء ؛ مثل : "تقبَّل الله"، أو "حرمًا "و"جمعًا"، أو غير ذلک، ولا يجوز إنكاره شرعًا؛ لأن الدعاء مشروعٌ بأصله، وإيقاعه عقب الصلاة آكدُ مشروعيةً وأشدُّ استحبابًا، فإذا كان من المسلم لأخيه فهو أدعى للقبول، وبذلک جرت سُنّةُ المسلمين سلفًا وخلفًا، وإنكارُ ذلک أو تبديعُ فاعله ضربٌ من التشدد والتنطع الذى لا يرضاه الله تعالى ولا رسوله صلى الله عليه وآله وسلم(دار الافتا المصرية، حكم المصافحة بين المصلين وقول حرمًا بعد الصلاة، الرقم المسلسل 4447، التاريخ: 31/07/2018)

(https://www.dar-alifta.org/ar/ViewFatwa.aspx?ID=14557&LangID=1)

[2] والواقع شاهد على أنهم لم يعنتوا من يترک المصافحة عقب الصلاة، ولم يرموه بالذم والتقصير مثلما خاف المانعون، لفهم الناس حكم الشرع بشأنها، وأنها من المباحات، وأنه لا بأس بها خاصة وأنها بحسب أصلها سنة عند كل لقاء .ومن حيث إن الصلاة قائمة أصلا على التلاقى

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

یہ بات مانعین، مثلاً ملا علی قاری وغیرہ نے بھی ذکر فرمائی ہے کہ اگر دوسرا خود سے مصافحہ و معانقہ میں پیش قدمی کرے، تو اس سے اعراض کرنا، زیادہ بُرا ہے، اور ایسی صورت میں مصافحہ ومعانقہ نہ کرنا، کرنے کے مقابلہ میں زیادہ فتنہ کا باعث ہے، جیسا کہ گزرا، اور آگے بھی آتا ہے۔

’’محمد بن سليمان المنيعی‘‘ کا حوالہ

شیخ محمد بن سليمان المنيعی (عضو هيئة التدريس بجامعة أم القرى) ایک سوال کے جواب میں فرماتے ہیں:

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

والتراحم والتصافی بالقلوب والجوارح والأفئدة، فلا معنى لمنع الناس من ذلك، خاصة وأن التصافح يؤلف بين القلوب ويربط بين الأفئدة، ويزيل ما قد يكون عالقا بالنفوس قبل الشروع فی الصلاة .فالمصافحة على هذا النحو تعد مظهرا من مظاهر الحب العامة، لاسيما لو كان ذلك التصافح بالقلوب مع الأيدى؛ ولهذا كانت المصافحة عقب الصلاة أولى، لتحقيقها للتواصل بين المسلمين، وتقوية أواصر الألفة والإخاء بين الناس، ليخرجوا من الصلاة مجتمعين غير متفرقين . ومما يؤيد ما ارتاحت إليه النفس هنا: أننی وجدت الذين يرجحون المنع يلحظون – والحمد لله – ملمح أدب الإسلام ومراعاة الشعور والتسامح بين الناس خاصة عقب الصلاة، وبسبب ما يبادر به المصافح لمن بجواره فی الصلاة، وذلك توفيقا بين المذهبين فی هذا الخلاف الذی لا طائل من ورائه، فقال هؤلاء: إن التعامل مع المتصافحين يجب أن يكون متمشيا مع مقاصد الشريعة لإشاعة الحب والصفاء بين الناس، عملا بقوله سبحانه: } ادع إلى سبيل ربك بالحكمة والموعظة الحسنة 1 {؛ فمن مد يده لجاره فی الصلاة مصافحا بعد الصلاة، سواء مع القول: " حرما"، أو "تقبل الله منا ومنكم"، أم بدونهما، فليمد يده إليه برفق ولين مبتسما فی وجهه،مبادلا له بالتحية، وفی غاية الهدوء وبدون أية غضاضة أو إشعاره بالذنب أو الخطيئة، وإن كان هو لا يفعل هذا وليس من دأبه المصافحة، فلا يخطء الآخرين ولا يجعلها مشكلة .فلا محل للنزاع – خاصة عقب الصلاة – بما ولدته فی الإنسان من صفو الخاطر وما أحدثته من إذابة الفوارق وإراحة النفوس؛ ولهذا فمن غير اللائق بأن يعرض المصلی عن مصافحة غيره، أو ينزع يده من يده فی عنف، أو أن يعبس فی وجهه، لأن هذا من الجفاء الذی لا يزيد المخالفين إلا شرودا ونفورا(المصارحة فی أحكام المصافحة،لعبد الناصر بن خضر ميلاد،ص١٢٥ الٰی ١٢٧،المبحث الرابع: المصافحة عقب الصلاة، الناشر : المكتبة الرقمية فی المدينة المنورة)

فإن جرت عادة الناس على المعانقة فی یوم العید، فلا بأس إذ الأمر فی هذا واسع، وله فی الشریعة أصل، کما أن فی دفع المعانق قطیعة ومجافاة (فتاوی واستشارات الإسلام الیوم،لعلماء وطلبة علم،ج۱۳،ص ۱۰۶، هل للمعانقة أصل؟)

ترجمہ: عید کے دن اگر معانقہ کی لوگوں کو عادت ہو، تو اس میں حرج نہیں، کیونکہ اس حکم میں وسعت پائی جاتی ہے، اور اس کی شریعت میں اصل موجود ہے، جیسا کہ معانقہ کرنے والے کو منع کرنے میں قطع تعلقی اور دوری پائی جاتی ہے (فتاویٰ واستشارات)

اس کے متعلق پہلے ذکر کیا جا چکا۔

''شیخ سلیمان الرحیلی'' کا حوالہ

عرب کے شیخ ''شیخ سلیمان الرحیلی'' نے عید کے دن معانقہ کے متعلق ایک سوال کے جواب میں فرمایا کہ:

''عید کے دن فسحة وتوسّع کی احادیث میں گنجائش آئی ہے، لہٰذا جو مباح عمل، عید کے دن لوگ اپنی عادت کے مطابق اختیار کریں، تو اس میں تنگی کرنا مناسب نہیں، پس اگر لوگوں کی عادت مصافحہ کرنے کی ہو، تو مصافحہ کر لینے کی گنجائش ہے، اور اگر معانقہ کرنے کی عادت ہو، تو معانقہ کرنے کی گنجائش ہے۔

لیکن اس کو خاص اس موقع کی مشروع عبادت نہ سمجھی جائے، اور نہ ہی کسی گناہ (مثلاً شہوتِ ممنوعہ) کا ارتکاب کیا جائے''۔ انتھیٰ۔ [1]

---

[1] یسأل عن حکم المعانقة فی العید ؟

الجواب : العید المشروع منه قد علمناه ، والتوسیع فیه مطلوب ، حتی یعلم الناس أن فی دیننا فسحة،فکل مباح یفعله الناس علی وجه العادة لا ینبغی أن یضیق فیه .

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

عید کے دن توسع سے متعلق احادیث اور ان کے ضمن میں محدثین وفقہائے کرام کی عبارات، اس سے پہلی فصل میں ذکر کی جا چکی ہیں، مذکورہ عبارت میں ان ہی کی طرف اشارہ ہے۔

’’أحکامُ التھنئۃ بالعیدین‘‘ کا تفصیلی حوالہ

دکتور احمد بن حمد بن عبدالعزیز الونیس (قسم الفقہ کلیۃ الشریعۃ: جامعۃ الإمام محمد بن سعود الإسلامیۃ، الریاض ، السعودیۃ) نے ’’أحکامُ التھنئۃ بالعیدین ‘‘ کے نام سے ایک مضمون تحریر فرمایا ہے، جس میں انہوں نے عیدین کے موقع پر مبارک باد اور اس کے ساتھ مصافحہ ومعانقہ کے موضوع کی تفصیلی انداز میں تحقیق کی ہے، اور ان کا یہ مضمون ’’مجلۃ العلوم الشرعیۃ، الریاض ‘‘ کے شمارہ نمبر 36، رجب 1436 ہجری میں شائع ہوا ہے۔

اس مضمون میں وہ ایک مقام پر فرماتے ہیں:

المصافحۃ عند التھنئۃ بالعید.

المصافحۃ عند کل لقاء مستحبۃ بإجماع العلماء، لما روی البراء بن عازب رضی اللہ عنہما قال :قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

فإن کانت عادۃ الناس المصافحۃ فلیتصافحوا.

وإن کانت عادۃ الناس المعانقۃ فلیتعانقوا.

وإن کانت عادۃ الناس الإجتماع علی الطعام علی سبیل العادۃ فلیفعلوا.

فالتوسیع فی یوم العید أصل ثابت ، حتی یعلم الناس أن فی دیننا فسحۃ ، لکن لا تفعل عبادۃ لم تشرع ، ولا یرتکب محرم ، فإذا سلیمنا من إنشاء عبادۃ والتقرب بھا إلی اللہ بخصوصھا لا بجنسھا ، وسلمنا من فعل المحرم فلا حرج علی الناس .

والتضییق علی الناس فی عیدھم و إرسال الرسائل المضیقۃ علیھم لیس من الفقہ فی شیء .

وإجتھادات بعض أھل العلم یؤجرون علیھا ، ولکن العمل بالأصول الشرعیۃ أولی وأعظم.

(أھل الحدیث والأثر بالأبیار)

(https://www.facebook.com/Alabyarlibya/posts/2436361509757005/)

وسلم"ما من مسلمين يلتقيان فيتصافحان الا غفر لهما، قبل أن يفترقا"

وأما خصوص المصافحة عند التهنئة بالعيد ، فقد اختلف فيها الفقهاء على أربعة أقوال، إلا أن منهم من أطلق المصافحة مع التهنئة ، ومنهم من قيدها بما بعد الفراغ من صلاة العيد.

القول الأول :جواز المصافحة عند التهنئة بالعيد ، وهذا قول الحنفية . [1] والحنابلة . [2] والشاطبي من المالكية .

القول الثاني: استحباب المصافحة عند التهنئة بالعيد، وهو قول الشافعية. [3]

القول الثالث : أن المصافحة عند التهنئة بعد الفراغ من صلاة

---

[1] انظر: حاشية الشرنبلالي ١/١٤٢، ومجمع الانهر ١/٢٥٥.

[2] انظر: حاشية ابن قاسم على الروض: ٢/٥٢٢، والملخص الفقهي: ١/٢٨٠.

[3] انظر: حاشية الشرقاوي: ١/٣١٠، ٣١١ ،وحاشية البيجوري على شرح ابن قاسم : ١/٤٢٩، وحاشية الشرواني :٣/٥٦.

لكن صرَّح ابن حجر الهيتمي من الشافعية بأنها لا تسن إذا لم يحصل تلاقي، وهذا أقل أحواله أنه يرى الإباحة.

ففي الفتاوى الفقهية الكبرى :٤/٢٤٥، قال الهيتمي:

ما حكم المصافحة بعد التدريس وفي ليالي رمضان بعد الدعاء عقب الوتر والتراويح وكذلك بعد صلاة العيد وما الأرحام وكيف كيفية صلتهم ؟

(فأجبت) بقولي الذي دلت عليه صرائح السنة وصرح به النووي وغيره أنه حيث وجد تلاق بين اثنين سن لكل منهما أن يصافح الآخر وحيث لم يوجد ذلك بأن ضمهما نحو مجلس ولم يتفرقا لا تسن سواء في ذلك المصافحة التي تفعل عقب الصلاة ولو يوم العيد، أو الدرس أو غيرهما.

بل متى وجد منهما تلاق ولو بحيلولة شيء بين اثنين بحيث يقطع أحدهما عن الآخر سنت وإلا لم تسن .

نعم التهنئة بالعيد والشهور سنة كما ذكره بعض أئمتنا واستدل له ولا يلزم من ندبها ندب المصافحة فيها وإن لم يوجد شرطها السابق .

العید ترکها أولی ، وهذا مقتضی کلام ابن الحاج المالکی. [1]

القول الرابع : أن المصافحة بعد صلاة العید بدعة محدثة ، وقال به أبو الطیب العظیم آبادی. [2]

ویُشترط فی المصافحة اتحاد الجنس ، فیصافح الرجلُ الرجل ، والمرأةُ المرأة ، وکذا مصافحة المحارم من النساء، أما مصافحة الرجل للمرأة الأجنبیة عنه فحرام فی العید وغیره، وکذا من یُخشی من مصافحته الفتنة کالأمرد الحسن. [3]

دلیل القول الأول :أن المصافحة عند التهنئة بالعید مما اعتاده الناس ، فهم یفعلونها علی وجه العادة ،لا علی وجه العبادة. [4]

ولا یُعلَم فیها نهی من الشرع. [5]

فتکون علی أصل الإباحة.

---

[1] قال ابن الحاج فی المدخل: وأما المصافحة فإنها وضعت فی الشرع عند لقاء المؤمن لأخیه،وأما فی العیدین علی ما اعتاده بعضهم عند الفراغ من الصلاة یتصافحون فلا أعرفه، لکن قال الشیخ الإمام أبو عبد الله بن النعمان رحمه الله أنه أدرک بمدینة فاس والعلماء العاملون بعلمهم بها متوافرون أنهم کانوا إذا فرغوا من صلاة العید صافح بعضهم بعضاً، فإن کان یساعده النقل عن السلف فیا حبذا وإن لم ینقل عنهم فترکه أولی.

[2] حیث قال فی عون المعبود،۱۴/۸۲:وکذا المصافحة والمعانقة بعد صلاة العیدین من البدع المذمومة المخالفة للشرع.

[3] انظر: فتح الباری: ۱۱/۶۵، وحاشیة الشرقاوی: ۱/۳۱۱ وحاشیة البیجوری علی شرح ابن قاسم : ۱/۴۲۹، وحاشیة ابن قاسم علی الروض :۲/۵۲۲.

[4] انظر: الدرر السنیة :۷/۲۳۳، فتوی للشیخ سلیمان بن سحمان، وحاشیة ابن قاسم علی الروض:۲/۵۲۲.

[5] لم أقف فی المصافحة عند التهنئة بالعید علی شیء مرفوع إلی النبی صلی الله علیه وسلم،أو من فعل الصحابة رضی الله عنهم، بنفی ولا إثبات، وبنحو ذلک قال الشیخ سلیمان بن سحمان رحمه الله تعالی .انظر : الدررالسنیة :۷/۲۲۳، وتقدم قریباً قول ابن الحاج فی المدخل :۲/۲۸۸، وأما فی العیدین علی ما اعتاده بعضهم عند الفراغ من الصلاة یتصافحون فلا أعرفه،ومراده والله أعلم لا أعرفه مأثوراً عن السلف .

ومـمـا يُستـأنــس بـه لهـذا الـقـول إقـرار بـعـض العلماء العاملين لـلـمـصافحة عند التهنئة بعد الفراغ من صلاة العيد، من غير نكير مـنهم، ومن ذلک ما قاله العلامة ابن الحاج رحمه الله تعالى .قال الشيخ الإمام أبو عبد الله بن النعمان رحمه الله : [1]

أنـه أدرک بـمـدينة فاس والعلماء العاملون بعلمهم بها متوافرون أنهم كانوا إذا فرغوا من صلاة العيد صافح بعضهم بعضاً. [2]

وقـال الشيخ سليمان بن سحمان رحمه الله تعالى –: عندما سئل عـن مـعـانقة الناس بعضهم بعضاً يوم العيد بعد الصلا ة بالمصلى ، وسلام بعضهم على بعض فقال فهذه العادة التى يفعلها الناس ، من السلام فى العيدين فى المصلى ، وفى البيوت ،كانوا يفعلونها عند أئمة أهل هذه الدعوة . [3]

وفـى وقتهـم، ولا ينكرونها عليهم، فلو كان هذا الصنيع من البدع الـمـنكرة المحدثة فى الدين لأنكر ذلک بعضهم أو كلهم ،فدلنا على أن هذا من العادات، لا من البدع المحدثة فى العبادات. [4]

دليـل الـقول الثانى: أن المصافحة عند التهنئة بالعيد يقترن بها من الـمـصـالـح مـا يـجـعـلها مستحبة لا مباحة فقط، كتقوية المحبة

---

[1] هو: أبـو عبد الله محمد بن موسى بن النعمان التلمسانى ، قدم الأسكندرية شابا ، وكان عارفا بمذهب مالک، راسخ القدم فى العبادة والنسک ، أشعريا منحرفا على الحنابلة ، توفى فى رمضان سنة ٣٨٦ هــ ،ودفن بالقرافة .انـظـر:شـذرات الذهب:٧/٦٧٠، ٦٧١، ومرآة الجنان :٤/١٥٠ ، ١٥١ .

[2] المدخل: ٤/٨٨٢.

[3] يـعـنـى أئـمة الـدعوة النجدية، أتباع الإمام المجدد الشيخ محمد بن عبد الوهاب رحمه الله تعالى.

[4] الدرر السنية :٧/٢٣٣، ٢٣٤.

والمودة بين المسلمين.[1]

وربما التقى المتهاجران فيصافح بعضهم بعضا ، فتنقطع المهاجرة بينهما ، أو تَخِف ، ولا شك أن هذا كله مندوب إليه في الشرع.[2]

ويمكن مناقشته بأن المصافحة عند التقاء المتهاجرين خارج محل النزاع؛ لأنها مشروعة لأجل اللقاء ، لا لأجل التهنئة ، والبحث في المصافحة لأجل التهنئة بخصوصها ، وأما المصافحة عند اللقاء فهي مستحبة بالإجماع كما تقدم.

دليل القول الثالث: أن المصافحة عند التهنئة بعد الفراغ من صلاة العيد لم يُنقل فيها شيء عن السلف ، فكان تركها أولى من فعلها.[3]

ويمكن مناقشته بأن المصافحة هنا لا تخلو من أمرين ، فهي إما أن تكون على وجه التعبد، فلابد لها حينئذٍ من دليل بخصوصها من السنة أو من فعل السلف ، وإلا كانت بدعة محدثة ، وإما أن تكون على وجه العادة ، فلا تحتاج إلى نقل عن السلف لجوازها؛ وإنما يُشترط عدم ورود النهي عنها ، وقد تقدم قريبا أنه لا يُعلم ورود نهي عنها ، فتكون حينئذٍ من المباحات، وصار القول بأن تركها أولى لا وجه له.

ويمكن أن يستدل للقول الرابع بأن المصافحة عبادة ، والعبادة

---

[1] انظر: فتاوى صلاة العيدين لابن جبرين ص ۴.

[2] انظر: الدرر السنية :۷/۲۳۴ فتوى للشيخ سليمان بن سحمان.

[3] انظر: المدخل لابن الحاج: ۲/۲۸۸.

لابد لها من دليل من الشرع، ولا يعرف دليل لمشروعية المصافحة بعد صلاة العيد ، فيكون فعلها حينئذٍ بدعة محدثة.

ويمكن مناقشته بعدم التسليم بكون المصافحة عبادة مطلقا ، بل قد تفعل على وجه العبادة ، وقد تفعل على وجه العادة ، فإذا فعلها الناس على وجه العادة لم يلزم لجوازها ورود الدليل على ذلک.

الترجيح: الذى يظهر والله أعلم أن المصافحة عند التهنئة بالعيد لا تخلو من أن تكون التهنئة عند اللقاء أو بعده ، فإن كانت التهنئة عند اللقاء فالمصافحة حينئذٍ سنة مجمع عليها؛ لأجل اللقاء ذاته ، لا لأجل التهنئة ، وإن كانت المصافحة بعداللقاء ، كما لو التقى بأخيه قبل صلاة العيد ، وصافحه، ثم صلَّيا صلاة العيد معا ، وبعد الفراغ من الصلاة أو الخطبة هنأه بالعيد مصافحاً له ، فا لمصافحة حينئذٍ لأجل التهنئة، لا لأجل اللقيا، وهى التى ينبغى أن تكون محل البحث ، والأقرب فيها أنها ترجع إلى ما اعتاده الناس. [1]

فإن كان هذا من عاداتهم فهو مباح لهم؛ لأن المصافحة قد تكون عبادة وقد تكون عادة ، فما اعتاده الناس منها فلا حرج فيه ، لكن إن اقترن بالمصافحة والحال هذه مصلحة ، فهى مستحبة لأجل المصلحة، وإن اقترن بها مفسدة حَرُمت لأجل المفسدة، والله أعلم("أحكام التهنئة بالعيدين"مشمولة: مجلة العلوم الشرعية ، الرياض، السعودية، العدد السادس والثلاثون رجب 1436هـ ،صفحة ٦٤ الىٰ ٦٨)

---

[1] ينبغى التَّنبُّه هنا إلى أن المصافحة بعد صلاة العيد أو الخطبة ليست لأجل الصلاة، وإنما هى لأجل التهنئة، فلا يَرِد هنا ما قرره بعض العلماء من بدعية التزام المصافحة بعد الصلوات، إذ هذه المصافحة التى حُكم ببدعيتها لأجل الصلاة ذاتها، فافترقا، يوضح ذلک أنه لو صلى الفريضة وبجواره رجل لم يره منذ مدة طويلة، فلما سلم من الصلاة صافحة، فلا يقال حينئذٍ ببدعية هذه المصافحة؛ لأنها ليست لأجل الصلاة، وإنما لأجل تحية هذا الغائب، والله أعلم .

ترجمہ: عید کی مبارک باد کے موقع پر مصافحہ کا حکم:

مصافحہ ہر ملاقات کے وقت باجماعِ علماء مستحب ہے، جیسا کہ حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو دو مسلمان بھی آپس میں ملاقات کرتے ہیں، پھر وہ ایک دوسرے سے مصافحہ کرتے ہیں، تو ان کے جدا ہونے سے پہلے، ان کی مغفرت کر دی جاتی ہے''۔

جہاں تک خاص عید کی مبارک باد کے موقع پر مصافحہ کا تعلق ہے، تو اس میں فقہاء کے چار اقوال ہیں، البتہ ان میں سے بعض نے مبارک باد کے ساتھ مصافحہ کا اطلاق کیا ہے، اور بعض نے اس کو عید کی نماز سے فراغت کے بعد مقید کیا ہے۔

پہلا قول یہ ہے کہ عید کی مبارک باد کے موقع پر مصافحہ کرنا جائز ہے، حنفیہ کا یہی قول ہے، اور حنابلہ کا بھی یہی قول ہے، اور مالکیہ میں سے شاطبی کا بھی یہی قول ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ عید کی مبارک باد کے موقع پر مصافحہ کرنا مستحب ہے، شافعیہ کا یہی قول ہے۔

تیسرا قول یہ ہے کہ عید کی نماز سے فارغ ہو کر، مبارک باد کے موقع پر مصافحہ نہ کرنا، بہتر ہے، ابنِ حاج مالکی کے کلام کا تقاضا یہی ہے۔

چوتھا قول یہ ہے کہ عید کی نماز کے بعد مصافحہ کرنا ''بدعتِ محدثہ'' ہے، ابو طیب عظیم آبادی (نیز کئی علمائے ہند و پاکستان) کا یہی قول ہے۔

اور مصافحہ کے جائز ہونے کی شرط، جنس کا متحد ہونا ہے، پس مرد، مرد سے مصافحہ کرے گا، اور عورت، عورت سے مصافحہ کرے گی، اور اسی طریقہ سے محرم عورتوں سے مصافحہ بھی جائز ہے، جہاں تک کہ آدمی کے اجنبی عورت سے مصافحہ کا تعلق ہے، تو یہ عید اور غیر عید دونوں میں ہی حرام ہے، اور اسی طریقہ سے جس سے مصافحہ کرنے میں، فتنہ کا خوف ہو، جیسا کہ خوبصورت امرد (بے ریش خوبصورت

لڑکا) اس سے بھی مصافحہ کرنا ممنوع ہے۔

پہلے قول کی دلیل یہ ہے کہ عید کی مبارک باد کے موقع پر، مصافحہ کرنا، لوگوں کی عادات کے قبیل سے ہے، پس وہ عادت کے طور پر یہ عمل کرتے ہیں، عبادت کے طور پر یہ عمل نہیں کرتے۔

اور اس میں شریعت کی طرف سے کوئی ممانعت معلوم نہیں ہوتی۔

لہٰذا اس کو اصل اباحت کا حکم حاصل ہوگا۔

اور اس قول کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ بعض علماء، عید کی نماز سے فارغ ہونے کے بعد، مبارک باد کے موقع پر بغیر کسی نکیر کے مصافحہ کرتے ہیں، جیسا کہ علامہ ابنِ حاج رحمہ اللہ تعالیٰ نے نقل کیا ہے کہ شیخ امام ابو عبداللہ بن نعمان رحمہ اللہ نے فرمایا کہ ''انہوں نے فاس کے شہر میں بکثرت، علمائے عاملین کو دیکھا کہ وہ عید کی نماز سے فارغ ہو کر، ایک دوسرے سے مصافحہ کیا کرتے تھے''۔

اور شیخ سلیمان بن سحمان رحمہ اللہ تعالیٰ سے جب عید گاہ میں، عید کی نماز سے فارغ ہو کر، لوگوں کے ایک دوسرے سے معانقہ کرنے اور ایک دوسرے کو سلام کرنے کے متعلق سوال کیا گیا، تو انہوں نے جواب میں فرمایا کہ ''یہ لوگوں کی عادت ہے کہ وہ عیدین کے موقع پر عید گاہ اور گھروں میں، ایک دوسرے کو سلام کرتے ہیں، اور ائمہ ومقتداء حضرات کے سامنے یہ عمل کرتے ہیں''۔

اور ان کے زمانے میں ان پر اہلِ علم حضرات نے نکیر نہیں کی، پس اگر یہ طرزِ عمل دین میں بدعتِ منکرہ ومحدثہ میں سے ہوتا، تو بعض، یا تمام حضرات اس پر نکیر کرتے، جس سے ہمیں یہ بات معلوم ہوگئی کہ یہ لوگوں کی عادات کے قبیل سے ہے، عبادات میں بدعتِ محدثہ کے قبیل سے نہیں۔

دوسرے قول کی دلیل یہ ہے کہ عید کی مبارک باد کے موقع پر مصافحہ کے ساتھ ایسے

مصالح وابستہ ہیں، جو اس کو مستحب قرار دے دیتے ہیں، نہ کہ صرف مباح، جیسا کہ مسلمانوں کے درمیان محبت اور مودت میں اضافہ ہونا۔

اور بعض اوقات ایک دوسرے سے قطع تعلقی کرنے والے جب ایک دوسرے سے مصافحہ کرتے ہیں، تو ان کے درمیان قطع تعلقی ختم، یا کم ہو جاتی ہے، اور اس میں شک نہیں کہ یہ تمام امور شریعت میں پسند کیے گئے ہیں۔

اور اس قول کا مناقشہ اس طور پر ممکن ہے کہ قطع تعلقی کرنے والوں کی ملاقات کے موقع پر مصافحہ کرنا محلِ نزاع سے خارج ہے، کیونکہ وہ ملاقات کی وجہ سے مشروع ہے، نہ کہ مبارک بادی کی وجہ سے، جب کہ اصل بحث خاص مبارک بادی کی وجہ سے مصافحہ کرنے کے بارے میں ہے، جبکہ ملاقات کے وقت مصافحہ بالاجماع، مستحب ہے، جیسا کہ گزرا۔

تیسرے قول کی دلیل یہ ہے کہ عید کی نماز سے فارغ ہونے کے بعد مبارک باد دیتے وقت مصافحہ کرنے کے بارے میں، سلف سے کچھ منقول نہیں، لہٰذا اس کا ترک کرنا، اس کو اختیار کرنے کے مقابلہ میں بہتر ہے۔

لیکن اس کا مناقشہ اس طور پر ممکن ہے کہ یہاں پر مصافحہ دو حالتوں سے خالی نہیں، یا تو یہ کہ وہ عبادت کے طور پر ہو، اس صورت میں تو سنت، یا سلف کے فعل سے اس کی دلیلِ خاص کا ہونا ضروری ہے، ورنہ تو یہ بدعتِ محدثہ کہلائے گی، اور یا یہ کہ وہ مصافحہ عادت کے طریقہ پر ہو، تو اس صورت میں اس کے جواز کے لیے سلف کی طرف سے نقل کی ضرورت نہیں ہوگی، البتہ اتنی بات شرط ہوگی کہ شریعت کی طرف سے اس کے متعلق ممانعت وارد نہ ہوئی ہو، اور قریب میں ہی یہ بات گزر چکی ہے کہ اس کے بارے میں ممانعت کا وارد ہونا معلوم نہیں، لہٰذا اس صورت میں یہ مباحات کے قبیل سے ہوگا، اور یہ بات کہنے کی کوئی وجہ نہیں ہوگی کہ اس کا ترک

کرنا، اولیٰ ہے۔

اور چوتھے قول کے لیے اس بات سے استدلال کرنا ممکن ہے کہ مصافحہ، عبادت ہے، اور عبادت کے لیے شرعی دلیل کا ہونا ضروری ہے، اور عید کی نماز سے فراغت کے بعد، مصافحہ کے مشروع ہونے کی کوئی دلیل معروف نہیں، لہٰذا ایسی صورت میں، اس کا کرنا بدعتِ محدثہ ہوگا۔ [1]

لیکن اس کا مناقشہ اس طرح ممکن ہے کہ مصافحہ کے مطلقاً عبادت ہونے کو تسلیم نہیں کیا جائے گا، بلکہ یہ بات ممکن ہے کہ کبھی اس کو عبادت کے طور پر اختیار کیا جاتا ہو، اور کبھی عادت کے طور پر اختیار کیا جاتا ہو، پس جب اس کو لوگ، عادت کے طور پر اختیار کریں گے، تو اس کے جائز ہونے کے لیے دلیلِ خاص وارد ہونا لازم نہیں ہوگا۔

راجح قول، جو ظاہر ہوتا ہے، واللہ أعلم، وہ یہ ہے کہ عید کی مبارک باد کے موقع پر مصافحہ کرنا، دو حال سے خالی نہیں، یا تو یہ کہ مبارک باد، ملاقات کے موقع پر ہو، یا اس کے بعد ہو، اگر مبارک باد، ملاقات کے موقع پر ہو، تو مصافحہ اس وقت میں بالاجماع سنت ہوگا، بذاتِ خود ملاقات کی وجہ سے، نہ کہ مبارک بادی کی وجہ سے، اور اگر مصافحہ، ملاقات کے بعد ہو، جیسا کہ اپنے مسلمان بھائی سے نمازِ عید سے قبل ملاقات ہوئی، اور اس سے مصافحہ کیا، پھر دونوں نے ایک ساتھ عید کی نماز پڑھی، اور عید کی نماز، یا خطبہ سے فارغ ہوکر اس کو عید کی مبارک باد دی، اس سے مصافحہ کرتے ہوئے، تو اس وقت میں مصافحہ مبارک بادی کی وجہ سے ہوگا، نہ کہ ملاقات کی وجہ سے، اور اسی کا محلِ بحث ہونا مناسب ہے، اور زیادہ قریب ترین (وراجح) قول یہ ہے کہ یہ لوگوں کی عادات کے قبیل سے ہے۔

---

[1] متعدد مشائخِ دیوبند کا یہی موقف ہے، جیسا کہ پہلے گزرا۔ محمد رضوان۔

پس اگر یہ لوگوں کی عادات سے تعلق رکھتا ہو، تو ان کے لیے مباح ہے، کیونکہ مصافحہ کبھی عبادت کے طور پر ہوتا ہے، اور کبھی عادت کے طور پر، پس جس مصافحہ کو لوگ، عادت کے طور پر اختیار کریں، اس میں حرج نہیں ہوگا، پھر اگر اس مصافحہ کے ساتھ کوئی اس قسم کی (یعنی مبارک بادی والی) مصلحت وابستہ ہو، تو وہ اس مصلحت کی وجہ سے مستحب ہوگا، اور اگر اس کے ساتھ کوئی مفسدہ وابستہ ہو، تو اس مفسدہ کی وجہ سے حرام ہوگا، **واللہ اعلم** (مجلۃ العلوم الشرعیۃ)

”أحكامُ التهنئة بالعيدين“ کا ایک اور حوالہ

اور شیخ موصوف دکتور احمد بن حمد الونیس، عید کے موقع پر معانقہ کے متعلق تحریر فرماتے ہیں کہ:

حكم المعانقة عند التهنئة بالعيد:

حاصل ما وقفت عليه من كلام الفقهاء فى المعانقة عند التهنئة بالعيد قولان:

القول الأول: أن المعانقة عند التهنئة بعد صلاة العيد بدعة، وهذا قول أبى الطيب العظيم آبادى. [1]

ومنعها أيضاً ابن الحاج بقوله : وأما المعانقة فقد كرهها مالك وأجازها ابن عيينة ، أعنى عند اللقاء من غيبة كانت ، وأما فى العيد لمن هو حاضر معك فلا. [2]

القول الثانى: جواز المعانقة عند التهنئة بالعيد، إذا كانت على وجه العادة، وهذا قول الشيخ سليمان بن سحمان. [3]

---

[1] حيث قال فى عون المعبود : ۸۲/۱۴ ،وكذا المصافحة والمعانقة بعد صلاة العيدين من البدع المذمومة المخالفة للشرع .ونقل كلامه هذا المباركفورى فى تحفة الأحوذى :۴۲۷/۷ولم يتعقبه بشىء.

[2] المدخل: ۲۸۸/۲.

[3] أنظر: الدرر السنية :۲۳۳/۷.

والشيخ عبد الله بن جبرين. [1]

وهو مقتضى قول الشيخ ابن عثيمين. [2]

ويمكن أن يُستدل للقول الأول بأن المعانقة عند التهنئة بعد صلاة العيد تُعد من العبادات التى لا دليل عليها من الشرع، فتكون بدعة محدثة.

ويمكن مناقشته بأن هذه المعانقة إن كانت على وجه العبادة والقُربة فيُسَلَّم حينئذٍ بأنها بدعة؛ لعدم الدليل على مشروعيتها ، لكن واقع الناس أنهم لا يتعانقون عند التهنئة بالعيد على وجه العبادة ، بل يفعلون ذلک على وجه العادة ، إذ المعانقة ليست عبادة محضة، بل قد تفعل على وجه العبادة ، وقد تفعل على وجه العادة ، وإذا كان الناس يفعلونها على وجه العادة فالأصل فى العادات الجواز ، حتى يدل دليل على منعها ،ولا يُشترط لجوازها وجود الدليل.

ودليل القول الثانى : أن الظاهر من حال الناس عند المعانقة فى العيد أنهم يتعانقون على وجه العادة، لا على وجه العبادة، والعادات الأصل فيها الجواز. [3]

---

[1] حيث قال رحمه الله تعالى : ولا بأس بالمعانقة والمصافحة لكل من لقيه من إخوانه وأصدقائه وأقاربه؛ليكون ذلک سبباً فى إثبات المودة والمحبة من المسلمين بعضهم لبعض (فتاوى صلاة العيدين لابن جبرين ص ۹۴)

[2] فقد تقدم النقل عنه قريباً أن المعانقة يُرجع فيها إلى عادة الناس، ومتى كان فيها جلب مودة فإنها تفعل، وهذا متحقق فى المعانقة عند التهنئة بالعيد، والله أعلم .

[3] انظر: الدرر السنية :۷/۲۳۳،فتوى للشيخ سليمان بن سحمان، حيث قال رحمه الله تعالى فى جواب سؤال عن حكم المعانقة يوم العيد بعد الصلاة فى المصلى وسلام الناس بعضهم على بعض :"الظاهر أن ما يفعله الناس اليوم لا يفعلونه على وجه القربة والعبادة فيكون ذلک من البدع فى الدين ، وإنما يفعلونه فيما يظهر لى على سبيل العادة، والعادات لا مدخل لها فى العبادات"

وقد ترجح فی المسألة السابقة أن المعانقة لغير القادم من السفر يرجع فيها إلى ما اعتاده الناس ، فما اعتادوه فهو مباح ، ومنه المعانقة عند التهنئة بالعيد ، فإنها مما اعتاده الناس فتكون مباحة.

الترجيح:

الراجح القول الثانی؛ لما تقدم من الاستدلال له، ومناقشة دليل القول الأول.

كما أن المعانقة عند التهنئة بالعيد وإن كانت بعد صلاة العيد فلا يظهر فيها ما يؤثر على الحكم؛ لأن الظاهر من حال المعانِق أنه يعانِق لأجل التهنئة ذاتها ، لا أنه يعانِق لأجل الصلاة. [1]

فالمعانقة عند التهنئة بالعيد مباحة من حيث الأصل ، لكن إن ترتب على فعلها مصلحة فإنها تكون مشروعة، وإن ترتب عليها مفسدة كانت ممنوعة، والله أعلم ("أحكام التهنئة بالعيدين"مشمولة: مجلة العلوم الشرعية ،الرياض، السعودية،العدد السادس والثلاثون رجب 1436هـ ،صفحة ۷۷،۷۸)

ترجمہ: عید کی مبارک باد کے موقع پر معانقہ کا حکم:

عید کی مبارک باد کے موقع پر معانقہ سے متعلق، فقہاء کے جس کلام سے میں واقف ہوا، تو اس میں دو قول ہیں:

پہلا قول یہ ہے کہ عید کی نماز کے بعد مبارک باد کے موقع پر معانقہ کرنا بدعت ہے، یہ ابوطیب عظیم آبادی کا قول ہے (جو"عونُ المعبود"میں مذکور ہے)

اور ابنِ حاج نے بھی اس سے منع کیا ہے، چنانچہ انہوں نے فرمایا کہ"جہاں تک

---

[1] أنظر ماتقدم ص ۴۵، حاشية رقم"۲".

معانقہ کا تعلق ہے، تو اس کو امام مالک نے مکروہ قرار دیا ہے، اور ابنِ عیینہ نے جائز قرار دیا ہے، یعنی غائب ہونے کے بعد ملاقات کے موقع پر، جہاں تک عید کے دن اپنے ساتھ حاضر شخص سے معانقہ کا تعلق ہے، تو یہ درست نہیں۔

دوسرا قول یہ ہے کہ عید کی مبارک باد کے موقع پر معانقہ کرنا جائز ہے، جب کہ یہ عادت کے طور پر ہو، شیخ سلیمان بن سحمان کا یہی قول ہے، اور شیخ عبداللہ بن جبرین کا بھی یہی قول ہے۔

اور شیخ ابنِ عثیمین کے قول کا تقاضا بھی یہی ہے۔

اور پہلے قول کے لیے یہ دلیل پکڑنا ممکن ہے کہ عید کی نماز کے بعد مبارک باد کے موقع پر معانقہ کرنا، ان عبادات میں سے شمار کیا جاتا ہے، جن کی شریعت کی طرف سے دلیل نہیں، لہٰذا یہ بدعتِ محدثہ ہوگا۔

اور اس قول کا مناقشہ اس طور پر ممکن ہے کہ یہ معانقہ، اگر عبادت اور قُربت کے طور پر ہو، تو اس وقت میں اس کا بدعت ہونا مسلّم ہوگا، کیونکہ اس کی مشروعیت کی کوئی دلیل نہیں پائی جاتی، لیکن واقعہ یہ ہے کہ لوگ عید کی مبارک باد کے موقع پر، عبادت کے طور پر معانقہ نہیں کرتے، بلکہ عادت کے طور پر معانقہ کرتے ہیں، کیونکہ معانقہ، عبادتِ محضہ نہیں، بلکہ اس کو کبھی عبادت کے طور پر اختیار کیا جاتا ہے، اور کبھی عادت کے طور پر اختیار کیا جاتا ہے، اور جب لوگ اس کو عادت کے طور پر اختیار کریں، تو عادات کے اندر، اصل حکم جائز ہونے کا ہے، جب تک کہ کوئی دلیل اس کی ممانعت کی نہ پائی جائے، لیکن اس کے جائز ہونے کے لیے کسی دلیل کا پایا جانا، شرط نہیں۔

اور دوسرے قول کی دلیل یہ ہے کہ لوگوں کی حالت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ عید کے موقع پر آپس میں معانقہ، عادت کے طریقہ پر کرتے ہیں، عبادت کے طریقہ

پر نہیں کرتے، اور عادات کے اندر اصل حکم جائز ہونے کا ہے۔

اور پہلے مسئلہ میں یہ راجح قرار دیا جا چکا ہے کہ سفر سے آنے والے کے علاوہ کسی اور سے معانقہ کرنا، لوگوں کی عادات کے قبیل سے ہے، پس جس کی لوگوں کو عادت ہو، وہ مباح ہے، اور اسی قبیل سے عید کی مبارک باد کے موقع پر، معانقہ کرنا بھی ہے، کیونکہ یہ بھی لوگوں کی عادات کے قبیل سے ہے، لہٰذا یہ بھی مباح ہوگا۔

راجح قول دوسرا ہے، جس کی دلیل پہلے گزر چکی ہے، اور پہلے قول کا مناقشہ بھی گزر چکا ہے، جیسا کہ عید کے موقع پر، معانقہ کرنا، اگرچہ عید کی نماز کے بعد ہو، تو اس سے حکم پر کوئی اثر ظاہر نہیں ہوگا، کیونکہ معانقہ کرنے والے کی حالت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بذاتِ خود مبارک باد کی وجہ سے معانقہ کرتا ہے، نماز کی وجہ سے معانقہ نہیں کرتا۔

پس عید کی مبارک باد کے موقع پر معانقہ کرنا، اصل کے اعتبار سے مباح ہے، پھر اگر اس کے اختیار کرنے میں کوئی مصلحت ہو، تو وہ مشروع بھی کہلائے گا، اور اگر اس پر کوئی مفسدہ مرتب ہو، تو وہ ممنوع کہلائے گا، **و اللہ اعلم** (مجلۃ العلوم الشرعیۃ)

اور شیخ موصوف، مذکورہ مضمون کے خاتمہ میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

الخاتمة:

أختم هذا البحث بذكر أهم نتائجه:

1– التهنئة في الاصطلاح : هي مواجهة من أصابه خير بالسرور ، مع الدعاء له بالاستمتاع بهذا الخير.

2– أن الأصل في التهنئة أنها من العادات لا من العبادات ، لكن قد يقترن بها ما يجعلها مشروعة، وقد يقترن بها ما يجعلها منهياً عنها.

3- يُستحب الابتداء بالتهنئة بالعيد؛ لثبوت ذلك عن الصحابة رضى الله عنهم ، ولما فيه من جلب المودة بين المسلمين.

4- أن إجابة التهنئة بالعيد أقل أحوالها أن تكون مستحبة ، ويتعين القول بوجوب الإجابة إذا غلب على الظن ترتب المفسدة على تركها ، كحصول القطيعة والشحناء بين المسلمين.

5- الأولى فى ألفاظ التهنئة بالعيد الإتيان بالعبارة الواردة عن الصحابة رضى الله عنهم، وهى : تقبل الله منا ومنكم .وأما غيرها من عبارات التهنئة التى يعتادها الناس فهى جائزة، إذا لم يكن فيها محظور شرعى.

6- الأفضل أن تكون التهنئة فى يوم العيد ، وأما التهنئة قبل العيد بيوم ، أو فى ليلته فلا بأس بها إذا اعتاد الناس ذلك.

7- تجوز التهنئة بالعيد فى أيام التشريق، والأيام التى تلى يوم عيد الفطر.

8- المصافحة عند التهنئة بالعيد لا تخلو من أن تكون التهنئة عند اللقاء أو بعده ، فإن كانت التهنئة عند اللقاء فالمصافحة حينئذٍ سنة مُجمَع عليها؛ لأجل اللقاء ذاته ، لا لأجل التهنئة، وإن كانت المصافحة بعد اللقاء ، كما لو التقى بأخيه قبل صلاة العيد ، وصافحه، ثم صلَّيَا صلاة العيد معا ، وبعد الفراغ من الصلاة أو الخطبة هنأه بالعيد مصافحاً له، فالمصافحة حينئذٍ لأجل التهنئة ، لا لأجل اللقيا ، وهى التى ينبغى أن تكون محل البحث، والأقرب فيها أنها ترجع إلى ما اعتاده الناس ، فإن كان هذا من عاداتهم فهو

مباح لهم.

9- تجوز المعانقة عند التهنئة بالعيد.

10- التهنئة بالعيد عبر الوسائل الحديثة كالهاتف والفاكس والبريد الإلكتروني وبطاقات المعايدة ونحوها كحكم التهنئة عن طريق المقابلة ابتداءً وجوابا ، مع تقييدها بالضوابط الشرعية؛ لتبقى على أصل المشروعية ، وقد تقدم بيان هذه الضوابط في موضعها من البحث.

والحمد لله الذي بنعمته تتم الصالحات ، وصلى الله وسلم على نبينا محمد وآله وصحبه أجمعين ("أحكام التهنئة بالعيدين" مشمولة: مجلة العلوم الشرعية ، الرياض، السعودية، العدد السادس والثلاثون رجب 1436هـ، صفحة ۸۳، ۸۴)

ترجمہ: خاتمہ: میں اس بحث کو اہم نتائج کے ذکر پر ختم کرتا ہوں:

(1)......اصطلاح میں، مبارک باد، جس کو خوشی والی نعمت حاصل ہو، اس کا اس خبر کے سننے کے بعد، دعاء کے ساتھ استقبال کرنا ہے۔

(2)...... مبارک باد کے اندر اصل یہ ہے کہ وہ عادات کے قبیل سے ہے، عبادات کے قبیل سے نہیں، لیکن بعض اوقات اس کے ساتھ ایسی چیز وابستہ ہوجاتی ہے، جو اس کو مشروع قرار دے دیتی ہے، اور بعض اوقات ایسی چیز وابستہ ہوجاتی ہے، جو اس کو ممنوع قرار دیتی ہے۔

(3)......عید کی مبارک باد کی ابتداء مستحب ہے، کیونکہ یہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے ثابت ہے، اور اس میں مسلمانوں کے درمیان محبت ومودّت، پیدا ہونے کی تاثیر بھی ہے۔

(4)......عید کی مبارک بادی کے جواب دینے کا کم ترین درجہ یہ ہے کہ وہ مستحب ہو، اور اگر غالب گمان کے مطابق، اس کے جواب نہ دینے پر کوئی مفسدہ مرتب ہو، جیسا کہ قطع تعلقی، اور مسلمانوں کے درمیان، بغض وعداوت کا پیدا ہونا، تو اس صورت میں جواب دینے کا قول واجب ہوگا۔

(5)......عید کی مبارک باد کے الفاظ میں بہتر یہ ہے کہ وہ الفاظ اختیار کیے جائیں، جو صحابہ رضی اللہ عنہم سے وارد ہوئے ہیں، جو کہ یہ ہیں "**تقبل اللّٰہ منا ومنکم**" اور اس کے علاوہ مبارک بادی کے وہ الفاظ، جو لوگوں میں رائج ہوں، تو وہ بھی جائز ہیں، جب تک ان میں کوئی شرعی ممانعت نہ پائی جائے (جیسا کہ "عید مبارک")

(6)......افضل یہ ہے کہ مبارک باد، عید کے دن دی جائے، لیکن عید سے ایک دن پہلے، یا عید کی رات میں مبارک باد دینے میں بھی کوئی حرج نہیں، جب لوگوں میں اس کی عادت ہو۔

(7)......ایامِ تشریق میں عیدالاضحیٰ کی مبارک باد جائز ہے، اور عیدالفطر کے ساتھ جو دن متصل ہوں، ان میں بھی مبارک باد جائز ہے۔

(8)......عید کی مبارک باد کے موقع پر مصافحہ کرنا، دو حال سے خالی نہیں، یا تو مبارک باد، ملاقات کے وقت ہوگی، یا اس کے بعد ہوگی، اگر مبارک باد، ملاقات کے وقت ہو، تو اس وقت میں مصافحہ بالاجماع سنت ہے، بذاتِ خود ملاقات کی وجہ سے، نہ کہ مبارک بادی کی وجہ سے، اور اگر مصافحہ ملاقات کے بعد ہو، جیسا کہ اگر اپنے مسلمان بھائی سے، عید کی نماز سے قبل ملاقات ہوئی ہو، اور اس سے مصافحہ کرلیا، پھر دونوں نے ایک ساتھ نماز پڑھی، اور نماز، یا خطبہ سے فارغ ہوکر اس کو عید کی مبارک باد دی، اس سے مصافحہ کرتے ہوئے، تو اس وقت میں مصافحہ،

مبارک باد کی وجہ سے ہوگا، نہ کہ ملاقات کی وجہ سے، اور یہی مصافحہ محلِ بحث ہے، جس میں (دلائلِ قویہ کے) قریب ترین قول یہ ہے کہ یہ لوگوں کی عادات کے قبیل سے ہے، پس اگر یہ لوگوں کی عادات میں داخل ہو، تو ان کے لیے مباح ہے۔

(9)......عید کی مبارک باد کے موقع پر معانقہ کرنا، جائز ہے۔

(10)......عید کی مبارک باد، جدید وسائل اور ذرائع ابلاغ، مثلاً ٹیلی فون اور فیکس اور انٹرنیٹ اور مبارک باد کے کارڈ (عید کارڈ) وغیرہ کے ذریعہ سے دینے اور اس کا جواب دینے کا حکم، ایسا ہی ہے، جیسا کہ براہِ راست عید کی مبارک باد دینے اور اس کے جواب کا حکم ہے، جب کہ اس میں شرعی ضوابط کو ملحوظ رکھا گیا ہو، تاکہ یہ اصل مشروعیت پر باقی رہے، اور ان ضوابط کا بیان، اپنی بحث کے موقع پر گزر چکا ہے۔

اور تمام تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں، جس کی نعمت کے ذریعہ سے نیکیاں، پایۂ تکمیل تک پہنچتی ہیں، اور ہمارے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے تمام صحابہ پر اللہ، درود وسلام نازل فرمائے (مجلۃ العلوم الشرعیۃ)

مذکورہ عبارات سے معلوم ہوا کہ عید کی مبارک باد، اور اس موقع پر مصافحہ ومعانقہ، بطور عادت کے کرنے میں حرج نہیں، بلکہ اگر نیک نیتی اور حسنِ سلوک واظہارِ سرور وغیرہ کی غرض سے ہو، تو پھر مستحب لغیرہٖ کے درجہ میں داخل ہونے کی گنجائش ہے۔

اور عام طور پر لوگ، عید کے موقع پر مصافحہ ومعانقہ، مبارکباد کے وقت عادت کے طور پر کرتے ہیں، اور اس کو اظہارِ سرور کا ذریعہ سمجھتے ہیں، جس کی احادیث سے تائید ہوتی ہے، جیسا کہ تیسری فصل میں گزرا۔

دکتور احمد بن حمد نے، جس انداز میں مذکورہ مسئلہ پر آزادانہ انداز میں کلام کیا، اور اس میں کسی

مسلکی وغیر مسلکی تعصب کو دخیل نہیں بنایا، یہی طریقہ آج کل عرب کے بہت سے مصنفین و متخصصین میں جاری ہے، جو بعض جہات سے نہایت مستحسن طریقہ ہے، ہمارے دینی مدارس وجامعات کے طلبہ وعلماء کو بھی اس طرزِ عمل کو اپنانے کی ضرورت ہے، لیکن افسوس کہ ہمارے یہاں کے ایک بڑے علمی حلقہ میں اس طرزِ عمل کو اپنانا اور اختیار کرنا تو درکنار، اس طرزِ عمل کو اجنبی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، اور بعض اوقات اس پر بے جا نکیر بھی کی جاتی ہے، جس کی وجہ سے تحقیق کے میدان میں ترقی کی رفتار کم ہے، اور اس کے مقابلے میں روایتی وتقلیدی کام زیادہ ہے۔

بہر حال مذکورہ عبارات وحوالہ جات سے معلوم ہوا کہ عید کی نماز اور دوسری نمازوں کے بعد، مصافحہ کا مسئلہ مختلف فیہ ومجتہد فیہ ہے، اور عید، نکاح وغیرہ کی مبارک باد دیتے ہوئے، اظہارِ سرور وبشاشت کا ذریعہ سمجھتے ہوئے اور اسی طرح تعزیت کے موقع پر اظہارِ ہمدردی کا ذریعہ سمجھتے ہوئے، مصافحہ ومعانقہ کرنا گناہ نہیں، بلکہ بہت سے حضرات کے نزدیک مستحب ہے، جس پر نکیر اور تشدد سے اجتناب کرنے کی ضرورت ہے۔

واللہ تعالیٰ اعلم

خلاصۂ کلام

شروع سے اب تک جو بحث کی گئی، اس کا خلاصہ یہ نکلا کہ مختلف احادیث وروایات سے ملاقات اور سفر وغیرہ کے مواقع پر مصافحہ ومعانقہ کرنا ثابت ہے، جن کا اہم مقصد باہمی الفت ومحبت کا پیدا کرنا اور ایک دوسرے کا دل خوش کرنا ہے۔

اور عیدین کے موقع پر مبارکباد دینے کا جائز، بلکہ مستحب ہونا راجح ہے۔

اور عید کے دن منکرات سے بچتے ہوئے، خوشی اور سرور کا اظہار کرنا، نہ صرف یہ کہ جائز ہے، بلکہ باعثِ اجر وثواب ہے، جس کو دوسرے دنوں سے خاص امتیازی مقام حاصل ہے۔

اور نمازوں یا مخصوص نمازوں کے بعد مصافحہ کرنے میں اختلاف ہے، بعض بدعتِ مکروہہ اور بعض مباحہ، بلکہ بعض مستحب کہتے ہیں، اور وہ نماز میں مشغولی کو''غیبوبتِ حکمية ''شمار کر کے اس کو''غیبوبتِ حسية ''کے ساتھ لاحق کرتے ہیں، لہٰذا اس مسئلہ کے مجتہد فیہ و مختلف فیہ ہونے کی وجہ سے اس میں زیادہ سختی وتشدد مناسب نہیں۔ [1]

---

[1] وقد اختلف فقهاء المذاهب فى حكم المصافحة عقب الصلوات وبخاصة صلاتى العصر والصبح ويظهر من عباراتهم أن فيها ثلاثة أقوال :قول بالاستحباب، وآخر بالإباحة، وثالث بالكراهة.

أما القول بالاستحباب فقد استنبطه بعض شراح الحنفية من إطلاق عبارات أصحاب المتون، وعم نصهم على استثناء المصافحة بعد الصلوات، قال الحصكفى :وإطلاق المصنف -التمرتاشى -تبعا للدرر والكنز والوقاية والنقاية والمجمع والملتقى وغيرها يفيد جوازها مطلقا ولو بعد العصر، وقولهم :إنه بدعة، أى مباحة حسنة كما أفاده النووى فى أذكاره، وعقب ابن عابدين على ذلك بعد أن ذكر بعض من قال باستحبابها مطلقا من علماء الحنفية بقوله :وهو الموافق لما ذكره الشارح من إطلاق المتون، واستدل لهذا القول بعموم النصوص الواردة فى مشروعية المصافحة وممن ذهب إلى هذا القول من الشافعية المحب الطبرى وحمزة الناشرى وغيرهما، وقالوا باستحباب المصافحة عقب الصلوات مطلقا ، واستأنس الطبرى بما رواه أحمد والبخارى عن أبى جحيفة رضى الله عنه قال :خرج رسول الله صلى الله عليه وسلم بالهاجرة إلى البطحاء ، فتوضأ ثم صلى الظهر ركعتين والعصر ركعتين وبين يديه عنزة تمر من ورائها المرأة وقام الناس فجعلوا يأخذون يديه فيمسحون بها وجوههم، قال أبو جحيفة :فأخذت بيده، فوضعتها على وجهى، فإذا

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

اورخاص عیدین کے دن معانقہ کرنے کے سنت ہونے کا احادیث وسنت اورفقہائے کرام کی تصریحات سے ذکرنہیں ملتا، اسی لیے بہت سے اصحابِ علم وفقہ حضرات نے عیدین کے دن ملاقات، یا سفر کا سبب پائے بغیر محض عید کا موقع ہونے کی بنیاد پر مصافحہ ومعانقہ کرنے کو

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

هی أبرد من الثلج وأطيب رائحة من المسک ، قال المحب الطبری :ويستأنس بذلک لما تطابق عليه الناس من المصافحة بعد الصلوات فی الجماعات لا سيما فی العصر والمغرب إذا اقترن به قصد صالح من تبرک أو تودد أو نحوه.

وأما القول بالإباحة فقد ذهب إليه العز بن عبد السلام من الشافعية، حيث قسم البدع إلى خمسة أقسام :واجبة ومحرمة ومكروهة ومستحبة ومباحة، ثم قال :وللبدع المباحة أمثلة منها المصافحة عقيب الصبح والعصر. ونقل ابن علان عن المرقاة أنه مع كونها من البدع فإذا مد مسلم يده إليه ليصافحه فلا ينبغی الإعراض عنه بجذب اليد لما يترتب عليه من أذی يزيد علی مراعاة الأدب، وإن كان يقال إن فيه نوع إعانة علی البدعة وذلک لما فيه من المجابرة.

واستحسن النووی فی المجموع -كما نقله ابن علان -كلام ابن عبد السلام واختار أن مصافحة من كان معه قبل الصلاة مباحة ومن لم يكن معه قبل الصلاة سنة، وقال فی الأذكار :واعلم أن هذه المصافحة مستحبة عند كل لقاء ، وأما ما اعتاده الناس من المصافحة بعد صلاتی الصبح والعصر فلا أصل له فی الشرع علی هذا الوجه، ولكن لا بأس به، فإن أصل المصافحة سنة، وكونهم حافظوا عليها فی بعض الأحوال وفرطوا فيها فی كثير من الأحوال أو أكثرها لا يخرج ذلک البعض عن كونه من المصافحة التی ورد الشرع بأصلها.

وأما القول بالكراهة فقد نقله ابن عابدين عن بعض علماء المذهب، وقال :قد يقال :إن المواظبة عليها بعد الصلوات خاصة قد يؤدی بالجهلة إلی اعتقاد سنيتها فی خصوص هذه المواضع، وأن لها خصوصية زائدة علی غيرها، مع أن ظاهر كلامهم أنه لم يفعلها أحد من السلف فی هذه المواضع، وذكر أن منهم من كرهها لأنها من سنن الروافض.

واعتبر ابن الحاج هذه المصافحة من البدع التی ينبغی أن تمنع فی المساجد، لأن موضع المصافحة فی الشرع إنما هو عند لقاء المسلم لأخيه لا فی أدبار الصلوات الخمس، فحيث وضعها الشرع توضع، فينهی عن ذلک ويزجر فاعله، لما أتی من خلاف السنة (الموسوعة الفقهية الكويتية، ج٣٧، ص ٣٦٢، وص ٣٦٣، مادة "مصافحة")

اعلم أن المصافحة مستحبة عند كل لقاء، وأما ما اعتاده الناس من المصافحة بعد صلاة الصبح والعصر، فلا أصل له فی الشرع علی هذا الوجه ولكن لا بأس به، فإن أصل المصافحة سنة وتقييدها بما بعد الصبح والعصر عادة كانت فی زمانه، وإلا فعقب الصلوات كلها كذلک .والراجح عند الحنفية جواز المصافحة مطلقا ولو بعد الصلوات .وكره بعض الحنفية المصافحة بعد الصلاة (الفقه الاسلامی وادلتہ للزحيلی، ج۴ص ٢٦٦٠، وص ٢٦٦١،القسم الاول، العبادات، الباب السابع، المبحث الرابع)

مکروہ، یا بدعت قرار دیا ہے، اور اس سے بچنے کی تلقین فرمائی ہے، بندہ نے اپنی بعض تالیفات میں اسی موقف کو نقل کیا تھا، جس کی طرف دلائل کے پیشِ نظر اب بندے کا رجحان نہ رہا۔

بلکہ اب تمام پہلوؤں پر غور وفکر کے بعد راجح یہ معلوم ہوا کہ اگر ملاقات، یا سفر کا سبب نہ پائے جانے کی صورت میں محض عیدین کا موقع ہونے کی بنا پر، خواہ عید کی نماز کے بعد ہو، یا اس سے آگے پیچھے، اظہارِ سرور کے طور پر مبارک باد دیتے ہوئے، ایک دوسرے کے ساتھ معانقہ کیا جائے، تو اس میں حرج نہیں، بلکہ بعض جہات سے مستحب لغیرہٖ ہے۔

بعض متاخرین ومعاصرین کے علاوہ سابق ادوار کے بعض فقہائے کرام ومشائخِ عظام سے بھی اس کا ثبوت دستیاب ہوا۔

نیز نکاح کی مبارکباد دیتے وقت اظہارِ سرور کے طور پر دوسرے سے معانقہ کرنا، اور تعزیت کے موقع پر اظہارِ ہمدردی کے طور پر معانقہ کرنا بھی جائز ہے۔

لیکن اس کو عقیدے کے اعتبار سے ضروری، یا خاص اس موقع کی سنت نہ سمجھا جائے، بلکہ مذکورہ مقاصد کا ایک ذریعہ اور وسیلہ سمجھ کر اختیار کیا جائے۔

اگر کسی کو اس رائے سے اختلاف ہو، تب بھی اس مسئلہ کے مجتہد فیہ ومختلف فیہ ہونے کی وجہ سے عوامُ الناس کے لیے، اس مسئلہ میں شدت اور نکیر والا طرزِ عمل اختیار کرنے سے پرہیز کرنا مناسب معلوم ہوا، جس کے دلائل، ماقبل میں ذکر کیے جا چکے ہیں۔

فقط

وَاللہُ سُبْحَانَهٗ وَ تَعَالٰی اَعْلَمُ وَ عِلْمُهٗ اَتَمُّ وَ اَحْكَمُ

محمد رضوان خان

یکم/صفر المظفر / 1441 ہجری۔ بمطابق یکم/ اکتوبر/ 2019ء بروز منگل

ادارہ غفران راولپنڈی پاکستان

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

علمی وتحقیقی سلسلہ

عید کے اہم مسائل

عیداور نمازِ عید کے اہم مسائل
کرفیو اور لاک ڈاؤن کی حالت میں
نمازِ عید کا حکم اور اس کا طریقہ

مؤلف
مفتی محمد رضوان خان

ادارہ غفران راولپنڈی پاکستان
www.idaraghufran.org

فہرست

صفحہ نمبر	مضامین
473	**تمہید** (من جانبِ مؤلف)
474	**عید کے اہم مسائل**
//	’’عیدُ الفطر‘‘ کے معنیٰ
475	عید کی حکمت
477	نمازِ عید کا حکم
479	نمازِ عید واجب ہونے کی شرائط
482	نمازِ عید صحیح واداء ہونے کی شرائط
485	نمازِ عید کے لیے مسجد وغیر مسجد کا حکم
488	خواتین کے لیے نمازِ عید کا حکم
492	نمازِ عید کی ادائیگی کا وقت
497	نمازِ عید کا طریقہ اور چند متعلقہ مسائل
499	حنفیہ کے نزدیک عید کی نماز کا طریقہ
502	مالکیہ کے نزدیک عید کی نماز کا طریقہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تمہید

(من جانبِ مؤلف)

آج کل کرونا وائرس کی وجہ سے مختلف مما لک میں لاک ڈاؤن اور کرفیو وغیرہ کی صورتِ حال ہے، سماجی فاصلوں اور دُوریوں کی وجہ سے لوگ، ایک دوسرے کے ساتھ اجتماع واختلاط سے مجتنِب ومحترز ہیں، یا ان کو اس کی تعلیم وتلقین کی جارہی ہے۔

ایسے حالات میں ماہِ رمضان کا مبارک مہینہ شروع ہو کر اختتام کے مراحل کے قریب ہے۔

جس کے بعد عیدُ الفطر کا مبارک موقع آرہا ہے۔

بعض احباب کی خواہش پر عید کے اہم مسائل سے متعلق ایک مختصر مضمون بعجلت ترتیب دیا گیا ہے، جس میں مختلف مذاہب ومسالک کے فقہائے کرام کے اقوال کی روشنی میں عید اور نمازِ عید کے متعلق چند اہم مسائل کا حکم بیان کیا گیا ہے۔

اسی کے ساتھ ساتھ موجودہ مخصوص صورتِ حال سے متعلق ایک سوال کا جواب بھی شامل کیا گیا ہے، اور آخر میں دو فتاویٰ بھی شامل کر لیے گئے ہیں، تاکہ موجودہ حالات میں دنیا بھر کے مختلفُ الانواع حالات میں امتِ مسلمہ کو رہنمائی حاصل ہو سکے۔

اور چونکہ موجودہ زمانے میں مسلمان، دنیا کے مختلف خطوں میں آباد ہیں، جہاں کے حالات بھی ایک دوسرے سے مختلف ہیں، اس لیے اہم مسائل میں حنفیہ کے علاوہ دیگر فقہائے کرام کے اقوال پر بھی اس مضمون میں اختصار کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے۔

اللہ تعالیٰ امتِ مسلمہ کی ہر طرح کے فتنوں سے حفاظت فرمائے۔ آمین

وَاللّٰہُ سُبْحَانَہٗ وَتَعَالٰی اَعْلَمُ.

محمد رضوان خان 27 / رمضانُ المبارک / 1441ھ 21 / مئی / 2020 بروز جمعرات

ادارہ غفران، راولپنڈی، پاکستان

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عید کے اہم مسائل

’’عیدُ الفطر‘‘ کے معنیٰ

شوّال کے مہینہ کے پہلے دن کا آغاز ’’عیدُ الفطر‘‘ کے ساتھ ہوتا ہے، اور ’’عیدُ الفطر‘‘ دو لفظوں کا مجموعہ ہے: (1)......عید (2)......الفطر

اور عیدُ الفطر کے جملہ میں ’’عید‘‘ کی نسبت ’’فطر‘‘ کی طرف ہو رہی ہے۔

فطر کے معنیٰ ’’افطار کرنے‘‘ کے ہیں جس سے یہاں مراد روزوں کی فرضیت کے بعد افطار یعنی روزے نہ رکھنے کی اجازت مل جانا ہے کہ رمضان المبارک کے مہینہ میں جو روزے رکھنے کی پابندی تھی، وہ شوال کے آغاز پر ختم ہو جاتی ہے۔

’’عید‘‘ عربی کا لفظ ہے، جس کے عربی میں کئی معنیٰ آتے ہیں۔

ایک معنیٰ خوشی کے ہیں اور کیونکہ عیدین کے دِنوں میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے خوشی کا موقع حاصل ہوتا ہے، اس لئے اس کو عید کہا جاتا ہے۔

اور عید کے ایک معنیٰ ’’عود کرنے اور لوٹنے‘‘ یا لوٹ کر آنے کے ہیں، اور کیونکہ عید کے دن بندوں کی عبادتوں پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے مختلف انعامات واحسانات کا اعادہ کیا جاتا ہے، مثلاً روزے میں کھانے پینے کی ممانعت کے بعد افطار کی اجازت، صدقۂ فطر کا حکم۔

نیز یہ موقع ہر سال لوٹ کر آتا ہے، اس لیے اس کو ’’عید‘‘ کا نام دیا جاتا ہے۔

اس کے علاوہ اور وجوہات بھی عید کا نام رکھنے کی بیان کی گئی ہیں۔ [1]

---

[1] أی :الفطر والأضحی .قیل :إنما سمی العید عیدا لأنہ یعود کل سنة، وھو مشتق من العود، فقلبت الواو یاء لسکونھا وانکسار ما قبلھا .وفی الأزھار :کل اجتماع للسرور، فھو عند العرب

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

عید کی حکمت

ہر قوم اور ملّت میں سال کے کچھ دن، زیب وزینت اختیار کرنے اور خوشی کا اظہار کرنے، اور جشن منانے کے لئے مقرر ہوتے ہیں، جس کا انسانی فطرت تقاضا کرتی ہے، اور ان دنوں کو عام بول چال میں ''تہوار'' کہا جاتا ہے، اور لوگ اپنے اپنے مذہب اور طور طریقوں کے مطابق ان دنوں کو مناتے ہیں۔

تہوار منانے کے لئے ہر قوم کا مزاج ومذاق، انداز اور طور طریقے مختلف ہوسکتے ہیں، لیکن ان سب میں ایک بات مشترک طور پر پائی جاتی ہے اور وہ ''خوشی منانا'' ہے۔

شریعتِ مطہرہ نے انسانی فطرت کا تقاضا پورا کرنے کے لیے عبادت کے طور پر عید کا دن مقرر کیا ہے، جس کا طریقہ دوسرے مذاہب سے مختلف اور خالص عبادت اور سنجیدہ خوشی وفرحت پر مشتمل ہے، اور دوسرے مختلف مذاہب اور اقوام میں پائی جانے والی بے اعتدالیوں سے پاک بھی ہے۔ [1]

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾ عيد لعود السرور بعوده .وقيل :لأن الله تعالى يعود على العباد بالمغفرة والرحمة، ولذا قيل :ليس العيد لمن لبس الجديد، إنما العيد لمن أمن الوعيد، وجمعه أعياد وإن كان أصله الواو لا الياء للزومها فى الواحد، أو للفرق بينه وبين أعواد الخشب(مرقاة المفاتيح، ج٣ص ١٠٦٠ ، كتاب الصلاة ،باب صلاة العيدين)

سمى العيد بهذا الاسم لأن الله تعالىٰ فيه عوائد الاحسان اى انواع الاحسان العائدة على عباده فى كل عام : منهاالفطر بعد المنع عن الطعام وصدقة الفطر واتمام الحج بطواف الزيارة ولحوم صلاة العيدين سبب التسمية :سمى العيد بهذا الاسم؛ لأن لله تعالى فيه عوائد الإحسان أى أنواع الإحسان العائدة على عباده فى كل عام، منها الفطر بعد المنع عن الطعام وصدقة الفطر، وإتمام الحج بطواف الزيارة، ولحوم الأضاحى وغيرها؛ ولأن العادة فيه الفرح والسرور والنشاط والحبور غالبا بسبب ذلک، وأصل معنى (عيد) لغة :عود، والعود هو الرجوع، فهو يعود ويتكرر بالفرح كل عامة(الفقه الاسلامى وادلتهٔ للزحيلى، ج٢،ص ١٣٨٦ ،القسم الأول :العبادات،الباب الثانى: الصلاة ،الفصل العاشر،المبحث الرابع)

[1] صلاة العيدين :حكمة مشروعيتها:

الحكمة من مشروعية العيدين :أن كل قوم لهم يوم يتجملون فيه ويخرجون من بيوتهم بزينتهم .

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

قَدِمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْمَدِيْنَةَ وَلَهُمْ يَوْمَانِ يَلْعَبُوْنَ فِيْهِمَا، فَقَالَ: مَا هٰذَانِ الْيَوْمَانِ؟ قَالُوْا: كُنَّا نَلْعَبُ فِيْهِمَا فِي الْجَاهِلِيَّةِ، فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: إِنَّ اللّٰهَ قَدْ أَبْدَلَكُمْ بِهِمَا خَيْرًا مِّنْهُمَا: يَوْمَ الْأَضْحٰى، وَيَوْمَ الْفِطْرِ (سنن ابی داؤد، رقم الحديث ١١٣٤، كتاب الصلاة، باب صلاة العيدين، مسنداحمد، رقم الحديث ١٢٨٢٧) [1]

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (مکہ مکرمہ سے ہجرت فرما کر) مدینہ منورہ تشریف لائے تو مدینے کے لوگ (جن میں کئی لوگ پہلے ہی سے اسلام قبول کر چکے تھے) دودنوں میں کھیل کود کیا کرتے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پوچھا کہ یہ دودن کیا ہیں؟ انہوں نے عرض کیا کہ ہم جاہلیت میں (اسلام سے پہلے) ان دودنوں میں کھیل کود کیا کرتے تھے (بس وہی رواج اب تک چل رہا ہے) تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں اِن دودنوں کے بدلے میں اِن سے بہتر دودن عطا فرما دیئے ہیں (اب وہی تمہارے قومی اور مذہبی تہوار ہیں) ایک عیدالاضحیٰ کا دن، اور دوسرا عیدالفطر کا دن (ابوداؤد، مسند احمد)

وہ دودن جن میں مدینہ کے لوگ کھیل کود کیا کرتے تھے ان کے نام ''نیروز'' اور ''مہرجان'' تھے۔

چنانچہ اسلام نے ان دودِنوں کے بدلے میں پورے سال میں اُمَّتِ مسلمہ کے لئے عید کے

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

فقد ورد عن أنس -رضى الله عنه- أنه قال: كان لأهل الجاهلية يومان فى كل سنة يلعبون فيهما، فلما قدم النبى صلى الله عليه وسلم المدينة قال: كان لكم يومان تلعبون فيهما وقد أبدلكم الله بهما خيرا منهما: يوم الفطر ويوم الأضحى (الموسوعة الفقهية الكويتية، ج٢٧، ص٢٤٠، مادة''صلاة العيدين'')

[1] قال شعيب الارنؤوط: إسناده صحيح على شرط الشيخين من جهة يزيد بن هارون، وأما متابعه سهل بن يوسف، فمن رجال البخارى وأصحاب السنن (حاشية مسند احمد)

یہ دو دن مقرر کئے ہیں، ایک عیدُ الاضحیٰ کا دن اور دوسرے عید الفطر کا دن۔
اور دوسری قوموں کے تہواروں کے منانے سے اسلام نے منع فرمادیا، بلکہ دوسری قوموں کے مقابلہ میں اسلامی عید کے دن مقرر فرمائے، اور اسی وجہ سے مسلمانوں کو عیدین کے دن منانا عبادت ہے، اور کافروں کے مذہبی تہواروں کو منانا، اور اِن میں اعانت وشرکت منع ہے۔

نمازِ عید کا حکم

عید کے دن دو رکعت اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں شکرانہ کے طور پر مقرر کی گئی ہیں، جس کو عید کی نماز کہا جاتا ہے۔
نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک قول وفعل اور بعض آیات کی تفاسیر سے ''عید کے دن'' نمازِ عید کا ثبوت ملتا ہے۔
نیز عید کی نماز کے مشروع ہونے پر امت کا اجماع بھی ہے، اگرچہ اس کے درجہ کی تعیین میں فقہائے کرام کا کچھ اختلاف بھی ہے۔ [1]

---

[1] مضمون البحث :الكلام عن صلاة العيد يتناول أدلة مشروعيتها، وحكمها الفقهي، ووقتها وموضعها، وكيفيتها أو صفتها، وخطبتها، وحكم التكبير في العيدين، وسنن العيد أو مستحباته أو وظائفه، والتنفل قبل العيد وبعده، كيفية صلاته صلى الله عليه وسلم صلاة عيد الفطر والأضحى وكيفية خطبته.
أولا ــ أدلة مشروعية صلاة العيد :شرعت صلاة العيد في السنة الأولى من الهجرة، بدليل ما روى أنس :قدم رسول الله صلى الله عليه وسلم المدينة، ولهم يومان يلعبون فيهما، فقال :ما هذان اليومان؟ قالوا :كنا نلعب فيهما في الجاهلية، فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم :إن الله قد أبدلكما خيرا منهما :يوم الأضحى، ويوم الفطر.
وأدلة مشروعيتها :الكتاب والسنة والإجماع:
أما الكتاب :فقوله تعالى :(فصل لربک وانحر)المشهور في التفسير :أن المراد بذلک صلاة العيد أي صلاة الأضحى والذبح.
وأما السنة :فثبت أن رسول الله صلى الله عليه وسلم بالتواتر كان يصلي صلاة العيدين .وأول عيد صلاه صلى الله عليه وسلم :عيد الفطر في السنة الثانية من الهجرة .قال ابن عباس :شهدت صلاة الفطر مع رسول الله صلى الله عليه وسلم وأبي بكر وعمر، فكلهم يصليها قبل الخطبة وعنه أن النبي صلى الله عليه وسلم صلى العيد بغير أذان ولا إقامة(الفقه الاسلامي وادلتهٔ للزحيلي، ج٢، ص١٣٨٦، ١٣٨٧، القسم الأول،الباب الثاني :الصلاة ،الفصل العاشر،المبحث الرابع)

عید کی نماز حنفیہ کے مفتیٰ بہ قول کی رُو سے واجب ہے۔

اور شافعیہ اور مالکیہ کے نزدیک، عید کی نماز سنتِ مؤکدہ ہے۔

جبکہ حنابلہ کے نزدیک، عید کی نماز فرضِ کفایہ ہے کہ اگر شہر میں کچھ لوگ مثلاً چالیس افراد، نمازِ عید کو ادا کرلیں، تو باقی لوگ گناہ گار نہیں ہوتے، جیسا کہ جنازہ کا حکم بھی اسی طرح سے فرضِ کفایہ کا ہے کہ چند لوگوں کے ادا کرنے سے دوسرے لوگ گناہ گار نہیں رہتے۔ [1]

اس سے معلوم ہوا کہ عید کی نماز کے بارے میں فقہائے مجتہدین میں سے ایک رائے فرضِ کفایہ ہونے کی ہے، جوکہ حنابلہ کی ہے، دوسری رائے واجب علی العین ہونے کی ہے، جوکہ حنفیہ کی ہے، اور تیسری رائے سنتِ مؤکدہ ہونے کی ہے، جوکہ مالکیہ اور شافعیہ کی ہے، اور شافعیہ کے نزدیک ہر ایک کو عید کی نماز باجماعت پڑھنا ضروری نہیں، بلکہ بغیر جماعت کے، اور مسافر اور عورت کو بھی عید کی نماز کا اپنے مقام پر رہتے ہوئے پڑھنا جائز ہے، جیسا کہ آگے آتا ہے۔ [2]

---

[1] حکم صلاة العيدين :صلاة العيدين واجبة على القول الصحيح المفتى به عند الحنفية - والمراد من الواجب عند الحنفية :أنه منزلة بين الفرض والسنة -ودليل ذلك :مواظبة النبى صلى الله عليه وسلم عليها من دون تركها ولو مرة، وأنه لا يصلى التطوع بجماعة -ما خلا قيام رمضان وكسوف الشمس وصلاة العيدين فإنها تؤدى بجماعة

فلو كانت سنة ولم تكن واجبة لاستثناها الشارع كما استثنى التراويح وصلاة الخسوف .

أما الشافعية والمالكية :فقد ذهبوا إلى القول بأنها سنة مؤكدة .ودليلهم على ذلك :قوله صلى الله عليه وسلم فى الحديث الصحيح للأعرابى -وكان قد ذكر له الرسول صلى الله عليه وسلم الصلوات الخمس فقال له :هل على غيرهن؟ قال لا، إلا أن تطوع .

قالوا :ولأنها صلاة ذات ركوع وسجود لم يشرع لها أذان فلم تجب بالشرع، كصلاة الضحى .

وذهب الحنابلة إلى القول بأنها فرض كفاية؛ لقوله تعالى :(فصل لربك وانحر) ، ولمداومة الرسول صلى الله عليه وسلم على فعلها (الموسوعة الفقهية الكويتية، ج٢٧، ص ٢٤٠، مادة"صلاة العيدين")

[2] ثانيا۔ حكمها الفقهى :يتردد حكم صلاة العيد بين آراء ثلاثة :كونها فرض كفاية، أو واجبا، أو سنة۔

فقال الحنابلة فى ظاهر المذهب :صلاة العيد فرض كفاية، إذا قام بها من يكفى سقطت عن الباقين،

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

نمازِ عید واجب ہونے کی شرائط

حنفیہ کے نزدیک عید کی نماز واجب ہونے کی وہی شرائط ہیں، جو نمازِ جمعہ کی ہیں، سوائے خطبہ کے، کہ وہ عید کی نماز صحیح ہونے کے لیے ضروری نہیں، بلکہ سنت ہے۔

اور اگرچہ عام حالات میں عید کی نماز کا بڑے مجمع کے ساتھ پڑھنا سنت و مستحب ہے، اور کوئی عذر نہ ہو، تو عید کی نماز، آبادی سے باہر نکل کر بڑے میدان، یا عیدگاہ میں پڑھنا مناسب ہے، اور عید کی نماز ایک شہر، یا آبادی میں کئی جگہ پڑھنا بھی جائز ہے، مگر حتی الامکان ہر محلّہ

﴿ گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ ﴾

أی كصلاة الجنازة، للآية السابقة (فصل لربک وانحر)وهی صلاة العيد فی المشهور فی السير، وكان النبی صلى الله عليه وسلم والخلفاء بعده يداومون عليها، ولأنها من أعلام الدين الظاهرة، فكانت واجبة كالجهاد، ولم تجب عينا على كل مسلم، لحديث الأعرابی الآتی :إلا أن تطوع المقتضی نفی وجوب صلاة، سوى الخمس، وإنما وجب العيد بفعل النبی صلى الله عليه وسلم، ومن صلى معه.

فإن تركها أهل بلد يبلغون أربعين بلا عذر، قاتلهم الإمام كالأذان؛ لأنها من شعائر الإسلام الظاهرة، وفی تركها تهاون بالدين.

وقال الحنفية فی الأصح :تجب صلاة العيدين على من تجب عليه الجمعة بشرائطها المتقدمة سوى الخطبة، فإنها سنة بعدها.ودليلهم على الوجوب :مواظبة النبی صلى الله عليه وسلم عليها.

وقال المالكية والشافعية :هی سنة مؤكدة تلی الوتر فی التأكيد، لمن تجب عليه الجمعة :وهو الذكر البالغ الحر المقيم ببلد الجمعة، أو النائی عنه كبعد فرسخ (5544م) منه، ولا تندب عند المالكية لصبی وامرأة وعبد ومسافر لم ينو إقامة تقطع حكم السفر، وندبت لغير المرأة الشابة، ولا تندب لحاج ولا لأهل منى، ولو غير حاجين.

وتشرع عند الشافعية للمنفرد كالجماعة، والعبد والمرأة والمسافر والخنثى والصغير، فلا تتوقف على شروط الجمعة من اعتبار الجماعة والعدد وغيرهما .وهی أفضل فی حق غير الحاج بمنى من تركها بالإجماع.

ودليلهم على سنيتها :قوله صلى الله عليه وسلم للأعرابی السائل عن الصلاة :خمس صلوات كتبهن الله تعالى على عباده، قال له :هل علی غيرها؟ قال :لا، إلا أن تطوع وكونها مؤكدة : لمواظبته صلى الله عليه وسلم عليها.

والتهنئة بالعيد والأعوام والأشهر مشروعة مباحة، لا سنة فيها ولا بدعة(الفقه الاسلامی وادلتہٗ للزحيلی،ج۲،ص۱۳۸۸و ۱۳۸۹،القسم الأول :العبادات،الباب الثانی :الصلاة ،الفصل العاشر،المبحث الرابع)

میں چھوٹے چھوٹے اجتماعوں کی بجائے کم از کم مقامات پر بڑے بڑے اجتماعات کی کوشش کرنی چاہیے۔

تاہم حنفیہ کے مشہور قول اور عام ضابطہ وقاعدہ کے مطابق عید کی نماز صحیح ہونے کے لئے کم از کم امام کے علاوہ تین آدمیوں کا ہونا ضروری ہے، جو امام کے ساتھ شروع نماز سے شریک ہوں۔ [1]

---

[1] والأحكام التي سبقت بالنسبة للعدد الذي تنعقد به الجماعة إنما هو في غير الجمعة والعيد؛ إذ فيهما يختلف العدد -ولكل مذهب رأيه في تحديد العدد، حسبما يستند إليه من أدلة (الموسوعة الفقهية الكويتية، ج۲۷، ص ۱۷۰، مادة "صلاة الجماعة")

أما بيان شرائط وجوبها فكل ما هو شرط وجوب الجمعة فهو شرط وجوب صلاة العيدين من الإمام والمصر والجماعة إلا الخطبة فإنها سنة بعد الصلاة بإجماع الصحابة.

وشرط الشيء يكون سابقا عليه أو مقارنا له (تحفة الفقهاء للسمرقندي، ج ۱، ص ۱۶۶، كتاب الصلاة، باب صلاة العيدين)

ومن شرائطها :الجماعة وأقلهم عند أبي حنيفة ثلاثة سوى الإمام وقال أبو يوسف ومحمد :اثنان سوى الإمام(مختصر القدوري، ص ۳۹، ۴۰، كتاب الصلاة، باب صلاة الجمعة)

قوله واشتراط الجماعة لها :أي لصلاة الجمعة وفيه أن الجماعة كما هي شرط لها شرط لصلاة العيدين .

قوله وكونها : بالجر عطف على الجماعة أي واشتراط كون الجماعة ثلاثة سوى الإمام وفيه أن كونها ثلاثة سوى الإمام ليس شرطا خاصا بالجمعة بل كذلك صلاة العيدين .

قوله والخطبة :أي اشتراط الخطبة لها بخلاف صلاة العيدين فإن الخطبة ليست شرطا لها ولو اقتصر على اشتراط الخطبة لها لكان صوابا وقد يقال المختص بها اشتراط المجموع لا كل واحد (غمز عيون البصائر شرح كتاب الأشباه والنظائر، ج۴،ص ۲۶،الفن الثالث من الأشباه والنظائر وهو فن الجمع والفرق،القول في أحكام يوم الجمعة)

(قوله وأقلها اثنان) لحديث اثنان فما فوقهما جماعة أخرجه السيوطي في الجامع الصغير، ورمز لضعفه .قال في البحر :لأنها مأخوذة من الاجتماع، وهما أقل ما تتحقق به، وهذا في غير جمعة اهـ أي فإن أقلها فيها ثلاثة صالحون للإمامة سوى الإمام، مثلها العيد لقولهم :يشترط لها ما يشترط للجمعة صحة وأداء سوى الخطبة فافهم(رد المحتار على الدر المختار، ج ۱، ص ۵۵۳، كتاب الصلاة، باب الإمامة)

واشتراط الجماعة لها وكونها ثلاثة سوى الإمام (ردالمحتار، ج۲ص ۱۶۵، كتاب الصلاة، باب الجمعة)

تثنية عيد، وأصله عود قلبت الواو ياء لسكونها بعد كسرة اهـ ح .وفي الجوهرة مناسبته للجمعة ظاهرة وهو أنهما يؤديان بجمع عظيم ويجهر فيهما بالقراءة ويشترط لأحدهما ما يشترط للآخر سوى الخطبة، وتجب على من تجب عليه الجمعة، وقدمت الجمعة للفرضية وكثرة وقوعها. اهـ(رد المحتار على الدر المختار، ج۲، ص ۱۶۵، كتاب الصلاة،باب العيدين)

اور بعض حنفیہ نے جمعہ کے علاوہ، عید کی نماز کے لئے، دوسری عام نمازوں کی طرح صرف دو افراد کو بھی کافی قرار دیا ہے۔

اگر مخصوص مجبوری، مثلاً لاک ڈاؤن وغیرہ کے حالات میں، جبکہ چار افراد کا بھی اجتماع مشکل ہو، کوئی اس قول کے مطابق عمل کر لے، تو اس کی گنجائش معلوم ہوتی ہے۔ [1]

جبکہ حنابلہ کے نزدیک عید کی نماز فرض ہونے کے لئے جمعہ کی نماز کی طرح مستقل طور پر مقیم ہونا اور جمعہ کی نماز والی تعداد کے مطابق کم از کم چالیس افراد کا ہونا شرط ہے۔

اور مالکیہ کے نزدیک عید کی نماز کے سنتِ مؤکدہ ہونے کے لئے بھی مکمل طور پر انہی شرائط کا پایا جانا ضروری ہے، جو نمازِ جمعہ کے واجب ہونے کی شرائط ہیں، البتہ ان کے نزدیک عورت اور مسافر کو عید کی نماز پڑھنا مستحب ہے، ان کے ذمہ تاکیدی سنت نہیں۔

اور شافعیہ کے نزدیک عید کی نماز ہر ایک مکلّف مسلمان کے حق میں سنتِ مؤکدہ ہے، خواہ وہ مرد ہو یا عورت ہو، مقیم ہو یا مسافر ہو۔ [2]

---

[1] قلت :وفی إمامة البحر أن الجماعة فی العید تسن علی القول بسنیتها، وتجب علی القول بوجوبها .اهـ .وظاهره أنها غیر شرط علی القول بالسنیة لکن صرح بعده بأنها شرط لصحتها علی کل من القولین أی فتکون شرطا لصحة الإتیان بها علی وجه السنة وإلا کانت نفلا مطلقا تأمل لکن اعترض ط ما ذکره المصنف بأن الجمعة من شرائطها الجماعة التی هی جمع والواحد هنا مع الإمام کما فی النهر(رد المحتار علی الدر المختار،ج۲،ص۱۶۶، کتاب الصلاة،باب العیدین)

کما فی النهروفیه ان من شرائطها الجماعة التی هی جمع والواحد هنا مع الإمام جماعة، فکیف یصح أن یقال: بشرائطها(حاشیة الطحطاوی علی الدر،ج۱،ص۳۵۱، کتاب الصلاة،باب العیدین)

وإذا لم یشترط السلطان أو نائبه فلا معنی لاشتراط الإذن العام وکأنهم استغنوا بذکر السلطان عنه، علی أنا قدمنا أن الإذن العام لم یذکر فی الظاهر .نعم بقی أن یقال :من شرائطها الجماعة التی هی جمع والواحد هنا مع الإمام جماعة، فکیف یصح أن یقال :إن شروطه الجمعة(النهر الفائق شرح کنز الدقائق،ج۱،ص۳۷۳، کتاب الصلاة،باب صلاة العیدین)

قوله" :وشرائط الصحة "ظاهره أنه لا بد من الجماعة المذکورة فی الجمعة علی خلاف فیها ولیس کذلک فإن الواحد هنا مع الإمام جماعة فیکف یصح أن یقال بشرائطها(حاشیة الطحطاوی علی مراقی الفلاح،ص۵۲۸، کتاب الصلاة،باب الجمعة)

[2] شروط وجوب صلاة العیدین.

عند الحنفیة :هی بعینها شروط وجوب صلاة الجمعة .فیشترط لوجوبها الإمام المصر الجماعة الوقت الذکورة الحریة صحة البدن الإقامة.

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

نمازِ عید صحیح واداء ہونے کی شرائط

جہاں تک عید کی نماز صحیح ہونے کی شرائط کا تعلق ہے، تو حنفیہ کے نزدیک اس کے صحیح ہونے کی شرائط وہی ہیں، جو جمعہ کی نماز صحیح ہونے کی شرائط ہیں۔

اور حنابلہ کے نزدیک عید کی نماز علی الکفایة درجہ میں صحیح ہونے کے لئے عید کی نماز کا وقت ہونا اور جماعت کا ہونا شرط ہے، البتہ جس کو جماعت کے ساتھ نہ ملے، وہ تنہاء پڑھنا چاہے، تو جائز ہے۔

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾ إلا الخطبة، فإنها سنة بعد الصلاة.

قال الكاساني في بدائع الصنائع -وهو يقرر أدلة هذه الشروط :-أما الإمام فشرط عندنا لما ذكرنا في صلاة الجمعة، وكذا المصر لما روينا عن علي -رضي الله عنه -أنه قال :لا جمعة ولا تشريق ولا فطر ولا أضحى إلا في مصر جامع .ولم يرد بذلك نفس الفطر ونفس الأضحى ونفس التشريق؛ لأن ذلك مما يوجد في كل موضع، بل المراد من لفظ الفطر والأضحى صلاة العيدين؛ ولأنها ما ثبتت بالتوارث من الصدر الأول إلا في الأمصار .والجماعة شرط لأنها ما أديت إلا بجماعة، والوقت شرط فإنها لا تؤدى إلا في وقت مخصوص، به جرى التوارث وكذا الذكورة والعقل والبلوغ والحرية وصحة البدن، والإقامة من شروط وجوبها كما هي من شروط وجوب الجمعة؛ لما ذكرنا في صلاة الجمعة، ولأن تخلف شرط من هذه الشروط يؤثر في إسقاط الفرض فلأن تؤثر في إسقاط الواجب أولى(الموسوعة الفقهية الكويتية، ج۲۷،ص ۲۴۰، ۲۴۱،مادة"صلاة العيدين")

وأما الحنابلة -وصلاة العيدين عندهم فرض كفاية كما سبق بيانه -فإنما شرطوا لفرضيتها: الاستيطان، والعدد المشترط للجمعة.

والمالكية -وهم من القائلين بأن صلاة العيدين سنة مؤكدة -شرطوا لذلك، أي لتأكيد سنيتها: تكامل شروط وجوب الجمعة، وأن لا يكون المصلي متلبسا بحج .فإذا فقد أحد الشروط نظر :فإن كان المفقود هو عدم التلبس بالحج فصلاة العيد غير مطلوبة بأي وجه من وجوه الطلب، وإن كان المفقود هو أحد شروط وجوب الجمعة، كالمرأة والمسافر، فهي في حقهم مستحبة وليست بسنة مؤكدة .قال الصفتي :وهي سنة في حق من يؤمر بالجمعة وجوبا إلا الحاج فلا تسن له ولا تندب، وأما المرأة والصبي والمسافر فتستحب في حقهم

وذهب الشافعية إلى أنها سنة مؤكدة في حق كل مكلف ذكرا كان أو أنثى، مقيما أو مسافرا، حرا أو عبدا، ولم يشترطوا لسنيتها شرطا آخر غير التكليف. وقالوا باشتراط عدم التلبس بالحج لأدائها جماعة، أي فالحاج تسن له صلاة العيد منفردا لا جماعة(الموسوعة الفقهية الكويتية، ج۲۷،ص ۲۴۱، ۲۴۲،مادة"صلاة العيدين")

اور مالکیہ اور شافعیہ کے نزدیک عید کی نماز صحیح ہونے کے لئے وقت کے علاوہ مذکورہ چیزوں میں سے کوئی چیز شرط نہیں، نہ تو جماعت کا ہونا شرط ہے، اور نہ ہی شہر وغیرہ کا ہونا شرط ہے۔ اگر کسی کو جماعت کے ساتھ نہ مل سکے، تو اس کو تنہاء پڑھنا بھی سنت، یا مستحب ہے۔ [1]

---

[1] شروط الصحة: كل ما يعتبر شرطا فى صحة صلاة الجمعة، فهو شرط فى صحة صلاة العيدين أيضا، ما عدا الخطبة فهى هنا ليست شرطا فى صحة العيدين وإنما هى سنة.

ويستثنى -أيضا -شرط عدم التعدد (راجع صلاة الجمعة) فلا يشترط ذلك لصلاة العيد، قال الحصكفى :وتؤدى بمصر واحد فى مواضع كثيرة اتفاقا، وقال ابن عابدين :مقررا هذا الكلام: والخلاف إنما هو فى الجمعة، فيشترط لصحتها الإمام والمصروالجماعة والوقت.

وقد مر أنها شروط للوجوب أيضا .هذا عند الحنفية.

أما الحنابلة فقد اشترطوا الوقت والجماعة.

ولم يشترط المالكية والشافعية لصحة صلاة العيدين شيئا من هذه الشروط إلا الوقت.

أما الشروط التى هى قدر مشترك فى صحة الصلوات المختلفة من طهارة واستقبال قبلة . . .إلخ فليس فيها من خلاف(الموسوعة الفقهية الكويتية، ج٢٧،ص ٢٤٢ ،مادة "صلاة العيدين")

شرائط وجوبها وجوازها:

قال الحنفية :كل ما هو شرط وجوب الجمعة وجوازها فهو شرط وجوب صلاة العيدين، وجوازها، من الإمام والجماعة، والمصر، والوقت، إلا الخطبة فإنها سنة بعد الصلاة، ولو تركها جازت صلاة العيد.

أما الإمام أى حضور السلطان أو الحاكم أو نائبه :فهو شرط أداء العيد كالجمعة، لما ثبت فى السنة، ولأنه لو لم يشترط السلطان، لأدى إلى الفتنة، بسبب تجمع الناس، وتنازعهم على التقدم للإمامة لما فيها من الشرف والعلو والرفعة.

وأما المصر :فلقول على موقوفا عليه :لا جمعة ولا تشريق، ولا صلاة فطر، ولا أضحى، إلا فى مصر جامع أو مدينة عظيمة .

وأما الجماعة :فلأنها ما أديت إلا بجماعة.

وأما الوقت :فإنها لا تؤدى إلا فى وقت مخصوص، كما جرى به التوارث عن السلف.

والذكورة والعقل والبلوغ والحرية وصحة البدن والإقامة من شرائط وجوبها، كما هى من شرائط وجوب الجمعة، فلا تجب على النسوان والصبيان والمجانين والعبيد بدون إذن مواليهم، ولا على الزمنى والمرضى والمسافرين، كما لاتجب عليهم الجمعة.

أما الحنابلة فقالوا :يشترط لصحة صلاة العيد استيطان أربعين عدد الجمعة ولا يشترط لها إذن، ويفعلها المسافر والعبد والمرأة والمنفرد تبعا لأهل وجوبها(الفقه الاسلامى وادلتۂ للزحيلى ، ج٢، ص ١٣٨٩ ،القسم الأول :العبادات،الباب الثانى:الفصل العاشر:،المبحث الرابع ـ صلاة العيدين)

الجماعة فى صلاة العيدين شرط صحة عند الحنفية والحنابلة، وسنة عند المالكية والشافعية (الموسوعة الفقهية الكويتية، ج٢٧، ص١٦٨ ،مادة "صلاة الجماعة")

اگر کسی کو عید کی نماز، پڑھنا ممکن نہ ہو، تو حنفیہ کے نزدیک بھی مشہور قول کے مطابق، عید کی نماز کے بجائے گھر میں نفل کی نیت سے چار رکعت نفل پڑھ لینا بہتر ہے۔ [1]

فقہائے کرام کی کتب میں مذکورہ چیزوں کی تفصیلات مذکور ہیں، جن کو اصحابِ علم ملاحظہ فرما سکتے ہیں، ان کی تفصیلات کا یہ موقع نہیں۔ [2]

---

[1] عن مسروق ، قال :قال عبد الله :من فاته العيد فليصل أربعا(مُصنف ابن أبى شيبة،رقم الحديث ٥٨٥٠ ، كتاب الصلاة،باب الرجل تفوته الصلاة فى العيدين، كم يصلى؟)

ولكنه يصلى أربعا مثل صلاة الضحى إن شاء؛ لأنها إذا فاتته لا يمكن تداركها بالقضاء لفقد الشرائط فلو صلى مثل الضحى لنيل الثواب كان حسنا، وهو مروى عن ابن مسعود(البحر الرائق ،ج ٢ ص ١٧٥ ، كتاب الصلاة، باب العيدين)

روى عن ابن مسعود رضى اللّٰہ عنہ انه قال من فاتته صلوة العيدصلى اربع ركعات يقرأفى الاولٰى سبح اسم ربك الاعلٰى وفى الثانيه والشمس وضحها وفى الثالثة والليل اذايغشى وفى الرابعه والضحى وروى فى ذلك عن رسول الله صلى الله عليه وسلم وعدا جميلاً وثواباً جزيلا (قاضى خان علٰى هامش الهندية ج ١ ص ١٨٣ ، كتاب الصلاة،باب صلاة العيدين وتكبيرات أيام التشريق)

[2] وأجمع المسلمون على صلاة العيدين .وصلاة العيد فرض على الكفاية، فى ظاهر المذهب، إذا قام بها من يكفى سقطت عن الباقين، وإن اتفق أهل بلد على تركها قاتلهم الإمام .وبه قال بعض أصحاب الشافعى.

وقال أبو حنيفة :هى واجبة على الأعيان، وليست فرضا، لأنها صلاة شرعت لها الخطبة، فكانت واجبة على الأعيان، وليست فرضا .كالجمعة .وقال ابن أبى موسى :قيل إنها سنة مؤكدة غير واجبة .وبه قال مالك، وأكثر أصحاب الشافعى،

وقال أبو حنيفة :هى واجبة على الأعيان، وليست فرضا، لأنها صلاة شرعت لها الخطبة، فكانت واجبة على الأعيان، وليست فرضا .كالجمعة .وقال ابن أبى موسى :قيل إنها سنة مؤكدة غير واجبة .وبه قال مالك، وأكثر أصحاب الشافعى؛ لقول رسول الله -صلى الله عليه وسلم - للأعرابى حين ذكر خمس صلوات قال :هل على غيرهن؟ قال :لا إلا أن تطوع . وقوله -عليه السلام :-خمس صلوات كتبهن الله على العبد. الحديث.

ولأنها صلاة ذات ركوع وسجود لم يشرع لها أذان، فلم تجب ابتداء بالشرع، كصلاة الاستسقاء والكسوف .ثم اختلفوا، فقال بعضهم :إذا امتنع جميع الناس من فعلها قاتلهم الإمام عليها .وقال بعضهم :لا يقاتلهم .ولنا، على أنها لا تجب على الأعيان أنها لا يشرع لها الأذان، فلم تجب على الأعيان، كصلاة الجنازة، ولأن الخبر الذى ذكره مالك ومن وافقه يقتضى نفى وجوب صلاة سوى الخمس، وإنما خولف بفعل النبى -صلى الله عليه وسلم -ومن صلى معه، فيختص بمن كان

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

نمازِ عید کے لیے مسجد و غیر مسجد کا حکم

عید کی نماز کے لئے مسجد کا ہونا ضروری نہیں، بلکہ مسجد کے علاوہ بھی کسی جگہ میں عید کی نماز کا پڑھنا جائز ہے، اور شافعیہ کے نزدیک اگر مسجد وسیع ہو، جس میں اس مسجد کے علاقے کے لوگ سما سکیں، تو غیر مسجد میں پڑھنے کے بجائے، مسجد ہی میں عید کی نماز پڑھنا افضل ہے۔

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

مثلهم، ولأنها لو وجبت على الأعيان لوجبت خطبتها، ووجب استماعها كالجمعة.
ولنا، على وجوبها في الجملة، أمر الله تعالى بها، بقوله " فصل لربك وانحر " والأمر يقتضي الوجوب، ومداومة النبي -صلى الله عليه وسلم -على فعلها، وهذا دليل الوجوب .ولأنها من أعلام الدين الظاهرة، فكانت واجبة كالجمعة، ولأنها لو لم تجب لم يجب قتال تاركيها، كسائر السنن، يحققه أن القتال عقوبة لا تتوجه إلى تارك مندوب كالقتل والضرب .فأما حديث الأعرابي فلا حجة لهم فيه؛ لأن الأعراب لا تلزمهم الجمعة، لعدم الاستيطان، فالعيد أولى.
والحديث الآخر مخصوص بما ذكرناه، على أنه إنما صرح بوجوب الخمس، وخصها بالذكر، لتأكيدها ووجوبها على الأعيان،ووجوبها على الدوام، وتكررها في كل يوم وليلة، وغيرها يجب نادرا ولعارض، كصلاة الجنازة والمنذورة والصلاة المختلف فيها، فلم يذكرها، وقياسهم لا يصح؛ لأن كونها ذات ركوع وسجود لا أثر له، بدليل أن النوافل كلها فيها ركوع وسجود، وهي غير واجبة، فيجب حذف هذا الوصف، لعدم أثره، ثم ينقض قياسهم بصلاة الجنازة، وينتقض على كل حال بالمنذورة(المغني لابن قدامة،ج٢،ص ٢٧٢،٢٧٣، كتاب الصلاة،باب صلاة العيدين)
فصل :ويشترط الاستيطان لوجوبها؛ لأن النبي -صلى الله عليه وسلم -لم يصلها في سفره .ولا خلفاؤه وكذلك العدد المشترط للجمعة؛ لأنها صلاة عيد، فأشبهت الجمعة .وفي إذن الإمام روايتان :أصحهما، ليس بشرط.
ولا يشترط شيء من ذلك لصحتها، لأنها تصح من الواحد في القضاء، وقال أبو الخطاب في ذلك كله روايتان .وقال القاضي :كلام أحمد يقتضي روايتين :إحداهما، لا يقام العيد إلا حيث تقام الجمعة وهذا مذهب أبي حنيفة إلا أنه لا يرى ذلك إلا في مصر، لقوله :لا جمعة ولا تشريق إلا في مصر جامع .والثانية، يصليها المنفرد والمسافر، والعبد والنساء، على كل حال.
وهذا قول الحسن والشافعي، لأنه ليس من شرطها الاستيطان فلم يكن من شرطها الجماعة، كالنوافل، إلا أن الإمام إذا خطب مرة، ثم أرادوا أن يصلوا، لم يخطبوا وصلوا بغير خطبة، كي لا يؤدي إلى تفريق الكلمة، والتفصيل الذي ذكرناه أولى ما قيل به، إن شاء الله تعالى(المغني لابن قدامة،ج٢،ص ٢٩١، كتاب الصلاة،باب صلاة العيدين،فصل شرط صلاة العيدين الاستيطان)
وأجمع المسلمون على أن صلاة العيد مشروعة وعلى أنها ليست فرض عين ونص الشافعي

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

اور شافعیہ کے نزدیک چونکہ تنہاء بھی عید کی نماز پڑھنا درست ہے، اس لیے ان کے نزدیک عورت، مرد وغیرہ کو تنہاء اپنے گھروں میں پڑھنا بھی درست ہے۔

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

وجمهور الأصحاب على أنها سنة وقال الإصطخرى فرض كفاية فإن قلنا فرض كفاية قوتلوا بتركها وإن قلنا سنة لم يقاتلوا على أصح الوجهين وقال أبو إسحاق المروزى يقاتلون وقد ذكرالمصنف دليل الجميع ووجه الدلالة من الحديث للمذهب أن النبى صلى الله عليه وسلم أخبره أنه لا فرض سوى الخمس فلو كان العيد فرض كفاية لما أطلق هذا الإطلاق لأن فرض الكفاية واجب على جميعهم ولكن يسقط الحرج بفعل البعض ولهذا لو تركوه كلهم عصوا وقوله لأنها صلاة مؤقتة احتراز من الجنازة وقوله لا تشرع لها الإقامة احتراز من الصلوات الخمس وقوله فلم تجب بالشرع احتراز من المنذورة وجماهير العلماء من السلف والخلف أن صلاة العيد سنة لا فرض كفاية.

(وأما قول) الشافعى فى المختصر من وجب عليه حضور الجمعة وجب عليه حضور العيدين (فقال) أصحابنا هذا ليس على ظاهره فإن ظاهره أن العيد فرض عين على كل من تلزمه الجمعة وهذا خلاف إجماع المسلمين فيتعين تأويله قال أبو إسحاق من لزمته الجمعة حتما لزمه العيد ندبا واختيارا وقال الإصطخرى معناه من لزمته الجمعة فرضا لزمه العيد كفاية قال أصحابنا ومراد الشافعى أن العيد يتأكد فى حق من تلزمه الجمعة(المجموع شرح المهذب، ج٥،ص،٢،وص٣، كتاب الصلاة ، باب صلاة العيدين)

واختلفوا فيمن تجب عليه صلاة العيد -أعنى :وجوب السنة -فقالت طائفة :يصليها الحاضر والمسافر، وبه قال الشافعى والحسن البصرى، وكذلك قال الشافعى :إنه يصليها أهل البوادى، ومن لا يجمع حتى المرأة فى بيتها .وقال أبو حنيفة وأصحابه :إنما تجب صلاة الجمعة والعيدين على أهل الأمصار والمدائن .وروى عن على أنه قال :لا جمعة ولا تشريق إلا فى مصر جامع .وروى عن الزهرى أنه قال :لا صلاة فطر ولا أضحى على مسافر.

والسبب فى هذا الاختلاف :اختلافهم فى قياسها على الجمعة، فمن قاسها على الجمعة كان مذهبه فيها على مذهبه فى الجمعة، ومن لم يقسها رأى أن الأصل هو أن كل مكلف مخاطب بها حتى يثبت استثناؤه من الخطاب.

قال القاضى :قد فرقت السنة بين الحكم للنساء فى العيدين والجمعة، وذلك أنه ثبت أنه -عليه الصلاة والسلام -أمر النساء بالخروج للعيدين، ولم يأمر بذلك فى الجمعة .

وكذلك اختلفوا فى الموضع الذى يجب منه المجىء إليها كاختلافهم فى صلاة الجمعة من الثلاثة الأميال إلى مسيرة اليوم التام(بداية المجتهد ونهاية المقتصد، ج١،ص٢٢٩،كتاب الصلاة الثانى، الباب الثامن فى صلاة العيدين)

وصلاة العيدين سنة مسنونة لا ينبغى تركها وهى على جميع أهل الآفاق وأهل الأمصار وأهل القرى وأهل البادية يبرزون إلى مصلاهم فيصلونها هناك ولا تصلى فى المسجد إلا من ضرورة إلا أهل

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

جب ملک میں بڑے بڑے اجتماعات پر پابندی ہو، تو شافعیہ کے نزدیک اس مسئلہ میں بہت وُسعت اور گنجائش موجود ہے۔

اور مالکیہ وحنابلہ کے نزدیک بھی اگر کوئی جماعت میں شریک نہ ہوسکے، تو اس کو تنہاء بغیر جماعت کے پڑھ لینا جائز ہے، اور حنفیہ کے نزدیک اگر کسی کو جماعت کے ساتھ عید کی نماز دستیاب نہ ہو، تو اس کو قضاء کا حکم تو نہیں، البتہ اگر وہ چاہے، تو مشہور قول کے مطابق، اس کے لیے عام نوافل کی طرح بغیر جماعت کے چار رکعات پڑھ لینا بہتر ہے۔ [1]

﴿ گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ ﴾

مكة فسنتهم صلاتها فى المسجد الحرام وليست على المسافرين ولا على أهل منى والحاج لأنهم مسافرون مشغولون بغير ذلك(الكافى فى فقه أهل المدينة، ج ا ،ص ٢٦٣ ، كتاب الصلاة، باب صلاة العيدين)

(لمأمور الجمعة)ش :يعني أن صلاة العيدين إنما هى سنة فى حق من يؤمر بالجمعة يريد وجوبا وأما من لا تجب عليه الجمعة من أهل القرى الصغار والمسافرين والنساء والعبيد ومن عقل الصلاة من الصبيان فليست فى حقهم سنة ولكنه يستحب لهم إقامتها كما سيأتى عند قوله:وإقامة من لم يؤمر بها.
(فرع) قال فى النوادر ولو تركوا الجمعة وهى عليهم فعليهم أن يصلوا العيد بخطبة وجماعة انتهى.
ودخل فى قوله :لمأمور الجمعة من كان على ثلاثة أميال، قال فى النوادر وينزل إليها من على ثلاثة أميال انتهى(مواهب الجليل فى شرح مختصر خليل،ج٢،ص ١٨٩، ١٩٠ ،كتاب الصلاة،فصل صلاة العيدين)

صلاة العيد كصلاة الجمعة فى اشتراط الجماعة حتى تقع سنة، وأما من فاتته فيندب له فقط(الفواكه الدوانى على رسالة ابن أبى زيد القيروانى،ج ا ،ص ٢٧٠ ،باب فى صلاة العيدين والتكبير أيام منى)

[1] مكان أدائها :كل مكان طاهر، يصلح أن تؤدى فيه صلاة العيد، سواء كان مسجدا أو عرصة وسط البلد أو مفازة خارجها .إلا أنه يسن الخروج لها إلى الصحراء أو إلى مفازة واسعة خارج البلد تأسيا بما كان يفعله رسول الله صلى الله عليه وسلم.
ولا بأس أن يستخلف الإمام غيره فى البلدة ليصلى فى المسجد بالضعفاء الذين لا طاقة لهم بالخروج لها إلى الصحراء .
ولم يخالف أحد من الأئمة فى ذلك، إلا أن الشافعية قيدوا أفضلية الصلاة فى الصحراء بما إذا كان مسجد البلد ضيقا.
وإن كان المسجد واسعا لا يتزاحم فيه الناس، فالصلاة فيه أفضل؛ لأن الأئمة لم يزالوا يصلون صلاة العيد بمكة فى المسجد؛ ولأن المسجد أشرف وأنظف .ونقل صاحب المهذب عن الشافعي قوله : إن كان المسجد واسعا فصلى فى الصحراء فلا بأس، وإن كان ضيقا فصلى فيه ولم يخرج إلى

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

اور جب بڑے اجتماعات پر پابندی ہو، تو حنفیہ کے نزدیک گھروں وغیرہ میں چار عاقل بالغ مرد افراد بھی، جمعہ کی طرح نمازِ عید قائم کر سکتے ہیں۔

بلکہ حنفیہ کے ایک غیر معروف قول کے مطابق جمعہ کے علاوہ دیگر باجماعت نمازوں کی طرح دو افراد بھی عید کی نماز باجماعت اداء کر سکتے ہیں، اور مجبوری کے حالات میں اس قول پر عمل کر لینے کی گنجائش ہے، کما مر۔

خواتین کے لیے نمازِ عید کا حکم

عورتوں پر عید کی نماز لازم نہیں، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول وفعل سے خواتین کا عید

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

الصحراء كرهت؛ لأنه إذا ترك المسجد وصلى في الصحراء لم يكن عليهم ضرر، وإذا ترك الصحراء وصلى في المسجد الضيق تأذوا بالزحام، وربما فات بعضهم الصلاة(الموسوعة الفقهية الكويتية، ج۲۷، ص ۲۴۵، مادة"صلاة العيدين")

رابعا۔ موضع أداء صلاة العيد :للفقهاء رأيان متقاربان ، فقال الجمهور غير الشافعية :موضعها في غير مكة :المصلى (الصحراء خارج البلد، على أن يكون قريبا من البلد عرفا عند الحنابلة) لا المسجد، إلا من ضرورة أو عذر، وتكره في المسجد، بدليل فعل النبي صلى الله عليه وسلم، والكراهة لمخالفة فعله عليه السلام .فإن كان عذر لم تكره، لقول أبي هريرة :أصابنا مطر في يوم عيد، فصلى بنا النبي صلى الله عليه وسلم في المسجد وروى أن عمر وعثمان رضي الله عنهما صليا في المسجد في المطر.

أما في مكة :فالأفضل فعلها في المسجد الحرام، لشرف المكان، ومشاهدة الكعبة، وذلك من أكبر شعائر الدين.

وقال الشافعية :فعل صلاة العيد في المسجد أفضل؛ لأنه أشرف وأنظف من غيره، إلا إذا كان مسجد البلد ضيقا، فالسنة أن تصلى في المصلى، لما روى أن النبي صلى الله عليه وسلم كان يخرج إلى المصلى، ولأن الناس يكثرون في صلاة العيد، وإذا كان المسجد ضيقا تأذى الناس .قال الشافعية رحمه الله :فإن كان المسجد واسعا، فصلى في الصحراء فلا بأس، وإن كان ضيقا، فصلى فيه ولم يخرج إلى المصلى، كرهت.

فإن كان في الناس ضعفاء ، استخلف الإمام في مسجد البلد من يصلي بهم،لما روى أن عليا رضي الله عنه استخلف أبا مسعود الأنصاري رضي الله عنه، ليصلي بضعفة الناس في المسجد.

وقال الحنفية :ولا يخرج المنبر إلى المصلى (الجبانة) يوم العيد، ولا بأس ببنائه دون إخراجه (الفقه الاسلامي وادلتهٔ للزحيلي، ج۲،ص ۱۳۹۴، ۱۳۹۵، القسم الأول :العبادات،الباب الثاني :الصلاة ،الفصل العاشر،المبحث الرابع)

کی نماز کے لیے جانا ثابت ہے۔

لیکن فقہائے کرام کا اس سلسلہ میں اختلاف ہے۔

بعض فقہاء کے نزدیک مطلقاً عورتوں کو عید کی نماز کے لئے نکلنا جائز ہے، خواہ جوان ہو، یا بوڑھی، جبکہ خوشبو لگا کر نہ نکلیں، اور زیب وزینت کا اظہار نہ کریں۔

اور حنفیہ کے نزدیک خواتین کو عید کی نماز کے لیے گھر سے باہر نہ نکلنا افضل ہے، اور بہتر یہ ہے کہ وہ گھر میں رہ کر ہی عبادت وذکر کریں، اور جوان عورتوں کو عید کی نماز کے لیے گھر سے باہر نکلنا مکروہ ہے، البتہ بوڑھی اور معمّر خواتین کو عید کی نماز کے لیے گھر سے نکلنا جائز ہے۔

اور امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک بوڑھی خواتین کے ساتھ ساتھ اُن خواتین کو بھی نکلنا جائز بلکہ مستحب ہے، جو کہ بوڑھی تو نہیں ہیں، لیکن حسن وجمال والی نہیں ہیں، اور جو حسن وجمال والی ہوں، ان کو فتنہ وفساد لازم آنے کی وجہ سے نکلنا مستحب نہیں ہے۔

مالکیہ کے نزدیک جوانی اور خوبصورتی میں ممتاز عورت کو نکلنا منع ہے، اور جو ایسی نہ ہو، اس کو کبھی کبھی نکلنے میں حرج نہیں، اور بوڑھی خواتین کو نکلنے میں حرج نہیں۔ [1]

---

[1] المرأة وصلاة العيدين:

ذهب المالكية، والشافعية، والحنابلة إلى كراهة خروج الشابات وذوات الجمال لصلاة العيدين لما فى ذلك من خوف الفتنة، ولكنهم استحبوا فى المقابل خروج غير ذوات الهيئات منهن واشتراكهن مع الرجال فى الصلاة.

وذلك للحديث المتفق عليه عن أم عطية :كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يخرج العواتق وذوات الخدور والحيض فى العيد، فأما الحيض فكن يعتزلن المصلى ويشهدن الخير ودعوة المسلمين.

ولكن ينبغى أن يخرجن فى ثياب لا تلفت النظر دون تطيب ولا تبرج .

ويختلف الحكم عند الحنفية فى إباحة خروج النساء إلى صلاة العيدين بين كون المرأة شابة أو عجوزا .أما الشابات من النساء وذوات الجمال منهن، فلا يرخص لهن

فى الخروج إلى صلاة العيد ولا غيرها كصلاة الجمعة ونقل الكاسانى إجماع أئمة المذهب الحنفى عليه، وذلك لقوله تعالى :(وقرن فى بيوتكن).

وأما العجائز فلا خلاف أنه يرخص لهن الخروج للعيد وغيره من الصلوات.

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

اور علامہ ابنِ تیمیہ حنبلی رحمہ اللہ نے، خواتین کے عید کی نماز میں شریک ہونے کی خصوصی اہمیت پر زور دیا ہے۔ [1]

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

غير أن الأفضل على كل حال أن تصلى المرأة فى بيتها، واختلفت الرواية عن أبى حنيفة :هل تخرج المرأة للصلاة أم لتكثير سواد المسلمين (الموسوعة الفقهية الكويتية،ج۲۷،ص ۲۴۲، ۲۴۳، مادة"صلاة العيدين")

خروج النساء إلى صلاة العيد:

اتفق الفقهاء منهم الحنفية والمالكية على أنه لا يرخص للشابات من النساء الخروج إلى الجمعة والعيدين وشىء من الصلاة، لقوله تعالى :(وقرن فى بيوتكن)والأمر بالقرار نهى عن الانتقال، ولأن خروجهن سبب الفتنة بلا شك، والفتنة حرام، وما أدى إلى الحرام فهو حرام.

وأما العجائز :فلا خوف فى أن يرخص لهن الخروج فى الفجر والمغرب والعشاء ، والعيدين، واختلفوا فى الظهر والعصر والجمعة، كما بينا سابقا .وهذا التفصيل بين الشابة والعجوز هو مذهب الآخرين أيضا.

وعبارة الشافعية والحنابلة :لا بأس بحضور النساء مصلى العيد غير ذوات الهيئات فلا تحضر المطيبات، ولا لابسات ثياب الزينة أو الشهرة، لما روت أم عطية، قالت :كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يخرج العواتق والحيض، وذوات الخدور فى العيد، فأما الحيض فكن يعتزلن الصلاة، ويشهدن الخير ودعوة المسلمين .

وإذا أراد النساء الحضور تنظفن بالماء ، ولا يتطيبن، ولا يلبسن الشهرة من الثياب، أى الثياب الفاخرة، ويعتزلن الرجال فلا يختلطن بهم، ويعتزل الحيض المصلى للحديث السابق، ولقوله صلى الله عليه وسلم :لا تمنعوا إماء الله مساجد الله، وليخرجن تفلات أى غير عطرات، ولأن المرأة إذا تطيبت ولبست الشهرة من الثياب، دعا ذلك إلى الفساد (الفقه الاسلامى وادلتهٔ للزحيلى،ج۲،ص ۱۳۹۰، ۱۳۹۱، القسم الأول : العبادات،الباب الثانى :الصلاة ،الفصل العاشر،المبحث الرابع)

[1] قلنا :ما كان يشهد الجمعة والجماعة من النساء إلا أقلهن؛ لأن (النبى صلى الله عليه وسلم قال :لا تمنعوا إماء الله مساجد الله وبيوتهن خير لهن) متفق عليه .وقال :(صلاة إحداكن فى مخدعها أفضل من صلاتها فى حجرتها وصلاتها فى حجرتها أفضل من صلاتها فى دارها وصلاتها فى دارها أفضل من صلاتها فى مسجد قومها وصلاتها فى مسجد قومها أفضل من صلاتها معى -أو قال -خلفى) رواه أبو داود .فقد أخبر المؤمنات :أن صلاتهن فى البيوت أفضل لهن من شهود الجمعة والجماعة إلا "العيد "فإنه أمرهن بالخروج فيه ولعله -والله أعلم -لأسباب:

أحدها :أنه فى السنة مرتين فقبل بخلاف الجمعة والجماعة.

الثانى :أنه ليس له بدل خلاف الجمعة والجماعة فإن صلاتها فى بيتها الظهر هو جمعتها.

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

یہ بھی یاد رہے کہ مذکورہ حکم عام حالات میں عورتوں کو عید کی نماز کے لئے باہر نکلنے سے متعلق ہے۔

اور اگر کسی گھر وغیرہ میں کسی فقہ کے مطابق عید کی نماز پڑھی جائے، تو وہاں کی عورتوں کو نمازِ عید میں شریک ہونا، بلا کراہت جائز ہوگا، جس کی تفصیل ہم جمعہ سے متعلق اپنے دیگر مضامین میں بیان کر چکے ہیں، اور اِذنِ عام واِذنِ حاکم کے مسئلہ کی بھی تفصیل باحوالہ بیان کر چکے ہیں، جس کے اعادہ کی یہاں ضرورت نہیں۔

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

الثالث :أنه خروج إلى الصحراء لذكر الله فهو شبيه بالحج من بعض الوجوه؛ ولهذا كان العيد الأكبر فى موسم الحج موقفة للحجيج ومعلوم أن الصحابيات إذا علمن أن صلاتهن فى بيوتهن أفضل لم يتفق أكثرهن على ترك الأفضل؛ فإن ذلك يلزم أن يكون أفضل القرون على المفضول من الأعمال .فإن قيل :هذا التفضيل إنما وقع فى حق من بعد الصحابيات لما أحدث النساء ما أحدثن ولأن من بعد الرسول من الأئمة لا يساويه؛ فأما الصحابيات فصلاتهن خلف النبى صلى الله عليه وسلم كانت أفضل ويكون هذا الخطاب عاما خرج منه القرن الأول؛ فإن تخصيص العموم جائز .قلنا :هذا خلاف ما علم بالاضطرار من لغة العرب والعجم وخلاف ما علم بالاضطرار من دين المسلمين وخلاف ما فطر الله عليه العقلاء وخلاف ما أجمع المسلمون عليه؛ وذلك لأن قوله: (لا تمنعوا إماء الله مساجد الله وبيوتهن خير لهن) قد أجمع المسلمون على أن الحاضرين تحقق دخولهم فيه .واختلفوا فى القرن الثانى والثالث هل يدخلون بمطلق الخطاب أم بدليل منفصل؟ فيه قولان فأما دخول الغائب دون الحاضر فممتنع باتفاق .ثم اللغة تحيله فإن قوله :(لا تمنعوا إماء الله) لا ريب أنه خطاب للصحابة -رضى الله عنهم -ابتداء فكيف تحيل اللغة أن لا يدخلوا فيه .ويدخل فيه من بعدهم؟ أهل اللغة لا يشكون أن هذا ممتنع.

ثم قد علمنا بالاضطرار أن أوامر القرآن والسنة شملت الصحابة ثم من بعدهم وقد يقال أو يتوهم فى بعضها :أنها شملتهم دون من بعدهم فأما اختصاص من بعدهم بالأوامر الخطابية دونهم فهذا لا وجود له .وأما مخالفته "للفطر "فما من سليم العقل يعرض عليه هذا إلا أنكره أشد الإنكار ثم هب هذا أمكن فى قوله :(لا تمنعوا إماء الله مساجد الله) فكيف بقوله :(صلاة إحداكن فى مسجد قومها أفضل من صلاتها معى أو خلفى) ؟ أليس نصا فى صلاتهن فى بيوتهن وفى مسجد النبى صلى الله عليه وسلم خلفه؟ وصلى الله على محمد (مجموع الفتاوى،لابن تيمية،ج٦،ص٤٦٠،شهود النساء الجمعة)

فالقادر يخرج والنساء قادرات على الخروج فيخرجن ولا يصلين وحدهن وكذلك من كان من المسافرين فى البلد فإنه يمكنهم أن يصلوا مع الإمام فلا يصلون وحدهم بإمام بخلاف الجمعة فإنهم

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

نمازِ عید کی ادائیگی کا وقت

حنفیہ، مالکیہ اور حنابلہ کے نزدیک عید کی نماز کا وقت سورج طلوع ہونے کے کچھ دیر بعد اس

﴿ گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ ﴾

إذا لم يصلوها صلوا وحدهم وإذا كانوا فى بيوتهم صلوا بإمام كما يصلون فى الصحراء .
وأما من كان يوم العيد مريضا أو محبوسا وعادته يصلى العيد فهذا لا يمكنه الخروج فهؤلاء بمنزلة الذين استخلف على من يصلى بهم فيصلون جماعة وفرادى ويصلون أربعا كما يصلون يوم الجمعة بلا تكبير ولا جهر بالقراء ة ولا أذان وإقامة لأن العيد ليس له أذان وإقامة فلا يكون فى المبدل عنه بخلاف الجمعة فإن فيها وفى الظهر أذانا وإقامة والجمعة كل من فاتته صلى الظهر ؛ لأن الظهر واجبة فلا تسقط إلا عمن صلى الجمعة فلا بد لكل من كان من أهل وجوب الصلاة أن يصلى يوم الجمعة إما الجمعة وإما الظهر ولهذا كان النساء والمسافرون وغيرهم إذا لم يصلوا الجمعة صلوا ظهرا .وأما يوم العيد فليس فيه صلاة مشروعة غير صلاة العيد وإنما تشرع مع الإمام فمن كان قادرا على صلاتها مع الإمام من النساء والمسافرين فعلوها معه وهم مشروع لهم ذلک بخلاف الجمعة فإنهم إن شاء وا صلوها مع الإمام وإن شاء وا صلوها ظهرا ؛ بخلاف العيد فإنهم إذا فوتوه فوتوه إلى غير بدل فكان صلاة العيد للمسافر والمرأة أوكد من صلاة يوم الجمعة والجمعة لها بدل بخلاف العيد .وكل من العيدين إنما يكون فى العام مرة والجمعة تتكرر فى العام خمسين جمعة وأكثر فلم يكن تفويت بعض الجمع كتفويت العيد .ومن يجعل العيد واجبا على الأعيان لم يبعد أن يوجبه على من كان فى البلد من المسافرين والنساء كما كان فإن جميع المسلمين الرجال والنساء كانوا يشهدون العيد مع رسول الله صلى الله عليه وسلم والقول بوجوبه على الأعيان أقوى من القول بأنه فرض على الكفاية .وأما قول من قال إنه تطوع فهذا ضعيف جدا ؛ فإن هذا مما أمر به النبى صلى الله عليه وسلم وداوم عليه هو وخلفاؤه والمسلمون بعده ولم يعرف قط دار إسلام يترک فيها صلاة العيد وهو من أعظم شعائر الإسلام .وقوله تعالى (ولتكبروا الله على ما هداكم) ونحو ذلک من الأمر بالتكبير فى العيدين أمر بالصلاة المشتملة على التكبير الراتب والزائد بطريق الأولى والأحرى وإذا لم يرخص النبى صلى الله عليه وسلم فى تركه للنساء فكيف للرجال .
ومن قال :هو فرض على الكفاية .قيل له :هذا إنما يكون فيما تحصل مصلحته بفعل البعض كدفن الميت وقهر العدو وليس يوم العيد مصلحة معينة يقوم بها البعض بل صلاة يوم العيد شرع لها الاجتماع أعظم من الجمعة فإنه أمر النساء بشهودها ولم يؤمرن بالجمعة بل أذن لهن فيها وقال :(صلاتكن فى بيوتكن خير لكن) . ثم هذه المصلحة بأى عدد تحصل ؟ فمهما قدر من ذلک كان تحكما سواء قيل بواحد أو اثنين أو ثلاثة .وإذا قيل بأربعين فهو قياس على الجمعة وهو فرض على الأعيان فليس لأحد أن يتخلف عن العيد إلا لعجزه عنه وإن تخلف عن الجمعة لسفر أو أنوثة .والله أعلم(مجموع الفتاوى،لابن تيمية، ج۲۴، ص ۱۸۱ الیٰ ۱۸۴، كتاب الفقه، الصلاة ،باب صلاة الجمعة،خروج النساء لمصلى العيد)

لمحہ شروع ہوجاتا ہے، جب نوافل کے جائز ہونے کا وقت شروع ہوتا ہے، اور عید کی نماز کا وقت، دوپہر کو سورج کے زوال تک جاری رہتا ہے۔

اور شافعیہ کے نزدیک عید کی نماز کا وقت، سورج طلوع ہوتے ہی، بلا تاخیر فوراً شروع ہوجاتا ہے، اور سورج کے زوال تک جاری رہتا ہے۔ [1]

---

[1] وقت أدائها:

ذهب جمهور الفقهاء -الحنفية والمالكية والحنابلة -إلى أن وقت صلاة العيدين يبتدء عند ارتفاع الشمس قدر رمح بحسب رؤية العين المجردة -وهو الوقت الذى تحل فيه النافلة -ويمتد وقتها إلى ابتداء الزوال.

وقال الشافعية :إن وقتها ما بين طلوع الشمس وزوالها، ودليلهم على أن وقتها يبدأ بطلوع الشمس أنها صلاة ذات سبب فلا تراعى فيها الأوقات التى لا تجوز فيها الصلاة.

أما الوقت المفضل لها، فهو عند ارتفاع الشمس قدر رمح، إلا أنه يستحب عدم تأخيرها عن هذا الوقت بالنسبة لعيد الأضحى، وذلك كى يفرغ المسلمون بعدها لذبح أضاحيهم، ويستحب تأخيرها قليلا عن هذا الوقت بالنسبة لعيد الفطر، وذلك انتظارا لمن انشغل فى صبحه بإخراج زكاة الفطر.

وهذا محل اتفاق عند سائر الأئمة ، ودليلهم على ما ذهبوا إليه من التفريق بين صلاتى الفطر والأضحى :أن رسول الله صلى الله عليه وسلم كتب إلى بعض الصحابة :أن يقدم صلاة الأضحى ويؤخر صلاة الفطر (الموسوعة الفقهية الكويتية، ج۲۷،ص ۲۴۳،مادة"صلاة العيدين")

ثالثا۔وقتها :اتفق الفقهاء على أن وقت صلاة العيد :هو ما بعد طلوع الشمس قدر رمح أو رمحين، أى بعد حوالى نصف ساعة من الطلوع، إلى قبيل الزوال، أى قبل دخول وقت الظهر، وهو وقت صلاة الضحى؛ للنهى عن الصلاة عند طلوع الشمس، فتحرم عند الشروق، وتكره بعدها عند الجمهور، فإذا صلوا قبل ارتفاع الشمس قدر رمح لا تكون عند الحنفية صلاة عيد، بل نفلا محرما(الفقه الاسلامي وادلتہٗ للزحيلى، ج۲،ص ۱۳۹۱،القسم الأول :العبادات،الباب الثانى : الصلاة ،الفصل العاشر،المبحث الرابع)

الشافعية قالوا :وقتها من ابتداء طلوع الشمس، وإن لم ترتفع إلى الزوال، ويسن قضاء ها بعد ذلک على صفتها الآتية.

المالكية قالوا :وقتها من حل النافلة إلى الزوال، ولا تقضى بعد ذلک.

الحنابلة قالوا :وقتها من حل النافلة، وهو ارتفاع الشمس قدر رمح بعد طلوعها إلى قبيل الزوال، وإن فاتت فى يومها تقضى فى اليوم التالى، ولو أمكن قضاء ها فى اليوم الأول، وكذلک تقضى، وإن فاتت أيام لعذر، أو لغير عذر.

الحنفية قالوا :وقتها من حل النافلة إلى الزوال، فإذا زالت الشمس وهو فيها فسدت إن حصل

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

سورج طلوع ہونے سے لے کر، زوال کے دوران جب بھی چاہیں، عید کی نماز پڑھی جاسکتی ہے، اور اپنے حسبِ حال اور حسبِ سہولت، اس وقت کے درمیان جب بھی عید کی نماز ادا کی جائے، وہ ادا ہو جاتی ہے۔ [1]

اگر لوگوں کو عید کے دن کا علم، وقت نکلنے کے بعد ہوا، تو نمازِ عید کو اگلے دن مذکورہ وقت میں یعنی سورج طلوع ہونے کے بعد زوال سے پہلے اداء کیا جاسکتا ہے۔

اور اگر ایسا نہ ہو، اور کوئی شخص، یا کچھ لوگ نمازِ عید سے رہ جائیں، اور وقت ختم ہو جائے، تو وہ لوگ اگلے دن عید کی نماز نہیں پڑھ سکتے۔

تاہم شافعیہ کے نزدیک چونکہ جماعت سے نمازِ عید پڑھنا، ضروری نہیں، اس لیے ان کے نزدیک کوئی شخص جماعت سے رہ جائے، تو وہ عید کے دن زوال سے پہلے پہلے عید کی نماز بغیر جماعت کے اداء پڑھ سکتا ہے، اور زوال کے بعد قضاء پڑھ سکتا ہے۔

مالکیہ بھی ایسے شخص کو زوال سے پہلے، تنہا بغیر جماعت کے پڑھنا مستحب قرار دیتے ہیں۔

اور حنفیہ کے نزدیک بھی جمعہ کی طرح مشہور اقوال کے مطابق چار افراد، اور دوسرے قول کے مطابق، دو افراد، عید کی نماز با جماعت اداء کر سکتے ہیں۔

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

الزوال قبل القعود قدر التشهد، ومعنى فسادها أنها تنقلب نفلاً، أما قضاؤها إذا فاتت فسيأتى حكمه بعد.

الشافعية قالوا :يسن تأخير صلاة العيدين إلى أن ترتفع الشمس قدر رمح.

المالكية قالوا :لا يسن تأخير صلاة العيدين عن أول وقتها(الفقه على المذاهب الأربعة،للجزيرى، ج ا ،ص ۳۱۴، كتاب الصلاة،مباحث صلاة العيدين، كيفية صلاة العيدين)

[1] تعجيل الصلاة وتأخيرها :يسن تعجيل صلاة الأضحى فى أول وقتها بحيث يوافق الحجاج بمنى فى ذبحهم، وتأخير صلاة الفطر عن أول وقتها قليلا، لما روى الشافعى مرسلا أن النبى صلى الله عليه وسلم كتب إلى عمرو بن حزم، وهو بنجران :أن عجل الأضحى، وأخر الفطر، وذكر الناس ولأنه يتسع لذلك وقت الأضحية، ووقت صدقة الفطر(الفقه الاسلامى وادلتهٔ للزحيلى، ج۲، ص ۱۳۹۱، القسم الأول :العبادات،الباب الثانى :الصلاة ،الفصل العاشر،المبحث الرابع)

اورحنابلہ کے نزدیک بھی اگرکوئی قضاء کرنا چاہے،تو اسے چار رکعات ایک، یادوسلام کے ساتھ اپنے مقام پررہ کر پڑھنادرست ہے،ضروری نہیں۔ [1]

---

[1] حكمها بعد خروج وقتها:

لفوات صلاة العيد عن وقتها ثلاث صور:

الصورة الأولى :أن تؤدى صلاة العيد جماعة فى وقتها من اليوم الأول ولكنها فاتت بعض الأفراد، وحكمها فى هذه الصورة أنها فاتت إلى غير قضاء ، فلا تقضى مهما كان العذر؛ لأنها صلاة خاصة لم تشرع إلا فى وقت معين وبقيود خاصة، فلا بد من تكاملها جميعا، ومنها الوقت .وهذا عند الحنفية والمالكية.

وأما الشافعية :فقد أطلقوا القول بمشروعية قضائها -على القول الصحيح فى المذهب -فى أى وقت شاء وكيفما كان :منفردا أو جماعة، وذلك بناء على أصلهم المعتمد، وهو أن نوافل الصلاة كلها يشرع قضاؤها .

وأما الحنابلة :فقالوا :لا تقضى صلاة العيد، فإن أحب قضاء ها فهو مخير إن شاء صلاها أربعا، إما بسلام واحد، وإما بسلامين.

الصورة الثانية :أن لا تكون صلاة العيد قد أديت جماعة فى وقتها من اليوم الأول، وذلك إما بسبب عذر :كأن غم عليهم الهلال وشهد شهود عند الإمام برؤية الهلال بعد الزوال، وإما بدون عذر.

ففى حالة العذر يجوز تأخيرها إلى اليوم الثانى سواء كان العيد عيد فطر أو أضحى؛ لأنه قد ثبت عن رسول الله صلى الله عليه وسلم :أن قوما شهدوا برؤية الهلال فى آخر يوم من أيام رمضان، فأمر عليه الصلاة والسلام بالخروج إلى المصلى من الغد.

وهذا عند الحنفية والشافعية والحنابلة فيشرع قضاء صلاة العيد فى اليوم الثانى عند تأخر الشهادة برؤية الهلال، أما المالكية :فقد أطلقوا القول بعدم قضائها فى مثل هذه الحال.

إلا أن الشافعية لا يعتبرون صلاتها فى اليوم الثانى قضاء إذا تأخرت الشهادة فى اليوم الذى قبله إلى ما بعد غروب الشمس .بل لا تقبل الشهادة حينئذ ويعتبر اليوم الثانى أول أيام العيد، فتكون الصلاة قد أديت فى وقتها .

الصورة الثالثة :أن تؤخر صلاة العيد عن وقتها بدون العذر الذى ذكرنا فى الصورة الثانية .فينظر حينئذ :إن كان العيد عيد فطر سقطت أصلا ولم تقض .وإن كان عيد أضحى جاز تأخيرها إلى ثالث أيام النحر، أى يصح قضاؤها فى اليوم الثانى، وإلا ففى اليوم الثالث من ارتفاع الشمس فى السماء إلى أول الزوال، سواء كان ذلك لعذر أو لغير عذر ولكن تلحقه الإساء ة إن كان غير معذور بذلك (الموسوعة الفقهية الكويتية، ج۲۷،ص ۲۴۴ و ۲۴۵،مادة"صلاة العيدين")

هل تقضى صلاة العيد وهل تصلى منفردا؟ للفقهاء رأيان:

قال الحنفية والمالكية :من فاتته صلاة العيد مع الإمام، لم يقضها؛ لفوات وقتها، والنوافل لا تقضى،

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

جب نمازِ عید فاسد ہوجائے، تو اس کے بعد اگر وقت موجود ہو، تو اس کو دوبارہ

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

ولأنها لم تعرف قربة إلا بشرائط لا تتم بالمنفرد، فلو أمكنه الذهاب لإمام آخر فعل، لأنها تؤدى بمواضع اتفاقا .ولا تجوز للمنفرد وإنما تصلى جماعة.

وقال الشافعية والحنابلة :من فاتته صلاة العيد مع الإمام، سن له قضاؤها على صفتها، لفعل أنس، ولأنه قضاء صلاة، فكان على صفتها كسائر الصلوات .وله قضاؤها متى شاء فى العيد وما بعده متى اتفق، والأفضل قضاؤها فى بقية اليوم.

وتجوز صلاة العيد للمنفرد والعبد والمسافر والمرأة، كما بينا (الفقه الاسلامى وادلتهٔ للزحيلى، ج۲، ص ۱۳۹۱، ۱۳۹۲،القسم الأول :العبادات،الباب الثانى :الصلاة ،الفصل العاشر،المبحث الرابع)

المدرك عند الشافعية والحنابلة :إن أدرك المصلى الإمام فى الخطبة، صلى تحية المسجد ثم جلس فسمعها، ولو كان بمسجد، ثم صلى العيد متى شاء ، قبل الزوال أو بعده على صفتها، ولو منفردا أو بجماعة دون أربعين؛ لأنها عند الشافعية نفل، فجاز للمنفرد فعلها كصلاة الكسوف، وتصير عند الحنابلة القائلين بفرضيتها تطوعا لسقوط فرض الكفاية بالطائفة الأولى .

وإن أدرك المرء الإمام فى التشهد، جلس معه، فإذا سلم الإمام، قام فصلى ركعتين، يأتى فيهما بالتكبير؛ لأنه أدرك بعض الصلاة التى ليست مبدلة من أربع، فقضاها على صفتها كسائر الصلوات.

صلاتها فى اليوم الثانى إذا تأخر إثبات العيد لما بعد الزوال:

إذا لم يعلم قوم بالعيد إلا بعد زوال الشمس (أى ظهر العيد)،أو غم الهلال على الناس، فشهدوا عند الإمام برؤية الهلال بعد الزوال، أو حصل عذر مانع كمطر شديد، ففى جواز صلاة العيد فى اليوم التالى رأيان:

قال المالكية :لا تصلى من الغد، ولا تنوب عن صلاة الجمعة؛ لفوات وقتها.

وقال الجمهور :تصلى فى اليوم التالى من الغد، وفى عيد الأضحى إلى ثلاثة أيام، لما روى أبو عمير بن أنس عن عمومة له من أصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم، قال :غم علينا هلال شوال، فأصبحنا صياما، فجاء ركب فى آخر النهار، فشهدوا أنهم رأوا الهلال بالأمس، فأمر النبى صلى الله عليه وسلم الناس أن يفطروا من يومهم، وأن يخرجوا غدا لعيدهم أى إلى المصلى كما فى رواية البيهقى.

وهذا هو الراجح، قال أبو بكر الخطيب :سنة النبى صلى الله عليه وسلم أولى أن تتبع، وحديث أبى عمير صحيح، فالمصير إليه واجب، وكالفرائض.

وإن شهد اثنان برؤية هلال شوال ليلة الحادى والثلاثين صلوا بالاتفاق فى الغد، ولا يكون ذلك قضاء ؛ لأن فطرهم غدا، لما روت عائشة رضى الله عنها أن النبى صلى الله عليه وسلم قال :فطركم يوم تفطرون، وأضحاكم يوم تضحون، وعرفتكم يوم تعرفون (الفقه الاسلامى وادلتهٔ للزحيلى، ج۲، ص ۱۳۹۲و۱۳۹۳،القسم الأول :العبادات،الباب الثانى :الصلاة ،الفصل العاشر،المبحث الرابع)

پڑھنا جائز ہے۔ [1]

نمازِ عید کا طریقہ اور چند متعلقہ مسائل

نمازِ عید سے متعلق مزید چند باتوں کو مختصراً سمجھ لینا ضروری ہے۔

ایک تو یہ کہ نمازِ عید کی دو رکعتیں ہیں، اور عید کی نماز سے پہلے اذان اور اقامت نہیں ہے۔

دوسرے حنفیہ کے نزدیک عید کی نماز کا جماعت سے اداء کرنا واجب ہے۔

تیسرے، عید کی نماز میں قرائت، جہراً یعنی بلند آواز سے کرنے کا حکم ہے، جو حنفیہ کے نزدیک واجب ہے، اور باقی فقہاء کے نزدیک واجب نہیں، بلکہ سنت، یا مستحب ہے۔

چوتھے عید کی نماز میں، دوسری نمازوں کے مقابلے میں کچھ زائد تکبیرات ہیں۔

---

[1] مفسدات صلاة العيد:

لصلاة العيد مفسدات مشتركة ومفسدات خاصة.

أما مفسداتها المشتركة :فهي مفسدات سائر الصلوات .(راجع :صلاة)

وأما مفسداتها الخاصة بها، فتلخص في أمرين:

الأول :أن يخرج وقتها أثناء أدائها بأن يدخل وقت الزوال، فتفسد بذلك .قال ابن عابدين :أي يفسد وصفها وتنقلب نفلا، اتفاقا إن كان الزوال قبل القعود قدر التشهد، وعلى قول الإمام أبي حنيفة إن كان بعده.

الثاني :انفساخ الجماعة أثناء أدائها.

فذلك -أيضا -من مفسدات صلاة العيد .وهل يشترط لفسادها أن تفسخ الجماعة قبل أن تقيد الركعة الأولى بالسجدة، أم تفسد مطلقا؟ يرد في ذلك خلاف وتفصيله في مفسدات صلاة الجمعة (ر :صلاة الجمعة) . وخالف المالكية والشافعية بالنسبة لانفساخ الجماعة .

ما يترتب على فسادها:

قال صاحب البدائع :إن فسدت صلاة العيد بما تفسد به سائر الصلوات من الحدث العمد وغير ذلك، يستقبل الصلاة على شرائطها، وإن فسدت بخروج الوقت، أو فاتت عن وقتها مع الإمام سقطت ولا يقضيها عندنا .

وسائر الأئمة متفقون على أن صلاة العيد إذا فسدت بما تفسد به سائر الصلوات الأخرى، تستأنف من جديد.

أما إن فسدت بخروج الوقت فقد اختلفوا في حكم قضائها أو إعادتها، وقد مر تفصيل البحث في ذلك عند الكلام على وقت صلاة العيد ف ٧ وما بعدها(الموسوعة الفقهية الكويتية، ج٢٧، ص٢٤٨، ٢٤٩، مادة"صلاة العيدين")

اور یہ زائد تکبیرات، حنفیہ کے نزدیک واجب ہیں، اور حنفیہ کے علاوہ دیگر فقہاء کے نزدیک واجب نہیں، بلکہ سنت ہیں۔

پھر حنفیہ کے نزدیک عید کی نماز میں مجموعی طور پر چھ زائد تکبیرات ہیں، تین تکبیرات پہلی رکعت میں، اور تین تکبیرات دوسری رکعت میں۔

اور شافعیہ کے نزدیک، عید کی نماز میں مجموعی طور پر بارہ زائد تکبیرات ہیں، ان کے نزدیک پہلی رکعت میں سات تکبیرات ہیں، جو تکبیرِ تحریمہ کے بعد اور قرائت شروع کرنے سے پہلے کہی جاتی ہیں، اور دوسری رکعت میں پانچ تکبیرات ہیں، وہ بھی دوسری رکعت کے شروع میں قرائت سے پہلے کہی جاتی ہیں۔

اور مالکیہ اور حنابلہ کے نزدیک، عید کی نماز میں مجموعی طور پر گیارہ زائد تکبیرات ہیں، ان کے نزدیک پہلی رکعت میں چھ تکبیرات ہیں، جو تکبیرِ تحریمہ کے بعد قرائت سے پہلے کہی جاتی ہیں، اور دوسری رکعت میں پانچ تکبیرات ہیں، جو دوسری رکعت میں کھڑے ہونے کے بعد، قرائت سے پہلے کہی جاتی ہیں۔ [1]

---

[1] كيفية أدائها:

أولا -الواجب من ذلك:

صلاة العيد، لها حكم سائر الصلوات المشروعة؛ فيجب ويفرض فيها كل ما يجب ويفرض في الصلوات الأخرى.

ويجب فيها -زيادة على ذلك -ما يلي:

أولا - :أن تؤدى في جماعة وهو قول الحنفية والحنابلة.

ثانيا - :الجهر بالقراء ة فيها، وذلك للنقل المستفيض عن النبي صلى الله عليه وسلم.

ثالثا :أن يكبر المصلي ثلاث تكبيرات زوائد بين تكبيرة الإحرام والركوع في الركعة الأولى، وأن يكبر مثلها -أيضا -بين تكبيرة القيام والركوع في الركعة الثانية.

وسيان (بالنسبة لأداء الواجب) أن تؤدى هذه التكبيرات قبل القراء ة أو بعدها، مع رفع اليدين أو بدونهما، ومع السكوت بين التكبيرات أو الاشتغال بتسبيح ونحوه .

أما الأفضل فسنتحدث عنه عند البحث في كيفيتها المسنونة.

فمن أدرك الإمام بعد أن كبر هذه التكبيرات :فإن كان لا يزال في القيام كبر المؤتم لنفسه بمجرد

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

اور عید کی نماز کی دونوں رکعتوں میں سورہ فاتحہ اور اس کے بعد کوئی سورت ملائی جاتی ہے۔ کوئی مخصوص سورت ضروری نہیں، البتہ عید کی نماز میں بعض سورتیں افضل ہیں۔ [1]

حنفیہ کے نزدیک عید کی نماز کا طریقہ

حنفیہ کے نزدیک عید کی نماز میں عام نمازوں کے مقابلہ میں چھ تکبیریں زیادہ ہیں، تین پہلی

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

الدخول فی الصلاۃ، وتابع الإمام .أما إذا أدرکہ راکعا فلیرکع معہ، ولیکبر تکبیرات الزوائد أثناء رکوعہ بدل من تسبیحات الرکوع.

وھذہ التکبیرات الزائدۃ قد خالف فی وجوبھا المالکیۃ والشافعیۃ والحنابلۃ، ثم اختلفوا فی عدد ھذہ التکبیرات ومکانھا.

فالشافعیۃ قالوا :ھی سبع فی الرکعۃ الأولی بین تکبیرۃ الإحرام وبدء القراء ۃ، وخمس فی الرکعۃ الثانیۃ بین تکبیرۃ القیام وبدء القراء ۃ أیضا.

وذھب المالکیۃ والحنابلۃ إلی أنھا ست تکبیرات فی الرکعۃ الأولی عقب تکبیرۃ الإحرام، وخمس فی الثانیۃ عقب القیام إلی الرکعۃ الثانیۃ أی قبل القراء ۃ فی الرکعتین .

والجھر بالقراء ۃ واجب عند الحنفیۃ فقط .واتفق الجمیع علی مشروعیتہ (الموسوعۃ الفقھیۃ الکویتیۃ، ج۲۷،ص۲۴۵، ۲۴۶،مادۃ”صلاۃ العیدین“)

[1] خامسا۔ کیفیۃ صلاۃ العید أو صفتھا :صلاۃ العید رکعتان بالاتفاق، لقول عمر رضی اللہ عنہ : صلاۃ الأضحی رکعتان، وصلاۃ الفطر رکعتان، وصلاۃ السفر رکعتان، وصلاۃ الجمعۃ رکعتان تمام غیر قصر علی لسان نبیکم، وقد خاب من افتری وھی تشمل بعد الإحرام علی تکبیرات :ثلاث عند الحنفیۃ، وست فی الأولی وخمس فی الثانیۃ عند المالکیۃ والحنابلۃ، وسبع فی الأولی وخمس فی الثانیۃ عند الشافعیۃ قبل القراء ۃ فی الرکعتین إلا عند الحنفیۃ فی الرکعۃ الثانیۃ یکون التکبیر بعد القراء ۃ، ویندب بعد الفاتحۃ قراء ۃ سورتین ھما عند الجمھور :(سبح اسم ربک الأعلی) و (الغاشیۃ)

ولکن عند المالکیۃ یقرأ فی الثانیۃ سورۃ (والشمس)ونحوھا، وعند الشافعیۃ :(ق)و (اقتربت) .ولا یؤذن لھا ولا یقام، لما روی عن ابن عباس رضی اللہ عنھما قال :شھدت العید مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ومع أبی بکر وعمر وعثمان رضی اللہ عنھم، فکلھم صلی قبل الخطبۃ بغیر أذان ولا إقامۃ والسنۃ أن ینادی لھا :الصلاۃ جامعۃ لما روی عن الزھری أنہ کان ینادی بہ وقیاسا علی صلاۃ الکسوف.

ویبدأ بھا عند الجمھور غیر المالکیۃ بالنیۃ بقلبہ ولسانہ فیقول :(أصلی صلاۃ العید للہ تعالی) إماما أو مقتدیا، ویأتی بعد الإحرام بدعاء الافتتاح أو الثناء (الفقہ الاسلامی وادلتہ للزحیلی، ج۲،ص۱۳۹۵، ۱۳۹۶،القسم الأول،الباب الثانی :الصلاۃ ،الفصل العاشر،المبحث الرابع)

رکعت میں ثناء کے بعد اور سورہ فاتحہ سے پہلے اور تین دوسری رکعت میں قرائت کے بعد اور رکوع سے پہلے۔

اور حنفیہ کے نزدیک پہلی رکعت میں تین زائد تکبیرات قرائت سے پہلے اور دوسری رکعت میں قرائت کے بعد ہیں، اور اس طرح دونوں رکعتوں میں قرائت پے در پے ہے، دونوں سورتوں کی قراءت کے درمیان زائد تکبیرات حائل نہیں ہیں۔

اور اگر تکبیرِ تحریمہ اور دونوں رکعتوں کی رکوع کی تکبیرات کو بھی ان چھ زائد تکبیرات کے ساتھ شمار کیا جائے، تو مجموعی طور پر نو اور تکبیرِ تحریمہ کے علاوہ آٹھ تکبیرات بن جاتی ہیں۔

حنفیہ کے نزدیک عید کی نماز کا مکمل طریقہ یہ ہے کہ پہلے دل میں عید الفطر کی دو رکعت چھ زائد تکبیروں کے ساتھ پڑھنے کی نیت کرے۔

پھر عام نمازوں کی طرح تکبیرِ تحریمہ کہہ کر نماز شروع کرے، اور ثناء (یعنی سُبْحَانَکَ اللّٰھُمَّ الخ) پڑھے، پھر وقفہ وقفہ سے تین مرتبہ ہاتھ اٹھا کر ''اللہ اکبر'' کہے، پہلی اور دوسری مرتبہ ''اللہ اکبر'' کہنے کے ساتھ کانوں تک ہاتھ اٹھا کر چھوڑتا رہے، اور تیسری مرتبہ ''اللہ اکبر'' کہنے کے بعد ہاتھ باندھ لے، اور امام کو چاہئے کہ ہر دفعہ بآوازِ بلند ''اللہ اکبر'' کہنے کے بعد کم از کم اتنی دیر ٹھہرے، جتنی دیر تین مرتبہ ''سُبْحَانَ رَبِّیَ الْعَظِیْم '' کہنے میں لگتی ہے، مجمع زیادہ ہونے کی وجہ سے ضرورت ہو، تو اس سے زیادہ بھی وقفہ کیا جاسکتا ہے۔

پہلی رکعت میں تین مرتبہ ''اللہ اکبر'' کہنے کے بعد امام ''اَعُوْذُ بِاللّٰہ '' اور ''بِسْمِ اللّٰہ '' پڑھ کر عام نمازوں کی طرح اونچی آواز سے سورہ فاتحہ اور اس کے بعد کسی سورت کی قرأت کرے اور حسبِ قاعدہ رکوع اور دو سجدوں کے ساتھ پہلی رکعت مکمل کرے۔

پھر دوسری رکعت میں کھڑے ہو کر حسبِ قاعدہ سورہ فاتحہ اور اس کے بعد کسی سورت کی قرأت کرے، اور پھر قرأت سے فارغ ہونے کے بعد رکوع سے پہلے اسی طرح ہاتھ اٹھا کر تین مرتبہ ''اللہ اکبر'' کہے، جیسے پہلی رکعت میں کہا تھا اور تینوں مرتبہ ہاتھ اٹھا کر چھوڑتا رہے۔

پھر چوتھی مرتبہ ہاتھ اٹھائے بغیر رکوع کی تکبیر کہتا ہوا رکوع میں جائے اور حسبِ قاعدہ رکوع اور دو سجدوں اور قعدہ کے ساتھ اور سلام پھیر کر نماز مکمل کرے۔ [1]

---

[1] وأما بيان كيفية أداء صلاة العيدين فنقول يصلى الإمام ركعتين فيكبر تكبيرة الافتتاح ويقول سبحانك اللهم وبحمدك إلى آخره ثم يكبر ثلاثا ثم يقرأ جهرا ثم يكبر تكبيرة الركوع فإذا قام إلى الثانية يقرأ أولا ثم يكبر ثلاثا ويركع بالرابعة فتكون التكبيرات الزوائد ستا ثلاثة فى الركعة الأولى وثلاثة فى الركعة الثانية وثلاثة أصليات تكبيرة الافتتاح وتكبيرات الركوع فصار حاصل الجواب عندنا أن يكبر فى صلاة العيدين تسع تكبيرات ستة فى الزوائد وثلاثة أصليات،ويوالى بين القراء تين فيقرأ فى الركعة الأولى بعد التكبيرات وفى الثانية قبل التكبيرات،وهذا هو مذهب عبد الله بن مسعود وحذيفة بن اليمان وعقبة بن عامر الجهنى وأبى موسى الأشعرى وأبى هريرة وابن مسعود الأنصارى رضى الله عنهم(تحفة الفقهاء، ج ۱ ص۱٦٧ ،كتاب الصلاة،باب صلاة العيدين)

كيفيتها فى المذاهب:

الحنفية :ينادى (الصلاة جامعة)، ثم ينوى المصلى إماما أو مقتديا صلاة العيد بقلبه ولسانه قائلا: (أصلى صلاة العيد لله تعالى) إماما للإمام، ومقتديا للمؤتمين، ثم يكبر تكبيرة الإحرام ثم يضع يديه تحت سرته، ثم يقرأ الإمام والمؤتم الثناء :(سبحانك اللهم وبحمدك ..الخ)، ثم يكبر الإمام والقوم ثلاثا تسمى تكبيرات الزوائد، لزيادتها على تكبيرة الإحرام والركوع، رافعا يديه فى كل منها، ثم يرسلها، ويسكت بعد كل تكبيرة مقدار ثلاث تسبيحات، ولا يسن ذكر معين، ولابأس بأن يقول :(سبحان الله والحمد لله، ولا إله إلا الله، والله أكبر)، ثم توضع اليدان تحت السرة.

ثم يتعوذ الإمام ويسمى سرا، ثم يقرأ جهرا الفاتحة، وسورة بعدها، وندب أن تكون سورة (الأعلى) تماما، ثم يركع الإمام والقوم.

فإذا قام للركعة الثانية :ابتدأ بالبسملة، ثم بالفاتحة، ثم بالسورة ليوالى بين القراء تين، وهو الأفضل عندهم، وندب أن تكون سورة (الغاشية)

ثم يكبر الإمام والقوم تكبيرات الزوائد ثلاثا مع رفع اليدين كما فى الركعة الأولى، لأثر ابن مسعود، قال :يكبر تكبيرة، ويفتتح به الصلاة، ثم يكبر بعدها ثلاثا، ثم يقرأ، ثم يكبر تكبيرة، يركع بها، ثم يسجد، ثم يقوم، فيقرأ، ثم يكبر ثلاثا، ثم يكبر تكبيرة، يركع بها ، ثم تتم الركعة الثانية إلى السلام.

فإن قدم التكبيرات فى الثانية على القراء ة جاز، وكذا إذا كبر زيادة على الثلاث إلى ست عشرة تكبيرة، فإذا زاد لا يلزم المؤتم المتابعة.

وإن نسى الإمام التكبيرات وركع، فإنه يعود ويكبر، ولا يعيد القراء ة، ويعيد الركوع.

أما المسبوق الذى سبقه الإمام :فإن كان قبل التكبيرات الزوائد، يتابع الإمام على مذهبه، ويترك رأيه .وإن أدركه بعدما كبر الإمام الزوائد وشرع فى القراء ة، فإنه يكبر تكبيرة الافتتاح، ويأتى بالزوائد برأى نفسه لا برأى الإمام؛ لأنه مسبوق.

وإن أدرك الإمام فى الركوع :فإن لم يخف فوت الركعة مع الإمام، يكبر للافتتاح قائما، ويأتى

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

مالکیہ کے نزدیک عید کی نماز کا طریقہ

مالکیہ کے نزدیک عید کی نماز کا طریقہ، اذان واقامت کے بغیر جہری قرائت کے ساتھ، حنفیہ کی طرح ہے، البتہ مالکیہ کے نزدیک تکبیرِ تحریمہ کے بعد پہلی رکعت میں چھ، اور دوسری رکعت میں پانچ تکبیرات، قرائت سے پہلے ہیں، اور ان تکبیرات کا قرائت سے قبل ہونا مستحب ہے، اوران کے نزدیک تکبیرات کا پے در پے اور لگاتار کہنا مستحب ہے، اورامام کے لیے ہر تکبیر کے بعد اتنا انتظار کرنا مستحب ہے کہ مقتدی بھی تکبیر کہہ لیں۔

اور مالکیہ کے مشہور قول کے مطابق، صرف تکبیرِ تحریمہ میں ہاتھ اٹھائے جائیں گے، اور باقی تکبیرات میں ہاتھ نہیں اٹھائے جائیں گے۔

نیز مالکیہ کے نزدیک، عید کی زائد تکبیرات سنتِ مؤکدہ ہیں۔ [1]

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

بالزوائد، ثم يتابع الإمام فى الركوع .وإن خاف إن كبر أن يرفع الإمام رأسه من الركوع، كبر للافتتاح، ثم كبر للركوع، وركع؛ لأنه لو لم يركع يفوته الركوع والركعة، وهذا لايجوز .ثم إذا ركع يكبر تكبيرات العيد فى الركوع عند أبى حنيفة ومحمد؛ لأن للركوع حكم القيام .وقال أبو يوسف .لا يكبر؛ لأنه فات عن محله، وهو القيام، فيسقط كالقنوت.

وعلى الرأى الأول الراجح :إن أمكنه الجمع بين التكبيرات والتسبيحات جمع بينهما، وإن لم يمكنه الجمع بينهما يأتى بالتكبيرات دون التسبيحات؛ لأن التكبيرات واجبة، والتسبيحات سنة، والاشتغال بالواجب أولى .فإن رفع الإمام رأسه من الركوع قبل أن يتمها رفع رأسه؛ لأن متابعة الإمام واجبة، وسقط عنه ما بقى من التكبيرات؛ لأنه فات محلها.

هذا إذا أدرك الإمام فى الركعة الأولى .فإن أدركه فى الركعة الثانية، كبر للافتتاح، وتابع إمامه فى الركعة الثانية، فإذا فرغ الإمام من صلاته، قام إلى قضاء ما سبق به، متبعا رأى نفسه؛ لأنه منفرد فيما يقضى، بخلاف اللاحق؛ لأنه فى الحكم كأنه خلف الإمام.

وتقدم صلاة العيد على صلاة الجنازة إذا اجتمعتا، وتقدم صلاة الجنازة على الخطبة(الفقه الاسلامى وادلتهٔ للزحيلى،ج۲،ص۱۳۹۶ الى ۱۳۹۸ ،القسم الأول :العبادات،الباب الثانى :الصلاة ،الفصل العاشر،المبحث الرابع)

[1] المالكية :كالحنفية فى أداء صلاة العيد ركعتين جهرا بلا أذان ولا إقامة، واستحباب قراء ة (سبح) ونحوها، وسورة (والشمس)ونحوها، إلا أن التكبير فى

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

شافعیہ کے نزدیک عید کی نماز کا طریقہ

شافعیہ کے نزدیک، ثناء، تعوذ اور جہری قرائت کے اعتبار سے عید کی نماز کا طریقہ، حنفیہ کی طرح ہے، اور شافعیہ کے نزدیک پہلی رکعت میں سات، اور دوسری رکعت میں پانچ تکبیرات، قرائت سے پہلے ہیں، اور تمام تکبیرات کے موقع پر رفعِ یدین کا حکم ہے، اور ہر تکبیر کے درمیان ایک معتدل، یعنی درمیانی مقدار والی آیت کے بقدر وقفہ کرنے کا حکم ہے، جس میں تہلیل اور تکبیر اور تمجید پڑھی جائے گی۔

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

الركعة الأولى ست بعد تكبيرة الإحرام، وفي الثانية خمس غير تكبيرة القيام، قبل القراءة ندبا، فإن أخر التكبير عن القراء ة صح، وخالف المندوب .ولا يتبع المؤتم الإمام في التأخير عن القراء ة ولا في الزيادة عن هذا القدر .ودليلهم على عدد التكبير عمل أهل المدينة، وقول ابن عمر :شهدت الأضحى والفطر مع أبي هريرة، فكبر في الأولى سبع تكبيرات قبل القراء ة، وفي الآخرة خمسا قبل القراء ة.

ويندب موالاة التكبير إلا الإمام فيندب له الانتظار بعد كل تكبيرة، حتى يكبر المقتدون به، ويرفع يديه في تكبيرة الإحرام فقط، ولا يرفع يديه مع التكبيرات في المشهور، ويكره الرفع .ويسكت المكبر .ويكره أن يقول شيئا من تسبيح أو تحميد أو تهليل أو غيرها.

والتكبيرات سنة مؤكدة، فلو نسي الإمام شيئا منها، وتذكره في أثناء قراء ته أوبعدها، كبر، ما لم يركع، وأعاد القراء ة، وسجد بعد السلام سجود السهو، لزيادة القراء ة الأولى.

وإن تذكره بعد أن ركع، استمر في صلاته وجوبا، ولا يرجع له، إذ لا يرجع من فرض لنفل، وإلا بطلت الصلاة، ويسجد الإمام للسهو ولو لترك تكبيرة واحدة، إذ كل تكبيرة منها سنة مؤكدة .وأما المؤتم فالإمام يحمله عنه.

وإذا لم يسمع المقتدي تكبير الإمام تحرى تكبيره وكبر.

والمسبوق :لا يكبر ما فاته أثناء تكبير الإمام، ويكمل ما فاته بسبب تأخر اقتدائه بعد فراغ الإمام منه، وإذا اقتدى بالإمام أثناء القراء ة بعد التكبير، فإنه يأتي بالتكبير بعد إحرامه، سواء في الركعة الأولى أو الثانية .ويأتي بست تكبيرات في الأولى، وبخمس في الثانية .وإذا فاتته الركعة الأولى يقضيها ستا غير تكبيرة القيام، وإن أدرك مع الإمام أقل من ركعة، قضى ركعتين بعد سلام الإمام، يكبر في الأولى ستا، وفي الثانية خمسا(الفقه الاسلامي وادلتہ للزحيلي، ج٢،ص١٣٩٨، ١٣٩٩، القسم الأول: العبادات،الباب الثاني :الصلاة ،الفصل العاشر،المبحث الرابع)

اوران کے نزدیک یہ زائد تکبیرات سنت ہیں، جن کے ترک کرنے سے سجدہ سہو واجب نہیں ہوتا۔ [1]

حنابلہ کے نزدیک عید کی نماز کا طریقہ

حنابلہ کے نزدیک بھی عید کی نماز میں قرائت سے پہلے ثناء اور تعوذ پڑھی جائے گی، اوران کے

---

[1] الشافعية :هم كالحنفية فى دعاء الافتتاح والتعوذ والجهر بالقراء ة، إلا أن التكبير عندهم سبع فى الأولى، خمس فى الثانية، قبل القراء ة مع رفع اليدين فى الجميع، يقف بين كل ثنتين كآية معتدلة، يهلل ويكبر ويمجد (أى يعظم الله)، واضعا يمناه على يسراه بينهما، تحت صدره، ويحسن فى ذلک الباقيات الصالحات :(سبحان الله والحمد لله، ولا إله إلا الله، والله أكبر) ثم يتعوذ ويقرأ .والتكبير ليس فرضا ولا بعضا من أبعاض الصلاة، وإنما هو سنة أو هيئة كالتعوذ ودعاء الافتتاح، فلا يسجد للسهو لتركهن عمدا ولا سهوا، وإن كان الترک لكلهن أو بعضهن مكروها.

ولو نسيها المصلى وتذكرها قبل الركوع، وشرع فى القراء ة، ولو لم يتم الفاتحة، لم يتداركها، وفاتت فى المذهب الجديد لفوات محله، فلو عاد لم تبطل صلاته، ولو عاد إلى القيام فى الركوع أوبعده ليكبر، فإن صلاته تبطل إن كان عالما متعمدا .والجهل كالنسيان.

ولو زاد الإمام عن عدد التكبير لا يتابعه المأموم، وإذا ترک الإمام التكبير تابعه المأموم فى تركه، فإن فعل بطلت صلاته إذا رفع يديه ثلاث مرات متوالية؛ لأنه فعل كثير تبطل به الصلاة، وإلا فلا تبطل .وإذا كبر الإمام أقل من هذا العدد تابعه المؤتم .والمسبوق ببعض الصلاة يكبر إذا فرغ من قضاء ما فاته.

ودليلهم على عدد التكبير :ما رواه الترمذى وحسنه :أنه صلى الله عليه وسلم كبر فى العيدين فى الأولى سبعا قبل القراء ة، وفى الثانية خمسا قبل القراء ة.

ودليلهم على التسبيح والتحميد بين التكبيرات :ما رواه البيهقى عن ابن مسعود قولا وفعلا، وقال أبو موسى الأشعرى وحذيفة :صدق .وهى الباقيات الصالحات، قال تعالى :(والباقيات الصالحات خير عند ربک ثوابا وخير أملا)وهى عند ابن عباس وجماعة.

ودليلهم على رفع اليدين :ما روى أن عمر رضى الله عنه كان يرفع يديه فى كل تكبيرة فى العيد.

والسنة أن يقرأ بعد الفاتحة فى الركعة الأولى :(ق)، وفى الثانية :(اقتربت)، بكمالهما جهرا، بدليل ما رواه أبو واقد الليثى :كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يقرأ فى الفطر والأضحى بـ (ق والقرآن المجيد)، و (اقتربت الساعة)، والجهر بالقراء ة لنقل الخلف عن السلف.

ولو قرأ فى الأولى :(سبح اسم ربک الأعلى)، وفى الثانية :(هل أتاک حديث الغاشية) ، كان سنة أيضا، لثبوته أيضا فى صحيح مسلم .وله أن يقرأ أيضا فى الأولى (الكافرون)وفى الثانية (الإخلاص) (الفقه الاسلامى وادلتهٔ للزحيلى، ج٢،ص ١٤٠٠ و ١٤٠١،القسم الأول :العبادات،الباب الثانى: الصلاة ،الفصل العاشر،المبحث الرابع)

نزدیک تکبیرات کی تعداد مالکیہ کی طرح، پہلی رکعت میں چھ اور دوسری رکعت میں پانچ ہے، اوران کے نزدیک ہر تکبیر کے ساتھ رفعِ یدین کا حکم ہے۔

اور ہر تکبیر کے بعد، تکبیر، تحمید اور تسبیح اور درود شریف پڑھنے کا حکم ہے، لیکن دونوں رکعتوں میں آخری تکبیر کے بعد کوئی ذکر نہیں ہے۔ [1]

عید کے خطبہ کا حکم

عید کا خطبہ جمعہ کے خطبہ کی طرح فرض نہیں، البتہ عید کا خطبہ، جمہور فقہائے کرام کے نزدیک

---

[1] الحنابلة :هم كالجمهور غير المالكية فى دعاء الافتتاح والتعوذ قبل القراء ة، وكالمالكية فى عدد التكبير :فى الأولى ستا زوائد، وفى الثانية خمسا، لما روى أحمد عن عمرو بن شعيب عن أبيه عن جده :أن النبى صلى الله عليه وسلم كبر فى عيد ثنتى عشرة تكبيرة، سبعا فى الأولى، وخمسا فى الآخرة وعدوا السبع مع تكبيرة الإحرام، خلافا للشافعية.

ويرفع يديه مع كل تكبيرة، لحديث وائل بن حجر :أنه صلى الله عليه وسلم كان يرفع يديه فى التكبير ويقول بين كل تكبيرتين زائدتين :الله أكبر كبيرا، والحمد لله كثيرا، وسبحان الله بكرة وأصيلا، وصلى الله على محمد وآله وسلم تسليما كثيرا لحديث ابن مسعود السابق فى رأى الشافعية .وإن أحب قال غير ذلك من الذكر؛ إذ ليس فيه ذكر مؤقت أى محدود .ولا يأتى بعد التكبيرة الأخيرة فى الركعتين بذكر أصلا.

والتكبير والذكر بين التكبيرات كما قال الشافعية :سنة، وليس بواجب، ولا تبطل الصلاة بتركه عمدا ولا سهوا .فإن نسى التكبير وشرع فى القراء ة، لم يعد إليه، لأنه سنة فات محلها، كما لو نسى الاستفتاح أو التعوذ، حتى شرع فى القراء ة، أو نسى قراء ة سورة حتى ركع.

كذلك لا يأتى بالتكبير إن أدرك الإمام قائما بعد التكبير الزائد أو بعضه، لفوات محله، كما لو أدرك الإمام راكعا .والمسبوق ولو بنوم أو غفلة ببعض صلاته يكبر إذا فرغ من قضاء ما فاته، وهو قول أكثر أهل العلم، ويعمل فى القضاء بمذهبه، ودليلهم عموم قوله صلى الله عليه وسلم :ما أدركتم فصلوا، ومافاتكم فاقضوا.

ويقرأ فى الركعة الأولى بعد الفاتحة بسبح، وفى الثانية بعد الفاتحة بالغاشية لحديث سمرة بن جندب أن النبى صلى الله عليه وسلم كان يقرأ فى العيدين بسبح اسم ربك الأعلى، وهل أتاك حديث الغاشية ؛لأن فى سورة (الأعلى)حثا على الصدقة والصلاة فى قوله (قد أفلح من تزكى، وذكر اسم ربه فصلى)

ويجهر بالقراء ة، لما روى الدارقطنى عن ابن عمر قال :كان النبى صلى الله عليه وسلم يجهر بالقراء ة فى العيدين والاستسقاء (الفقه الاسلامى وادلتهٔ للزحيلى، ج۲،ص ۱۴۰۲ و۱۴۰۳،القسم الأول :العبادات،الباب الثانى :الصلاة ،الفصل العاشر،المبحث الرابع)

سنت ہے، اور مالکیہ کے نزدیک مستحب ہے۔ [1]

عید کی نماز کے بعد امام کے لئے کھڑے ہو کر دو خطبے پڑھنا چاہئے، اور دونوں کے درمیان کچھ دیر کے لئے بیٹھنا چاہئے۔

---

[1] سادسا ۔ خطبة العيد :

تسن عند الجمهور وتندب عند المالكية خطبتان للعيد كخطبتى الجمعة فى الأركان والشروط والسنن والمكروهات، بعد صلاة العيد خلافا للجمعة، بلا خلاف بين المسلمين، يذكر الإمام فى خطبة عيد الفطر بأحكام زكاة الفطر .

لقوله صلى الله عليه وسلم :أغنوهم عن السؤال فى هذا اليوم، وفى عيد الأضحى بأحكام الأضحية وتكبيرات التشريق ووقوف الناس بعرفة وغيرها، تشبها بالحجاج، وما يحتاجون إليه فى يومهم، ويحسن تعليمهم ذلك فى خطبة الجمعة السابقة على العيد .وإذا صعد على المنبر لا يجلس عند الحنفية، ويجلس عند الحنابلة والمالكية والشافعية ليستريح.

ودليل سنية الخطبة :التأسى بالنبى صلى الله عليه وسلم وبخلفائه الراشدين فلا يجب حضورها ولا استماعها، لما روى عطاء عن عبد الله بن السائب قال :شهدت مع النبى صلى الله عليه وسلم العيد، فلما انقضت الصلاة، قال :إنا نخطب، فمن أحب أن يجلس للخطبة، فليجلس، ومن أحب أن يذهب فليذهب ولو ترك الخطبة جازت صلاة العيد.

وكونها بعد الصلاة اتباعا للسنة أيضا، فإن ابن عمر قال :إن النبى صلى الله عليه وسلم وأبا بكر وعمر وعثمان كانوا يصلون العيدين قبل الخطبة فلو خطب الإمام قبل الصلاة صح عند الحنفية وأساء ، لترك السنة، لأن التأخير سنة.

ويبدأ الخطيب خطبته بالتكبير، كما يكبر فى أثنائها، من غير تحديد عند المالكية، وقيل عندهم : سبعا فى أولها .وعند الجمهور :يكبر فى الخطبة الأولى تسع تكبيرات متوالية، وفى الثانية :يكبر فى الثانية بسبع متوالية أيضا، لما روى سعيد بن منصور عن عبيد الله بن عتبة، قال :كان يكبر الإمام يومى العيد قبل أن يخطب تسع تكبيرات، وفى الثانية :سبع تكبيرات ويستحب عند الحنفية أيضا أن يكبر الإمام قبل نزوله من المنبر أربع عشرة مرة، ويندب للإمام بعد فراغه من الخطبة أن يعيدها لمن فاته سماعها، ولو نساء ، اتباعا للسنة، رواه الشيخان.

ويلاحظ أن الخطب المشروعة عشر :خطبة الجمعة، والعيدين، والكسوفين، والاستسقاء ، والزواج، وأربع فى الحج عند الشافعية، وثلاث عند الحنفية، وكلها بعد الصلاة إلا خطبتى الجمعة وعرفة فقبلها، وخطبة الزواج لا تقترن بصلاة، وكل منها ثنتان إلا الثلاثة الباقية فى الحج عند الشافعية ما عدا خطبة عرفة، وخطبة النكاح، ففرادى، ويبدأ بالتحميد فى ثلاث :خطبة الجمعة والاستسقاء والزواج، ويبدأ بالتكبير فى خمس أوست :خطبة العيدين، وثلاث أو أربع خطب الحج .إلا التى بمكة وعرفة، يبدأ فيها بالتكبير ثم بالتلبية، ثم بالخطبة(الفقه الاسلامى وادلتهٗ للزحيلى، ج٢،ص١٤٠٣ الٰی ١٤٠٥ ،القسم الأول :العبادات،الباب الثانى :الصلاة ،الفصل العاشر،المبحث الرابع)

عید کی نماز کا خطبہ، عید کی نماز کے بعد پڑھنا سنت ہے، اور اس کو خاموشی سے سننا چاہئے۔ [1]

نمازِ عید کی سنن ومندوبات

نمازِ عید میں باقی چیزیں اسی طرح سے سنت اور مستحب ہیں، جس طرح دوسری نمازوں میں ہیں۔ [2]

---

[1] وتختلف خطبة العيد عن خطبة الجمعة فى أمور:
منهـا ــ أن خـطبة الجمعة تكون قبل الصلاة، وخطبة العيد بعد الصلاة، فإذا قدمها لم تصح عند غير الـحنفية، ويندب إعادتها بعد الصلاة .ومـنهـا ـ أن خطبتى الجمعة تبدآن بالحمد لله، وهو شرط أو ركـن عـنـد الشـافـعية والـحنابلة، سنة عند الحنفية، مندوب عند المالكية، أما خطبتا العيدين فيسن افتتاحهما بالتكبير.
ومـنهـا ــ يسـن بـالـمستـمـع خـطبة الـعيد عند الحنفية والحنابلة والمالكية أن يكبر سرا عند تكبير الـخـطيـب، أمـا خـطبة الجمعة فيحرم الكلام فيها، ولو ذكرا عند الجمهور، وقال الحنفية :لا يكره الـذكـر فى خطبة الجمعة والعيد على الأصح .ويـحـرم الكلام غير التكبير عند الحنابلة فى كل من خطبة العيد والجمعة.
وقـال الشافعية :الـكـلام مـكـروه لا مـحرم فى خطبة الجمعة والعيد، ولا يكبر الحاضرون فى حال الخطبة، بل يستمعونها.
ومـنهـا ــ أن الـخـطيـب عـنـد الـحنفية خلافا للجمهور لايجلس إذا صعد المنبر، ويجلس فى خطبة الجمعة.
ومـنهـا ــ أن الـخـطيـب عند المالكية إذا أحدث فى أثناء خطبة العيد يستمر ولا يستخلف، بخلاف خطبة الجمعة، فإنه إذا أحدث فيها يستخلف.
ومـنهـا ــ أن خـطبة الـعيـد عـند الشافعية لا يشترط فيها شروط خطبة الجمعة من قيام وطهارة وستر عـورة وجلوس بين الخطبتين، وإنما يسن ذلك فقط(الفقه الاسلامى وادلتهٔ للزحيلى، ج۲،۱۴۰۵ و۱۴۰۶، القسم الأول :العبادات،الباب الثانى :الصلاة ،الفصل العاشر،المبحث الرابع)

[2] ثانيا :المندوب من ذلك:
يـنـدب فـى صلاة العيدين كل ما يندب فى الصلوات الأخرى :فـعلا كان، أو قراء ة، وتختص صلاة العيدين بمندوبات أخرى نجملها فيما يلى:
أولا -يسـن أن يسـكـت بيـن كل تكبيرتين من التكبيرات الزوائد قدر ثلاث تسبيحات ولا يسن أن يشتغل بينهما بذكر أو تسبيح.
ثانيا -يسـن أن يرفع يديه عند التكبيرات الزوائد إلى شحمة أذنيه، بخلاف تكبيرة الركوع فلا يرفع يديه عندها.

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

حنفیہ کے نزدیک فجر کے بعد عید کی نماز سے پہلے گھر، یا کسی بھی جگہ کوئی نفل نماز پڑھنا مرد وعورت دونوں کے لئے مکروہ ہے۔

اور عید کی نماز کے بعد جہاں عید کی نماز ادا کی ہے، وہاں نفل پڑھنا مکروہ ہے، کسی دوسری جگہ یا گھر میں مرد وعورت دونوں کے لئے مکروہ نہیں۔

البتہ قضاء نماز، عید سے پہلے پڑھنے میں حرج نہیں، مگر بہتر یہ ہے کہ وہ عید گاہ میں، یا مسجد میں دوسروں کے سامنے نہ پڑھی جائے، تاکہ لوگوں کو غلط فہمی پیدا نہ ہو۔ [1]

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

ثالثا -يسن أن يوالى بين القراء ة فى الركعتين، وذلک بأن يكبر التكبيرات الزوائد فى الركعة الأولى قبل القراء ة، وفى الركعة الثانية بعدها، فتكون القراء تان متصلتين على ذلک.

رابعا -يسن أن يقرأ فى الركعة الأولى سورة الأعلى وفى الركعة الثانية سورة الغاشية ولا يلتزمهما دائما كى لا يترتب على ذلک هجر بقية سور القرآن.

خامسا -يسن أن يخطب بعدها خطبتين، لا يختلف فى كل منهما فى واجباتها وسننها عن خطبتى الجمعة .إلا أنه يستحب أن يفتتح الأولى منهما بتسع تكبيرات متتابعات والثانية بسبع مثلها .

هذا ولا يشرع لصلاة العيد أذان ولا إقامة، بل ينادى لها :الصلاة جامعة (الموسوعة الفقهية الكويتية، ج۲۷،ص ۲۴۲ ،۲۴۷،مادة"صلاة العيدين")

[1] (ويكره النفل قبل صلاة العيد) مطلقا ؛ (و) كذا يكره (بعدها فى الجبانة) أى الصحراء والمراد بها فناء المصر المعد لصلاة العيد والجمعة ولا فرق فى هذا الحكم بين الجبانة والجامع (وينتقل) فى غير الجبانة أما (فى مسجده) أى مسجد محلته (أو فى بيته (حلبى صغير—مختصر غنية المتملى فى شرح منية المصلى – لابراهيم الحلبى،ص۱۷۵ ،كتاب الصلاة، كراهية الصلاة)

إذا قضى صلاة الفجر قبل صلاة العيد لا بأس به ولو لم يصل صلاة الفجر لا يمنع جواز صلاة العيد وكذا يجوز قضاء الفوائت القديمة قبلها لكن لو قضاها بعدها فهو أحب وأولى(الفتاوىٰ الهندية، ج ۱ ص ۱۵۰ ، كتاب الصلاة، الباب السابع عشر فى صلاة العيدين)

وعامة أصحابنا على أنه لا يتطوع قبل صلاة العيد لا فى المصلى ولا فى بيته، فأول الصلاة فى هذا اليوم صلاة العيد والله أعلم(المحيط البرهانى، ج ۱ ص۲۹۷، كتاب الصلاة، فصل بيان ما يكره من التطوع)

و "يكره التنفل "قبل "صلاة "العيد ولو "تنفل "فى المنزل و "كذا "بعده "أى العيد "فى المسجد "أى مصلى العيد لا فى المنزل فى اختيار الجمهور لأنه صلى الله عليه وسلم كان لا يصلى قبل العيد شيئا فإذا رجع إلى منزله صلى ركعتين (مراقى الفلاح شرح نورالايضاح، ص۷۷، كتاب الصلاة، احكام الصلاة، فصل فى الاوقات المكروهة)

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

اورشافعیہ کے نزدیک عید کی نماز سے پہلے اورعید کی نماز کے بعد، نفل نماز پڑھنا سوائے امام کے، کسی کے لیے مکروہ نہیں۔

اور مالکیہ کے نزدیک عید کے دن، عید کی نماز سے پہلے اورعید کی نماز کے بعد، زوال تک نفل پڑھنا مکروہ ہے، بشرطیکہ عید کی نماز، عیدگاہ میں اداء کی گئی ہو، اوراگر مسجد میں اداء کی گئی ہو، تو پھر مکروہ نہیں۔

اورحنابلہ کے نزدیک امام اورمقتدی ہرایک کے لیے، عید کی نماز سے پہلے اورعید کی نماز کے بعد، صرف اس جگہ نوافل کا پڑھنا مکروہ ہے، جہاں عید کی نماز پڑھی جائے، اوراس کے علاوہ دوسرے مقام پر نہ عید کی نماز سے پہلے نوافل کا پڑھنا مکروہ ہے، اورنہ ہی عید کی نماز کے بعد مکروہ ہے۔ [1]

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

قوله" :في المصلى اتفاقا "في القهستاني عن المضمرات أنها لا تكره في ناحية المسجد عند ابن مقاتل فكأنه لم يعتبر خلافه والكراهة تثبت مطلقا ولو في صلاة الضحى أو تحية المسجد وسواء من تجب عليه صلاة العيد وغيره حتى يكره للنساء أن يصلين الضحى يوم العيد قبل صلاة الإمام كما في النهر وغيره عن الخانية قوله " :لأن رسول الله صلى الله عليه وسلم الخ "أي مع حرصه على النوافل فلولا الكراهة لفعل(حاشية الطحاوي على المراقي، ص ۵۳۱، ۵۳۲، كتاب الصلاة، باب الجمعة)

(ويكره التنفل قبل صلاة العيد) مطلقا ؛(و) كذا يكره (بعدها)اى بعد صلاة العيد، لكن (في الجبانة)فقط وهي الصحراء والمراد بها فناء المصر المعد لصلاة العيد والجمعة ولا فرق في هذا الحكم بين الجبانة والجامع (وينتفل) في غير الجبانة أما (في مسجده) أي مسجد محلته (أو في بيته)لما تقدم من الدليل في بيان اوقات الكراهة (غنية المتملي في شرح منية المصلي ، المعروف بشرح الكبير ص ۳۶۵، كتاب الصلاة ، كراهية الصلاة، الناشر:سهيل اكادمي، لاهور، الباكستان، الطبعة الثالثة ۱۴۱۲ھ)

[1] وذهب الحنفية إلى أنه لا سنة لها قبلية ولا بعدية، ولا تصلى أي نافلة قبلها وقبل الفراغ من خطبتها؛ لأن الوقت وقت كراهة، فلا يصلى فيه غير العيد .أما بعد الفراغ من الخطبة فلا بأس بالصلاة.

وذهب الشافعية إلى أنه لا يكره التنفل قبلها ولا بعدها لما عدا الإمام، سواء صليت في المسجد أو المصلى .

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

عید کے دن سے متعلق چند سنتیں اور مستحبات وآداب

عید کا دن چونکہ عبادت اور خوشی کے مجموعے کا دن ہے، اس لیے شریعت کی طرف سے اس دن ایسے کام عبادت قرار دیئے گئے ہیں، جو ان دونوں عناصر کو شامل ہوں؛ یعنی ان میں عبادت کا پہلو بھی ہو، اور خوشی ومسرت کا پہلو بھی ہو۔

چنانچہ احادیث وروایات سے چند اعمال کا سنت ومستحب ہونا معلوم ہوتا ہے، جن کا خلاصہ یہ ہے:

(1)...... عید کی رات میں حسبِ توفیق نفلی عبادت وذکر کرنا، اور بطورِ خاص گناہوں سے بچنا۔

(2)...... عید کے دن صبح کو سویرے اُٹھنا، اور فجر کی نماز اپنے وقت پر اداء کرنا، اور مرد حضرات کو فجر کی نماز مسجد میں باجماعت پڑھنا۔

(3)...... شریعت کے موافق طہارت و نظافت اور صفائی ستھرائی اور زیب وزینت اختیار کرنا۔

(4)...... خوب اہتمام کے ساتھ میل کچیل دور کر کے غسل کرنا۔

(5)...... خاص اہتمام کے ساتھ مرد وعورت سب کو مسواک کرنا۔

(6)...... فاضل (یعنی زیرِ ناف وبغلوں اور مونچھوں کے) بال اور ہاتھ پاؤں کی انگلیوں کے ناخن وغیرہ کاٹنا۔

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

وفصل المالكية فقالوا :يكره التنفل قبلها وبعدها إلى الزوال، إن أديت في المصلى ولا يكره إن أديت في المسجد.

وللحنابلة تفصيل آخر فقد قالوا :لا يتنفل قبل الصلاة ولا بعدها كل من الإمام والمأموم، في المكان الذي صليت فيه، فأما في غير موضعها فلا بأس (الموسوعة الفقهية الكويتية، ج٢٧، ص٢٤٨، مادة"صلاة العيدين")

(7)...... پاک وصاف عمدہ لباس، جو میسر ہو، پہننا۔

(8)......خوشبو لگانا (مگر خواتین تیز خوشبو لگانے سے پرہیز کریں)

(9)......صدقۂ فطر ادا نہ کیا ہو، تو عید کی نماز سے پہلے پہلے ادا کر دینا۔

(10)......عید کی نماز کے لئے جلدی پہنچنا۔

(11)......کوئی عذر نہ ہو، تو عید کی نماز ادا کرنے کے لیے پیدل جانا۔

(12)......کوئی عذر نہ ہو، تو عید کی نماز، عیدگاہ میں ادا کرنا۔

(13)......عید کی نماز کے لیے جاتے ہوئے راستے میں تکبیر کہنا، اور تکبیر ان الفاظ میں کہنا بہتر ہے:

”اَللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ وَلِلّٰہِ الْحَمْدُ“

(14)......عید الفطر کی نماز کے لئے جانے سے پہلے کچھ کھالینا اور اگر یہ میٹھی چیز ہو، تو زیادہ مناسب ہے۔

(15)......جس راستہ سے عید کی نماز کے لئے جائیں، اس کے علاوہ سے واپس آنا۔

(16)......اپنی وسعت وحیثیت کے مطابق صحیح مستحقین ومساکین کو صدقہ کرنا۔

(17)......حسبِ حیثیت اپنے اہل وعیال اور گھر والوں کی ضروریات (لباس، اور کھانے پینے وغیرہ) میں وسعت وفراخی کرنا۔

(18)......گھر والوں، عزیزوں اور دوستوں کے ساتھ خوش اخلاقی سے پیش آنا، اور مبارک باد دینا۔ [1]

---

[1] ولها -أيضا -سنن تتصل بها وهى قبل الصلاة أو بعدها نجملها فيما يلى:
أولا :أن يطعم شيئا قبل غدوه إلى الصلاة إذا كان العيد عيد فطر، ويسن أن يكون المطعوم حلوا كتمر ونحوه، لما روى البخارى أنه صلى الله عليه وسلم كان لا يغدو يوم الفطر حتى يأكل تمرات.
ثانيا :يسن أن يغتسل ويتطيب ويلبس أحسن ثيابه.

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

عید کے دن کثرت سے تکبیر کہنا سنت و مستحب ہے، جس کے الفاظ اور اوقات میں، فقہائے

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

ثالثا :یسن الخروج إلى المصلى ماشيا، فإذا عاد ندب له أن يسير من طريق أخرى غير التى أتى منها .ولا بأس أن يعود راكبا.

ثم إن كان العيد فطرا سن الخروج إلى المصلى بدون جهر بالتكبير فى الأصح عند الحنفية .

رابعا :إن كان أضحى فيسن الجهر بالتكبير فى الطريق إليه.

قال فى الدر المختار :قيل :وفى المصلى أيضا وعليه عمل الناس اليوم .

واتفقت بقية الأئمة مع الحنفية فى استحباب الخروج إلى المصلى ماشيا والعود من طريق آخر، وأن يطعم شيئا يوم عيد الفطر قبل خروجه إلى الصلاة، وأن يغتسل ويتطيب ويلبس أحسن ثيابه.

أما التكبير فى الطريق إلى المصلى فقد خالف الحنفية فى ذلك كل من المالكية والحنابلة، والشافعية، فذهبوا إلى أنه يندب التكبير عند الخروج إلى المصلى والجهر به فى كل من عيدى الفطر والأضحى.

وأما التكبير فى المصلى :فقد ذهبت الشافعية (فى الأصح من أقوال ثلاثة) إلى أنه يسن للناس الاستمرار فى التكبير إلى أن يحرم الإمام بصلاة العيد.

وذهب المالكية -أيضا -إلى ذلك استحسانا .قال العلامة الدسوقى فى حاشيته على الشرح الكبير :وأما التكبير جماعة وهم جالسون فى المصلى فهذا هو الذى استحسن، وهو رأى عند الحنابلة أيضا .

وأما التكبيرات الزوائد فى الصلاة :فقد خالف الحنفية فى استحباب موالاتها، وعدم فصل أى ذكر بينها كل من الحنابلة والشافعية حيث ذهب هؤلاء جميعا إلى أنه يستحب أن يفصل بينها بذكر، وأفضله أن يقول :سبحان الله والحمد لله ولا إله إلا الله والله أكبر .أو يقول :الله أكبر كبيرا والحمد لله كثيرا وسبحان الله وبحمده بكرة وأصيلا.

كما خالف المالكية فى استحباب رفع اليدين عند التكبيرات الزوائد، فذهبوا إلى أن الأفضل عدم رفع اليدين عند شىء منها .كما خالف المالكية، فى عدد التكبيرات التى يستحب افتتاح الخطبة بها .ويستحب عندهم أن تفتتح الخطبة بالتكبير ولا تحديد للعدد عندهم(الموسوعة الفقهية الكويتية، ج۲۷،ص۲۴۷و۲۴۸،مادة"صلاة العيدين")

وأما آدابه فمنها :الاغتسال ويدخل وقته بنصف الليل، والتطيب، والاستياک، ولبس أحسن الثياب .ويسن أن يكون ذلک قبل الصلاة، وأداء فطرته قبل الصلاة.

ومن آداب العيد :إظهار البشاشة والسرور فيه أمام الأهل والأقارب والأصدقاء ، وإكثار الصدقات .قال فى الدر المختار :والتهنئة بتقبل الله منا ومنكم لا تنكر.

ونقل ابن عابدين الخلاف فى ذلک ثم صحح القول بأن ذلک حسن لا ينكر، واستند فى تصحيحه هذا إلى ما نقله عن المحقق ابن أمير الحاج من قوله :بأن ذلک مستحب فى الجملة. وقاس على ذلک ما اعتاده أهل البلاد الشامية والمصرية من قولهم لبعض :عيد مبارک .

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

کرام کے مابین تھوڑا بہت اختلاف ہے۔ [1]

﴿ گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ ﴾

وذكر الشهاب ابن حجر -أيضا -أن هذه التهنئة على اختلاف صيغها مشروعة.
واحتج له بأن البيهقي عقد له بابا فقال :باب ما روى في قول الناس بعضهم لبعض في العيد :تقبل الله منا ومنكم، وساق فيه ما ذكره من أخبار وآثار ضعيفة لكن مجموعها يحتج به في مثل ذلك، ثم قال الشهاب :ويحتج لعموم التهنئة بسبب ما يحدث من نعمة، أو يندفع من نقمة بمشروعية سجود الشكر، وبما في الصحيحين عن كعب بن مالك في قصة توبته لما تخلف في غزوة تبوك :أنه لما بشر بقبول توبته مضى إلى النبي صلى الله عليه وسلم قام إليه طلحة بن عبيد الله فهنأه .
كما يكره حمل السلاح فيه، إلا أن يكون مخافة عدو مثلا؛ لما ورد في ذلك من النهي عن رسول الله صلى الله عليه وسلم(الموسوعة الفقهية الكويتية، ج٢٧،ص ٢٥٠، ٢٥١،مادة"صلاة العيدين")

[1] شعائر وآداب العيد:
أما شعائره فأبرزها :التكبير.
وصيغته :الله أكبر الله أكبر لا إله إلا الله، والله أكبر الله أكبر، ولله الحمد.
وخالفت الشافعية والمالكية، فذهبوا إلى جعل التكبيرات الأولى في الصيغة ثلاثا بدل ثنتين.
ثم إن هذا التكبير يعتبر شعارا لكل من عيدى الفطر والأضحى، أما مكان التكبير وحكمه وكيفيته في عيد الفطر فقد مر الحديث عنه ف /.12
وأما حكمه ومكانه في عيد الأضحى، فيجب التكبير مرة عقب كل فرض أدى جماعة، أو قضى في أيام العيد، ولكنه كان متروكا فيها، من بعد فجر يوم عرفة إلى ما بعد عصر يوم العيد.
وذهب أبو يوسف ومحمد (وهو المعتمد في المذهب) إلى أنه يجب بعد كل فرض مطلقا،ولو كان المصلي منفردا أو مسافرا أو امرأة، من فجر يوم عرفة إلى ما بعد عصر اليوم الثالث من أيام التشريق.
أما ما يتعلق بحكم التكبير :فسائر المذاهب على أن التكبير سنة أو سنة مؤكدة وليس بواجب.
والمالكية يشرع التكبير عندهم إثر خمس عشرة صلاة تبدأ من ظهر يوم النحر.
وأما ما يتعلق بنوع الصلاة التي يشرع بعدها التكبير :فقد اختلفت في ذلك المذاهب:
فالشافعية على أنه يشرع التكبير عقب كل الصلوات فرضا كانت أم نافلة على اختلافها لأن التكبير شعار الوقت فلا يختص بنوع من الصلاة دون آخر.
والحنابلة على أنه يختص بالفروض المؤداة جماعة من صلاة الفجر يوم عرفة إلى صلاة العصر من آخر أيام التشريق، فلا يشرع عقب ما أدى فرادى من الصلوات.
والمالكية على أنه يشرع عقب الفرائض التي تصلى أداء ، فلا يشرع عقب ما صلى من ذلك قضاء مطلقا أي سواء كان متروكات العيد أم لا(الموسوعة الفقهية الكويتية، ج٢٧، ص ٢٤٩ و ٢٥٠، مادة "صلاة العيدين")
سابعا۔ حكم التكبير في العيدين :

﴿ بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں ﴾

حنفیہ کے نزدیک عید الفطر کی نماز کے لیے جاتے ہوئے راستے میں، بلکہ بعض حضرات کے نزدیک عیدگاہ پہنچ کر امام کی آمد سے پہلے بھی تکبیر کہنا سنت ہے، اور دلیل کے لحاظ سے راجح

﴿ گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ ﴾

اتفق الفقهاء على مشروعية التكبير فى العيدين فى الغدو إلى الصلاة، وفى إدبار الصلوات أيام الحج .

أما التكبير فى الغدو إلى صلاة العيد :فقال أبو حنيفة :يندب التكبير سرا فى عيد الفطر فى الخروج إلى المصلى لحديث خير الذكر الخفى، وخير الرزق ما يكفى ، ويقطعه إذا انتهى إلى المصلى فى رواية، وفى رواية :إلى الصلاة .

وقال الصاحبان :يكبر جهرا، واتفقوا على التكبير جهرا فى عيد الأضحى فى الطريق.

وقال الجمهور :يكبر فى المنازل والمساجد والأسوق والطرق أى عند الغدو إلى الصلاة جهرا، إلى أن تبدأ الصلاة، وعند الحنابلة :إلى فراغ الخطبة،

وهو فى الفطر آكد من تكبير ليلة الأضحى لقوله تعالى :(ولتكملوا العدة، ولتكبروا الله على ما هداكم، ولعلكم تشكرون)ولما فيه من إظهار شعائر الإسلام، وتذكير الغير.

ويندب التكبير المطلق (وهو ما لا يكون عقب الصلاة) عند الشافعية والحنابلة :من غروب شمس ليلة عيد الفطر، لا ما قبلها :ولا يسن التكبير المقيد (وهو المفعول عقب الصلاة) ليلة الفطر عند الحنابلة وفى الأصح عند الشافعية، لعدم وروده(الفقه الاسلامى وادلتهٔ للزحيلى، ج٢، ص٢٠٦و١٤٠٧ ،القسم الأول :العبادات،الباب الثانى :الصلاة ،الفصل العاشر،المبحث الرابع)

وصيغة التكبير:

عند الحنفية والحنابلة شفعا :(الله أكبر، الله أكبر، لا إله إلا الله، والله أكبر، الله أكبر (ثنتين)، ولله الحمد) عملا بخبر جابر عن النبى صلى الله عليه وسلم الآتى، وهو قول الخليفتين الراشدين، وقول ابن مسعود.

وصيغته عند المالكية والشافعية فى الجديد ثلاثا :(الله أكبر، الله أكبر، الله أكبر)، وهذا هو الأحسن عند المالكية، فإن زاد (لا إله إلا الله، والله أكبر، الله أكبر، ولله الحمد) فهو حسن، عملا بما ورد عن جابر وابن عباس رضى الله عنهم، ويستحب أن يزيد عند الشافعية بعد التكبيرة الثالثة : (الله أكبر كبيرا، والحمد لله كثيرا، وسبحان الله بكرة وأصيلا) كما قاله النبى صلى الله عليه وسلم على الصفا .ويسن أن يقول أيضا بعد هذا :(لا إله إلا الله ولا نعبد إلا إياه، مخلصين له الدين، ولو كره الكافرون، لا إله إلا الله وحده، صدق وعده، ونصر عبده، وهزم الأحزاب وحده، لا إله إلا الله والله أكبر .(وهذه الزيادة إن شاء ها عند الحنفية، ويختمها بقوله :(اللهم صل على محمد وعلى آل محمد، وعلى أصحاب محمد، وعلى أزواج محمد، وسلم تسليما كثيرا(الفقه الاسلامى وادلتهٔ للزحيلى، ج٢،ص١٤٠٧ ،القسم الأول :العبادات،الباب الثانى :الصلاة ،الفصل العاشر،المبحث الرابع)

یہ ہے کہ عیدالفطر کے دن بھی عیدالاضحیٰ کی طرح جہراً تکبیر کہنا سنت ومستحب ہے۔ [1]

---

[1] السنة فی الأضحی التکبیر فی الطریق کما سیأتی فافهم(رد المحتار علی الدر المختار، ج۲ ص ۱۶۹، کتاب الصلاة ،باب العیدین)

ومنها أن یغدو إلی المصلی جاهرا بالتکبیر فی عید الأضحی، فإذا انتهی إلی المصلی ترک؛ لما روی عن النبی -صلی الله علیه وسلم -أنه کان یکبر فی الطریق .

وأما فی عید الفطر فلا یجهر بالتکبیر عند أبی حنیفة، وعند أبی یوسف ومحمد یجهر، وذکر الطحاوی أنه یجهر فی العیدین جمیعا(بدائع الصنائع، ج ۱ ص ۲۷۹، کتاب الصلاة، فصل بیان مایستحب فی یوم العید)

قلت :هذا خلاف ما مر عنه آنفا أنه یکبر، وقال أبو جعفر :والذی عندنا أنه لا ینبغی أن یمنع العامة من ذلک لقلة رغبتهم فی الخیرات، وقال :وبه نأخذ(البنایة شرح الهدایة، ج۳ص ۱۰۴،کتاب الصلاة ،باب صلاة العیدین)

وقال الفقیه ابوجعفر :والذی عندنا انه لاینبغی ان تمنع العامة عن ذلک لقلة رغبتهم فی الخیرات ، وبه ناخذ ، یعنی انهم اذا منعوا عن الجهر به لایفعلونه سرا، فینقطعون عن الخیر بخلاف العالم الذی یعلم ان الاسرار هو الافضل ، ثم قیل یقطع التکبیر اذا انتهی الی المصلی سواء فی الفطر ای علی القول بالجهر او الاضحی ، وقیل لایقطعه مالم یفتتح الصلاة (غنیة المستملی فی شرح منیة المصلی ، المعروف بشرح الکبیر ص۵۶۵، کتاب الصلاة ، فصل فی صلاة العید، الناشر:سهیل اکادمی، لاهور، الباکستان، الطبعة الثالثة ۱۴۱۲ هـ)

وبقولهما قالت الأئمة الثلاثة ، وهو قول علی وأبی أمامة الباهلی وعمر بن عبد العزیز والنخعی وابن أبی لیلی وابن جبیر وأبان بن عثمان والحکم وإسحاق وأبی ثور وحماد قال الطحاوی وبه نأخذ ، ثم ما أول وقت التکبیر ؟ اختلف فیه فذهب سعید بن المسیب وابن سلمة وعروة وزید بن أسلم والشافعی إلی أن أول وقته إذا غربت الشمس لیلة العید وقال جمهور الصحابة والتابعین والأئمة الثلاثة ابتداؤه عند الغدو إلی الصلاة لا قبلها واختاره النووی -والله سبحانه أعلم -قال الکمال الخلاف فی الجهر بالتکبیر فی الفطر لا فی أصله ؛ لأنه داخل فی عموم ذکر الله تعالی فعندهما یجهر به کالأضحی وعنده لا یجهر وعن أبی حنیفة کقولهما ، وفی الخلاصة ما یفید أن الخلاف فی أصل التکبیر ولیس بشیء إذ لا یمنع من ذکر الله تعالی بسائر الألفاظ فی شیء من الأوقات بل من إیقاعه علی وجه البدعة فقال أبو حنیفة رفع الصوت بالذکر بدعة تخالف الأمر من قوله تعالی (واذکر ربک فی نفسک تضرعا وخیفة ودون الجهر من القول)فیقتصر فیه علی مورد الشرع وقد ورد به فی الأضحی ، وهو قوله تعالی (واذکروا الله فی أیام معدودات)جاء فی التفسیر أن المراد التکبیر فی هذه الأیام والأولی الاکتفاء فیه بالإجماع علیه اهـ .

(قوله وقال أبو جعفر إلخ) یحتمل أن یراد بأبی جعفر هذا الإمام الطحاوی وأن یکون الفقیه الهندوانی إذ فی غایة السروجی قال الطحاوی والذی عندنا أنه لا ینبغی أن یمنع العامة من ذلک لقلة رغبتهم فی الخیرات قال :وبه نأخذ ، وفی الفتاوی الظهیریة وعن الفقیه أبی جعفر أنه کان

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

آج کل عید کی غیر معمولی تیاری بھی ایک مستقل رسم بن گئی ہے، اس میں ہر شخص دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتا ہے، عید کے دن کو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے لئے بلاشبہ خوشی کا دن بنایا ہے اور اتنی بات بھی شریعت سے ثابت ہے کہ اس روز جو بہتر سے بہتر لباس ہو، وہ پہنے، لیکن اس غرض کے لئے آج بے شمار فضول خرچیوں کو عید کا ضروری حصہ سمجھ لیا گیا ہے۔

چنانچہ آج یہ بات ضروری سمجھ لی گئی ہے کہ کسی کے پاس گنجائش ہو، یا نہ ہو، مگر وہ ہر حال میں کسی نہ کسی طرح گھر کے ہر فرد کے لئے نئے جوڑے اور سر سے لے کر پاؤں تک کی ہر نئے سے نئی چیز کا انتظام کرے، بیوی بچوں کا ہر جائز وناجائز مطالبہ پورا کرے، سر سے لے کر پاؤں تک ہر چیز نئی اور اچھی سے اچھی ہو اور دکان ومکان کی زیب وزینت بھی عمدہ سے عمدہ طریقے پر کرے، خواہ اس کی خاطر ناجائز ذریعۂ آمدنی کیوں نہ اختیار کرنا پڑے، یا دوسروں سے قرض اور بھیک ہی کیوں نہ مانگنی پڑے، جس کی وجہ سے ایک درمیانی آمدنی والے شخص کے لئے عید کی تیاری ایک مستقل مصیبت اور مسئلہ بن چکی ہے۔

شریعت نے مسلمانوں کو ہر موقع پر میانہ روی کی تعلیم دی ہے۔ اور فضول خرچی اور حد سے تجاوز کرنے سے منع فرمایا ہے۔

اس لیے عید کی تیاری میں بے جا غلو سے پرہیز کرنا چاہیے۔

جہاں تک عید کے دن مبارک باد دیتے ہوئے معانقہ کا مسئلہ ہے، تو اگر اس کو سنت نہ سمجھے، اور کوئی دوسرا گناہ بھی لازم نہ آئے، تو بہت سے حضرات کے نزدیک جائز ہے، جس کی تفصیل ہم نے اپنے ایک مستقل رسالہ ''عید کے دن مصافحہ ومعانقہ کا حکم'' میں ذکر کردی ہے۔

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾ يقول سمعت أن مشايخنا كانوا يرون التكبير فى الأسواق فى الأيام العشر ، وفى المجتبى وذكر أبو الليث أن إبراهيم بن يوسف كان يفتي بالتكبير فى الأسواق فى الأيام العشر قال الهندواني وعندى :لا ينبغي أن تمنع العامة من ذلك لقلة رغبتهم فى الخيرات وبه نأخذ هذا فى جمع التفاريق قيل لأبى حنيفة ينبغي لأهل الكوفة وغيرها أن يكبروا أيام التشريق فى الأسواق والمساجد قال نعم اهـ كذا نقلته من خط العلامة ابن أمير حاج (حاشية الشلبى على التبيين الحقائق، ج ۱ ص ۲۲۴، كتاب الصلاة، باب صلاة العيدين، مندوبات عيدالفطر)

(ضمیمہ)

لاک ڈاؤن میں نمازِ عید کا حکم

سوال:

جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ اس وقت دنیا کے کئی ممالک میں خاص کرونا وائرس کی وجہ سے لاک ڈاؤن کا سماں ہے، جس کی وجہ سے عید کی نماز کا بڑے مجامع اور مساجد میں ادا کرنا مشکل ہے، ایسی صورت میں عید کی نماز کا کیا طریق ہوگا؟

اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی ہے کہ سعودی مفتی اعظم اور سعودی سائنٹیفک اینڈ ریسرچ کونسل کے سربراہ شیخ عبدالعزیز الشیخ نے کہا ہے کہ غیر معمولی حالات میں اور موجودہ عالمی وبا کی صورتحال میں عید کی نماز گھر پر ادا کرنا مناسب عمل ہے، اور عید کی نماز گھر پر ادا کی جاسکتی ہے جب کہ نماز اکیلے اور باجماعت بھی ادا کی جاسکتی ہے، اور اس طرح کے ماحول میں والدین اپنا زیادہ تر وقت گھروں میں اپنے بچوں کے ساتھ ہی گزاریں۔

کورونا وائرس کے باعث سعودی عرب میں نماز تراویح بھی گھروں میں پڑھنے کی ہدایت کی گئی اور مسجد الحرام میں چند مخصوص افراد کو نمازِ تراویح کی اجازت دی گئی، جب کہ مساجد میں پنجگانہ نماز کی ادائیگی پر بھی پابندی ہے۔

اس کے علاوہ سعودی حکومت نے ملک میں کورونا کی وجہ سے عیدالفطر پر مکمل کرفیو کا اعلان کیا ہے۔

سعودی عرب کے علاوہ ترکی، شام، مصر اور الجزائر وغیرہ میں بھی نمازِ عید کے اجتماعات پر پابندی ہے۔

جبکہ ہمارے یہاں کے بعض اہلِ علم حضرات نے مسلمانوں کو ماہِ رمضان کے آخری عشرے

کے لمحات کو غنیمت جان کر عبادتوں اور دعاؤں کا خاص اہتمام کرنے اور مساجد کو جماعت کی نمازوں سے آباد کرنے اور جمعہ بے خوف وخطر، مگر احتیاطی تدابیر کے ساتھ مسجدوں میں ادا کرنے اور عید کی نماز بھی ممکنہ احتیاطی تدابیر کے ساتھ ادا کرنے کی ترغیب دی ہے۔

لیکن تا حال اس سلسلے میں حکومت کی طرف سے گزشتہ حکم نامہ کے برخلاف کوئی نیا حکم نامہ سامنے نہیں آسکا۔

اور بعض علماء کا کہنا یہ ہے کہ لاک ڈاؤن اور کرفیو والے علاقوں میں بڑے مجامع کے بغیر گھروں وغیرہ میں چند لوگوں کو باجماعت عید کی نماز پڑھنا جائز نہیں۔

آپ سے اس سلسلہ میں رہنمائی کی درخواست ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جواب:

اس وقت مخصوص وبا کرونا وائرس کی وجہ سے صرف ملکِ پاکستان ہی میں نہیں، دنیا بھر کے مختلف ممالک میں صورتِ حال اسی نوعیت کی ہے، جس کی وجہ سے لوگوں کو جمعہ وعید کی نماز کو حسبِ معمول بڑے مجامع کے ساتھ اداء کرنے میں مشکلات کا سامنا ہے۔

اور دنیا بھر میں لوگ چونکہ مختلف مسالک ومکاتبِ فکر سے وابستہ ہیں، اور وہاں مختلف مکاتبِ فکر کے اعتبار سے قوانین موجود ہیں، اس لیے ان کے مطابق عمل کرنے میں حرج نہیں۔

عید کے دن کو جمعہ کے دن کے ساتھ بعض چیزوں میں مشابہت حاصل ہے۔

لیکن عید کی نماز کا وہ درجہ نہیں، جو درجہ جمعہ کی نماز کا ہے، کیونکہ جمعہ کی نماز تو فرض ہے، اور اس کے فرض ہونے پر فقہائے کرام کا اتفاق ہے۔

جبکہ عید کی نماز فرض نہیں، اور اس کے واجب ہونے، نہ ہونے میں بھی فقہائے کرام کا اختلاف ہے۔

حنفیہ کے مفتیٰ بہ قول کے مطابق عید کی نماز واجب ہے۔

اور شافعیہ اور مالکیہ کے نزدیک عید کی نماز سنتِ مؤکدہ ہے۔
جبکہ حنابلہ کے نزدیک عید کی نماز فرضِ کفایہ ہے۔ [1]

---

[1] صلاة العيدين واجبة على القول الصحيح المفتى به عند الحنفية -والمراد من الواجب عند الحنفية :أنه منزلة بين الفرض والسنة -ودليل ذلک :مواظبة النبى صلى الله عليه وسلم عليها من دون تركها ولو مرة، وأنه لا يصلى التطوع بجماعة -ما خلا قيام رمضان وكسوف الشمس وصلاة العيدين فإنها تؤدى بجماعة،فلو كانت سنة ولم تكن واجبة لاستثناها الشارع كما استثنى التراويح وصلاة الخسوف .

أما الشافعية والمالكية :فقد ذهبوا إلى القول بأنها سنة مؤكدة .ودليلهم على ذلک :قوله صلى الله عليه وسلم فى الحديث الصحيح للأعرابى -وكان قد ذكر له الرسول صلى الله عليه وسلم الصلوات الخمس فقال له :هل على غيرهن؟ قال لا، إلا أن تطوع .

قالوا :ولأنها صلاة ذات ركوع وسجود لم يشرع لها أذان فلم تجب بالشرع، كصلاة الضحى .

وذهب الحنابلة إلى القول بأنها فرض كفاية؛ لقوله تعالى :(فصل لربک وانحر) ، ولمداومة الرسول صلى الله عليه وسلم على فعلها (الموسوعة الفقهية الكويتية، ج٢٧،ص٢٤٠،مادة"صلاة العيدين")

اختلف الفقهاء فى حكم صلاة العيد .فذهب المالكية والشافعية إلى أنها سنة مؤكدة، لحديث الأعرابى الذى ذكر له النبى صلى الله عليه وسلم الصلوات الخمس فقال :هل على غيرهن؟ قال : "لا، إلا أن تطوع وذلک مع فعل النبى صلى الله عليه وسلم لها ومداومته عليها.

وذهب الحنفية -على المفتى به عندهم -إلى أنها واجبة، لمواظبة النبى صلى الله عليه وسلم عليها من دون تركها ولو مرة؛ ولأنها تؤدى بجماعة، فلو كانت سنة ولم تكن واجبة لاستثناها الشارع، كما استثنى التراويح وصلاة الخسوف.

وذهب الحنابلة إلى أنها فرض كفاية لقوله تعالى :(فصل لربک وانحر) ولمداومة النبى صلى الله عليه وسلم على فعلها(الموسوعة الفقهية الكويتية، ج٣١،ص١١٤ ،مادة "عيد")

يتردد حكم صلاة العيد بين آراء ثلاثة :كونها فرض كفاية، أو واجبا، أو سنة.

فقال الحنابلة فى ظاهر المذهب :صلاة العيد فرض كفاية، إذا قام بها من يكفى سقطت عن الباقين، أى كصلاة الجنازة، للآية السابقة (فصل لربک وانحر) وهى صلاة العيد فى المشهور فى السير، وكان النبى صلى الله عليه وسلم والخلفاء بعده يداومون عليها، ولأنها من أعلام الدين الظاهرة، فكانت واجبة كالجهاد، ولم تجب عينا على كل مسلم، لحديث الأعرابى الآتى :إلا أن تطوع المقتضى نفى وجوب صلاة، سوى الخمس، وإنما وجب العيد بفعل النبى صلى الله عليه وسلم، ومن صلى معه.

فإن تركها أهل بلد يبلغون أربعين بلا عذر، قاتلهم الإمام كالأذان؛ لأنها من شعائر الإسلام الظاهرة، وفى تركها تهاون بالدين.

وقال الحنفية فى الأصح :تجب صلاة العيدين على من تجب عليه الجمعة بشرائطها المتقدمة سوى الخطبة، فإنها سنة بعدها.

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

حنفیہ کے نزدیک عید کی نماز واجب ہونے کی وہی شرائط ہیں، جو نمازِ جمعہ کی ہیں، سوائے خطبہ کے، کہ وہ عید کی نماز صحیح ہونے کے لیے ضروری نہیں، بلکہ سنت ہے۔

پھر حنفیہ کے مشہور قول اور عام ضابطہ وقاعدہ کے مطابق نمازِ عید کے لیے بھی امام سمیت کم از کم چار افراد کا ہونا شرط ہے، اس سے کم افراد ہونے کی صورت میں عید کی نماز ادا نہ ہوگی۔ [1]

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾ ودليلهم على الوجوب :مواظبة النبى صلى الله عليه وسلم عليها.

وقال المالكية والشافعية :هى سنة مؤكدة تلى الوتر فى التأكيد، لمن تجب عليه الجمعة :وهو الذكر البالغ الحر المقيم ببلد الجمعة، أو النائى عنه كبعد فرسخ (5544م) منه، ولا تندب عند المالكية لصبى وامرأة وعبد ومسافر لم ينو إقامة تقطع حكم السفر، وندبت لغير المرأة الشابة، ولا تندب لحاج ولا لأهل منى، ولو غير حاجين.

وتشرع عند الشافعية للمنفرد كالجماعة، والعبد والمرأة والمسافر والخنثى والصغير، فلا تتوقف على شروط الجمعة من اعتبار الجماعة والعدد وغيرهما .وهى أفضل فى حق غير الحاج بمنى من تركها بالإجماع.

ودليلهم على سنيتها :قوله صلى الله عليه وسلم للأعرابى السائل عن الصلاة :خمس صلوات كتبهن الله تعالى على عباده، قال له :هل على غيرها؟ قال :لا، إلا أن تطوع وكونها مؤكدة : لمواظبته صلى الله عليه وسلم عليها(الفقه الاسلامى وادلتہ للزحيلى، ج۲، ص۱۳۸۷، ۱۳۸۸، القسم الأول :العبادات، الباب الثانى:الفصل العاشر:،المبحث الرابع۔ صلاة العيدين)

[1] أما بيان شرائط وجوبها فكل ما هو شرط وجوب الجمعة فهو شرط وجوب صلاة العيدين من الإمام والمصر والجماعة إلا الخطبة فإنها سنة بعد الصلاة بإجماع الصحابة.وشرط الشىء يكون سابقا عليه أو مقارنا له (تحفة الفقهاء للسمرقندى، ج۱، ص۱٦٦، كتاب الصلاة، باب صلاة العيدين)

والأحكام التى سبقت بالنسبة للعدد الذى تنعقد به الجماعة إنما هو فى غير الجمعة والعيد؛ إذ فيهما يختلف العدد -ولكل مذهب رأيه فى تحديد العدد، حسبما يستند إليه من أدلة (الموسوعة الفقهية الكويتية، ج۲۷، ص۱۷۰، مادة"صلاة الجماعة")

(قوله وأقلها اثنان) لحديث اثنان فما فوقهما جماعة أخرجه السيوطى فى الجامع الصغير، ورمز لضعفه .قال فى البحر :لأنها مأخوذة من الاجتماع، وهما أقل ما تتحقق به، وهذا فى غير جمعة اهـ أى فإن أقلها فيها ثلاثة صالحون للإمامة سوى الإمام، مثلها العيد لقولهم :يشترط لها ما يشترط للجمعة صحة وأداء سوى الخطبة فافهم(رد المحتار على الدر المختار، ج۱، ص۵۵۳، كتاب الصلاة، باب الإمامة)

تثنية عيد، وأصله عود قلبت الواو ياء لسكونها بعد كسرة اهـ ح .وفى الجوهرة مناسبته للجمعة ظاهرة وهو أنهما يؤديان بجمع عظيم ويجهر فيهما بالقراءة ويشترط لأحدهما ما يشترط للآخر سوى الخطبة، وتجب على من تجب عليه الجمعة، وقدمت الجمعة للفرضية وكثرة وقوعها. اهـ(رد المحتار، ج۲، ص۱٦۵، كتاب الصلاة،باب العيدين) ﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

البتہ بعض حنفیہ نے عید کی نماز کے لئے جمعہ کے علاوہ دوسری عام نمازوں کی طرح صرف دو افراد کو بھی کافی قرار دیا ہے۔

اگر مخصوص مجبوری، مثلاً لاک ڈاؤن وغیرہ کے حالات میں، جبکہ چار افراد کا بھی اجتماع مشکل ہو، کوئی اس قول کے مطابق عمل کرلے، تو اس کی گنجائش ہے۔ [1]

جبکہ حنابلہ کے نزدیک عید کی نماز فرض ہونے کے لئے جمعہ کی نماز کی طرح مستقل طور پر مقیم ہونا اور جمعہ کی نماز والی تعداد کے مطابق کم از کم چالیس افراد کا ہونا شرط ہے۔

اور مالکیہ کے نزدیک عید کی نماز کے سنتِ مؤکدہ ہونے کے لئے بھی مکمل طور پر انہی شرائط کا پایا جانا ضروری ہے، جو نمازِ جمعہ کے واجب ہونے کی شرائط ہیں، البتہ ان کے نزدیک عورت

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾ قوله واشتراط الجماعة لها :أى لصلاة الجمعة وفيه أن الجماعة كما هى شرط لها شرط لصلاة العيدين .

قوله وكونها : بالجر عطف على الجماعة أى واشتراط كون الجماعة ثلاثة سوى الإمام وفيه أن كونها ثلاثة سوى الإمام ليس شرطا خاصا بالجمعة بل كذلك صلاة العيدين .

قوله والخطبة :أى اشتراط الخطبة لها بخلاف صلاة العيدين فإن الخطبة ليست شرطا لها ولو اقتصر على اشتراط الخطبة لها لكان صوابا وقد يقال المختص بها اشتراط المجموع لا كل واحد (غمز عيون البصائر شرح كتاب الأشباه والنظائر، ج۴،ص۲۶،الفن الثالث من الأشباه والنظائر وهو فن الجمع والفرق،القول فى أحكام يوم الجمعة)

[1] قلت :وفى إمامة البحر أن الجماعة فى العيد تسن على القول بسنيتها، وتجب على القول بوجوبها .اهـ .وظاهره أنها غير شرط على القول بالسنية لكن صرح بعده بأنها شرط لصحتها على كل من القولين أى فتكون شرطا لصحة الإتيان بها على وجه السنة وإلا كانت نفلا مطلقا تأمل لكن اعترض ط ما ذكره المصنف بأن الجمعة من شرائطها الجماعة التى هى جمع والواحد هنا مع الإمام كما فى النهر(رد المحتار على الدر المختار،ج۲،ص۱۶۶، كتاب الصلاة،باب العيدين)

كما فى النهروفيه ان من شرائطها الجماعة التى هى جمع والواحد هنا مع الإمام جماعة، فكيف يصح أن يقال:بشرائطها(حاشية الطحطاوى على الدر،ج۱،ص۳۵۱، كتاب الصلاة،باب العيدين)

وإذا لم يشترط السلطان أو نائبه فلا معنى لاشتراط الإذن العام وكأنهم استغنوا بذكر السلطان عنه، على أنا قدمنا أن الإذن العام لم يذكر فى الظاهر .نعم بقى أن يقال :من شرائطها الجماعة التى هى جمع والواحد هنا مع الإمام جماعة، فكيف يصح أن يقال :إن شروطه الجمعة(النهر الفائق شرح كنز الدقائق،ج۱،ص۳۷۳، كتاب الصلاة،باب صلاة العيدين)

قوله" :وشرائط الصحة "ظاهره أنه لا بد من الجماعة المذكورة فى الجمعة على خلاف فيها وليس كذلك فإن الواحد هنا مع الإمام جماعة فيكف يصح أن يقال بشرائطها(حاشية الطحطاوى على مراقى الفلاح،ص۵۲۸، كتاب الصلاة،باب الجمعة)

اور مسافر کو عید کی نماز پڑھنا مستحب ہے، ان کے ذمہ تاکیدی سنت نہیں۔

اور شافعیہ کے نزدیک عید کی نماز ہر ایک مکلّف مسلمان کے حق میں سنتِ مؤکدہ ہے، خواہ وہ مرد ہو یا عورت ہو، مقیم ہو، یا مسافر ہو۔

جہاں تک عید کی نماز صحیح ہونے کی شرائط کا تعلق ہے، تو حنفیہ کے نزدیک اس کے صحیح ہونے کی شرائط وہی ہیں، جو جمعہ کی نماز صحیح ہونے کی شرائط ہیں۔

اور حنابلہ کے نزدیک فرضِ کفایہ درجہ میں، عید کی نماز صحیح ہونے کے لئے عید کی نماز کا وقت ہونا اور جماعت کا ہونا شرط ہے۔

اور مالکیہ اور شافعیہ کے نزدیک عید کی نماز صحیح ہونے کے لئے وقت کے علاوہ مذکورہ چیزوں میں سے کوئی چیز شرط نہیں، نہ تو جماعت کا ہونا شرط ہے، اور نہ ہی شہر وغیرہ کا ہونا شرط ہے۔

اگر عید کے دن لوگوں کو بڑے اجتماعات منعقد کرنے اور مساجد میں داخلے پر پابندی ہو، تو ان کو حسبِ موقع فقہائے کرام کے اقوال کے مطابق عمل کر لینا جائز ہے۔ [1]

---

[1] فی حکم صلاة العيدين ووقتهما تفصيل فی المذاهب، فانظره تحت الخط .

الشافعية قالوا :هـی سنة عين مؤكدة لكل من يؤمر بالصلاة، وتسن جماعة لغير الحاج، أما الحجاج فتسن لهم فرادى.

المالكية قالوا :هـی سنة عين مؤكدة تلی الوتر فی التأكد، يخاطب بها كل من تلزمه الجمعة بشرط وقوعها جماعة مع الإمام، وتندب لمن فاتته معه، وحينئذ يقرأ فيها سراً، كما تندب لمن لم تلزمه، كالعبيد والصبيان؛ ويستثنى من ذلک الحاج، فلا يخاطب بها لقيام وقوفه بالمشعر الحرام مقامها، نعم تندب لأهل "منی "غير الحجاج وحداناً لا جماعة، لئلا يؤدی ذلک إلى صلاة الحجاج معهم.

الحنفية قالوا :صلاة العيدين واجبة فی الأصح على من تجب عليه الجمع بشرائطها، سواء كانت شرائط وجوب أو شرائط صحة، إلا أنه يستثنى من شرائط الصحة الخطبة، فإنها تكون قبل الصلاة فی الجمعة وبعدها فی العيد، ويستثنى أيضاً عدد الجماعة، فإن الجماعة فی صلاة العيد تتحقق بواحد مع إمام، بخلاف الجمعة، وكذا الجماعة فإنها واجبة فی العيد يأثم بتركها، وإن صحت الصلاة بخلافها فی الجمعة، فإنها لا تصح إلا بالجماعة، وقد ذكرنا معنى الواجب عند الحنفية فی "واجبات الصلاة "وغيرها، فارجع إليه.

الحنابلة قالوا :صلاة العيد فرض كفاية على كل من تلزمه صلاة الجمعة، فلا تقام إلا حيث تقام الجمعة ما عدا الخطبة، فإنها سنة فی العيد، بخلافها فی الجمعة، فإنها شرط، وقد تكون صلاة العيد سنة، وذلک فيمن فاتته الصلاة مع الإمام، فإنه يسن له أن يصليها فی أی وقت شاء بالصفة الآتية(الفقه على المذاهب الأربعة،للجزيری، ج ۱، ص ۳۱۳،مباحث صلاة العيدين،حكم صلاة العيدين، ووقتهما)

حنفیہ کے مشہور قول کے مطابق جمعہ کی طرح امام کے علاوہ کم از کم تین افراد اور غیر مشہور قول کے مطابق، جمعہ کے علاوہ دوسری نمازوں میں جماعت کی طرح صرف دو افراد بھی عید کی نماز با جماعت اداء کر سکتے ہیں، جیسا کہ گزرا۔

اور موجودہ حالات میں اپنے گھروں وغیرہ کے اندر بھی عید کی نماز اداء کر سکتے ہیں، جس میں خواتین اور بچے اور گھر میں موجود مریض بھی شرکت کر سکتے ہیں، نمازِ عید اداء کرتے وقت گھر کے دروازے کھولنا بھی ضروری نہیں۔

اور عید کی نماز کو پڑھنے کا طریقہ وہی ہے، جو جمعہ کی نماز کو پڑھنے کا طریقہ ہے، سوائے اس کے کہ عید کی نماز میں زائد تکبیرات کہی جاتی ہیں، اور خطبہ بعد میں دیا جاتا ہے، جو کہ فرض نہیں، بلکہ سنت ہے۔

اس سلسلہ میں مختلف فقہائے کرام کے اقوال پہلے ذکر کیے جا چکے ہیں، اگر کسی کو جماعت کے ساتھ عید کی نماز نہ ملے، تو حنفیہ کے نزدیک اس کی قضاء نہیں، البتہ اگر چاہے، تو بغیر جماعت کے چار رکعت نفل نماز عام طریقے کے مطابق پڑھ لینا چاہئے۔

اور حنابلہ کے نزدیک بھی اگر کسی کو جماعت نہ ملے، تو گھر میں پڑھ لینا جائز ہے، جیسا کہ آگے آتا ہے۔

اور شافعیہ کے نزدیک جس کو جماعت سے عید کی نماز نہ ملے، تو وہ بغیر جماعت کے بھی پڑھ سکتا ہے، زوال سے پہلے پڑھے، تو اداء ہے، زوال کے بعد قضاء ہے۔

اور مالکیہ کے نزدیک بھی جو جماعت کے ساتھ عید کی نماز نہ پڑھ سکے، تو زوال تک تنہا پڑھنا مستحب ہے۔ [1]

سعودی عرب میں چونکہ حنبلی فقہ عام طور پر رائج ہے، اور حنبلی فقہ میں عید کی نماز فرض

---

[1] الحنفية قالوا :الجماعة شرط لصحتها كالجمعة، فإن فاتته مع الإمام فلا يطالب بقضائها لا في الوقت ولا بعده، فإن أحب قضاء ها صلى أربع ركعات بدون تكبيرات الزوائد، يقرأ في الأولى بعد الفاتحة سورة "الأعلى"، وفي الثانية "الضحى "وفي الثالثة "الانشراح "وفي الرابعة "التين."

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

علی الکفایة ہے، اگر موجودہ حالات میں چند لوگ شہر میں کسی ایک جگہ عید کی نماز پڑھ لیں، اور باقی لوگ اپنے اپنے گھروں وغیرہ میں چار رکعات دو، یا ایک سلام کے ساتھ پڑھ لیں، یا اپنے اپنے طور پر دو رکعتیں عید کی نماز کی طرح ہی پڑھ لیں، تو جائز، بلکہ مستحب ہے۔

اس اعتبار سے سعودی عرب کے مفتی صاحب مذکور کا فتویٰ ان کے مسلک کے مطابق درست ہے۔ [1]

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

الحنابلة قالوا :الجماعة شرط لصحتها كالجمعة، إلا أنه يسن لمن فاتته مع الإمام أن يقضيها فی أی وقت شاء علی صفتها المتقدمة.

الشافعية قالوا :الجماعة فيها سنة لغير الحاج، ويسن لمن فاتته مع الإمام أن يصليها علی صفتها فی أی وقت شاء ، فإن كان فعله لها بعد الزوال فقضاء ، وإن كان قبله فأداء .

المالكية قالوا :الجماعة شرط لكونها سنة، فلا تكون صلاة العيدين سنة إلا لمن أراد إيقاعها فی الجماعة، ومن فاتته مع ندب الإمام له فعلها إلی الزوال، ولا تقضی بعد الزوال(الفقه علی المذاهب الأربعة،للجزيری، ج ۱،ص ۳۱۶و۳۱۷،مباحث صلاة العيدين،حكم الجماعة وقضائها إذا فات وقتها)

عن مسروق ، قال :قال عبد الله :من فاته العيد فليصل أربعا(مُصنف ابن أبی شيبة،رقم الحديث ۵۸۵۰، كتاب الصلاة،باب الرجل تفوته الصلاة فی العيدين، كم يصلی؟)

ولكنه يصلی أربعا مثل صلاة الضحی إن شاء؛ لأنها إذا فاتته لا يمكن تداركها بالقضاء لفقد الشرائط فلو صلی مثل الضحی لنيل الثواب كان حسنا، وهو مروی عن ابن مسعود(البحرالرائق ، ج ۲ ص ۱۷۵، كتاب الصلاة، باب العيدين)

روی عن ابن مسعود رضی اللّٰہ عنه انه قال من فاتته صلوة العيدصلی اربع ركعات يقرأفی الاولٰی سبح اسم ربک الاعلٰی وفی الثانيه والشمس وضحها وفی الثالثة والليل اذايغشی وفی الرابعه والضحی وروی فی ذلک عن رسول الله صلی الله عليه وسلم وعدا جميلاً وثواباً جزيلا (قاضی خان علٰی هامش الهندية ج ۱ ص ۱۸۴ ، كتاب الصلاة،باب صلاة العيدين وتكبيرات أيام التشريق)

[1] مسألة؛ قال :(ومن فاتته صلاة العيد صلی أربع ركعات، كصلاة التطوع، وإن أحب فصل بسلام بين كل ركعتين) . وجملته أن من فاتته صلاة العيد فلا قضاء عليه؛ لأنها فرض كفاية، قام بها من حصلت الكفاية به، فإن أحب قضاء ها فهو مخير، إن شاء صلاها أربعا، إما بسلام واحد وإما بسلامين.

وروی هذا عن ابن مسعود، وهو قول الثوری؛ وذلک لما روی عبد الله بن مسعود، أنه قال :من فاته العيد فليصل أربعا، ومن فاتته الجمعة فليصل أربعا .وروی عن علی -رضی الله عنه -أنه قال: إن أمرت رجلا أن يصلی بضعفة الناس، أمرته أن يصلی أربعا .رواهما سعيد .قال أحمد، -رحمه

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ بعض اہلِ علم حضرات کی طرف سے جو عید کی نماز کے لیے سخت شرائط کو لازم کیا جاتا ہے، اور ان کی طرف سے مجبوری میں بھی لوگوں کو نمازِ عید سے محروم کرنے کا حکم دیا جاتا ہے، یہ راجح نہیں۔

آگے موجودہ صورتِ حال میں عید کی نماز سے متعلق ہندوستان اور پاکستان کے دو دارالافتاؤں سے جاری ہونے والے فتاویٰ کو نقل کیا جاتا ہے۔

﴿ گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ ﴾

الله :-یقوی ذلک حدیث علی، أنه أمر رجلا یصلی بضعفة الناس أربعا، ولا یخطب.
ولأنه قضاء صلاة عید، فکان أربعا کصلاة الجمعة، وإن شاء أن یصلی رکعتین کصلاة التطوع.
وهذا قول الأوزاعی لأن ذلک تطوع .وإن شاء صلاها علی صفة صلاة العید بتکبیر .نقل ذلک عن أحمد إسماعیل بن سعید، واختاره الجوزجانی.
وهذا قول النخعی، ومالک، والشافعی، وأبی ثور وابن المنذر؛ لما روی عن أنس، أنه کان إذا لم یشهد العید مع الإمام بالبصرة جمع أهله وموالیه، ثم قام عبد الله بن أبی عتبة مولاه فیصلی بهم رکعتین، یکبر فیهما .ولأنه قضاء صلاة، فکان علی صفتها، کسائر الصلوات، وهو مخیر، إن شاء صلاها وحده، وإن شاء فی جماعة .قیل لأبی عبد الله :أین یصلی؟ قال :إن شاء مضی إلی المصلی، وإن شاء حیث شاء (المغنی لابن قدامة، ج۲،ص ۲۸۹، ۲۹۰، کتاب الصلاة ،باب صلاة العیدین،مسألة فاتته صلاة العید)

(وإن فاتته الصلاة استحب أن یقضیها علی صفتها وعنه یقضیها أربعاً وعنه أنه مخیر بین رکعتین وأربع) وجملة ذلک أنه لا یجب قضاء صلاة العید علی من فاتته لأنها فرض کفایة وقد قام بها من حصلت به الکفایة وان أحب قضاء ها استحب له أن یقضیها علی صفتها نقل ذلک عن أحمد اسماعیل بن سعید واختاره الجوزجانی وهو قول النخعی ومالک والشافعی وأبی ثور لما روی عن أنس أنه کان إذا لم یشهد العید مع الامام بالبصرة جمع أهله وموالیه ثم قام عبد الله بن أبی عتبة مولاه فیصلی بهم رکعتین یکبر فیهما ولأنها قضاء صلاة فکانت علی صفتها کسائر الصلوات وهو مخیر إن شاء صلاها فی جماعة کما ذکرنا عن أنس وان شاء صلاها وحده وعنه أنه یقضیها أربعا اما بسلام واحد أو بسلامین وهو قول الثوری لما روی عن عبد الله بن مسعود أنه قال من فاته العید فلیصل أربعا.

وروی عن علی أنه قال إن أمرت رجلاً أن یصلی بضعفة الناس أمرته أن یصلی أربعاً رواهما سعید ولأنه قضاء صلاة عید فکانت أربعا کقضاء الجمعة، وعنه أنه مخیر بین رکعتین وأربع وهذا قول الأوزاعی لأنها صلاة تطوع أشبهت صلاة الضحی(الشرح الکبیر علی متن المقنع، ج۲، ص ۲۵۰،کتاب الصلاة،باب صلاة الجمعة)

دارُالعلوم دیوبند کا فتویٰ

باسمہٖ سبحانہٗ وتعالٰی

حضرات مفتیانِ کرام، دارالافتاء دارُالعلوم دیوبند

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ !

(۱۱۳۴/ ھ) ملک میں جاری لاک ڈاؤن اور سماجی فاصلہ برقرار رکھنے کی ہدایت کے پیشِ نظر دارالافتاء کی طرف سے نمازِ جمعہ سے متعلق ہدایات حاصل کی گئی تھیں، اب جبکہ رمضانُ المبارک کا مہینہ قریبُ الختم ہے، اور ابھی لاک ڈاؤن کے سلسلہ میں کوئی صورتِ حال واضح نہیں ہے، اس لئے نمازِ عیدُ الفطر کے سلسلہ میں رہنمائی کی ضرورت ہے۔ اگر لاک ڈاؤن کا سلسلہ اسی طرح برقرار رہا، تو نمازِ عیدُ الفطر کی ادائیگی کا کیا طریقہ ہوگا۔ رہنمائی فرمائی جائے۔

والسلام

مہتمم دارالعلوم دیوبند

۲۲/۹/۱۴۴۱ھ۔۱۶/۵/۲۰۲۰

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰہ العصمۃ والتوفیق، حامداً ومصلیاً ومسلماً

(۱۶۹/تتمہ/ ھ) عیدین کی نماز احناف کے نزدیک اصح اور مفتی بہٖ قول کے مطابق واجب ہے، اور اس کے لئے وہی شرائط ہیں، جو جمعہ کے لئے ہیں، البتہ جمعہ میں خطبہ شرط ہے، اور وہ نماز سے پہلے ہوتا ہے، اور عیدین میں خطبہ سنت ہے، اور وہ نماز کے بعد ہوتا ہے۔

لہٰذا اگر عیدُ الفطر تک لاک ڈاؤن کا سلسلہ جاری رہتا ہے، اور مساجد وغیرہ

میں پانچ سے زائد لوگوں کو نماز کی اجازت نہیں ہوتی ہے، تو 6/ شعبان، سنہ 1441ھ (مطابق: یکم اپریل، سنہ 2020ء) کے فتوے (۶۸۱/ ن، ۱۰۶/تتمہ/ ن) میں جن شرائط وتفصیلات کے ساتھ مساجد میں اور گھروں کی بیٹھک، یا باہری کمروں میں جمعہ ادا کرنے کا حکم دیا گیا ہے، اُنہی کی رعایت کے ساتھ مساجد اور گھروں کی بیٹھک، یا باہری کمروں میں نمازِ عید بھی ادا کی جائے۔

اور جن لوگوں کے لئے نمازِ عید کی کوئی صورت نہ بن سکے، عذر و مجبوری کی وجہ سے اُن سے نمازِ عید معاف ہوگی، لہٰذا انہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔

البتہ یہ حضرات اگر اپنے اپنے گھروں میں انفرادی طور پر 2 یا 4 / رکعت چاشت کی نماز پڑھ لیں، تو بہتر ہے، کیونکہ جنہیں عید کی نماز نہ مل سکے، اُن کے لئے فقہاء نے 2 یا 4 / رکعت چاشت کی مستحب قرار دی ہیں۔

فقط واللہ سبحانہٗ تعالیٰ أعلم

محمود حسن بلند شہری غفرلہٗ

دارالعلوم دیوبند

۲۳/ ۹/ ۱۴۴۱ھ، الموافق ۱۷/ ۵/ ۲۰۲۰ء، یومُ الاحد

الجواب صحیح	الجواب صحیح	الجواب صحیح
وقار علی غفرلہ	نعمان سیتاپوری غفرلہ	حبیبُ الرحمٰن عفا اللہ عنہ
۲۳/ رمضان ۱۴۴۱ھ	۲۳/ ۹/ ۱۴۴۱ھ	۲۳/ ۹/ ۱۴۴۱ھ

(https://www.unaurdu.com/2020/05/deoband.html)

جامعۃُ العلوم الاسلامیۃ، بنوری ٹاؤن کا فتویٰ

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

سوال

کیا فرماتے ہیں مفتیانِ کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ:

1۔عید کی نماز کا کیا حکم ہے؟

2۔اگر کسی ملک میں وبائی امراض، یا وائرس کے پیشِ نظر عیدگاہ میں جانے سے منع کیا جائے، تو کیا عید کی نماز گھر یا گھر کی چھت، پارکنگ وغیرہ میں ادا کی جاسکتی ہے؟

جواب دے کر مشکور وممنون فرمائیں

مستفتی

عبدالمنان، کراچی

جواب

واضح رہے کہ عید کی نماز دین کے شعائر میں سے بنیادی شعار ہے۔(1)

اور عید کی نماز سے مقصود مسلمانوں کی شان وشوکت اور قوت کا اظہار ہے، یہی وجہ ہے کہ عید کی نماز عیدگاہ میں پڑھنا مسنون ہے، تاکہ زیادہ سے زیادہ مسلمان ایک جماعت میں شریک ہوسکیں۔(2)

1۔صورتِ مسئولہ میں شہر، فنائے شہر اور بڑا گاؤں، جہاں جمعہ قائم کرنے کی شرائط پائی جاتی ہیں، وہاں عید کی نماز پڑھنا واجب ہے، تاہم جمعہ اور عید کی نماز کی شرائط میں فرق یہ ہے کہ جمعہ کے درست ہونے کے لئے خطبہ شرط ہے، جبکہ عید کی نماز کے لئے خطبہ شرط نہیں، سنت ہے۔(3)

اسی طرح عید کی نماز کے لئے اِذنِ عام کا ہونا بھی شرط نہیں۔[4] ۱

جمعہ اور عید کی نمازوں کے لئے جماعت کا ہونا شرط ہے، انفرادی طور پر جمعہ یا عید کی نماز ادا کرنا درست نہیں، جماعت کے ساتھ پڑھنا ضروری ہے، لیکن جمعہ اور عید کی جماعت کے لئے کتنے افراد ضروری ہیں، اس میں فرق ہے، جمعہ کی نماز درست ہونے کے لئے امام کے علاوہ تین بالغ مردوں کا ہونا ضروری ہے، اور عید کی نماز کے لئے امام کے علاوہ ایک بالغ مرد کا ہونا کافی ہے۔[5] ۲

2۔ اگر کسی ملک میں وائرس، یا کسی وبائی مرض کی وجہ سے حکومت عیدگاہ یا مسجد میں عید کی نماز پڑھنے سے منع کرے، تو شہر، فنائے شہر یا بڑے گاؤں کے رہنے والے مسلمان کوشش کریں کہ وہ عید کی نماز، عیدگاہ میں یا مسجد میں پڑھیں۔

لیکن اگر کسی علاقے میں عید کی نماز عیدگاہ، یا مسجد میں پڑھنا ممکن نہ ہو تو کم از کم دو افراد گھر، گھر کی چھت، صحن یا بلڈنگ کی پارکنگ وغیرہ میں جمع ہو کر پڑھیں۔ ۳

عید کی نماز کا طریقہ:

عید کی نماز کے لیے اذان اور اقامت نہیں، جب نماز کھڑی کی جائے، تو عید کی

---

۱ بعض حنفیہ نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے، لیکن دیگر حضرات نے اس سے اختلاف کیا ہے، اور انہوں نے عید کی نماز کے لیے بھی اذنِ عام کو ضروری قرار دیا ہے، لیکن باضابطہ تعددِ عیدین کے موجودہ ماحول میں اذنِ عام شرط نہیں رہتا، جس کی تفصیل ہم جمعہ وعید سے متعلق اپنے مستقل مضامین میں بیان کر چکے ہیں۔ محمد رضوان خان۔

۲ یہ بھی بعض حنفیہ کے بقول ہے، ورنہ دیگر حنفیہ نے جمعہ کی طرح عید کی نماز کے لیے بھی امام سمیت کم از کم چار افراد کو ضروری قرار دیا ہے، جیسا کہ دارُالعلوم دیوبند کے فتوے میں بھی گزرا۔ محمد رضوان خان۔

۳ چھت، صحن، یا بلڈنگ کی قید، سوال میں ان چیزوں کا ذکر ہونے کی وجہ سے ہے، اذنِ عام کی وجہ سے نہیں، کیونکہ اس کو تو عید کی نماز کے لیے مذکورہ فتوے میں ضروری قرار ہی نہیں دیا گیا، اور یہ قید مجمع کے بڑا ہونے کی وجہ سے بھی نہیں، کیونکہ اس فتوے میں ساتھ ہی کم از کم دو افراد کے عید کی نماز پڑھنے کا ذکر ہے۔

اور ہمارے نزدیک اصل دارومدار لوگوں کے حالات اور قانونی وغیر قانونی پیچیدگیوں پر ہے۔

ممکن ہے کہ کسی کو نہ چھت میسر ہو، نہ صحن میسر ہو، اور نہ پارکنگ، تو اس کو اپنے حسبِ حال گھر کے کسی کمرہ میں بھی نمازِ عید کا اداء کرنا جائز ہوگا، جس کی مدلل تفصیل ہم اپنے جمعہ وعید سے متعلق مضامین میں ذکر کر چکے ہیں۔ محمد رضوان خان۔

نماز چھ زائد تکبیرات کے ساتھ پڑھنے کی نیت کرے، اس کے بعد تکبیر کہہ کر ہاتھ ناف کے نیچے باندھ لے، اور ثناء پڑھے، اس کے بعد تین زائد تکبیریں کہے، دو تکبیروں میں ہاتھ کانوں تک اُٹھا کر چھوڑ دے، اور تیسری تکبیر پر ہاتھ اُٹھا کر ناف کے نیچے باندھ لے، اس کے بعد امام اونچی آواز میں قراءت کرے، قرائت مکمل ہونے کے بعد بقیہ رکعت (رکوع اور سجدہ وغیرہ) دیگر نمازوں کی طرح ادا کرے۔

پھر دوسری رکعت کے شروع میں امام اونچی آواز میں قراءت کرے، اس کے بعد تین زائد تکبیریں کہے، تینوں تکبیروں میں ہاتھ کانوں تک اُٹھا کر چھوڑ دے، پھر ہاتھ اُٹھائے بغیر چوتھی تکبیر کہہ کر رکوع میں جائے، اور پھر دیگر نمازوں کی طرح دو سجدوں کے بعد التحیات، درود اور دعا پڑھ کر سلام پھیر دے، پھر نماز مکمل کرنے کے بعد امام دو خطبے دے، دونوں خطبوں کے درمیان تھوڑی دیر بیٹھے۔ (6) لے

حوالہ جات

(1) بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع (84/3)

ولأنها من شعائر الإسلام فلو كانت سنة فربما اجتمع الناس على تركها فيفوت ما هو من شعائر الإسلام فكانت واجبة صيانة لما هو من شعائر الإسلام عن الفوت.

(2) صحیح البخاری (22/2)ط: دار الشعب

عن أبی سعید الخدری، قال: کان رسول الله صلى الله علیه وسلم یخرج یوم الفطر والأضحى إلى المصلى، فأول شیء یبدأ به الصلاة، ثم ینصرف.

فتح الباری (450/2)

واستدل به على استحباب الخروج إلى الصحراء لصلاة العید وأن ذلک أفضل من صلاتها فی المسجد لمواظبة النبی صلى الله علیه وسلم على ذلک مع فضل مسجده.

الدر المختار وحاشیة ابن عابدین (169/2)

وفی الخلاصة والخانیة السنة أن یخرج الإمام إلى الجبانة، ویستخلف غیره لیصلی فی المصر بالضعفاء بناء على أن صلاة العیدین فی موضعین جائزة بالاتفاق، وإن لم

لے یہ طریقہ حنفیہ کے مطابق ہے، دیگر فقہائے کرام کے نزدیک تکبیراتِ عیدین کی تعداد مختلف ہے، جس کا ذکر ہم اس سے پہلے کر چکے ہیں۔ محمد رضوان خان۔

يستخلف فله ذلك .اهـ .نوح.

الفتاوى الهندية (150/1)

الـخـروج إلـى الـجبانة فى صلاة العيد سنة وإن كان يسعهم المسجد الجامع، على هذا عامة المشايخ وهو الصحيح، هكذا فى المضمرات.

(3) بدائع الصنائع فى ترتيب الشرائع (85/3)

وأمـا شـرائـط وجـوبهـا وجـوازها فكل ما هو شرط وجوب الجمعة وجوازها فهو شرط وجـوب صـلاـة العيدين وجوازها من الإمام والمصر والجماعة والوقت إلا الخطبة فإنها سنة بعد الصلاة.

الدر المختار وحاشية ابن عابدين (166/2)

(تـجـب صلاتهما) فى الأصح (على من تجب عليه الجمعة بشرائطها) المتقدمة (سوى الخطبة) فإنها سنة بعدها.

وفـي الـرد: (قوله فإنها سنة بعدها) بيان للفرق وهو أنها فيها سنة لا شرط وأنها بعدها لا قبلها بخلاف الجمعة .قال فى البحر: حتى لو لم يخطب أصلا صح وأساء لترك السنة ولو قدمها على الصلاة صحت وأساء ولا تعاد الصلاة.

بدائع الصنائع فى ترتيب الشرائع (89/3)

وأمـا الخطبة فليست بشرط؛ لأنها تؤدى بعد الصلاة وشرط الشيء يكون سابقا عليه أو مـقـارنـا لـه، والـدليـل على أنها تؤدى بعد الصلاة ما روى عن ابن عمر أنه قال: صليت خـلف رسـول الـله – صلى الله عليه وسلم – وخلف أبى بكر وعمر – رضى الله عنهما – وكـانـوا يبـدئون بالصلاة قبل الخطبة وكذا روى عن ابن عباس – رضى الله عنهما – أنه قال: صـليـت خـلف رسـول الـلـه – صلى الله عليه وسلم – وخلف أبى بكر وعمر وعثمان فبدئوا بالصلاة قبل الخطبة ولم يؤذنوا ولم يقيموا ولأنها وجبت لتعليم ما يجب إقـامتـه يـوم الـعيـد والوعظ والتكبير فكان التأخير أولى ليكون الامتثال أقرب إلى زمان التعليم.

(4) النهر الفائق شرح كنز الدقائق (373/1) ط: دار الكتب العلمية

وإذا لـم يشتـرط السـلـطان أو نائبه فلا معنى لاشتراط الإذن العام وكأنهم استغنوا بذكر السلطان عنه، على أنا قدمنا أن الإذن العام لم يذكر فى الظاهر.

(5) النهر الفائق شرح كنز الدقائق (373/1) ط: دار الكتب العلمية

نعم بقى أن يقال: مـن شـرائطها الجماعة التى هى جمع والواحد هنا مع الإمام جماعة، فكيف يصح أن يقال: إن شروطه الجمعة.

الدر المختار وحاشية ابن عابدين (166/2)

(تـجـب صـلاتهما) فى الأصح (على من تجب عليه الجمعة بشرائطها) المتقدمة (سوى الخطبة) فإنها سنة بعدها.

وفى الرد: لكن اعترض ط ما ذكره المصنف بأن الجمعة من شرائطها الجماعة التى هى جمع والواحد هنا مع الإمام كما فى النهر.

الفقه على المذاهب الاربعة (531/1)

الحنفية قالوا: صلاة العيدين واجبة فى الأصح على من تجب عليه الجمع بشرائطها، سواء كانت شرائط وجوب أو شرائط صحة، إلا أنه يستثنى من شرائط الصحة الخطبة، فإنها تكون قبل الصلاة فى الجمعة وبعدها فى العيد، ويستثنى أيضاً عدد الجماعة، فإن الجماعة فى صلاة العيد تتحقق بواحد مع إمام، بخلاف الجمعة.

(6) الفتاوى الهندية (150/1)

ويصلى الإمام ركعتين فيكبر تكبيرة الافتتاح ثم يستفتح ثم يكبر ثلاثا ثم يقرأ جهرا ثم يكبر تكبيرة الركوع فإذا قام إلى الثانية قرأ ثم كبر ثلاثا وركع بالرابعة فتكون التكبيرات الزوائد ستا ثلاثا فى الأولى وثلاثا فى الأخرى، وثلاث أصليات تكبيرة الافتتاح وتكبيرتان للركوع فيكبر فى الركعتين تسع تكبيرات ويوالى بين القرائتين وهذه رواية ابن مسعود بها أخذ أصحابنا، كذا فى محيط السرخسى.

ويرفع يديه فى الزوائد ويسكت بين كل تكبيرتين مقدار ثلاث تسبيحات، كذا فى التبيين وبه أفتى مشايخنا، كذا فى الغياثية ويرسل اليدين بين التكبيرتين ولا يضع هكذا فى الظهيرية.

ثم يخطب بعد الصلاة خطبتين، كذا فى الجوهرة النيرة، ويجلس بينهما جلسة خفيفة، كذا فى فتاوى قاضى خان، وإذا صعد المنبر لا يجلس عندنا، كذا فى العينى شرح الهداية، ويخطب فى عيد الفطر بالتكبير والتسبيح والتهليل والتحميد والصلاة على النبى – صلى الله عليه وسلم –، كذا فى التتارخانية.

فقط واللّٰہ أعلم

کتبہ محمد عمران ممتاز

دارالافتاء جامعہ علوم اسلامیہ

علامہ بنوری ٹاؤن کراچی

24 رمضان المبارک 1441ھ۔ 18 مئی 2020ء

فتویٰ نمبر: 144109203248

الجواب صحیح	الجواب صحیح
محمد شفیق عارف	محمد انعام الحق
۲۴/۹/۱۴۴۱ھ	۲۴/۹/۱۴۴۱ھ

(https://www.banuri.edu.pk/readquestion/gharoo-mai-eid-ki-namaaz-ka-hukum-144109203248/22-05-2020)

موجودہ دور کے بعض اصحابِ علم کا فرمانا یہ ہے کہ حنفیہ کے نزدیک، جمعہ وعیدین کی نماز کے گھروں وغیرہ میں پڑھنے کی گنجائش نہیں، اور وہ اس سلسلے میں اذنِ عام یا اذنِ حاکم وغیرہ کے مسئلے کو بنیاد بناتے ہیں، مگر ہمیں ان کی باتوں سے اتفاق نہیں، جس کے باحوالہ تفصیلی دلائل کے لیے ہمارے درجِ ذیل رسائل کی طرف رجوع فرمائیں۔

(1)...... بروز جمعہ، نمازِ جمعہ وظہر کے مخصوص مسئلہ کی تحقیق

(2)...... جمعہ میں اذنِ عام وحاکم کی تحقیق

(3)......تعددِ جمعہ واذنِ عام کی حقیقت

خلاصہ یہ کہ شریعتِ مطہرہ کے بیان کردہ احکام ہر زمانے اور ہر حالت میں قابلِ عمل اور سہل ہیں، اور فقہائے کرام ومجتہدینِ عظام کا فقہی واجتہادی مسائل میں اختلاف رحمت ہے، زحمت نہیں۔

اور موجودہ مخصوص مجبوری اور کرفیو، یا لاک ڈاؤن کے حالات میں فقہائے کرام کی طرف سے بیان کردہ سہولت کے مطابق لوگوں کو عید کی نماز اداء کرنے کی گنجائش نہ دینا، اور ان کو عید کی نماز سے محروم کرنے کا حکم صادر کردینا، مناسب طریقہ نہیں۔

فقط

وَاللّٰہُ سُبۡحَانَہٗ وَتَعَالٰی اَعۡلَمُ .

محمد رضوان خان

27/ رمضانُ المبارک/ 1441ھ 21/ مئی/ 2020 بروز جمعرات

ادارہ غفران، راولپنڈی، پاکستان

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

علمی و تحقیقی سلسلہ

نمازِ عید، با جماعت اور تنہاء پڑھنے کا حکم

کرفیو، لاک ڈاؤن اور دوسرے اعذار کی حالت میں گھروں وغیرہ میں
عیدُ الفطر وعیدُ الاضحیٰ کی نماز سے متعلق احادیث وروایات اور آثار
محدثین، فقہاء ومجتہدین اور اصحابِ علم کے اقوال کی روشنی میں
مختلف حالات میں عورتوں، مریضوں اور معذوروں وغیرہ کو
گھروں وغیرہ میں نمازِ عید با جماعت اور بلا جماعت پڑھنے کا حکم

مؤلف

مفتی محمد رضوان خان

ادارہ غفران راولپنڈی پاکستان

www.idaraghufran.org

فہرست

	مضامین	صفحہ نمبر
	تمہید (من جانبِ مؤلف)	542
	نمازِ عید، باجماعت اور تنہاء پڑھنے کا حکم	557
	سوال	//
	جواب	558
	(فصل نمبر 1) احادیث وروایات اور آثار	566
	عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کی حدیث	//
	براء بن عازب رضی اللہ عنہ کی حدیث	567
	ابو عُمیر بن انس کی حدیث	568
	قتادۃ کی حدیث	570
	ربعی بن حِراش کی حدیث	571
	ابنِ عمر رضی اللہ عنہ کی روایت	572

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تمہید

(من جانبِ مؤلف)

ایک عرصہ سے دنیا بھر میں مخصوص (covid-19) کی وباء کے اثرات پائے جاتے ہیں، جس کی وجہ سے کئی ممالک میں لاک ڈاؤن اور کرفیو وغیرہ کا سلسلہ موجود ہے، اور آئندہ بھی ماہ بماہ تک یہ سلسلہ جاری رہنے کے امکانات وخدشات ظاہر کیے جارہے ہیں، جس کے اثرات عیدُ الفطر کے بعد، اللہ نہ کرے، عیدُ الاضحیٰ کے اوپر بھی پڑ سکتے ہیں، ورنہ کسی دوسرے وقت بھی کسی علاقے کے مسلمانوں کو اچانک کرفیو وغیرہ کی بناء پر اس طرح کی صورتِ حال سے سابقہ پڑسکتا ہے، ویسے بھی ہر مسلمان کو قبل از وقت مسائل کا علم ہونا چاہئے۔

ملکِ پاکستان میں بھی ماہِ رمضان المبارک سے قبل اچانک لاک ڈاؤن ہونے کی وجہ سے مساجد میں، پنجگانہ نماز باجماعت، جمعہ کی نماز اور پھر تراویح کی نماز، گھروں وغیرہ میں اداء کرنے کے مسائل درپیش رہے۔

اور خاص طور پر ماہِ رمضان میں جو مسلمانوں کے لئے عبادت کا ایک اہم اور عظیم مہینہ شمار ہوتا ہے، مساجد میں اجتماعی عبادات کے حوالے سے مشکلات پیش آتی رہیں۔

جبکہ ہندوستان اور کئی دوسرے مسلم وغیر مسلم ممالک میں ہمارے یہاں سے بھی زیادہ سخت اور شدید لاک ڈاؤن اور کرفیو جیسی صورتِ حال موجود رہی، جس کا سلسلہ ابھی تک جاری ہے، بعض غیر مسلم ممالک میں، جہاں مسلمانوں کی تعداد بہت کم ہے، ایسے مسلمان بھی موجود ہیں، جو اپنی رہائش گاہوں پر کسی دوسرے مسلمان کی رفاقت ومعیت کے بغیر محصور ومجبور ہیں، جن کو نہ تو نمازوں کے اوقات میں باہر نکلنے کی اجازت ہے، اور نہ ہی کسی مسلمان کو اپنے ساتھ شامل کر کے نماز باجماعت پر عمل کرنا ممکن ہے، ویسے بھی وہاں مساجد کی تعداد، ہمارے

یہاں کے مقابلے میں بہت کم ہے، اور بعض علاقوں میں مساجد بھی غیر معمولی فاصلہ پر واقع ہیں، جہاں پہنچنے کے لئے میل ہا میل کا سفر طے کرنا پڑتا ہے، جو موجودہ حالات میں نہ متوقع ہے، اور نہ وہاں نماز کے اجتماعات میں شمولیت کی عملی صورت ممکن ہے۔

اس غیر معمولی صورتِ حال میں بطورِ خاص، ہمارے ملک میں مختلف اہلِ علم حضرات کی طرف سے نماز باجماعت، نمازِ جمعہ، اور نمازِ عید کے سلسلہ میں طرح طرح کی آراء سامنے آتی رہیں، اور ایک ایسے معاشرہ میں کہ جہاں ہر طرح کے مفتیانِ کرام کی بہتات ہو، اور ہر قسم کا فتویٰ دینے اور اپنے مخالف کی رائے کی ہر طرح سے تردید ونکیر کرنے میں بھی جرأت وہمت کا غیر معمولی مزاج وماحول پایا جاتا ہو، ایسے میں عامۃُ المسلمین کو اپنے لئے راہِ عمل متعین کرنا اور اس صورتِ حال کے نتیجے میں پیدا شُدہ اضطراب وتذبذب کو ختم کرنا مشکل مرحلہ بن جاتا ہے، اور لوگ مختلف فرقوں میں بٹ کر ایک دوسرے کے خلاف بحث ومباحثہ اور مجادلہ ومقابلہ کی فضاء پر اُتر آتے ہیں۔

اور بدقسمتی سے اس طرح کی صورتِ حال، دوسرے ممالک کے مقابلے میں ہمارے ملکِ پاکستان میں کچھ زیادہ ہی ہے، جس کا اندازہ سوشل میڈیا کے مختلف مناظر سے لگایا جاسکتا ہے، اور اس طرز کو کسی طرح بھی سلف کے طریقے کے مطابق قرار نہیں دیا جاسکتا۔

یہی وجہ ہے کہ کئی ماہ سے، ہمارے یہاں اس طرح کا ایک بڑا طبقہ نماز باجماعت، اور جمعہ وعیدین، جیسے اہم مسائل کے سلسلے میں اضطراب وتذبذب، بلکہ تعصب وتشدد کے راستہ پر گامزن رہا۔

اور موجودہ زمانے کے المیات میں سے ایک المیہ یہ ہے کہ جس طرح مسلمانوں کے بہت سے سیاسی قائدین میں عوام ورعایا کی صحیح رہنمائی اور ان کے دنیاوی حقوق کی ادائیگی میں کمی کا غیر معمولی فقدان پایا جاتا ہے۔

اسی طرح مسلمانوں کے بعض مذہبی ودینی مقتداؤں میں بھی مسلمانوں کو مذہبی ودینی اعتبار

سے صحیح رہنمائی اور ان کے دینی و مذہبی متنوع حقوق کی ادائیگی کے لیے صلاحیتوں کے خرچ کرنے میں کمی کا غیر معمولی فقدان پایا جاتا ہے۔

اور جس طرح موجودہ زمانے میں ہمارے بہت سے سیاسی قائدین کا کردار سیاسی شعبوں میں ایک روایتی و رسمی حیثیت کا حامل ہو کر رہ گیا ہے، اور غیر معمولی حالات میں ان کے لیے صحیح فیصلے کرنا مشکل ہوتا ہے، اسی طرح موجودہ زمانے میں ہمارے بعض مذہبی قائدین کا کردار بھی مذہبی شعبوں میں ایک طرح سے روایتی و رسمی حیثیت کا حامل ہو کر رہ گیا ہے، کہ وہ اس طرح کے غیر معمولی حالات میں بھی اپنے مخصوص ومشہور، روایتی مجتہد فیہ اقوال میں توسع اور گنجائش کے لیے آمادہ نہیں ہوتے کہ جب بین الاقوامی سطح پر پوری انسانیت کو غیر معمولی حالات درپیش ہوں، اور بلا امتیاز امتِ مسلمہ کے تمام مسالک وفرقوں کو ان کا سامنا ہو۔

پھر دوسرے حالات میں اس قسم کے مذہبی مقتداؤں سے توسع کی کیا توقع کی جاسکتی ہے۔

اور اس کا ایک اہم سبب یہ بے اعتدالی معلوم ومحسوس ہوئی، کہ جو اکابر ومشائخ اپنے زمانۂ شباب وصحت میں دین کی سُنہری خدمات وتحقیقات سرانجام دے کر اب پیرانہ سالی اور حالتِ ضعف میں اور ایک طرح سے چراغِ آخرِ شب ہیں، اصاغر کی طرف سے اب بھی تمام تر اہم مسائل کی تحقیق کی ذمہ داری ان ہی کے سر ڈالنے کی کوشش کی جاتی ہے، جو کہ ایک طرح سے ظلم ہے، جس کی وجہ یا تو یہ ہے کہ اصاغر ونوجوان خود سے کوئی تحقیق کرنے کو اپنے اکابر ومشائخ کی شان میں بے ادبی خیال کرتے ہیں، جو کہ سراسر غلط اور سلف کے طرز اور طریقہ کے خلاف ہے، یا پھر ان اصاغر کی طرف سے خود سہولت پسندی، بلکہ کسل مندی کا مظاہرہ کیا جاتا ہے، جو کہ ناانصافی ہے۔

حضراتِ اکابر ومشائخ کے صحیح ادب واحترام اور عقیدت ومحبت کا تقاضا یہ ہے کہ ان کی پیرانہ سالی، حالتِ ضُعف اور چراغِ آخرِ شب کی حالت میں ان پر غیر معمولی تحقیقات کا

بوجھ ڈالنے کے بجائے، خود اس ذمہ داری کو انجام دیا جائے، اور ان اکابر سے خدمت لینے کے بجائے، ان کی خدمت کی جائے، اور ان کی بحالتِ شباب وصحت، خدماتِ جلیلہ فی الدین اور محنتِ شاقہ لِلدّین کے طرزِ عمل میں ان کی اتباع وپیروی کی جائے، اور اپنے صحت وشباب کے زمانے میں، اعضاء وقویٰ کے مطابق اپنے حصہ کی ذمہ داریوں کو انجام دینے اور نباہنے کی کوشش کی جائے، اور اپنے حصہ کے کام کا بوجھ اُن اکابر ومشائخ کے سر نہ ڈالا جائے۔

اکابر ومشائخ کی شان میں خالی قصیدے پڑھ دینا تو کوئی مقصد ومنصب نہیں۔

جبکہ ہمارا ایک مذہبی طبقہ تو موجودہ کرونا وائرس کے وباء ہونے کو سنجیدہ طریقہ پر تسلیم کرنے کے لئے بھی تیار نہیں، اگرچہ ہمارے حکمرانوں اور ڈاکٹروں وغیرہ کی طرف سے دنیاوی اغراض ومفادات کی خاطر بعض غیر حقیقی واقعات اور جھوٹے کیس بنانے، اور ظلم وستم کی داستانیں رقم کرنے کی بھی کمی نہیں، لیکن اس کے باوجود، اس وباء کے حقیقی وجود کی نفی کردینا بھی درست طرزِ عمل نہیں، خواہ اس وباء کا سبب کچھ بھی ہو، احادیث میں تو طاعون کو بھی شیطان کا خفیہ چوکا قرار دیا گیا ہے، اور ساتھ ہی اس کی حفاظتی تدابیر سے بھی آگاہ کیا گیا ہے۔

موجودہ حالات سے متعلق بندہ متعدد مضامین لکھ چکا ہے، جن میں نمازِ عید سے متعلق ایک آنے والا مضمون بھی شامل ہے۔

بندہ نے آنے والا یہ مضمون بنیادی طور پر 29 / رمضانُ المبارک/ 1441ھ، 23 / مئی/ 2020ء، بروز ہفتہ، ظہر وعصر کے مابین بتعجیل قدرے اختصار کے ساتھ تحریر کیا تھا، جس میں بعض پہلوؤں کے اندر تشنگی پائی جاتی تھی، لیکن چونکہ دنیا کے مختلف ممالک میں اگلے دن عیدُ الفطر کا امکان تھا، اور عیدُ الفطر کے موقع پر مختلف ممالک میں سخت لاک ڈاؤن اور کرفیو کا سماں تھا، جہاں کسی فرد کو بھی اپنے یہاں سے نکلنے کی اجازت نہ تھی، اور وہاں کی مساجد بھی

بیرونی افراد واشخاص کے لئے بند تھیں، جبکہ بہت سے لوگ یورپ وغیرہ میں ایسے مقامات پر تھے، جہاں ان کے ساتھ کوئی دوسرا مسلمان فرد، یا ایک سے زیادہ افراد موجود نہ تھے، اور عامۃُ المسلمین کو نمازِ عید سے جو قلبی وایمانی تعلق اور لگاؤ ہے، اس کے پیشِ نظر، ان کو نمازِ عید اداء کیے بغیر قلبی وذہنی سکون کا حاصل ہونا مشکل تھا، جواُن کے لئے سال بھر ذہنی تشویش میں مبتلا رہنے کا باعث بن سکتا تھا، اور اُن کی طرف سے اس سلسلہ میں پے در پے مختلف سوالات واستفسارات کیے جا رہے تھے۔

ان حالات میں بندہ نے مختلف فقہائے کرام ومجتہدینِ عظام کے اقوال کی روشنی میں سرِ دَست ممکنہ حد تک توسع وگنجائش کی کوشش کی تھی، تاکہ جملہ مسلمانوں کے لیے اس ہمہ گیر واجتماعی نوعیت کی پریشانی کے وقت میں فقہائے کرام ومجتہدینِ عظام کے وسیع تر اقوال کی روشنی میں اپنی اپنی حسبِ حیثیت وحسبِ ضرورت عمل کی راہ پیدا ہو، اور فقہائے کرام ومجتہدینِ عظام کا اختلاف ''زحمت'' کے بجائے ''رحمت'' بن کر ظاہر ہو، جس کی شرعی وفقہی عبارات وتصریحات سے بھرپور تائید ہوتی ہے، اور بندہ نے اپنی بعض تالیفات ومضامین میں ان کو نقل بھی کر دیا ہے، جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔

دوسری طرف گھروں وغیرہ میں، باجماعت اور بغیر جماعت، نمازِ عید کی ادائیگی درست ومعتبر، یا مباح وجائز ہونے میں توسع اور یُسر کا موقف، ہمارے یہاں اہلِ علم حضرات کے ایک خاص طبقہ کے لئے سخت وحشت کا باعث تھا، اور ان کی طرف سے اس سلسلہ میں عجیب وغریب انداز میں سخت شرائط پر مشتمل تحریری وزبانی آراء کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ جاری تھا، جس کو موجودہ حالات میں عملی جامہ پہنانا بھی عوام کے لئے مشکل تھا، اور یہ کوئی ہمارے یہاں کے اہلِ علم حضرات کے ایک مخصوص طبقہ کی طرف سے کوئی نئی بات نہیں، اس کا سلسلہ اور داستان، خاصی قدیم وطویل ہے، اور اس کا بندہ کے مضامین میں جابجا تذکرہ ہے۔

اس بناء پر ان کو آئینہ دکھانے کے لئے بندہ نے ان کے غیر معتدل طرزِ عمل کی نشاندہی بھی کی

تھی، جس میں کوئی خاص بزرگ شخصیت ہدف نہیں تھی، اور اسی وقت سرِ دست اس مضمون کو ادارہ غفران کی ویب سائٹ وغیرہ کے ذریعہ سے نشر کر دیا گیا تھا، تا کہ دنیا کے مختلف حصوں میں موجود ومحصور افراد کو مختلف فقہائے کرام ومجتہدینِ عظام کے اقوال کی روشنی میں اپنے اپنے حالات کے مطابق، بروقت استفادہ کرنے میں سہولت حاصل ہو، اور متعدد اہلِ علم حضرات کی طرف سے سامنے آنے والی مختلف آراء کی حیثیت وحقیقت سے بھی ایک درجہ میں آگاہی حاصل ہو کر، عمل میں تذبذب اور کش مکش کی کیفیت کا خاتمہ ہو۔

اور خیال تھا کہ بعد میں وقت ملنے پر اس موضوع کے تشنہ طلب پہلوؤں پر کلام کر کے دوبارہ تفصیلی موقف کی اشاعت کی جائے گی، تا کہ بعض علمی وفقہی پہلو مزید منقح ہوں، اور آئندہ کے لئے ممکنہ متوقع حالات کے پیشِ نظر عیدُ الاضحیٰ، یا دوسرے کرفیو وغیرہ کے مواقع پر بھی اس مسئلہ سے عوام کو آگاہی حاصل ہو، اور ساتھ ہی علماء کو غور وفکر کرنے کا موقع بھی میسر ہو۔

پھر ابتدائی نشر واشاعت کے بعد جلد ہی معلوم ہوا کہ بعض اہلِ علم حضرات نے بندہ کے اس مضمون میں مذکور بعض الفاظ کو انتہائی غیر معیاری زبان اور اہلِ علم حضرات کی شان میں سخت تنقید پر مشتمل محسوس کیا، اور بعض نے اپنے تئیں یہ تأثر بھی حاصل کیا، اور اس کا ایک دوسرے کے ساتھ باہمی گفتگو میں اظہار بھی کیا کہ بندہ نے اس قسم کے الفاظ سے کسی خاص معروف ومقبول علمی شخصیت کو تنقید ہدف بنایا ہے، اس سلسلہ میں ایک صاحبِ علم کی طرف سے بندہ کو اس قسم کے الفاظ سے بعض لوگوں کو ایہام ہونے کی وجہ سے ان میں نرمی پیدا کرنے کا خیر خواہانہ مشورہ بھی موصول ہوا، جس کو بحمد اللہ تعالیٰ بندہ نے کسی لیت ولعل اور حیل وحجت کے بغیر بطیبِ خاطر قبول ومنظور بھی کر لیا۔

اور اب نظرِ ثانی کے وقت اس قسم کے الفاظ میں نرمی ولچک پیدا کرنے اور ساتھ ہی بعض پہلوؤں کو منقح اور واضح کرنے کی ممکنہ کوشش بھی کی ہے۔

جس کے نتیجہ میں الفاظ میں نرمی کرنے کے باوجود بندہ کے بیان کردہ سابق بنیادی اور اصل

موقف اور اس کے اسباب وعوامل میں مزید قوت اور وُسعت ظاہر ہوئی۔

اور اس سے قبل جو کسی تالیف ومضمون میں بندہ نے نمازِ عید کی شرائط میں سختی کی طرف رُجحان ظاہر کیا تھا، بندہ اس سے بھی رجوع کرتا ہے۔

بحمداللہ تعالیٰ وببرکتِ مشائخِ اعلیٰ نہ تو بندہ کو اپنے موقف کے صاف صاف کسی لاگ لپیٹ کے بغیر اظہار میں، کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کا خوف ہے، کیونکہ بحمداللہ تعالیٰ اصل مقصود رضائے خالق ہے، نہ کہ رضائے مخلوق، اور شاید یہ صاف گوئی اور عدمِ خِفاء ہی بعض لوگوں کے، بندہ سے خَفاء ہونے کا سبب بن جاتی ہے۔

اور نہ بندہ کو اپنے غیر معتدل وغیر معیاری الفاظ سے رجوع واصلاح کے اقرار میں کوئی عار ہے، کیونکہ وہ الفاظ نعوذ باللہ تعالیٰ قرآن وحدیث نہیں کہ اُن میں خطاء کا احتمال ہی نہ ہو۔

اور نہ ہی بندہ کو اپنے کسی دینی موقف کے خطاء وتسامح پر مشتمل ہونے کا کسی بھی ذریعہ سے علم وآگاہی حاصل ہوجانے کے بعد اس کی نشر واشاعت اور اعلان واِعلام میں کوئی شرم ہے، کیونکہ یہ تو خطاء ونسیان سے مرکب، ایک انسان کی منصبی ذمہ داری اور فریضۂ الٰہی ہے۔

اور نہ ہی بندہ بالخصوص اپنے آپ کو اور بالعموم دوسرے اہلِ علم حضرات کو خطاء وتسامح سے مبرّاء سمجھتا، کیونکہ یہ پاکیزہ مقام تو انسانوں میں، انبیائے کرام علیہم السلام کے لیے مختص ہے۔

اور نہ ہی بندہ اپنی کسی قلبی خیانت کو اللّٰہ جل جلالہٗ وعمّ نوالہٗ سے مخفی رہنے کا نعوذ باللہ تعالیٰ عقیدہ رکھتا، بے شک کوئی کچھ بھی کہتا اور سمجھتا رہے، بندہ اپنی نیت وقصد اور مافی الضمیر کے متعلق اصل اور حقیقی محتسب، اللہ ربُّ العزت کی ذات کو ہی قرار دیتا ہے، اور اس راہ میں کسی دوسرے کی بے جا شرکت ومداخلت کی کوشش سے شرعاً وعقلاً متأثر نہیں ہوتا، کیونکہ ایک مؤمن وموحِّد کے ایمان وتوحید کا تقاضا یہی ہے۔

اور اس مرحلہ پر ذہن میں غیر اختیاری طور پر کسی کا بتلایا ہوا، یہ شعر بھی گردش کرنے لگا کہ:

تُندیِ بادِ مخالف سے نہ گھبرا، اے عقاب!
یہ تو چلتی ہے، تجھے اونچا اُڑانے کے لئے

لیکن یہ بات بار بار کے مشاہدہ سے معلوم ہوئی کہ ہمارے یہاں کا ایک طبقہ صرف الفاظ اور ایک دوسرے کی شان میں متصوَّر ومتخیَّل، بلکہ متوھَّم اونچ نیچ کی جنگ کو تو بہت اہمیت وشدت، بلکہ کراہت وطوالت دیتا ہے، اور اپنے زعم وگمان کے مطابق اس کو اپنی، یا اپنے مخصوص بزرگوں کی شان میں بڑی بے ادبی وگستاخی تصور کرتا ہے، اور بلا دلیل بدگمانی وبدزبانی کا بھی ارتکاب کرتا ہے، مگر دلائلِ شرعیہ وفقہیہ کی روشنی میں علمی وفقہی تحقیق، اور اس میں اپنے اُن مشائخ واکابر کے طرزِ عمل کو نظر انداز کردیتا ہے، جن کی نظر اس طرح کی ذاتی ونفسانی اونچ نیچ کے بجائے، شرعی وفقہی دلائل پر ہوتی ہے، اور وہ خود سے اپنے متعلقین ومعتقدین کو اپنی شان میں غلو ومبالغہ، یا قصیدہ گوئی کی دعوت، بلکہ اجازت بھی نہیں دیتے۔

اگر الفاظ کی ہیر پھیر کردینے سے ایک اہم اور ہمہ گیر شرعی ودینی مسئلہ کے حل وتحقیق میں مدد ملتی ہے، تو اس سے کون سا فرق پڑتا ہے، اور کس کی شان گھٹ جاتی ہے؟ بالخصوص مجھ جیسے بندہ کی، جس کی کوئی شان ہی نہ ہو۔

اصل بات تو کسی شرعی ودینی مسئلہ میں بنیادی موقف اور اس کے متعلق دلائلِ شرعیہ وفقہیہ کی ہے، جس کو طرزِ سلف کے مطابق ہر قسم کے تعصب وتحزُّب اور تشدُّد وجمود سے بچ کر خالص علمی وفقہی بنیادوں پر حل کرنا چاہیے، اور اس سلسلہ میں گروپ بندی اور گروہ بندی سے بچنا چاہیے، جس سے الحمدللہ تعالیٰ بندہ اپنے آپ کو نفور اور دُور پاتا ہے، اور دین کے معاملہ میں کسی خاص گروپ، یا گروہ کی بے جا حمایت کا روادار نہیں ہے، اور حق وصواب کی نعمت ودولت جہاں سے بھی دستیاب ہو، تعصب وتحزب اور تشدد وجمود سے بالاتر ہوکر، نعمتِ غیر مترقبہ اور متاعِ گم گشتہ سمجھتے ہوئے اس کو حاصل کرنے کا متمنی ومتلاشی، اور تعصب وتحزب اور تشدد وجمود کو دُور کرنے اور اعتدال کو اختیار و پیدا کرنے کے لئے ساعی وکوشاں ہے۔

مذکورہ حضرات کے اس جیسے طرزِ عمل سے اپنے الفاظ میں نرمی کرنے اور اپنے الفاظ سے رجوع کرنے کے باوجود، بندہ کو اپنی سابق شکایت وحکایت میں مزید قوت محسوس ہوئی کہ بعض حضرات جمود وتشدُّ د اور تعصُّب وتحزُّ ب میں اس درجہ آگے بڑھ گئے ہیں کہ ان کی طرف سے کسی شرعی وفقہی مسئلہ میں دلائلِ شرعیہ وفقہیہ کے مقابلے میں ذاتی اور متوَھّم اونچ، نیچ اور الفاظ کی سختی ونرمی پر ہی سارازور ہے، اور جمود وتشدد اور تعصب وتحزب سے متعلق جو شکایت، بلکہ حکایت ذکر ونقل کی گئی تھی، اس پر غور وفکر اور لب کشائی کے لئے آمادہ نہیں۔

اور بندہ کو اس بات، بلکہ اس حقیقت سے انکار نہیں کہ ہر شخص کو فطری طور پر اپنے مخصوص اکابر ومشائخِ عظام اور معزز اساتذۂ کرام سے جو غیر معمولی قلبی محبت وعقیدت ہوتی ہے، اور اس کے دل میں ان اشخاص وافراد کے متعلق جس قسم کے جذبات ہوتے ہیں، وہ جذبات ان اشخاص وافراد کی رائے کے مقابلے میں کسی دوسرے کی رائے سے اُنسیت وقبولیت پیدا کرنے، کی راہ میں طبعی طور پر حائل بننے میں مسابقت کرتے ہیں، لیکن اندریں حالات طبعی جذبات وکیفیات کے مقابلہ میں، عقل ونقل اور شرعی وفقہی دلائل کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ اس قسم کے جذبات وکیفیات کی قدر کرتے ہوئے، ان کو اپنی جگہ برقرار رکھتے ہوئے، بلکہ ان کے ذریعہ حدودِ شریعت میں رہ کر اپنے اکابر ومشائخ سے جائز طریقہ پر استفادہ کرتے ہوئے، کسی شرعی وفقہی اور اجتہادی واختلافی رائے کے رَدوقبول اور صواب وخطاء اور راجح ومرجوح وغیرہ ہونے میں، ان جذبات وکیفیات کو حائل نہ ہونے دیا جائے، اور کسی شرعی وفقہی رائے میں مذکورہ اُمور کا مدار، محض اپنے طبعی جذبات وکیفیات کی کسوٹی پر نہ رکھا جائے۔

جس کے متعلق قرآن وسنت میں متعدد نصوص وارد ہیں، جن پر عمل درآمد کرنا، بلکہ ان کا اپنے آپ کو مصداق سمجھنا بھی آج تعصُّب وتحزُّ ب، تشدُّ د وجمود اور قحطُ الرجال کے دور میں ایک مشکل مرحلہ بن گیا ہے۔

سورہ نسآء میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰى أَنْفُسِكُمْ أَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِيْنَ إِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا أَوْ فَقِيْرًا فَاللّٰهُ أَوْلٰى بِهِمَا فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰى أَنْ تَعْدِلُوْا وَإِنْ تَلْوُوْا أَوْ تُعْرِضُوْا فَإِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا (سورة النساء، رقم الآية ١٣٥)

ترجمہ: اے ایمان والو! ہوجاؤ تم قائم کرنے والے انصاف کو، گواہ بنو اللہ کے لئے ، اگرچہ تمہارے خلاف ہو، یا والدین کے، اور اقرباء کے، اگر ہے، وہ (شخص) غنی یا فقیر، تو اللہ ان دونوں کے مقابلہ میں اولیٰ (ومقدم) ہے، پس خواہش کی اتباع نہ کرو تم، عدل وانصاف کرنے میں، اور اگر تم زبان لپیٹو گے (یعنی غلط بیانی کر کے ناانصافی کرو گے) یا (عدل وانصاف سے) اعراض کرو گے، تو اللہ تمہارے اعمال سے خوب خبردار ہے (جس کا تم کو حساب دینا پڑے گا)

(سورہ نساء)

اور سورہ مائدہ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا كُوْنُوا قَوَّامِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلٰى أَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى وَاتَّقُوا اللّٰهَ إِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ (سورة المائدة، رقم الآية ٨)

ترجمہ: اے ایمان والو! ہوجاؤ تم قائم کرنے والے اللہ کے لئے انصاف کے ساتھ گواہی کو، اور ہرگز آمادہ نہ کرے تم کو کسی قوم کی عداوت اس پر کہ تم عدل نہ کرو، تم عدل کرو، یہی زیادہ قریب ہے تقویٰ کے، اور ڈرو تم اللہ سے، بے شک اللہ خوب خبردار ہے، تمہارے اعمال سے (سورہ مائدہ)

اور سورہ مائدہ میں ہی اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

وَإِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ (سورة المائدة، رقم الآية ۴۲)

ترجمہ: اور اگر فیصلہ کریں آپ، تو فیصلہ کریں، ان کے درمیان عدل (وانصاف) کے ساتھ، بے شک اللہ محبت رکھتا ہے، عدل (وانصاف) کرنے والوں سے (سورہ مائدہ)

اور سورہ انعام میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

وَإِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى (سورة الانعام، رقم الآية ۱۵۲)

ترجمہ: اور جب کہو تم، تو انصاف کرو، اگرچہ ہو وہ رشتہ دار (سورہ انعام)

مفسرینِ عظام نے ''بالقسط'' کی تفسیر ''بالعدل'' کے ساتھ کی ہے۔ [1]

حضرت واثلہ بن اسقع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

سَأَلْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَقُلْتُ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ أَمِنَ الْعَصَبِيَّةِ أَنْ يُحِبَّ الرَّجُلُ قَوْمَهُ؟ قَالَ: لَا، وَلٰكِنْ مِنَ الْعَصَبِيَّةِ أَنْ يَّنْصُرَ الرَّجُلُ قَوْمَهُ عَلَى الظُّلْمِ (مسند أحمد، رقم الحديث ۱۶۹۸۹) [2]

ترجمہ: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ اے اللہ کے رسول! کیا آدمی کا اپنی قوم (یعنی اپنی برادری، یا خاندان وقبیلہ اور اکابر ومشائخ وغیرہ) سے محبت رکھنا بھی تعصُّب میں داخل ہے؟

تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نہیں! بلکہ تعصب تو یہ ہے کہ آدمی اپنی قوم کی ظلم (یعنی ناحق چیز) پر مدد واعانت کرے (مسند احمد)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے ان کا یہ ارشاد مروی ہے کہ:

---

[1] (يأيها الذين آمنوا كونوا قوامين) قائمين (بالقسط) بالعدل (شهداء) بالحق (تفسير الجلالين، سورة النساء، تحت رقم الآية ۱۳۵)

يأمر تعالى عباده المؤمنين أن يكونوا قوامين بالقسط أى بالعدل، فلا يعدلوا عنه يمينا ولا شمالا، ولا تأخذهم فى الله لومة لائم ولا يصرفهم عنه صارف (تفسير ابنِ كثير، ج۲ ص۳۸۳، سورة النسآء)

[2] قال شعيب الارنؤوط: حديث حسن (حاشية مسند احمد)

قَالَ: مَنْ نَصَرَ قَوْمَهُ عَلٰی غَيْرِ الْحَقِّ، فَهُوَ كَالْبَعِيرِ الَّذِیْ رُدِّیَ، فَهُوَ يُنْزَعُ بِذَنَبِهٖ (سنن أبی داود،رقم الحديث ۵۱۱۷، کتاب الادب، باب فی العصبيه) [1]

ترجمہ: جس شخص نے اپنی قوم کی ناحق مدد کی تو وہ اس اونٹ کی طرح ہے، جو کنویں میں گر پڑا، اب وہ اپنی دم سے کھینچ کر نکالا جائے گا (ابوداؤد)

اس سے معلوم ہوا کہ اپنی قوم وجماعت یا مخصوص گروپ کی ناحق مدد وبے جا طرف داری، انسان کو دنیا وآخرت کے اندر مشکل میں پھنسانے کا سبب ہے، جس کا رات دن اپنی آنکھوں سے مشاہدہ ہوتا ہے، اور اس کے نقصانات کا رات دن مسلمان سامنا کرتے ہیں۔

علمی وفقہی دنیا میں بھی ایک دوسرے سے تعصب وتشدد کرنے والے حضرات مختلف قسم کی مشکلات میں پھنستے ہیں، بے جا اور دور دراز کی تاویلات کر کے نصوص سے راہِ فرار اختیار کرتے ہیں، اور آخرت کی مشکلات کا وبال الگ ہے، اللہ ربُّ العزت حفاظت فرمائے۔ آمین۔ [2]

حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، قَالَ: حُبُّکَ الشَّیْءَ يُعْمِیْ وَيُصِمُّ

(سنن ابی داؤد،رقم الحديث ۵۱۳۰، کتاب الادب، ابواب النوم، باب فی الهوی)

ترجمہ: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تیرا کسی چیز سے محبت کرنا اندھا اور بہرا بنا دیتا ہے (ابوداؤد)

اس حدیث کی سند کو بعض حضرات نے ضعیف قرار دیا ہے، البتہ حضرت ابوالدرداء رضی اللہ

---

[1] قال شعيب الارنؤوط:

حديث حسن(حاشية سنن ابی داؤد)

[2] (مثل الذی يعين قومه علی غير الحق مثل بعير تردی وهو يجر بذنبه) لفظ رواية أبی داود كمثل بعير تردی فی بئر فهو ينزع منها بذنبه اه قال بعضهم :معنی الحديث أنه قد وقع فی الإثم وهلک كالبعير إذا تردی فی بئر فصار ينزع بذنبه ولا يقدر علی الخلاص(فيض القدير للمناوی، تحت رقم الحديث ۸۱۴۲)

عنہ پر اس روایت کے موقوف ہونے کو صحیح قرار دیا ہے۔ [1]

مطلب یہ ہے کہ جب انسان کو کسی سے محبت ہوجاتی ہے، تو عادتاً وہ اس کے تسامحات ومرجوحات اور لغزشوں وخطاؤں سے اندھا اور بہرا بنادیتی ہے، اور صواب وخطاء اور راجح ومرجوح وغیرہ کی تمیز ختم ہوجاتی ہے۔

تعصب میں بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔ [2]

بہرحال بندہ اپنے سابق مضمون میں اس قسم کے تیز تنقیدی الفاظ سے رجوع کرتا ہے، جو کسی بزرگ کی شان میں بے ادبی پر مشتمل ہوں، اور اس قسم کے الفاظ سے جس کسی کو دل شکنی ودل آزاری محسوس ہوئی ہے، بندہ اس سے بطیبِ خاطر غیر مشروط معذرت بھی پیش کرتا ہے۔

لیکن ساتھ ہی یہ گزارش بھی کرتا ہے کہ اہلِ علم حضرات کے لئے مُتوَهَّم تخیلات اور الفاظ کی سختی ونرمی سے زیادہ، عبارت کے مقصود ومفہوم اور شرعی وفقہی دلائل پر نظر کا ہونا، زیادہ اہمیت کا حامل اور ان کی شانِ عالی ومنصبِ ذمہ داری کا تقاضا ہے۔

---

[1] قال شعیب الارنؤوط:
صحیح موقوفاً، وهذا إسناد ضعيف لضعف أبي بكر بن عبد الله بن أبي مريم، وبقية -وهو ابن الوليد- وإن كان ضعيفاً قد توبع(حاشية سنن ابی داوٗد، تحت رقم الحديث ۵۱۳۰)

[2] "حبک الشیء یعمی ویصم."(حم تخ د) عن أبی الدرداء، والخرائطی فی اعتلال القلوب عن أبی برزة، وابن عساكر عن عبد الله بن أنيس.
(حبک الشیء) عام فی كل حيوان وجماد وعرض وجوهر .(يعمى) أى عن معائب ما يحبه أو عن كل شیء سواه إذا تمكن فی القلب(ويصم) عن سماع كل ما ليس فی معناه أى يصيره كالأعمى والأصم لا ينتفع بحاسته والحديث تحذير عن الإيغال فی المحبة لأى محبوب سوى ما يحبه الله ورسوله فإن تخصيصه معلوم من قاعدة الشرع .(حم تخ د) عن أبی الدرداء) قال الحافظ العراقی: إسناده ضعيف وقال الزركشی: روى من طرق فی كل منها مقال وقال المصنف فی الدرر: الوقف به أشبه، (والخرائطی فی اعتلال القلوب عن أبی برزة)، (وابن عساكر عن عبد الله بن أنيس) قد أشار المصنف بتعدد طرقه ومخرجيه إلى دفع زعم الصغانی وضعه وقوله فيه ابن أبی مريم كذوب أبطله الحافظ العراقی بأنه لم يتهمه أحد بكذب(التنوير شرح الجامع الصغير، ج۵ص ۳۲۴، ۳۲۵، تحت رقم الحديث ۳۶۵۸،باب الحاء الموحدة)

تاہم جن حضرات نے ایک پیاسے بندہ کو اس پُرفتن اور قحطُ الرجال کے دور میں ''الــدیــن النصیحة ''اور''الـمؤمن مر آة المؤمن ''کا مصداق بن کر براہِ راست خیر خواہانہ مشورہ سے سیراب کیا، اور ان کے مشورے سے مزید اُمور منقح ہوئے، ان کا بندہ نہایت ممنون ومشکور، بلکہ اُن سے مسرور ہے۔

فـجـزاهـم الـلّٰـه تـعـالٰى خير الجزاء، ووفقهم اللّٰه تعالٰى لما يحب ويرضٰى.

اور آئندہ کے لئے بھی لِلّٰه فی اللّٰه بندہ ہر قسم کے خیر خواہانہ مشوروں کو کھلے دل کے ساتھ سُننے اور ان پر غور وفکر کرنے کے لئے آمادہ اور ایسے احباب کا جوئیندہ ہے، جس کے لئے بندہ کی طرف سے دعوتِ شیراز کا اِذنِ عام ہے۔

لیکن ساتھ ہی یہ حقیقت پیشِ نظر رکھنا بھی ضروری ہے کہ ''مُشیــر'' کی حیثیت ''فیــصــل وحَــکَــم'' کی نہیں ہوتی، البتہ ''مشیر'' کے مشورہ پر اخلاص ونیک نیتی کے ساتھ غور وفکر اور تدبّر وتفکر کرنا، صاحبِ معاملہ کی دیانتاً اور فیمابینهٗ وبین اللّٰه ذمہ داری ہوتی ہے، جس پر وہ عنداللہ جواب دہ ہے۔

اسی کے ساتھ جن حضراتِ گرامی اور کرم فرماؤں نے خیر خواہانہ مشورہ دینے کے بجائے، پیٹھ پیچھے مختلف قسم کی باتیں کیں، ان کی خدمت میں فی الحال بندہ قرآنی الفاظ کی حکایت میں یہ گزارش پیش کرتا ہے کہ:

فَسَتَـذْكُـرُوْنَ مَـا اَقُـوْلُ لَـكُـمْ وَاُفَـوِّضُ اَمْرِىْ اِلَى اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ بَصِيْرٌ بِالْعِبَادِ (سورة الغافر، رقم الآية ۴۴)

اور آخرت کے اعتبار سے بندہ اُن کرم فرماؤں کو بھی ایک طرح سے اپنا خیر خواہ ہی شمار کرتا ہے، ممکن ہے کہ مجھ جیسے کمزور انسان کو ان کی اخلاص وتقوے پر مشتمل کچھ نیکیاں آخرت میں کام آجائیں، یا مذکورہ حضراتِ گرامی، اور کرم فرما حضرات، گناہ گار وخطاوار بندہ کے

گناہوں اور خطاؤں کا بوجھ ہلکا کرنے میں، کسی طرح سے معاون بن جائیں۔

واللّٰہ المستعان، وعلیہ التکلان.

مذکورہ نکات کو ذہن میں رکھ کر آنے والے مضمون کو ملاحظہ کرنا چاہیئے۔

اور اُمتِ مسلمہ کو پیش آمدہ مسائل میں وسیع تر فقہائے کرام ومجتہدینِ عظام کے اقوال کی روشنی میں رہنمائی فراہم کرنی چاہیئے۔

اور دین میں تنگی پیدا کرنے سے اجتناب کرنا چاہیے، جس کا لازمی نتیجہ بھی یہ ہے کہ اس کی وجہ سے قبولیت کا دائرہ بھی تنگ ہوجاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ امتِ مسلمہ کی تعصب وتحزب اور تشدد وجمود سے حفاظت فرمائے، اور اعتدال ومیانہ روی کو اختیار کرنے کی توفیق عطاء فرمائے۔ آمین۔

فقط

وَاللّٰہُ سُبۡحَانَہٗ وَتَعَالٰی اَعۡلَمُ .

محمد رضوان خان

5/ شوال المکرّم/ 1441ھ 28/ مئی/ 2020 بروز جمعرات

ادارہ غفران، راولپنڈی، پاکستان

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نمازِ عید، باجماعت اور تنہاء پڑھنے کا حکم

سوال

جناب مفتی صاحب!

آج کل ''کرونا وائرس'' کی وجہ سے دنیا کے بیشتر ملکوں میں عید کے موقع پر ''لاک ڈاؤن'' اور ''کرفیو'' کی فضاء موجود ہے، ایسی صورت میں جن لوگوں کو بڑے مجامع اور مساجد میں جانا مشکل ہو، ان کے لیے اپنے مقام پر رہتے ہوئے نمازِ عید کو، باجماعت، یا بغیر جماعت کے پڑھنے کی مختلف ممالک اور مسالک کے، کئی اہلِ علم اور مفتیانِ کرام نے اجازت دی ہے، جن کی اخبارات اور ذرائع ابلاغ میں بھی اشاعت ہوئی۔

سعودی عرب کے مفتی اعظم عبدالعزیز آل الشیخ نے بھی اس بارے میں فتویٰ جاری کیا ہے۔

اور سعودی عرب کی فقہ کونسل کے فیصلے کے متعلق بھی 17 مئی 2020ھ کو یہ خبر منظرِ عام پر آئی کہ:

> ''کرونا وائرس کے بعد پیدا ہونے والے موجودہ حالات میں گھروں میں عید کی نماز ادا کرنا جائز ہے، اس بات کی روایت حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حوالے سے نقل کی گئی ہے''۔

(https://urdu.alarabiya.net/ur/editor-selection/2020/05/17/)

اور ترکی وغیرہ ممالک کے حکمرانوں اور علمائے کرام نے بھی اس طرح کی آراء دی ہیں۔

لیکن ہمارے ملکِ پاکستان کے ایک مفتی صاحب نے فرمایا کہ:

> ''فقہ حنفی کے مطابق نمازِ عید کا بڑے مجامع کے علاوہ، گھروں وغیرہ میں پڑھنا درست نہیں، ہاں دوسرے فقہ کے مطابق درست ہے''۔

جبکہ اس قسم کے بیانات کی وجہ سے دنیا بھر کے بہت سے مسلمان، نمازِ عید کی برکتوں اور

رحمتوں سے محروم ہو جائیں گے۔

اگر فقہ حنفی کے مطابق گھروں میں عید کی نماز درست نہ ہو، تو کیا موجودہ حالات میں لوگوں کو دوسرے فقہاء کے قول پر عمل کرنے کی گنجائش نہیں ہوگی؟

آپ سے اس مسئلے کے بارے میں رہنمائی درکار ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جواب

شریعتِ مطہرہ کی تعلیمات دنیا کے سب علاقوں اور زمانوں کے لیے قابلِ عمل ہیں، جس سے کوئی علاقہ اور زمانہ خارج نہیں، البتہ شریعتِ مطہرہ کی طرف سے، تمام حالات میں یکساں طریقہ اور مخصوص شکل کو متعین نہیں کیا گیا، اور مجبوری ومعذوری والے حالات میں، شریعت کے اعمال واحکام کو انجام دینے کے طریقے مختلف ہیں، اور مجبوری کی صورت میں سنن ومستحبات کی خلاف ورزی میں کراہت وغیرہ بھی مرتفع ہوجایا کرتی ہے۔

اب ظاہر ہے کہ موجودہ ''لاک ڈاؤن'' اور ''کرفیو'' کے حالات میں ہی، سوال میں مذکور، اس طرح کے سوالات ابھر کر سامنے آرہے ہیں، عام اور کھلے دنوں میں اس طرح کے مسائل پیش نہیں آتے، جس کی وجہ سے دوسرے عام دنوں میں نہ تو عوام کی طرف سے اس طرح کے سوالات کرنے کی ضرورت محسوس کی جاتی، اور نہ ہی اہلِ علم حضرات، عام حالات میں، اس طرح کے مسائل پر کلام وتحقیق اور بحث وتمحیص کی خاطر خواہ ضرورت سمجھتے۔

لہٰذا مخصوص اور عارضی حالات کے احکام بھی عارضی اور مخصوص ہی ہوں گے، اور ایسی صورت میں عام حالات والے احکام ومسائل کے انطباق کی کوشش، اور جستجو کرنا بھی مناسب نہ ہوگا۔

آج کل بعض اہلِ علم حضرات کا مزاج یہ بن گیا ہے کہ وہ مخصوص حالات میں بھی عام حالات سے متعلق بیان کردہ مسائل سے عدول کرنے اور ان میں گنجائش پر آمادہ نظر نہیں آتے، اور پھر مخصوص حالات میں اس کے مطابق عملی شکل موجود نہ ہونے کی صورت میں طرح طرح کی

مشکلات سے خود بھی دوچار ہوتے ہیں، اور اس کے نتیجے میں عوام بھی مشکلات، اور تذبذبات کا شکار ہوتے ہیں۔

ان حضرات سے ہماری گزارش ہے کہ اس قسم کے اجتماعی اور اہم مسائل پر تحقیق کے بغیر کوئی حکم صادر کردینا، مناسب طریقہ نہیں، بلکہ ایسی صورت میں تو ہمارے نزدیک اگر کسی ایک مخصوص فقہ کے بجائے، اہلُ السنۃ والجماعۃ کے کسی دوسرے فقہی سلسلے سے متبادل صورت دستیاب ہو، اس کی طرف بھی عامۃُ المسلمین کو رہنمائی کرنی چاہیے۔

ہمارے نزدیک موجودہ ''لاک ڈاؤن'' اور ''کرفیو'' کے حالات میں بھی، جس کو جس طرح سے بن پڑے، عیدین کی نماز کی متبادل صورتوں پر عمل کرنا چاہیے، جس کے متعلق ہماری طرف سے ''عید کے اہم مسائل'' کے عنوان سے تحریر کردہ مضمون میں روشنی ڈالی جاچکی ہے۔

اور اب آپ کے مستقل سوال کرنے پر اس کی کچھ مزید تفصیل ذکر کی جاتی ہے۔

پہلے تو یہ ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ حنفیہ کے نزدیک نمازِ عید کے واجب اور سنت ہونے میں اختلاف ہے، حنفیہ کا ایک قول نمازِ عید کے سنت ہونے کا ہے۔ [1]

لیکن بہت سے مشائخِ حنفیہ نے نمازِ عید کے واجب ہونے کے قول کو راجح قرار دیا ہے، اور عام کتبِ حنفیہ میں، اسی کے مطابق حکم مذکور ہے۔ [2]

---

[1] محمد عن يعقوب عن أبي حنيفة عيدان اجتمعا في يوم واحد فالأول سنة والآخر فريضة ولا يترك واحد منهما (الجامع الصغير، ۱۱۳، كتاب الصلاة،باب في العيدين والصلاة بعرفات والتكبير في أيام التشريق)

[2] واشتبه المذهب في صلاة العيد أنها واجبة أم سنة فالمذكور في الجامع الصغير إنها سنة لأنه قال في العيدين :يجتمعان في يوم واحد فالأولى منهما سنة وروى الحسن عن أبي حنيفة رحمهما الله تعالى أنه تجب صلاة العيد على من تجب عليه صلاة الجمعة وقال في الأصل :لا يصلى التطوع في الجماعة ما خلا قيام رمضان وكسوف الشمس فهو دليل على أن صلاة العيد واجبة.

والأظهر أنها سنة ولكنها من معالم الدين أخذها هدى وتركها ضلالة وإنما يكون الخروج في العيدين على أهل الأمصار دون أهل القرى والسواد لما روينا لا جمعة ولا تشريق إلا في مصر جامع والمراد بالتشريق صلاة العيد على ما جاء في الحديث لا ذبح إلا بعد التشريق (المبسوط،لشمس الأئمة السرخسي،ج۲،ص۳۷، كتاب الصلاة،باب صلاة العيدين)

نیز متعدد مشائخِ حنفیہ نے عید کی نماز واجب ہونے کی شرائط کو، جمعہ کی نماز واجب ہونے کی شرائط کی طرح ہونے کی تصریح کی ہے۔

اور عید کی نماز صحیح ہونے کی شرائط کے بارے میں حنفیہ کے مابین تھوڑا بہت اختلاف ہے، لیکن مشائخِ حنفیہ نے اس میں بھی راجح اسی کو قرار دیا ہے کہ نمازِ عید کے صحیح ہونے کی شرائط بھی نمازِ جمعہ کی طرح ہیں، سوائے خطبہ کے۔

جبکہ بعض حضرات نے کچھ دیگر شرائط میں اختلاف بھی کیا ہے۔[1]

---

[1] باب صلاة العيدين:

الكلام في صلاة العيدين في مواضع وفي بيان أنها واجبة أم سنة وفي شرائط وجوبها وفي وقت أدائها وفي كيفية أدائها وفي بيان ما يستحب ويسن في يوم عيد الأضحى والفطر.

أما الأول وهو بيان أنها واجبة أم سنة فنقول اختلفت الروايات عن أصحابنا في ظاهر الرواية دليل على أنها واجبة فإنه قال ولا يصلى نافلة في جماعة إلا قيام رمضان وصلاة الكسوف فهذا دليل على أن صلاة العيد واجبة فإنها تقام بجماعة.

وروى الحسن عن أبي حنيفة أنه قال وتجب صلاة العيد على أهل الأمصار كما تجب الجمعة.

وذكر أبو الحسن الكرخي ههنا وقال وتجب صلاة العيد على من يجب عليه الجمعة.

وذكر في الجامع الصغير أنه سنة فإنه قال إذا اجتمع العيدان في يوم واحد فالأول سنة.

وذكر أبو موسى الضرير في مختصره أنها فرض كفاية والأصح أنها واجبة.

أما بيان شرائط وجوبها فكل ما هو شرط وجوب الجمعة فهو شرط وجوب صلاة العيدين من الإمام والمصر والجماعة إلا الخطبة فإنها سنة بعد الصلاة(تحفة الفقهاء، ج ا،ص ١٦٥، ١٦٦، كتاب الصلاة،باب صلاة العيدين)

(باب العيدين)

أي صلاة العيدين، ولا خفاء في وجه المناسبة وسمي به لما أن لله -سبحانه وتعالى- فيه عوائد الإحسان إلى عباده أو؛ لأنه يعود ويتكرر أو؛ لأنه يعود بالفرح والسرور أو تفاؤلا بعوده على من أدركه كما سميت القافلة قافلة تفاؤلا بقفولها أي برجوعها وجمعه أعياد وكان حقه أعواد؛ لأنه من العود ولكن جمع بالياء للزومها في الواحد أو للفرق بينه وبين عود الخشب فإنه يجمع على عيدان وعود اللهو فإنه يجمع على أعواد كما في العيني، وكانت صلاة عيد الفطر في السنة الأولى من الهجرة كما رواه أبو داود مسندا إلى أنس -رضي الله عنه- قال قدم رسول الله -صلى الله عليه وسلم- المدينة، ولهم يومان يلعبون فيهما فقال ما هذان اليومان؟ قالوا: كنا نلعب فيهما في الجاهلية فقال رسول الله -صلى الله عليه وسلم-: إن الله قد أبدلكم بهما خيرا منهما يوم الأضحى ويوم الفطر (قوله تجب صلاة العيد على من تجب عليه الجمعة بشرائطها سوى الخطبة) تصريح

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

اورعید کی نماز سنت ہونے کے قول کی بناء پر، عید کی نماز باجماعت کے سنت ہونے کا قول بھی مروی ہے، جس کی رو سے عید کی نماز کا جماعت کے ساتھ ہونا شرط نہیں ہے، البتہ اس کو سنت کی ادائیگی پر اداء کرنے کی شرط ہے۔

لیکن بایں ہمہ حنفیہ کے نزدیک بغیر جماعت کے نمازِ عید کا پڑھنا گناہ نہیں، وہ الگ بات ہے کہ یہ نمازِ عید کے حکم میں محسوب ہوگی، یا نہیں؟ جس کی تفصیل آگے آتی ہے۔ [1]

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

بوجوبها، وهو إحدى الروايتين عن أبى حنيفة، وهو الأصح كما فى الهداية والمختار كما فى الخلاصة، وهو قول الأكثرين كما فى المجتبى ويدل عليه من جهة الرواية قول محمد فى الأصل، ولا يصلى نافلة فى جماعة إلا قيام رمضان وصلاة الكسوف فإنه لم يستثن العيد فعلم أنه ليس من النوافل ومن جهة الدليل مواظبته -صلى الله عليه وسلم -عليها من غير ترك.

وفى رواية أخرى أنها سنة لقول محمد فى الجامع الصغير فى العيدين يجتمعان فى يوم واحد قال يشهدهما جميعا ولا يترك واحدا منهما والأولى منهما سنة والأخرى فريضة قال فى غاية البيان وهذا أظهر، ولم يعلله، وهو كذلك لوجهين أحدهما أن الجامع الصغير صنفه بعد الأصل فما فيه هو المعول عليه وثانيهما أنه صرح بالسنة بخلاف ما فى الأصل والظاهر أنه لا خلاف فى الحقيقة؛ لأن المراد من السنة السنة المؤكدة بدليل قوله، ولا يترك واحدا منهما وكما صرح به فى المبسوط، وقد ذكرنا مرارا أنها بمنزلة الواجب عندنا؛ ولهذا كان الأصح أنه يأثم بترك المؤكدة كالواجب، وفى المجتبى الأصح أنها سنة مؤكدة.

وأفاد أن جميع شرائط الجمعة وجوبا وصحة شرائط للعيد إلا الخطبة فإنها ليست بشرط حتى لو لم يخطب أصلا صح وأساء لترك السنة، ولو قدمها على الصلاة صحت وأساء ، ولا تعاد الصلاة.وبه اندفع ما فى السراج الوهاج من أن المملوك تجب عليه العيد إذا أذن له مولاه، ولا تجب عليه الجمعة؛ لأن الجمعة لها بدل، وهو الظهر، وليس كذلك العيد فإنه لا بدل له؛ لأن منافعه لا تصير مملوكة له بالإذن فحاله بعد الإذن كحاله قبله، وفى القنية صلاة العيد فى الرساتيق تكره كراهة تحريم اهـ؛ لأنه اشتغال بما لا يصح؛ لأن المصر شرط الصحة(البحر الرائق شرح كنز الدقائق، ج٢،ص ١٧٠، ١٧١، كتاب الصلاة ،باب العيدين)

(قوله وبه اندفع ما فى السراج) أى بما أفاده المصنف أن جميع شرائط الجمعة وجوبا وصحة شرائط للعيد ومن جملتها الحرية فلا تجب العيد أيضا، وإن أذن له كالجمعة لكن قد نقل فى الجمعة عن السراج أن الجمعة تجب عليه وقال بعضهم يتخير(منحة الخالق،على البحر الرائق شرح كنز الدقائق، ج٢،ص ١٧١، كتاب الصلاة،باب العيدين)

[1] (قوله :بشرائطها) متعلق ب تجب الأول، والضمير للجمعة وشمل شرائط الوجوب وشرائط الصحة لكن شرائط الوجوب علمت من قوله على من تجب عليه الجمعة، فبقى المراد من قوله

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

اورنمازِ عید کے درجہ وحکم کی تعیین میں اسی اختلاف کی وجہ سے مشائخِ حنفیہ نے نمازِ وتر کی طرح نمازِ عیدین میں بھی واجب وغیرہ کی تعیین کے بغیر ''مطلق عید کی نماز'' کی نیت کرنے کا حکم فرمایا ہے۔ [1]

جبکہ مالکیہ اور شافعیہ کے نزدیک عید کی نماز سنتِ مؤکدہ ہے۔

اور حنابلہ کے نزدیک **فرض علی الکفایۃ** ہے۔

لیکن جمہور فقہائے کرام کے نزدیک نمازِ عیدین کا تنہاء بغیر جماعت کے پڑھنا بھی فی الجملہ

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

بشرائطها القسم الثانى فقط، واستثنى من الثانى الخطبة، واستثنى فى الجوهرة من الأول المملوك إذا أذن لـه مولاه فإنه تلزمه العيد بخلاف الجمعة لأن لها بدلا وهو الظهر، وقال :وينبغى أن لا تجب عليه العيد أيضا لأن منافعه لا تصير مملوكة له بالأذان .اهـ .وجزم به فى البحر.

قلت :وفى إمامة البحر أن الجماعة فى العيد تسن على القول بسنيتها، وتجب على القول بوجوبها . اهـ .وظاهره أنها غير شرط على القول بالسنية لكن صرح بعده بأنها شرط لصحتها على كل من القولين أى فتكون شرطا لصحة الإتيان بها على وجه السنة وإلا كانت نفلا مطلقا تأمل لكن اعترض ط ما ذكره المصنف بأن الجمعة من شرائطها الجماعة التى هى جمع والواحد هنا مع الإمام كما فى النهر(رد المحتار على الدر المختار، ج٢،ص١٦٦، كتاب الصلاة ،باب العيدين)

[1] وأراد المصنف بالفرض الفرض العملى فيشمل الواجب فيدخل فيه قضاء ما شرع فيه من النفل، ثم أفسده والنذر والوتر وصلاة العيدين وركعتا الطواف فلا بد من التعيين لإسقاط الواجب عنه وقالوا :إنه لا ينوى فيه أنه واجب للاختلاف فيه وفى القنية من سجود التلاوة لا تجب نية التعيين فى السجدات.اهـ(البحر الرائق شرح كنز الدقائق،ج١،ص٢٩٧، كتاب الصلاة ،باب شروط الصلاة)

(قوله :وقالوا :إنه لا ينوى إلخ) أى لا يلزمه تعيين الوجوب لا أن المراد منعه من أن ينوى وجوبه؛ لأنه إن كان حنفيا ينبغى أن ينويه ليطابق اعتقاده وإن كان غيره لا تضره تلك النية، كذا ذكر المؤلف فى باب الوتر (منحة الخالق،على البحر الرائق شرح كنز الدقائق،ج١،ص٢٩٧، كتاب الصلاة ،باب شروط الصلاة)

وكذا ينبغى أن ينوى صلاة الجمعة، وصلاة العيدين، وصلاة الجنازة، وصلاة الوتر؛ لأن التعيين يحصل بهذا وإن كان إماما فكذلك الجواب؛ لأنه منفرد فينوى ما ينوى المنفرد(بدائع الصنائع فى ترتيب الشرائع،ج١،ص١٢٨،كتاب الصلاة،فصل شرائط أركان الصلاة)

وفى صلاة الجنازة ينوى الصلاة لله تعالى والدعاء للميت وفى العيدين ينوى صلاة العيد وفى الوتر ينوى صلاة الوتر .كذا فى الزاهدى وفى الغاية أنه لا ينوى فيه أنه واجب للاختلاف فيه .كذا فى التبيين(الفتاوى الهندية،ج١،ص٦٦، كتاب الصلاة،الباب الثالث،الفصل الرابع فى النية)

جائز، بلکہ بعض مخصوص افراد کے حق میں، سنت، یا مستحب ہے، ناجائز وممنوع نہیں، جیسے حجاج، یا اہلِ منیٰ وغیرہ۔ [1]

اس تجزیہ سے اتنی بات ضرور معلوم ہوگئی کہ جملہ فقہائے کرام کے نزدیک نمازِعید کا درجہ نمازِ جمعہ سے کمزور ہے۔

اور فقہائے کرام کی عبارات میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جمعہ وعیدین کی نمازوں میں مندرجہ ذیل چیزوں کے اعتبار سے فرق ہے۔

---

[1] فی حکم صلاة العيدين ووقتهما تفصيل فی المذاهب، فانظره تحت الخط .
الشافعية قالوا :هـى سنة عين مؤكدة لكل من يؤمر بالصلاة، وتسن جماعة لغير الحاج، أما الحجاج فتسن لهم فرادى.
المالكية قالوا :هـى سنة عين مؤكدة تلى الوتر فى التأكد، يخاطب بها كل من تلزمه الجمعة بشرط وقوعها جماعة مع الإمام، وتندب لمن فاتته معه، وحينئذ يقرأ فيها سراً، كما تندب لمن لم تلزمه، كالعبيد والصبيان؛ ويستثنى من ذلک الحاج، فلا يخاطب بها لقيام وقوفه بالمشعر الحرام مقامها، نعم تندب لأهل "منى "غير الحجاج وحداناً لا جماعة، لئلا يؤدى ذلک إلى صلاة الحجاج معهم.
الحنفية قالوا :صلاة العيدين واجبة فى الأصح على من تجب عليه الجمع بشرائطها، سواء كانت شرائط وجوب أو شرائط صحة، إلا أنه يستثنى من شرائط الصحة الخطبة، فإنها تكون قبل الصلاة فى الجمعة وبعدها فى العيد، ويستثنى أيضاً عدد الجماعة، فإن الجماعة فى صلاة العيد تتحقق بواحد مع إمام، بخلاف الجمعة، وكذا الجماعة فإنها واجبة فى العيد يأثم بتركها، وإن صحت الصلاة بخلافها فى الجمعة، فإنها لا تصح إلا بالجماعة، وقد ذكرنا معنى الواجب عند الحنفية فى "واجبات الصلاة "وغيرها، فارجع إليه.
الحنابلة قالوا :صلاة العيد فرض كفاية على كل من تلزمه صلاة الجمعة، فلا تقام إلا حيث تقام الجمعة ما عدا الخطبة، فإنها سنة فى العيد، بخلافها فى الجمعة، فإنها شرط، وقد تكون صلاة العيد سنة، وذلک فيمن فاتته الصلاة مع الإمام، فإنه يسن له أن يصليها فى أى وقت شاء بالصفة الآتية(الفقه على المذاهب الأربعة،للجزيرى، ج ۱،ص ۳۱۳، كتاب الصلاة،مباحث صلاة العيدين،حكم صلاة العيدين، ووقتهما)
الحنابلة قالوا :الجماعة شرط لصحتها كالجمعة، إلا أنه يسن لمن فاتته مع الإمام أن يقضيها فى أى وقت شاء على صفتها المتقدمة.
الشافعية قالوا :الجماعة فيها سنة لغير الحاج، ويسن لمن فاتته مع الإمام أن يصليها على صفتها فى أى وقت شاء ، فإن كان فعله لها بعد الزوال فقضاء ، وإن كان قبله فأداء .
المالكية قالوا :الجماعة شرط لكونها سنة، فلا تكون صلاة العيدين سنة إلا لمن أراد إيقاعها فى الجماعة، ومن فاتته مع ندب الإمام له فعلها إلى الزوال، ولا تقضى بعد الزوال(الفقه على المذاهب الأربعة، للجزيرى، ج ۱، ص۳۱۷، كتاب الصلاة، مباحث صلاة العيدين،حكم الجماعة وقضائها إذا فات وقتها)

(1)......نمازِ جمعہ اپنی متعلقہ شرائط کے ساتھ بالاتفاق فرض ہے، اور اس کی فرضیت قرآن وسنت اور اجماعِ امت سے ثابت ہے۔

برخلاف نمازِ عید کے، کہ اس کے فرض علی الکفایۃ، واجب اور سنت ہونے کے مابین بھی فقہائے کرام ومجتہدینِ عظام کا اختلاف ہے، حنفیہ کے نزدیک عید کی نماز کا واجب ہونا، اگرچہ راجح ہے، لیکن ایک قول سنت ہونے کا بھی ہے۔

(2)......نمازِ جمعہ کے صحیح ہونے کے لئے بالاجماع جماعت، شرط ہے۔

برخلاف نمازِ عید کے، کہ اس کی صحت کے لئے نماز باجماعت ہونا متفق علیہ نہیں، اور جماعت کے لئے افراد کی مخصوص تعداد میں بھی فقہائے کرام کے مابین اختلاف ہے۔

(3)......نمازِ جمعہ کے لئے اذان واقامت مشروع ومسنون ہے۔

برخلاف نمازِ عید کے، کہ اس کے لئے نہ اذان مشروع ہے، اور نہ اقامت مسنون ہے۔

(4)......نمازِ جمعہ کے لئے خطبہ ضروری ہے، اور نماز سے مقدم ہے، جس کے بغیر نمازِ جمعہ کی ادائیگی وصحت درست ومعتبر قرار نہیں پاتی۔

برخلاف نمازِ عید کے، کہ اس میں خطبہ سنت ہے، اور **عندالجمھور** نمازِ عید سے مؤخر ہے، اور اس کے بغیر نمازِ عید کی ادائیگی وصحت درست ومعتبر قرار پاجاتی ہے، بلکہ بعض فقہائے کرام کے نزدیک مخصوص صورتوں میں خطبہ کی ضرورت وسنت بھی برقرار نہیں رہتی۔

(5)......نمازِ جمعہ کی شرائطِ صحت وشرائطِ وجوب **عندالحنفیۃ علی التعیین** منصوص ہیں، جبکہ نمازِ عید، بلکہ تکبیرِ تشریق کی اکثر شرائط کو جمعہ پر قیاس کیا گیا ہے، اور بعض شرائط میں کسی قدر اختلاف بھی رونما ہوا ہے۔

نیز جمعہ اور اُس کے بعد نمازِ عید کے لئے اِذنِ سلطان و اِذنِ عام اور مصر وغیرہ کی شرائط صرف عند الحنفیہ معتبر ہیں۔

غیر حنفیہ ان میں سے کسی کو نہ جمعہ کے لئے شرط قرار دیتے، اور نہ عید کے لئے۔

(6)...... وقت گزرنے کے بعد جمعہ کی بالاتفاق قضاء نہیں، اور اس کے بجائے نمازِ ظہر کا حکم ہے۔

برخلاف نمازِ عید کے، کہ اس کی قضاء کے وجوب وعدمِ وجوب اور سنت ومستحب ہونے وغیرہ میں بھی اختلاف ہے، یہاں تک کہ اگلے اور تیسرے دن تک بھی قضاء کا قول موجود ہے، جس کو بعض حضرات نے اداء کا بھی نام دے دیا ہے۔

(7)......عیدین میں اضافی تکبیرات ہیں، جبکہ جمعہ میں نہیں ہیں۔

مذکورہ تمہید کو ذہن میں رکھ کر اب مسئلہ ھٰذا کی کچھ تفصیل ملاحظہ فرمائیں۔

(فصل نمبر 1)

احادیث وروایات اور آثار

پہلے مرحلہ میں چند احادیث وروایات اور آثار ذکر کیے جاتے ہیں۔

عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کی حدیث

حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: يَوْمُ عَرَفَةَ، وَيَوْمُ النَّحْرِ، وَأَيَّامُ التَّشْرِيْقِ عِيْدُنَا أَهْلَ الْإِسْلَامِ، وَهِيَ أَيَّامُ أَكْلٍ وَشُرْبٍ (سنن ابی داؤد، رقم الحديث ۲۴۱۹، كتاب الصوم، باب صيام أيام التشريق) [1]

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عرفہ، اور قربانی کے دن، اور ایامِ تشریق، ہمارے اہلِ اسلام کی عید ہے، اور یہ (اہلِ اسلام کے لیے) کھانے اور پینے کے ایام ہیں (سنن ابی داؤد)

اسلام میں عید وتہوار کے اعتبار سے، جو درجہ ''عید الاضحیٰ'' کا ہے، وہی ''عید الفطر'' کے دن کا بھی ہے۔

مذکورہ حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایامِ عید کو، تمام اہلِ اسلام کی عید قرار دیا، اور اس کی نسبت، تمام اہلِ اسلام کی طرف فرمائی، جس سے معلوم ہوا کہ عید کے یہ ایام، تمام مسلمانوں کے حق میں عید کے شمار ہوتے ہیں، جس میں تمام اہلِ اسلام، مرد وعورت داخل ہیں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں خواتین بھی عید کی نماز میں آ کر شریک ہوا کرتی تھیں، جس کا

---

[1] قال شعيب الارنؤوط:
اسناده صحيح (حاشية سنن ابی داؤد)

احادیث میں ذکر آیا ہے۔

اور اسی وجہ سے فقہائے کرام نے عید کے دن بہت سے احکام میں مرد حضرات کے ساتھ، خواتین وغیرہ کو بھی شامل کیا ہے، اگرچہ دونوں کے احکام میں کچھ فرق بھی ہے، اور جمہور فقہائے کرام ومحدثینِ عظام نے مسافر، مریض اور منفرد، نیز دیہاتی کے لیے بھی نمازِ عید کو مشروع قرار دیا ہے، جس کی بعض روایات وآثار سے بھی تائید ہوتی ہے۔

محدثینِ عظام وفقہائے کرام کے حوالہ جات سے اس کی تفصیل آگے آتی ہے۔

براء بن عازب رضی اللہ عنہ کی حدیث

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَّهُ قَالَ فِيْ يَوْمِ عِيْدٍ: أَوَّلُ مَا نَبْدَأُ يَوْمَنَا هٰذَا أَنْ نُصَلِّيَ، ثُمَّ نَنْحَرَ، فَمَنْ فَعَلَ ذٰلِکَ، فَقَدْ أَصَابَ سُنَّتَنَا، وَمَنْ تَعَجَّلَ، فَإِنَّمَا هُوَ لَحْمٌ قَدَّمَهُ لِأَهْلِهِ (صحيح ابن حبان، رقم الحديث ٥٩٠٦، كتاب الأضحية)[1]

ترجمہ: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عیدُ الاضحیٰ کے دن فرمایا کہ اس دن ہم پہلا کام نماز پڑھنے کا کریں گے، پھر اس کے بعد قربانی کریں گے، پس جس نے یہ عمل کیا، تو اس نے ہماری سنت کو پالیا، اور جس نے قربانی کو پہلے کر دیا، تو وہ گوشت ہے، جس کو اس نے اپنے گھر والوں کو کھانے کے لئے پہلے تیار کر دیا (ابنِ حبان)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ عیدین کے موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سنت کے مطابق عمل کرنے والے کو مصیب قرار دیا ہے۔

اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قول، یا فعل سے نمازِ عید کے متعلق جو حکم ثابت ہو، اس کے مطابق

---

[1] قال شعيب الارنؤوط:
إسناده صحيح على شرط الشيخين (حاشيه صحيح ابن حبان)

عمل کرنا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے مطابق ''صواب'' ہوگا۔

اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قول وفعل سے عید کے اپنے وقت سے مؤخر ہونے کی بعض صورتوں میں نمازِ عید کا اداء کرنا بھی ثابت ہے، وہ بھی مذکورہ حدیث کا مصداق ہوگا، جیسا کہ آگے آتا ہے۔

ابوعُمیر بن انس کی حدیث

حضرت ابوعمیر بن انس، رسولُ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابۂ کرام میں سے اپنے بعض چچا سے روایت کرتے ہیں کہ:

أَنَّ رَكْبًا جَاءُوْا إِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَشْهَدُوْنَ أَنَّهُمْ رَأَوُا الْهِلَالَ بِالْأَمْسِ، فَأَمَرَهُمْ أَنْ يُفْطِرُوْا، وَإِذَا أَصْبَحُوْا أَنْ يَغْدُوْا إِلٰى مُصَلَّاهُمْ (سنن أبى داود، رقم الحديث ١١٥٧، كتاب الصلاة ، باب إذا لم يخرج الإمام للعيد من يومه يخرج من الغد) [1]

---

[1] قال شعيب الارنؤوط:

إسناده صحيح .وقد صحح إسناده البيهقي 316 /3، وابنُ حزم 92 /5، وقال ابن المنذر فی "الأوسط :295 /4 "حديث ثابت، وقال الخطابی فی "معالم السنن " حديث صحيح، وكذلک قال ابن الملقن فی "البدر المنير 95 /5 "، وحسن إسناده الدارقطنی .(2203)وأخرجه ابن ماجه 1653))، والنسائی فی "الكبرى "(1768) من طريقين عن أبی بشر جعفر بن أبی وحشية، به.

وهو فی "مسند أحمد "(20579)، و"صحيح ابن حبان.(3456) "

قال الخطابی :وإلى هذا ذهب الأوزاعی وسفيان الثوری وأحمد بن حنبل وإسحاق فی الرجل لا يعلم بيوم الفطر إلا بعد الزوال.

وقال الشافعی :إن علموا بذلک قبل الزوال خرجوا وصلى الإمام بهم صلاة العيد، وإن لم يعلموا إلا بعد الزوال لم يصلوا يومهم ولا من الغد، لأنه عمل فی وقت إذا جاز ذلک الوقت لم يعمل فی غيره، وكذلک قال مالک وأبو ثور.

قلت (القائل الخطابی) :سنة رسول الله -صلَّى الله عليه وسلم -أولى وحديث أبی عمير صحيح فالمصير إليه واجب (حاشية سنن ابی داوٗد)

ترجمہ: کچھ سوار نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے، جنہوں نے یہ گواہی دی کہ انہوں نے گزشتہ رات (عیدُ الفطر کا) چاند دیکھ لیا تھا، تو انہیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے روزہ توڑنے کا حکم فرمایا، اور یہ حکم بھی فرمایا کہ اگلے دن (یعنی 2 شوال کو) صبح وہ عیدگاہ جائیں (ابوداؤد)

اور ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ مجھ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض انصار صحابہ نے، جو کہ میرے چچا تھے، یہ حدیث بیان کی کہ:

غُمَّ عَلَيْنَا هِلَالُ شَوَّالٍ، فَأَصْبَحْنَا صِيَامًا، فَجَاءَ رَكْبٌ مِنْ آخِرِ النَّهَارِ، فَشَهِدُوْا عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، أَنَّهُمْ رَأَوُا الْهِلَالَ بِالْأَمْسِ، فَأَمَرَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ النَّاسَ أَنْ يُّفْطِرُوْا مِنْ يَوْمِهِمْ، وَأَنْ يَخْرُجُوْا لِعِيْدِهِمْ مِنَ الْغَدِ (مسند أحمد، رقم الحديث ٢٠٥٨٤) [1]

ترجمہ: ہم پر شوال کا چاند اَبر آلود ہوگیا، تو ہم نے صبح کو روزہ رکھا، تو دن کے آخری حصہ میں کچھ سواروں نے آ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس یہ گواہی دی کہ انہوں نے گزشتہ رات (عیدُ الفطر کا) چاند دیکھ لیا تھا۔

تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو روزہ توڑنے کا حکم فرمایا۔

اور یہ حکم بھی فرمایا کہ اگلے دن (یعنی 2 شوال) صبح کو وہ اپنی عید کی نماز پڑھنے کے لئے نکلیں (مسند احمد)

---

[1] قال شعيب الارنؤوط:
إسناده جيد، رجاله ثقات رجال الشيخين غير أبي عمير بن أنس.
وقد سلف الكلام عليه عند الحديث 20579
وأخرجه عبد الرزاق 7339، وابن أبي شيبة 3/67 و14/88، وابن ماجه 1653، والبيهقي 3/316 من طريق هشيم بن بشير، بهذا الإسناد.
وانظر 2057 (حاشية مسند احمد)

اس حدیث کو امام نسائی نے بھی اپنی سُنن میں روایت کیا ہے۔ [1]

قتادۃ کی حدیث

حضرت قتادہ سے روایت ہے کہ:

عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ أَنَّ عُمُومَةً لَّهُ شَهِدُوا عِنْدَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلٰى رُؤْيَةِ الْهِلَالِ، فَأَمَرَهُمُ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنْ يَّخْرُجُوا لِعِيْدِهِمْ مِنَ الْغَدِ (صحيح ابن حبان، رقم الحديث ٣٤٥٦، كتاب الصوم، باب رؤية الهلال) [2]

---

[1] أخبرنا عمرو بن على، قال: حدثنا يحيى، قال: حدثنا شعبة، قال: حدثنا أبو بشر، عن أبى عمير بن أنس، عن عمومة له، أن قوما رأوا الهلال، فأتوا النبى صلى الله عليه وسلم فأمرهم أن يفطروا بعد ما ارتفع النهار، وأن يخرجوا إلى العيد من الغد(سنن النسائى، رقم الحديث ١٥٥٧)

[2] قال شعيب الارنؤوط: حديث صحيح، رجاله ثقات رجال الشيخين .وأخرجه البزار "972"، البيهقى 4/249من طريق يعقوب بن إبراهيم، بهذا الإسناد.

وقال البزار :أخطأ فيه سعيد بن عامر، وإنما رواه شعبة عن أبى بشر عن أبى عمير بن أنس "وهو أكبر أولاد أنس "أن عمومة له شهدوا عند النبى صلى الله عليه وسلم.

وقال البيهقى :تفرد به سعيد بن عامر عن شعبة، وغلط فيه، إنما رواه شعبة عن أبى بشر.

وأخرجه على بن الجعد "1787"وأبو داود "1157"فى الصلاة :باب إذا لم يخرج الإمام للعيد من يومه يخرج من الغد، والبيهقى 4/50والدارقطنى 2/170من طريق شعبة وعبد الرزاق "7339"، وابن أبى شيبة 3/67، وابن ماجه "1653"فى الصيام :باب ما جاء فى الشهادة على رؤية الهلال، من طريق هشيم بن بشير، والبيهقى 4/249من طريق أبى عوانة، ثلاثتهم عن أبى بشر جعفر بن أبى وحشية، عن أبى عمير عبد الله بن أنس بن مالك، عن عمومة له من أصحاب النبى صلى الله عليه وسلم.

قلت :وهذا سند قوى، رجاله رجال الشيخين غير أبى عمير بن أنس بن مالك، فقد روى له أصحاب السنن غير الترمذى وهو ثقة صحح حديثه غير واحد، وقال ابن سعد :كان ثقة قليل الحديث، وذكره المؤلف فى "الثقات"، وانفرد ابن عبد البر بتجهيله، ولم يتابع.

وقال البيهقى :هو إسناد حسن، وأبو عمير رواه عن عمومة له من أصحاب النبى صلى الله عليه وسلم، وأصحاب النبى صلى الله عليه وسلم كلهم ثقات، فسواء سموا أو لم يسموا (حاشية ابن حبان)

ترجمہ: انس بن مالک رضی اللہ عنہ کے چچا نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس یہ گواہی دی کہ انہوں نے گزشتہ رات (عیدُ الفطر کا) چاند دیکھ لیا تھا، تو انہیں رسولُ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اگلے دن صبح کو (یعنی 2 شوال کے دن) اپنی عید کی نماز پڑھنے کے لئے نکلنے کا حکم فرمایا (ابن حبان)

ربُعی بن حِراش کی حدیث

حضرت ربعی بن حراش، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض صحابہؓ کرام سے روایت کرتے ہیں کہ:

اِخْتَلَفَ النَّاسُ فِیْ آخِرِ یَوْمٍ مِّنْ رَمَضَانَ، فَقَدِمَ أَعْرَابِیَّانِ، فَشَهِدَا عِنْدَ النَّبِیِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ بِاللّٰهِ لَأَهَلَّا الْهِلَالَ أَمْسِ عَشِیَّةً، فَأَمَرَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ النَّاسَ أَنْ یُّفْطِرُوْا، زَادَ خَلَفٌ فِیْ حَدِیْثِهٖ، وَأَنْ یَّغْدُوْا إِلٰى مُصَلَّاهُمْ (سنن أبی داود، رقم الحدیث ۲۳۳۹، کتاب الصوم، باب شهادة رجلین علی رؤیة هلال شوال) [1]

---

[1] قال شعیب الارنؤوط: إسناده صحیح، وإبهام صحابیه لا یضر، لأن الصحابة کلهم عدول، قال الإمام البیهقی :وأصحاب النبی -صلَّى الله علیه وسلم -کلهم ثقات، سواء سموا أم لم یسموا . مسدَد :هو ابن مسرهد الأسَدی، وأبو عوانة :هو الوضاح بن عبد الله الیشکری، ومنصور :هو ابن المعتمر السُّلمی.

وأخرجه الدارقطنی فی "سننه "(2202)، والبیهقی فی "الکبری 248 /2 "من طریق أبی عوانة، بهذا الإسناد .وقال الدارقطنی :هذا إسناد حسن ثابت.

وأخرجه عبد الرزاق فی "مصنفه "(7335) و (7337)، وأحمد فی "مسنده"(18824) و (23069)، وابن الجارود (396)، والطبرانی فی "الکبیر /17 "(662)، والدارقطنی (2199) و (2200) و (2201)، والبیهقی 248 /4من طریق سفیان الثوری، والدارقطنی (2194) من طریق عَبیدة بن حُمید، کلاهما عن منصور، به وقال الدارقطنی من طریق عَبیدة :هذا صحیح.

وأخرجه الطبرانی /17(663)، والحاکم 297 /1، والبیهقی 248 /4من طریق إسحاق بن إسماعیل الطالقانی، عن سفیان بن عیینة، عن منصور، عن ربعی بن حراش، عن أبی مسعود ...فذکر الحدیث.

وانظر تمام تخریجه فی "مسند أحمد(18824) "(حاشیة ابو داؤد)

ترجمہ: رمضان کے آخری دن میں لوگوں کا اختلاف ہوگیا، تو دو دیہاتیوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آ کر گواہی دی کہ انہوں نے گزشتہ رات (عیدُ الفطر کا) چاند دیکھ لیا تھا، تو رسولُ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو روزہ توڑنے کا حکم دیا، اور خلف (نام کے راوی) نے اپنی حدیث میں یہ بھی زیادہ روایت کیا کہ اگلے دن صبح کو عیدگاہ جانے کا بھی حکم فرمایا (ابوداؤد)

مذکورہ روایات سے معلوم ہوا کہ نمازِ عید کا اصل وقت گزرنے کے بعد اس کو بعد میں پڑھنے کا فی الجملہ ثبوت ہے، خواہ اس کو اداء کا نام دیا جائے، یا قضاء کا۔

اور وقت کے اندر نمازِ عید کی ادائیگی کی اہمیت، وقت گزرنے کے بعد سے زیادہ ہے، جس کا جمہور فقہائے کرام نے پورا لحاظ فرمایا ہے، یہاں تک کہ اگر مثلاً تیسویں دن روزہ رکھنے کے بعد، زوالِ شمس سے پہلے اُس دن کا یومِ عید ہونا معلوم ہوجائے، اور نمازِ عید کے لئے اجتماع ممکن ہو، تو اگلے دن کے بجائے اُسی دن نمازِ عید پڑھنے کا حکم ہے، جیسا کہ آگے آتا ہے۔

ابنِ عمر رضی اللہ عنہ کی روایت

حضرت حفص نے، حجاج سے اور انہوں نے زہری سے روایت کیا ہے کہ:

شُهِدَ عِنْدَ ابْنِ عُمَرَ أَنَّهُمْ رَأَوُا الْهِلَالَ ، فَقَالَ: أُخْرُجُوْا إِلٰى عِيْدِكُمْ مِنَ الْغَدِ ، وَقَدْ مَضٰى مِنَ النَّهَارِ مَا شَاءَ اللّٰهُ (مُصنف ابن أبی شيبة، رقم الرواية ٩٥٥٦، كتاب الصوم، باب فی القوم يشهدون علی رؤية الهلال أنهم رأوه فی اليوم الماضی ، ما يصنع ؟)

ترجمہ: حضرت ابنِ عمر رضی اللہ عنہ کے پاس لوگوں کی طرف سے چاند دیکھنے کی گواہی دی گئی، تو انہوں نے فرمایا کہ تم اگلے دن اپنی عید کی نماز کے لئے نکلو، اور اس وقت دن کا جتنا اللہ نے چاہا، وقت گزر چکا تھا (ابن ابی شیبہ)

مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کی روایت

ابنِ نمیر نے ابویعفور سے، اور انہوں نے اپنے والد سے روایت کیا ہے کہ:

رُئِیَ هِلَالُ رَمَضَانَ وَالْمُغِیرَةُ بْنُ شُعْبَةَ عَلَى الْكُوفَةِ ، فَلَمْ يَخْرُجْ حَتّٰى كَانَ مِنَ الْغَدِ ، فَخَرَجَ فَخَطَبَ النَّاسَ عَلٰى بَعِيرٍ ، ثُمَّ انْصَرَفَ

(مُصنف ابن أبی شیبة، رقم الروایة ۹۵۵۵، کتاب الصیام، باب فی القوم یشهدون علی رؤیة الهلال أنهم رأوه فی الیوم الماضی ، ما یصنع ؟)

ترجمہ: رمضان کا چاند دیکھا جا چکا تھا، اور مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کوفہ میں تھے، تو وہ اگلے دن ہی نکلے، پھر (نمازِ عید کے بعد) لوگوں کو اپنے اونٹ پر بیٹھ کر خطبہ دیا، اور پھر واپس تشریف لائے (ابن ابی شیبہ)

ابراہیم نخعی کی روایت

امام محمد نے، امام ابوحنیفہ سے، اور انہوں نے حماد سے روایت کیا ہے کہ:

عَنْ إِبْرَاهِيمَ فِيْ قَوْمٍ شَهِدُوْا أَنَّهُمْ رَأَوْا هِلَالَ شَوَّالٍ فَقَالَ حَمَّادٌ: سَأَلْتُ إِبْرَاهِيمَ عَنْ ذٰلِكَ، فَقَالَ: إِنْ جَاءُوْا صَدْرَ النَّهَارِ فَلْيُفْطِرُوْا وَلْيَخْرُجُوْا، وَإِنْ جَاءُوْا آخِرَ النَّهَارِ، فَلَا يَخْرُجُوْا وَلَا يُفْطِرُوْا حَتَّى الْغَدِ ،قَالَ مُحَمَّدٌ: وَبِهٖ نَأْخُذُ، إِلَّا فِيْ خَصْلَةٍ وَّاحِدَةٍ، يُفْطِرُوْنَ وَيَخْرُجُوْنَ مِنَ الْغَدِ إِذَا جَاءُوْا مِنَ الْعَشِيِّ ،وَهُوَ قَوْلُ أَبِيْ حَنِيْفَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ (کتابُ الآثار لمحمد بن الحسن، رقم الروایة ۲۰۵، باب خروج النساء فی العیدین ورؤیة الهلال)

ترجمہ: حضرت ابراہیم نخعی نے ان لوگوں کے بارے میں، جنہوں نے شوال کا چاند دیکھنے کی گواہی دی، یہ فرمایا کہ اگر وہ لوگ دن کے شروع حصہ میں گواہی

دیں، تو لوگوں کو چاہئے کہ روزہ توڑ دیں، اور عید کی نماز کے لئے نکلیں، اور اگر وہ دن کے آخری حصہ میں گواہی دیں، تو وہ نہ نکلیں، اور روزہ نہ توڑیں، اگلے دن تک۔

امام محمد نے فرمایا کہ ہم اسی کو لیتے ہیں، مگر ایک خصلت میں نہیں لیتے، اور ہم یہ کہتے ہیں کہ وہ روزہ توڑ دیں گے، اور اگلے دن عید کی نماز کے لئے نکلیں گے، جبکہ شام کے وقت میں گواہی حاصل ہو، امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا بھی یہی قول ہے

(کتاب الآثار)

امام محمد بن حسن شیبانی کی روایت

امام محمد نے ''کتابُ الحجة علٰی أهل المدينة'' میں فرمایا کہ:

قال ابو حنيفة رضى الله عنه اذا صام الناس يوم الفطر وهم يظنون انه من شهر رمضان فجائهم ثبت بان هلال شهر رمضان قد رؤى قبل ان يصوموا بيوم وان يومهم ذلک احد وثلاثون فانهم يفطرون ذلک اليوم اية ساعة جائهم الخبر فان كان الخبر جائهم قبل زوال الشمس افطروا وخرج بهم امامهم فيصلى بهم العيد وان جائهم الخبر بعد زوال الشمس افطروا وخرجوا من الغد.

وقال اهل المدينة بقول ابى حنيفة من الفطر غير انهم قالوا لا يصلون صلاة العيد ان جائهم ذلک بعد الزوال.

وقال محمد بن الحسن قد جاء فى هذا يعينه اثر عن رسول الله صلى الله عليه وسلم روته الثقات ان شهودا اتوا رسول الله صلى

اللہ علیہ وسلم عشیة فأخبروہ انھم رأوا الھلال بالامس فأمر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الناس ان یفطروا وان یخرجوا من الغد لعیدھم .

اخبرنا بذلک شعبة بن الحجاج عن ابی بشر جعفر بن ایاس عن ابی عمیر ابن انس بن مالک عن عمومة لہ من اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان رھطا شھدوا عند النبی صلی اللہ علیہ وسلم من اخر النھار انھم رأوا الھلال بالامس فأمر الناس ان یفطروا وقال اغدوا غدا إلی المصلی (الحجة علی أھل المدینة،لمحمد بن الحسن بن فرقد الشیبانی، ج ۱ ص۳۷۷،۳۷۸، کتاب الصّیام،باب الرجل یصوم یوم الفطر وھو یظن انہ من شھر رمضان)

ترجمہ: امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے فرمایا کہ جب لوگ عیدُ الفطر کے دن روزہ رکھ لیں، اور وہ یہ گمان کریں کہ وہ رمضان کا مہینہ ہے، پھر ان کے پاس معتبر گواہوں سے یہ بات ثابت ہوجائے، کہ رمضان کے مہینہ کا چاند پہلے دیکھ لیا گیا تھا، اور انہوں نے ایک دن کا اضافی روزہ رکھ لیا ہے، اور ان کا یہ دن اکتیسواں ہے، تو وہ اس دن، اُسی وقت روزہ توڑ دیں گے، جب ان کو یہ خبر ملے۔

پھر اگر ان کو زوالِ شمس سے پہلے خبر ملی، تو وہ روزہ توڑ دیں گے، اور ان کا امام اُن کے ساتھ جا کر عید کی نماز پڑھائے گا، اور اگر ان کے پاس زوالِ شمس کے بعد خبر آئی، تو وہ روزہ توڑ دیں گے، اور اگلے دن عید کی نماز کے لئے نکلیں گے۔

اور اہلِ مدینہ کا قول بھی روزہ توڑنے کے متعلق امام ابوحنیفہ کے قول کے مطابق ہے، لیکن اُن کا کہنا یہ ہے کہ اگر اُن کے پاس زوال کے بعد خبر پہنچی، تو وہ عید کی نماز نہیں پڑھیں گے۔

امام محمد بن حسن نے فرمایا کہ اس کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بعینہٖ حدیث آئی ہے، جو اس مسئلہ کو تقویت دیتی ہے، جس کو ثقات نے روایت کیا ہے، کہ کچھ لوگوں نے شام کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آ کر یہ گواہی دی، کہ انہوں نے کل چاند دیکھ لیا تھا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو روزہ توڑنے، اور اگلے دن عید کی نماز کے لئے نکلنے کا حکم فرمایا۔

ہمیں اس کی شعبہ بن حجاج نے خبر دی، ابو بشر جعفر بن ایاس کے حوالہ سے، انہوں نے ابو عمیر بن انس بن مالک کے حوالہ سے، انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابۂ کرام میں سے اپنے چچا کے حوالہ سے، کہ ایک وفد نے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس دن کے آخری حصہ میں آ کر یہ گواہی دی، کہ انہوں نے کل چاند دیکھ لیا تھا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو روزہ توڑنے کا حکم فرمایا، اور اگلے دن صبح عیدگاہ جانے کا حکم فرمایا (الحجۃ علی اہل المدینۃ)

مذکورہ احادیث اور روایات سے معلوم ہوا کہ اگر کسی عذر کی وجہ سے عیدُ الفطر کے دن عید کی نماز نہ پڑھی جاسکے، تو اگلے دن صبح کے وقت عید کی نماز پڑھی جائے گی، امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا بھی یہی قول ہے۔

اور اس قسم کی احادیث و روایات سے نمازِ عید کا فی الجملہ قضاء کرنا ثابت ہوتا ہے۔

البتہ امام طحاوی رحمہ اللہ نے شرح معانی الآ ثار میں ابو عمیر بن انس کی حدیث میں دو توجیہات کا احتمال ظاہر کیا ہے، ایک یہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عیدگاہ میں جانے کا حکم فرمانے سے مقصود عید کی نماز ہو، اور دوسرے یہ کہ نماز کے بجائے، دعاء کا حکم مقصود ہو، جیسا کہ بعض روایات میں حائضہ خواتین کو اسی غرض سے حاضر ہونے کا ذکر ہے، اور پھر فرمایا کہ:

’’بظاہر یہی دعاء مراد ہونے کا قول راجح ہے، اور امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا جو بعض لوگوں نے روایت کیا ہے، یہی قول ہے، اور ہم نے امام ابو یوسف کی، امام

ابوحنیفہ سے مروی روایت میں اس کو نہیں پایا“۔ ل

اور علامہ بدرُ الدین عینی نے ”نخب الافکار فی تنقیح مبانی الاخبار “میں فرمایا کہ:

ل حدثنا فهد ,قال :ثنا عبد الله بن صالح ,قال :ثنا هشيم بن بشير ,عن أبى بشر جعفر بن إياس ,عن أبى عمير بن أنس بن مالك ,قال :أخبرنى عمومتى من الأنصار :أن الهلال خفى على الناس فى آخر ليلة من شهر رمضان فى زمن النبى صلى الله عليه وسلم فأصبحوا صياما فشهدوا عند النبى صلى الله عليه وسلم بعد زوال الشمس ,أنهم رأوا الهلال الليلة الماضية .فأمر رسول الله صلى الله عليه وسلم الناس بالفطر ,فأفطروا تلك الساعة ,وخرج بهم من الغد ,فصلى بهم صلاة العيد قال أبو جعفر :فذهب قوم إلى هذا فقالوا :إذا فات الناس صلاة العيد فى صدر يوم العيد ,صلوها من غد ذلك اليوم ,فى الوقت الذى يصلونها .وممن ذهب إلى ذلك ,أبو يوسف .وخالفهم فى ذلك آخرون ,فقالوا :إذا فاتت الصلاة يوم العيد ,حتى زالت الشمس من يومه ,لم يصل بعد ذلك فى ذلك اليوم ,ولا فيما بعده .وممن قال ذلك ,أبو حنيفة رحمه الله تعالى .وكان من الحجة لهم فى ذلك ,أن الحفاظ ممن روى هذا الحديث ,عن هشيم ,لا يذكرون فيه أنه صلى بهم من الغد .فممن روى ذلك عن هشيم ولم يذكر فيه هذا ,يحيى بن حسان ,وسعيد بن منصور ,وهو أضبط الناس لألفاظ هشيم ,وهو الذى ميز للناس ما كان هشيم يدلس به من غيره.

حدثنا صالح بن عبد الرحمن، قال :ثنا سعيد بن منصور، قال :ثنا هشيم، قال :أنا أبو بشر، عن أبى عمير بن أنس، قال :أخبرنى عمومتى، من الأنصار من أصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم قالوا :أغمى علينا هلال شوال فأصبحنا صياما ,فجاء ركب من آخر النهار فشهدوا عند رسول الله صلى الله عليه وسلم أنهم رأوا الهلال بالأمس .فأمرهم رسول الله صلى الله عليه وسلم أن يفطروا من يومهم ,ثم ليخرجوا لعيدهم من الغد إلى مصلاهم.

حدثنا سليمان بن شعيب، قال :ثنا يحيى بن حسان، قال :ثنا هشيم، عن أبى بشر، فذكر بإسناده مثله فهذا هو أصل هذا الحديث ,لا كما رواه عبد الله بن صالح ,وأمره إياهم بالخروج من الغد لعيدهم ,قد يجوز أن يكون أراد بذلك أن يجتمعوا فيه ليدعوا ,أو ليرى كثرتهم ,فيتناهى ذلك إلى عدوهم فتعظم أمورهم عنده ,لا لأن يصلوا كما يصلى للعيد وقد رأينا المصلى فى يوم العيد قد كان أمر بحضور من لا يصلى.

حدثنا صالح، قال :ثنا سعيد، قال :أنا هشيم، قال :أنا منصور، عن ابن سيرين، عن أم عطية، وهشام، عن حفصة، عن أم عطية، رضى الله عنها قالت :كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يخرج الحيض وذوات الخدور يوم العيد فأما الحيض فيعتزلن ويشهدن الخير ,ودعوة المسلمين وقال هشيم: فقالت امرأة :يا رسول الله ,فإن لم يكن لإحدانا جلباب؟ قال :فلتعرها أختها جلبابها فلما كان الحيض يخرجن لا للصلاة ,ولكن لأن يصيبهن دعوة المسلمين ,احتمل أن يكون النبى صلى الله عليه وسلم أمر الناس بالخروج من غد العيد لأن يجتمعوا فيدعون ,فيصيبهم دعوتهم ,لا للصلاة. وقد روى هذا الحديث شعبة ,عن أبى بشر ,كما رواه سعيد ويحيى ,لا كما رواه عبد الله بن صالح. حدثنا ابن مرزوق، قال :ثنا وهب، قال :ثنا شعبة، عن أبى بشر، قال :سمعت أبا عمير بن أنس، رضى الله عنه ح ,

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

''امام طحاوی نے ''بعضُ النـاس '' کی قید اس لئے لگائی، کہ بعض حضرات نے اگلے دن قضاء کو روایت کیا ہے، اور اسی روایت سے حنفیہ کی کتب بھری ہوئی ہیں، لیکن امام طحاوی کے کلام سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ امام ابوحنیفہ کا مذہب، وہ ہے، جو انہوں نے شروع میں ذکر کیا، اسی لئے انہوں نے فرمایا کہ ہم نے اس کو امام ابو یوسف کی، امام ابوحنیفہ سے مروی روایت میں نہیں پایا''۔انتھٰی۔ [1]

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

وحدثنا ابن مرزوق، قال :ثنا أبو الوليد، قال :ثنـا شعبة، عن أبى بشر، فذكر مثله بإسناده ,غير أنه قال :وأمـرهـم إذا أصبـحوا أن يخرجوا إلى مصلاهم فمعنى ذلك أيضا معنى ما روى يحيى وسعيد عن هشيم ,وهذا هو أصل الحديث .ولـما لم يكن فى الحديث ,مـا يدل على حكم ما اختلفوا فيه من الصلاة فى الغد ,فـنظرنا فى ذلك فرأينا الصلوات على ضربين .فمنها ما الدهر كله لها وقت , غير الأوقات التى لا يصلى فيها الفريضة ,فكان ما فات منها فى وقته ,فالدهر كله لها وقت يقضى فيه ,غيـر مـا نهى عن قضائها فيه من الأوقات .ومـنهـا ما جعل له وقت خاص ,ولم يجعل لأحد أن يـصـليه فى غير ذلك الوقت .مـن ذلك الجمعة ,حـكـمهـا أن يـصلى يوم الجمعة من حين تزول الشـمس إلى أن يدخل وقت العصر ,فـإذا خـرج ذلك الوقت فاتت ولم يجز أن يصلى بعد ذلك فى يومها ذلك ,ولا فيـما بعده .فـكـان مـا لا يـقضى فى بقية يومه بعد فوات وقته ,لا يـقضى بعد ذلك .ومـا يـقـضى بعد فوات وقته فى بقية يومه ذلك ,قـضى من الغد ,وبعد ذلك ,وكل هذا مجمع عليه .وكانت صلاة العيد جعل لها وقت خاص ,فى يوم العيد ,آخره زوال الشمس ,وكل قـد أجـمع على أنها إذا لم تصل يومئذ حتى زالت الشمس أنها لا تصلى فى بقية يومها .فلما ثبت أن صلاة العيد ,لا تقضى بعد خروج وقتها فى يومها ذلك ,ثبت أنها لا تقضى بعد ذلك فى غد ولا غيره ,لأنا رأينا ما للذى فاته أن يقضيه من غد يومه جائز له أن يقضيه من بقية اليوم الذى وقته فيه وما ليس ,للذى فاته أن يقضيه من بقية يومه ذلك ,فليس له أن يقضيه من غده .فصلاة العيد كذلك , لـمـا ثبت أنها لا تقضى إذا فاتت فى بقية يومها ,ثبـت أنها لا تقضى فى غده .فهذا هو النظر فى هذا الباب ,وهـو قول أبى حنيفة رحمه الله تعالى ,فيما رواه عن بعض الناس ,ولم نجده فى رواية أبى يـوسف عنه ,هـكـذا كـان فـى رواية أحـمـد رحمهما الله تعالى(شرح معانى الآثار ج ۱، ص ۳۸۶، ۳۸۷، كتاب الصلاة، باب الإمام يفوته صلاة العيد هل يصليها من الغد أم لا؟)

[1] قوله" :وهو قول أبى حنيفة "أى وجه النظر المذكور هو قول أبى حنيفة "فيما روى عنه بعض الناس "قيـد بـه لأن مـنهـم مـن روى أنهـا تقضى من الغد، وعلى هذه الرواية شحنت كتب الحنفية ولكن الذى يفهم من كلام الطحاوى أن مذهب أبى حنيفة هو ما ذكره أولا فلذلك قال :ولم نجده فـى رواية أبـى يـوسف عـنه(نخب الأفكار فى تنقيح مبانى الأخبار فى شرح معانى الآثار، لبدر الدين العينى، ج۶،ص ۱۶۵، كتاب الصلاة ،باب :الإمام تفوته صلاة العيد هل يصليها من الغد أم لا؟)

اور ہم امام محمد کے حوالہ سے، امام ابوحنیفہ کا قول ذکر کرچکے ہیں، جس میں امام ابوحنیفہ کی روایت اور صراحت بھی شامل ہے، اس لئے اگلے دن نمازِ عید کے متعلق امام ابوحنیفہ کی یہ تصریح ہی راجح ہے، اور اس کے مقابلہ میں امام طحاوی کا قول راجح نہیں، کیونکہ انہوں نے اس کے متعلق لاعلمی کا اظہار کیا ہے، وہ بھی امام ابویوسف کی روایت میں، اور لاعلمی سے کسی چیز کی نفی لازم نہیں آتی، اور امام محمد کی روایت کے موجود ہوتے ہوئے امام ابویوسف کی روایت کی بھی ضرورت نہیں۔

نیز بعض مرفوع احادیث میں اگلے دن نمازِ عید کے پڑھنے کی صاف طور پر تصریح ہے، جس کو محض دعاء وغیرہ پر محمول کرنا، بظاہر مشکل ہے، اسی وجہ سے جملہ فقہائے کرام نے، اس سے دعاء کے بجائے نمازِ عید کو مراد لیا ہے۔

اور مذکورہ احادیث وروایات سے یہ بات بھی معلوم ہوگئی کہ عید کی نماز کو، جمعہ کی نماز کا درجہ حاصل نہیں، کیونکہ وقت گزرنے کے بعد نمازِ جمعہ کا حکم نہیں رہتا، جبکہ بعض صورتوں میں عید کی نماز کو اگلے دن تک، اور عیدُ الاضحیٰ کی نماز کو اس سے بھی اگلے دن تک پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے۔

مقدام بن معدی کرب رضی اللہ عنہ کی روایت

ابوطرفہ حمصی سے روایت ہے کہ:

أَتَيْتُ الْمِقْدَامَ بْنَ مَعْدِىْ كَرِبَ وَهُوَ فِىْ قُرَيَةٍ عَلٰى أَمْيَالٍ مِنْ حِمْصَ يَوْمَ عِيْدٍ فَقُلْنَا: اُخْرُجْ فَصَلِّ بِنَا الْعِيْدَ، فَقَالَ: لَا، صَلُّوْا فُرَادٰى (المعجم الكبير، للطبرانی، رقم الحديث ٦١٨، ج٢٠ ص ٢٦٢)

ترجمہ: میں مقدام بن معدی کرب رضی اللہ عنہ کے پاس حاضر ہوا، جو عید کے دن مقامِ حمص سے چند میل کے فاصلے پر ایک گاؤں میں تھے، تو ہم نے ان سے عرض کیا کہ آپ باہر نکل کر ہمیں عید کی نماز پڑھا دیں گے، تو انہوں نے جواب میں فرمایا کہ نہیں، بلکہ تم تنہاء عید کی نماز پڑھ لو (طبرانی)

اس روایت کو دولابی اور ابنِ ابی عاصم، نیز ابنِ عساکر نے بھی اپنی اسناد کے ساتھ روایت کیا ہے۔ [1]

اس روایت کو علامہ ہیثمی نے ’’مجمعُ الزوائد‘‘ میں ’’باب المنفرد يصلى العيد‘‘ کے باب میں طبرانی کے حوالہ سے نقل کیا ہے۔

اور فرمایا کہ مجھے ’’ابو طُرفة‘‘ راوی کا تعارف نہیں۔ [2]

لیکن علامہ ذہبی نے ’’تاريخُ الاسلام‘‘ میں ’’ابو طُرفة‘‘ کا نام ’’عبادبن ريان، ابوطرفة لخمى حمصى‘‘ بیان فرمایا ہے، اور اسی کے ساتھ یہ بھی فرمایا کہ انہوں نے مقدام بن معدی کرب رضی اللہ عنہ سے سماعت کی ہے، اور میرے علم میں ان کے متعلق کوئی

---

[1] حدثنا على بن سهل الرملى قال حدثنا الوليد بن مسلم، عن يحيى بن حمزة، عن أبى طرفة الحمصى قال :أتينا المقدام بن معد يكرب صاحب رسول الله صلى الله عليه وسلم وهو فى قرية من قرى حمص على أربعة أميال منها فى يوم عيد، فقلنا :اخرج فصل بنا ,فقال :لا ولكن صلوا فرادى(الكنى والأسماء ،للدولابى، رقم الحديث ١٢١٢ ، ج٢ص ٦٩٠)

حدثنا يحيى بن عثمان، نا الوليد بن مسلم، نا يحيى بن حمزة، نا أبو طرفة الحمصى، قال " :أتينا المقدام بن معدى كرب وهو فى قرية على أميال يوم عيد فقلنا :اخرج فصل بنا العيد قال :لا، صلوا فرادى(الآحاد والمثانى،لا بن أبى عاصم، رقم الحديث ٢٤٣٧، ج٤ص ٣٩٢)

عباد بن الريان أبو طرفة اللخمى الحمصى أدرك المقدام بن معدى كرب الكندى وحدث عن عروة بن رويم اللخمى ومكحول روى عنه الوليد بن مسلم وعبد الكريم بن محمد اللخمى من أهل بواء ويحيى بن حمزة القاضى ووفد على هشام بن عبد الملك وأراه سكن دمشق بأخرة.............

أنبأنا أبو على الحداد وجماعة قالوا أنا أبو بكر بن ريذة أنا سليمان بن أحمد بن أيوب نا بكر بن سهل نا عبد الله بن يوسف نا يحيى بن حمزة نا أبو طرفة عباد بن الريان اللخمى الحمصى قال أتيت المقدام بن معدى كرب وهو فى قرية على أميال من حمص يوم عيد فقلنا اخرج فصل بنا العيد فقال لا صلوا فرادى(تاريخ دمشق،لابن عساكر، ج٢٦،ص ٢٢٤ الىٰ ٢٢٧،ذكر من اسمه عباد ، تحت ترجمة:عباد بن الريان أبو طرفة اللخمى الحمصى)

[2] رواه الطبرانى فى الكبير وأبو طرفة لا أعرفه(مجمع الزوائد ومنبع الفوائد، ج٢، ص٢٠٥، تحت رقم الحديث ٣٢٥٢،باب المنفرد يصلى العيد)

جرح نہیں، اور یہ ان شاء اللہ تعالیٰ ''صالحُ الحدیث'' ہیں۔[1]

اس روایت سے معلوم ہوا کہ نمازِ عید کا تنہاء پڑھنا بھی جائز ہے، اگر نمازِ عید، بلا جماعت کی مشروعیت کو، غیر معقول اور خلافِ قیاس قرار دیا جائے، تو ایک صحابیِ رسول کا یہ فرمان، حدیثِ مرفوع کا درجہ رکھے گا، اور اس کے برخلاف قیاس واجتہاد کی زیادہ اہمیت نہ رہے گی، اور اس فرمان کی مخالفت کرنے والے، مجتہد کے متعلق، اس جیسی روایت نہ پہنچنے، جیسی تاویل کی جائے گی، اور اسے اجتہادی مخطی قرار دے کر عند اللہ معذور، بلکہ ایک اجر کا مستحق سمجھا جائے گا، یا پھر اس مجتہد کے قول میں کوئی دوسری مناسب تاویل کی جائے گی، لیکن اس روایت کی صریح مخالفت کو گوارا نہ کیا جائے گا، جیسا کہ آگے آتا ہے۔

امام بخاری کا حوالہ

امام بخاری نے اپنی ''صحیحُ البخاری'' میں فرمایا کہ:

بَابٌ: إِذَا فَاتَهُ الْعِيْدُ يُصَلِّيْ رَكْعَتَيْنِ، وَكَذٰلِكَ النِّسَاءُ، وَمَنْ كَانَ فِي الْبُيُوْتِ وَالْقُرٰى.

لِقَوْلِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: هٰذَا عِيْدُنَا أَهْلَ الْإِسْلَامِ وَأَمَرَ أَنَسُ بْنُ مَالِكٍ مَوْلَاهُمُ ابْنَ أَبِيْ عُتْبَةَ بِالزَّاوِيَةِ فَجَمَعَ أَهْلَهٗ وَبَنِيْهِ، وَصَلّٰى كَصَلَاةِ أَهْلِ الْمِصْرِ وَتَكْبِيْرِهِمْ.

وَقَالَ عِكْرِمَةُ: أَهْلُ السَّوَادِ يَجْتَمِعُوْنَ فِي الْعِيْدِ، يُصَلُّوْنَ رَكْعَتَيْنِ كَمَا يَصْنَعُ الْإِمَامُ .

---

[1] عباد بن الريان، أبو طرفة اللخمي الحمصي.

سمع :المقدام بن معدي كرب رضي الله عنه، ومكحولا، وعروة بن رويم.

وعنه :يحيى بن حمزة، والوليد بن مسلم، وعبد الكريم بن محمد اللخمي.

ما علمت فيه جرحا، فهو صالح الحديث إن شاء الله(تاريخ الإسلام،للذهبي،ج٣،ص٩٠٣، تحت رقم الترجمة ٢٤١،حرف العين)

وَقَالَ عَطَاءٌ :إِذَا فَاتَهُ العِيدُ صَلّٰى رَكْعَتَيْنِ (صحيح البخارى، أبواب العيدين)

ترجمہ: یہ باب ہے اس بات کا کہ جب نمازِ عید فوت ہو جائے، تو وہ (نمازِ عید کی) دو رکعت پڑھے، اور اسی طریقے سے عورتیں بھی عید کے دن دو رکعتیں پڑھیں، اور وہ لوگ بھی دو رکعتیں پڑھیں، جو گھروں میں ہوں، اور جو لوگ شہر کے بجائے گاؤں دیہات میں ہوں (وہ بھی پڑھیں)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کی وجہ سے کہ یہ ہماری، یعنی اہلِ اسلام کی عید ہے (نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عید کی نسبت سب مسلمانوں کی طرف فرمائی، جس میں عورتیں بھی داخل ہیں، اور وہ لوگ بھی، جو کسی وجہ سے عید کی نماز پڑھنے کے لیے، عیدگاہ، یا مسجد میں نہ آ سکیں)

اور حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے اپنے آزاد کردہ غلام ابنِ ابی عتبہ کو مقامِ ''زاویہ'' میں اپنے گھر والوں، اور اولاد کو جمع کرنے کا حکم فرمایا، اور ان کو شہر والوں کی طرح عید کی نماز پڑھائی، جس میں (نمازِ عید کی زائد) تکبیرات بھی کہیں۔

اور (حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ کے شاگرد) حضرت عکرمہ نے فرمایا کہ گاؤں والے بھی عید کے دن جمع ہو کر اسی طرح عید کی نماز پڑھیں گے، جس طرح شہر میں امام، نمازِ عید پڑھتا ہے۔

اور (جلیل القدر تابعی) حضرت عطاء نے فرمایا کہ جب کسی کی عید کی نماز فوت ہو جائے، تو وہ دو رکعات پڑھے گا (صحیح بخاری)

امام طحاوی کا حوالہ

امام طحاوی نے، حضرت انس رضی اللہ عنہ کے پوتے ''عبیداللہ بن ابی بکر بن انس'' سے

روایت کیا ہے کہ:

عَنْ جَدِّهٖ، أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: إِذَا كَانَ فِيْ مَنْزِلِهٖ بِالطَّفِّ ،فَلَمْ يَشْهَدِ الْعِيْدَ إِلٰى مِصْرِهٖ جَمَعَ مَوَالِيَهُ وَوَلَدَهُ ،ثُمَّ يَأْمُرُ مَوْلَاهُ عَبْدَ اللّٰهِ بْنَ أَبِيْ عُتْبَةَ فَيُصَلِّيْ بِهِمْ كَصَلَاةِ أَهْلِ الْمِصْرِ (شرح معانی الآثار، رقم الحديث ٧٢٨٩، كتاب الزيادات،باب صلاة العيدين كيف التكبير فيها)

ترجمہ: ان کے دادا حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ، جب مقامِ ''طف'' میں اپنے گھر پر ہوتے تھے، اور وہ عید کی نماز کے لیے شہر میں نہیں جاتے تھے، تو وہ اپنے غلاموں اور بیٹوں کو جمع کر کے، اپنے غلام عبداللہ بن ابی عتبہ کو حکم فرماتے تھے، جو اُن کو شہر والوں کی طرح عید کی نماز پڑھاتا تھا (شرح معانی الآ ثار)

امام بیہقی کا حوالہ

امام بیہقی رحمہ اللہ نے بھی حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کے اس واقعہ کو روایت کیا ہے، جس میں اس بات کی صراحت ہے کہ بعض اوقات حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ، اپنے گھر والوں کو عید کی نماز پڑھایا کرتے تھے۔ [1]

حضرت انس رضی اللہ عنہ کا شمار نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طویل عرصہ تک خدمت کرنے اور لمبی عمر

---

[1] أخبرنا أبو الحسن ابن أبى المعروف الفقيه وأبو الحسن ابن أبى سعيد الإسفرايينيان بها قالا: حدثنا أبو سهل بشر بن أحمد، حدثنا حمزة ابن محمد الكاتب، حدثنا نعيم بن حماد، حدثنا هشيم، عن عبيد الله بن أبى بكر بن أنس بن مالك خادم رسول الله –صلى الله عليه وسلم– قال: كان أنس إذا فاتته صلاة العيد مع الإمام جمع أهله فصلى بهم مثل صلاة الإمام فى العيد .

ويذكر عن أنس بن مالك أنه كان إذا كان بمنزله بالزاوية فلم يشهد العيد بالبصرة جمع مواليه وولده ثم يأمر مولاه عبد الله بن أبى عتبة فيصلى بهم كصلاة أهل المصر ركعتين ويكبر بهم كتكبيرهم(السنن الكبير،للبيهقى، ج٦،ص ٥٩٣، تحت رقم الحديث ٦٣٠٧، كتاب صلاة العيدين،باب صلاة العيدين سنة أهل الإسلام حيث كانوا)

پانے والے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی فہرست میں ہوتا ہے۔

ان کا اپنے گھر میں اہلِ خانہ کے ساتھ نمازِ عید کا ادا فرمانا اور اس کا حکم فرمانا، امتِ مسلمہ کے لئے موجودہ حالات میں راہِ عمل کی بڑی دلیل ہے۔

اور ظاہر ہے کہ گھر میں خواتین اور بچے بھی ہوتے ہیں، ایسی صورت میں ان کو بھی نمازِ عید میں شریک کرنے کے لئے کوئی ممانعت نہیں پائی جاتی۔

پس مذکورہ حدیث سے گھر میں باجماعت نمازِ عید اداء کرنا ثابت ہوا۔

پھر نمازِ عید کے گھروں میں ثابت نہ ہونے کے قول کے کیا معنیٰ؟

امام ابنِ ابی شیبہ کا حوالہ

اس کے علاوہ متعدد صحابہ وتابعین اور محدثین سے بھی عید کی نماز فوت ہوجانے، یا عید کی نماز سے رہ جانے کی صورت میں نماز پڑھنے کی روایات مروی ہیں۔

اور بعض آثار میں عید کی نماز کی قضاء کا بھی صاف طور پر ذکر ہے۔

مشہور محدث امام ابنِ ابی شیبہ نے اس طرح کی کئی روایات کو ذکر فرمایا ہے، البتہ ان میں سے بعض روایات، میں دو کے بجائے، چار رکعات پڑھنے کا ذکر ہے۔

چنانچہ ابنِ ابی شیبہ نے مندرجہ ذیل روایات کو ذکر فرمایا ہے:

> حضرت انس رضی اللہ عنہ کے بارے میں روایت ہے کہ وہ بعض اوقات عید کے دن اپنے گھر والوں اور خادموں کو جمع کرتے تھے، اور پھر ان کو عبداللہ بن ابی عتبہ، دو رکعتیں پڑھاتے تھے۔

> حضرت عطاء سے روایت ہے کہ جس کی نمازِ عید رہ جائے، وہ دو رکعتیں پڑھے گا، اور ان میں تکبیر بھی کہے گا۔

> حضرت حکم سے روایت ہے کہ ابوعیاض چھپے ہوئے تھے، تو ان کے پاس عید کے

دن حضرت مجاہد آئے، اور انہوں نے اُن کو دو رکعتیں پڑھائیں، اور دعاء کی۔
ابنِ حنفیہ سے روایت ہے کہ جس کی نمازِ عید رہ جائے، ایسا شخص دو رکعتیں پڑھے گا۔
حضرت حسن سے روایت ہے کہ وہ شخص امام کی طرح کی نماز پڑھے گا۔
اور حضرت حماد سے روایت ہے کہ ابراہیم نخعی نے فرمایا کہ جب تمہاری امام کے ساتھ نمازِ عید فوت ہوجائے، تو تم امام کی طرح سے ہی نماز پڑھو، اور ابراہیم نخعی نے فرمایا کہ جب لوگ عید کی نماز سے لوٹ جائیں، تو پھر مسجد کے کسی حصہ میں جاکر، امام کی طرح سے نماز پڑھ لے، اور جو شخص عیدگاہ نہ جائے، وہ بھی امام کی طرح کی نماز پڑھ لے۔
اور حضرت حماد نے فرمایا کہ جو شخص عید کے دن، عید کی نماز کو نہ پائے، تو اسے چاہئے کہ وہ امام کی طرح سے ہی نماز پڑھے، اور اس کی طرح ہی تکبیر کہے۔
حضرت شریک سے روایت ہے کہ میں نے ابواسحاق سے اس آدمی کے متعلق سوال کیا کہ جو شخص عید کے دن اس وقت پہنچے کہ جب امام، نمازِ عید سے فارغ ہوچکا ہو؟
تو انہوں نے فرمایا کہ وہ دو رکعتیں پڑھے گا۔
اور ابنِ عون سے روایت ہے کہ محمد بن سیرین نے اس شخص کے بارے میں فرمایا کہ جس کی نمازِ عید فوت ہوجائے، تو اس کے لئے امام کی طرح کی نماز پڑھنا مستحب ہے، اور اگر اسے یہ معلوم ہوجائے کہ امام نے کون سی قرائت کی تھی، تو وہ بھی یہی قرائت کرے گا (ابنِ ابی شیبہ) [1]

---

[1] حدثنا ابن علية ، عن يونس ، قال :حدثني بعض آل أنس ؛ أن أنسا كان ربما جمع أهله وحشمه يوم العيد ، فصلى بهم عبد الله بن أبي عتبة ركعتين.
حدثنا يحيى بن سعيد ، عن ابن جريج ، عن عطاء ، قال :يصلي ركعتين ويكبر.
حدثنا وكيع ، عن شعبة ، عن الحكم ، قال :كان أبو عياض مستخفيا ، قال :فجاء ه مجاهد يوم عيد ، فصلى به ركعتين ، ودعا.
﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

اور حضرت شعبی سے روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ وہ شخص چار رکعات پڑھے گا۔

اور حضرت مسروق سے روایت ہے کہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جس کی نمازِ عید فوت ہو جائے، تو اسے چاہئے کہ وہ چار رکعات پڑھے۔

اور حضرت شعبی سے بھی چار رکعات کی روایت مروی ہے۔

اور حضرت ضحاک سے مروی ہے کہ جس کو عیدُ الفطر، یا عیدُ الاضحیٰ کے دن نمازِ عید میں شرکت سے کوئی عذر ہو، تو اس کی نماز چار رکعتیں ہیں (ابنِ ابی شیبہ) [1]

اور حضرت حنش سے روایت ہے کہ حضرت علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

حدثنا وكيع ، عن إسماعيل ، عن أبي عمر ، عن ابن الحنفية ، قال :يصلي ركعتين.

حدثنا وكيع ، عن ربيع ، عن الحسن ، قال :يصلي مثل صلاة الإمام.

حدثنا جرير ، عن مغيرة ، عن حماد ، عن إبراهيم ، قال :إذا فاتتك الصلاة مع الإمام فصل مثل صلاته .وقال إبراهيم :وإذا استقبل الناس راجعين فليدخل أدنى مسجد ، ثم ليصل صلاة الإمام ، ومن لا يخرج إلى العيد ، فليصل مثل صلاة الإمام.

حدثنا هشيم ، عن مغيرة ، عن حماد ؛ فيمن لم يدرك الصلاة يوم العيد ، قال :يصلي مثل صلاته ، ويكبر مثل تكبيره.

حدثنا شريك ، قال :سألت أبا إسحاق عن الرجل يجيء يوم العيد وقد فرغ الإمام ؟ قال :يصلي ركعتين.

حدثنا حسن بن عبد الرحمان الحارثي ، عن ابن عون ، عن محمد ؛ في الذي يفوته العيد ، قال : كان يستحب أن يصلي مثل صلاة الإمام ، وإن علم ما قرأ به الإمام قرأ به(مُصنف ابن أبي شيبة، كتاب الصلاة،باب الرجل تفوته الصلاة في العيدين ، كم يصلي ؟)

[1] حدثنا سفيان بن عيينة ، عن مطرف ، عن الشعبي ، عن عبد الله ، قال :يصلي أربعا.

حدثنا هشيم ، وحفص ، عن حجاج ، عن مسلم ، عن مسروق ، قال :قال عبد الله :من فاته العيد فليصل أربعا.

حدثنا وكيع ، عن إسماعيل ، عن الشعبي ، قال :يصلي أربعا.

حدثنا علي بن هاشم ، عن جويبر ، عن الضحاك ، قال :من كان له عذر يعذر به في يوم فطر ، أو جمعة ، أو أضحى ، فصلاته أربع ركعات (مُصنف ابن أبي شيبة، كتاب الصلاة،باب الرجل تفوته الصلاة في العيدين ، كم يصلي ؟)

عرض کیا گیا کہ بعض ضعیف لوگ عیدگاہ جانے کی طاقت نہیں رکھتے، تو انہوں نے ایک آدمی کو حکم دیا کہ وہ لوگوں کو چار رکعات پڑھائے، دو رکعتیں تو نمازِ عید کی، اور دو رکعتیں اُن کے عیدگاہ کی طرف نہ جانے کی وجہ سے۔

ابوقیس نے ہزیل سے روایت کیا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک آدمی کو حکم فرمایا کہ وہ کمزور لوگوں کو عید کے دن چار رکعات پڑھائے، چاشت کی نماز کی طرح۔

اور ابواسحاق سے روایت ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک آدمی کو یہ حکم دیا کہ وہ کمزور لوگوں کو مسجد میں نمازِ عید کی دو رکعتیں پڑھائے۔

عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ کے بارے میں روایت ہے کہ انہوں نے مصعب بن عمیر کی اِمارت میں لوگوں کو عید کی دو رکعتیں پڑھائیں۔

اور ایک روایت میں خطبہ کے بغیر دو رکعتیں پڑھانے کا ذکر ہے۔

اور مسلم بن یزید سے روایت ہے کہ ہمیں قاسم بن عبدالرحمٰن نے جامع مسجد میں عید کے دن دو رکعتیں پڑھائیں، اور خطبہ بھی دیا (ابنِ ابی شیبہ) [1]

---

[1] حدثنا ابن إدريس ، عن ليث ، عن الحكم ، عن حنش ، قال :قيل لعلى بن أبى طالب :إن ضعفة من ضعفة الناس لا يستطيعون الخروج إلى الجبانة ، فأمر رجلا يصلى بالناس أربع ركعات ؛ ركعتين للعيد ، وركعتين لمكان خروجهم إلى الجبانة.

حدثنا وكيع ، عن سفيان ، عن أبى إسحاق ؛ أن عليا أمر رجلا يصلى بضعفة الناس فى المسجد ركعتين.

حدثنا وكيع ، عن سفيان ، عن أبى قيس ، قال :أظنه ، عن هزيل ؛ أن عليا أمر رجلا يصلى بضعفة الناس يوم العيد أربعا ، كصلاة الهجير.

حدثنا حميد بن عبد الرحمن ، عن حسن بن صالح ، عن ابن أبى ليلى ، عن عيسى ، عن عبد الرحمن بن أبى ليلى ، قال :صلى بالناس فى مسجد الكوفة ركعتين ، فى إمارة مصعب بن الزبير.

حدثنا حميد بن عبد الرحمن ، عن حسن ، عن ابن أبى ليلى ؛ أن عليا أمر رجلا يصلى بالناس فى مسجد الكوفة ركعتين .قال :وقال ابن أبى ليلى :يصلى ركعتين ، فقال

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

امام بیہقی نے بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی، چار رکعات والی روایت کو نقل کیا ہے، اور انہوں نے فرمایا کہ دو رکعات تو تحیۃُ المسجد کی ہیں، اور دو رکعتیں عیدُ الفطر کی نماز کی ہیں۔

لیکن ابنِ ترکمانی نے الجوھرُ النقی میں اس کی تردید کرتے ہوئے فرمایا کہ مذکورہ روایت کی سند معتبر نہیں، اور دوسری روایت کے پیشِ نظر راجح یہ ہے کہ دو رکعتیں تو عید کی ہیں، اور دو رکعتیں عید گاہ جانے کے ترک کرنے کی وجہ سے ہیں۔ [1]

اگر ابنِ ترکمانی کی اس بات کو تسلیم کرلیا جائے، تو چار رکعتوں کا الگ الگ سلام کے ساتھ

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

رجل لابن أبی لیلی :یصلی بغیر خطبة ؟ قال :نعم.

حدثنا وکیع ، قال :حدثنا مسلم بن یزید بن مذکور الخارقی ، قال :صلی بنا القاسم بن عبد الرحمن یوم عید فی المسجد الجامع رکعتین ، وخطب.

حدثنا مروان بن معاویة ، عن عریف بن درهم ، قال :رأیت عبد الله بن أبی هذیل یأتی المسجد الأعظم یوم العید (مُصنف ابن أبی شیبة، کتاب الصلاة،باب القوم یصلون فی المسجد ، کم یصلون ؟)

[1] قال (باب الامام یأمر من یصلی بالضعفة العید فی المسجد) ذکر فیه (عن علی علیه السلام انه امر رجلا یصلی بضعفة الناس فی المسجد اربعا) * قلت *فی سنده أبو قیس هو الاودی قال البیهقی فی باب لا نکاح الا بولی (مختلف فی عدالته) وقال فی باب مس الفرج بظهر الکف (لا یحتج بحدیثه قاله ابن حنبل) وفی سنده ایضا عاصم بن علی خرج له فی الصحیح ولکن ابن معین قال عنه لا شء وفی روایة کذاب ابن کذاب ثم قال البیهقی (ویحتمل ان یکون اراد رکعتین تحیة المسجد ثم رکعتی العید مفصولتین عنهما) واستدل علی هذا التأویل بما جاء فی روایة اخری (ان علیا قال صلوا یوم العید فی المسجد اربع رکعات رکعتان للسنة ورکعتان للخروج)

قلت:الظاهر ان البیهقی فهم من قوله رکعتان للسنة انه اراد تحیة المسجد ومن قوله رکعتان للخروج انه اراد رکعتی العید.

والظاهر ان الامر لیس کذلک وانما اراد بقوله رکعتان للسنة رکعتی العید واراد بقوله ورکعتان للخروج أی لترک الخروج إلی المصلی ویدل علی ذلک ان ابن ابی شیبة اخرج فی مصنفه هذا

الحدیث ولفظه قیل لعلی ان ضعفة من الناس لا یستطیعون الخروج إلی الجبانة فامر رجلا یصلی بالناس اربع رکعات رکعتین للعید ورکعتین لمکان خروجهم إلی الجبانة فظهر بهذا ضعف ما تأوله البیهقی (الجوهر النقی ،للترکمانی،ج۳،ص۳۱۰،۳۱۱، کتاب صلاة العیدین)

پڑھنا ثابت ہوگا، اور اس صورت میں عید کی نماز کی دو رکعتیں ہی ثابت ہوں گی۔
تاہم حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی چار رکعات کی روایت کی سند میں ضُعف پایا جاتا ہے۔ [1]

---

[1] وقال أحمد بن منيع :حدثنا ابن علية، حدثنا الليث، عن الحكم، عن حنش قال: قيل لعلي رضى الله عنه :إن ناسا لايستطيعون الخروج منهم من به علة، ومنهم من يعجز عليه المسجد .فقال رضى الله عنه" :صلوا ههنا، وفي المسجد، وصلوا أربعا :ركعتين للسنة وركعتين للخروج.

الحكم عليه:

هذا إسناد ضعيف، وفيه علتان:

أ -ضعف الليث بن أبي سليم -كما في التقريب (5685 :464).-

- 2ضعف حنش بن المعتمر .انظر :الجرح والتعديل .(3/ 291)

وقد أورده البوصيرى في الإتحاف (:98 /1ب مختصر)، وقال :رواه أحمد بن منيع، وحنش ضعيف.

تخريجه:

أخرجه ابن أبي شيبة في مصنفه (184 /2) قال :حدثنا ابن إدريس، عن ليث به.

وتقدم لفظه.

والبيهقي في السنن الكبرى (310 /3) من طريق الشافعي، عن ابن علية يه.

وقال المتقي الهندي في كنز العمال :(638 /8)رواه ابن أبي شيبة وابن منيع والمروزي في العيدين.

وقد اختلفت الرواية عن علي في ذلك:

فورد أنه أمره أن يصلي أربع ركعات .أخرجه ابن أبي شيبة في المصنف (185 /2)، والبيهقي في السنن الكبرى (310 /3) من طريق أبي قيس، أنه كان يحدث عن هزيل، أن عليا أمر رجلا أن يصلي بضعفة الناس في المسجد يوم فطر أو يوم أضحى وأمره أن يصلي أربعا.

قال ابن التركماني في الجوهر النقي :(في سنده أبو قيس هو الأودي، قال البيهقي (112 /7) :مختلف في عدالته .وقال في باب مس الفرج بظهر الكف :(136 /1)لا يحتج بحديثه، قاله ابن حنبل).

وأخرج الشافعي -كما في كنز العمال (639 /8)- ، ولم أجده في الأم ولا في المسند)، وابن أبي شيبة في المصنف (185 /2)، والبيهقي في السنن الكبرى (310 /3) عن أبي إسحاق، أن عليا أمر رجلا فصلى بضعفة الناس يوم العيد في المسجد ركعتين.

وأبو إسحاق هو السبيعي وهو مدلس -كما هو معروف-، على أنه اختلف عليه فيه :

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

جن روایات میں دو رکعات کا تکبیر کے ساتھ اور عید کی نماز کی طرح پڑھنے کا ذکر ہے، ان سے صاف طور پر یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ عید کی نماز ہی کہلائے گی، اور ان روایات سے عید کی نماز کے تنہاء پڑھنے کا بھی ثبوت ہوتا ہے۔

اور جن روایات میں چار رکعات پڑھنے کا ذکر آیا ہے، ان میں ایک احتمال یہ ہے کہ وہ الگ الگ سلاموں کے ساتھ یہ چار رکعات پڑھے، دو رکعات تو نمازِ عید کی پڑھے، اور دو رکعات عید گاہ میں نہ جانے، یا پھر خطبہ کے قائم مقام بنانے کے لیے پڑھے، کیونکہ انفرادی صورت میں خطبہ نہیں، جیسا کہ بعض آثار سے معلوم ہوتا ہے۔

اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ مذکورہ مقاصد کے لئے ان چار رکعات کو ایک سلام کے ساتھ ہی پڑھے۔

پھر بہر دو صورت یہ بھی احتمال ہے کہ دو رکعات عام نوافل کی طرح پڑھے، اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہ رکعات، نمازِ عید کی طرح پڑھے۔

لیکن دوسری روایات میں عید کی طرح ہونے کی تصریح کا تقاضا، عید کی طرح الگ سلام سے پڑھنے کے احتمال کے راجح ہونے کا ہے، جس سے دونوں قسم کی روایات میں تعارض بھی نہیں رہتا، بالخصوص جبکہ دو رکعات کی تصریح حضرت عطاء، عکرمہ، حسن بصری، ابنِ سیرین، حماد، ابراہیم نخعی اور ابنِ حنفیہ وغیرہ جیسے جلیل القدر حضرات سے پائی جاتی ہے، جن میں سے بعض میں تکبیرات اور نمازِ عید، یا امام کی طرح ہونے کی تصریح بھی ہے۔

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

فرواه ابن مهدى عن سفيان، عن أبي إسحاق أن عليا - ... كما سبق. ورواه بندار، عن عبد الرحمن بن مهدى، عن سفيان، عن أبي إسحاق عن بعض أصحابه أن عليا ...

قلت :وابن مهدى وبندار -هو محمد بن بشار -ثقتان من رواة الصحيح، لكنه معلول بأبي إسحاق لتدليسه -والله أعلم (حاشية المطالب العالية بزوائد المسانيد الثمانية،لسعد بن ناصر بن عبد العزيز الشّثرى، ج٥ص١٤٨ الى ١٥٠، رقم الرواية٧٥٦، ابواب الجمعة، باب صلاة العيدين)

نیز بعض روایات سے نمازِ عید کو، دو یا اس سے زیادہ افراد کے ساتھ باجماعت پڑھنے کا بھی ثبوت ملتا ہے۔

اس کے علاوہ حضرت ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ اور بعض دیگر حضرات سے نمازِ عید کے بعد چار رکعات پڑھنے کا ثبوت ملتا ہے۔ [1]

---

[1] حدثنا إسحاق بن إبراهيم، عن عبد الرزاق، عن الثوری، عن صالح، عن الشعبی، قال :كان ابن مسعود يصلى بعد العيدين أربعا(المعجم الكبير،للطبرانی،رقم الحديث ٩٥٣٠، ج٩ص ٣٠٦)

حدثنا محمد بن على بن شعيب السمسار، ثنا خالد بن خداش، ثنا عيسى بن يونس، عن حريث، عن الحكم، عن إبراهيم، عن علقمة، عن عبد الله، أنه :كان يصلى بعد العيدين أربعا(المعجم الكبير،للطبرانی،رقم الحديث ٩٥٣١، ج٩ص ٣٠٦)

حدثنا أبو الأحوص ، عن أبی إسحاق ، قال :كان سعيد بن جبير ، وإبراهيم ، وعلقمة يصلون بعد العيد أربعا.

حدثنا عبد الله بن إدريس ، عن يزيد بن أبی زياد ، قال :رأيت إبراهيم ، وسعيد بن جبير ، ومجاهدا، وعبد الرحمن بن أبی ليلى ، يصلون بعدها أربعا.

حدثنا جرير ، عن منصور ، عن إبراهيم ، قال :كان علقمة يجیء يوم العيد ، فيجلس فی المصلى ، ولا يصلی حتى يصلی الإمام ، فإذا صلى الإمام ، قام فصلى أربعا.

حدثنا مروان بن معاوية ، عن صالح بن حی ، عن الشعبی ، قال :سمعته يقول :كان عبد الله إذا رجع يوم العيد ، صلى فی أهله أربعا.

حدثنا وكيع ، عن مسعر ، عن أبی صخرة ، عن الأسود بن هلال ، قال :خرجت مع علی ، فلما صلى الإمام ، قام فصلى بعدها أربعا.

حدثنا حفص بن غياث ، عن الأعمش ، عن إبراهيم ، عن علقمة ، وأصحاب عبد الله ؛ أنهم كانوا يصلون بعد العيد أربعا.

حدثنا أبو معاوية ، عن الأعمش ، عن إبراهيم ، قال :كانوا يصلون بعد العيد أربعا ، ولا يصلون قبلها شيئا.

حدثنا عبدة ، عن عاصم ، قال :رأيت الحسن ، وابن سيرين يصليان بعد العيد ، ويطيلان القيام.

حدثنا شبابة بن سوار ، قال :حدثنا المغيرة بن مسلم ، عن عبد الله بن بريدة ، عن أبيه ؛ أنه كان يصلی يوم العيد قبل الصلاة أربعا ، وبعدها أربعا.

حدثنا عبيدة بن حميد ، عن منصور ، عن إبراهيم ، قال :كان الأسود يصلی قبل العيدين .قال :وكان علقمة لا يصلی قبلها ، ويصلی بعدها أربعا.

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

حضرت ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ان روایات کے پیشِ نظر یہ احتمال ہے کہ حضرت ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ نے نمازِ عید چھوٹ جانے والے کے لیے نمازِ عید کے بعد والی ان چار رکعتوں کے ہی پڑھنے کا حکم فرمایا، اور ان کا نمازِ عید سے تعلق نہ ہو۔

لیکن دیگر روایات و آثار میں جب گھر میں باجماعت اور تنہاء شخص کو بھی نمازِ عید پڑھنے کا ثبوت موجود ہے، تو وہ حکم اپنی جگہ برقرار رہتا ہے۔

بہر حال مذکورہ احادیث وروایات اور آثار کے پیشِ نظر، جو شخص، یا جو اشخاص عام اور مشہور مقام پر ہونے والی نمازِ عید میں کسی عذر کی وجہ سے، یا بلا عذر شریک نہ ہوسکیں، ان کے لئے عید کے دن زوال سے پہلے عید کی نماز پڑھنے کے جائز ہونے پر امتِ مسلمہ کے اکثر فقہائے کرام ومجتہدینِ عظام میں سے کسی کا قابلِ ذکر اختلاف نہیں۔

البتہ اس کے طریقہ ونوعیت میں تھوڑا بہت اختلاف پایا جاتا ہے، جو اصل مقصد میں مُخِل نہیں، جیسا کہ آنے والے حوالہ جات سے معلوم ہوگا۔

واللہ تعالیٰ أعلم.

﴿ گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ ﴾

حدثنا ابن إدريس ، عن شعبة ، عن الحكم ، عن إبراهيم ، قال : كفاك بقول عبد الله ، يعني في الصلاة بعد العيد(مُصنف ابن أبي شيبة، كتاب الصلاة،باب فيمن كان يصلي بعد العيد أربعا)

(فصل نمبر2)

محدثین، فقہاء اور علماء کی عبارات وحوالہ جات

ہم بجائے اس کے کہ خود اس اہم مسئلے پر اپنی طرف سے روایتی لب کشائی کریں، جس طرح کے کئی دوسرے اہلِ علم حضرات کررہے ہیں۔

اس سلسلے میں متعدد مستند محدثین اور اصحابِ علم حضرات کے حوالہ جات پیش کرتے ہیں، تاکہ امتِ مسلمہ کے عامۃُ الناس کو اصل حقائق معلوم ہوں، اور وہ اس سلسلے میں مختلف قسم کی باتوں سے متاثر ہو کر کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہوں۔

’’عمدۃُ القاری شرحُ البخاری‘‘ کا حوالہ

علامہ بدرُالدین عینی حنفی نے ’’عمدۃُ القاری شرحُ البخاری‘‘ میں امام بخاری کی عبارت کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا کہ:

’’امام بخاری کی اس عبارت سے دو باتیں سمجھی جاتی ہیں:

ایک یہ کہ جب کسی آدمی کی نمازِ عید، جماعت کے ساتھ فوت ہو جائے، خواہ کسی عذر کی وجہ سے فوت ہو، یا بغیر عذر کے فوت ہو، تو وہ عید کی نماز پڑھے گا۔

دوسرے یہ کہ وہ نمازِ عید کی دو رکعتیں ہی پڑھے گا، جس طرح اصل میں بھی عید کی دو رکعتیں ہی ہوتی ہیں۔

البتہ ان دونوں چیزوں میں علماء کا اختلاف ہے۔

حنفیہ کے نزدیک اگر حکمران امام کی اقتداء میں، نمازِ عید فوت ہو جائے، تو اس کی قضاء نہیں کی جائے گی، لیکن جب اس کی نمازِ عید حکمران سمیت فوت ہو جائے، تو دوسرے دن، حکمران کے ساتھ جماعت کے ساتھ قضاء کی جائے گی۔

اورامام شافعی وغیرہ کے نزدیک قضاء کی جائے گی۔

اورامام مالک اورامام شافعی اور ابوثور کے نزدیک، نمازِ عید چھوٹنے پر، بعد میں عید کی دورکعتیں ہی پڑھے گا، البتہ امام مالک کے نزدیک اس کو ایسا کرنا واجب نہیں، بلکہ مستحب ہے، امام احمد کا بھی ایک قول اسی طرح کا ہے۔

اور ایک جماعت کا قول یہ ہے کہ وہ چار رکعت پڑھے گا، یہ قول امام ثوری وغیرہ کا ہے، امام احمد کا بھی ایک قول اسی طرح ہے۔

اورامام ابوحنیفہ نے فرمایا کہ اگر شخص کوئی امام اور مجمع کے ساتھ شریک ہوکر، عید کی نماز نہ پڑھ سکے، تو وہ چاہے، تو نماز پڑھ لے، اور چاہے تو نہ پڑھے، پھر چاہے، تو چار پڑھ لے، اور چاہے تو دو پڑھ لے۔

اورامام اسحاق بن راہویہ نے فرمایا کہ اگر وہ عیدگاہ میں، یا اس جگہ، جہاں نمازِ عید ہوئی ہے، نماز پڑھے گا، تو عید کی نماز کی طرح ہی دو رکعت پڑھے گا، اور دوسری جگہ پڑھے گا، تو چار رکعتیں پڑھے گا۔

اور اسی طریقے سے وہ عورتیں بھی، جو عیدگاہ میں شریک نہ ہوں، وہ بھی اپنے مقام پر عید کی نماز پڑھیں گی۔

اور وہ لوگ بھی، جو گھروں میں ہوں، اور گاؤں، دیہات میں ہوں، اور عیدگاہ میں حاضر نہ ہوں، وہ بھی اپنے اپنے طور پر عید کی نماز پڑھیں گے۔

ان تمام چیزوں کی دلیل امام بخاری نے یہ بیان فرمائی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ ہمارے اہلِ اسلام کی عید ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کے تمام افراد کی طرف، عید کی نسبت فرمائی، جس میں گاؤں، دیہات کے لوگ بھی شامل ہیں، اور گھروں میں موجود افراد بھی اور عورتیں بھی۔

اور ایک دلیل یہ بھی ہے کہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے بھی اپنے اہلِ خانہ اور اولاد کو شہر کے لوگوں کی طرح نمازِ عید کا حکم فرمایا، اس واقعہ کو باسند طریقے پر بیہقی وغیرہ نے روایت کیا ہے۔

اور تابعی حضرت عکرمہ کی روایت بھی دلیل ہے کہ گاؤں والے، عید کے دن جمع ہوکر، دو رکعتیں امام کی طرح پڑھیں گے، اس کو ابنِ ابی شیبہ نے روایت کیا ہے۔

اور حضرت عطاء نے فرمایا کہ جس کی عید کی نماز فوت ہوجائے، تو وہ تکبیرات کے ساتھ دو رکعتیں پڑھے گا، اس کو فریابی نے اپنی مصنف میں روایت کیا ہے، البتہ بعض نے عطاء سے عید کی نماز چار رکعت پڑھنے کو روایت کیا ہے۔

امام بخاری نے جو عید سے رہ جانے والے اور دو رکعت پڑھنے والے کے لئے تکبیر کہنے کا ذکر کیا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ دو رکعتیں، عید کی نماز کے طریقے پر ہی زائد تکبیرات کے ساتھ پڑھی جائیں گی، یہ مطلب نہیں کہ ان کو عام نفلوں کی طرح بغیر زائد تکبیرات کے پڑھا جائے گا"۔انتھٰی۔ [1]

---

[1] باب إذا فاته العيد يصلي ركعتين أى :هذا باب ترجمته :إذا فاتت الرجل صلاة العيد مع الإمام يصلي ركعتين، وفهم من هذه الترجمة حكمان :أحدهما :أن صلاة العيد إذا فاتت الرجل مع الجماعة فإنه يصليها، سواء كان الفوت بعارض أو غيره .والآخر :أنها تقضى ركعتين كأصلها.

وفى كل واحد من الوجهين اختلاف العلماء.

أما الوجه الأول :فقد قال قوم :لا قضاء عليه أصلا وبه قال مالك وأصحابه، وهو قول المزنى، وعند أصحابنا الحنفية كذلك :لا يقضيها إذا فاتت عن الصلاة مع الإمام، وأما إذا فاتت عنه مع الإمام فإنه يصليها مع الجماعة فى اليوم الثانى .وفى قاضيخان :إذا تركها بغير عذر لا يقضيها أصلا، وبعذر يقضيها فى اليوم الثانى فى وقتها، وبه قال الأوزاعى والثورى وأحمد وإسحاق .قال ابن المنذر :وبه أقول :فإن تركها فى اليوم الثانى بعذر أو بغير عذر لا يصليها، وقال الشافعى :من فاتته صلاة العيد يصلى وحده كما يصلى مع الإمام، وهذا بناء على أن المنفرد :هل يصلى صلاة العيد؟ عندنا لا يصلى، وعنده يصلى .

وقال السرخسى :وللشافعى قولان، الأصح قضاؤها، فإن أمكن جمعهم فى يومهم صلى بهم، وإلا صلاها من الغد، وهو فرع قضاء النوافل عنده، وعلى القول الآخر :هى كالجمعة يشترط لها

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

ہم یہ بات جمعہ سے متعلق اپنے دیگر مضامین میں واضح کر چکے ہیں کہ پہلے زمانوں میں جمعہ وعید کی نماز شہروں میں عموماً ایک ہی مقام پر پڑھی جاتی تھی، اور کسی کو دوسری جماعت کی بھی

﴿ گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ ﴾

الجماعة والأربعون ودار الإقامة، وفعله فى الغد إن قلنا أداء لا يصليها فى بقية اليوم، وإلا صلاها فى بقيته، وهو الصحيح عندهم، وتأخرها عنه لا يسقط أبدا .وقيل :إلى آخر الشهر.

وأما الوجه الثانى :فقد قالت طائفة :إذا فاتت صلاة العيد يصلى ركعتين، وهو قول مالك والشافعى وأبى ثور، إلا أن مالكا استحب له ذلك من غيرإيجاب، وقال الأوزاعى :يصلى ركعتين ولا يجهر بالقراء ة ولا يكبر تكبير الإمام، وليس بلازم .

وقالت طائفة :يصليها إن شاء أربعا، روى ذلك عن على وابن مسعود، وبه قال الثورى وأحمد.

وقال أبو حنيفة :إن شاء صلى وإن شاء لم يصل، فإن شاء صلى أربعا، وإن شاء ركعتين .

وقال إسحاق :إن صلى فى الجبانة صلى كصلاة الإمام، فإن لم يصل فيها صلى أربعا.

وكذالك النساء أى :وكذلك النساء اللاتى لم يحضرن المصلى مع الإمام يصلين صلاة العيد، والآن يأتى دليله.

ومن كان فى البيوت والقرى وكذلك يصلى العيد من كان فى البيوت من الذين لا يحضرون المصلى .قوله :(والقرى) أى :وكذلك يصلى العيد من كان فى القرى.

لقول النبى صلى الله عليه وسلم هاذا عيدنا أهل الإسلام،هذا دليل لما تقدم من الأشياء الثلاثة .

وجه الاستدلال به أنه أضاف إلى كل أمة الإسلام من غير فرق بين من كان مع الإمام أو لم يكن .

وقوله :(هذا عيدنا) قد مضى فى حديث عائشة، رضى الله تعالى عنها فى قصة المغنيتين .وأما قوله: (أهل الإسلام) ، فقال بعض الشراح :كأنه من البخارى، وقيل :لعله مأخوذ من حديث عقبة بن عامر مرفوعا :(أيام منى عيدنا أهل الإسلام) ، وهو فى (السنن) : وصححه ابن خزيمة :(وأهل الإسلام)، بالنصب على أنه منادى مضاف حذف منه حرف النداء ، أو بتقدير :أعنى أو أخص.

وأمر أنس بن مالك مولاهم ابن عتبة بالزاوية فجمع أهله وبنيه وصلى كصلاة أهل المصر وتكبيرهم هذا التعليق ذكره ابن أبى شيبة فقال :حدثنا ابن علية عن يونس، قال :حدثنى بعض آل أنس بن مالك أن أنسا كان ربما جمع أهله وحشمه يوم العيد فيصلى بهم عبد الله بن أبى غنية ركعتين، وقال البيهقى فى (السنن) : أخبرنا أبو الحسن الفقيه وأبو الحسن بن أبى سيد الإسفراينى حدثنا ابن سهل بشر بن أحمد حدثنا حمزة بن محمد الكاتب حدثنا نعيم بن حماد حدثنا هشيم عن عبد الله بن أبى بكر بن أنس بن مالك، (قال :كان أنس بن مالك إذا فاتته صلاة العيد مع الإمام جمع أهله يصلى بهم مثل صلاة الإمام فى العيد) . قال :ويذكر عن أنس أنه كان إذا كان بمنزله بالزاوية فلم يشهد العيد بالبصرة جمع مواليه وولده ثم يأمر مولاه عبد الله بن أبى غنية فيصلى بهم كصلاة أهل المصر ركعتين، ويكبر بهم كتكبيرهم .وبه قال فيما ذكره ابن أبى شيبة ومجاهد وابن الحنفية وإبراهيم وابن سيرين وحماد وأبو إسحاق السبيعى .قوله :(وأمر أنس مولاه) وفى رواية

﴿ بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں ﴾

اجازت نہ تھی۔

اس لیے اس زمانے میں عندالحنفیہ امام کے ساتھ فوت ہونے کے بعد دوسرے کو جماعت جائز نہ ہونے کی وجہ سے فوت ہونے کا تصور محدود تھا، برخلاف موجودہ تعدُّد کی صورت کے۔

’’فتحُ الباری شرحُ البخاری‘‘ کا حوالہ

علامہ ابنِ حجر عسقلانی نے ’’فتحُ الباری شرحُ البخاری ‘‘میں امام بخاری کی عبارت کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا کہ:

’’مطلب یہ ہے کہ جب کسی کی نمازِ عید، جماعت کے ساتھ فوت ہوجائے، خواہ اس کی نمازِ عید غیر اختیاری طریقہ پرفوت ہو، یا اختیاری طریقہ پرفوت ہو، تو وہ عید

﴿ گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ ﴾

المستملی :(مولاهم)

.قوله :(ابن أبی غنية) ، بفتح الغين المعجمة وكسر النون وتشديد الياء آخر الحروف.

هـذا فی رواية أبی ذر، وفی رواية غيره، بضم العين المهملة وسكون التاء المثناة من فوق وفتح الباء الموحدة، وهو الأكثر الأشهر .

قوله :(بالزاوية) بـالـزای، مـوضـع علی فرسخين من البصرة كان بها قصر وأرض لأنس، رضی الله تـعـالـی عـنه، وكان يقيم هناک كثيرا، وكانت بالزاوية وقعة عظيمة بين الحجاج والأشعث .قوله: (بعض آل أنس بن مالک، المراد :عبيد الله بن أبی بكر بن أنس.

وقال عكرمة أهل السواد يجتمعون فی العيد يصلون ركعتين كما يصنع الإمام هذا التعليق وصله ابن أبی شيبة فقال :حـدثنا غندر عن شعبة عن قتادة عن عكرمة أنه قال فی القوم يكونون فی السواد وفی السفر فی يوم عيد فطر أو أضحی، قال :يجتمعون فيصلون ويؤمهم أحدهم.

وقال عطاء إذا فاته العيد صلی ركعتين.

عـطـاء بـن أبـی ربـاح، وفـی رواية الكشميهنی :وكـان عـطـاء ، والأول أصـح، ورواه الـفريابی فی (مصنفه) عن الثوری عن ابن جريج :

(عن عطاء قال :من فاته العيد فليصل ركعتين) ، ورواه ابن أبی شيبة فی فصل :من فاتته صلاة العيد لم يصل، حدثنا يحيی بن سعيد عن ابن جريج،

(عن عطاء قال :يصلی ركعتين ويكبر) .

وقوله :(ويكبر) ، إشـارة إلـی أنهـا تـقـضی كهيئتها لا أن الركعتين مطلق نفل(عمدة القاری شرح صحيح البخاری، ج٦،ص٣٠٧،الیٰ٣٠٩، كتاب العيدين،باب إذا فاته العيد يصلی ركعتين)

کی نماز اصل طریقہ پر دو رکعت ہی اداء کرے گا۔

مگر کچھ لوگوں کا اس میں اختلاف ہے، کہ انہوں نے چار رکعتیں پڑھنے کا حکم دیا ہے، اور انہوں نے اس کو جمعہ پر قیاس کیا ہے کہ اگر کسی کی نمازِ جمعہ فوت ہو جائے، تو وہ ظہر کی چار رکعتیں پڑھتا ہے، اسی طرح یہاں پر بھی چار رکعتیں پڑھے گا۔

لیکن بعض حضرات نے اس کے جواب میں فرمایا کہ یہ قیاس صحیح نہیں ہے، کیونکہ اگر جمعہ کی نماز فوت ہو جائے، تو اس کے بدلے میں ظہر کی نماز پڑھنے کا حکم ہوتا ہے، جو کہ چار رکعتیں ہیں، برخلاف عید کے، کہ عید کی نماز چھوٹنے کے بعد اس کا حکم ایسا نہیں ہوتا (لہٰذا دونوں کا حکم مختلف ہوا)‘‘۔انتھٰی۔ [1]

اس سے معلوم ہوا کہ جو لوگ شہر کے بڑے اور مشہور مجامع میں عید کی نماز میں شریک نہ ہوں، وہ سب لوگ دو رکعات پڑھیں گے۔

یہی قول زیادہ قوی ہے، اور امام بخاری کے نزدیک اس حکم میں گھر کی خواتین بھی شامل ہیں۔

’’الکواکبُ الدراری شرحُ البخاری‘‘ کا حوالہ

علامہ شمس الدین کرمانی نے ’’الکواکبُ الدراری شرحُ البخاری ‘‘میں امام بخاری کی عبارت کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا کہ:

’’اس سے معلوم ہوا کہ عید کی نماز کے لئے جماعت شرط نہیں ہے، اور اگر عید کی

---

[1] (قوله باب إذا فاته العيد)أی مع الإمام يصلی ركعتين فی هذه الترجمة حكمان مشروعية استدراک صلاة العيد إذا فاتت مع الجماعة سواء كانت بالاضطرار أو بالاختيار و كونها تقضى ركعتين كأصلها وخالف فی الأول جماعة منهم المزنی فقال لا تقضى وفيالثانی الثوری وأحمد قالا إن صلاها وحده صلى أربعا ولهما فی ذلک سلف قال بن مسعود من فاته العيد مع الإمام فليصل أربعا أخرجه سعيد بن منصور بإسناد صحيح وقال إسحاق إن صلاها فی الجماعة فركعتين وإلا فأربعا قال الزين بن المنير كأنهم قاسوها على الجمعة لكن الفرق ظاهر لأن من فاتته الجمعة يعود لفرضه من الظهر بخلاف العيد انتهى وقال أبو حنيفة يتخير بين القضاء والترک وبين الثنتين والأربع(فتح الباری شرح صحيح البخاری، ج ٢،ص ۴٧۴،۴٧۵، كتاب العيدين ،باب إذا فاته العيد)

نماز فوت ہوجائے، تو اس کی دو رکعتیں ہی پڑھی جائیں گی، جیسا کہ امام بخاری کے بیان کردہ دلائل سے معلوم ہوتا ہے۔

علامہ ابنِ بطال نے اس مسئلہ میں فقہاء کے اختلاف کا ذکر کیا ہے‘‘۔انتہٰی۔ [1]

’’منحۃُ الباری شرحُ البخاری‘‘ کا حوالہ

علامہ زکریا بن محمد انصاری نے’’منحۃُ الباری شرحُ البخاری‘‘میں امام بخاری کی عبارت کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا کہ:

’’اگر کوئی امام کے ساتھ عید کی نماز نہ پڑھے، اور اس کی عید کی نماز فوت ہوجائے، تو وہ امام کی طرح عید کی دو رکعتیں ہی پڑھے گا۔

حنفیہ کا اس میں اختلاف ہے، انہوں نے دو اور چار رکعتوں کو پڑھنے کے درمیان اختیار دیا ہے۔

لیکن جمہور کا قول اس کے خلاف ہے کہ وہ دو رکعتوں کے پڑھنے ہی کے قائل ہیں۔

اور اسی طریقہ سے جو عورتیں امام کے ساتھ نمازِ عید میں شریک نہ ہوں، اور عورتوں کے علاوہ جو لوگ گھروں میں موجود ہوں، اور اسی طریقہ سے جو لوگ گاؤں میں

---

[1] (باب إذا فاته العيد) أى مع الإمام والعرض منه بيان عدم اشتراط الجماعة فى صلاة العيد وأنه عند فوات ركعتان أيضا لا أربع ركعات ,قال ابن بطال :اختلفوا فيمن فاتته الصلاة مع الإمام فقال مالك والشافعي يصلى ركعتين ,وأحمد يصليها أربعا كمن لم يحضر الجمعة ,وأبو حنيفة إن شاء الله ركعتين وأولى الأقوال ما أشار إليه البخارى واستدل عليه بقوله صلى الله عليه وسلم (هذا عيدنا) هو ذلك إشارة إلى الصلاة ,قوله (وكذلك النساء) أى اللائى لم يحضرن المصلى مع الإمام ووجه الاستدلال بقوله هذا عيدنا أنه أضافه إلى أمة الإسلام من غير فرق بين من كان مع الإمام أو لم يكن (وأهل الإسلام) منادى مضاف حذف منه حرف النداء قوله (ابن أبى عتبة) بضم المهملة وسكون الفوقانية وبالموحدة منصوب بأنه يدل عن المولى أو بيان فى بعضها (مولاهم)أى مولى أنس وبأصحابه و(الزاوية) موضع على فرسخين من البصرة(الكواكب الدرارى فى شرح صحيح البخارى، لشمس الدين الكرمانى، ج٦،ص٨٧،٨٨، كتاب العيدين،باب إذا فاته العيد أهل الإسلام يصلى ركعتين وكذلك النساء ومن كان فى البيوت والقرى)

موجود ہوں، وہ سب عید کی نماز کی دو رکعتیں ہی پڑھیں گے۔

جس کی دلیل نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث ہے کہ یہ (عید کا تہوار) ہماری، یعنی اہلِ اسلام کی عید ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عید کی نسبت خاص قسم کے مسلمانوں کی طرف نہیں فرمائی، بلکہ تمام مسلمانوں کی طرف فرمائی، جس میں عورتیں اور گھر میں موجود افراد اور گاؤں کے سب لوگ داخل ہیں۔

اور حضرت انس رضی اللہ عنہ، اور حضرت عکرمہ اور عطاء کی روایتیں بھی اسی بات کی دلیل ہیں''۔انتہٰی۔ [1]

---

[1] (باب :إذا فاته العيد) أى :صلاته (يصلى ركعتين) أى : كهيئتهما مع الإمام، وخالفت الحنفية، فخيرته بين ركعتين على الأصل، وبين أربع؛ لخبر ابن مسعود بإسناد صحيح" :من فاته العيد مع الإمام،فليصل أربعا)

لكن الجمهور على خلافه.

(وكذلك النساء) أى :اللاتى لم يحضرن المصلى مع الإمام .(ومن كان فى البيوت) أى :ممن لم يحضرها معه من غير النساء .(والقرى) أى :وكذلك من كان فى القرى, ولم يحضر، وأشار بقوله :(ومن كان فى البيوت والقرى) إلى مخالفة ما روى عن على: لا جمعة ولا تشريق إلا فى مصر جامع (هذا) أى :ما ذكر من ركعتى العيد عندنا .(أهل الإسلام) بنصب أهل على الاختصاص، أو على النداء بـ "يا"، وبها صرح، كما فى نسخة.

ووجه مطابقة الحديث للترجمة :ما فى هذا من الإشارة إلى الركعتين، وعمم بقوله : (أهل الإسلام) من كان مع الإمام ممن لم يكن معه من النساء ، وأهل القرى، وغيرهم. (مولاهم) أى :مولى أنس، وأصحابه، وفى نسخة" :مولاه "أى :مولى أنس .(ابن أبى عتبة) بنصب (ابن) بدل من مولى، أو عطف بيان و (عتبة) بضم العين، وسكون الفوقية، وفتح الموحدة، وفى نسخة " :غنية "بمعجمة مفتوحة، ونون مكسورة، وتحتية مشددة.

(بالزاوية) موضع على فرسخين من البصرة، كان بها قصر،وأرض لأنس .(فجمع) بتخفيف الميم .(وقال عطاء) فى نسخة" :وكان عطاء "(إذا فاته) أى :المصلى على النسخة الأولى، وعطاء على الثانية .(العيد) أى :صلاته(منحة البارى بشرح صحيح البخارى المسمى تحفة البارى ،لزكريا بن محمد بن أحمد بن زكريا الأنصارى، ج٣،ص ٦٠ الىٰ ٦٢، كتاب العيدين،باب :إذا فاته العيد يصلى ركعتين)

’’اللامعُ الصبیح بشرح الجامع الصحیح‘‘ کا حوالہ

علامہ شمس الدین برماوی نے ’’شـرحُ البخـاری‘‘ میں امام بخاری کی عبارت کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا کہ:

’’جب امام کے ساتھ عید کی نماز فوت ہوجائے (یعنی کوئی باہر جاکر امام کے ساتھ نمازِ عید نہ پڑھ سکے) تو عید کی دو رکعتیں پڑھی جائیں گی، کیونکہ نمازِ عید کے لئے جماعت کا ہونا شرط نہیں، جیسا کہ امام شافعی اور امام مالک کا قول ہے۔

جس کی دلیل نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث ہے کہ یہ (عید کا تہوار) ہماری، یعنی اہلِ اسلام کی عید ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عید کی نسبت مسلمانوں کے کسی مخصوص طبقہ وافراد کی طرف نہیں فرمائی، بلکہ تمام مسلمانوں کی طرف فرمائی، جس میں عورتیں اور گھر میں موجود افراد اور گاؤں کے سب لوگ داخل ہیں۔

اور حضرت انس رضی اللہ عنہ، اور حضرت عطاء اور حضرت عکرمہ کی روایتیں بھی اسی بات کی دلیل ہیں‘‘۔انتھٰی۔[1]

---

[1] (بـاب إذا فاته العيد)؛ أى :مع الإمام؛ أى :أن الـجـماعة لا تشترط فى العيد، وأنه عند الفوات ركـعتـان كـما يقوله الشافعي ومالک، لا أربع كما يقوله أحمد إلحاقا لها بالجمعة إذا فاتت، ولا أنه مخير بين أربع وركعتين كقول أبى حنيفة.

"لقول النبى -صلى الله عليه وسلم "-أشار به البخارى إلى حديث عائشة فى الجاريتين اللتين كانتا تغنيان عند النبى -صلى الله عليه وسلم -، وفيه :(دعهما فإن لكل قوم عيدا، وهذا عيدنا)، وقد سبق فـى (باب سنة العيدين)، وإلى حديث عقبة بن عامر :أنه -صلى الله عليه وسلم -قال فى يوم عرفة، وأيام التشريق" :عيدنا أهل الإسلام"، رواه أبو داود، والنسائى، وابن خزيمة، والحاكم وغيرهم.

"أهل الإسلام"؛ أى :يا أهل الإسلام، فحذف حرف النداء .

قال (ک) :وجـه استدلال البخارى بذلک :أن قـولـه هـذا إشارة للركعتين، وعمم بقوله :(يا أهل الإسلام) من كان مع الإمام أو لم يكن :النساء والقرى وغيرهم.

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

”ارشادُ الساری شرحُ البخاری“ کا حوالہ

علامہ قسطلانی نے ”ارشادُ الساری شرحُ البخاری“ میں امام بخاری کی عبارت کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا کہ:

”جب عید کی نماز فوت ہو جائے، تو وہ دو رکعتیں پڑھے گا، خواہ عذر کی وجہ سے اس کی نمازِ عید فوت ہو، یا بغیر عذر کے فوت ہو، اور اسی طریقہ سے عورتیں بھی، اور وہ لوگ بھی، جو گھروں میں ہوں، اور وہ لوگ بھی جو گاؤں، دیہات میں ہوں، وہ سب نمازِ عید کی دو رکعتیں پڑھیں گے۔

جس کی دلیل نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے کہ یہ (عید کا تہوار) ہماری، اہلِ اسلام کی عید ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عید کے حکم میں تمام اہلِ اسلام کو شریک فرمایا، جس میں مرد، عورتیں اور گاؤں کے لوگ، اور وہ لوگ، جو عید گاہ اور مسجد میں نہ آ سکیں، سب شامل ہیں۔

اور اس کی دلیل حضرت انس اور حضرت عطاء اور حضرت عکرمہ وغیرہ کی روایات بھی ہیں“۔ انتہٰی۔ [1]

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

"ابن أبی عتبة "بضم المهملة وسكون المثناة فوق والموحدة، بالنصب بدل عن (مولى)، أو بيان، وفی بعضها :(مولاهم)؛ أى :مولى أنس وأصحابه.

"بالزاوية "هى موضع على فرسخين من البصرة(اللامع الصبيح بشرح الجامع الصحيح،لشمس الدين البِرُماوی، ج۴،ص۳۸۷، كتاب العيدين،باب إذا فاته العيد يصلى ركعتين وكذلک النساء ، ومن كان فی البيوت والقرى)

[1] باب إذا فاته العيد يصلى ركعتين وكذلک النساء ومن كان فی البيوت والقرى، لقول النبی -صلى الله عليه وسلم :-هذا عيدنا أهل الإسلام.

وأمر أنس بن مالک مولاهم ابن أبی عتبة بالزاوية فجمع أهله وبنيه وصلى كصلاة أهل المصر وتكبيرهم.

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

''شرح صحیحُ البخاری لابنِ بطال'' کا حوالہ

علامہ ابنِ بطال نے ''شرح صحیحُ البخاری'' میں امام بخاری کی عبارت کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا کہ:

''جس کی نمازِ عید فوت ہوجائے، اور اسی طرح عورتیں اور وہ لوگ جو اپنے گھروں میں ہوں، وہ عید کی نماز دو رکعات کی شکل میں ہی پڑھیں گے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کی وجہ سے کہ یہ ہمارے اہلِ اسلام کی عید ہے۔

اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کے واقعہ کی وجہ سے، جو کہ صحابیِ رسول ہیں، اور حضرت عکرمہ اور حضرت عطاء کی روایات کی وجہ سے''۔انتہٰی۔ [1]

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

وقال عكرمة :أهل السواد يجتمعون فى العيد يصلون ركعتين كما يصنع الإمام.

وقال عطاء :إذا فاته العيد صلى ركعتين.

هذا (باب) بالتنوين (إذا فاته العيد) أى :إذا فات الرجل صلاة العيد مع الإمام، سواء كان لعارض أم لا، (يصلى ركعتين) كهيئتها مع الإمام، لا أربعا.

خلافا لأحمد فيما نقل عنه، وعبارة المرداوى فى تنقيح المقنع :وإن فاتته سن قضاؤها قبل الزوال وبعده على صفاتها، وعنه :أربع بلا تكبير بسلام، قال بعضهم :كالظهر .اهـ.

واستدل بما روى سعيد بن منصور، بإسناد صحيح عن ابن مسعود من قوله :من فاته العيد مع الإمام فليصل أربعا .وقال المزنى وغيره :إذا فاتته لا يقضيها .وقال الحنفية :لا تقضى، لأن لها شرائط لا يقدر المنفرد على تحصيلها.

(وكذلك النساء) اللاتى لم يحضرن المصلى مع الإمام (و) كذلك (من كان فى البيوت) ممن لم يحضرها معه أيضا (و) كذلك من كان فى (القرى) ولم يحضر (لقول النبى -صلى الله عليه وسلم-) هذا عيدنا أهل الإسلام .(بنصب أهل على الاختصاص، أو منادى مضاف حذف منه حرف النداء، ويؤيده رواية أبى ذر فى نسخة عن الكشميهنى :يا أهل الإسلام؛ وأشار إلى حديث عائشة(إرشاد السارى لشرح صحيح البخارى،للقسطلانى،ج٢،ص٢٢٦، كتاب العيدين،باب إذا فاته العيد يصلى ركعتين)

[1] باب إذا فاته العيد يصلى ركعتين وكذلك النساء ومن كان فى البيوت والقرى، لقوله عليه السلام :هذا عيدنا أهل الإسلام، وأمر أنس بن مالك مولاهم ابن أبى عتبة بالزاوية، فجمع أهله

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

''فتحُ الباری لابنِ رجب'' کا حوالہ

علامہ ابنِ رجب نے ''فتح الباری شرح صحیحُ البخاری'' میں فرمایا کہ:

''اگر (مثلاً تیسویں) دن کے حصہ میں ہی یومِ عید کا علم ہو (کہ آج عید کا دن ہے) تو اگر زوال سے پہلے علم ہو، تو وہ اسی وقت نکل کر عید کی نماز پڑھیں گے۔

اور اگر اُن کو زوال کے بعد دن کے حصہ میں گواہی حاصل ہو، تو اکثر علماء کا قول یہ ہے کہ وہ اگلے دن صبح کو عید کی نماز کے لئے نکلیں گے، عمر بن عبدالعزیز، امام ثوری، امام ابوحنیفہ، امام اوزاعی، حضرت لیث اور اسحاق، اور امام احمد اور ابنِ منذر، ان سب کا یہی قول ہے، جس کی دلیل عمیر بن انس کی حدیث ہے۔

اور امام شافعی نے اس میں توقف کا اظہار کیا ہے، اور فرمایا کہ اگر یہ حدیث ثابت ہو، تو ہم اس کے مطابق قول کریں گے، جبکہ اس حدیث کو متعدد محدثین نے صحیح قرار دیا ہے، اور امام احمد نے اس سے دلیل پکڑی ہے (لہٰذا امام شافعی کے نزدیک بھی یہ حدیث قابلِ حجت ہونی چاہئے)

اور ایک جماعت کا قول یہ ہے کہ مذکورہ صورت میں عید کی نماز ساقط ہوجائے گی، اور قضاء نہیں کی جائے گی، جیسا کہ جمعہ کو فوت ہونے کے بعد قضاء نہیں کیا جاتا، امام مالک، ابوثور اور امام شافعی کا ایک قول یہی ہے۔

لیکن امام شافعی کا مشہور قول یہ ہے کہ اگر شہر کے چھوٹا ہونے کی وجہ سے لوگوں کا دن کے باقی حصہ میں جمع ہونا ممکن ہو، تو اسی دن نمازِ عید پڑھیں گے، ورنہ اگلے

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

وبنيه، فصلى كصلاة أهل المصر وتكبيرهم .وقال عكرمة :أهل السواد يجتمعون فى العيد، يصلون ركعتين، كما يصنع الإمام .وقال عطاء :إذا فاته العيد صلى ركعتين(شرح صحيح البخارى لابن بطال، ج٢،ص ٥٧٢،٥٧٣، كتاب العيدين،باب إذا فاته العيد يصلى ركعتين)

دن تک مؤخر کریں گے، اور امام شافعی کے اصحاب نے اس پر، اس مسئلہ کو مبنی کیا ہے کہ اگلے دن تک تاخیر کرنا، قضاء کہلائے گا، یا اداء کہلائے گا۔

اگر یہ کہا جائے کہ وہ اداء ہے، تو زوال کے بعد نہیں پڑھی جائے گی، کیونکہ اس کی ادائیگی کا وقت فوت ہو گیا۔

اور اگر کہا جائے کہ وہ قضاء ہے، تو اُن کے نزدیک دن کے باقی حصہ میں اگر لوگوں کو نمازِ عید کے لئے جمع ہونا ممکن ہو، تو اس کو اداء کیا جائے گا، ان کے نزدیک یہی قول زیادہ صحیح ہے، اور ان کے نزدیک اگلے دن تک مؤخر کرنے کے مقابلہ میں یہی افضل ہے، اور ان کے نزدیک اگر عید کا دن گزرنے کے بعد رات میں اس کا علم ہوا، تو بلا اختلاف اگلے دن پڑھی جائے گی، اور اس صورت میں ان کے نزدیک (یہ نمازِ عید) بلا اختلاف، اداء کہلائے گی"۔ انتھٰی۔ [1]

---

[1] وأما إن لم يعلم بالعيد إلا فى أثناء النهار، فإن علم به قبل زوال الشمس خرجوا من وقتهم، وصلوا صلاة العيد.

وإن شهدوا بعد الزوال فى أثناء النهار، فقال أكثر العلماء :يخرجون من الغد للصلاة، وهو قول عمر بن عبد العزيز والثورى وأبى حنيفة والأوزاعى والليث وإسحاق وأحمد وابن المنذر.

واستدلوا بما روى أبو عمير بن أنس، قال :حدثنى عمومة لى من الأنصار من أصحاب النبى -صلى الله عليه وسلم -قالوا :غم علينا هلال شوال، فأصبحنا صياما، فجاء ركب من آخر النهار، فشهدوا عند رسول الله -صلى الله عليه وسلم -أنهم رأوا الهلال بالأمس، فأمر الناس أن يفطروا من يومهم، وأن يخرجوا لعيدهم من الغد.

خرجه الإمام أحمد وأبو داود والنسائى وابن ماجه.

وصححه إسحاق بن راهويه والخطابى والبيهقى.

واحتج به أحمد.

وتوقف فيه الشافعى، وقال :لو ثبت قلنا به.

وقالت طائفة :تسقط ولا تصلى بعد ذلك، كما لا تقضى الجمعة إذا فاتت، وهو قول مالك وأبى ثور والشافعى -فى قول له.

والقول المشهور، عنه :أنه إن أمكن جمع الناس فى بقية يومهم لصغر البلد خرجوا، وصلوا فى بقية اليوم، وإلا أخروه إلى الغد.

وبنى ذلك أصحابه على أن التأخير إلى الغد قضاء، أو أداء .

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

اور علامہ ابنِ رجب نے ''شرح صحیحُ البخاری ''میں امام بخاری کی عبارت کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا کہ:

''جب کسی کی نمازِ عید فوت ہوجائے، اور اسی طریقہ سے عورتیں، اور وہ سب لوگ جو گھروں میں ہوں، خواہ عذر کی وجہ سے، یا بغیر عذر کے، اور وہ عید کی نماز میں شریک نہ ہوں، تو وہ نمازِ عید کی دو رکعتیں پڑھیں گے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کی وجہ سے کہ یہ ہماری، یعنی اہلِ اسلام کی عید ہے، اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت اور حضرت عکرمہ اور حضرت عطاء کی روایات کی وجہ سے۔

امام بخاری نے اس باب میں چند مسائل ذکر کیے ہیں۔

جن میں ایک مسئلہ یہ ہے کہ جس کی امام کے ساتھ نمازِ عید فوت ہوجائے، وہ دو رکعتیں پڑھے گا۔

حضرت حسن، اور ابنِ سیرین اور مجاہد اور عکرمہ اور حضرت عطاء اور ابراہیم نخعی سے بھی اسی طرح کی روایات مروی ہیں۔

اور امام ابوحنیفہ کی ایک روایت بھی اسی کے مطابق ہے۔

اور امام مالک اور اوزاعی اور امام شافعی کا یہی قول ہے، اور امام احمد کی ایک روایت بھی اس کے مطابق ہے۔

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

فإن قيل :إنه أداء ، لم تصل بعد الزوال؛ لأن وقت أدائها قد فات.

وإن قيل :إنه قضاء -وهو أصح عندهم -، قضيت فی بقية النهار، إذا أمكن جمع الناس فيه.

وهو أفضل -عندهم -من تـأخيرها إلى الغد، فی أصح الوجهين عندهم .ولا خلاف عندهم، أنه إذا لم يعلم بالعيد إلا فی الليلة الثانية، أنه يصلی من الغد.

قالوا :ويكـون أداء ، بغير خلاف(فتح الباری شرح صحيح البخاری،لابن رجب، ج٨، ص ٤٦٢، ٤٦٣، أبواب العيدين،باب التكبير إلى العيد)

البتہ بعض دوسرے حضرات کا کہنا یہ ہے کہ وہ دو کے بجائے چار رکعتیں پڑھیں گے، اور بعض نے دو اور چار رکعتیں پڑھنے میں اختیار دیا ہے۔

اور امام احمد نے ایک روایت میں دو اور چار رکعتوں کی روایات کے مابین اس طرح جمع کیا ہے کہ اگر جماعت کے ساتھ عید کی نماز پڑھی جائے، تو امام کی طرح دو رکعتیں پڑھی جائیں، اور اگر تنہاء پڑھے، تو چار رکعتیں پڑھے۔

اور امام اسحاق نے فرمایا کہ اگر فوت شُدہ نمازِ عید کو گھر میں پڑھے، تو چار رکعات پڑھے، ظہر کی طرح اور اگر عید گاہ میں پڑھے، تو تکبیرِ زوائد کے ساتھ دو رکعتیں پڑھے"۔انتہیٰ۔ [1]

---

[1] باب إذا فاته العيد يصلي ركعتين، وكذلك النساء ، ومن كان في البيوت والقرى؛ لقول النبي -صلى الله عليه وسلم :-(هذا عيدنا أهل الإسلام).

وأمر أنس بن مالك مولاهم ابن أبي عتبة بالزاوية، فجمع أهله وبنيه، فصلى بهم كصلاة أهل المصر وتكبيرهم.

وقال عكرمة :أهل السواد يجتمعون في العيد، يصلون ركعتين، كما يصنع الإمام .

وكان عطاء إذا فاته العيد صلى ركعتين.

ذكر البخاري في هذا الباب مسائل.

أحدها:

من فاته صلاة العيد مع الإمام من أهل المصر، فإنه يصلي ركعتين.

وحكاه عن عطاء .

وحكى -أيضا -عن أبي حنيفة والحسن وابن سيرين ومجاهد وعكرمة والنخعي، وهو قول مالك والليث والأوزاعي والشافعي وأحمد -في رواية، عنه.

ثم اختلفوا :هل يصلي ركعتين بتكبير كتكبير الإمام، أم يصلي بغير تكبير؟

فقال الحسن والنخعي ومالك والشافعي وأحمد -في رواية :-يصلي بتكبير، كما يصلي الإمام.

واستدلوا بالمروى عن أنس، وأنس لم يفته في المصر بل كان ساكنا خارجا من المصر بعيدا منه، فهوفي حكم أهل القرى.

وقد أشار إلى ذلك الإمام أحمد -في رواية عنه.

والقول بانه يصلي كما يصلي الإمام قول أبي حنيفة وأبي بكر بن أبي شيبة، حتى قال :لايكبر إلا كما يكبر الإمام، لا يزيد عليه ولا ينقص.

وكذا قاله الإمام أحمد -في رواية أبي طالب.

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

”التوضیح شرحُ الجامع الصحیح“ کا حوالہ

علامہ ابنِ ملقن نے ”التوضیح شرحُ الجامع الصحیح “میں امام بخاری کی عبارت

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

وعن ابن سيرين، قال :كانوا يستحبون إذا فات الرجل العيدان أن يمضى إلى الجبان، فيصنع كما يصنع الإمام.

وقال أحمد -في رواية الأثرم :-أن صليت ذهب إلى الجبان فصلى، وإن شاء صلى مكانه.

وقال -في رواية إسماعيل بن سعيد :-إذا صلى وحده لم يجهربالقراء ة، وإن جهر جاز.

وهذا عنده حكم المصلى الصلاة الجهرية مفردا، فلو صلاها في جماعة جهر بها بغير إشكال، كما فعله الليث بن سعد.

وقد ذهب جماعة من العلماء إلى أن الإمام لايجهر بالقرأة فى صلاة العيدين إلا بمقدار ما يسمع من يليه، روى ذلك عن على، وهو قول الحسن والنخعى والثورى.

وذكر الحسن، عن أن النبى -صلى الله عليه وسلم -وأبا بكر وعمر كانوا يسمعون القراء ة فى العيدين والجمعة من يليهم.خرجه المروزى فى (كتاب العيدين).

وهو قول الثورى فى الجمعة والعيدين جميعا.

وقال عطاء والأوزاعى وأحمد -في الرواية الأخرى :-يصلى من فاته العيد ركعتين بغير تكبير.

هذه الرواية، حكاها أبو بكر عبد العزيز بن جعفر فى كتاب (الشافى).

وقال أحمد :إنما التكبير مع الجماعة.

وجعله أبو بكر عبد العزيز كالتكبير خلف المكتوبة فى أيام التشريق.

وروى حنبل، عن أحمد، أنه مخير، إن شاء صلى بتكبير، وإن شاء صلى بغير تكبير.

وقالت طائفة :من فاتته صلاة العيد مع الإمام صلى أربع ركعات.

روى ذلك عن ابن مسعود من غير وجه.

وسوى ابن مسعود بين من فاتته الجمعة، ومن فاته العيد، فقال -فى كل منهما :-يصلى أربعا.

واحتج به الإمام أحمد.

ولا عبرة بتضعيف ابن المنذر له؛ فإنه روى بأسانيد صحيحة.

وهذا قول الشعبى والثورى وأحمد -فى رواية أخرى، عنه -، وهى اختيار أبى بكر عبد العزيز بن جعفر من أصحابنا، بناء على اختيارهم اشتراط الجماعة للعيد والاستيطان، ويكون الأربع عيدا.

نص عليه أحمد فى رواية الميمونى.

وهذا يشبه قول ابن شاقلا :إن أدرك تشهد الجمعة يصلى أربعا، وهى جمعة له، كما سبق ذلك.

وعلى هذا، فيصلى وحده من غير جماعة، نص عليه أحمد فى رواية محمد بن الحكم، وكذا ذكره أبو بكر عبد العزيز.

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

کی شرح کرتے ہوئے فرمایا کہ:

’’اوراسی طریقہ سے عورتیں اور جولوگ گھروں اور گاؤں میں ہوں، وہ بھی عید کی

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

وإنما يصلى فى جماعة إذا قلنا :يصلى صلاة العيد على صفتها.
وهل يصلى الأربع بسلام واحد، أو يخير بين ذلك وبين صلاتها بسلامين؟
فيه عن أحمد روايتان.
واختار أبو بكر صلاتها بسلام واحد، تشبيها لصلاتها بصلاة من تفوته الجمعة.
وعن أحمد :يخير بين أن يصلى ركعتين أو أربعا.
وهذا مذهب الثورى الذى حكاه أصحابه، عنه.
واستدل أحمد، بأنه روى عن أنس، أنه صلى ركعتين، وعن ابن مسعود أنه صلى أربعا.
وكذلك روى عن على، أنه أمر من يصلى بضعفة الناس فى المسجد أربعا، ولا يخطب بهم.
وروى أحمد بن القاسم، عن أحمد الجمع بين فعل أنس وقول ابن مسعود على وجه آخر، وهو :إن صلى من فاته العيد جماعة صلى كصلاة الإمام ركعتين، كما فعل أنس، وإن صلى وحده صلى أربعا، كما قال ابن مسعود.
وقال إسحاق :إن صلاها فى بيته صلاها أربعا كالظهر، وإن صلاها فى المصلى صلاها ركعتين بالتكبير؛ لأن عليا أمر الذى يصلى بضعفة الناس فى المسجد أن يصلى أربعا، ركعتين مكان صلاة العيد، وركعتين مكان خروجهم إلى الجبان، كذا رواه حنش بن المعتمر عن على.
واعلم؛ أن الاختلاف فى هذه المسألة ينبنى على أصل، وهو :أن صلاة العيد :هل يشترط لها العدد والاستيطان وإذن الإمام؟
فيه قولان للعلماء، هما روايتان عن أحمد.
وأكثر العلماء، على أنه لايشترط لها ذلك، وهو قول مالك والشافعى.
ومذهب أبى حنيفة وإسحاق :أنه يشترط لها ذلك.
فعلى قول الأولين :يصليها المنفرد لنفسه فى السفر والحضر والمرأة والعبد ومن فاتته، جماعة وفرادى.
لكن لا يخطب لها خطبة الإمام؛ لأن فيه افتئاتا عليه، وتفريقا للكلمة.
وعلى قول الآخرين :لايصليها إلا الإمام أو من أذن له، ولا تصلى إلا كما تصلى الجمعة، ومن فاتته، فإنه لايقضيها على صفتها، كما لايقضى الجمعة على صفتها.
ثم اختلفوا :فقال أبو حنيفة وأصحابه :لاتقضى بالكلية، بل تسقط، ولا يصلى من فاتته مع الإمام عيدا أصلا، وإنما يصلى تطوعا مطلقا، إن شاء صلى ركعتين، وإن شاء صلى أربعا.
وقال أحمد وإسحاق :بل تقضى كما قال ابن مسعود وغيره من الصحابة.
وليست العيد كالجمعة؛ ولهذا يصليها الإمام والناس معه إذا لم يعلموا بالعيد إلا من آخر النهار من

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

نماز پڑھیں گے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول کی وجہ سے کہ یہ ہمارے اہلِ اسلام کی عید ہے۔

اور حضرت عکرمہ، اور حضرت عطاء کی روایات کی وجہ سے، نیز حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت کی وجہ سے، جس کو دوسرے محدثین نے سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔

پھر علماء کا اس شخص کے بارے میں اختلاف ہے کہ جس کی امام کے ساتھ نمازِ عید فوت ہوجائے، تو ایسا شخص بعض حضرات کے نزدیک امام کی طرح دو رکعت پڑھے گا، یہ قول حضرت عطاء، اور نخعی اور حسن، اور ابنِ سیرین سے مروی ہے، اور یہی قول امام مالک، اور امام شافعی اور ابوثور کا ہے، لیکن امام مالک نے اس کو واجب قرار نہیں دیا، بلکہ مستحب قرار دیا ہے۔

امام شافعی کا قول بھی اسی طرح کا ہے۔

اور امام اوزاعی نے فرمایا کہ وہ دو رکعتیں پڑھے گا، جس میں وہ قرائت نہیں کرے گا، اور امام والی تکبیر بھی نہیں کہے گا، اور اس کو یہ دو رکعتیں پڑھنا لازم بھی نہیں۔

اور ایک جماعت کا قول یہ ہے کہ اگر وہ چاہے، تو چار رکعتیں پڑھ لے گا، کیونکہ امام کے ساتھ نکلنے کی صورت میں تو دو رکعتیں پڑھی جاتی ہیں، جیسا کہ جو شخص جمعہ میں امام کے ساتھ شریک نہ ہو، وہ چار پڑھتا ہے، یہ حضرت علی، اور ابنِ مسعود

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

غد يوم الفطر، والجمعة لا تقضى بعد خروج وقتها، ولأن الخطبة ليست شرطا لها، فهي كسائر الصلوات، بخلاف الجمعة.

والذين قالوا :تقضى إذا فاتت مع الإمام، لم يختلفوا أنها تقضى ما دام وقتها باقيا .

فإن خرج وقتها، فهل تقضى؟ قال مالك :لاتقضى.

وعن الشافعي قولان. والمشهور عندنا :إنما تقضى.

وخرجوا فيها رواية اخرى :أنها لاتقضى(فتح البارى شرح صحيح البخارى،لا بن رجب، ج ۹ ،ص ۷۵ ،الىٰ ۸۰ ،أبواب العيدين،باب إذا فاته العيد يصلى ركعتين)

سے مروی ہے، امام ثوری، اور امام احمد کا بھی یہی قول ہے، لیکن اگر وہ چاہے، تو ایک سلام سے پڑھے، اور اگر چاہے، تو دو سلاموں سے پڑھے۔

اور امام ابوحنیفہ کا قول یہ ہے کہ اگر چاہے، تو نماز پڑھ لے، اور اگر چاہے، تو نہ پڑھے، پھر اگر نماز پڑھے، تو چار، اور دو رکعتیں پڑھنے میں اختیار ہے۔

اور امام اسحاق نے فرمایا کہ اگر عیدگاہ میں پڑھے، تو امام کی طرح دو رکعات پڑھے، ورنہ تو چار رکعات پڑھے۔

لیکن تمام اقوال میں صواب ودرستگی کے اعتبار سے اولیٰ اور بہتر قول یہ ہے کہ اسی طریقہ سے پڑھے، جس طریقہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سنت قرار دیا ہے، اور اسی کی طرف امام بخاری نے اشارہ کیا ہے، اور اس پر حدیث سے استدلال کیا ہے۔

جس میں یہ حدیث بھی داخل ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے ہماری سنت کے مطابق عمل کیا، اس نے ہماری سنت کو پالیا، اور جس نے امام کی نماز کی طرح سے نماز کو پڑھا، تو اس نے بھی سنت کو پایا، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت، نمازِ عید کے دو رکعتیں پڑھنے کی ہے، نہ کہ چار رکعتیں پڑھنے کی۔

اور عید کے دن کے علاوہ میں نمازِ عید پڑھنے سے متعلق فقہاء کا اختلاف ہے۔

اور بعض متاخرین نے امام ابوحنیفہ کا یہ مذہب نقل کیا ہے کہ جس کی امام کے ساتھ نماز فوت ہوجائے، تو وہ قضاء نہیں کرے گا، جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر امام جماعت کے ساتھ عید کی نماز پڑھ لے، اور بعض کی نماز فوت ہوجائے، یہاں تک کہ اس کا وقت نکل جائے، تو وہ پھر تنہاء اور جماعت کے ساتھ نماز نہیں پڑھے گا، اور اس سے نمازِ عید ساقط ہوجائے گی۔

لیکن اگر دوسروں کے ساتھ ساتھ امام کی نماز بھی فوت ہوجائے، تو وہ اگلے دن

جماعت کے ساتھ پڑھے گا، جبکہ کسی عذر کی وجہ سے فوت ہوئی ہو، مثلاً اُن کو زوال کے بعد عید کے دن ہونے کا علم ہوا ہو۔

اور ابنِ حزم نے فرمایا کہ جو شخص عیدُ الفطر کے دن، عید کے لئے نہ نکلا، تو وہ دوسری مرتبہ نکلے گا، اور اگر دوسری مرتبہ بھی نہیں نکلا، تو اگلے دن سورج کے زوال سے پہلے نکلے گا، کیونکہ یہ فعلِ خیر ہے، اور یہی امام ابوحنیفہ اور امام شافعی کا قول ہے۔

اور عیدُ الاضحیٰ میں امام ابوحنیفہ کے نزدیک تیسرے دن بھی نکلے گا''۔انتھٰی۔ [1]

---

[1] (وكـذلک النساء ، ومن كان فى البيوت والقرى لقول النبى -صـلى الله عليه وسلم " :-هذا عيدنا أهل الإسلام"

(وقال عكرمة :أهـل السـواد يجتمعون فى العيد يصلون ركعتين كما يصنع الإمام .وقال عطاء :إذا فاته العيد صلى ركعتين.

هذا التعليق سلف فى باب سنة العيدين خلا :أهل الإسلام، وكأنه من البخارى.

قال :(وأمـر أنـس بـن مـالک مـولاهم ابن أبى عتبة بالزاوية، فجمع أهلة وبنيه، وصلى كصلاة أهل المصر وتكبيرهم.

وهذا رواه ابن أبى شيبة عن ابن علية، عن يونس قال :حدثنى بعض آل أنس أن أنسا كان ربما جمع أهله وحشمه يوم العيد فيصلى بهم عبيد الله بن أبى عتبة ركعتين .

وقال البيهقى فى "المعرفة :"وروينا عن أنس بن مالک أنه كان إذا فاتته صلاة العيد مع الإمام جمع أهله فصلى بهم مثل صلاة الإمام فى العيد.

قال :وفى رواية أخرى :أمـر مـولاه عبيـد الله ابن أبى عتبة فيصلى بهم كصلاة أهل العصر ركعتين، ويكبر بهم كتكبيرهم .قال :وهو قول محمد بن سيرين وعكرمة .

وأسنده فى "سننه "من حديث هشيم عن عبد الله بن أبى بكر بن أنس ابن مالک قال :كان أنس إذا فاتته صلاة العيد مع الإمام جمع أهله فصلى بهم مثل صلاة الإمام فى العيد .ثم قال :ويذكر عن أنس أنـه كـان إذا كـان بمنزله بالزاوية فلم يشهد العيد بالبصرة جمع مواليه وولده ثم يأمر مولاه عبد الله بن أبى عتبة فيصلى بهم كصلاة أهل العصر ركعتين، ويكبر بهم كتكبيرهم.

وابن أبى عتبة (خ م س) جاء فى بعض الروايات :عبد الله.

وفى بعضها :عبيد الله .وفى "الجعديات "عـن شعبة، عن قتادة، عن عبد الله -أو عبيد الله، مولى لأنس -عن أبى سعيد الخدرى .وهو روى عن مولاه أنس وعدة من الصحابة، وروى له، مسلم أيضا، وذكره ابن حبان فى "ثقاته "فى عبد الله مكبرا .

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

علامہ ابنِ حزم کی اصل عبارت آگے آ رہی ہے۔

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

قال البخارى :(وقال عكرمة :أهل السواد يجتمعون فى العيد يصلون ركعتين كما يصنع الإمام.) وهذا رواه ابن أبى شيبة عن غندر، عن شعبة، عن قتادة عن عكرمة أنه قال فى القوم يكونون فى السواد فى السفر فى عيد فطر أو أضحى، قال :يجتمعون فيصلون ويؤمهم أحدهم .

قال البخارى :(وقال عطاء :إذا فاته العيد صلى ركعتين) وهذا رواه ابن أبى شيبة عن يحيى بن سعيد، عن ابن جريج، عن عطاء قال :يصلى ركعتين ويكبر .ذكره ابن أبى شيبة فى الرجل تفوته الصلاة فى العيدين، كم يصلى؟ .

ثم ذكر حديث عائشة أن أبا بكر رضى الله عنه دخل عليها وعندها جاريتان فى أيام منى تدففان - الحديث.

وسلف فى باب :الحراب والدرق يوم العيد .

أما فقه الباب:

فاختلف العلماء فيمن فاته صلاة العيد مع الإمام، فقالت طائفة :يصلى ركعتين مثل صلاة الإمام . روى ذلك عن عطاء والنخعى والحسن وابن سيرين، وهو قول مالك والشافعى وأبى ثور، إلا أن مالكا قال :يستحب له ذلك من غير إيجاب .قلت :وكذا قال الشافعى .وقال الأوزاعى :يصلى ركعتين ولا يجهر بالقراء ة، ولا يكبر بتكبير الإمام، وليس بلازم .

وقالت طائفة :يصليها أربعا إن شاء ؛ لأنها إنما تصلى ركعتين إذا صليت مع الإمام بالبروز لها، كما على من لم يحضر الجمعة مع الإمام أن يصلى أربعا .روى ذلك عن على وابن مسعود، وبه قال الثورى وأحمد، لكن إن شاء بتسليمة وإن شاء بتسليمتين .

وقال أبو حنيفة :إن شاء صلى وإن شاء لم يصل، فإن صلى صلى أربعا، وإن شاء ركعتين.

وقال إسحاق :إن صلى فى الجبانة صلى كصلاة الإمام وإلا صلى أربعا.

وأولى الأقوال بالصواب أن يصليها كما سنها رسول الله -صلى الله عليه وسلم -، وهو الذى أشار إليه البخارى، واستدل على ذلك بقوله" :هذا عيدنا أهل الإسلام "و"إنها أيام عيد "وذلك إشارة إلى الصلاة، وقد أبان ذلك بقوله " :أول نسكنا فى يومنا هذا أن نصلى ثم ننحر، فمن فعل ذلك فقد أصاب سنتنا. ومن صلى كصلاة الإمام فقد أصاب السنة.

واتفق مالك والكوفيون والمزنى على أنه لا تصلى صلاة العيد فى غير يوم العيد .وقال الشافعى فى أظهر قوليه :إنها تقضى متى شاء .)وحكى ابن المنذر عنه مثل ذلك، وفى قول :تصلى من الغد أداء .

واحتج عليه المزنى فقال :لما كان ما بعد الزوال أقرب إلى وقتها من اليوم الثانى ، وأجمعوا أنها لا تصلى إلا قبل الزوال فأحرى أن لا تصلى من الغد إذ هو أبعد.

وحرر بعض المتأخرين مذهب أبى حنيفة فقال :من فاتته مع الإمام لم يقضها .يعنى أنه صلاها الإمام فى جماعة وفاتت بعضهم حتى خرج وقتها فإنه لا يصليها وحده ولا جماعة، وسقطت عنه .وأما إذا

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

’’فیضُ الباری شرحُ البخاری‘‘ کا حوالہ

مشائخِ دیوبند و اکابرِ دیوبند میں معروف علمی شخصیت، علامہ انور شاہ کشمیری نے ’’فیضُ الباری شرحُ البخاری‘‘ میں امام بخاری کی عبارت کی تشریح کے ذیل میں فرمایا کہ:

’’یہ بات جان لینی چاہئے کہ جماعت سے نمازِ عید کے فوت ہوجانے کے بعد، عید کی دو رکعتوں کا قضاء ہونا، دوسرا مسئلہ ہے، اور یہ اس کے قول پر بھی صادق آتا ہے، جو جمعہ فی القریٰ کا قائل نہ ہو، جیسا کہ حنفیہ۔

اور ہماری فقہ حنفی کی کتابوں میں یہ بات مذکور ہے کہ جس کی نمازِ عید فوت ہوجائے، تو وہ اپنے گھر میں، دو، یا چار رکعتیں پڑھے گا۔

لیکن حنفیہ میں سے کسی نے یہ بات نہیں لکھی کہ وہ اس نماز میں عید کی زائد تکبیرات پڑھے گا، یا نہیں پڑھے گا (رہا بعض کا یہ کہنا کہ چاشت کی طرح پڑھے گا، تو یہ زائد تکبیرات کے منافی نہیں، کیونکہ اس کا مقصود، تکبیرات کی نفی کے بجائے، جہری قرائت اور خطبہ کی نفی بھی ہوسکتی ہے)

پھر عید کی نماز کی قضاء فرض نمازوں کی طرح کی قضاء نہیں ہے، جو کہ فوت ہونے

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

فاتت الإمام أيضا فإنه يصليها مع الجماعة فى اليوم الثانى، إذا كان الفوات لعذر، مثل أن يظهر أنهم صلوها بعد الزوال فى يوم غير .

وقال ابن حزم :من لم يخرج يوم الفطر ولا يوم الأضحى للعيد خرج لها ثانية، فإن لم تخرج غدوة خرجت ما لم تزل الشمس؛ لأنه فعل خير، والله تعالى يقول :(وافعلوا الخير) (الحج77 :) ثم قال :وهذا قول أبى حنيفة والشافعى، ولو لم يخرج فى الثانى من الأضحى وخرج فى الثالث فقد قال به أبو حنيفة، وهو فعل خير لم يأت عنه نهى، واستدل بحديث أبى داود والنسائى وابن ماجه من حديث أبى عمير بن أنس بن مالك عن عمومة له من أصحاب النبى -صلى الله عليه وسلم -أن ركبا جاء وا إلى النبى -صلى الله عليه وسلم -يشهدون أنهم رأوا الهلال بالأمس، فأمرهم أن يفطروا وإذا أصبحوا يغدو إلى مصلاهم صححه الخطابى والبيهقى وابن المنذر (التوضيح لشرح الجامع الصحيح،لابن الملقن،ج ١،ص ١٤٨ الیٰ ١٥٣ ، كتاب العيدين،باب إذا فاته العيد يصلى ركعتين)

کے بعد بھی ضروری رہتی ہے، بلکہ عید کی نماز کی قضاء سنت نماز کی قضاء کی طرح ہے (جس کو بعد میں پڑھنا جائز ومستحب ہے)

چنانچہ ''العناية'' میں ہے کہ سنت کی بھی قضاء ہوتی ہے، لیکن یہ سنت سے استحباب کی طرف نزول کرلیتی ہے (اس حیثیت سے امام ابوحنیفہ کا قضاء کے متعلق یہ قول، دوسرے فقہاء کے اقوال کے مطابق، یا ان کے قریب تر کہلائے گا)

اوراس میں راز یہ ہے کہ سنت، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے استمرارِ فعل سے ثابت ہوتی ہے، اور وہ وقتی خصوصیات کے ساتھ محفوظ ہوتی ہے، جس کے فوت ہونے کے بعد اس کا مطالبہ نہیں ہوتا۔

برخلاف فرائض اور واجبات کے، کیونکہ ان کا حکم، امر سے ثابت ہوتا ہے، اور جب وہ وقت کی وجہ سے فوت ہوجائے، تو اس کا مطالبہ باقی رہتا ہے۔

اور حضرت عطاء کے قول سے نمازِ عید کی قضاء کا حکم ثابت ہوتا ہے، جس کا حنفیہ کے موافق ہونا، جمعہ کے باب میں اس سے زیادہ صراحت کے ساتھ گزر چکا ہے، کہ گاؤں میں جمعہ نہیں ہے۔

اس لیے جمعہ فی القریٰ اور عیدین کی قضاء میں تمیز وفرق کرنا مناسب ہے (یعنی حضرت عطاء کی اس روایت سے گاؤں میں ابتداءً نمازِ عید کے مشروع ہونے کے بجائے، نمازِ عید کی قضاء پڑھنے کا ثبوت ہوتا ہے)

پھر یہ مسئلہ فوت شدہ نمازِ عید کے متعلق ہے، نہ کہ عید کی ادائیگی کے متعلق، اوراس میں کوئی نزاع نہیں، لیکن امام بخاری نے ان دونوں مسئلوں کو جمع فرمادیا۔

تاہم امام بخاری رحمہ اللہ کے کلام میں اس کی کوئی دلیل نہیں، کہ انہوں نے ابتداءً جمعہ فی القریٰ کو جائز قرار دیا ہو۔

کیونکہ انہوں نے ''الفائتة'' کا باب باندھا ہے، نہ کہ ''اداء'' کا، لہٰذا یہ بات ممکن

ہے کہ وہ گاؤں میں پڑھی جانے والی عید ''فـــائتة'' (یعنی فوت شدہ) ہو، نہ کہ گاؤں میں پڑھے جانے والی عید کی اداءنماز ہو۔

اور دوسرے فقہاء جمعہ کی قضاء کے قائل نہیں، بلکہ اس کے عوض ظہر کے قائل ہیں (لہٰذا اس سے جمعہ فی القریٰ اور اس پر قیاس کرتے ہوئے گاؤں میں عید کی نماز کا ثبوت نہ ہوگا)

اور میرے نزدیک حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فوت شدہ عید کو پڑھا تھا، لہٰذا حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت، موضعِ نزاع سے خارج ہے، کیونکہ قضاء کے ہم بھی منکر نہیں، البتہ حضرت عکرمہ کی روایت، نمازِعید کے گاؤں میں قائم کرنے میں صریح ہے''۔انتہٰی۔ [1]

---

[1] واعلم أن قضاء ركعتى العيد بعد الفوات مسألة أخرى، ويتأتى على مذهب من لا يقول بالجمعة فى القرى أيضا .ففى مبسوطات فقهنا :من فاتته سئخنة العيد .فإنه يصلى ركعتين أو أربعا فى بيته .ولم يكتب أحدهم ماذا يفعل مع التكبيرات .ثم إن هذا القضاء ليس كقضاء المكتوبات، فإنه يبقى واجبا بعد الفوات أيضا، بل هو كقضاء السنة.

وفى العناية :أن للسنة أيضا قضاء ، ولكنها تنحط عن السنية إلى الاستحباب .والسر فيه أن السنة تثبت باستمرار فعله صلى الله عليه وسلم وتكون محفوفة بالخصوصية الوقتية، فلا يبقى له طالب بعد الفوات، بخلاف الواجب والفرض، فإنه يثبت بالأمر، فإذا فات عن وقته بقى الأمر طالبا له. وهذا معنى ما كتبه الأصوليون أن الموجب فى الوقت هو الأمر، فإذا لم يؤده فى الوقت استمر طلب الأمر منه، وليس هكذا حال السنة فإنها تكون محفوفة بالخصوصية، فإذا فاتتا عن وقتها لا يبقى لها طالب بعده .ومن العجائب ما فى مختصر خليل أن قضاء السنن حرام.

قوله :(قال عطاء :إذا فاته العيد صلى ركعتين) فعطاء يقول بالقضاء ، مع أنه قد مر عنه فى باب الجمعة ما أصرح منه فى موافقته للحنفية :أن لا جمعة فى القرى .ولذا ينبغى التمييز بين مسألة الجمعة فى القرى وقضاء العيدين.

ثم إن مسألته فى العيد فى الفائتة دون المؤداة ولا نزاع فيها، والمصنف جمع بينهما، ولا دليل فى كلام المصنف رحمه الله تعالى أنه أجاز العيد فى القرى أو لا، لأنه بوب بالفائتة دون المؤادة . فيجوز أن تكون الإعادة من جهة الفوات لا لكون العيد فى القرى .ثم إنهم لم يقولوا بالقضاء عن الجمعة، بل يصلى الظهر، لأن الجمعة بدل عنها فلا تقام بها إلا عند استجماع شرائطها، والاستيقان بتحقيقها.

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

ہماری رائے بھی نمازِ عید کے مسئلہ میں علامہ کشمیری کی رائے کے مطابق ہے۔

علامہ کشمیری کی یہ رائے، اُن جلیلُ القدر تابعین اور بعض صحابۂ کرام کے آثار اور جمہور کے مطابق ہے، جن سے فقہائے کرام بھی اپنے دیگر مسائل میں استدلال فرماتے ہیں۔

اور غالباً ان ہی روایات وآثار کی بناء پر علامہ کشمیری نے ہر قسم کے تعصب سے بالاتر ہوکر، اس نماز کے عید کی قضاء ہونے کی طرف رُجحان ظاہر کیا ہے، جو کہ ایک دیانت دار محقق کی شان ہے، اور آگے آتا ہے کہ متعدد مشائخِ حنفیہ نے جو امام کے ساتھ نمازِ عید فوت ہونے کے بعد پڑھی جانے والی اس نماز کو عام چاشت کی قرار دیا ہے، جس سے اس کے نمازِ عید نہ ہونے کا تأثر ملتا ہے، تو وہ تعبیر والفاظ کا اختلاف ہے، اُس سے نمازِ عید کے عنوان سے پڑھنے کا گناہ ہونا لازم نہیں آتا، اور بظاہر ہمارے نزدیک یہی راجح ہے۔

البتہ یہاں یہ شبہ وارد ہوتا ہے کہ زوال تک تو عید کی نماز کے اداء ہونے کا وقت ہے، پھر وقت کے اندر تنہاء، یا باجماعت پڑھنے والے کو قضاء کا نام کیوں دیا گیا؟

تو اس کے جواب میں عرض ہے کہ جملہ فقہائے کرام کے نزدیک نمازِ عید کا کامل طریقہ یہی ہے کہ معروف ومعتاد طریقہ پر باجماعت اداء کی جائے، اور جو شخص، یا جو اشخاص اس معروف ومعتاد طریقہ سے ہٹ کر نماز پڑھیں گے، تو وہ ایک حیثیت سے قضاء ہو جائے گی۔

''المنتقیٰ شرح الموطأ'' کا حوالہ

سلیمان بن خلف قرطبی ''المنتقیٰ شرح الموطا'' میں فرماتے ہیں کہ:

''عید کی نماز امام مالک کے نزدیک جماعت کے ساتھ سنت ہے، اور جس کی نماز

﴿ گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ ﴾

قولہ :(وصلی کصلاۃ أھل المصر) وقد ثبت عندی أنہ فاتتہ العید فصلی کذلک، وحینئذ خرج أثر أنس رضی اللہ تعالی عنہ عن موضع النزاع، فإن القضاء لا ینکر ھنا أیضا .نعم، أثر عکرمۃ صریح فی إقامۃ العید فی القری (فیض الباری علی صحیح البخاری، ج۲،ص۴۷۸، ۴۷۹، کتاب العیدین، باب إذا فاتہ العید یصلی رکعتین، وکذلک النساء ، ومن کان فی البیوت والقری)

جماعت سے فوت ہو جائے، تو اس پر عید کی نماز لازم نہیں، پھر اگر چاہے، تو پڑھ لے، اور چاہے تو ترک کر دے۔

اور ابنِ حبیب نے فرمایا کہ یہ تمام مسلمانوں کے لئے لازمی سنت ہے، عورتوں کے لئے بھی، غلاموں کے لئے بھی اور مسافروں کے لئے بھی، اور سمجھدار بچوں کے لئے بھی، اپنے گھروں میں، یا جہاں بھی ہوں، وہیں پڑھیں گے، اگرچہ وہ جماعت میں شریک نہ ہوں۔

اور امام مالک نے مدونہ میں فرمایا کہ عورتوں پر عید کی نماز واجب نہیں، مگر اُن کے لئے مستحب ہے۔

پھر جو شخص جماعت سے رہ جائے، تو کیا وہ جماعت کے ساتھ پڑھے گا، اس کے متعلق امام مالک نے مدونہ میں فرمایا کہ عورتیں اگر نہ نکلیں، تو وہ جمع ہو کر نہیں پڑھیں گی، اور اگر وہ پڑھیں گی، تو تنہاء پڑھیں گی، اور ابنِ حبیب نے فرمایا کہ جب کوئی شخص عید کی نماز سے رہ جائے، تو وہ اپنے گھر والوں یا چند لوگوں کے ساتھ، جو اس کے پاس ہوں، یا مسجد میں ہوں، جماعت کے ساتھ نماز پڑھے گا۔

اور ابنِ نافع اور اشہب نے روایت کیا ہے کہ جس پر جمعہ کی نماز واجب نہیں، اس پر عید کی نماز بھی نہیں، اور ابنِ قاسم نے امام مالک سے روایت کیا ہے کہ جس گاؤں میں دس افراد ہوں، نمازِ عید وہاں بھی سنت ہوگی۔

اور جس شخص کی نمازِ عید فوت ہو جائے، اُس کو تنہاء عیدگاہ، یا اپنے گھر میں نماز سے منع نہیں کیا جائے گا، کیونکہ امام کے ساتھ اس کی نماز فوت ہونے کے بعد اُس کی طرف سے امام کی مخالفت، یا اُس کا اظہار نہیں پایا جاتا۔

اسی وجہ سے جس شخص کی مسجد کے امامِ راتب سے جماعت کی نماز فوت ہو جائے، اُس کو تنہاء مسجد میں، یا گھر میں نماز پڑھنا جائز ہے، البتہ اس کو مسجد میں دوسری

جماعت منع ہے"۔انتھٰی۔ [1]

اس سے معلوم ہوا کہ نمازِ عید با جماعت فوت ہونے کے بعد اس کے قضاء پڑھنے میں کوئی مانع نہیں پایا جاتا، بلکہ یہ ایک کارِ خیر اور باعثِ اجروثواب عمل ہے۔

"المسالک شرح موطأ مالک" کا حوالہ

علامہ ابنِ عربی نے "المسالک شرح موطأ مالک" میں فرمایا کہ:

"جس کی امام کے ساتھ عید کی نماز فوت ہوجائے، اس کے بارے میں بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ وہ عید کی نماز کی طرح دو رکعات ہی پڑھے گا، لیکن

---

[1] وهذا كما قال لأن صلاة العيد إنما سنت للجماعة وتلك الجماعة هم عند مالك الرجال الأحرار فمن فاتته تلك الجماعة لم يلزمه صلاة العيد فإن شاء صلاها وإن شاء تركها.

وقال ابن حبيب هى سنة لازمة لجميع المسلمين النساء والعبيد والمسافرين ومن عقل الصلاة من الصبيان يصلونها فى بيوتهم وحيث كانوا وإن لم يشهدوها فى الجماعة.

وقد قال مالك فى المدونة ليس على النساء ذلك إلا أنه يستحب لهن، وجه قول مالك أن هذه صلاة عيد فلم تلزم المفرد كصلاة الجمعة، ووجه قول ابن حبيب أن كل صلاة لا تسقط عن الرجال فإنها لا تسقط عن النساء إلى غير بدل كسائر الفروض.

(فرع) وإذا صلاها من تخلف عن الجماعة هل يصليها فى جماعة قال مالك فى المدونة فيمن يخرج إليها من النساء لا يجمع بهن أحد وإن صلين صلين أفذاذا.

وقال ابن حبيب لا بأس أن يجمع الرجل صلاة العيد إذا تخلف عنها مع أهله أو مع نفر يكونون عنده أو فى مسجدهم، وجه قول مالك أن هذه صلاة عيد فلا يجمعها من فاتته كصلاة الجمعة ووجه قول ابن حبيب أن هذه صلاة مسنونة يلحقها التغيير فجاز أن تجمع مع غير الإمام وإن جمع فيها الإمام كصلاة الكسوف.

(مسألة) وفى أى المواضع يلزم روى ابن نافع وأشهب أن صلاتها ليست إلا على من عليه صلاة الجمعة وروى ابن القاسم عن مالك أنها تلزم القرية فيها عشرون رجلا والنزول إليها من ثلاث أميال كالجمعة.

(مسألة) وقوله إن صلى فى المصلى أو فى بيته لم أر بذلك بأسا يريد أنه لا يمنع من ذلك حين فاتته لأنه ليس فى صلاته وحده بعد الإمام افتيات عليه ولا إظهار لمخالفته ولذلك جوز لمن فاتته صلاة الجماعة فى مسجد له إمام راتب أن يصليها فى المسجد وحده أو فى بيته ومنعاه من أن يصليها فيه بجماعة أخرى (المنتقى شرح الموطإ، ج ١، ص ٣١٩، ٣٢٠، ما جاء فى التكبير والقراءة فى صلاة العيدين)

بعض حضرات کا کہنا یہ ہے کہ اس کو دو، یا چار رکعتوں کے پڑھنے میں اختیار ہوگا، امام ابوحنیفہ کا یہی قول ہے۔

لیکن ہمارے نزدیک ان تمام اقوال میں بہتر قول وہی ہے، کہ عید کی نماز اسی طریقہ سے پڑھے، جس طریقہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سنت قرار دیا ہے، اور اسی کی طرف امام بخاری نے اپنا رجحان ظاہر فرمایا ہے''۔انتہٰی۔ [1]

''المحلیٰ بالآثار'' کا حوالہ

علامہ ابنِ حزم نے''المحلیٰ بالآثار''میں فرمایا کہ:

''جو شخص عیدین کی نماز کے لئے عیدُ الفطر اور عیدُ الاضحیٰ کے لئے نہیں نکلا، تو وہ دوسرے دن نکلے گا، اور اگر صبح کے وقت نہیں نکلا، تو سورج کے زوال تک نکلے گا، اس لئے کہ یہ فعلِ خیر ہے، اور اللہ تعالیٰ کا سورہ حج میں ارشاد ہے کہ خیر کے عمل کو کرو۔

اس کے علاوہ عمیر بن انس کی حدیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، اور یہی قول امام ابوحنیفہ اور امام شافعی کا ہے، اور اگر عیدُ الاضحیٰ کے دوسرے دن نہیں نکلا، تو

---

[1] اختلف العلماء فيمن فاته العيد مع الإمام:

فقالت طائفة :يصلي ركعتين مثل صلاة الإمام، وروى ذلك عن عطاء ، والنخعي، وابن سيرين، والحسن، وهو قوله مالك والشافعي، إلا أن مالكا قال :أستحب له ذلك من غير إيجاب.

وقال الأوزاعي :يصلي ركعتين ولا يجهر بالقراء ة، ولا يكبر تكبير الإمام، وليس بلازم.

وقالت طائفة :يصليها أربعا .

وقال أبو حنيفة :إن شاء صلى وإن شاء لم يصل، وهو بالخيار بأن يصلي ركعتين أو أربعا.

قال الإمام :وأولى هذه الأقوال بالصواب أن يصليها كما سنها رسول الله -صلى الله عليه وسلم -، وهو الذى أشار إليه البخارى(المسالِك فى شرح مُوَطَّأ مالك،لابن العربى المالكى،ج٣،ص ٢٦٩،٢٧٠،كتاب صلاة العيدين والتجمل فيهما،غدو الإمام يوم الفطر وانتظار الخطبة)

تیسرے دن نکلے گا، امام ابوحنیفہ کا یہی قول ہے، اور یہ فعلِ خیر ہے، جس کے بارے میں کوئی ممانعت وارد نہیں ہوئی ہے"۔انتھیٰ۔ [1]

"نیلُ الاوطار" کا حوالہ

اور امام شوکانی نے"نیلُ الاوطار"میں فرمایا کہ:

"اس حدیث میں اُن حضرات کے لئے دلیل ہے، جن کا کہنا ہے کہ اگر وقت نکلنے کے بعد ہی عید کا علم ہوا ہو، تو عید کی نماز دوسرے دن پڑھی جائے گی، اسی کی طرف امام اوزاعی، ثوری، اور امام احمد اور اسحاق اور امام ابوحنیفہ اور امام ابو یوسف اور امام محمد گئے ہیں، اور امام شافعی کا بھی ایک قول یہی ہے، اور ابو طالب نے یہ قید لگائی ہے کہ پہلے دن عید کی نماز ترک کرنا، التباس کی وجہ سے ہو۔

لیکن اس بات کی تردید کی گئی ہے، کیونکہ التباس تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ہمراہیوں کے لئے تھا، آنے والے سواروں کے لئے نہیں تھا، انہوں نے تو

---

[1] مسألة :ومن لم يخرج يوم الفطر، ولا يوم الأضحى لصلاة العيدين :خرج لصلاتهما في اليوم الثاني، وإن لم يخرج غدوة خرج ما لم تزل الشمس، لأنه فعل خير، وقال تعالى :(وافعلوا الخير) (الحج)

حدثنا عبد الله بن ربيع ثنا عمر بن عبد الملك ثنا محمد بن بكر ثنا أبو داود ثنا حفص بن عمر هو الحوضي -ثنا شعبة عن جعفر بن أبي وحشية عن أبي عمير بن أنس بن مالك عن عمومة له من أصحاب النبي -صلى الله عليه وسلم -أن ركبا جاء وا إلى رسول الله -صلى الله عليه وسلم - يشهدون أنهم رأوا الهلال بالأمس، فأمرهم أن يفطروا وإذا أصبحوا يغدوا إلى مصلاهم .

قال أبو محمد :هذا مسند صحيح، وأبو عمير مقطوع على أنه لا يخفى عليه من أعمامه من صحت صحبته ممن لم تصح صحبته وإنما يكون هذا علة ممن يمكن أن يخفى عليه هذا، والصحابة كلهم عدول -رضي الله عنهم -، لثناء الله تعالى عليهم.

وهذا قول أبي حنيفة، والشافعي فلو لم يخرج في الثاني من الأضحى وخرج في الثالث فقد قال به أبو حنيفة، وهو فعل خير لم يأت عنه نهي؟(المحلى بالآثار،لا بن حزم الأندلسي،ج٣،ص٣٠٧، كتاب الصلاة، صلاه العيدين، مسألة لم يخرج يوم الفطر ولا يوم الأضحى لصلاة العيدين،رقم المسئلة:٥٥٢)

گزشتہ دن چاند دیکھنے کے باوجود عید کے دن عمداً نمازِ عید کو ترک کر دیا تھا، لیکن اس کے باوجود ان کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عید کی نماز کا حکم فرمایا، جیسا کہ ابوداؤد کی روایت میں ہے۔

اور یہ روایت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ التباس اور غیر التباس میں کوئی فرق نہیں، جیسا کہ دیگر حضرات کا قول ہے، یا تو انہوں نے اس حدیث کی وجہ سے ہی یہ قول کیا ہے، یا اس پر قیاس کیا ہے۔

اور اس حدیث سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ دوسرے دن عید کی نماز اداء کہلائے گی، قضاء نہیں کہلائے گی۔

اور خطابی نے امام شافعی سے روایت کیا ہے کہ اگر اُن کو زوال سے پہلے عید کا علم ہو جائے، تو وہ نماز پڑھیں گے، ورنہ نہ تو اس دن پڑھیں گے، اور نہ اگلے دن پڑھیں گے، کیونکہ یہ ایک خاص وقت کا عمل ہے، جس کو دوسرے وقت میں نہیں کیا جاسکتا، امام مالک اور ابوثور کا بھی ایک قول یہی ہے۔

لیکن خطابی نے فرمایا کہ اگلے دن پڑھنا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت، اور اتباع کے زیادہ لائق ہے، اور ابو عمیر کی حدیث صحیح ہے، لہٰذا اس پر عمل واجب ہے۔

اور شرحُ القدوری میں حنفیہ کا یہ قول مروی ہے کہ اگر (عیدُ الاضحیٰ کی نماز) دوسرے دن بھی سورج کے زوال تک نماز نہ پڑھی جاسکے، تو تیسرے دن زوال تک پڑھنا جائز ہے، اگر تیسرے دن زوال تک بھی نہ پڑھی جاسکے، تو اُن سے عید کی نماز ساقط ہو جائے گی، چاہے عذر کی وجہ سے ہو، یا بغیر عذر کے۔

اور یہ حدیث عیدُ الفطر کے بارے میں وارد ہوئی ہے، پس جو حضرات قیاس کے قائل ہیں، انہوں نے اس کے ساتھ عیدُ الاضحیٰ کو بھی لاحق کیا ہے، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سواروں کے لئے عیدگاہ کی طرف، نمازِ عید کے لئے نکلنے کے حکم سے

استدلال کیا ہے''۔انتہیٰ۔ [1]

''مرعاۃُ المفاتیح، شرح مشکاۃُ المصابیح'' کا حوالہ

اہلِ حدیث سلسلہ کے عالم علامہ مبارک پوری نے مشکاۃ کی شرح ''مرعاۃ'' میں فرمایا کہ:

''اس (ابوعمیر بن انس کی) حدیث سے امام ابوحنیفہ اور امام احمد وغیرہ نے یہ دلیل پکڑی ہے کہ نمازِ عید کا وقت زوال تک ہوتا ہے، اس لئے کہ اگر عید کی نماز زوال کے بعد بھی ادا کی جاسکتی، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُس کو اگلے دن صبح کے وقت تک مؤخر کرنے کا حکم نہ فرماتے۔

پھر امام شوکانی کی عبارت ذکر کرکے فرمایا کہ امام شافعی نے اپنے قول کو اس حدیث کی صحت پر معلق کیا ہے، اور یہ بات پہلے گزر چکی ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے،

---

[1] والحديث دليل لمن قال :إن صلاة العيد تصلى فى اليوم الثانى إن لم يتبين العيد إلا بعد خروج وقت صلاته، وإلى ذلك ذهب الأوزاعى والثورى وأحمد وإسحاق وأبو حنيفة وأبو يوسف ومحمد وهو قول للشافعى :ومن أهل البيت الهادى والقاسم والناصر والمؤيد بالله وأبو طالب وقيد ذلك أبو طالب بشرط أن يكون ترك الصلاة فى اليوم الأول للبس كما فى الحديث.

ورد بأن كون الترك للبس إنما هو للنبى -صلى الله عليه وسلم -ومن معه لا للركب؛ لأنهم تركوا الصلاة فى يوم العيد عمدا بعد رؤيتهم للهلال بالأمس، فأمر النبى -صلى الله عليه وسلم -لهم كما فى رواية أبى داود، يدل على عدم الفرق بين عذر اللبس وغيره كما ذهب إلى ذلك الباقون، فإنهم لا يفرقون بين اللبس وغيره من الأعذار إما لذلك وإما قياسا لها عليه .وظاهر الحديث أن الصلاة فى اليوم الثانى أداء لا قضاء .

وروى الخطابى عن الشافعى أنهم إن علموا بالعيد قبل الزوال صلوا، وإلا لم يصلوا يومهم ولا من الغد؛ لأنه عمل فى وقت فلا يعمل فى غيره، قال :وكذا قال مالك وأبو ثور .قال الخطابى :سنة النبى -صلى الله عليه وسلم -أولى بالاتباع .وحديث أبى عمير صحيح فالمصير إليه واجب .اهـ.

وحكى فى شرح القدورى عن الحنفية أنهم إذا لم يصلوها فى اليوم الثانى حتى زالت الشمس صلوها فى اليوم الثالث، فإن لم يصلوها فيه حتى زالت الشمس سقطت سواء كان لعذر أو لغير عذر .اهـ .والحديث وارد فى عيد الفطر، فمن قال بالقياس ألحق به عيد الأضحى وقد استدل بأمره -صلى الله عليه وسلم -للركب أن يخرجوا إلى المصلى لصلاة العيد(نيل الأوطار،للشوكانى، ج٣،ص٣٦٨، كتاب العيدين،باب حكم الهلال إذا غم ثم علم به من آخر النهار)

جس کو کئی ائمہ نے صحیح قرار دیا ہے، لہٰذا اس حدیث کے مطابق قول کرنا واجب ہوا۔

اور علماء کا اس شخص کے بارے میں اختلاف ہے کہ جس نے امام کے ساتھ عید کی نماز کو نہیں پایا، مزنی، اور امام مالک اور امام ابوحنیفہ اس کی قضاء نہ کرنے کی طرف گئے ہیں، یہی قول امام احمد کا ہے۔

پھر علامہ ابنِ قدامہ حنبلی کی عبارت نقل کر کے فرمایا کہ امام کے ساتھ عید کی نماز فوت ہونے والے کو دو رکعتیں، تکبیر کے ساتھ پڑھنے کی طرف امام بخاری گئے ہیں، اور امام بخاری کا باب باندھنا بھی اسی پر دلالت کرتا ہے، اور ہمارے نزدیک یہی قول راجح ہے''۔انتہٰی۔ ؎

؎ وبـه أخـذ أحـمـد وأبـوحنيفة وغيرهما أن وقتها إلى زوالها إذ لو كانت صلاة العيد تؤدى بعد الزوال لما أخرها رسول الله -صلى الله عليه وسلم -إلى الغد (فأمرهم) أى الناس (أن يفطروا) أى ذلک اليوم؛ لأنه ثبت أنه يوم عيد الفطر (وإذا أصبحوا) أى فى اليوم الثانى من شوال (أن يغدوا) أى يـذهبـوا فـى الـغدوة أى جميعا (إلى مصلاهم) لـصـلاة الـعيـد، كما فى رواية ابن ماجه وغيره، قال الشوكانى :الحديث دليل لمن قال :إن صلاة العيد تصلى فى اليوم الثانى إن لم يتبين العيد إلا بعد خـروج وقـت صلاته، وإلى ذلک ذهب الأوزاعى والثورى وأحمد وإسحاق وأبوحنيفة وأبويوسف ومـحمد، وهو قول للشافعى، وظاهر الحديث أن الصلاة فى اليوم الثانى أداء لا قضاء -انتهى .وقال الـخطابى فى المعالم (ج 1ص252) : وإلـى هذا الحديث ذهب الأوزاعى وسفيان الثورى وأحمد بن حنبل وإسحاق .وقال الشافعى :إن عـلـموا بذلک قبل الزوال خرجوا وصلى الإمام بهم صلاة الـعيد، وإن لم يعلموا إلا بعد الزوال لم يصلوا يومهم ولا من الغد؛ لأنه عمل فى وقت إذا جاز ذلک الـوقت لم يعمل فى غيره، وكذلک قال مالک وأبوثور، قال الخطابى :سنة رسول الله -صلى الله عليه وسلم -أولى، وحديث أبى عمير صحيح، فالمصير إليه واجب -انتهى .

قلت :وروى البيهـقى عن الشافعى ما يدل على أنه علق القول به على صحة هذا الحديث، وقد تقدم أن الـحـديـث صـحـيـح، صححه غير واحد من الأئمة، فالقول به واجب .(رواه أبـوداود والنسائى) وأخـرجـه أيـضـا أحمد وابن ماجه فى الصيام والدارقطنى والبيهقى (ج 3ص316) ، وابن حبان فى صـحـيـحـه، وسـكـت عـنه أبوداود والمنذرى، وصححه الدارقطنى والبيهقى والنووى وابن المنذر وابن السكن وابن حزم والخطابى والحافظ ابن حجر فى بلوغ المرام .

فائدة :اختلف العلماء فيمن لم يدرک صلاة العيد مع الإمام، فذهب المزنى ومالک وأبوحنيفة إلى

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

امام مالک کا قول، جو مذکورہ عبارت میں ذکر کیا گیا، ان کا معروف قول اس کے علاوہ ہے، اور امام ابوحنیفہ کے قول کے متعلق الگ مقام پر ذکر کیا جا چکا۔

''مرقاۃُ المفاتیح، شرح مشکاۃُ المصابیح'' کا حوالہ

ملا علی قاری نے ''مرقاۃ'' کی شرح ''مشکاۃ'' میں ابوعمیر بن انس کی حدیث کی شرح کے ذیل میں فرمایا کہ:

''اگر زوال کے بعد چاند کی شہادت حاصل ہو، تو امام ابوحنیفہ کے نزدیک لوگ روزہ توڑ دیں گے، اور اگلے دن صبح کو عید کی نماز پڑھیں گے۔

علامہ ابنِ حجر نے فرمایا کہ عید کی قضاء نماز کی دو رکعتیں اسی طرح ہیں، جس طرح اداء کی ہوتی ہیں، جیسا کہ امام شافعی اور امام مالک کا قول ہے۔

اور امام احمد نے فرمایا کہ جمعہ کی طرح چار رکعتیں پڑھی جائیں گی، اور امام ابوحنیفہ

﴿ گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ ﴾

أنه لا يقضيها، وبه قال أحمد، قال ابن قدامة :من فاتته صلاة العيد أى مع الجماعة، فلا قضاء عليه - انتهى .وذهب الشافعي إلى أنه يقضيها، واختلفوا أيضا فى أنه كيف يقضى، فقال أبوحنيفة :إن شاء صلى وإن شاء لم يصل، فإن شاء صلى أربعا وإن شاء صلى ركعتين، وإليه ذهب أحمد.

قال ابن قدامة :من فاتته صلاة العيد فلا قضاء عليه، فإن أحب قضاء ها فهو مخير إن شاء صلاها أربعا، روى هذا عن ابن مسعود، وهو قول الثورى، قال ابن مسعود :من فاته العيد مع الإمام فليصل أربعا -أخرجه سعيد بن منصور بإسناد صحيح -، وإن شاء أن يصلى ركعتين، كصلاة التطوع، وهو قول الأوزاعى، وإن شاء صلاها على صفة صلاة العيد بتكبير وحده أو فى جماعة، نقل ذلك عن أحمد إسماعيل بن سعد، واختاره الجوزجانى، وهذا قول النخعى ومالك والشافعى وأبى ثور وابن المنذر أنه يصليها كما يصلى مع الإمام إلا أن مالكا استحب له ذلك من غير إيجاب،

وذلك لما روى البيهقى عن عبد الله بن أبى بكر بن أنس قال :كان أنس إذا فاته العيد مع الإمام جمع أهله فصلى بهم مثل صلاة الإمام فى العيد، وروى ابن أبى شيبة عن ابن جريج عن عطاء بن أبى رباح قال :من فاته العيد يصلى ركعتين ويكبر؛ ولأنه قضاء صلاة فكان على صفتها كسائر الصلوات (انتهىٰ)

.قلت :وإليه ذهب البخارى، كما يدل عليه تبويبه، وهو قول الراجح عندنا(مرعاة المفاتيح شرح مشكاة المصابيح، ج۵،ص ۶۴، ۶۵، كتاب الصلاة،باب صلاة العيدين،الفصل الثانى)

نے فرمایا کہ اسے دو اور چار رکعتوں کے درمیان اختیار ہوگا، اور اس کا جمعہ پر قیاس بعید ہے، کیونکہ جمعہ دراصل ظہر کا بدل ہے، یا یہ دونوں ایک وقت کی نمازیں ہیں، لہٰذا ان میں سے ایک کا دوسرے کے عدد کی طرف رجوع جائز ہے، اور یہاں (عید کی نماز میں) معاملہ اس طرح نہیں ہے۔

اور علامہ ابنِ حجر نے جو امام ابوحنیفہ کا قول نقل کیا ہے، تو یہ صحیح نہیں ہے، اس لئے کہ امام ابوحنیفہ کا مذہب یہ ہے کہ جو شخص امام کے ساتھ عید کی نماز نہ پائے، تو وہ اس کی قضاء نہیں کرے گا''۔انتہٰی۔ [1]

---

[1] (وعن أبي عمير بن أنس) أي :أنس بن مالك الأنصاري يقال :اسمه عبد الله، روى (عن عمومة له) : جمع عم، كالبعولة جمع بعل، ذكره الجوهري، وهو المراد هنا، وقد يستعمل بمعنى المصدر كأبوة، وخئولة .(من أصحاب النبي -صلى الله عليه وسلم -) أي :من الأنصار، وهو معدود في صغار التابعين، عمر بعد أبيه أنس زمانا طويلا، ذكره المؤلف .(أن ركبا) : جمع راكب، كصحب وصاحب .(جاء وا إلى النبي -صلى الله عليه وسلم -يشهدون) أي :يؤدون الشهادة . (أنهم رأوا الهلال؟ بالأمس) .: قال ابن الهمام :وبين في رواية ابن ماجه والدارقطني أنهم قدموا آخر النهار، وصحح الدارقطني إسناده بهذا اللفظ، وصححه النووي في الخلاصة، وقد وقع في بعض طرقه من رواية الطحاوي أنهم شهدوا بعد الزوال، وبه أخذ أبو حنيفة أن وقتها من ارتفاع الشمس إلى زوالها، إذ لو كانت صلاة العيد تؤدى بعد الزوال لما أخرها رسول الله -صلى الله عليه وسلم -إلى الغد .(فأمرهم) أي :الناس .(أن يفطروا) أي :ذلك اليوم .(وإذا أصبحوا أن يغدوا) أي :يذهبوا في الغدوة أي :جميعا .(إلى مصلاهم) : لصلاة العيد كما في رواية أخرى.

قال المظهر :يعني لم يروا الهلال في المدينة ليلة الثلاثين من رمضان، فصاموا ذلك اليوم، فجاء قافلة في أثناء ذلك اليوم، وشهدوا أنهم رأوا الهلال ليلة الثلاثين، فأمر النبي -صلى الله عليه وسلم -بالإفطار، وبأداء صلاة العيد في اليوم الحادي والثلاثين .

وفي الفقه إن شهدوا بعد الزوال أفطر الناس، وصلوا صلاة العيد من الغد عند أبي حنيفة، وفي قول للشافعي وظاهر قوليه :أنه لا يقضى الصلاة من اليوم ولا من الغد، وهو مذهب مالك .وفي شرح المنية :إن حدث عذر منع الصلاة يوم الفطر قبل الزوال صلاها من الغد قبل الزوال، وإن منع عذر من الصلاة في اليوم الثاني لم يصل بعده بخلاف الأضحى، فإنها تصلى في اليوم الثالث أيضا إن منع عذر في اليوم الأول والثاني، وكذا إن أخرها إلى اليوم الثاني أو الثالث جاز، لكن مع الإساءة اهـ.

قال ابن حجر :صلاة العيد المقضية ركعتان كالمؤداة قاله الشافعي ومالك ;لأن الأصل أن القضاء يحكى الأداء إلا لدليل، واستدل البخاري بما فيه خفاء ، قال أحمد :أربع كالجمعة إذا

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

اس سلسلہ میں عرض ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے براہِ راست جو اس بارے میں مروی ہے، اس میں دو، یا چار رکعات پڑھنے کے جواز کا ذکر ہے، اور اس کے عید کے قائم مقام ہونے، نہ ہونے کی تصریح موجود نہیں۔

اور ہمارا رجحان اس طرف ہوا کہ مختلف روایات وآثار کے پیشِ نظر امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک نمازِ عید باجماعت فوت ہونے کے بعد اس کی قضاء انفرادی طور پر واجب نہیں رہتی، البتہ بصورتِ تطوع جائز رہتی ہے، اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک تطوع کے طریقہ پر درحقیقت یہ عید کی قضاء نماز ہی ہے۔

لیکن جماعت، خطبہ اور جہری قرائت وغیرہ کی صفات مفقود ہونے کی وجہ سے یہ اپنی مخصوص ہیئت پر قائم نہیں رہتی، اس لیے اس کو نمازِ عید کی قضاء کا عنوان دینے سے اجتناب کیا گیا۔

پس ایک جہت سے یہ قضاء کہلائے گی، اور دوسری جہت سے تطوعِ محض کہلائے گی، پھر بعض نے اس کی تعبیر تطوعِ محض، یا چاشت کی نماز سے کردی، اور بعض نے قضاء سے کردی۔

اس حیثیت سے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا یہ قول نہ تو جمہور کے خلاف کہلائے گا، اور نہ ہی آثارِ صحابہ وتابعین وغیرہ کے خلاف شمار ہوگا۔

چنانچہ دیگر فقہائے کرام میں سے بھی کسی نے قضاء کو جائز کہا، کسی نے سنت، یا مستحب و مندوب وغیرہ کہا، اور کسی نے چار رکعات کی شکل میں پڑھنے کو راجح کہا، کسی نے دو رکعات کی شکل میں پڑھنے کو راجح کہا، کسی نے تکبیراتِ زوائد کے ساتھ پڑھنے کو راجح کہا، اور کسی

﴿ گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ ﴾

فاتت .وقال أبو حنيفة :مخير بين ركعتين وأربع، والقياس على الجمعة بعيد ;لأنها بدل عن الظهر، أو صلاتا وقت واحد، فجاز رجوع أحدها لعدد الأخرى، وهنا ليس الأمر كذلك اهـ .وما نقله عن أبي حنيفة فغير صحيح إذ مذهبه أن من لم يدرك صلاة العيد مع الإمام لا يقضيها .(رواه أبو داود، والنسائي) وقال ميرك :سكت عليه أبو داود، وأقره المنذري اهـ .وقد تقدم أن سكوتهما إما تصحيح أو تحسين منهما، فالحديث حجة على مالك والشافعي -رحمهما الله تعالى (مرقاة المفاتيح شرح مشكاة المصابيح، ج٣، ص ١٠٧٤، كتاب الصلاة ،باب صلاة العيدين)

نے خطبہ وتکبیر کے بغیر پڑھنے کو راجح کہا، اور یہ اختلاف اَولویت وغیر اَولویت کے مابین دائر رہا، اور اس تعبیر کے اختلاف کی وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ حنفیہ کے نزدیک نمازِ عید کی زائد تکبیرات واجب کا درجہ رکھنے کی وجہ سے نمازِ عید کو وجود میں لانے کے لئے زیادہ دَخل رکھتی ہیں، برخلاف دیگر فقہائے کرام کے، کہ ان کے نزدیک واجب کے بجائے سنت کا درجہ رکھتی ہیں، اسی طرح جماعت کے شرط کی اہمیت میں بھی فرق، اس اختلاف کی بناء ہے۔

’’کتابُ الاصل‘‘ اور ’’الجامعُ الصغیر‘‘ کا حوالہ

امام محمد رحمہ اللہ نے ’’کتابُ الاصل‘‘ میں فرمایا کہ:

قلت: أرأيت الرجل يفوته العيد هل عليه أن يصلي شيئا؟ قال: إن شاء فعل، وإن شاء لم يفعل .قلت: فكم يصلي إن أراد أن يصلي ؟ قال:إن شاء أربع ركعات، صان شاء ركعتين.

قلت: أرأيت الإمام إذا خرج إلى الجبانة أينبغي له أن يخلف رجلا يصلي بالناس في المسجد؟ قال: إن فعل فحسن، وإن لم يفعل فلا شيء عليه .قلت: فإن فعل كيف يصلي بهم الرجل؟ قال: يصلي بهم كما يصلي الإمام في الجبانة.

قلت: أرأيت رجلا أحدث في الجبانة يوم العيد وهو مع الإمام، فخاف إن رجع إلى الكوفة أن تفوته الصلاة، وهو لا يجد الماء، كيف يصنع؟ قال: يتيمم ويصلي مع الناس .قلت: لم؟ قال: لأن العيد إن فاته لم تكن عليه صلاة، وصلاة العيد بمنزلة الصلاة على الجنازة؛ ألا ترى أنه إذا صلى على الجنازة فأحدث أنه يتيمم ويصلي عليها، فكذلك العيد .قلت: فإن أحدث بعدما صلى

ركعة أيتيمم مكانه ويمضى على صلاته؟ قال: نعم .قلت: فإن لم يتمم ولكنه انصرف إلى الكوفة فتوضأ، ثم عاد إلى المصلى فوجد الإمام قد صلى، كيف يصنع؟ قال: يصلى ركعتين كصلاة الإمام، ويكبر كما يكبر الإمام .قلت: فهل يقرأ فيهما؟ قال: لا .قلت: فما شأنه يكبر ولا يقرأ؟ قال: لأن قرائة الإمام له قرائة، ولا يكون تكبير الإمام له تكبيرات ألا ترى أن من خلف الإمام يكبرون معه ولا يقرؤون، فهذا والذى خلفه سواء، ولأنه قد أدرك أول الصلاة مع الإمام .وهذا قول أبى حنيفة .وقال أبو يوسف ومحمد: إذا دخل مع الإمام فى الصلاة متوضئا لم يجزه التيمم؛ لأن هذا لا يفوته الصلاة .وهذا قول زفر (الأصل المعروف بالمبسوط،ج ا ،ص ۳۲۰،و ۳۲۱، كتاب الصلاة،باب صلاة العيدين)

ترجمہ: میں نے امام ابوحنیفہ سے عرض کیا کہ اگر ایک شخص کی نمازِعید فوت ہوجائے، کیا اس کے ذمہ کوئی نماز پڑھنا واجب ہے؟

تو امام ابوحنیفہ نے فرمایا کہ اگر چاہے، تو پڑھ لے، اور اگر چاہے تو نہ پڑھے۔

میں نے عرض کیا کہ اگر وہ نماز پڑھنا چاہے، تو کتنی رکعتیں پڑھے گا؟ تو امام ابوحنیفہ نے فرمایا کہ اگر چاہے، تو چار رکعات پڑھ لے، اور اگر چاہے، تو دو رکعات پڑھ لے۔

میں نے عرض کیا کہ اگر امام، عیدگاہ کی طرف چلا جائے، تو کیا اس کے لئے مسجد میں کسی آدمی کو نمازِعید کے لئے خلیفہ مقرر کرنا مناسب ہے، تو امام ابوحنیفہ نے فرمایا کہ اگر وہ ایسا کرے، تو اچھا ہے، اور اگر وہ ایسا نہ کرے، تو اس پر کوئی حرج نہیں۔

میں نے کہا کہ اگر وہ کسی آدمی کو خلیفہ مقرر کردے، تو وہ لوگوں کو کس طرح سے نماز پڑھائے گا؟

تو امام ابوحنیفہ نے فرمایا کہ اسی طریقہ سے پڑھائے گا، جیسے امام عید گاہ میں پڑھائے گا۔

میں نے عرض کیا کہ اگر عید کے دن امام کے ساتھ عید گاہ میں شریک کسی آدمی کو حدَث لاحق ہو جائے، اور اسے یہ خوف ہو کہ اگر وہ شہر میں وضو کے لئے گیا، تو اس کی نمازِ عید فوت ہو جائے گی، اور اس کو وہاں پانی میسر نہ ہو، تو وہ کیا طرزِ عمل اختیار کرے گا؟

تو امام ابوحنیفہ نے فرمایا کہ وہ تیمّم کر کے لوگوں کے ساتھ نماز پڑھے گا۔

میں نے عرض کیا کہ کیوں؟

تو امام ابوحنیفہ نے فرمایا کہ اس لئے کہ عیدین کی نماز اگر فوت ہو جائے، تو اس پر کوئی نماز واجب نہیں، اور عیدین کی نماز، جنازہ کی نماز کے درجہ میں ہے، کیا آپ نہیں دیکھتے کہ جب جنازہ کی نماز پڑھے، اور اسے حدَث لاحق ہو جائے، تو وہ تیمّم کر کے نمازِ جنازہ پڑھے گا، پس اسی طریقہ سے عید کا بھی حکم ہے۔

میں نے عرض کیا کہ اگر ایک رکعت پڑھنے کے بعد حدَث لاحق ہو، تو کیا وہ اسی جگہ تیمّم کر کے آگے نماز کو جاری رکھ لے گا؟

تو امام ابوحنیفہ نے فرمایا کہ جی ہاں۔

میں نے عرض کیا کہ اگر اس نے تیمّم نہیں کیا، اور وہ شہر میں وضو کرنے کی طرف لوٹ گیا، پھر جب وہ عید گاہ میں لوٹ کر آیا، تو امام نمازِ عید سے فارغ ہو گیا تھا، تو وہ کیا طرزِ عمل اختیار کرے گا؟

تو امام ابوحنیفہ نے فرمایا کہ وہ امام کی طرح دو رکعتیں پڑھے گا، اور امام کی طرح

تکبیر کہے گا۔

میں نے عرض کیا کہ کیا وہ قرائت بھی کرے گا؟

امام ابوحنیفہ نے فرمایا کہ نہیں۔

میں نے عرض کیا کہ اس کی کیا وجہ ہے، کہ وہ تکبیر کہے گا، مگر قرائت نہیں کرے گا؟

تو امام ابوحنیفہ نے فرمایا کہ اس لئے کہ امام کی قرائت اس کی قرائت ہے، لیکن امام کی تکبیر، اس کی تکبیر نہیں ہے، کیا آپ نہیں دیکھتے کہ امام کے پیچھے لوگ امام کے ساتھ تکبیر کہتے ہیں، لیکن قرائت نہیں کرتے، تو یہ اور اس کے مقتدی برابر ہیں، اور ایک وجہ یہ ہے کہ اس نے امام کے ساتھ نماز کے شروع حصہ کو پالیا ہے، اور یہ امام ابوحنیفہ کا قول ہے، اور ابو یوسف اور محمد کا قول یہ ہے کہ جب امام کے ساتھ وضو کر کے شامل ہو، تو اس کے لئے تیمّم جائز نہیں ہوگا، کیونکہ یہ عمل اس کی نماز کو فوت نہیں کرتا، اور یہی امام زفر کا قول ہے (الاصل)

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے متعلق براہِ راست مذکورہ عبارت سے ایک بات تو یہ معلوم ہوئی کہ اگر کسی شخص کی نمازِ عید فوت ہو جائے، تو اس پر عید کی نماز پڑھنا واجب نہیں رہتا، لیکن اگر وہ پڑھنا چاہے، تو اس کے لئے جائز ہے۔

اور اس کے لئے جس طرح دو رکعتیں پڑھنا جائز ہے، اسی طرح چار رکعتیں پڑھنا بھی جائز ہے۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی مذکورہ عبارت میں اس بات کی تصریح نہیں کہ یہ دو، یا چار رکعتیں ایک سلام کے ساتھ پڑھے گا، یا دو سلاموں کے ساتھ پڑھے گا، اور یہ نماز مطلق تطوع و نفل ہوگی، یا عید کے قائم مقام ہوگی، اور اس کو عام نوافل کی طرح پڑھا جائے گا، یا زائد تکبیرات کے ساتھ پڑھا جائے گا۔

البتہ بعد کے متعدد مشائخِ حنفیہ نے ان کو مطلق نوافل اور بعض نے چاشت کے نوافل کا درجہ

دیا ہے۔

لیکن علامہ انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ وغیرہ نے نمازِ عید کا درجہ دیا ہے۔

اور ہمارے نزدیک علامہ کشمیری کی رائے راجح ہے، جس کی تائید جلیل القدر تابعین اور بعض صحابۂ کرام کے آثار سے بھی ہوتی ہے، جن سے نمازِ عید رہ جانے کی صورت میں دو یا چار رکعات پڑھنے کی تصریح ہے، جن کا درجہ بحیثیت استناد کے یقیناً مذکورہ ان مشائخِ حنفیہ سے زیادہ ہے، جو اس نماز کو عام چاشت قرار دے رہے ہیں۔

اور غالباً امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے دو اور چار رکعات کا اختیار دے کر متعدد آثار کی رعایت کو ملحوظ رکھا ہے۔

البتہ اگر یہ کہا جائے کہ مشائخِ حنفیہ کا نمازِ عید کی تکبیرات سے انکار مراد نہیں، البتہ قضاء واجب نہ ہونے اور جہری قرائت نہ ہونے اور خطبہ نہ ہونے کی وجوہات کی بناء پر چاشت سے مشابہت مراد ہے، تو پھر یہ ایک لفظی اختلاف رہ جاتا ہے۔

اور ایسی صورت میں یہ کہنے کی گنجائش پیدا ہوجاتی ہے کہ نمازِ عید فوت ہونے کے بعد عندالحنفیة، نمازِ عید کی قضاء واجب نہیں، البتہ اگر کوئی چاہے، تو زائد تکبیرات کے ساتھ دو، یا چار رکعات بغیر جہری قرائت وخطبہ کے پڑھ لے، جو بظاہر اور صورتاً چاشت کا درجہ رکھتی ہیں، جہری قرائت اور خطبہ وجماعت نہ ہونے کی وجہ سے، اگرچہ ان کو عید کا عنوان کیوں نہ دیا جائے۔

نیز تنہاء پڑھنے کی صورت میں تکبیر کو بھی واجب نہ کہا جائے، تو گنجائش ہے۔

اور ہمارا رجحان اس طرف ہوا کہ دو رکعتیں مطلق عید کی نیت سے پڑھنا بہتر ہے، پھر اگر یہ درحقیقت نمازِ عید ہوئی، تو فبہا، ورنہ نفل ہوجائیں گی، اور یہ گزر چکا کہ نمازِ عید کے تطوع وغیر تطوع میں اختلاف کی وجہ سے مطلق نیت بہتر ہے، تاکہ اختلاف کی رعایت ہوجائے۔

اور اگر کوئی چار رکعات پڑھنا چاہے، تو مزید دو رکعات بعد میں عام نفل کے طور پر پڑھ لے، تاکہ یہ جماعت اور خطبہ وغیرہ کی تلافی کے طور پر ہوجائیں۔

اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے مذکورہ کلام سے دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ اگر امام شہر میں اپنا کوئی نائب نمازِ عید کے لئے مقرر کردے، تو اس کا عام طریقہ کے مطابق، نمازِ عید کا پڑھانا جائز ہے۔

اور ہم تفصیل کے ساتھ جمعہ سے متعلق اپنے مضامین میں ذکر کرچکے ہیں کہ اگر حکمران کی طرف سے اپنے طور پر امام مقرر کرکے لوگوں کو نمازِ عید پڑھنے کی ممانعت نہ ہو، تو اس کی حیثیت بھی یہی ہوگی، اور آج کل اسی طرح کی صورتِ حال ہے۔

لہٰذا گھروں وغیرہ میں اپنے طور پر امام مقرر کرکے نمازِ عید کا پڑھنا جائز ہوگا، اور اِذنِ عام مذکورہ صورت میں ضروری نہیں۔

امام محمد نے کتابُ الاصل کے تیمّم کے باب میں بھی عید کی نماز میں مقتدی کے وضو ٹوٹنے کے متعلق امام ابوحنیفہ کا یہی قول ذکر کیا ہے، اور اپنے اختلاف کا بھی ذکر کیا ہے، اور جمعہ کی نماز میں وضو ٹوٹنے کے متعلق امام ابوحنیفہ کا یہ قول ذکر کیا ہے کہ اس میں تیمّم کرنا جائز نہیں، کیونکہ جمعہ کی نماز، عید کی نماز کے مِثل نہیں، پس ایک تو آدمی شہر میں ہے، اور دوسرے جب جمعہ کی نماز فوت ہوجائے، تو اس کے لئے ظہر کی نماز کی چار رکعت پڑھنا واجب ہوجاتا ہے، اور جمعہ کی نماز نہ تو عید کی طرح ہے، اور نہ ہی نمازِ جنازہ کی طرح ہے۔ [1]

---

[1] قلت: أرأيت رجلا شهد العيد مع الإمام في الجبانة وهو على غير وضوء أيتيمم ويصلي؟ قال: نعم .قلت: لم؟ قال :لأن هذا خارج من المصر، فإن رجع فتوضأ فاتته الصلاة، وليس صلاة العيد إلا مع الإمام .وصلاة العيد والصلاة على الجنازة سواء .قلت: وكذلك لو أن الإمام أحدث بعدما دخل في الصلاة يوم العيد تيمم وصلى بهم بقية الصلاة؟ قال: نعم .قلت:وكذلك لو أحدث رجل خلفه؟ قال: نعم، يتيمم ويدخل معه في صلاته .وهذا قول أبي حنيفة .وقال أبو يوسف ومحمد: إذا دخل في الصلاة متوضئا ثم أحدث انحرف فتوضأ ثم بنى؛ لأن هذا لا تفوته الصلاة .قلت: فإن كان كل الذي ذكرت لك يجد الماء من غير أن تفوته الصلاة؟ قال: عليهم أن يتوضؤوا ولا يجزيهم التيمم. قلت: وكذلك لو أن رجلا شهد الجمعة فأحدث؟ قال: لا، الجمعة ليست مثل العيد؛ لأن الرجل في المصر، ولأن الجمعة إذا فاتت الرجل كان عليه أن يصلي الظهر أربعا، والظهر فريضة. وليست الجمعة كالعيد ولا كالصلاة على الجنازة (الأصل المعروف بالمبسوط، ج ۱، ص ۹۷، كتاب الصلاة ،باب التيمم بالصعيد)

اس کے علاوہ امام محمد نے ''الجامعُ الصغیر'' میں بھی اس مسئلہ اور اختلاف کا ذکر کیا ہے۔ [1]

جس کی تشریح کرتے ہوئے علامہ لکھنوی نے النافعُ الکبیر میں فرمایا کہ:

یہ حکم حنفیہ کے نزدیک ہے، کیونکہ عید کی نماز قضاء نہیں کی جاتی، امام شافعی کا اس میں اختلاف ہے۔انتھیٰ۔ [2]

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے نمازِ عید کی قضاء نہ ہونے کا جو حکم لگایا، وہ ہمارے نزدیک اس پر محمول ہے کہ نمازِ عید کی مخصوص شرائط کے بغیر اپنی جملہ صفات کے ساتھ، یعنی ''مِن حیث ھی ھی'' قضاء نہیں، کیونکہ جب نماز باجماعت اپنی شرائط کے ساتھ نہ ہوگی، تو خطبہ بھی نہ ہوگا، اور جہری قرائت بھی نہ ہوگی، اور ممکن ہے کہ تکبیراتِ زوائد بھی نہ ہوں۔

ایسی صورت میں وہ ظاہراً چاشت کی طرح کی تطوع ہوجائیں گی، اگرچہ عنداللہ ان پر عید ہی کا ثواب کیوں نہ حاصل ہو۔

دیگر فقہائے کرام نے ان کو قضاءِ عید کا عنوان دیا، اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے مذکورہ وجوہ کی بناء پر قضاء کا عنوان نہ دیا، لیکن دو، یا چار رکعات سے منع نہ فرمایا۔

---

[1] إمام صلى فى مصلى الكوفة فأحدث أو أحدث رجل خلفه تيمم وبنى رجل فى رحله ماء قد نسيه فتيمم وصلى ثم ذكره فى الوقت فقد تمت صلاته وهو قول محمد وقال أبو يوسف لا يجزيه(الجامع الصغير ،لمحمد بن الحسن الشيبانى،ص ٧٦، كتاب الصلاة ،باب فيمن تيمم ثم ارتد عن الإسلام)

[2] قوله تيمم وبنى أصل هذا أن التيمم لصلاة العيد قبل الشروع فيها جائز عندنا لأن صلاة العيد لا تقضى.

خلافا للشافعى و كذلك التيمم لصلاة الجنازة جائز عندنا وأما بعد الشروع فى صلاة العيد للبناء فكذلك عند أبى حنيفة وقال أبو يوسف ومحمد لا يتيمم لأن المبيح كان خشية الفوت وقد أمن بالشروع لأن اللاحق يقضى ما فاته بعد فراغ الإمام وأبو حنيفة يقول لا بل المبيح قائم لأنه يوم ازدحام فقلما يسلم المرء فى ذلك عن أمر ينتقض به صلاته.

قوله قد نسيه قيد بالنسيان لأن فى الظن لا يجوز له التيمم بالإجماع ولو كان الماء فى إناء فى ظهره أو معلقا بعنقه أو موضوعا بين يديه ثم نسيه وتيمم لا يجزيه بالإجماع لأنه نسى ما لا ينسى فلا يعتبر كذا ذكره المحبوبى فى شرح الجامع الصغير

قوله لا يجزيه له أنه فات شرطه وهو طلب الماء فى معدنه فلا يجوز كما لو ترك الطلب فى العمرانات وهما يقولان إن السفر موضع الحاجة الأصلية للماء فلا يكون معدنا(النافع الكبير لمن يطالع الجامع الصغير ،للكنوى ،ص ٧٦، كتاب الصلاة،باب فيمن تيمم ثم ارتد عن الإسلام)

اس طرح امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا یہ اختلاف دیگر جمہور کے ساتھ صرف لفظی نوعیت کا ہوا، کیونکہ تنہاء پڑھنے کی صورت میں خطبہ وغیرہ کی دیگر حضرات بھی نفی کرتے ہیں۔

اور زائد تکبیرات کا کہہ لینا، عندالحنفیۃ اگرچہ منفرد کو واجب نہ ہو، لیکن مذکورہ صورت میں کراہت کی بھی کوئی معقول وجہ نہیں، جیسا کہ گزرا۔

پس اگر کوئی امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک قضاء کا انکار کرے، جیسا کہ عامۂ مشائخ نے انکار کیا، اور کوئی اثبات کرے، جیسا کہ علامہ کشمیری اور دیگر محدثین وفقہاء نے فرمایا، تو ان دونوں باتوں میں درحقیقت کوئی ٹکراؤ نہ ہوگا۔

اور عدمِ جواز، بمعنیٰ اثباتِ معصیت کسی کے نزدیک بھی نہ ہوگا۔

ہم اسی موقف کو راجح اور احادیث وروایات اور آثار کے موافق سمجھتے ہیں، جبکہ دوسرے موقف میں مذکورہ اُمور کی خلاف ورزی لازم آتی ہے۔

اگر پھر بھی کوئی مذکورہ اُمور کی خلاف ورزی کو گوارا کرے، تو وہ اس کا اپنا معاملہ ہے، ہم ماسبق میں اپنا رجحان ذکر کر چکے ہیں۔

''شرح مختصرُ الطحاوی'' کا حوالہ

امام ابوبکر جصاص نے ''شرح مختصرُ الطحاوی'' میں فرمایا کہ:

''جس کی عید کی نماز فوت ہوجائے، تو وہ قضاء نہیں کرے گا، اس روایت کی وجہ سے کہ جمعہ اور تشریق، مصرِ جامع میں ہی ہے، اور تشریق کا نام، نمازِ عید کو بھی شامل ہے، سلف سے اس کی یہی تاویل مروی ہے۔

اور جب اس کا مصر سے تعلق ہے، تو نمازِ جمعہ کی طرح جماعت اور امام سے بھی تعلق ہوگا۔

نیز نمازِ عید، امام اور جماعت کے بغیر منقول نہیں ہے۔

لہٰذا یہ نماز اس طریقہ کے بغیر جائز نہیں ہوگی، جو طریقہ منقول ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ تم اسی طریقہ سے نماز پڑھو، جس طرح مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھتے ہو۔

اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی طریقہ سے نمازِ عید پڑھی ہے“۔انتھیٰ۔ [1]

یہ ملحوظ رہے کہ جمعہ اور تشریق کے مصرِ جامع میں ہی ہونے کی مذکورہ روایت، امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے، اہلِ سواد کے عیدین کی نماز واجب نہ ہونے کے متعلق مروی ہے، جیسا کہ امام محمد نے ”کتابُ الاصل“ میں اس کو نقل فرمایا ہے۔ [2]

نیز امام ابوبکر جصاص نے ”شرح مختصرُ الطحاوی“ میں ہی فرمایا کہ:

”اگر عید کی نماز، پہلے دن کسی عذر کی وجہ سے نہ پڑھی جاسکے، تو دوسرے دن جائز ہے، جو دوسرے دن قضاء کے طریقہ پر پڑھی جائے گی، لیکن اگر امام بغیر عذر کے جان بوجھ کر ترک کردے، تو دوسرے دن قضاء واجب نہیں ہوگی۔

جس سے یہ بات معلوم ہوئی کہ عید کے دوسرے دن کے ساتھ نمازِ عید کے وجود کا تعلق نہیں ہے، البتہ بعض صورتوں میں قضاء کے طریقہ پر جوازِ فعل کا تعلق

---

[1] مسألة :(لا قضاء لصلاة العيد)

قال أبو جعفر :(ومن فاتته صلاة العيد لم يقضها)

ولک لما روى عن النبي صلى الله عليه وسلم أنه قال" :لا جمعة ولا تشريق إلا في مصر جامع."

واسم التشريق يتناول صلاة العيد؛ لما روى عن السلف في تأويله، ولما ثبت أنها متعلقة بالمصر -كما وصفنا -تعلقت بالجماعة والإمام، كصلاة الجمعة.

وأيضًا :لم تنقل إلا بإمام وجماعة، فلا تجوز إلا على الوجه الذى نقلت عليه.

وقال النبي صلى الله عليه وسلم" :صلوا كما رأيتموني أصلي"، وكذلک صلاها النبي صلى الله عليه وسلم(شرح مختصر الطحاوى للجصاص، ج۲،ص ۱۶۱، كتاب الصلاة،باب صلاة العيدين)

[2] قلت :أرأيت أهل السواد من لم يكن في مصر ولا مدينة هل عليهم الخروج يوم الفطر أو يوم النحر؟ قال :لا، ولا يجب ذلک إلا على أهل الأمصار والمدائن .قلت :ولم؟ قال :للأثر الذى بلغنا عن رسول الله -صلى الله عليه وسلم -أنه قال: لا جمعة ولا تشريق إلا في مصر جامع (الأَصل،لمحمد بن الحسن الشيباني، ج۵،ص ۴۱۳، كتاب الصيد والذبائح،باب ما لا يجزء من الأضحية)

ہے"۔انتھٰی۔ [1]

یہ بات فقہائے کرام کے درمیان مختلف فیہ ہے کہ اگلے دن پڑھے جانے والی وہ عید کی نماز قضاء کہلائے گی، یا اداء، لیکن بہرحال اتنی بات معلوم ہوگئی کہ عید کے سلسلہ میں جمعہ کے مقابلے میں اس حیثیت سے توسع کا، نصوص سے ثبوت موجود ہے، اور اس پر فقہائے مجتہدین کا اجماع ہے، کہ بعض صورتوں میں عید کی نماز کو اپنے مخصوص وقت کے بعد بھی پڑھنا مشروع ہے، اور وقت کے اندر مشروع ہونے کا درجہ اس سے اَھون ہے۔

اور وقت کے اندر بقدرِ امکان، اس کو اجتماعاً، یا انفراداً پڑھنے کا مسئلہ ہی اس وقت زیرِ بحث ہے۔

اس کے علاوہ امام ابوبکر جصاص نے "شرح مختصرُ الطحاوی" میں تکبیراتِ تشریق کے باب میں فرمایا کہ:

"امام ابوحنیفہ کا قول یہ ہے کہ تکبیرِ تشریق ،شہروں کے اندر فرض نمازوں کو باجماعت اداء کرنے والے مقیمین پر ہی واجب ہے، منفرد پر اور گاؤں میں، اور مسافر پر، اور تنہاء نماز پڑھنے والی عورتوں پر واجب نہیں۔

امام ابوحنیفہ کی دلیل حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ ارشاد ہے کہ "لا جمعة ولا تشریق إلا فی مصر جامع "اور تشریق کا نام نمازِ عید، اور تکبیرِ تشریق اور قربانی سب کو شامل ہے، اور اس لفظ کا عموم، غیر مصر میں ان سب چیزوں کی نفی کرتا ہے۔

---

[1] فإن قیل :فقد یجوز عندکم فعل صلاة العید فی الیوم الثانی من الفطر، إذا فاتت فی الیوم الأول لعذر، ولا یتعلق بالیوم الثانی وجوب صدقة الفطر.
قیل له :لم تکن العلة جواز الفعل، وإنما کانت وجوب الفعل، وصلاة العید لا تجب فی الیوم الثانی من الفطر، وإنما تجب فی الیوم الأول، وتفعل فی الیوم الثانی علی وجه القضاء إذا فاتت لعذر.
ألا تری أنا نقول إنه لو ترکها الإمام عمدًا من غیر عذر :لم یجب قضاؤها فی الیوم الثانی، فعلمت أنَّ الیوم الثانی من الفطر لیس یتعلق به وجوب صلاة العید وإن تعلق به جواز الفعل علی جهة القضاء فی بعض الوجوه(شرح مختصر الطحاوی للجصاص،ج۷،ص ۳۱۹،۳۲۰،کتاب الضحایا)

اور جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ یہ مصر کے ساتھ مخصوص ہے، تو یہ بھی ضروری ہو گیا کہ وہ جماعت کے ساتھ مخصوص ہو، اور اُن لوگوں کے ساتھ مخصوص ہو، جن پر جماعت واجب ہے، جیسا کہ جمعہ۔

نیز جب تکبیر، وقت کے ساتھ مخصوص ہے، تو وہ جمعہ اور نمازِ عید دونوں کے مشابہ ہے''۔انتہٰی۔ [1]

مذکورہ عبارت سے معلوم ہوا کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی طرف سے جو دلیل ،نمازِ جمعہ کے شہر کے ساتھ خاص ہونے کے سلسلہ میں پیش کی گئی ہے، وہی دلیل اس سلسلہ میں عید اور تکبیرِ تشریق کے سلسلہ میں بھی پیش کی گئی ہے، لیکن اس کے باوجود، مشائخِ حنفیہ نے اس سے عدول کر کے، شہر اور غیر شہر، اور مقیم ومسافر اور مرد وعورت، اور منفرد سب کے حق میں تکبیرِ تشریق کا حکم لگایا ہے، حالانکہ اس حدیث میں مصر کی قید موجود ہے، اور جمعہ وعید کے سلسلہ میں دیگر شرائط اسی سے ماخوذ ہیں۔

پس جب تکبیرِ تشریق کے مسئلہ میں امام صاحب کے قول اور اس کی دلیل سے عدول کی

---

[1] مسألة :(من تجب عليه تكبيرات التشريق)

قال :(وقال أبو حنيفة :هـذا التكبيـر عـلى المقيمين فى جماعات المكتوبات فى الأمصار، وليس على منفرد، ولا فى السواد، ولا على المسافرين، ولا على النساء إذا صلين وحدهن.

وقال أبو يوسف ومحمد :على كل مصلى فرض، كائنًا من كان.

قال أبو بكر :لأبـى حـنيـفة مـا روى عـن الـنبى صلى الله عليه وسلم، وعن على رضى الله عنه" :لا جمعة ولا تشريق إلا فى مصر جامع."

واسـم التشـريـق يتنـاول صلاة العيد وتكبير التشريق والأضحية، وعموم اللفظ ينفى ذلک كله فى غير مصر.

ويـدل عـلى أن التكبير مراد به، ما ذكر فى خبر آخر" :لا جـمعة، ولا تشريق، ولا (صلاة فطر)، ولا أضحى إلا فى مصر جامع."

وإذا ثبـت أنـه مـخصوص بالمصر، وجب أن يكون مخصوصًا بالجماعة، وبمن تجب عليه الجماعة كالجمعة.

وأيضًا :لما كان التكبير مخصوصًا بوقت، يسقط بفوات وقته :أشبه الجمعة وصلاة العيد، فلم يلزم إلا أهل الأمصار(شرح مختصر الطحاوى، ج٢،ص١٦٦، كتاب الصلاة ،باب صلاة العيدين)

نظیر عندالحنفیہ موجود ہے، تو اگر نمازِ عید کے سلسلہ میں اس سے کمزور عدول کیا جائے، یعنی نمازِ عید کو منفرد، اہلِ قریہ، اور عورتوں کے حق میں واجب ہونے کے بجائے فی الجملہ بدرجہ تطوع، مشروع مانا جائے، تو اس کی بھی گنجائش ہوسکتی ہے۔

اور تکبیرِ تشریق کے مسئلہ میں جس قدر امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے قول سے عدول کیا گیا ہے، اس قدر عدول عید کے مذکورہ مسئلہ میں نہیں کرنا پڑتا، اور اس عدول کی ضرورت، احادیث وروایات اور آثار کی وجہ سے پیش آئی، اور ہمارے نزدیک وہ عدول بھی مشائخِ حنفیہ کی مخصوص تعبیر کی وجہ سے ہے، ورنہ ہم امام صاحب کے قول کی جو توجیہ راجح سمجھتے ہیں، اس کو عدول سمجھنے اور کہنے کی بھی ضرورت نہیں۔ [1]

''التجرید للقدوری'' کا حوالہ

امام قدوری نے ''التجرید'' میں ''لا جمعة ولا تشریق ولا فطر ولا أضحی إلا فی مصر جامع'' کی روایت سے حنفیہ کے نزدیک گاؤں میں جمعہ جائز نہ ہونے پر استدلال فرمایا ہے۔ [2]

---

[1] قلت :فمن صلى المكتوبة فى جماعة فى مصر من الأمصار فعليهم أن يكبروا فى هذه الأيام؟ قال :نعم .قلت :فإن كان معهم نساء ؟ قال :عليهن أن يكبرن .قلت :أرأيت من صلى وحده من المقيمين أو المسافرين أو النساء هل عليهم أن يكبروا؟ قال :لا .قلت :فهل على المسافرين أن يكبروا؟ قال :لا .قلت :أرأيت من صلى التطوع فى جماعة أو صلى الوتر هل يكبر بعدها؟ قال :لا. قلت :فهل على أهل السواد أن يكبروا؟ قال :لا .قلت :فإن صلوا فى جماعة؟ قال :وإن صلوا فى جماعة فلا تكبير عليهم .وهذا قول أبى حنيفة .وقال أبو يوسف ومحمد: نرى التكبير على من صلى المكتوبة، رجل أو امرأة أو مسافر أو مقيم صلى وحده أو فى جماعة (كتاب الاصل لمحمد بن الحسن الشيبانى، ج ۱، ص ۳۲۵، وص ۳۲۶، كتاب الصلاة،باب التكبير فى أيام التشريق)

قوله وهذا على المقيمين إلخ لحديث على لا جمعة ولا تشريق ولا فطر ولا أضحى إلا فى مصر جامع وأراد بالتشريق التكبير (النافع الكبير شرح الجامع الصغير للكنوى، ص ۱۱۴، وص ۱۱۵، كتاب الصلاة، باب فى صلاة الجمعة)

[2] لا يجوز إقامة الجمعة فى القرى:

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

نیز امام قدوری نے ''التجرید'' میں ہی مذکورہ روایت سے عید کی نماز کے لئے مصر ہونے کی شرط پر بھی استدلال فرمایا ہے۔ [1]

اس کے علاوہ امام قدوری نے ''التجرید'' میں ہی مذکورہ روایت سے امام ابوحنیفہ کے نزدیک تکبیرِ تشریق کے لئے مصر وا قامت کے شرط ہونے پر بھی استدلال فرمایا ہے۔ [2]

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

قال أصحابنا :لا يجوز إقامة الجمعة فی القری.

وقال الشافعی :إذا كانت قرية مجتمعة المنازل لا يظعن أهلها عنها شتاء ولا صيفا إلا ظعن حاجة وكان أهلها أربعين رجلا وجبت عليهم الجمعة وصح فعلها فيها.

والدليل علی ما قلناه :ما روی سعيد بن المسيب عن علی (-رضی الله عنه -) أن النبی -صلی الله عليه وسلم -قال :(لا جمعة ولا تشريق ولا فطر ولا أضحی إلا فی مصر جامع)(التجريد للقدوری، ج۲،ص ۹۱۹، كتاب الصلاة، رقم المسألة ۲۲۴)

[1] من شرط صلاة العيد المصر:

قال أصحابنا :من شرط صلاة العيد المصر.

وقال الشافعی :يجوز فی الأمصار وغيرها، وللمسافر والمقيم.

لنا :قوله -عليه السلام :-(لا جمعة ولا تشريق ولا فطر ولا أضحی (إلا فی مصر جامع)، (ومعلوم أنه) لم يرد نفس الفطر ونفس الأضحی)، فلم يبق إلا أن يكون المراد به الصلاة (التجريد للقدوری، ج۲،ص ۹۸۱، كتاب الصلاة، رقم المسألة ۲۴۶)

[2] من شرط تكبير التشريق المصر والإقامة:

قال أبو حنيفة :من شرط تكبير التشريق المصر والإقامة.

وقال أبو يوسف ومحمد :يكبر المسافر.

وهو قول الشافعی.

لنا :قول -عليه السلام :-(لا جمعة ولا تشريق ولا أضحی ولا فطر إلا فی مصر جامع .(والمراد بالتشريق تكبيره؛ لأنه مأخوذ من الظهور .ولا يجوز أن يقال :إن الأصمعی قال :التشريق الصلاة؛ لأنها تفعل عند إشراق الشمس؛ لأن الصلاة قد فهمت من قوله :(لا فطر ولا أضحی)، فلم يحمل اللفظ علی التكرار .ولا يجوز أن يحمل علی تشريق اللحم؛ لأن الأضحية لا تختص بالمصر .ولأنه ذكر زائد يلی الصلاة ويختص بها فاختص ببعض الأماكن، كالخطبة .ولا يلزم التثويب؛ لأنه لا يلی الصلاة .ولا التلبية؛ لأنها لا تختص الصلاة .ولأن الأذكار تارة تتقدم الصلاة وتارة تتأخر، فإذا كان ما يتقدم يجوز أن يختص ببعض الأماكن فالمتأخر مثله!(التجريد للقدوری، ج۲،ص ۹۹۳، ۹۹۴، كتاب الصلاة، رقم المسألة ۲۵۲)

’’المبسوط للسرخسی‘‘ کا حوالہ

شمس الائمہ سرخسی نے ’’المبسوط‘‘ میں فرمایا کہ:

’’ہمارے نزدیک جمعہ کے لئے شہر کے شرط ہونے کی دلیل یہ روایت ہے کہ ’’**لا جمعة ولا تشريق إلا في مصر جامع**‘‘۔انتہٰی۔ [1]

نیز شمس الائمہ سرخسی نے ’’المبسوط‘‘ میں فرمایا کہ:

’’حنفیہ کا مذہب عید کی نماز کے واجب، یا سنت ہونے میں مشتبہ ہے، لیکن زیادہ راجح یہ ہے کہ یہ سنت ہے، تاہم یہ دین کے اَعلام میں سے ہے، جس کا اختیار کرنا ہدایت اور ترک کرنا، ضلالت ہے (جیسا کہ عند البعض، پنجگانہ نماز باجماعت اور اذان واقامت وغیرہ کا حکم ہے)

اور عیدین کے لئے خروج، شہر والوں کے ہی ذمہ ہے، بوجہ اس روایت کے کہ ’’**لا جمعة ولا تشريق إلا في مصر جامع**‘‘۔

اور تشریق سے مراد، نمازِ عید ہے‘‘۔انتہٰی۔ [2]

نیز شمس الائمہ سرخسی نے ’’المبسوط‘‘ میں ہی فرمایا کہ:

---

[1] (ولنا) قوله -عليه الصلاة والسلام- لا جمعة ولا تشريق إلا في مصر جامع وقال علي -رضي الله تعالى عنه- لا جمعة ولا تشريق ولا فطر ولا أضحى إلا في مصر جامع (المبسوط،لشمس الأئمة السرخسي،ج۲،ص۲۳، كتاب الصلاة ،باب صلاة الجمعة)

[2] واشتبه المذهب في صلاة العيد أنها واجبة أم سنة فالمذكور في الجامع الصغير إنها سنة لأنه قال في العيدين :يجتمعان في يوم واحد فالأولى منهما سنة وروى الحسن عن أبي حنيفة رحمهما الله تعالى أنه تجب صلاة العيد على من تجب عليه صلاة الجمعة وقال في الأصل :لا يصلى التطوع في الجماعة ما خلا قيام رمضان وكسوف الشمس فهو دليل على أن صلاة العيد واجبة.

والأظهر أنها سنة ولكنها من معالم الدين أخذها هدى وتركها ضلالة وإنما يكون الخروج في العيدين على أهل الأمصار دون أهل القرى والسواد لما روينا لا جمعة ولا تشريق إلا في مصر جامع والمراد بالتشريق صلاة العيد على ما جاء في الحديث لا ذبح إلا بعد التشريق (المبسوط،لشمس الأئمة السرخسي،ج۲،ص۳۷،كتاب الصلاة ،باب صلاة العيدين)

’’جس کی نماز عید امام کے ساتھ فوت ہوجائے، اس پر کچھ واجب نہیں، اور امام شافعی نے فرمایا کہ وہ اسی طریقہ سے تنہاء نماز پڑھے گا، جس طریقہ سے امام پڑھتا ہے، لیکن یہ بات صحیح نہیں ہے، کیونکہ اس طریقہ سے نمازِ عید کا پڑھنا، قُربت کے طور پر صرف رسولُ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل سے پہچانا جاسکتا ہے، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو جماعت کے ساتھ ہی ادا کیا ہے، اور اس کو اسی صفت پر ادا کرنا جائز ہے۔

پس جب وہ فوت ہوگئی، تو اس کا کوئی خلیفہ نہیں رہا، کیونکہ اس کا وقت، طلوعِ شمس کے بعد ہے۔

اور یہ وقت تمام دنوں میں کسی واجب نماز کا وقت نہیں ہے، برخلاف جمعہ کی نماز کے کہ اگر وہ فوت ہوجائے، تو وہ ظہر کی نماز پڑھے گا، کیونکہ اس کا وقت زوال کے بعد ہے، اور یہ تمام دنوں میں ظہر کی واجب نماز کا وقت ہے۔

البتہ اگر وہ چاہے تو دو رکعتیں پڑھ لے، اور چاہے تو چار رکعتیں پڑھ لے، دوسرے دنوں میں چاشت کی نماز کی طرح‘‘۔انتہٰی۔ [1]

’’لا جمعة ولا تشريق، الخ ‘‘والی روایت سے ہی شمسُ الائمہ سرخسی نے امام ابوحنیفہ

---

[1] (قال :ولا شيء على من فاتته صلاة العيد مع الإمام وقال الشافعي -رضي الله عنه :-يصلي وحده كما يصلي مع الإمام وهذا غير صحيح فالصلاة بهذه الصفة ما عرفت قربة إلا بفعل رسول الله -صلى الله عليه وسلم -وما فعلها إلا بالجماعة ولا يجوز أداؤها إلا بتلك الصفة وإذا فاتت فليس لها خلف لأن وقتها بعد طلوع الشمس وهذا ليس بوقت لصلاة واجبة فی سائر الأيام بخلاف من فاتته الجمعة فإنه يصلي الظهر لأن وقتها بعد الزوال وهو وقت لوجوب الظهر فی سائر الأيام ولكنه إن أحب صلى ركعتين إن شاء وإن شاء أربعا كصلاة الضحى فی سائر الأيام لحديث عمارة بن روبية -رضي الله عنه -كان رسول الله -صلى الله عليه وسلم -يفتتح الضحى بركعتين ولحديث ابن مسعود -رضي الله عنه -كان رسول الله -صلى الله عليه وسلم -يواظب على أربع ركعات فی صلاة الضحى والذی يختص بهذا اليوم حديث علي -رضي الله عنه -عن رسول الله -صلى الله عليه وسلم -قال :من صلى بعد العيد أربع ركعات كتب الله تعالى له بكل نبت نبت وبكل ورقة حسنة(المبسوط،للسرخسی،ج ۲،ص ۳۹، كتاب الصلاة،باب صلاة العيدين)

رحمہ اللہ کے نزدیک تکبیرِ تشریق کے اہلِ شہر اور مرد اور مقیم وغیرہ پر واجب ہونے کے متعلق استدلال کیا ہے۔ [1]

’’المحیطُ البرھانی فی الفقہ النعمانی‘‘ کا حوالہ

’’المحیطُ البرھانی فی الفقہ النعمانی‘‘ میں ہے کہ:

’’ہمارے نزدیک عید کی نماز جب فوت ہوجائے، تو اس کو قضاء نہیں کیا جائے گا، کیونکہ وہ جماعت اور سلطان کے ساتھ ہی مشروط ہے، اور منفرد اس کے حصول سے عاجز ہے‘‘۔انتہٰی۔ [2]

اور’’المحیطُ البرھانی فی الفقہ النعمانی‘‘ میں ہی نوادرُ الصلاۃ کے حوالہ سے مذکور ہے کہ:

’’حنفیہ کے نزدیک انفرادی طور پر اداء نہ کرنے کے عدمِ جواز کی وجہ یہ ہے کہ حنفیہ کے نزدیک سلطان اور جماعت شرط ہے، اور امام شافعی کے نزدیک یہ شرط نہیں۔

---

[1] وهـذا التـكبيـر عـلى الرجال المقيمين من أهل الأمصار في الصلوات المكتوبات في الجماعة عند أبي حنيفة -رحمه الله -وقـال أبو يوسف ومحمد رحمهما الله تعالى كل من يصلي مكتوبة في هـذه الأيـام فـعـليـه الـتـكبير مسافرا كان أو مقيما في المصر أو القرية رجلا أو امرأة في الجماعة أو وحده وهو قول إبراهيم -رحـمه الله تعالى -لأن هـذه التكبيرات في حق غير الحاج بمنزلة التلبية في حق الحاج وفي التلبية لا تراعى هذه الشروط فكذلك في التكبيرات .

وأبو حنيفة -رضـي الله عنه -احتـج بـمـا روينـا لا جمعة ولا تشريق إلا في مصر جامع قال الخليل والنضر بن شميل رحمهما الله تعالى :التشريق في اللغة التكبير.

ولا يجوز أن يحمل على صلاة العيد فقد قال في حديث علي -رضي الله عنه :-لا جمعة ولا تشريق ولا فـطـر ولا أضـحى إلا في مصر جامع فقد ثبت في الحديث أنه بمنزلة الجمعة في اشتراط المصر فيـه فكذلك في اشتراط الذكورة والإقامة والجماعة ولهذا لم يشترط أبو حنيفة -رضي الله عنه -فيـه الـحـرية كـمـا لا تشترط في صلاة الجمعة(المبسوط،لشمس الأئمة السرخسي،ج ٢،ص ٣٣، كتاب الصلاة ،باب التكبير في أيام التشريق)

[2] صلاة العيد إذا فاتت لا تقضى عندنا لأنها لم تشرع إلا بجماعة وسلطان، والمنفرد عاجز عن تـحـصيـلها(المحيط البرهاني في الفقه النعماني،ج ١ ،ص ١٥٠ ، كتاب الطهارات ،الفصل الخامس في التيمم)

لٰہذا اُن کے نزدیک اس کا حکم تراویح کی طرح ہے، کہ اگر وہ رمضان میں جماعت کے ساتھ فوت ہو جائے، تو تنہاء پڑھی جاتی ہے۔

اور عید کی نماز چاشت کی جگہ مقرر کی گئی ہے۔

لٰہذا عید کی نماز فوت ہونے کے بعد اگر وہ چاہے، تو چاشت کی نماز پڑھ سکتا ہے۔

لیکن چاشت کی نماز کا پڑھنا واجب نہیں ہے''۔انتھٰی۔ [1]

نمازِ عید کے، چاشت کے وقت میں ہونے میں تو شبہ نہیں، لیکن امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک نمازِ عید کا، چاشت کے قائم مقام ہونا محلِ نظر ہے۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے اس کی تصریح دستیاب نہیں، بلکہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے نمازِ عید کی

---

[1] ذكر في نوادر الصلاة :ولا شيء على من فاتته صلاة العيد مع الإمام، وقال الشافعي :يصلي وحده كما يصلي مع الإمام، وهذا بناء على أن المنفرد هل يصلي صلاة العيد؟ عندنا لا يصلي، وعنده يصلي؛ لأن الجماعة والسلطان ليس بشرط عنده، فكان له أن يصلي وحده، فإذا فاتته مع الإمام لم يعجز عن قضائها.

فقال بالقضاء كالتراويح إذا فاتت بالجماعة في رمضان يقضيها وحده؛ لأنه قادر على قضائها، لأنه يجوز الأداء منفردا كما يجوز بجماعة كذا ههنا .وعلماؤنا رحمهم الله قالوا :لا يجوز إقامتها إلا بشرائط مخصوصة منها الإمام، فإذا فاتت مع الإمام فقد عجز عن قضائها، فلا يلزمه القضاء .

فإن قيل :صلاة العيد قائمة مقام صلاة الضحى، ولهذا تكره صلاة الضحى قبل صلاة العيد، وإذا قامت مقام صلاة الضحى، وهو قادر على صلاة الضحى إن عجز عن إقامة صلاة العيد وجب أن تلزمه صلاة الضحى لتقوم مقام صلاة العيد، كما إذا فاتته الجمعة يلزمه إقامة الظهر، وإنما تلزمه لما قلنا.

قلنا :نعم صلاة العيد أقيمت مقام صلاة الضحى، فإذا عجز عن إقامة صلاة العيد لفوات الشرائط عاد الأمر إلى الأصل وهي صلاة الضحى، وصلاة الضحى غير واجبة في الأصل بل يتخير في ذلك.

وفي أداء الجمعة لما عجز عن أداء الجمعة لفوات الشرائط سقطت عنه الجمعة، وعاد الأمر إلى ما كان قبل الجمعة، وقبل الجمعة كان يلزمه أداء الظهر، ولا يتخير في أدائه، فكذلك بعدها، فإن أحب أن يصلي صلى إن شاء ركعتين، وإن شاء أربعا، ويكون ذلك صلاة الضحى والأفضل أن يصلي أربع ركعات، لما روي عن ابن مسعود رضي الله عنه أنه قال :من فاتته صلاة العيد صلى أربع ركعات، يقرأ في الركعة الأولى :(سبح اسم ربك الاعلى)وفي الثانية :(والشمس وضحها) وفي الثالثة :(والليل إذا يغشى) وفي الرابعة :(والضحى)وروي في ذلك عن النبي عليه السلام وعدا جميلا وثوابا جزيلا(المحيط البرهاني في الفقه النعماني، ج۲،ص ۱۲ ۱ ،كتاب الصلاة،الفصل السادس والعشرون في صلاة العيدين)

دلیل میں ''لا جمعة ولا تشريق ولا فطر ولا أضحى إلا فى مصر جامع'' کی روایت مروی ہے، اور حنفیہ کے راجح قول کے مطابق نمازِ عید واجب ہے، جبکہ چاشت کی نماز واجب نہیں، اور وہ جماعت کے ساتھ بھی مشروع نہیں۔

پھر اس کے چاشت کے قائم مقام ہونے کا تقاضا یہ ہوگا کہ اس میں جماعت وغیرہ شرط نہ ہو، کیونکہ چاشت کی نماز باجماعت ثابت نہیں، یہی وجہ ہے کہ عام مشائخِ حنفیہ نے نمازِ عید کے لئے، نمازِ جمعہ کی شرائط بیان کی ہیں، نمازِ چاشت کی شرائط بیان نہیں کیں۔

اس کے علاوہ ''المحيط البرهانى فى الفقه النعمانى'' میں تکبیرِ تشریق کے ذیل میں امام ابوحنیفہ کے قول کی دلیل میں ''لا جمعة ولا تشريق ولا فطر ولا أضحى إلا فى مصر جامع'' کی روایت سے استدلال کیا گیا ہے۔ [1]

---

[1] فوجه قولهما :أن التكبير تبع للمكتوبة فيجب على كل من تجب عليه المكتوبة بطريق التبعية.

وجه قول أبى حنيفة رحمه الله :قوله عليه السلام :لا جمعة ولا تشريق إلا فى مصر جامع والمراد من التشريق تكبير أيام التشريق هكذا قاله النضر بن شميل، والخليل بن أحمد وهما كانا من أئمة اللغة، ولأن التشريق حقيقته تقديد اللحم؛ لأنه تفعيل من شرق تشريقا إذا قطع وأظهر للشمس سمى تقديد اللحم تشريقا؛ لأن فى ذلک تقطيعه وإظهاره للشمس والحقيقة وهو التقديد ليس بمراد؛ لأنه لا يختص بالمصر وله مجاز أن الصلاة والتكبير فى أدبار الصلوات لأن فى ذلک إظهار شعار الإسلام فإن أمكن حمله عليهما يحمل عليهما ويكون هذا تبعا للصلاة والتكبير إلا فى مصر جامع، وإن لم يمكن حمله عليهما يحمل على التكبير لأن نفى صلاة العيد إلا فى المصر استفيد برواية أخرى، وهو قوله عليه السلام والتحية :لا جمعة ولا تشريق ولا فطر ولا أضحى إلا فى مصر جامع والمراد من الفطر والأضحى صلاة الفطر والأضحى فلو حمل التشريق المذكور فى هذه الرواية على الصلاة كان تكرارا ومهما أمكن حمل اللفظ على فائدة جديدة لا يحمل على التكرار، وإذا ثبت أن المصر شرط وجب أن يشترط القوم الخاص والجماعة كما فى الجمعة وصلاة العيدينفوجه قولهما :أن التكبير تبع للمكتوبة فيجب على كل من تجب عليه المكتوبة بطريق التبعية.

وجه قول أبى حنيفة رحمه الله :قوله عليه السلام :لا جمعة ولا تشريق إلا فى مصر جامع والمراد من التشريق تكبير أيام التشريق هكذا قاله النضر بن شميل، والخليل بن أحمد وهما كانا من أئمة اللغة، ولأن التشريق حقيقته تقديد اللحم؛ لأنه تفعيل من شرق تشريقا إذا قطع وأظهر للشمس

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

دیگر کتبِ حنفیہ کا حوالہ

حنفیہ کی دیگر متعدد کتب میں بھی امام کے ساتھ عید کی نماز فوت ہونے کے بعد، اس کی قضاء نہ ہونے کا ذکر ہے۔

اس قسم کی عبارات سے ظاہر ہوتا ہے کہ حنفیہ کے نزدیک نمازِ عید کے لئے سلطان شرط ہے،

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

سمی تقدید اللحم تشريقا؛ لأن في ذلك تقطيعه وإظهاره للشمس والحقيقة وهو التقديد ليس بمراد؛ لأنه لا يختص بالمصر وله مجاز أن الصلاة والتكبير في أدبار الصلوات لأن في ذلك إظهار شعار الإسلام فإن أمكن حمله عليهما يحمل عليهما ويكون هذا تبعا للصلاة والتكبير إلا في مصر جامع، وإن لم يمكن حمله عليهما يحمل على التكبير لأن نفي صلاة العيد إلا في المصر استفيد برواية أخرى، وهو قوله عليه السلام والتحية :لا جمعة ولا تشريق ولا فطر ولا أضحى إلا في مصر جامع والمراد من الفطر والأضحى صلاة الفطر والأضحى فلو حمل التشريق المذكور في هذه الرواية على الصلاة كان تكرارا ومهما أمكن حمل اللفظ على فائدة جديدة لا يحمل على التكرار، وإذا ثبت أن المصر شرط وجب أن يشترط القوم الخاص والجماعة كما في الجمعة وصلاة العيدين.

فإن قيل :هذه التكبيرات شرعت تبعا ولا يجوز أن يشترط التبع ما لا يشترط الأصل قلنا :نعم إلا أن هذه التبعية عرفت شرعا بخلاف القياس فإنه لم يشرع في غير هذه الأيام فيراعى لهذه التبعية جميع الشرائط التي ورد بها، والنص جعل من إحدى شرائط إقامته المصر وجب أن يشترط القوم الخاص والجماعة كما في الجمعة والعيد، واختلاف المشايخ على قول أبي حنيفة رحمه الله :أن الحرية هل هي شرط لوجوب هذه التكبيرات.

وفائدة الخلاف إنما تظهر فيما إذا أم العبد قوما صلاة مكتوبة في هذه الأيام هل يجب عليه التكبير لمن شرط الحرية قال :فإن الذكورة والمصر شرط لإقامته مقصودا فكذا الحرية قياسا على الجمعة وصلاة العيد.

ومن لم يشترط الحرية قال :لم يشترط لإقامته السلطان فلا يشترط الحرية كسائر الصلوات وإنما لم يشترط لإقامته السلطان عند أبي حنيفة رحمه الله لما حكي عن الشيخ الإمام أبي بكر محمد بن الفضل البخاري رحمه الله :أن التكبير يشبه صلاة العيد وصلاة الجمعة من حيث إنه شرط لإقامته المصر بالنص كما شرط الإقامة للجمعة والعيد ويشبه سائر الصلوات من حيث إنه يقام في يوم واحد خمس مرات، فكان له حظا من الخصوص والعموم، فأشبه بالخصوص شرطنا القوم الخاص والجماعة وأشبه بالعموم لم يشترط السلطان توفيرا على الشبهين حظهما بقدر الإمكان(المحيط البرهاني في الفقه النعماني، ج٢،ص ١١٩، ١٢٠ ، كتاب الصلاة،الفصل السابع والعشرون في تكبير أيام التشريق)

اور جب سلطان شرط ہے، تو اسی سے اس کی جماعت کا شرط ہونا بھی معلوم ہوتا ہے۔ [1]

اور جب حاکم کی طرف سے ایک سے زیادہ مقامات پر خود سے کسی کو امام مقرر کر کے نمازِ عید کی ممانعت نہ ہو، بلکہ اس سے بڑھ کر اجازت وحکم ہو، تو پھر نمازِ عید کے فوت ہونے کا محدود تصور بھی ختم ہو جاتا ہے، اور قضاء ہونے کا محدود تصور بھی مرتفع ہو کر، توسع پیدا ہو جاتا ہے، جیسا کہ آج کل ایسا ہی ہے۔

اور اس قسم کے اُمور میں **حکمِ حاکم کو رافع للخلاف** بھی قرار دیا گیا ہے، اور بہت سے ممالک میں مسلم حکمرانوں کی طرف سے جب گھروں میں نمازِ عید باجماعت اور تنہاء پڑھنے کی اجازت، بلکہ حکم موجود ہو، تو اس کو کیونکر ناجائز وغیر درست قرار دیا جاسکتا ہے، بالخصوص جبکہ عند الحنفیہ انفرادی طور پر پڑھنے کا بھی فی الجملہ ثبوت موجود ہو، جیسا کہ آگے آتا ہے۔

---

[1] (ولا تقضى) صلاة العيد (إن فاتت مع الإمام) كلمة مع متعلقة بالضمير المستتر فى فاتت لا بفاتت والمعنى أن الإمام لو صلاها مع جماعة وفاتت عنه الصلاة بالجماعة لا يقضيها من فاتته وعند الأئمة الثلاثة تقضى(مجمع الأنهر فى شرح ملتقى الأبحر، ج ١، ص ٧٤، كتاب الصلاة، باب صلاة العيدين)

وإن فسدت بخروج الوقت أو فاتت عن وقتها مع الإمام سقطت، ولا يقضيها عندنا.

وقال الشافعي يصليها وحده كما يصلى الإمام يكبر فيها تكبيرات العيد، والصحيح قولنا؛ لأن الصلاة بهذه الصفة ما عرفت قربة إلا بفعل رسول الله -صلى الله عليه وسلم -كالجمعة، ورسول الله -صلى الله عليه وسلم -ما فعلها إلا بالجماعة كالجمعة، فلا يجوز أداؤها إلا بتلك الصفة؛ ولأنها مختصة بشرائط يتعذر تحصيلها فى القضاء ، فلا تقضى كالجمعة ولكنه يصلى أربعا مثل صلاة الضحى إن شاء ؛ لأنها إذا فاتت لا يمكن تداركها بالقضاء لفقد الشرائط، فلو صلى مثل صلاة الضحى لينال الثواب كان حسنا لكن لا يجب لعدم دليل الوجوب، وقد روى عن ابن مسعود أنه قال من فاتته صلاة العيد صلى أربعا(بدائع الصنائع فى ترتيب الشرائع، ج ١، ص ٢٧٩، كتاب الصلاة، فصل بيان ما يفسد صلاة العيدين وبيان حكمها إذا فسدت)

ومن فاتته صلاة العيد مع الإمام لم يقضها لأن الصلاة بهذه الصفة لم تعرف قربة إلا بشرائط لا تتم بالمنفرد(الهداية فى شرح بداية المبتدى، ج ١، ص ٨٥، كتاب الصلاة ،باب :صلاة العيدين)

وقوله (ومن فاتته صلاة العيد مع الإمام) أى أدى الإمام صلاة العيد ولم يؤدها هو (لم يقضها) عندنا خلافا للشافعي فإنه قال :يصلى وحده كما يصلى مع الإمام لأن الجماعة والسلطان ليس بشرط عنده فكان له أن يصلى وحده.

وعندنا هى صلاة لا تجوز إقامتها إلا بشرائط مخصوصة من الجماعة والسلطان، فإذا فاتت عجز عن قضائها(العناية شرح الهداية، ج ٢، ص ٧٨، ٧٩، كتاب الصلاة ،باب :صلاة العيدين)

پھر کتبِ حنفیہ میں قضاء ہونے کی صورت میں اگر چاہے، تو دو، یا چار رکعتوں کے پڑھ لینے کا ذکر ہے۔ [1]

اسی کے ساتھ حنفیہ کی بعض کتب میں حضرت ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ کی سند سے یہ روایت بھی مذکور ہے کہ جس کی عید کی نماز فوت ہوجائے، تو وہ چار رکعات پڑھے، اور ان میں مخصوص سورتیں پڑھنے کا بھی ذکر ہے، اوران چار رکعات کے متعلق حدیث میں اجرِ عظیم وارد ہونے کا بھی ذکر ہے۔ [2]

---

[1] وإن فسدت بخروج الوقت سقطت، ولا يقضيها عندنا كالجمعة.ولكنه يصلى أربعا مثل صلاة الضحى إن شاء؛ لأنها إذا فاتته لا يمكن تداركها بالقضاء لفقد الشرائط فلو صلى مثل الضحى لنيل الثواب كان حسنا، وهو مروى عن ابن مسعود(البحرالرائق ،ج ٢ ص ١٧٥، كتاب الصلاة، باب العيدين)

[2] ومن خرج على الجبانة ولم يدرك الإمام فى شىء من الصلاة إن شاء انصرف إلى بيته وإن شاء صلى ولم ينصرف والأفضل أن يصلى أربعاً فتكون له صلاة الضحى لما روى عن ابن مسعود رضى اللّٰہ عنہ انه قال من فاتته صلوة العيدصلى اربع ركعات يقرأفى الاولىٰ سبح اسم ربك الاعلىٰ وفى الثانيه والشمس وضحها وفى الثالثة والليل اذايغشى وفى الرابعه والضحىٰ وروى فى ذلك عن رسول اللّٰہ صلى الله عليه وسلم وعدا جميلاً وثواباً جزيلا (فتاویٰ قاضى خان علىٰ هامش الهندية ج ١ ص ١٨٤، كتاب الصلاة)

(حكم من فاتته صلاة العيد مع الإمام)

م :(ومن فاتته صلاة العيد مع الإمام لم يقضها) ش :كلمة مع متعلقة بالصلاة لا بقوله فاتته، أى فاتت الصلاة عنه بالجماعة، وليس معناه فاتت الصلاة عنه وعن الإمام، حاصله أدى الإمام صلاة العيد ولم يؤدها هو، وأما إذا فاتت الإمام أيضا فائتة يصليها مع الجماعة فى اليوم الثانى إذا كان الفوات بعذر.

وفى "جوامع الفقه "و "قاضى خان "إذا تركها بغير عذر لا يقضيها أصلا، وبعذر يقضيها فى اليوم الثانى فى وقتها، وبه قال الأوزاعى والثورى وأحمد وإسحاق، وقال ابن المنذر :وبه أقول، وفى "جوامع الفقه :"العذر مثل أن يظهر أنهم صلوها بعد الزوال فى يوم غيم، وعلى قول ابن شجاع :لا يجوز فى اليوم الثانى، وبه قال مالك، فإن تركها فى اليوم الثانى بعذر أو بغير عذر لا يصليها.

وقال الشافعى :من فاتته صلاة العيد يصلى وحده كما يصلى مع الإمام، وهذا بناء على أن المنفرد هل يصلى صلاة العيد، عندنا لا يصلى، وعنده يصلى.

وقال السروجى :وللشافعى قولان الأصح قضاؤها، فإن أمكن جمعهم فى يوم صلى بهم، وإلا صلاها من الغد، وهو فرض قضاء النوافل عنده، وعلى القول الآخر هى الجمعة يشترط الجماعة والأربعين

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

لیکن ہمیں عید کی نماز فوت ہونے کی قید کے ساتھ ان چار رکعتوں کی فضیلت کا کسی مستند حدیث میں ذکر دستیاب نہ ہوا۔

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

ودار الإقامة، وفعله من الغد إن قلنا إذا لا يصليها فى بقية اليوم، وإلا صلاها فى نفسه وهو الصحيح عندهم.

وتأخيرها عنه قيل لا يسقط أنه لو قيل إلى آخر الشهر، وقال السروجى فى الذى تفوته صلاة العيد مع الإمام :لكنه إن أحب أن يصلى إن شاء صلى ركعتين وإن شاء أربعا كصلاة الضحى كسائر الأيام، ومثله فى البدائع، وعن ابن مسعود -رضى الله عنه -يصلى أربعا، وبه قال أحمد، لكن إن شاء بتسليمة واحدة، وإن شاء بتسليمتين، واستحبه الثورى، وعند الأوزاعى يصلى ركعتين ولا يجهر فيهما بالقراء ة ولا يكبر تكبير الإمام.

وقال إسحاق :إن يصلى فى الجبانة صلاها ركعتين وإلا صلاها أربعا.

وقال السغناقى :فإن أحب أن يصلى فالأفضل أن يصلى أربع ركعات لما روى عن ابن مسعود أنه قال :من فاتته صلاة العيد صلى أربع ركعات يقرأ فى الركعة الأولى (سبح اسم ربك الأعلى) وفى الثانية (والشمس وضحاها)وفى الثالثة (والليل إذا يغشى)وفى الرابعة (والضحى)وروى فى ذلك عن النبى -صلى الله عليه وسلم -وعدا جميلا وثوابا جزيلا، كذا فى "المحيط ."

قلت :قال ابن المنذر :لا يصح فيه حديث ابن مسعود -رضى الله عنه -.

م :(لأن الصلاة بهذه الصفة) ش :أراد بها التكبيرات المخصوصة بها .م :(لم تعرف قربة إلا بشرائط لا تتم بالمنفرد) ش :أراد بالشرائط هى الشرائط المخصوصة بها، نحو الجماعة والسلطان والمصر والمنفرد عاجز عن ذلك، فلا يجب عليه صلاتها.

وفى "نهاية المطلب "تصح صلاة العيد من المنفرد والمسافر والنساء فى الدور وراء الخدور كالنوافل، غير أن الجماعة فيها مستحبة، وقال ابن المنذر :يصليها المسافر ومن لا تجب عليه الجمعة والمرأة فى بيتها والعبد، وهو قول الحسن البصرى.

وقال الأوزاعى :ليس على المسافر صلاة الأضحى ولا الفطر، وبه قال مالك وإسحاق، وهو قول على بن أبى طالب -رضى الله عنه (البناية شرح الهداية، ج٣،ص ١١٩، ١٢٠، كتاب الصلاة ،باب : صلاة العيدين)

السروجى :(637وقيل 639 - 710وقيل 701هـ):

هو أحمد بن إبراهيم بن عبد الغنى، أبو العباس، شمس الدين السروجى، فقيه حنفى، تفقه على أبى الربيع سليمان بن أبى العز، وأبى الظاهر إسحاق بن على يحيى والشيخ نجم الدين كان مشاركا فى علوم وجمع وصنف وأفتى ودرس.

من تصانيفه " :اعتراضات على ابن تيمية فى علم الكلام "، و "شرح الهداية "وسماه الغاية ولم يكمله(الموسوعة الفقهية الكويتية، ج٣٨،ص ٣٩٥، ٣٩٦،مادة"تراجم الفقهاء")

اس لیے اہلِ علم حضرات کو اس حدیث کی سندی تصدیق ہوجانے سے قبل بیان ونقل کرنا مناسب نہیں۔

احادیث کی سندی تحقیق کے لئے کتبِ احادیث کی اہمیت زیادہ ہوتی ہے، بنسبت فقہی کتابوں کے۔

جہاں تک حضرت ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی مستند روایت کا تعلق ہے، تو اس کا ذکر پیچھے گزر چکا ہے۔

حاصل یہ ہے کہ حنفیہ کے نزدیک جب حاکم کی طرف سے ایک سے زیادہ مقامات پر لوگوں کو خود سے اپنے طور پر کسی کو امام مقرر کر کے نمازِ عید کی ممانعت نہ ہو، تو پھر نمازِ عید کے فوت ہونے کا محدود تصور ختم ہوجاتا ہے، اور قضاء ہونے کا محدود تصور بھی مرتفع ہوکر، توسع پیدا ہوجاتا ہے، اور ایسی صورت میں لوگوں کو اپنے طور پر گھروں وغیرہ میں امام مقرر کر کے نمازِ عید پڑھنا جائز ہوجاتا ہے، اور اِذنِ عام بھی ضروری نہیں رہتا، اذنِ عام کی حقیقت سے متعلق تفصیلی کلام ہم نے جمعہ سے متعلق دیگر رسائل میں کر دیا ہے، جیسا کہ آج کل لوگوں کو حکمرانوں کی طرف سے اس طرح نماز پڑھنے کی ممانعت نہیں۔

اور اس قسم کے اُمور میں **حکمِ حاکم کو رافع للخلاف** بھی قرار دیا گیا ہے، اور جب حکمرانوں کی طرف سے گھروں میں نمازِ عید پڑھنے کی اجازت، بلکہ حکم موجود ہو، تو پھر اس کو کیونکر ناجائز قرار دیا جاسکتا ہے، جس کی تفصیل ہم نے نمازِ جمعہ سے متعلق اپنے دوسرے مضامین میں ذکر کردی ہے۔

اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک اگر کسی شخص کو باجماعت نمازِ عید دستیاب نہ ہو، تو اس پر عید کی نماز پڑھنا واجب نہیں رہتا، لیکن اگر وہ پڑھنا چاہے، تو اس کے لئے جائز ہے۔

اور اس کے لئے جس طرح دو رکعتیں پڑھنا جائز ہے، اسی طرح چار رکعتیں پڑھنا بھی جائز ہے۔

پھر امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے اس بات کی تصریح دستیاب نہیں کہ یہ چار رکعتیں ایک سلام کے ساتھ پڑھے گا، یا دو سلاموں کے ساتھ پڑھے گا، اور یہ نماز مطلق تطوع ونفل ہوگی، یا عید کے قائم مقام ہوگی، اور اس کو عام نوافل کی طرح پڑھا جائے گا، یا زائد تکبیرات کے ساتھ پڑھا جائے گا۔

البتہ بعد کے متعدد مشائخِ حنفیہ نے ان کو مطلق نوافل اور بعض نے چاشت کے نوافل کا درجہ دیا ہے۔

لیکن بعض مشائخِ حنفیہ، مثلاً علامہ انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ وغیرہ نے اس کو نمازِ عید کا درجہ دیا ہے۔

اور ہمارے نزدیک یہی رائے راجح ہے، جس کی تائید بعض صحابۂ کرام کی روایات اور جلیل القدر تابعین کے آثار سے بھی ہوتی ہے، جن سے نمازِ عید رہ جانے کی صورت میں دو، یا چار رکعات پڑھنے کی تصریح ہے۔

اور غالباً امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے دو اور چار رکعات کا اختیار دے کر اس سلسلہ میں مروی متعدد روایات وآثار کی رعایت کو ملحوظ رکھا ہے۔

اور اگر یہ کہا جائے کہ مشائخِ حنفیہ کا نمازِ عید کی تکبیرات سے انکار مراد نہیں، البتہ قضاء واجب نہ ہونے اور جہری قرائت نہ ہونے اور خطبہ نہ ہونے جیسی وجوہات کی بناء پر چاشت سے مشابہت مراد ہے، تو پھر یہ ایک لفظی اختلاف شمار ہوتا ہے۔

اور ایسی صورت میں یہ کہنا درست قرار پاتا ہے کہ نمازِ عید فوت ہونے کے بعد عند الحنفیہ اس کی قضاء واجب نہیں، البتہ اگر کوئی چاہے، تو زائد تکبیرات کے ساتھ دو، یا چار رکعات بغیر جہری قرائت وخطبہ کے پڑھ لے، جو بظاہر اور صورتاً، جہری قرائت اور خطبہ وجماعت نہ ہونے کی وجہ سے چاشت کا درجہ رکھتی ہیں، اگرچہ ان کو عید کا عنوان کیوں نہ دیا جائے۔

نیز تنہاء پڑھنے کی صورت میں تکبیر کو بھی واجب نہ کہا جائے، تو گنجائش ہے، یعنی تکبیر کے بغیر

بھی نمازِ عید کا حکم دینے کی گنجائش ہے۔

اور ہمارا رجحان اس طرف ہوا کہ دو رکعتیں مطلق عید کی نیت سے پڑھنا بہتر ہے، پھر اگر یہ درحقیقت نمازِ عید ہوئی، تو فبھا، ورنہ نفل ہو جائیں گی، اور یہ گزر چکا کہ نمازِ عید کے تطوع وغیر تطوع میں اختلاف کی وجہ سے عندالحنفیۃ بھی نمازِ عید میں مطلق نیت بہتر ہے، تاکہ اختلاف کی رعایت ہو جائے۔

جن روایات میں دو رکعات کا تکبیر کے ساتھ اور عید کی نماز کی طرح پڑھنے کا ذکر ہے، ان سے صاف طور پر یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ عید کی نماز ہی کہلائے گی، اور ان روایات سے عید کی نماز کے تنہاء پڑھنے کا بھی ثبوت ہوتا ہے۔

اور بعض روایات میں چار رکعات پڑھنے کا ذکر آیا ہے، اگر کوئی چار رکعات پڑھنا چاہے، تو مزید دو رکعات بعد میں عام نفل کے طور پر پڑھ لے، تاکہ یہ جماعت اور خطبہ وغیرہ کی تلافی کے طور پر ہو جائیں۔

خلاصہ یہ کہ مذکورہ رجحان کے مطابق مختلف روایات وآثار کے پیشِ نظر امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک نمازِ عید باجماعت فوت ہونے کے بعد اس کی قضاء انفرادی طور پر واجب نہیں رہتی، البتہ بصورتِ تطوع جائز ومستحب رہتی ہے، اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک تطوع کے طریقہ پر درحقیقت یہ عید کی قضاء ہی ہے۔

لیکن جماعت، خطبہ اور جہری قرائت وغیرہ کی صفات مفقود ہونے کی وجہ سے یہ اپنی مخصوص ہیئت پر قائم نہیں رہتی، اس لیے اس کو نمازِ عید کی قضاء کا عنوان دینے سے اجتناب کیا گیا۔

اس لیے ایک جہت سے یہ نمازِ عید کی قضاء کہلائے گی، اور دوسری جہت سے تطوعِ محض کہلائے گی، بعض نے اس کی تعبیر تطوعِ محض، یا چاشت کی نماز سے کردی، اور بعض نے قضاء سے کردی، جیسا کہ پہلے دن کسی عذر سے نمازِ عید نہ پڑھی جانے کی صورت میں اگلے دن کی نماز کے متعلق اداء وقضاء کہلائے جانے میں فقہائے کرام کے مابین اختلاف رونما ہوا۔

اس حیثیت سے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا یہ قول نہ تو جمہور کے خلاف کہلائے گا، اور نہ ہی آثارِ صحابہ وتابعین وغیرہ کے خلاف شمار ہوگا۔

چنانچہ دیگر فقہائے کرام میں سے بھی کسی نے تو قضاءِ عید، یا انفراداً نمازِ عید کو جائز کہا، کسی نے سنت، یا مستحب ومندوب وغیرہ کہا، اور کسی نے چار رکعات کی شکل میں پڑھنے کو راجح کہا، اور کسی نے دو رکعات کی شکل میں پڑھنے کو راجح کہا، کسی نے تکبیراتِ زوائد کے ساتھ پڑھنے کو راجح کہا، اور کسی نے خطبہ وتکبیر کے بغیر پڑھنے کو راجح کہا، اور یہ اختلاف اَولویت وغیر اَولویت کے مابین دائر رہا۔

اور یہ بات اپنے مقام پر طے ہو چکی ہے کہ اس قسم کے اجتہادی مسائل میں اختلاف سے خروج اولیٰ ہوا کرتا ہے، جو کہ مذکورہ صورت میں بہر حال مرد وعورت سب کے لیے پڑھ لینے میں ہی ملحوظ ہے، تاکہ اگر واجب، یا سنت ادا نہ ہو، تو تطوع کا تو بہر حال اجر وثواب حاصل ہو ہی جائے، جس پر کسی کا اختلاف نہیں، اور عید کے عمومی حکم میں شرکت سے کوئی مسلم مرد وعورت محروم نہ رہے۔ [1]

اور جب نمازِ عید کی قضاء کے وجوب وعدمِ وجوب اور سنت ومستحب ہونے وغیرہ میں بھی اختلاف ہے، یہاں تک کہ اگلے اور تیسرے دن تک پڑھنے کا بھی فی الجملہ ثبوت ہے، تو اس

---

[1] التورع للخروج عن الخلاف:

قال القرافی :من الورع الخروج عن خلاف العلماء بحسب الإمكان، فإن اختلف العلماء فی فعل هل هو مباح أو حرام فالورع الترک، أو هو مباح أو واجب فالورع الفعل مع اعتقاد الوجوب حتی يجزء عن الواجب علی المذهب.

وإن اختلفوا فيه :هل هو مندوب أو حرام فالورع الترک، أو مکروه أو واجب فالورع الفعل، حذرا من العقاب فی ترک الواجب، وفعل المکروه لا يضره.

وإن اختلفوا هل هو مشروع أم لا فالورع الفعل، لأن القائل بالمشروعية مثبت لأمر لم يطلع عليه النافی، والمثبت مقدم علی النافی کتعارض البينات(الموسوعة الفقهية الکويتية، ج۴۳، ص ۱۰۹، مادة "ورع")

(قوله وذاک) أی ما فی المتن أحوط للخروج عن الخلاف ولموافقته للآثار(رد المحتار علی الدر المختار، ج ۱،ص ۲۱۵، کتاب الطهارة ،باب المياه،فصل فی البئر)

حیثیت سے اس کا نمازِ جمعہ پر بھی قیاس درست نہیں، کیونکہ وقت گزرنے کے بعد جمعہ کی بالاتفاق قضاء نہیں، اور اس کے بجائے نمازِ ظہر کا حکم ہے۔

خلاصہ یہ کہ بحالاتِ موجودہ حنفیہ کے نزدیک بھی گھروں میں باجماعت نمازِ عید درست ہے، اور جمہور کے علاوہ خود حنفیہ کے نزدیک بھی انفراداً نمازِ عید کے درست ہونے کی گنجائش ہے۔ اور ممانعت کی کوئی معقول وجہ سامنے نہ آ سکی، جس کی کچھ تفصیل پہلے گزر چکی ہے، کچھ مزید آگے خلاصۃُ الکلام میں آتی ہے۔

”بدایۃُ المجتہد“ کا حوالہ

علامہ ابنِ رشد مالکی نے ”بدایۃُ المجتہد“ میں عید کی نماز فوت ہونے کی صورت میں فقہائے کرام کے مختلف اقوال کا ذکر کر کے فرمایا کہ قضاء کے متعلق جمعہ کے ساتھ تشبیہ کا قول ضعیف ہے، کیونکہ جمعہ کے عوض میں ظہر کی چار رکعات کا ثبوت ہے، جبکہ عید کا معاملہ ایسا نہیں۔ [1]

---

[1] واختلفوا فيمن تفوته صلاة العيد مع الإمام فقال قوم :يصلى أربعا وبه قال أحمد والثورى وهو مروى عن ابن مسعود .وقال قوم :بل يقضيها على صفة صلاة الإمام ركعتين يكبر فيهما نحو تكبيره ويجهر كجهره وبه قال الشافعي وأبو ثور .
وقال قوم :بل ركعتين فقط لا يجهر فيهما ولا يكبر تكبير العيد .
وقال قوم :إن صلى الإمام فى المصلى صلى ركعتين وإن صلى المصلى صلى أربع ركعات .
وقال قوم :لا قضاء عليه أصلا وهو قول مالك وأصحابه،وحكى ابن المنذر عنه مثل قول الشافعي.
فمن قال أربعا الجمعة وهو تشبيه ضعيف ومن قال ركعتين كما صلاهما الإمام فمصيرا إلى أن الأصل هو أن القضاء يجب أن يكون على صفة الأداء ومن منع القضاء فلأنه رأى أنها صلاة من شرطها الجماعة والإمام كالجمعة فلم يجب قضاؤها ركعتين ولا أربعا إذ ليست هى بدلا من شىء وهذان القولان هما اللذان يتردد فيهما النظر :أعنى قول الشافعي وقول مالك .وأما سائر الأقاويل فى ذلك فضعيف لا معنى له لأن صلاة الجمعة بدل من الظهر وهذه ليست بدلا من شىء فكيف يجب أن تقاس إحداهما على الأخرى فى القضاء وعلى الحقيقة فليس من فاتته الجمعة فصلاته الظهر قضاء بل هى أداء لأنه إذا فاته البدل وجبت هى والله الموفق للصواب (بداية المجتهد ونهاية المقتصد، ج ١،ص ٢٣٠، ٢٣١، كتاب الصلاة الثانى،الباب الثامن فى صلاة العيدين)

نیز علامہ ابنِ رُشد نے عید کی نماز کے واجب اور سنت ہونے کے متعلق مختلف فقہائے کرام کے اقوال ذکر کیے ہیں، اور پھر فرمایا کہ اس اختلاف کا سبب نمازِ عید کو جمعہ پر قیاس کرنے، نہ کرنے پر مبنی ہے۔ [1]

"الفواكهُ الدواني" کا حوالہ

مالکیہ کی کتاب "الفواكه الدواني" میں ہے کہ جس کی نمازِ عید فوت ہوجائے، تو اس کو عید کی نماز پڑھنا مندوب ہے۔ [2]

"شرح مختصر خليل" کا حوالہ

مالکیہ کی کتاب "شرح مختصر خليل" میں امام کے ساتھ نمازِ عید فوت ہونے کے بعد،

---

[1] واختلفوا فيمن تجب عليه صلاة العيد -أعني :وجوب السنة -فقالت طائفة : يصليها الحاضر والمسافر، وبه قال الشافعي والحسن البصرى، وكذلك قال الشافعي :إنه يصليها أهل البوادى، ومن لا يجمع حتى المرأة فى بيتها .وقال أبو حنيفة وأصحابه :إنما تجب صلاة الجمعة والعيدين على أهل الأمصار والمدائن .وروى عن على أنه قال :لا جمعة ولا تشريق إلا فى مصر جامع .وروى عن الزهرى أنه قال :لا صلاة فطر ولا أضحى على مسافر.

والسبب فى هذا الاختلاف :اختلافهم فى قياسها على الجمعة، فمن قاسها على الجمعة كان مذهبه فيها على مذهبه فى الجمعة، ومن لم يقسها رأى أن الأصل هو أن كل مكلف مخاطب بها حتى يثبت استثناؤه من الخطاب.

قال القاضى :قد فرقت السنة بين الحكم للنساء فى العيدين والجمعة، وذلك أنه ثبت أنه -عليه الصلاة والسلام -أمر النساء بالخروج للعيدين، ولم يأمر بذلك فى الجمعة. وكذلك اختلفوا فى الموضع الذى يجب منه المجىء إليها كاختلافهم فى صلاة الجمعة من الثلاثة الأميال إلى مسيرة اليوم التام(بداية المجتهد ونهاية المقتصد، ج ا ،ص ٢٢٩، كتاب الصلاة الثانى،الباب الثامن فى صلاة العيدين)

[2] صلاة العيد كصلاة الجمعة فى اشتراط الجماعة حتى تقع سنة، وأما من فاتته فيندب له فقط (الفواكه الدوانى على رسالة ابن أبى زيد القيروانى،ج ا ،ص ٢٧٠،باب فى صلاة العيدين)

نمازِ عید کو باجماعت، یا بغیر جماعت کے پڑھے جانے میں اختلاف کا ذکر ہے۔[1]
اور دیگر شروحات میں قضاء کرنے کی صورت میں خطبہ کے ہونے، نہ ہونے کے قول کا بھی ذکر ہے۔ [2]

---

[1] (ص) وإقامة من لم يؤمر بها أو فاتته (ش) أى إنه يستحب لمن لم يؤمر بالجمعة وجوبا أو فاتته صلاة العيد مع الإمام أن يصليها وهل فى جماعة، أو أفذاذا قولان فمن أمر بالجمعة وجوبا أمر بالعيد سنة ومن لم يؤمر بها وجوبا أمر بالعيد استحبابا(شرح مختصر خليل للخرشى، ج۲، ص۱۰۴، فصل صلاة العيد)

[2] (وإقامة من لم يؤمر بها) قال مالك فى أهل القرى الذين لا جمعة عليهم :لا يصلون العيد.
قال ابن القاسم :ولا بأس أن يجتمعوا ويصلوا صلاة بغير خطبة، وإن خطب فحسن.
ابن رشد :في هذه المسألة فى المدونة اختلاف فى الرواية.
وقال ابن يونس :قال ابن حبيب :صلاة العيد تلزم كل مسلم وتجب على الرجال والنساء والعبيد والمسافرين ومن يؤمر بالصلاة من الصبيان يؤمر بها، وإن لم يشهدوها فى جماعة صلوها ركعتين حيث كانوا على سنتها فى التكبير والقراء ة وهو قول مالك وجماعة من أصحابه.
وقال أبو عمر :قال مالك فى المدونة :ليست على النساء إلا أنها تستحب لهن.
(أو فاتته) فى الموطأ قال مالك :من وجد الناس قد انصرفوا يوم العيد فلا أرى عليه صلاة، وإن صلى فى المصلى، أو فى بيته فلا بأس ويكبر سبعا وخمسا.
الباجى :وهل يصليها من تخلف عنها فى جماعة؟ قال فى المدونة :من لم يخرج إليها من النساء لا يجمع بهن أحد(التاج والإكليل لمختصر خليل، ج۲، ص۵۸۰، ۵۸۱، باب فى صلاة العيدين، فصل فى حكم صلاة العيد)
ص (وإقامة من لم يؤمر بها أو فاتته)
ش :قال فى المدونة :ولا تجب صلاة العيدين على النساء والعبيد ولا يؤمرون بالخروج إليها ومن حضرها منهم لم ينصرف إلا بانصراف الإمام وإذا لم يخرجن النساء ؛ فما عليهن بواجب أن يصلين، ويستحب لهن أن يصلين أفذاذا ولا تؤمهن منهن واحدة انتهى.
قال سند إذا لم يكن معهن رجل صلين أفذاذا فإن كان معهن رجل تخلف لعذر فهل يجمع بهن يختلف فيه بناء على أن من منعه العذر أن يجمع مع الإمام فى العيدين هل يجمع دونه؟ وسيأتى، ثم قال فى المدونة :ومن فاتته صلاة العيدين مع الإمام فيستحب له أن يصليها من غير إيجاب انتهى.
قال سند :إن جاء من فاتته والإمام يخطب فإنه يجلس ولا يصلى وسواء كان فى المصلى أو فى المسجد ثم قال فإن فاتت جماعة فأرادوا أن يصلوا بجماعتهم فهل يجوز؟ .
يختلف فيه قال ابن حبيب :من فاتته العيد لا بأس أن يجمعها مع نفر من أهله وقال سحنون :لا أرى أن يجمعوا وإن أحبوا صلوا أفذاذا ثم قال :والمذهب أنهم لا يخطبون ثم قال فى المدونة ويصليها أهل القرى كأهل الحضر فحمله سند على أن المراد به أهل القرى الصغار الذين لا تجب عليهم

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

بہرحال مالکیہ کے نزدیک گھروں وغیرہ میں عید کی نماز جائز ہے، جس کے طریقۂ کار کے افضل وغیر افضل اور راجح وغیر راجح ہونے میں اگرچہ مختلف صورتوں میں ان کا اختلاف ہے۔

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

الجمعة وأنه يستحب لهم أن يصلوها ثم قال :إذا قلنا لا تجب في غير موطن استيطان ويستحب لهم أن يقيموها فهل ذلك من غير خطبة قال عيسى عن ابن القاسم إن شاء من لا جمعة عليهم أن يصلوها بإمام فعلوا ولكن لا خطبة عليهم فإن خطبوا فحسن انتهى.

وما ذكره عن عيسى هو في أول رسم من سماعه قال ابن رشد في شرحه هو خلاف ما تقدم في رسم العيدين آخر سماع أشهب وقال في سماع أشهب المشار إليه :لم ير في هذه الرواية أن يصلى العيدين في جماعة وخطبة ومن لا تجب عليهم الجمعة وهو خلاف ما في أول رسم من سماع عيسى وفي المدونة في هذه المسألة اختلاف في الرواية انتهى.

فالحاصل أن المراد بقول المصنف :إقامة من لم يؤمر بها أو فاتته أنه يستحب له أن يصليها وهل في جماعة أو أفذاذا؟ .

قولان، والأصح أنه لا يجوز لهم جمعها، قال في الشامل :وإقامتها لمن فاتته ولمن لا تلزمه فذا وكذلك جماعة على الأصح فيهما انتهى.

ويظهر من كلام صاحب الطراز ترجيح جواز الجمع.

وعلى جواز الجمع لمن فاتته من أهل المصر لا يخطب بلا خلاف وكذلك من تخلف عنها لعذر وكذلك العبيد والمسافرون واختلف في أهل القرى الصغار على قولين والله أعلم.

(فرعان الأول)فلو أراد أن يجمعها من فاتته في المسجد أو في المصلى والظاهر أنهم يمنعون من ذلك ويدل لذلك قول ابن حبيب من فاته العيد فلا بأس أن يجمع مع نفر من أهله والله سبحانه وتعالى أعلم(مواهب الجليل في شرح مختصر خليل، ج۲،ص۱۹۷،۱۹۸، كتاب الصلاة،فصل صلاة العيدين)

من فاتته صلاة العيد مع الإمام، يندب له أن يقيم صلاة العيد، وهل يقيمها فذا أو جماعة؟ قولان، ومقتضى كلام الذخيرة أن الأول هو الراجح، وعلى إقامتها جماعة فلا يخطبون .قاله الشبراخيتي . وكذا قال بناني :إن الراجح صلاة من فاتته لها فذا لا جماعة .وهو ممن تسن في حقه .وفي الحطاب :قال في الشامل :وإقامتها لمن فاتته، ولمن لا تلزمه فذا، وكذا في جماعة على الأصح فيهما انتهى .ويظهر من كلام صاحب الطراز ترجيح جواز الجمع، وعلى جواز الجمع فمن فاتته من أهل المصر لا يخطب بلا خلاف، وكذا من تخلف عنه لعذر، وكذا العبيد، والمسافرون .واختلف في أهل القرى الصغار على قولين .والله أعلم .انتهى كلام الحطاب .وقال الحطاب فلو أراد أن يجمعها محن فاتته في المسجد أو في المصلى فالظاهر أنهم يمنعون من ذلك، ويدل لذلك قول ابن حبيب :من فاته العيد فلا بأس أن يجمعها مع نفر من أهله .والله سبحانه أعلم .انتهى .وقال سحنون .لا أرى أن يجمعوا؛ يعني من فاتته صلاة العيد وإن أحبوا صلوا أفذاذا، وفي الأجوبة الناصرية :أن أهل البادية يقيمون الصلاة ولا يخطبون (لوامع الدرر في هتك أستار المختصر ، شرح مختصر خليل للشيخ خليل بن إسحاق الجندي المالكي، ج۲،ص۲۴۷، باب صلاة العيد)

”المجموع شرح المهذب“ کا حوالہ

امام نووی شافعی نے ”المجموع شرحُ المهذب“ میں فرمایا کہ:

”جس کی نمازِ عید، امام کے ساتھ فوت ہوجائے، تو وہ تنہاء پڑھے گا، اور عید کے دن سورج کے زوال سے پہلے اس کی نمازِ عید اداء کہلائے گی، اور سورج کے زوال کے بعد فوت ہوجائے گی، اور اس کے بعد اس کی قضاء کے مستحب ہونے میں دو قول ہیں، زیادہ صحیح مستحب ہونے کا ہے۔ [1]

عید کی نماز جماعت کے ساتھ پڑھنا سنت ہے، اور اگر کوئی تنہاء پڑھے، تو شافعیہ کے مذہب میں اس کی نمازِ عید صحیح ہے۔ [2]

منفرد اور مسافر اور غلام اور عورت کے لئے مذہبِ شافعی میں صحیح قول یہ ہے کہ ان کو بھی گھر میں عید کی نماز پڑھنا مشروع ہے، کیونکہ یہ تطوع نماز میں داخل ہے، جس کو پڑھنا جائز ہے“۔ انتہٰی۔ [3]

---

[1] فإن فاتته صلاة العيد مع الإمام صلاها وحده وكانت أداء ما لم تزل الشمس يوم العيد وأما من لم يصل حتى زالت الشمس فقد فاتته وهل يستحب قضاؤها فيه القولان السابقان فی باب صلاة التطوع فی قضاء النوافل (أصحهما) يستحب وقال أبو حنيفة إذا فاتته مع الإمام لم يأت بها أصلا (المجموع شرح المهذب، ج۵، ص ۴، كتاب الصلاة ،باب صلاة العيدين)

[2] (فرع) تسن صلاة العيد جماعة وهذا مجمع عليه للأحاديث الصحيحة المشهورة فلو صلاها المنفرد فالمذهب صحتها (المجموع شرح المهذب، ج۵، ص ۱۹، كتاب الصلاة، باب صلاة العيدين)

[3] قال المصنف رحمه الله (روى المزنی رحمه الله انه يجوز صلاة العيد للمنفرد والمسافر والعبد والمرأة وقال فی الاملاء والقديم والصيد والذبائح لا يصلی العيد حيث لا تصلی الجمعة فمن اصحابنا من قال فيها قولان (احدهما) لا يصلون "لأن النبی صلی الله عليه وسلم كان بمنی مسافرا يوم النحر فلم يصل "ولانها صلاة شرع لها الخطبة واجتماع الكافة فلم يفعلها المسافر كالجمعة.

(والثانی) يصلون وهو الصحيح لانها صلاة نفل فجاز لهم فعلها كصلاة الكسوف ومن اصحابنا من قال يجوز لهم فعلها قولا واحدا وتأول ما قال فی الاملاء والقديم علی انه اراد لا يصلی بالاجتماع والخطبة حيث لا تصلی الجمعة لان فی ذلک افتياتا علی السلطان (المجموع شرح المهذب، ج۵، ص ۲۵، كتاب الصلاة، باب صلاة العيدين) ﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

”النجمُ الوھاج“ کا حوالہ

اورشافعیہ کی کتاب ”النجمُ الوھاج“ میں ہے کہ:

”عید کی نماز، جماعت کے ساتھ بالاجماع مشروع ہے، اور منفرد اور غلام اور عورت اور مسافر کے لئے بھی جائز ہے۔

تاہم زیادہ صحیح قول کے مطابق منفرد، خطبہ نہیں دے گا“۔انتھٰی۔ [1]

”الغررُالبھیة“ کا حوالہ

اورشافعیہ کی کتاب ”الغررُالبھیة“ میں ہے کہ:

”جو شخص تنہاء عید کی نماز پڑھے، وہ خطبہ نہیں دے گا، کیونکہ خطبہ سے مقصود، دوسرے کو وعظ ونصیحت کرنا ہے، جو کہ منفرد کے حق میں موجود نہیں“۔انتھٰی۔ [2]

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

أما الأحكام فهل تشرع صلاة العيد للعبد والمسافر والمرأة والمنفرد فى بيته أو فى غيره فيه طريقان (أصحهما وأشهرهما) القطع بأنها تشرع لهم ودليله ما ذكره المصنف وأجابوا عن ترك النبى صلى الله عليه وسلم صلاة العيد بمنى بانه تركها لا شتغاله بالمناسك وتعليم الناس أحكامها وكان ذلك أهم من العيد(المجموع شرح المهذب،ج۵،ص۲۶، كتاب الصلاة،باب صلاة العيدين)

[1] قال :(وتشرع جماعة) بالإجماع.

قال :(وللمنفرد والعبد والمرأة والمسافر) كسائر النوافل، إلا أن المرأة الجميلة وذات الهيئة يكره لها أن تحضرها، والعجوز يستحب لها الحضور لكن فى ثياب بيتها بلا طيب كما سيأتى، والخنثى فى هذا كالمرأة. ونقل عن القديم :أنها كالجمعة فى الشروط، حتى لا تصح للمنفرد ونحوه، إلا أنه يستثنى -على هذا القول -إقامتها فى خطة، الأبنية، وتقديم الخطبتين، والعدد.

وإذا قلنا :يصلى المنفرد ..لا يخطب على الأصح .وإذا اجتمع مسافرون ..صلى بهم واحد منهم وخطب، وكذلك من لا جمعة عليهم إذا اجتمعوا(النجم الوهاج فى شرح المنهاج،لأبى البقاء الشافعى،ج۲،ص۵۳۷،كتاب الصلاة، باب صلاة العيدين)

[2] (ومن يصلى وحده) صلاة العيد (لا يخطب) إذ الغرض من الخطبة تذكير الغير وهو منتف فى المنفرد(الغرر البهية فى شرح البهجة الوردية،لزكريا بن محمد بن أحمد بن زكريا الأنصارى الشافعى،ج۲،ص۵۶،باب صلاة العيد)

اس قسم کی عبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ شافعیہ کے نزدیک بھی گھروں وغیرہ میں تنہاء اور بغیر جماعت کے مرد وعورت دونوں کو نمازِ عید کا پڑھنا جائز ہے۔

’’المغنی لابنِ قدامۃ‘‘ کا حوالہ

حنابلہ کی کتاب ’’المغنی لابن قدامۃ‘‘ میں ہے کہ:

’’جس کی نمازِ عید فوت ہو جائے، تو وہ نفل نماز کی طرح چار رکعات پڑھے گا، اور اگر چاہے، تو دو رکعتوں کے درمیان سلام کا فاصلہ بھی کر لے گا۔

جس کی دلیل حضرت ابنِ مسعود اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کی روایات ہیں۔

اور ایک دلیل یہ بھی ہے کہ یہ نمازِ عید کی قضاء ہے، لہٰذا نمازِ جمعہ کی طرح چار رکعتیں ہوں گی۔

اور اگر چاہے، تو چار کے بجائے دو رکعتیں عام نوافل کی طرح پڑھ لے، امام اوزاعی کا یہی قول ہے۔

اور اگر چاہے، تو دو رکعتیں نمازِ عید کے طریقہ پر تکبیر کے ساتھ پڑھ لے۔

امام احمد سے اسماعیل بن سعید نے اس قول کو نقل کیا ہے، جس کو جوزجانی نے اختیار کیا ہے، ابراہیم نخعی، اور امام مالک اور امام شافعی اور ابوثور اور ابنِ منذر کا یہی قول ہے، جس کی دلیل حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے۔

اور ایک دلیل یہ بھی ہے کہ یہ نمازِ عید کی قضاء ہے، تو وہ دوسری نمازوں کی طرح نمازِ عید کی طرح ہی ہوگی، اور اس کو تنہاء اور جماعت کے ساتھ دونوں طرح پڑھنے کا اختیار ہے، خواہ وہ عیدگاہ میں پڑھے، یا جس جگہ چاہے پڑھے‘‘۔انتہٰی۔ [1]

---

[1] مسألة؛ قال :(ومن فاتته صلاة العيد صلى أربع ركعات، كصلاة التطوع، وإن أحب فصل بسلام بين كل ركعتين) . وجملته أن من فاتته صلاة العيد فلا قضاء عليه؛ لأنها فرض كفاية، قام بها من حصلت الكفاية به، فإن أحب قضاءها فهو مخير، إن شاء صلاها أربعا، إما بسلام واحد وإما بسلامين.

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

نیز مذکورہ کتاب میں ہی ہے کہ:

''اگر عید کے دن سورج کے زوال کے بعد عید کا علم ہوا، تو اگلے دن صبح کے وقت عید کی نماز پڑھی جائے گی۔

اور جس کی نمازِ عید فوت ہو جائے، اور زوال بھی ہو جائے، اور وہ عید کی نماز قضاء کرنا چاہے، تو وہ جب چاہے، اس کو قضاء کر سکتا ہے۔

لیکن ابنِ عقیل نے فرمایا کہ اگلے دن قضاء نہیں کر سکتا، لیکن صحیح قول پہلا ہی ہے، کیونکہ یہ تطوع اور نفل نماز ہے، جب بھی وہ اُس کو چاہے، پڑھ سکتا ہے۔

تاہم عید کی نماز واجب ہونے کے لئے استیطان شرط ہے، اور جمعہ کے لئے مشروط عدد بھی شرط ہے، اور اِذنِ امام کا ہونا صحیح تر قول کے مطابق شرط نہیں۔

لیکن عید کی نماز صحیح ہونے کے لئے ان میں سے کوئی چیز شرط نہیں۔

کیونکہ ایک شخص کی طرف سے بھی عید کی نماز کا پڑھنا جائز ہے۔

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

وروی هـذا عـن ابـن مسـعـود، وهو قول الثوری؛ وذلک لما روی عبد الله بن مسعود، أنه قال :من فـاته العيد فليصل أربعا، ومن فاته الجمعة فليصل أربعا .وروی عن علی -رضی الله عنه -أنه قال: إن أمرت رجلا أن يصلی بضعفة الناس، أمرته أن يصلی أربعا .رواهما سعيد .قال أحمد، -رحمه الله :-يقوی ذلک حديث علی، أنه أمر رجلا يصلی بضعفة الناس أربعا، ولا يخطب.

ولأنه قضاء صلاة عيد، فكان أربعا كصلاة الجمعة.

وإن شاء أن يصلی ركعتين كصلاة التطوع .وهذا قول الأوزاعی لأن ذلک تطوع.

وإن شـاء صـلاها علی صفة صلاة العيد بتكبير .نـقل ذلک عن أحمد إسماعيل بن سعيد، واختاره الجوزجانی.

وهـذا قـول الـنخعی، ومالک، والشافعی، وأبی ثور وابن المنذر؛ لما روی عن أنس، أنه كان إذا لم يشهـد الـعيـد مـع الإمـام بـالـبـصرة جمع أهله ومواليه، ثم قام عبد الله بن أبی عتبة مولاه فيصلی بهم ركعتين، يكبر فيهما.

ولأنـه قضاء صلاة، فكان علی صفتها، كسائر الصلوات، وهو مخير، إن شاء صلاها وحده، وإن شاء فی جماعة .قـيـل لأبی عبد الله :أيـن يصلی؟ قال :إن شـاء مـضـی إلی المصلی، وإن شاء حيث شاء (الـمـغـنـی لابـن قـدامة، ج٢،ص ٢٨٩، ٢٩٠، كـتـاب الـصلاة،باب صلاة العيدين،مسألة فاتته صلاة العيد)

البتہ جب امام کسی شہر میں ایک مرتبہ خطبہ دے دے، پھر لوگ عید کی نماز پڑھنا چاہیں، تو وہ خطبہ نہیں دیں گے، بلکہ بغیر خطبہ کے نمازِ عید پڑھیں گے، تا کہ اس کی وجہ سے امام کے ساتھ افتراق و تفریق لازم نہ آئے"۔انتہٰی۔ ل

ل فصل :إذا لم يعلم بيوم العيد إلا بعد زوال الشمس، خرج من الغد، فصلى بهم العيد .وهذا قول الأوزاعى، والثورى، وإسحاق، وابن المنذر .وصوبه الخطابى .وحكى عن أبى حنيفة أنها لا تقضى .وقال الشافعى :إن علم بعد غروب الشمس كقولنا، وإن علم بعد الزوال لم يصل، لأنها صلاة شرع لها الاجتماع والخطبة، فلا تقضى بعد فوات وقتها، كصلاة الجمعة.

وإنما يصليها إذا علم بعد غروب الشمس؛ لأن العيد هو الغد؛ لقول النبى -صلى الله عليه وسلم -: فطركم يوم تفطرون، وأضحاكم يوم تضحون، وعرفتكم يوم تعرفون .ولنا، ما روى أبو عمير بن أنس، عن عمومة له من أصحاب رسول الله -صلى الله عليه وسلم -أن ركبا جاء وا

إلى النبى -صلى الله عليه وسلم -فشهدوا أنهم رأوا الهلال بالأمس، فأمرهم أن يفطروا .فإذا أصبحوا أن يغدوا إلى مصلاهم .رواه أبو داود.

قال الخطابى :سنة رسول الله -صلى الله عليه وسلم -أولى، وحديث أبى عمير صحيح، فالمصير إليه واجب .ولأنها صلاة مؤقتة، فلا تسقط بفوات الوقت، كسائر الفرائض، وقياسهم على الجمعة لا يصح؛ لأنها معدول بها عن الظهر بشرائط منها الوقت، فإذا فات واحد منها رجع إلى الأصل.

(فصل فاتته صلاة العيد حتى زالت الشمس وأحب قضاء ها)

فصل :فأما الواحد إذا فاتته حتى تزول الشمس، وأحب قضاء ها، قضاها متى أحب .وقال ابن عقيل :لا يقضيها إلا من الغد، قياسا على المسألة التى قبلها .وهذا لا يصح؛ لأن ما يفعله تطوع، فمتى أحب أتى به، وفارق ما إذا لم يعلم الإمام والناس، لأن الناس تفرقوا يومئذ على أن العيد فى الغد، فلا يجتمعون إلا من الغد، ولا كذلك هاهنا، فإنه لا يحتاج إلى اجتماع الجماعة.

ولأن صلاة الإمام هى الصلاة الواجبة، التى يعتبر لها شروط العيد ومكانه وصفة صلاته، فاعتبر لها الوقت، وهذا بخلافه.

(فصل شرط صلاة العيدين الاستيطان) فصل :ويشترط الاستيطان لوجوبها؛ لأن النبى -صلى الله عليه وسلم -لم يصلها فى سفره .ولا خلفاؤه وكذلك العدد المشترط للجمعة؛ لأنها صلاة عيد، فأشبهت الجمعة .وفى إذن الإمام روايتان :أصحهما، ليس بشرط.

ولا يشترط شىء من ذلك لصحتها، لأنها تصح من الواحد فى القضاء ، وقال أبو الخطاب فى ذلك كله روايتان .وقال القاضى :كلام أحمد يقتضى روايتين :إحداهما، لا يقام العيد إلا حيث تقام الجمعة وهذا مذهب أبى حنيفة إلا أنه لا يرى ذلك إلا فى مصر، لقوله :لا جمعة ولا تشريق إلا فى مصر جامع .والثانية، يصليها المنفرد والمسافر، والعبد والنساء ، على كل حال.

وهذا قول الحسن والشافعى، لأنه ليس من شرطها الاستيطان فلم يكن من شرطها الجماعة، كالنوافل.

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

تفریق کا مفسدہ چونکہ خطبہ کی سنت کو ترک کرنے سے زیادہ نقصان دہ ہے، اس لیے اس علت کی وجہ سے ترکِ خطبہ کو راجح قرار دیا گیا۔

''الشرحُ الکبیر'' کا حوالہ

حنابلہ کی کتاب ''الشرحُ الکبیر'' میں بھی نمازِ عید فوت ہونے کی صورت میں اُس کی قضاء کے مستحب ہونے کا ذکر ہے، اور قضاء پڑھنے کی صورت میں ایک قول چار رکعات پڑھنے کا، اور دوسرا قول دو، اور چار رکعتوں کے درمیان اختیار ہونے کا مذکور ہے۔ [1]

مذکورہ عبارات سے معلوم ہوا کہ حنابلہ کے یہاں بھی نمازِ عید کے گھروں وغیرہ میں بِلا جماعت اور باجماعت پڑھنے، بلکہ وقت گزرنے کے بعد قضاء کی صورت میں بھی اداء کرنے کے جواز میں کافی توسع موجود ہے۔

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

إلا أن الإمام إذا خطب مرة، ثم أرادوا أن يصلوا، لم يخطبوا وصلوا بغير خطبة، كي لا يؤدى إلى تفريق الكلمة، والتفصيل الذى ذكرناه أولى ما قيل به، إن شاء الله تعالى(المغنى لابن قدامة، ج۲،ص ۲۹۰و ۲۹۱، كتاب الصلاة،باب صلاة العيدين)

[1] (مسألة) * (وإن فاتته الصلاة استحب أن يقضيها على صفتها وعنه يقضيها أربعاً وعنه أنه مخير بين ركعتين وأربع) وجملة ذلک أنه لا يجب قضاء صلاة العيد على من فاتته لأنها فرض كفاية وقد قام بها من حصلت به الكفاية وان أحب قضاء ها استحب له أن يقضيها على صفتها نقل ذلک عن أحمد اسماعيل بن سعيد واختاره الجوزجانى وهو قول النخعى ومالک والشافعى وأبى ثور لما روى عن أنس أنه كان إذا لم يشهد العيد مع الامام بالبصرة جمع أهله ومواليه ثم قام عبد الله بن أبى عتبة مولاه فيصلى بهم ركعتين يكبر فيهما ولأنها قضاء صلاة فكانت على صفتها كسائر الصلوات وهو مخير إن شاء صلاها فى جماعة كما ذكرنا عن أنس.

وان شاء صلاها وحده وعنه أنه يقضيها أربعا اما بسلام واحد أو بسلامين وهو قول الثورى لما روى عن عبد الله بن مسعود أنه قال من فاته العيد فليصل أربعا.

وروى عن على أنه قال إن أمرت رجلاً أن يصلى بضعفة الناس أمرته أن يصلى أربعاً رواهما سعيد ولأنه قضاء صلاة عيد فكانت أربعا كقضاء الجمعة، وعنه أنه مخير بين ركعتين وأربع وهذا قول الأوزاعى لأنها صلاة تطوع أشبهت صلاة الضحى (الشرح الكبير على متن المقنع،ج۲،ص۲۵۰، كتاب الصلاة، باب صلاة العيدين)

پس نمازِ عید کے گھروں میں اور باجماعت اور بلاجماعت مشروع ہونے پر جمہور فقہائے کرام ومحدثینِ عظام کا اتفاق ہے، اور دلائل کی رو سے یہ قول نہایت مضبوط ہے، اور حنفیہ کے نمازِ عید کے سنت ہونے کے قول پر اس کا انطباق زیادہ مؤثر طریقہ پر ہوتا ہے۔

اور نمازِ عید کے وجوب کے قول کی رو سے بھی عدمِ جواز، بمعنیٰ اثباتِ معصیت وکراہت کا ثبوت نہیں ہوتا، جیسا کہ گزرا، اور آگے آتا ہے۔

اور یہ پہلے گذر چکا کہ حنفیہ کے نزدیک بھی گھروں میں باجماعت نمازِ عید درست، بلکہ دیگر شرائط پائی جانے پر واجب ہے، اور حنفیہ کے نزدیک انفراداً نمازِ عید کے درست ہونے کی بھی گنجائش ہے، اور ہمیں انتہائی غور وخوض کے بعد ممانعت کی کوئی معقول اور مؤثر وجہ سامنے نہ آسکی۔

واللّٰہ تعالیٰ أعلم.

(فصل نمبر 3)

بحالتِ موجودہ نمازِ عید سے متعلق چند فتاویٰ وآراء

اب موجودہ حالات میں نمازِ عید سے متعلق عرب وعجم کے چند اصحابِ افتاء واصحابِ علم حضرات کی آراء بھی ملاحظہ کرلی جائیں، تاکہ معلوم ہوسکے کہ نمازِ عید سے متعلق موجودہ حالات میں دنیا بھر کے بڑے بڑے اصحابِ علم، اور اصحابِ افتاء اور دینی مقتداء حضرات نے کس قدر توسُّع کے ساتھ اس مسئلہ میں عوام کی رہنمائی کی، اور اُن کو تشویش سے بھی محفوظ رکھنے کا اہتمام کیا، اور اسی کے ساتھ عید کے شِعار کو بھی حسبِ قُدرت باقی رکھنے کی کوشش کی۔

’’اللجنةُ الدائمة ‘‘سعودی عرب کا فتویٰ

سعودی عرب کے، کِبار علماء کی کمیٹی ’’اللجنةُ الدائمة ‘‘ نے اس سلسلہ میں یہ فتویٰ جاری کیا کہ:

’’گھر میں عید کی نماز پڑھنے کے بارے میں فقہاء کے مابین اختلاف ہے، جمہور کے نزدیک یہ مشروع ہے، برخلاف حنفیہ کے۔

اور جس کی نمازِ عید قضاء ہوجائے، تو اس کا، اس کو اسی طریقہ پر پڑھنا مستحب ہے، جس طریقہ سے عید کی نماز پڑھی جاتی ہے، البتہ اس کے بعد خطبہ نہیں دیا جائے گا۔

امام مالک، امام شافعی، امام احمد اور امام نخعی وغیرہ جیسے اصحابِ علم کا یہی قول ہے، جس کی بعض احادیث وروایات سے بھی تائید ہوتی ہے‘‘۔انتھٰی۔ [1]

---

[1] السؤال: هل يجوز أن أصلى صلاة العيد فى البيت لأننى لا أستطيع الذهاب للمسجد بسبب وضعى الصحى ؟

نص الجواب: الحمد لله. صلاة العيدين فرض عين على كل رجل قادر ، فى أصح أقوال أهل العلم ،

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

''دائرۃُ الافتاء'' اُردن کا فتویٰ

اُردن کے ''دائرۃُ الافتاء'' نے بھی موجودہ حالات میں یہ اعلان کیا کہ عید کی نماز اپنے ایک گھر

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾ كما هو مبين في جواب السؤال رقم (48983).
وإذا لم تستطع الذهاب إليها بسبب وضعك الصحي ، فلا شيء عليك ، وهل يشرع لك فعلها في البيت ؟ فيه خلاف بين الفقهاء ، والجمهور على أنه يشرع ذلك خلافا للحنفية .
نقل المزني عن الشافعي رحمه الله في "مختصر الأم "(8/125) " : ويصلي العيدين المنفرد في بيته والمسافر والعبد والمرأة "انتهى .
وقال الخرشي (مالكي) " : يستحب لمن فاتته صلاة العيد مع الإمام أن يصليها ، وهل في جماعة , أو أفذاذا ؟ قولان "انتهى باختصار من "شرح الخرشي.(2/104) "
وقال المرداوي في "الإنصاف "(حنبلي)" : وإن فاتته الصلاة (يعني :صلاة العيد) استحب له أن يقضيها على صفتها (أي كما يصليها الإمام) "انتهى .
وقال ابن قدامة في "المغني "(حنبلي)" : وهو مخير ، إن شاء صلاها وحده ، وإن شاء صلاها جماعة "انتهى .
وفي الدر المختار مع حاشية ابن عابدين (2/175) (حنفي) " : ولا يصليها وحده إن فاتت مع الإمام "انتهى .
وقد اختار شيخ الإسلام ابن تيمية قول الحنفية ، ورجحه الشيخ ابن عثيمين رحمه الله ، كما في "الشرح الممتع "(5/156).
وجاء في فتاوى اللجنة الدائمة للإفتاء (8/306)" : صلاة العيدين فرض كفاية؛ إذا قام بها من يكفي سقط الإثم عن الباقين .
ومن فاتته وأحب قضاء ها استحب له ذلك، فيصليها على صفتها من دون خطبة بعدها، وبهذا قال الإمام مالك والشافعي وأحمد والنخعي وغيرهم من أهل العلم .والأصل في ذلك قوله صلى الله عليه وسلم :(إذا أتيتم الصلاة فامشوا وعليكم السكينة والوقار فما أدركتم فصلوا وما فاتكم فاقضوا) ، وما روي عن أنس رضي الله عنه أنه كان إذا فاتته صلاة العيد مع الإمام جمع أهله ومواليه، ثم قام عبد الله بن أبي عتبة مولاه فيصلي بهم ركعتين، يكبر فيهما .ولمن حضر يوم العيد والإمام يخطب أن يستمع الخطبة ثم يقضي الصلاة بعد ذلك حتى يجمع بين المصلحتين .وبالله التوفيق وصلى الله على نبينا محمد وآله وصحبه وسلم "انتهى .
اللجنة الدائمة للبحوث العلمية والإفتاء
الشيخ عبد العزيز بن عبد الله بن باز ، الشيخ عبد الرزاق عفيفي ، الشيخ عبد الله بن غديان.
والله أعلم (موقع :الاسلام سؤال وجواب:المشرف العام الشيخ محمد صالح المنجد، رقم السؤال:٩٦٩٢٢، تاريخ النشر: 2008-05-19)
https://islamqa.info/ar/answers/96922/

کے فرد کے ساتھ بھی باجماعت، اور تنہاء پڑھنا مستحب ہے، لیکن اس کے لئے خطبہ ضروری نہیں، اور عید کی نماز تنہاء پڑھنے والے کے لئے خطبہ سنت نہیں۔ [1]

''دیوانُ الافتاء'' جمہوریہ تونس کا فیصلہ

جمہوریہ تونس کے دیوانِ افتاء نے بھی موجودہ وباء کے باعث گھروں میں نمازِ عید کے جائز ہونے کا فتویٰ جاری کیا۔ [2]

---

[1] أعلنت الإفتاء الأردنية، اليوم الاثنين 18مايو، عن إجازة أداء صلاة عيد الفطر 2020في البيت؛ بسبب الأزمة الصحية الحالية التى سببتها أزمة فيروس كوفيد 19؛ لضمان سلامة المواطنين.

وقالت دائرة الإفتاء العام فى تصريح صحفى مُطول إن صلاة العيد سنة مؤكدة لمواظبة النبى صلى الله عليه وسلم عليها، موضحة أنه يستحب أن تصلى جماعة مع أهل البيت الواحد، أو أن تصلى فرادى.

وأضافت دائرة الإفتاء أنه لا يشترط لصحة الصلاة الخطبة، فلا يؤثر تركُ الخطبتين على صحتها؛ لأن الخطبة فى العيد سنة وليست شرطا لصحة الصلاة، وفى هذه الحالة لا يُسنّ للمنفرد خطبة بعدها(موقع: سوا الإخبارية ،وقت صلاة عيد الفطر 2020وكيفية أدائها فى البيت، 18-05-2020 https://palsawa.com/post/260318)

[2] أجاز ديوان الإفتاء فى تونس، الثلاثاء ، صلاة عيد الفطر بالمنازل، للحد من تفشى فيروس كورونا المستجد.

وقال الديوان (حكومى)، فى فتوى اطلعت عليها الأناضول، إن "صلاة العيد سُنّة مؤكدة ووقتها من ضحى يوم العيد الى الزوال."

وأضاف أنه إذا تعذر إقامة صلاة عيد الفطر جماعةً لسبب من الأسباب، ومنها المرض أو تفشى الأوبئة مثل كورونا الذى ينتقل بسرعة ويتطلب الاحتراز، فإنه يجوز أداؤها فى المنزل.

وأردف" :ثبت بالطرق الصحيحة أن النبى صلى الله عليه وسلم أمرنا أن نبتعد عن كل أرض موبوءة حفاظا على أرواحنا وأرواح غيرنا."

وتابع" :وعليه، يجوز شرعا لولى الأمر (الدولة) الأمر بتعليق صلاة الجماعة فى المساجد والجوامع، وهو ما قررته كل الدول الإسلامية."

من جهته، قال مفتى الجمهورية، عثمان بطيخ، إنه "يجوز أداء صلاة العيد فى البيت توقيا من كورونا، لأن الحجر الصحى ما زال ساريا، ومن الصعب احترام تدابير الوقاية بالمساجد."

وأكد بطيخ، فى تصريحات إعلامية، أن "صلاة عيد الفطر هى صلاة نافلة وبالإمكان أداؤها فى البيت كما فى المسجد."

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

أحمد المنزلاوی سعودی عرب کا حوالہ

عرب کے مشہور عالمِ دین دکتور ''أحمد المنزلاوی'' نے موجودہ حالات میں عذر کے باعث گھروں میں نمازِ عید کے جائز ہونے پر ایک مضمون تحریر کیا، جس میں جمہور کے نزدیک نمازِ عید کے گھروں میں باجماعت اور بغیر جماعت جائز ہونے کے دلائل بھی تحریر کیے، جس میں یہ بھی لکھا کہ جب مرض، سفر اور خوف وغیرہ کے اعذار میں فرض نمازوں میں تخلُّف کو مباح وجائز قرار دیا گیا ہے، اور جس کی نمازِ عید فوت ہوجائے، اس کو بھی اپنے طور پر پڑھنے کی اجازت دی گئی ہے، تو کسی وبائی عذر کی وجہ سے بڑے اجتماع کے ساتھ نمازِ عید کو قائم نہ کیا جاسکے، تو اس صورت میں بدرجہ اولیٰ اپنے گھر والوں کے ساتھ باجماعت، یا بلا جماعت، نمازِ عید کا پڑھنا جائز ہوگا۔ [1]

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

ومنذ نحو شهرين، تتخذ أغلب الدول الإسلامية قرارا بتعليق إقامة صلاة الجمع والجماعات، وإغلاق جميع المساجد والاكتفاء برفع الأذان، ضمن إجراء ات احترازية للحد من انتشار الفيروس.

ومن المقرر أن تستطلع معظم الدول العربية والإسلامية، نهاية الأسبوع، هلال شهر شوال الموافق لأول أيام عيد الفطر، وسط ترجيحات فلكية تذهب إلى حلوله الأحد(موقع: AA،فتوى رسمية بإقامة صلاة العيد بالمنازل،تحسبا من انتشار وباء كورونا، وفق ديوان الإفتاء الحكومي2020-05-18)

[1] الصلاة فى البيت بسبب الوباء :

علمنا جواز صلاة العيد لمن فاتته جماعة المسلمين، لكن الجماعة منعقدة ..فكيف إذا لم تنعقد جماعة للمسلمين من الأساس بسبب الوباء وما تعانيه الآن الأمة من فيروس كورونا وحذر التجمعات؟

معلوم أن من الأعذار المبيحة للتخلف عن الجماعة المرض والسفر والخوف، ومن الأخير يدخل الخوف من الوباء ، قال صلى الله عليه وسلم :من سمع المنادى فلم يمنعه من اتباعه عذر فلا صلاة له قالوا :وما العذر؟ قال :خوف، أو مرض(رواه الحاكم والترمذى وصححه الألبانى).

ويستدل كذلك بما رواه أبو مليح عن أبيه، أنه شهد النبى صلى الله عليه وسلم زمن الحديبية فى يوم جمعة وأصابهم مطر لم تبتل أسفل نعالهم، فأمرهم أن يصلوا فى رحالهم (رواه أحمد وأبو داود وابن ماجه، وصححه الألبانى).

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

هيئةُ كبار العلماء بالأزهر كا حواله

جامعہ اَزہر کی هيئةُ كبار العلماء نے بھی گھروں میں، حسبِ ضرورت گھر والوں کے ساتھ

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

فإذا كان القضاء مستحبًا فى حق من فاتته الصلاة مع الإمام الذى أدى صلاة العيد بالمسلمين، فمن باب أولى أن تكون إقامتها مشروعة فى حق من لم تُقم صلاة العيد فى بلدهم بسبب عذر الوباء وعدم التجمعات؛ لأن فى ذلك إقامة لتلك الشعيرة حسب الاستطاعة)، والله تعالى يقول: (فاتقوا الله ما استطعتم)وقال النبى صلى الله عليه وسلم :(إذا أمرتكم بأمر فأتوا منه ما استطعتم)

كيفية صلاة العيد فى البيت:

بمقتضى الآثار السابقة قال جمهور أهل العلم أن من فاتته صلاة العيد (ومثله من كان معذورًا) صلى ركعتين كما صلى الإمام مع له أن يكبر فيها التكبيرات الزوائد أو من دونها، وله أن يصليها فردًا أو يجمع بيها أهله، وذلك دون خطبة؛ لأن الخطبة مشروعة مع الجماعة.

ومن العلماء من قال :يصليها أربعاً واحتج بأثر وارد عن عبد الله بن مسعود رضى الله عنه أنه قال : من فاته العيد فليصل أربعاً، ولكنه منقطع كما قال العلامة الألبانى فى إرواء الغليل .121 /3ومن العلماء من خيره بين صلاة ركعتين أو أربع ركعات.

وأولى الأقوال هو القول الأول وهو أنه يقضيها ركعتين كأصلها، ولا يصح قياسها على الجمعة فمن فاتته الجمعة صلى أربعاً أى الظهر لأن الجمعة إنما تفوت إلى بدل وهو الظهر.

قال ابن قدامة المقدسى :وإن شاء صلاها على صفة صلاة العيد بتكبير، نقل ذلك عن أحمد إسماعيل بن سعد واختاره الجوزجانى وهذا قول النخعى ومالك والشافعى وأبى ثور وابن المنذر لما روى عن أنس :أنه كان إذا لم يشهد العيد مع الإمام بالبصرة جمع أهله ومواليه ثم قام عبد الله بن أبى عتبة مولاه فصلى بهم ركعتين يكبر فيهما ولأنه قضاء صلاة فكان على صفتها كسائر الصلوات وهو مخير إن شاء صلاها وحده وإن شاء فى جماعة .قيل لأبى عبد الله :أين يصلى؟ قال: إن شاء مضى إلى المصلى وإن شاء حيث شاء .(المغنى 290 /2).

ونقل القرافى أن مذهب الإمام مالك كما فى المدونة أنه يستحب لمن فاتته صلاة العيد مع الإمام أن يصليها على هيئتها .(الذخيرة 423 /2).

وقال الإمام الشافعى :ونحن نقول :إذا صلاها أحد صلاها كما يفعل الإمام يكبر فى الأولى سبعاً وفى الآخرة خمساً قبل القراء ة.(معرفة السنن والآثار 103 /5) .

وذكر المرداوى الحنبلى أن المذهب عند الحنابلة هو أنها تقضى على صفتها .(الإنصاف 2/ 433).

ومن عظيم فقه البخارى رحمه الله، أنه استدلّ على أن صلاة العيد تُصلّى ركعتين فى كل حال وفى كل صورة ومسألة، فقال :باب :إذا فاته العيد يصلى ركعتين، وكذلك النساء، ومن كان فى

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

باجماعت اور بغیر جماعت، عید کی نماز جائز ہونے اجتماعی حکم صادر کیا۔ [1]

دارُ الإفتاء المصرية کا حوالہ

دارُ الإفتاء المصرية سے بھی اس سلسلہ میں فتویٰ جاری کیا گیا، اور گھر میں، گھر والوں کے ساتھ باجماعت، یا تنہاء نمازِ عید پڑھنے کو جائز قرار دیا گیا، اور عذر کی وجہ سے گھر میں نمازِ عید اداء کرنے کی صورت میں اجروثواب سے محروم نہ ہونے سے آگاہ کیا گیا۔

اور یہ بھی تحریر کیا گیا کہ جو لوگ بحالاتِ موجودہ مساجد میں اجتماعات کے حکومتی فیصلے کی مخالفت کررہے ہیں، اور حکومت کی طرف مختلف قسم کے الزامات عائد کررہے ہیں، ان کا

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

البیوت والقری؛ لقول النبی صلی الله علیه وسلم :هذا عیدنا أهل الإسلام...أ.هـ

فقوله صلی الله علیه وسلم هذا یشمل الیومَ وما فیه من صلاةٍ ونسُکٍ، فهذا هو صفته فی شریعتنا لا یزاد فیها ولا ینقص.

فدلّ علی أن هذه صلاة لا بدَل لها، ولا تصح بغیر الصفة المشروعة شرعاً وهی رکعتین أبداً.

هـذا الاستنباط مـن البـخاری یدل دلالة واضحة أن العید غیر الجمعة، فالعید یصلی فی البیت لمن فاته، خلاف الجمعة إذا فاتته صلاها ظهرًا.

ویـنـصـح فی ظل هذا الوباء ، اجتماع کل أسرة وتزیین مکان فی البیت وتجهیزه للصلاة فیه للعید، والتکبیـر فـی الـوقـت الـمشروع ولو حتی من الشرفات لتظهر شعیرة المسلمین بقدر المستطاع، وإدخال البهجة والسرور علی قلوب المؤمنین والأطفال والنساء (هل یجوز صلاة العید فی البیت ؟ لأحمد المنزلاوی،11-05-2020،https://www.rqiim.com/islam/)

[1] أصـدرت هیـئة کبـار العلماء بالأزهر برئاسة الإمام الأکبر أحمد الطیب شیخ الأزهر، الأحد، بیـانـا لـلـمسـلمین حول العالم بشأن الأحکام المتعلقة بصلاة العید، فی ظل استمرار تفشی فیروس کورونا المستجد.

وقـالـت الهیـئة فی بیانها، إنه یجوز أداء صلاة عید الفطر المبارک فی البیوت، بالکیفیة التی تُصلی بها فی المساجد والساحات، وذلک لقیام العذر المانع من إقامتها فی المسجد أو الخلاء .

وتابعت " :ویـجـوز أیـضا أن یصلیها الرجل جماعة بأهل بیته، کما یجوز أن یؤدیها المسلم منفردا، وذلک انـطـلاقـا مـن أن أعـظـم مـقـاصـد شـریـعة الإسلام حفظ النفوس وحمایتها ووقایتها من کل الأخـطار والأضرار(موقع: sky news،صـلاة العید فی البیت " ..الـقول الفصل "من هیئة کبار العلماء، 17-05-2020)

(https://www.skynewsarabia.com/varieties/1345083)

طرزِ عمل درست نہیں۔ ؎

؎ قالت دار الإفتاء المصرية إن صلاة العيد سُنة مُؤكّدة، ويستحب أن تكون فى جماعة مع الإمام سواء فى المسجد أو الخلاء ، فإذا وُجد مانع من اجتماع الناس كما هو الحال الآن من انتشار الوباء القاتل الذى يتعذّر معه إقامة الجماعات؛ فإنه يجوز أن يُصلى المسلم العيد فى البيت منفردًا أو مع أهل بيته، ويمكن إقامة تكبيرات العيد بصورة عادية كما لو كانت صلاة العيد فى المساجد.
وأوضحت الدار فى أحدث فتاواها طريقة صلاة العيد فى البيت بأنها تكون بنفس صفة صلاة العيد المعتادة، فيُصلى المسلم ركعتين بسبع تكبيرات بعد تكبيرة الإحرام فى الأولى قبل القراء ة، وخمس تكبيرات فى الثانية بعد تكبيرة القيام قبل القراء ة، ثم يجلس للتشهد ويُسلم، ولا خطبة بعد أداء الصلاة.
ويبدأ وقت صلاة العيد من وقت ارتفاع الشمس، أى بعد شروقها بنحو ثلث الساعة، ويمتد إلى زوال الشمس، أى قبيل وقت الظهر.
وأضافت الدار أنه على المسلم ألا يحزن ويخاف من ضياع الأجر فيما اعتاد فعله من العبادات لكن منعه العذر؛ وذلك لأنّ الأجر والثواب حاصل وثابت حال العُذر، بل إنّ التعبُّد فى البيت فى هذا الوقت الذى نعانى فيه من تفشى الوباء يوازى فى الأجر التعبُّد فى المسجد.
وقالت دار الإفتاء " :على المسلم أن يَعْلَم أنّ الأجر والثواب حاصلٌ وثابتٌ لما اعتاد فعله من العبادات لكنه عَدَل عنه لوجود العذر؛ فقد روى البخارى عن أنس بن مالك رضى الله عنه أن رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم رجع من غزوة تبوك فدنا من المدينة، فقال :إِنّ بِالْمَدِينَةِ أقواما ما سرتم مسيرا ولا قطعتم واديا إلا كانوا معكم، قالوا :يا رسول الله، وهم بالمدينة !قال: وهم بالمدينة؛ حبسهم العذر .
فأخبر النبى عليه الصلاة والسلام أَنّ للمعذور مِن الأجر مثل ما للقوى العامل؛ لأنهم لما نووا الجهاد وأرادوه وحبسهم العذر كانوا فى الأجر كمن قطع الأودية والشعاب مجاهدًا بنفسه."
وعن أبى موسى الأشعرى رضى الله عنه، أن النبى صلى الله عليه وآله وسلم قال :إذا كان العبد يعمل عملا صالحا، فشغله عنه مرض أو سفر، كتب له كصالحِ ما كان يعمل وهو صحيح مقيم .
أخرجه أبو داود فى السنن، وابن حبان فى الصحيح، والحاكم فى المستدرك، وصَحّحه .وفى رواية :إذا مرض العبد، أو سافر، كتب له مثل ما كان يعمل مقيما صحيحا أخرجه الإمام البخارى فى الصحيح عن أبى موسى أيضًا .ولفتت إلى أن الأجر والثواب لا يقتصر على حصول العبادة بالفعل، بل بنيتها أيضًا، ففى حديث سهل بن سعد الساعدى قال :قال رسول الله صلى الله عليه وسلم :نية المؤمن خير من عمله رواه الطبرانى فى معجمه الكبير.
وأشارت الدار إلى أن الله تعالى شرع صلاة العيدين الفطر والأضحى إظهارًا للسُّرور بما تمّ قبلهُما من عبادتى الصوم والحج، وجمعًا للمسلمين فى هذين اليومين على الفرح بهاتين العبادتين؛ فعن أنس رضى الله عنه قال :قدم رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم المدينة ولهم يومان يلعبون فيهما، فقال :ما هذان اليومان؟، قالوا :كنا نلعب فيهما فى الجاهلية، فقال رسول الله :إنّ الله قد

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

وکیلُ الأزہر الشریف کا حوالہ

سابق وکیلُ الأزہر الشریف، دکتور عباس شومان نے بھی اس سلسلہ میں گھروں کے اندر نمازِ عید کے جائز ہونے کا حکم جاری کیا۔ [1]

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

أبدلكم بهما خيرًا منهما :يوم الأضحى، ويوم الفطر.

ونبهت دار الإفتاء فى فتواها على أنّه فى ظل الظروف الاستثنائية التي يمر بها العالم -ومنه مصرنا الحبيبة -من انتشار فيروس كورونا؛ يجب على المسلمين الالتزامُ بتعليمات الجهات المسئولة التى ارتأت إيقاف صلاة العيد فى كل المساجد والساحات، والاكتفاء ببث صلاة العيد من أحد المساجد الكبرى مع وضع كافة الإجراء ات الاحترازية التى تضمن سلامة حياة الناس والحفاظ على أرواحهم؛ وذلك لما تَقَرّر فى القواعد مِن أَنّ درء المفاسد مُقدّم على جلب المصالح.

وأضافت الدار أن مَنْ قال بجواز مخالفة تعليمات الدولة الرسمية القاضية بمنع صلاة العيد فى المساجد والساحات فى هذه الآونة؛ فقد قال قَوْلًا بغير علمٍ، وتسبّب فى إيقاع الناس فى المهالك، ولا يستشفع لهذا القول حُسن القصد؛ فهو غير كافٍ فى مثل هذه الأمور؛ بل يُعدُّ قتلًا إذا مات الناس بسبب قوله.

وأشارت إلى أنّ اتهام ولاة الأمور، والخوض فى دينهم وأعراضهم، والتطاول عليهم بنسبة فِعْلهم من منع صلاة العيد فى المساجد والساحات إلى المنكر؛ هو اتهام كاذبٌ ودعوى باطلة تُوقِع صاحبها فى الإثم، وفيه افتياتٌ صارخٌ على ما خُوِّل إلى ولاة الأمور مما فيه مصلحة الناس الدينية والدنيوية؛ فالمحافظة على النفوس -والتى هى من أهم المقاصد الكلية التى حَثّت عليها الشرائع السماوية -اقتضت المنع من صلاة العيد فى المساجد والساحات.

وأكدت الدار فى ختام فتواها أن العبادة فى البيت فى هذا الوقت توازى فى الأجر العبادة فى المسجد، بل قد تزيد أجرًا على العبادة فى المسجد؛ وذلك لأنّ هذا هو واجب الوقت الآن، لا سيما مع تَفَشِّي الوباء القاتل الذى ذهب ضحيتَه آلافُ البشر، وانتشر فى عشرات البلدان، كما أنّ فيه معنى الصبر على هذا البلاء، والثبات والالتزام بالتعليمات من قِبل الجهات المختصة، وهذا سببٌ لتكفير سيئات المؤمن ورفع درجاته(موقع:بوابة الأهرام، ركعتين فى البيت بلا خطبة ..دار الإفتاء توضح كيفية صلاة العيد فى البيت بسبب كورونا،20-05-2020)

(https://gate.ahram.org.eg/News/2408933.aspx)

[1] أوضح الدكتور عباس شومان، وكيل الأزهر الشريف السابق، كيفية صلاة العيد فى البيت، مشيرا إلى أن صلاة العيدين عند جمهور الفقهاء سنة مؤكدة.

وأوضح شومان، أن السنة المؤكدة يثاب فاعلها ولايعاقب تاركها، ولكنه يلام ويعاتب من رسول الله-صلى الله عليه وسلم فى الآخرة، فإذا صليت فى مسجد أو ساحة فيكون معها خطبة أشبه

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

الأمینُ العام للاتحاد العالمی لعلماء المسلمین کا حوالہ

فضیلۃُ الشیخ دکتور علی محی الدین (الأمینُ العام للاتحاد العالمی لعلماء المسلمین) نے بھی موجودہ حالات میں گھروں کے اندر، عید کی نماز، باجماعت اور بغیر جماعت جائز ہونے کا فتویٰ دیا، اور اس سلسلہ میں شریعت کی طرف سے وُسعت اور گنجائش ہونے کی وضاحت کی، اور موجودہ حالات میں گھروں میں ہی نمازِ عید کے افضل ہونے کا حکم لگایا۔ [1]

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

بخطبة الجمعة إلا أنها يسن أن تبدأ بالتكبير، ويبين فيها أحكام العيد وما على المسلمين أن يفعلوه، وتكون الخطبة بعد الصلاة، وفى ظل الأزمة التى نمر بها وتعليق الصلوات فى المساجد، وحرصا على الحصول على ثوابها فيمكن أن نصليها فى بيوتنا ونحصل على الأجر بإذن الله.

وتابع عبر صفحته الرسمية بموقع التواصل الاجتماعى "فيسبوك"، يمكن لمصليها فى بيته أن يكتفى بصلاة ركعتين كصلاة الصبح ويسن أن يكبر فيهما على النحو التالى:

1۔ : أن يكبر بعد تكبيرة الإحرام وقبل البدء فى الفاتحة سبع تكبيرات يقول فى كل تكبيرة :الله أكبر، ثم يتم ركعته كما يفعل فى صلواته، فإذا كان فى الركعة الثانية :كبر بعد تكبيرة القيام خمس تكبيرات ثم يتم صلاته، وهذا على مذاهب الجمهور.

2۔ : أن يجعل التكبيرات ثلاثا قبل القراء ة فى الأولى وثلاثا بعد القراء ة وقبل الركوع فى الثانية على مذهب الحنفية.

-3إذا لم يحسن التكبير وكيفيته فترك التكبير وصلاها كصلاة الصبح تماما دون زيادة تكبير فصلاته صحيحه .فالصلاة سنة والتكبيرات فيها سنة أيضا لاتبطل بتركها.

-4إذا كان رب البيت يحسن الخطبة أمكنه أن يخطب خطبة قصيرة فى أهله، ويجوز الاكتفاء بالصلاة وترك الخطبة فهى سنة حتى إذا صليت فى مسجد جاز الانصراف بعد الصلاة دون الاستماع لها.

وشدد على أن صلاة العيد ممكنة للجميع، لأن الجميع يصلى الصبح، وهى يجوز أن تصلى كصلاة الصبح دون زيادة، حتى لا يفوتكم الثواب، داعيا أن يتقبل الله منا وأن يرفع الغمة ويعيدنا إلى بيوته، وحرمه، وأن يشفى مرضانا وأن يحفظ صحة الأصحاء ، ويحمى بلادنا وبلاد المسلمين من كل سوء وشر(موقع:بوابة الأهرام ، بعد قرار الأوقاف ..تعرف على خطوات صلاة العيد من المنزل، 23-05-2020)(https://gate.ahram.org.eg/News/2410132.aspx)

[1] أداء صلاة العيد فى ظل كورونا فى البلاد التى لا زالت المساجد، وأماكن التجمع ممنوعة:
ففى ظل هذه الجائحة يجوز أداء صلاة العيد داخل البيوت والأفضل الأصح أن تقام جماعة، بحيث

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

اکرم کساب (رکن اتحاد العالمی لعلماء المسلمین) کا حوالہ

دکتور اکرم کساب، رکن اتحاد العالمی لعلماء المسلمین، نے بھی اس سلسلہ

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

يتقدم أحسنهم قراء ة من أهل البيت فيصلي بهم صلاة العيد فيكبر في الركعة الأولى بعد تكبيرة الإحرام ست تكبيرات، ثم يقرأ الفاتحة وسورة، وفي الركعة الثانية يبدأ بخمس تكبيرات ثم الفاتحة وسورة، ثم بعد الركعتين خطبة مؤجرة.

فقد جاء في مختصر الأم للمدني نقلاً عن الإمام الشافعي :(ويصلي العيدين المنفرد في بيته، والمسافر، والمرأة ..... .) وكذلك بقية الفقهاء المالكية، والحنابلة على أنه إذا فاتته صلاة العيد مع الإمام أن يصليها جماعة أو منفرداً، وقال ابن قدامة في المغني :(وهو مخير إن شاء صلاها وحده، وإن شاء صلاها جماعة.

إن في الموضوع فسحة ويسراً،ـ والحمد لله ـــ فلا تضيقوا على أنفسكم، والأفضل أداء صلاة العيدين جماعة داخل البيت في ظل حظر التجمعات، وإغلاق المساجد، ونتضرع إلى الله تعالى أن يرفع هذه الجائحة حتى نعود إلى مساجدنا وشعائرها، آمين .

وصلى الله على سيدنا محمد وعلى آله وصحبه وسلم(موقع : الدكتور على محى الدين القره داغي، حكم صلاة العيد في ظل جائحة كورونا "كوفيد ١٩")

(https://alqaradaghi.com/10613/)

أكد علماء ودعاة جواز صلاة العيد في البيوت في ظل جائحة كورونا (كوفيد 19 -)، حيث ما زالت المساجد فيها معطلة بسبب الخوف من تفشي الجائحة ويفضل صلاتها جماعة في البيت بدون خطبة.

وقال فضيلة الشيخ الدكتور على محيي الدين القره داغي الأمين العام للاتحاد العالمي لعلماء المسلمين إن صلاة العيدين سنة مؤكدة عند أكثرية الفقهاء ومنهم المالكية والشافعية، وأما الحنفية فيرون أنها واجبة -وهي مرتبة أعلى من السنة المستحبة، وأدنى من الفرض -والحنابلة يرون أنها فرض كفاية إذا قام بها البعض سقط عن الباقين.

وأضاف أن صلاة العيدين من الشعائر العظيمة في الإسلام، يشترك فيها الجميع الرجال والنساء حتى الحيض، ووقتها؛ بعد شروق الشمس يوم العيد وارتفاعها بمقدار رمح، أو رمحين، أي بعد حوالي 15دقيقة من طلوع الشمس، وينتهي وقتها بما قبل صلاة الظهر بحوالي 20دقيقة، وعند فواتها يجوز قضاؤها منفردا أو جماعة.مكانها؛ هو كل مكان طاهر مسجدًا أو غيره.

كيفية أدائها :

وبين فضيلته أنها تؤدى جماعة وجوبًا عند الحنفية والحنابلة ومنفرداً عند غيرهم، حيث تبدأ الركعة الأولى بسبع تكبيرات (أو أقل) والثانية بخمس أو ثلاث.

وحول أداء صلاة العيد في ظل كورونا في البلاد التي ما زالت المساجد فيها مغلقة، وأماكن التجمع

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

میں ایک مضمون تحریر کیا، جس میں مدلّل انداز میں گھروں میں نمازِ عید کے جائز ہونے کا حکم بیان کیا۔ ل

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

ممنوعة؛ قال فضيلته إنه فى ظل هذه الجائحة يجوز أداء صلاة العيد داخل البيوت والأفضل الأصح أن تقام جماعة، بحيث يتقدم أحسنهم قراء ة من أهل البيت فيصلى بهم صلاة العيد فيكبر فى الركعة الأولى بعد تكبيرة الإحرام ست تكبيرات، ثم يقرأ الفاتحة وسورة، وفى الركعة الثانية يبدأ بخمس تكبيرات ثم الفاتحة وسورة، ثم بعد الركعتين خطبة مؤجرة.

ونقل ما جاء فى مختصر الأم للمدنى نقلاً عن الإمام الشافعى :(ويصلى العيدين المنفرد فى بيته، والمسافر، والمرأة.....) وكذلك بقية الفقهاء المالكية، والحنابلة على أنه إذا فاتته صلاة العيد مع الإمام أن يصليها جماعة أو منفرداً، وقال ابن قدامة فى المغنى :(وهو مخير إن شاء صلاها وحده، وإن شاء صلاها جماعة).

وأكد الأمين العام للاتحاد العالمى لعلماء المسلمين أن الموضوع فيه فسحة ويسر، مضيفاً :لا تضيقوا على أنفسكم، لذلك فالأفضل أداء صلاة العيدين جماعة داخل البيت فى ظل حظر التجمعات، وإغلاق المساجد، ونتضرع إلى الله تعالى أن يرفع هذه الجائحة حتى نعود إلى مساجدنا وشعائرها(موقع: لوسيل ،فى ظل استمرار إغلاق المساجد بسبب جائحة "كورونا .." علماء ودعاة:صلاة العيد داخل البيوت جائزة وجماعة أفضل،23-05-2020، لمصطفى شاهين)
(https://lusailnews.net/article/society/qatari/23/05/2020/)

ل الحكمة من صلاة العيد:

للعيد حكمة تتجلى من خلال ما رواه أحمد عن أنس بن مالكٍ، قال :قدم رسول الله صلى الله عليه وسلم المدينة ولهم يومان يلعبون فيهما، فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم :ما هذان اليومان؟ قالوا :كنا نلعب فيهما فى الجاهلية، قال" :إن الله قد أبدلكم بهما خيراً منهما :يوم الفطر، ويوم النحر ."(رواه أحمد (13622)، فهو يوم للفرح والسرور، كما أنه يوم للشكر، قال تعالى: (ولتكملوا العدة ولتكبروا الله على ما هداكم ولعلكم تشكرون) (البقرة185 :).

حكمها :اختلف العلماء فى حكم صلاة العيد، فقال الأحناف :صلاة العيدين واجبة (الواجب عند الحنفية :أنه منزلة بين الفرض والسنة .(أما الشافعية والمالكية، فقد ذهبوا إلى القول بأنها سنة مؤكدة .وذهب الحنابلة إلى القول بأنها فرض كفاية.

مكان أدائها :لم يعهد الناس من قبل صلاة العيد فى البيوت؛ لأن الأصل فيها الجماعة، وهى من النوافل التى جاء ت السنة بصلاتها خارج البيت لا داخله، وقد اتفق الفقهاء على أن :كل مكان طاهر، يصلح أن تؤدى فيه صلاة العيد، سواء كان مسجداً أو عرصة وسط البلد أو مفازة خارجها. إلا أنه يسن الخروج لها إلى الصحراء أو إلى مفازة واسعة خارج البلد، تأسياً بما كان يفعله رسول الله صلى الله عليه وسلم.

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

عبدُ اللّٰہ بن شیخ محفوظ بن بیّہ کا حوالہ

عرب کے ایک اور مشہور عالمِ دین عبد اللّٰہ بن شیخ محفوظ بن بیّہ نے بھی اس سلسلہ میں ایک فتویٰ جاری کیا، جس میں گھروں کے اندر نمازِ عید کے جائز ہونے کا حکم بیان کیا۔ [1]

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾ صلاة العيد في هذه الأزمة:

إذا استمر الأمر على ما هو عليه من حظر التجول، ومن التجمعات، وغلق المدارس والمساجد، فتكون صلاة العيد على هذا النحو:

1- : يصلي الإمام في مسجده بمن يحضر معه من موظفي المسجد حتى لا يهجر بيت الله تعالى.

2- : يصلي كل امرء صلاته في بيته فيجمع أهل بيته ويصلي ركعتين في الأولى سبع تكبيرات قبل القراء ة، وفي الثانية خمس تكبيرات .(كصلاتها في الخلاء أو المصلى)

3- : لا مانع من سماع الخطبة من المسجد مع الإمام باعتبارها موعظة، فالخطبة ليست شرطاً للعيد كما في صلاة الجمعة، بل ورد عن النبي صلى الله عليه وسلم تخيير الناس في الجلوس لها، روى أبو داود عن عبد الله بن السائب، قال :شهدت مع رسول الله صلى الله عليه وسلم العيد، فلما قضى الصلاة، قال " :إنا نخطب، فمن أحب أن يجلس للخطبة فليجلس، ومن أحب أن يذهب فليذهب"، قال أبو داود" :هذا مرسلٌ عن عطاءٍ، عن النبي صلى الله عليه وسلم."

4- : يصلي الناس في بيوتهم، وجمهور العلماء على أن صلاة العيد جائزة في كل مكان؛ لأن الأصل أن تصلى في الخلاء ، قال الشافعي :ويصلي العيدين المنفرد في بيته.

5- : لا يحتاج المرء في صلاته في بيته إلى خطبة، فإن صلى الركعتين صحت صلاته، وإن أعطى موعظة لأهل بيته وذكرهم بنعم الله فلا بأس.

6- : من فاتته صلاة العيد في بيته لعذر؛ كأن سهر أهل البيت حتى الفجر ثم ناموا؛ فإن استيقظوا قبل الزوال صلوها في يومهم، وإن قاموا بعد الزوال صلوها من الغد، روى البيهقي عن عبيد الله بن أبي بكر بن أنس بن مالكٍ خادم رسول الله صلى الله عليه وسلم قال" :كان أنسٌ إذا فاتته صلاة العيد مع الإمام جمع أهله فصلى بهم مثل صلاة الإمام في العيد".

7- : لا يلجأ الناس لصلاتها في الخلاء بحجة أنها ستكون في الفضاء ، والمكان متسع، لأنه عند التطبيق سيصعب ضبط الناس في المكان، وقد يعز على البعض عند اللقيا عدم المصافحة أو المعانقة، وهذا مما سيوقع الناس في ضرر بالغ، وفي المسند عن ابن عباسٍ، قال :قال رسول الله صلى الله عليه وسلم " :لا ضرر ولا ضرار(موقع:عربي پوست ،كيف تصلى العيد في ظل أزمة كورونا؟20-05-2020، لأكرم كساب،داعية إسلامي مقيم في أمريكا)

[1] مع قرب انتهاء شهر رمضان سادت حالة من الجدل حول كيفية أداء صلاة عيد الفطر في ظل الإجراء ات الاحترازية الحالية التي فرضها تفشي فيروس كورونا المستجد في العديد من دول

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

الدولُ العربية والاسلامية کا حوالہ

الـدولُ الـعـربية والاسلامية، کی حکومتوں نے موجودہ حالات میں گھروں میں نمازِ عید کو جائز قرار دیا، اور نمازِ عید کے اداء کرنے پر لوگوں کو اَجرِ عظیم حاصل ہونے کی تعلیم دی، اور عذر کی حالت میں عید کی نماز سے محروم نہ ہونے کی لوگوں کو تبلیغ کی۔ [1]

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

العالم، وهو الأمر الذى حسمه مجلس الإمارات للإفتاء الشرعى، حيث أفتى بأن يصلى الناس العيد فى بيوتهم، فرادى أو جماعات، بدون خطبة.

"الإمارات للإفتاء :"الأخذ بأسباب الوقاية الصحية "واجب شرعى وضرورة حياتية"

جاء ذلک ردا على سؤال "ما حكم صلاة العيد فى البيوت خلف إمام المسجد أو المذياع أو التلفاز أو عبر وسائل التواصل الاجتماعى؟"، بحسب الموقع الرسمى للشيخ عبدالله بن بيه، رئيس المجلس.

واستند المجلس فى فتواه إلى أن "صلاة العيد سنة مؤكدة عند مالک والشافعى وفرض كفاية عند أحمد وواجبة لدى الأحناف، والأصل فيها :أن تصلى فى المصليات، إلا فى مكة المكرمة، واختار الشافعى صلاتها فى المساجد مطلقًا، كما الأصل :أن تصلى جماعةً، إلا أنَ الجمهور اتفقوا على جواز صلاتها فى البيوت عند وجود مانع أو عند فواتها "(موقع:العين الإخبارية، صلاة العيد فى زمن كورونا" ..الإمارات للإفتاء الشرعى "يحسم الجدل،16-05-2020، السبت)

(https://al-ain.com/article/eid-prayers-corona-uae-legal-advisory)

[1] كيفية صلاة العيد فى البيت 2020، صلاة عيد الفطر السعيد هى من اهم الشعائر الاسلامية التى يقوم بها المسلمين، حيث يعتبر عيد الفطر السعيد من اهم المناسبات الدينية التى تحل على المسلمين بعجد شهر رمضان المبارک، ولكن هنالک الكثير من المسلمين يجهلون كيفية صلاة عيد الفطر السعيد فى البيت بعدما اصدرت الحكومة العربية والاسلامية فرض حظر التجول وعدم التجمهر والتجمع لمنع تفشى فيروس كورونا، ومن هنا بدأ الكثير من المسلمين بالبحث عبر مواقع الانترنت لمعرفة كيفية صلاة العيد فى البيت 2020، فمن خلال المقال اليكم الطريقة الصحيحة لصلاة عيد الفطر السعيد فى البيت.

كيفية صلاة العيد فى البيت 2020:

يجهل الكثير من المسلمين فى عيد الفطر السعيد طريقة صلاة عيد الفطر فى البيت بعدما فرضت الحكومات حظر التجول ومنع الصلاة فى المساجد والساحات العامة، حيث تعتبر صلاة عيد الفطر السعيد هى من اهم الشعائر الاسلامية التى يقوم بها المسلمين، حيث يعتبر عيد الفطر السعيد من اهم المناسبات الدينية التى تحل على المسلمين بعجد شهر رمضان المبارک، ولكن هنالک

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

اس کے علاوہ عالَمِ عرب کی تقریباً تمام ریاستوں کے علماء واَصحابِ علم کی طرف سے یہی حکم جاری کیا گیا۔ ۱؎

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

الكثير من المسلمين يجهلون كيفية صلاة عيد الفطر السعيد فى البيت بعدما اصدرت الحكومة العربية والاسلامية فرض حظر التجول وعدم التجمهر والتجمع لمنع تفشى فيروس كورونا.
اكد العديد من علماء المسلمين وكبار الشيوخ طريقة صلاة عيد الفطر السعيد والتى تتمثل فى ركعتين دون خطبة، وبهذا يكون اجرها كما هو، حيث تمنع اقامة الصلاة بشكل جماعى بسبب الخطر الذى يهدد حياة البشرية كما اعلنت منظمة الصحة العالمية، حيث تسبب انتشار فيروس كورونا فى العالم العربى والاسلامى وجميع دول العالم فى منع التجمعات واقامة الفعاليات والمهرجانات والصلاة والكثير من الانشطة، وايضا اغلاق الحدود بين الدول بعضها البعض.
اعلنت السلطات فى الدول العربية والاسلامية بفرض حظر التجول للحد من انتشار فيروس كورنا فى البلاد العربية والاسلامية، حيث سجلت وزارة الصحة فى المملكة وغيرها الكثير من الدول العربية والاسلامية اصابات بفيروس كورونا فى البلاد، وجاء ت هذه القرارات للحد من انتشار الفيروس فى البلاد، كما ان منظمة الصحة العالمية اكدت ان فيروس كورونا اصبح وباء عالمى ولا يوجد له لقاح او علاج وبهذا يجب اتخاذ اجراء ات الوقاية لتجنب انتشار المرض فى البلاد.
اجر صلاة عيد الفطر السعيد:
لصلاة بشكل عام عند الله عز وجل اجر وثواب عظيم وكبير، حيث تعتبر صلاة عيد الفطر السعيد هى من اهم الشعائر الاسلامية التى يقوم بها المسلمين، حيث يعتبر عيد الفطر السعيد من اهم المناسبات الدينية التى تحل على المسلمين بعجد شهر رمضان المبارك، وبناء على ذلك يوجد لها اجر وثواب عظيم فى الدنيا والاخرة وفق ما هو موضح فى الدين الاسلامى.
اجر صلاة عيد الفطر السعيد يتمثل فى كسب رضا الله عز وجل ونيل الاجر والثواب فى الدنيا والاخرة، لأن احياء صلاة عيد الفطر من الشعائر الهامة التى اكدها الدين الاسلامى، ومن يقوم بهذه الصلاة له اجر وثواب عظيم، فمع حلول عيد الفطر السعيد بدأ الكثير من المسلمين فى مختلف دول العالم العربى بالبحث عن طريقة لمعرفة كيفية صلاة عيد الفطر السعيد فى البيت بعدما اصدرت الحكومة العربية والاسلامية فرض حظر التجول وعدم التجمهر والتجمع لمنع تفشى فيروس كورونا، ومن هنا بدأ الكثير من المسلمين بالبحث عبر مواقع الانترنت لمعرفة كيفية صلاة العيد فى البيت .2020(موقع: دار العرب، كيفية صلاة عيد الفطر 2020)
(https://www.3rabhome.com/28733)

۱؎ أجمعت أغلب الجهات الدينية فى الدول العربية والإسلامية على منع أداء صلاة عيد الفطر هذا العام فى المساجد والمصليات؛ لمنع انتشار فيروس كورونا، وبالتالى يتطلع كثيرون لمعرفة كيفية أداء صلاة العيد فى البيت وتوقيتها .

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

یہاں تک کہ خلیجِ عرب میں نمازِ عید کے لئے "صلوا فی بیوتکم و صلوا فی رِحالکم"

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

ومع تأكيد الفتاوى على إمكانية أداء هذه الشعيرة داخل البيوت، تثور التساؤلات عن كيفية أداء صلاة العيد فى البيت، للأفراد الذين تعودوا على الصلاة مع إمام بخطبتين وركعتين والتكبيرات المعروفة.

ركعتان بلا خطبة:

وتواترت بيانات الهيئات الدينية المعروفة، مثل مفتى السعودية والأزهر الشريف، ومجلس الإمارات للإفتاء، على جواز أداء صلاة العيد فى البيوت.

وبذلك تكون كيفية أداء صلاة العيد فى البيت، وفق الفتاوى الشرعية، بركعتين دون خطبة، يكبر المصلى 7تكبيرات فى ركعته الأولى ويقرأ الفاتحة وسورة، و 5تكبيرات فى الثانية ثم الفاتحة وسورة، ويجوز للرجل أن يصلى بأهل بيته، ويمكن كذلك أن يصلى الشخص منفردا.

توقيت صلاة العيد:

يختلف التوقيت حسب الدول والمناطق، وكان يتم تحديد وقتها مسبقا؛ نظرا لأنها تؤدى فى المساجد وبالتالى يعرف المصلون الموعد المحدد للقدوم إلى المسجد.

لكن فى ظل أزمة كورونا وضرورة أداء الصلاة فى البيت، فيمكن التقيد بالتوقيت المحدد شرعا لصلاة العيد.

ووفقا للأزهر، فإن توقيت صلاة العيد هو وقت صلاة الضحى، يبدأ من بعد شروق الشمس بثلث ساعة ويمتد إلى قبيل أذان الظهر بثلث ساعة، فإن دخل وقت الظهر فلا تصلى لأن وقتها قد فات.

ووفقا لهذه القاعدة، فيمكن لأى شخص معرفة شروق الشمس حسب المدينة التى يسكنها وتحديد وقت صلاة العيد بناء على ذلك(موقع: رؤيا نيوز، 23-05-2020"كيفية أداء صلاة العيد بالبيت وتوقيتها")

(https://royanews.com/archives/39306)

والخلاصة :يجوز للمسلمين -فى الدول التى تم منع إقامة صلاة العيد فيها -أداء صلاة العيد فى بيوتهم جماعاتٍ أو فرادى على صفتها مع التكبيرات الزوائد، وفى وقتها بعد طلوع الشمس بربع أو ثلث ساعة تقريباً حتى قبيل أذان الظهر بربع أو ثلث ساعة تقريباً، ولا خطبة لمن يصلى منفرداً، أما من يصلى مع جماعة، فلهم أداء الخطبة أو تركها ولا حرج إن شاء الله تعالى .وتنطبق هذه الأحكام على المرضى وكبار السن والمصابين بأمراض مزمنة وغيرهم من أصحاب الأعذار فى الدول التى سُمح فيها بإقامة صلاة العيد، فيصلون فى البيوت وفقاً لما بيناه، والله تعالى أعلى وأعلم(موقع:اسلام اون لاین،"أحكام صلاة العيد فى زمن الوباء")

(https://islamonline.net/)

کا شِعار بلند ہوگیا۔ ا

ا رفعت بلدان الخليج العربية شعار "ألا صلوا فى بيوتكم ..ألا صلوا فى رحالكم " صلاة عيد الفطر، بسبب تزايد أعداد الإصابات بفيروس كورونا المستجد "كوفيد 19"، وفى إطار الإجراء ات التى اتخذت فى العالم كله بمنع أى شكل من أشكال التجمعات للحد من انتشار الوباء العالمى، ففى المملكة العربية السعودية، أفتى مفتى عام المملكة بجواز اقامة صلاة العيد فى البيوت.

وقال الشيخ عبد العزيز بن عبد الله آل الشيخ مفتى عام المملكة العربية السعودية، رئيس هيئة كبار العلماء والرئيس العام للبحوث العلمية والإفتاء، إن صلاة العيد إذا استمر الوضع كما هو الحال عليه فى هذه الأيام من عدم إقامة الجمع والجماعات فى المساجد والجوامع فإنها تصلى فى البيوت بدون خطبة بعدها.

وبحسب إحدى الصحف، سبق صدور فتوى من اللجنة الدائمة للفتوى السعودية جاء فيها :(ومن فاتته صلاة العيد وأحب قضاء ها استُحب له ذلك فيصليها على صفتها من دون خطبة بعدها)، فإذا كان القضاء مستحباً فى حق من فاتته الصلاة مع الإمام الذى أدى صلاة العيد بالمسلمين، فمن باب أولى أن تكون إقامتها مشروعة فى حق من لم تُقم صلاة العيد فى بلدهم لأن فى ذلك إقامة لتلك الشعيرة حسب الاستطاعة، والله تعالى يقول :(فَاتَّقُوا اللَّهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ) ، وقال النبى صلى الله عليه وسلم :(إذا أمرتكم بأمر فأتوا منه ما استطعتم)

وفى دولة الإمارات العربية المتحدة، حسم مجلس الإمارات للإفتاء الشرعى أمر صلاة عيد الفطر، حيث أفتى بأن يصلى الناس العيد فى بيوتهم، فرادى أو جماعات، بدون خطبة.

وردا على سؤال "ما حكم صلاة العيد فى البيوت خلف إمام المسجد أو المذياع أو التلفاز أو عبر وسائل التواصل الاجتماعى؟"، بحسب الموقع الرسمى للشيخ عبدالله بن بيه، رئيس المجلس الإماراتى.

واستند المجلس الإماراتى فى فتواه إلى أن "صلاة العيد سنة مؤكدة عند مالك والشافعي وفرض كفاية عند أحمد وواجبة لدى الأحناف، والأصل فيها :أن تصلّى فى المصليات، إلا فى مكة المكرمة، واختار الشافعى صلاتها فى المساجد مطلقًا، كما الأصل :أن تصلّى جماعةً، إلا أنَّ الجمهور اتفقوا على جواز صلاتها فى البيوت عند وجود مانع أو عند فواتها."

وقرر سلطنة عمان حظر التجمعات فى العيد بما فيها صلاة العيد، وأصدرت اللجنة العليا المكلفة ببحث آلية التعامل مع التطورات الناتجة عن انتشار فيروس "كورونا" عدة قرارات فى مقدمتها حظر التجمعات المرتبطة بالعيد مثل "الهبطات "(تجمعات نحر الذبائح) بمختلف أنواعها وتجمعات المعايدة والاحتفالات الجماعية بالعيد،

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

اوراہلِ تشیع کی طرف سے بھی اسی طرح کا حکم جاری کیا گیا۔ [1]

میڈیا اور ذرائع ابلاغ کے ذریعہ سے اس طرح کے سینکڑوں حوالہ جات دستیاب ہوسکتے ہیں، جن میں سے بہت سی خبریں اُردو اخبارات میں بھی شائع ہوئیں۔

چنانچہ 20/اپریل 2020ء، کو میڈیا میں یہ خبر شائع ہوئی کہ:

ریاض (آئی این پی) سعودی عرب میں علما کی سپریم کونسل نے دنیا بھر کے مسلمانوں پر زور دیا ہے کہ اگر وہ ایسے ملکوں میں رہ رہے ہیں، جہاں کورونا وائرس

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

وذلك لخطورة مثل هذه التجمعات على نشر المرض فى أوساط المجتمع.

كما كلفت اللجنة شرطة عمان السلطانية بمراقبة التزام الافراد والمنشآت والمؤسسات العامة والخاصة بالقرارات التى تصدرها اللجنة العليا وتفويضها مباشرة بفرض الغرامات المالية المقررة والحبس الاحتياطى لجميع المخالفين لهذه القرارات.

وقررت إعادة فتح حزمة جديدة من الأنشطة التجارية والصناعية، مع ضرورة التزام تلك الأنشطة بالضوابط الوقائية اللازمة، وستقوم الجهات المختصة بالإعلان عن تقفاصيل تلك الأنشطة.

مع التزام الجميع بارتداء الكمامات فى الأماكن العامة، وتشمل جميع مواقع الأنشطة التجارية والصناعية المسموح بها، وفى أماكن العمل فى القطاعين العام والخاص ووسائل النقل العامة.

وفى مختلف البلدان الخليجية الأخرى متوقع أن تتخذ قرارات متشابهة لتلك التى أقرتها دور الافتاء فى الامارات والسعودية، فقد فرضت الكويت حظراً شاملاً فى العاشر يستمرّ إلى ما بعد عيد الفطر، وذلك للحد من انتشار فيروس كورونا(موقع: اليوم السابع، " "ألا صلوا العيد فى بيوتكم .."شعار صلاة عيد الفطر فى الخليج ..مفتى السعودية: الصلاة فى البيت دون خطبة ..إفتاء الإمارات: صلوا فى البيوت فرادى أو جماعات ..وعمان تحظر تجمعات الصلاة والذبائح وتفرض الكمامات"2020-05-18، الاثنين)

[1] صلاة العيد، صلاة يُقيمها المسلمون (شيعة وسنة) فى عيد الفطر وعيد الأضحى وهى من الصلوات الواجبة فى زمن حضور الإمام المعصوم مع اجتماع الشرائط، ومستحبة فى عصر الغيبة جماعة وفرادى، ولا يعتبر فيها العدد ولا تباعد الجماعتين، ولا غير ذلك من شرائط صلاة الجمعة ولا إقامة فيها، ولا يجب قضاؤها على من لم يصلّها.

(http://ar.wikishia.net/view/صلاة-العيد)

کا حملہ جاری ہے، تو ایسے میں وہ ان ملکوں میں نافذ کرفیو اور لاک ڈاؤن جیسی احتیاطی تدابیر کی لازمی پابندی کرتے ہوئے رمضان المبارک میں نمازیں اور تراویح اپنے گھروں میں ادا کریں، مسلمان جن ملکوں میں رہائش پذیر ہیں، انہیں وہاں عالمی وبا کی روک تھام کی خاطر نافذ کردہ احتیاطی تدابیر کا لحاظ رکھتے ہوئے اپنے دینی فرائض اداء کرنے کی مثال پیش کرنی چاہیے، سعودی عرب کے مفتیِ اعظم نے جمعہ کے روز ایک بیان میں کہا تھا کہ رمضانُ المبارک کے دوران تراویح اور عید کی نماز گھروں میں ادا کی جائے، تا کہ کورونا وائرس کے پھیلاؤ کو روکا جاسکے۔

سعودی عرب سمیت متعدد اسلامی ملکوں، مصر اور متحدہ عرب امارات نے غیر معینہ مدت کے لیے مساجد کے اندر نماز باجماعت پر پابندی عائد کر دی ہے، تا کہ وائرس کے پھیلاؤ کو روکا جاسکے۔

مصر نے احتیاطی تدبیر کے طور پر افطار و سحر کے روایتی خیمے اور کھلی جگہوں پر ان کے انعقاد پر پابندی لگادی ہے (سچ نیوز ''سعودی علماء کی سپریم کونسل نے دنیا بھر کے مسلمانوں کو کس عمل کو بجالانے پر زور دیا؟'' 20-04-2020، اردو پوائنٹ ''لاک ڈاون والی جگہوں پر رہنے والے مسلمان گھروں میں نماز ادا کریں: سعودی علما کونسل'' 20-04-2020)

(https://www.suchtv.pk/urdu/world/item/83821-saudi-ulma-council-decision.html)

(https://www.urdupoint.com/daily/livenews/2020-04-20/news-2349576.html)

اور 19 / مئی 2020ء کو روز نامہ ''جنگ'' میں یہ خبر شائع ہوئی کہ:

سعودی عرب، ترکی، شام، مصر، الجزائر میں کہیں پر عید الفطر کے اجتماعات پر پابندی عائد کی گئی ہے اور کہیں اس موقع پر کرفیو کے نفاذ کا اعلان کیا گیا ہے۔

سعودی عرب، الجزائر اور مصر میں نمازِ عید کے اجتماعات پر پابندی عائد کی گئی ہے۔

شام کی حکومت نے بھی ملک میں عید الفطر کے اجتماعات پر پابندی عائد کردی ہے۔

شامی وزارتِ مذہبی امور کی جانب سے شامی عوام کو ہدایت کی گئی ہے کہ گھر کے

افراد کے ساتھ گھر پر ہی نمازِ عید ادا کی جائے۔

ترکی کے صدر رجب طیب اردوان نے ملک بھر میں عید پر کرفیو نافذ کرنے کا اعلان کردیا ہے (روزنامہ ''جنگ'' بین الاقوامی خبریں، 19-05-2020)

(https://jang.com.pk/news/773027)

اور 19 / مئی 2020ء کو ''جیو نیوز'' میں یہ خبر شائع ہوئی کہ:

شامی حکام کا کہنا ہے کہ مملکت میں عید الفطر کی نماز کے اجتماعات پر پابندی ہوگی تاکہ عالمی وبا کورونا وائرس کو پھیلنے سے روکا جاسکے۔

شامی وزارتِ مذہبی امور نے اپیل کی ہے کہ گھر کے افراد کے ساتھ گھر پر ہی نمازِ عید اداء کی جائے۔

اس سے قبل ترکی، سعودی عرب، الجزائر اور مصر میں بھی نمازِ عید کے اجتماعات پر پابندی عائد کی جاچکی ہے۔

سعودی حکومت نے 23 مئی سے 27 مئی تک تمام شہروں میں 24 گھنٹے کے کرفیو کا اعلان کررکھا ہے، جبکہ سعودی مفتیِ اعظم کا کہنا ہے کہ موجودہ حالات کے تناظر میں عید کی نماز گھر پر اداء کی جاسکتی ہے۔

ترکی نے بھی 23 تا 26 مئی ملک بھر میں مکمل لاک ڈاؤن کا اعلان کردیا ہے

(جیو نیوز ''شام، مصر اور الجزائر میں نمازِ عید کے اجتماعات پر پابندی'' 19-05-2020)

(https://urdu.geo.tv/latest/221837-)

اور ظاہر ہے کہ اس طرح کی خبریں، عامۃُ الناس کے سامنے بھی آتی ہیں۔

پس جب اتنے مسلم ممالک وریاست کے جید اور کِبار علمائے کرام ومفتیانِ عظام کی طرف سے گھروں میں نمازِ عید کے جواز کے فتاویٰ جاری کیے جارہے ہوں، تو بعض اہلِ علم کی طرف سے، ان کو نظر انداز کرکے ایک ہمہ گیر مسئلہ پر یکطرفہ مخالف حکم لگادینا، اور دوسرے موقف پر نکیر کرنا، مناسب طرزِ عمل نہیں کہلاتا، اور وہ عوام کے لئے سخت تشویش کا باعث بنتا ہے۔

اس کے علاوہ ہندوستان کے متعدد اصحابِ علم کی طرف سے بھی گھروں میں نمازِ عید کے جواز کا حکم بیان کیا گیا، جس میں حنفیہ کی بیان کردہ شرائط کا بھی لحاظ کیا گیا۔

اور پاکستان کے چند ایک دارُالافتاؤں سے بھی اس کے متعلق فتویٰ جاری ہوا۔

اس لیے یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ گھروں میں عید کی نماز کا جواز صرف غیر حنفیہ کے نزدیک ہے، اور حنفیہ کے نزدیک اس کی گنجائش نہیں۔

آگے اس سلسلہ میں چند فتاویٰ اور عبارات وحوالہ جات نقل کیے جاتے ہیں۔

دارُالعلوم دیوبند کا فتویٰ

باسمہٖ سبحانہٗ وتعالٰی

حضرات مفتیانِ کرام، دارالافتاء دارُالعلوم دیوبند

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ!

(۱۱۳۴/ھ) ملک میں جاری لاک ڈاؤن اور سماجی فاصلہ برقرار رکھنے کی ہدایت کے پیشِ نظر دارالافتاء کی طرف سے نمازِ جمعہ سے متعلق ہدایات حاصل کی گئی تھیں، اب جبکہ رمضانُ المبارک کا مہینہ قریبُ الختم ہے، اور ابھی لاک ڈاؤن کے سلسلہ میں کوئی صورتِ حال واضح نہیں ہے، اس لئے نمازِ عیدُ الفطر کے سلسلہ میں رہنمائی کی ضرورت ہے۔ اگر لاک ڈاؤن کا سلسلہ اسی طرح برقرار رہا، تو نمازِ عیدُ الفطر کی ادائیگی کا کیا طریقہ ہوگا۔

رہنمائی فرمائی جائے۔

والسلام

مہتمم دارالعلوم دیوبند

۲۲/۹/۱۴۴۱ھ۔۱۶/۵/۲۰۲۰

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰہ العصمة والتوفیق، حامداً ومصلیاً ومسلماً

(۱٦۹/تتمہ/ھ) عیدین کی نماز احناف کے نزدیک اصح اور مفتی بہ قول کے مطابق واجب ہے، اور اس کے لئے وہی شرائط ہیں، جو جمعہ کے لئے ہیں، البتہ جمعہ میں خطبہ شرط ہے، اور وہ نماز سے پہلے ہوتا ہے، اور عیدین میں خطبہ سنت ہے، اور وہ نماز کے بعد ہوتا ہے۔

لہٰذا اگر عیدُ الفطر تک لاک ڈاؤن کا سلسلہ جاری رہتا ہے، اور مساجد وغیرہ میں پانچ سے زائد لوگوں کو نماز کی اجازت نہیں ہوتی ہے، تو 6/ شعبان، سنہ 1441ھ (مطابق: یکم اپریل، سنہ 2020ء) کے فتوے (٦٨١/ن، ١٠٦/تتمہ/ن) میں جن شرائط وتفصیلات کے ساتھ مساجد میں اور گھروں کی بیٹھک، یا باہری کمروں میں جمعہ ادا کرنے کا حکم دیا گیا ہے، اُنہی کی رعایت کے ساتھ مساجد اور گھروں کی بیٹھک، یا باہری کمروں میں نمازِ عید بھی ادا کی جائے۔

اور جن لوگوں کے لئے نمازِ عید کی کوئی صورت نہ بن سکے، عذر ومجبوری کی وجہ سے اُن سے نمازِ عید معاف ہوگی، لہٰذا انہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔

البتہ یہ حضرات اگر اپنے اپنے گھروں میں انفرادی طور پر 2 یا 4/ رکعت چاشت کی نماز پڑھ لیں، تو بہتر ہے، کیونکہ جنہیں عید کی نماز نہ مل سکے، اُن کے لئے فقہاء نے 2 یا 4/ رکعت چاشت کی مستحب قرار دی ہیں۔

فقط واللّٰہ سبحانہٗ تعالٰی أعلم

محمود حسن بلند شہری غفرلہٗ

دار العلوم دیوبند

۲۳/۹/۱۴۴۱ھ، الموافق ۱۷/۵/۲۰۲۰ء، یومُ الاحد

الجواب صحیح	الجواب صحیح	الجواب صحیح
وقار علی غفرلہ	نعمان سیتاپوری غفرلہ	حبیبُ الرحمٰن عفا اللہ عنہ
۲۳/ رمضان ۱۴۴۱ھ	۲۳/۹/۱۴۴۱ھ	۲۳/۹/۱۴۴۱ھ

(https://www.unaurdu.com/2020/05/deoband.html)

جامعۃُ العلوم الاسلامیۃ، بنوری ٹاؤن کا فتویٰ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سوال

کیا فرماتے ہیں مفتیانِ کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ:

1۔عید کی نماز کا کیا حکم ہے؟

2۔اگر کسی ملک میں وبائی امراض، یا وائرس کے پیشِ نظر عید گاہ میں جانے سے منع کیا جائے، تو کیا عید کی نماز گھر یا گھر کی چھت، پارکنگ وغیرہ میں ادا کی جا سکتی ہے؟

جواب دے کر مشکور وممنون فرمائیں

مستفتی

عبدالمنان، کراچی

جواب

واضح رہے کہ عید کی نماز، دین کے شعائر میں سے بنیادی شعار ہے۔[1]

اور عید کی نماز سے مقصود مسلمانوں کی شان وشوکت اور قوت کا اظہار ہے، یہی وجہ ہے کہ عید کی نماز، عید گاہ میں پڑھنا مسنون ہے، تا کہ زیادہ سے زیادہ مسلمان ایک جماعت میں شریک ہوسکیں۔[2]

1۔صورتِ مسئولہ میں شہر، فنائے شہر اور بڑا گاؤں، جہاں جمعہ قائم کرنے کی شرائط پائی جاتی ہیں، وہاں عید کی نماز پڑھنا واجب ہے، تاہم جمعہ اور عید کی نماز کی شرائط میں فرق یہ ہے کہ جمعہ کے درست ہونے کے لئے خطبہ شرط ہے، جبکہ عید کی نماز کے لئے خطبہ شرط نہیں، سنت ہے۔(3)

اسی طرح عید کی نماز کے لئے اِذنِ عام کا ہونا بھی شرط نہیں۔(4) ؎۱

جمعہ اور عید کی نمازوں کے لئے جماعت کا ہونا شرط ہے، انفرادی طور پر جمعہ یا عید کی نماز ادا کرنا درست نہیں، جماعت کے ساتھ پڑھنا ضروری ہے، لیکن جمعہ اور عید کی جماعت کے لئے کتنے افراد ضروری ہیں، اس میں فرق ہے، جمعہ کی نماز درست ہونے کے لئے امام کے علاوہ تین بالغ مردوں کا ہونا ضروری ہے، اور عید کی نماز کے لئے امام کے علاوہ ایک بالغ مرد کا ہونا کافی ہے۔(5) ؎۲

2۔اگر کسی ملک میں وائرس، یا کسی وبائی مرض کی وجہ سے حکومت عیدگاہ، یا مسجد میں عید کی نماز پڑھنے سے منع کرے، تو شہر، فنائے شہر، یا بڑے گاؤں کے رہنے والے مسلمان کوشش کریں کہ وہ عید کی نماز، عیدگاہ میں، یا مسجد میں پڑھیں۔

لیکن اگر کسی علاقے میں عید کی نماز عیدگاہ، یا مسجد میں پڑھنا ممکن نہ ہو تو کم از کم

؎۱ بعض حنفیہ نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے، لیکن دیگر حضرات نے اس سے اختلاف کیا ہے، اور انہوں نے عید کی نماز کے لیے بھی اذنِ عام کو ضروری قرار دیا ہے، لیکن باضابطہ تعددِ عیدین کے موجودہ ماحول میں اذنِ عام شرط نہیں رہتا، جس کی تفصیل ہم جمعہ سے متعلق اپنے سابق مضامین میں بیان کر چکے ہیں، جو بحمداللہ تعالیٰ اس سے پہلے ''علمی و تحقیقی رسائل'' میں شائع ہو چکے ہیں۔محمد رضوان خان۔

؎۲ یہ بھی بعض حنفیہ کے بقول ہے، ورنہ دیگر حنفیہ نے جمعہ کی طرح عید کی نماز کے لیے بھی امام سمیت کم از کم چار افراد کو ضروری قرار دیا ہے، جیسا کہ دارُالعلوم دیوبند کے فتوے میں بھی گزرا، اس کے بعد دارُالعلوم دیوبند کے ایک فتوے میں اس کی بھی وضاحت کی گئی کہ عید کی نماز میں امام کے علاوہ ایک فرد ہونے کا قول تسامح پر مبنی ہے، جو بنیادی طور پر تکبیرِ تشریق کے مسئلہ سے متعلق تھا، بعد کے حضرات نے تسامح کی وجہ سے اس کو نمازِ عید کے مسئلہ میں نقل کر دیا۔محمد رضوان خان۔

دو افراد گھر، گھر کی چھت، صحن، یا بلڈنگ کی پارکنگ وغیرہ میں جمع ہو کر پڑھیں۔ ١

عید کی نماز کا طریقہ:

عید کی نماز کے لیے اذان اور اقامت نہیں، جب نماز کھڑی کی جائے، تو عید کی نماز چھ زائد تکبیرات کے ساتھ پڑھنے کی نیت کرے، اس کے بعد تکبیر کہہ کر ہاتھ ناف کے نیچے باندھ لے، اور ثناء پڑھے، اس کے بعد تین زائد تکبیریں کہے، دو تکبیروں میں ہاتھ کانوں تک اُٹھا کر چھوڑ دے، اور تیسری تکبیر پر ہاتھ اُٹھا کر ناف کے نیچے باندھ لے، اس کے بعد امام اونچی آواز میں قراءت کرے، قرائت مکمل ہونے کے بعد بقیہ رکعت (رکوع اور سجدہ وغیرہ) دیگر نمازوں کی طرح ادا کرے۔

پھر دوسری رکعت کے شروع میں امام اونچی آواز میں قراءت کرے، اس کے بعد تین زائد تکبیریں کہے، تینوں تکبیروں میں ہاتھ کانوں تک اُٹھا کر چھوڑ دے، پھر ہاتھ اُٹھائے بغیر چوتھی تکبیر کہہ کر رکوع میں جائے، اور پھر دیگر نمازوں کی طرح دو سجدوں کے بعد التحیات، درود اور دعا پڑھ کر سلام پھیر دے، پھر نماز مکمل کرنے کے بعد امام دو خطبے دے، دونوں خطبوں کے درمیان تھوڑی دیر بیٹھے۔ (6) ٢

حوالہ جات

---

١ چھت، صحن، یا بلڈنگ کی قید، سوال میں ان چیزوں کا ذکر ہونے کی وجہ سے ہے، اذنِ عام کی وجہ سے نہیں، کیونکہ اس کو تو عید کی نماز کے لیے مذکورہ فتوے میں ضروری قرار ہی نہیں دیا گیا، اور یہ قید مجمع کے بڑا ہونے کی وجہ سے بھی نہیں، کیونکہ اس فتوے میں ساتھ ہی کم از کم دو افراد کے عید کی نماز پڑھنے کا ذکر ہے۔

اور ہمارے نزدیک اصل دارومدار لوگوں کے حالات اور قانونی وغیر قانونی پیچیدگیوں پر ہے۔

ممکن ہے کہ کسی کو نہ چھت میسر ہو، نہ صحن میسر ہو، اور نہ پارکنگ، تو اس کو اپنے حسبِ حال گھر کے کسی کمرہ میں بھی نمازِ عید کا اداء کرنا جائز ہوگا، جس کی مدلل تفصیل ہم اپنے جمعہ سے متعلق مضامین میں ذکر کر چکے ہیں۔ محمد رضوان خان۔

٢ یہ طریقہ حنفیہ کے مطابق ہے، دیگر فقہائے کرام کے نزدیک تکبیراتِ عیدین کی تعداد مختلف ہے، جس کا ذکر ہم اس سے پہلے کر چکے ہیں۔ محمد رضوان خان۔

(1) بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع (84/3)
ولأنها من شعائر الإسلام فلو كانت سنة فربما اجتمع الناس على تركها فيفوت ما هو من شعائر الإسلام فكانت واجبة صيانة لما هو من شعائر الإسلام عن الفوت.
(2) صحيح البخارى (22/2)ط: دارالشعب
عن أبى سعيد الخدرى، قال: كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يخرج يوم الفطر والأضحى إلى المصلى، فأول شىء يبدأ به الصلاة، ثم ينصرف.
فتح البارى (450/2)
واستدل به على استحباب الخروج إلى الصحراء لصلاة العيد وأن ذلك أفضل من صلاتها فى المسجد لمواظبة النبى صلى الله عليه وسلم على ذلك مع فضل مسجده.
الدرالمختار وحاشية ابن عابدين (169/2)
وفى الخلاصة والخانية السنة أن يخرج الإمام إلى الجبانة، ويستخلف غيره ليصلى فى المصر بالضعفاء بناء على أن صلاة العيدين فى موضعين جائزة بالاتفاق، وإن لم يستخلف فله ذلك .اهـ .نوح.
الفتاوى الهندية (150/1)
الخروج إلى الجبانة فى صلاة العيد سنة وإن كان يسعهم المسجد الجامع، على هذا عامة المشايخ وهو الصحيح، هكذا فى المضمرات.
(3) بدائع الصنائع فى ترتيب الشرائع (85/3)
وأما شرائط وجوبها وجوازها فكل ما هو شرط وجوب الجمعة وجوازها فهو شرط وجوب صلاة العيدين وجوازها من الإمام والمصر والجماعة والوقت إلا الخطبة فإنها سنة بعد الصلاة.
الدرالمختار وحاشية ابن عابدين (166/2)
(تجب صلاتهما) فى الأصح (على من تجب عليه الجمعة بشرائطها) المتقدمة (سوى الخطبة) فإنها سنة بعدها.
وفى الرد: (قوله فإنها سنة بعدها) بيان للفرق وهو أنها فيها سنة لا شرط وأنها بعدها لا قبلها بخلاف الجمعة .قال فى البحر: حتى لو لم يخطب أصلا صح وأساء لترك السنة ولو قدمها على الصلاة صحت وأساء ولا تعاد الصلاة.
بدائع الصنائع فى ترتيب الشرائع (89/3)
وأما الخطبة فليست بشرط؛ لأنها تؤدى بعد الصلاة وشرط الشىء يكون سابقا عليه أو مقارنا له، والدليل على أنها تؤدى بعد الصلاة ما روى عن ابن عمر أنه قال: صليت خلف رسول الله – صلى الله عليه وسلم – وخلف أبى بكر وعمر – رضى الله عنهما – وكانوا يبدئون بالصلاة قبل الخطبة وكذا روى عن ابن عباس – رضى الله عنهما – أنه قال: صليت خلف رسول الله – صلى الله عليه وسلم – وخلف أبى بكر وعمر وعثمان فبدئوا بالصلاة قبل الخطبة ولم يؤذنوا ولم يقيموا ولأنها وجبت لتعليم ما يجب إقامته يوم العيد والوعظ والتكبير فكان التأخير أولى ليكون الامتثال أقرب إلى زمان

التعليم.

(4) النهر الفائق شرح كنز الدقائق (373/1) ط: دار الكتب العلمية

وإذا لم يشترط السلطان أو نائبه فلا معنى لاشتراط الإذن العام وكأنهم استغنوا بذكر السلطان عنه، على أنا قدمنا أن الإذن العام لم يذكر فى الظاهر.

(5) النهر الفائق شرح كنز الدقائق (373/1) ط: دار الكتب العلمية

نعم بقى أن يقال: من شرائطها الجماعة التى هى جمع والواحد هنا مع الإمام جماعة، فكيف يصح أن يقال: إن شروطه الجمعة.

الدر المختار وحاشية ابن عابدين (166/2)

(تجب صلاتهما) فى الأصح (على من تجب عليه الجمعة بشرائطها) المتقدمة (سوى الخطبة) فإنها سنة بعدها.

وفى الرد: لكن اعترض ط ما ذكره المصنف بأن الجمعة من شرائطها الجماعة التى هى جمع والواحد هنا مع الإمام كما فى النهر.

الفقه على المذاهب الاربعة (531/1)

الحنفية قالوا: صلاة العيدين واجبة فى الأصح على من تجب عليه الجمع بشرائطها، سواء كانت شرائط وجوب أو شرائط صحة، إلا أنه يستثنى من شرائط الصحة الخطبة، فإنها تكون قبل الصلاة فى الجمعة وبعدها فى العيد، ويستثنى أيضاً عدد الجماعة، فإن الجماعة فى صلاة العيد تتحقق بواحد مع إمام، بخلاف الجمعة.

(6) الفتاوى الهندية (150/1)

ويصلى الإمام ركعتين فيكبر تكبيرة الافتتاح ثم يستفتح ثم يكبر ثلاثا ثم يقرأ جهرا ثم يكبر تكبيرة الركوع فإذا قام إلى الثانية قرأ ثم كبر ثلاثا وركع بالرابعة فتكون التكبيرات الزوائد ستا ثلاثا فى الأولى وثلاثا فى الأخرى، وثلاث أصليات تكبيرة الافتتاح وتكبيرتان للركوع فيكبر فى الركعتين تسع تكبيرات ويوالى بين القرائتين وهذه رواية ابن مسعود بها أخذ أصحابنا، كذا فى محيط السرخسي.

ويرفع يديه فى الزوائد ويسكت بين كل تكبيرتين مقدار ثلاث تسبيحات، كذا فى التبيين وبه أفتى مشايخنا، كذا فى الغياثية ويرسل اليدين بين التكبيرتين ولا يضع هكذا فى الظهيرية.

ثم يخطب بعد الصلاة خطبتين، كذا فى الجوهرة النيرة، ويجلس بينهما جلسة خفيفة، كذا فى فتاوى قاضى خان، وإذا صعد المنبر لا يجلس عندنا، كذا فى العينى شرح الهداية، ويخطب فى عيد الفطر بالتكبير والتسبيح والتهليل والتحميد والصلاة على النبى – صلى الله عليه وسلم –، كذا فى التتارخانية.

فقط والله أعلم

كتبہٗ محمد عمران ممتاز

دارالافتاء جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی

24 رمضان المبارک 1441ھ۔ 18 مئی 2020ء

فتویٰ نمبر: 144109203248

الجواب صحیح	الجواب صحیح
محمد شفیق عارف	محمد انعام الحق
۲۴/۹/۱۴۴۱ھ	۲۴/۹/۱۴۴۱ھ

https://www.banuri.edu.pk/readquestion/gharoo-mai-eid-ki-namaaz-ka-hukum-144109203248/22-05-2020

ہندوستان کے بعض مفتیان کا فتویٰ

ہندوستان کے فقہ حنفی سے منسلک ایک دارالافتاء سے موجودہ حالات میں درجِ ذیل فتویٰ جاری ہوا۔

جن مقامات پر جمعہ کی شرائط پائی جاتی ہیں، وہاں موجودہ حالات میں امام کے علاوہ کم از کم تین بالغ مرد ہوں، تو گھروں میں بھی عید کی نماز ہوسکتی ہے۔

مناسب یہ ہے کہ لاک ڈاؤن کے اصول و ضابطوں کی پابندی کرتے ہوئے مسجدوں اور عیدگاہوں میں بھی کچھ لوگ عیدُ الفطر کی نماز ادا کریں۔

حالات کی نزاکت، اربابِ سیاست کی شرارت اور میڈیا کی بدنیتی کو محسوس کرتے ہوئے مسجدوں و عیدگاہوں، یا کسی بھی مقام پر بڑی تعداد میں نمازِ عید کی ادائیگی کی کوشش نہ کی جائے اور نہ ہی اس سلسلے میں حکومت سے کوئی مطالبہ کیا جائے؛ بلکہ جس طرح رمضان کے مقدس مہینے میں ہم نے صبر و تحمل کے ساتھ گھروں میں تراویح پڑھیں اور جمعہ کی نمازیں ادا کی ہیں، اسی طرح عید کی نماز بھی سادگی کے ساتھ، بغیر بھیڑ بھاڑ کے ادا کی جائے۔

لاک ڈاؤن کے موقع پر نمازِ عید کے تعلق سے مذکورہ بالا بنیادی باتوں کے بعد نفسِ

مسئلہ ذیل میں ملاحظہ کریں۔

نمازِ عید الفطر کی ادائیگی کے لئے شہر سے باہر کھلے میدان میں جانا سنت ہے۔

یہ حکم عام صحت منداور غیر معذورین کے لئے ہے؛ لیکن جو لوگ اپنی پیرانہ سالی، یا ضعف و بیماری کی وجہ سے باہر جا کر عید کی نماز ادا نہیں کر سکتے ہیں، ان کے لئے گنجائش ہے کہ وہ شہر ہی میں دوسری جماعت کر کے عید کی نماز اداء کر لیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کمزوروں اور ضعیفوں کے لئے شہر کے اندر ہی الگ سے عیدین کی جماعت کا اہتمام فرماتے تھے۔

جب عام حالات میں ضُعَفاء کے لئے یہ رعایت ہے کہ وہ عیدگاہ جانے کے بجائے شہر کے مسلمانوں کی پنچایت، یا کمیٹی کی ہدایت وانتظام کے مطابق شہر کے اندر مسجد ہی میں عید کی نماز ادا کر لیں، تو آج کے مخصوص حالات میں جن مقامات پر شرائطِ جمعہ پائی جاتی ہیں، اور وہاں جن لوگوں پر جمعہ واجب ہے، ان پر عیدین کی نماز ادا کرنا بھی واجب ہے۔

ایسے مقامات پر لاک ڈاؤن کے عذر کی وجہ سے متعدد مقامات پر عید کی نمازیں ادا کی جاسکتی ہیں، اور ان مقامات میں مسجد کے علاوہ رہائشی مکان، ہال، کارخانہ، دالان، برآمدہ، بیٹھک، رِسَپشن ہال وغیرہ جگہوں پر عیدین کی نماز ادا کی جاسکتی ہے۔

موجودہ صورت میں جماعت میں تقلیل مقصود ہے؛ اس لیے اس طرح گھروں میں تعددِ جماعت، اذنِ عام کی شرط کے منافی نہیں ہے؛ کیوں کہ ان صورتوں میں غلقِ ابواب، ممنوع نہیں ہے۔ کتبِ فقہ میں اس کی تصریحات موجود ہیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ہدایت پر تکلیف سے بچانے کے لئے شہر کے اندر صرف ضُعَفا ومعذورین کی جماعت کی جاتی تھی، جس میں اذنِ عام کی کوئی تصریح نہیں ہے۔ پھر بھی کمزور وضعیف صحابۂ کرام کی نمازوں کی صحت پر کسی صحابی نے

اعتراض اور نکیر نہیں کیا۔ اسی طرح موجودہ حالات میں تکلیف سے بچانے کے لئے تقلیلِ جماعت ہی مقصود ہے، جوکہ اذنِ عام کے منافی نہیں ہے۔

کچھ لوگوں کی طرف سے یہ بات کہی جارہی ہے کہ حکومت کی طرف سے اجازت نہیں ہے۔ یہ بات صحیح نہیں ہے، بلکہ حکومت نے مجمع اور بھیڑ جمع کرنے پر پابندی لگائی ہے، نہ کہ جمعہ وعیدین پر۔

جو عُلماءِ شہر کے مختلف مکانات میں مختصر ٹکڑیوں میں جمعہ وعیدین کو ناجائز کہتے ہیں وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اثر اور غلقِ ابواب کے سلسلے میں فُقہاء کی تصریحات پر سنجیدگی سے غور فرمالیں۔

خطبۂ عید پڑھنا سنت اور سننا واجب ہے۔

شہروں میں شرائط کے پائے جانے پر عیدین میں چھ زائد تکبیروں کے ساتھ دو رکعت نماز اداء کرنا واجب ہے۔

نمازِ جمعہ کے برخلاف عیدین میں خطبہ واجب نہیں، بلکہ سنت ہے۔ اسی طرح عیدین میں، خطبہ، نمازِ دوگانہ کے بعد پڑھا جائے گا۔ اگر کسی وجہ سے خطبہ نہ پڑھا جاسکے، تو بھی عیدین کی نماز ادا ہو جائی گی، البتہ سنت کی فضیلت سے محرومی رہے گی، اور خطبہ چھوڑنا بُرا ہے............۔

کچھ لوگوں نے موجودہ حالات میں عید کی نماز سے منع کر کے کہا ہے کہ لوگ اپنے اپنے گھروں میں، دو، یا چار رکعت چاشت پڑھیں، لیکن یہ بھی کہا ہے کہ چاشت کی نماز، عید کی نماز سے قبل مکروہ ہے، اس لئے جب کہیں شہر میں عید کی نماز ہو جائے، تو پھر چاشت کی نماز پڑھی جائے۔

ان لوگوں کی یہ بات صرف تشویش اور انتشار کا ذریعہ ہے؛ کیوں کہ انہوں نے ایک طرف عید کی نماز کی ادائیگی سے لوگوں کو منع کر دیا ہے۔

دوسری طرف شہر میں کہیں عید کی نماز ہوجانے کے انتظار کی تعلیم دے رہے ہیں، جب عید کی نماز ہے ہی نہیں، تو کہیں عید کی نماز ہوجانے کا کیا مطلب ہے؟ ان کی باتوں میں تضاد اور الجھاؤ ہے۔اس لئے انہیں اپنے موقف کی اصلاح کرنی چاہئے.............۔ فقط

واللہ اعلم بالصواب

کتبہٗ

محمد اشرف قاسمی (خادم الافتاء شہر مہد پور، ضلع اجین۔ایم۔پی)

24 رمضان المبارک 1441ھ، مطابق 18 مئی 2020ء

ashrafgondwi@gmail.com

تصدیق: مفتی عبدالخالق صاحب قاسمی (جامعہ اصحابِ صفہ، مکسی ضلع شاجاپور۔ ایم پی، خلیفہ حضرت مولانا قمرُ الزماں صاحب الہ آبادی مدظلہٗ)

مفتی محمد توصیف صدیقی (معین مفتی: دارالافتاء شہر مہد پور)

(بصیرت آن لائن، 20-05-2020 ''لاک ڈاؤن کے دوران گھروں اور مسجدوں میں عید کی نماز'' دارالافتاء شہر مہد پور، بقلم: مفتی محمد اشرف قاسمی)

(https://www.baseeratonline.com/107406)

مذکورہ بالا فتوے میں اِذنِ عام کے مسئلہ کو بھی سادہ انداز میں حل کردیا گیا ہے، لیکن ہمارے یہاں جمعہ جیسے قطعی ،واجتماعی فریضے سے ،منسلک صرف عند الحنفیہ ، اس چھوٹے سے اجتہادی، وفروعی نکتہ پر بھی کئی ماہ کے عرصہ میں اتفاق نہ ہوسکا اور یہ گتھی نہ سلجھ سکی، اور گومگو، اگر، مگر، چوں، چرا، کی کیفیت سے عوام میں اضطراب، وانتشار الگ پایا جاتا رہا۔

جنرل سیکرٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کا حوالہ

آل انڈیا مسلم، پرسنل لاء بورڈ کے جنرل سیکرٹری، اور امیرِ شریعت بہار، اُڑیسہ، مولانا محمد ولی

رحمانی صاحب نے بھی بروقت مسلمانوں کی اس سلسلہ میں، رہنمائی فرمائی، اور اس کی، بعض ذرائع ابلاغ میں درجِ ذیل طریقہ پر اشاعت ہوئی:

عید کی نماز، اعتکاف پر لوگوں کا اضطراب بڑھتا جارہا ہے اور ہر طرف سے سوال اٹھ رہے ہیں۔

ایسے میں جنرل سیکرٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ، مولانا محمد ولی رحمانی امیرِ شریعت بہار، اڑیشہ و جھارکھنڈ نے واضح پیغام جاری کیا ہے۔

اپنے پیغام میں انھوں نے کہا ہے کہ اندازہ ہے کہ لاک ڈاؤن لمبا کھنچے گا، اور ہم لوگوں کو ان ہی حالات کے اندر رمضان کا آخری عشرہ گزارنا ہے اور عید کی نماز پڑھنی ہے۔ لوگوں کے ذہن میں یہ سوال ہے کہ اعتکاف کے لیے کیا کیا جائے اور عید کی نماز کے سلسلے میں شرعی حکم کیا ہوگا؟ جہاں تک تعلق اعتکاف کا ہے، ان شاء اللہ لوگ اپنی اپنی مسجدوں میں اعتکاف کریں گے، لیکن ان کی تعداد ایک، یا زیادہ سے زیادہ دو فرد کی ہوگی اور وہ اعتکاف کا اہتمام کریں گے۔ ایک مسجد میں اگر ایک آدمی نے بھی اعتکاف کرلیا، تو پورے محلے اور پورے گاؤں کی طرف سے وہ اعتکاف، اللہ کے دربار میں قبول ہوگا اور کسی پر ذمہ داری عائد نہیں ہوگی۔ لیکن یہ خیال رہے کہ رمضان کے اخیر عشرے میں بھی مسجد کے اندر زیادہ مجمع نہ کیا جائے عام طور پر جس طرح تین چار آدمی مسجد میں نماز پڑھتے ہیں، نماز پڑھیں گے، بقیہ لوگ تراویح کی نماز گھروں پر ادا کریں گے، چاہے کسی حافظِ قرآن کے پیچھے مکمل قرآن پڑھیں، یا سورہ تراویح پڑھنے کا اہتمام کریں۔ امیرِ شریعت نے عید کی نماز کے تعلق سے کہا کہ اندازہ ہے کہ عید کا موقع بھی لاک ڈاؤن کے اندر ہی آئے گا۔ عید کی نماز جس طرح پڑھی جاتی رہی ہے، اس سال اس طرح پڑھنے کا موقع نہیں ملے گا۔ مسجدوں میں عید کی نماز، جس طرح جمعہ کی نماز ابھی پڑھی

جارہی ہے، تین چار افراد کے ساتھ، اسی طرح مسجدوں میں عید کی نماز پڑھی جائے گی اور بقیہ لوگ عید کی نماز اپنے گھروں میں اداء کریں گے۔

یہ خیال رہے کہ عید کی نماز کی ادائیگی واجب ہے اور اس میں عید کی نماز کے بعد جو خطبہ دیا جاتا ہے، وہ سنت ہے۔

اس کا بھی خیال رکھا جائے کہ عید کی نماز میں جو کم سے کم تعداد ہے، وہ امام کو چھوڑ کر تین آدمیوں کا ہونا ضروری ہے، اس لیے عید کی نماز میں ایک امام اور تین مقتدی ہوں اور نماز ادا کی جائے۔ گھروں میں جو لوگ عید کی نماز ادا کریں گے، وہ دو رکعت عید کی نماز پڑھیں گے اور دو رکعتوں کے بعد امام صاحب خطبہ دیں گے، چاہے وہ کسی کتاب کو دیکھ کر خطبہ دیں، یا کسی کاغذ پر خطبہ لکھا ہو، اسے دیکھ کر دیں، یا زبانی خطبہ دیں۔ ان شاء اللہ وہ خطبہ معتبر ہے۔ لیکن اگر کسی گھر میں ایسا کوئی آدمی نہیں ہے، جو خطبہ دے سکے، یا خطبہ پڑھ سکے، تو پھر دو رکعت عید کی نماز تکبیراتِ زائدہ کے ساتھ گھر میں پڑھی جائے گی اور کیوں کہ کوئی خطبہ جاننے والا، پڑھنے والا موجود نہیں ہے، اس لیے بغیر خطبے کے نماز ادا کی جائے گی۔ اور اگر عید کی نماز کی امامت کرنے والا بھی گھر میں کوئی نہیں ہے، تو ایسی شکل میں گھر کا ہر آدمی چار رکعت نفل نماز ادا کرے۔ جس طرح چاشت کی نماز پڑھی جاتی ہے، لیکن یہ بات ذہن میں رہے کہ یہ عید کی قضاء نہیں ہے، بلکہ یہ اللہ کے دربار میں سر جھکانا ہے، جس میں فائدہ ہی فائدہ ہے اور اس کا پڑھنا مستحب ہے (ملت ٹائمز ''عید اور اعتکاف پر امیر شریعت مولانا محمد ولی رحمانی کا پیغام'' 14-05-2020، الہلال، میڈیا، مونگیر، ۱۴ مئی ۲۲۲۰، آئی این ایس انڈیا)

(https://urdu.millattimes.com/archives/56142)

ملاحظہ فرمایئے کہ مندرجہ بالا بیان میں کس حکمت وبصیرت کے ساتھ مسلمانوں کی رہنمائی کی گئی ہے، اور ان کو مایوسی و پریشانی سے بچنے، بچانے کا اہتمام کیا گیا ہے۔

مفتی خلیل الرحمٰن قاسمی کا حوالہ

ہندوستان کے ایک اور مفتی خلیلُ الرحمٰن قاسمی برنی صاحب نے نمازِ عید کے سلسلے میں درجِ ذیل حکم بیان کیا:

اگر لاک ڈاؤن جاری رہتا ہے اور عید کی نماز عید گاہوں اور مساجد میں پڑھنے کی اجازت نہیں ملتی، تو یہ نماز بھی جمعہ ہی کی طرح گھروں میں پڑھ لی جائے۔ جو شرائط جمعہ کی نماز کے لئے ہیں، عیدین کی نماز میں ان شرائط کا لحاظ کیا جانا ضروری ہے۔ مثلاً جمعہ کے لئے جماعت شرط ہے، تو عید کی نماز کے لیے بھی جماعت شرط ہے۔ جمعہ کی نماز کے لئے امام کے علاوہ تین مقتدی کل چار افراد ہونے چاہییں، اسی طرح عید کی نماز کے لئے بھی امام کے علاوہ تین مقتدی ضروری ہیں، یعنی امام کو شامل کر کے کم از کم چار افراد ہونے ضروری ہیں۔

عید کی نماز میں خطبہ چوں کہ سنت ہے، اس لئے اگر خطبہ نہ دیا گیا، تو نماز ہو جائے گی۔ اس لئے اگر کوئی خطبہ دینے والا نہ ہو، صرف نمازِ عید ہی پڑھا سکتا ہو، تو نمازِ عید ہی پر اکتفا کریں۔ واضح رہے کہ عید کی نماز میں اذان و اقامت نہیں ہے۔

جو لوگ نماز عید بالکل ہی نہ پڑھ سکیں، تو وہ اس کی جگہ چار رکعت نماز چاشت پڑھ لیں۔ یہ نمازِ چاشت، عید کا بدل نہیں ہے۔ بلکہ بعض فقہاء کے نزدیک عید نہ پڑھ سکنے والوں کے لئے ایک مستحب عمل ہے“ (ہندوستان اردو ٹائمز، ”موجودہ حالات میں عید کی نماز کہاں پڑھیں اور کیسے پڑھیں“ 04-05-2020، ”ڈیلی ہنٹ“ 04-05-2020 ”موجودہ حالات میں عید کی نماز کہاں پڑھیں اور کیسے پڑھیں“)

(https://hindustanurdutimes.com/404-مقالات-و-مضامین)
https://m.dailyhunt.in/news/india/urdu/
baseerat+online-epaper-baonline/-newsid-n278012354

ڈاکٹر محمد نجیب سنبھلی قاسمی کا حوالہ

ہندوستان کے ڈاکٹر محمد نجیب سنبھلی قاسمی نے بھی اس سلسلہ میں درجِ ذیل بیان جاری کیا:

’’عید کی نماز، عیدگاہ اور مساجد میں ادا کی جاتی ہے، مگر لاک ڈاؤن کی وجہ سے عید الفطر کی نماز بھی جمعہ کی طرح گھروں میں ادا کی جائے گی، جس کے لئے امام کے علاوہ تین افراد کافی ہیں۔ عید کی نماز بالکل نہ پڑھنے کے مقابلہ میں گھروں میں ادا کرنا بہتر ہے۔ جن بعض علماء کو گھروں میں نمازِ جمعہ کی ادائیگی میں اختلاف بھی تھا، انہیں بھی لاک ڈاؤن میں گھروں میں نماز عید الفطر کی اجازت دینی چاہیے تاکہ مسلمان اس وقت مایوس نہ ہوں، بلکہ وہ کم از کم گھروں میں نماز عید پڑھ کر اپنے آپ کو کسی حد تک مطمئن کر سکیں‘‘ (اردو نیٹ جاپان ’’کورونا وبائی مرض کے سائے میں نمازِ عید کیسے پڑھیں؟‘‘ 19-05-2020)

(http://www.urdunetjapan1.com/2020/05/19/dr-mhd-najeeb-qasmi-india/)

ملاحظہ فرمایئے کہ مذکوہ بیان میں مسلمانوں کی مایوسی اور پریشانی کو دُور کرنے کا کتنا لحاظ کیا گیا ہے۔

چند علمائے ہند کا متفقہ فیصلہ

اس کے علاوہ ہندوستان کے متعدد علماء نے، پولیس انتظامیہ کے ساتھ مذاکرات کر کے اس سلسلہ میں گھروں کے اندر جمعہ کے جواز کا حکم بیان کیا، جس کے متعلق اخبارات میں درجِ ذیل خبر شائع ہوئی:

’’مالیگاؤں، دھولیہ، ناندیڑ اور دیگر شہروں میں نمازِ عید گھروں پر ہی پڑھنے پر اتفاق ہو گیا ہے۔

اس سلسلے میں مالیگاؤں میں محکمہ پولیس کی جانب سے منعقدہ نشست سے خطاب

کرتے ہوئے، بزرگ عالمِ دین مولانا عبدالحمید ازہری نے کہا کہ اسباب و وسائل کے باوجود آج اس بات کی ضرورت ہے کہ عید کی نماز عیدگاہوں پر اداء نہ کی جائے، بلکہ سرکاری انتظامیہ کے ساتھ مکمل تعاون کر کے گھروں پر ہی اداء کی جائے۔

نمازِ عید کے لئے عیدگاہوں، یا مساجد میں اجازت دیئے جانے کی بابت محکمہ پولیس نے مشاورتی نشست منعقد کی۔

پہلی نشست میں عبدالمالک سیٹھ بکراوالا اور حاجی یوسف الیاس کی جانب سے موقف پیش کیا۔

مفتی اعظم ہند عیدگاہ کی جانب سے شکیل احمد سبحانی نے پہلی نشست میں اعلان کیا کہ نمازِ عید، مفتی اعظم عیدگاہ مالیگاؤں میں ادانہیں کی جائیگی۔

رکن اسمبلی مفتی محمد اسماعیل قاسمی نے نمازِ عید کی افادیت بتائی۔

اس معاملے میں دوسری نشست بے نتیجہ رہی، البتہ مئی کی شب ساڑھے دس بجے اے۔ٹی۔ٹی۔ہائی اسکول گراؤنڈ میں تیسری نشست میں پولیس انتظامیہ اور عیدگاہوں کے ٹرسٹیان کے درمیان طے پایا کہ نمازِ عید کی ادائیگی گھروں میں کی جائے۔

ادھر دھولیہ ضلع کے سرپرست وزیر عبدالستار جمعرات کو ضلع کے دورہ پر آئے تھے۔ ان کی صدارت میں ضلع کلکٹر دفتر کے اجلاس ہال میں شہر کے سرکردہ افراد اور عوامی نمائندوں کی میٹنگ عمل میں آئی۔

اس دوران شہر کے رکن اسمبلی ڈاکٹر فاروق شاہ، سابق ڈپٹی میئر شوال امین، الحاج صابر سیٹھ، منظور انصاری، کارپوریٹر امین پٹیل و دیگر نے شہر کے مسلمانوں کی جانب سے مسائل پیش کئے، لیکن یہ بھی یقین دلایا کہ حالات کے پیشِ نظر

مسلمان اپنے اپنے گھروں میں ہی عید الفطر کی نماز اداء کریں گے۔

ادھر نانڈیڑ میں ضلع پولیس انتظامیہ کے ساتھ علمائے کرام کی ایک میٹنگ کا انعقاد کیا گیا۔

میٹنگ کا انعقاد آل انڈیا امام کونسل اور جمعیۃ علماء کی جانب سے کیا گیا تھا۔

میٹنگ میں ضلع ایس۔پی۔ وجئے کمار اور دیگر افسران موجود تھے۔

جبکہ ضلع اور شہر کے علماءِ کرام میں مولانا ایوب قاسمی، مولانا عبدالحسیب قادری، قاضی محمد رفیق وغیرہ موجود تھے، اس کے علاوہ سینئر قانون داں ایڈوکیٹ۔ ایم۔ زیڈ۔ صدیقی اور سماجی کارکن مسعود حسین کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔

ان سب ہی نے نمازِ عید گھر پر ہی ادا کرنے پر اتفاق کیا'' (''انقلاب، ممبئی'' مالیگاؤں، دھولیہ اور نانڈیڑ سمیت متعدد شہروں میں عید کی نماز گھروں پر ہی ادا کرنے کا فیصلہ، 2020-05-23)

شریعت کونسل، جماعتِ اسلامی ہند کا فیصلہ

جماعتِ اسلامی، ہندوستان نے اس سلسلہ میں عیدُ الفطر کے موقع پر درجِ ذیل اعلان کیا:

''کورونا وائرس سے نپٹنے کے لیے حکومتی سطح پر مارچ کے اواخر میں لاک ڈاؤن کا جو اعلان کیا گیا تھا اور مذہبی مقامات پر جمع ہونے کی جو پابندی عائد کی گئی تھی، اس کا سلسلہ دراز ہوتا گیا، اس کے نتیجے میں ماہِ رمضان المبارک میں بھی پنج وقتہ نماز، اسی طرح جمعہ اور تراویح کی نمازیں محدود رہیں اور مسلمان گھروں پر ہی انفرادی اور اجتماعی طور پر انھیں ادا کرتے رہے۔ امکان ہے کہ یہ سلسلہ ابھی کچھ اور دن جاری رہے گا۔ چنانچہ سوال کیا جا رہا ہے کہ اس صورتِ حال میں رمضانُ المبارک کے آخری دنوں کے معمولات کیسے ہوں؟ اور نماز کیسے ادا کی جائے؟ اس مسئلے پر غور وخوض کرنے کے لئے شریعہ کونسل جماعتِ اسلامی ہند کے صدر

مولانا سید جلال الدین عمری اور کونسل کے سکریٹری ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی کی نگرانی میں ایک نشست منعقد ہوئی اور کونسل کی جانب سے درجِ ذیل فیصلے کیے گئے:

1- رمضانُ المبارک کا ایک اہم عمل صدقۃُ الفطر کی ادائیگی ہے، یہ ہر صاحبِ حیثیت مسلمان پر اپنی طرف سے اور گھر کے تمام افراد کی طرف سے واجب ہے۔ رمضان کے آخری دنوں میں اسے ضرور ادا کرنا چاہیے، اس کی مقدار کھجور، کشمش، پنیر اور جَو میں ایک صاع (ساڑھے تین کلو) اور گیہوں میں نصف صاع (پونے دو کلو) ہے۔ اس کی قیمت بھی نکالی جاسکتی ہے۔ نصف صاع گیہوں کی قیمت چالیس روپے ہے۔ حسبِ استطاعت اس میں اضافہ کیا جاسکتا ہے۔

2- رمضانُ المبارک کے آخری عشرہ کی طاق راتوں میں سے کسی رات میں شبِ قدر ہوسکتی ہے۔ اس لیے ان میں عبادات (نوافل، تلاوتِ قرآن، اذکار اور دعا وغیرہ) کا اہتمام کیا جائے۔

3- رمضان المبارک کا آخری جمعہ (جمعۃ الوداع) دیگر جمعوں کے مثل ہے۔ اس کی کوئی خصوصی فضیلت نہیں ہے۔ موجودہ حالات میں گھروں میں اگر چار افراد ہوں، تو وہ باجماعت نمازِ جمعہ، یا نمازِ ظہر پڑھ سکتے ہیں، کوئی شخص تنہا ہو، تو وہ انفرادی طور پر ظہر پڑھ لے۔

4- موجودہ حالات میں عید الفطر کی نماز عیدگاہوں، جامع مساجد اور محلے کی مساجد میں (جتنے لوگوں کی اجازت ہو) اداء کی جائے۔

گھروں میں اگر چار افراد ہوں، تو وہ عید کی نماز دو رکعت زائد تکبیرات کے ساتھ باجماعت پڑھیں۔

نماز کے بعد خطبہ دیا جاسکتا ہے، لیکن ضروری نہیں۔ چار افراد نہ ہوں، تو چار رکعت

نفل تنہا پڑھ لی جائے۔

5- رمضان کے آخری دنوں میں خریداری کے لیے بازاروں میں بھیڑ لگانے سے حتی الامکان گریز کیا جائے۔ عید کے دن نئے یا پرانے صاف ستھرے کپڑے، جو بھی میسر ہوں، زیبِ تن کیے جائیں اور اللہ کا شکر ادا کیا جائے۔

6- عید کے دن گھومنے پھرنے اور ملاقات ومبارک باد کے لیے زیادہ اِدھر اُدھر جانے سے اجتناب کیا جائے۔ عید کی خوشیوں میں غریبوں اور ناداروں کا، خاص طور پر مسلم قیدیوں کا جیلوں میں اور ان کے پریشان حال گھر والوں کا خیال رکھا جائے۔

7- دعا کی جائے کہ اللہ تعالیٰ کورونا کی مہلک بیماری سے جلد از نجات دے اور معمول کی زندگی لوٹ آئے۔

شریعہ کونسل جماعتِ اسلامی ہند حکومت اور انتظامیہ سے مطالبہ کرتی ہے کہ چوتھے لاک ڈاؤن میں عبادت گاہوں کو پابندی سے مستثنیٰ کیا جائے اور ان میں سماجی فاصلہ برقرار رکھتے ہوئے معمول کے مطابق عبادت کرنے کی اجازت دی جائے۔

سید جلال الدین عمری (صدر) محمد رضی الاسلام ندوی (سکریٹری)

(شریعہ کونسل، جماعت اسلامی ہند، D-321، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی 25، رمضان المبارک ۱۴۴۱ھ، مئی 2020ء)

مختلف تنظیموں کا فیصلہ

اس کے علاوہ ہندستان کی ''جمعیت علمائے ہند، جماعتِ اسلامی، جمعیت اہلِ حدیث، سمیت تمام بڑی مسلم تنظیموں کی جانب سے'' اس سلسلہ میں اجتماعی اور متفقہ فیصلہ کیا گیا، جو ذرائع ابلاغ پر درجِ ذیل طریقہ پر شائع ہوا:

نئی دہلی، 27 مارچ (یواین آئی) جمعیت علمائے ہند، جماعتِ اسلامی، جمعیتِ اہلِ حدیث سمیت تمام بڑی مسلم تنظیموں کی جانب سے ملک بھر میں کورونا وائرس اور لاک ڈاؤن کے خطرات کے پیشِ نظر، نمازِ جمعہ سمیت ہر دن پڑھی جانے والی پانچ وقت کی نمازوں کو اپنے اپنے گھروں میں ادا کرنے کی اپیل کے بعد یہ پہلا جمعہ تھا جب اس کا ملا جلا اثر دیکھنے کو ملا۔

دارالحکومت کے سبھی علاقوں کی مسجدوں میں جمعہ کی اذان ہوئی اور مسجد کے امام اور مؤذن سمیت چار، چھ لوگوں نے نماز ادا کی۔

سبھی لوگوں نے اس پر سختی سے عمل کیا اور سب نے اپنے گھروں میں نماز پڑھی (یو این آئی اردو سروس ''کورونا کے خطرے کے پیشِ نظر لوگوں نے اپنے گھروں میں نماز ادا کی''

(27-05-2020

(http://www.uniurdu.com/news/national/story/1931746.html)

ملاحظہ فرمائیے کہ ہندوستان کی تمام بڑی مسلم تنظیموں نے اتفاقِ رائے کے ساتھ کس طرح سے فیصلے کیے، جو ہمارے ملک کے جملہ طبقات کے لئے باعثِ عبرت، اور آئینہ نمائی کا ذریعہ ہیں۔

مولانا مفتی اطہر شمسی کیرانہ کا حوالہ

مولانا مفتی اطہر شمسی کیرانہ، ہندوستان کا درجِ ذیل بیان، ذرائع ابلاغ میں شائع ہوا:

کیرانہ 23/مارچ (یو۔این۔آئی) القرآن اکیڈمی کے ڈائریکٹر مولانا مفتی اطہر شمسی صاحب نے ملت پر زور دیا ہے کہ وہ کورونا قہر کے پیشِ نظر، عین قرآنی تعلیم کی روشنی میں عافیت پسندانہ قدم اٹھاتے ہوئے، نمازیں اپنے گھروں پر ہی ادا کریں۔

انہوں نے کہا کہ قرآن کی سورۃ بقرہ آیت نمبر 185 میں کہا گیا ہے کہ اللہ

تمہارے ساتھ مشکل نہیں چاہتا، وہ تمہارے ساتھ آسانی چاہتا ہے۔
مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ اس آیت پر غور کریں اور نمازیں اپنے گھروں پر ہی ادا کریں۔
مولانا مفتی شمسی نے کہا کہ مساجد کو آباد رکھنے کی اس وقت بہتر صورت یہ ہوگی کہ امام اور مؤذن مسجدوں میں جماعت کے ساتھ نماز ادا کرتے رہیں، باقی لوگ اپنے گھروں میں نماز پڑھیں۔
اُنہوں نے مشکل پسندی کو ہی دین تصور کر لینے کی سوچ سے باہر نکلنے کی تلقین کرتے ہوئے کہا کہ یہ ایک خودساختہ تصور ہے، جس سے ملت کو فوری طور پر باہر نکلنا چاہئے اور دین کی اصل حقیقت کو سمجھنا چاہیے، جو فطرتِ آسانی پر مبنی ہے۔
مولانا مفتی اطہر شمسی نے واضح کیا کہ ایک بار پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جذام کا ایک مریض بیعت کرنے کے لئے حاضر ہوا۔ آنحضور نے اس سے ہاتھ نہیں ملایا اور فاصلے سے ہی بیعت قبول کر لی۔ یہ کراہیت ہرگز نہیں، بلکہ احتیاط ہے، جو عین فطری ہے۔
مولانا مفتی شمسی نے کہا کہ ان تعلیمات سے واضح ہوگیا کہ لوگوں کو متعدی امراض سے بچاؤ کی تمام تدابیر اختیار کرنی چاہئیں اور احتیاطی تدابیر کو دین کے خلاف نہیں سمجھنا چاہیے (یو۔این۔آئی۔ ''کورونا: قرآن عافیت پسندی کی تعلیم دیتا ہے، نماز گھر پڑھیں: مفتی اطہر شمسی'' 23-05-2020)

(http://www.uniurdu.com/news/regional/story/1926715.html)

پروفیسر محمد مشتاق تجاروی کا حوالہ

جامعہ ملیہ اسلامیہ ملیہ، دہلی کے شعبہ اسلامک اسٹڈیز کے اسسٹنٹ پروفیسر محمد مشتاق تجاروی کا درجِ ذیل مضمون ذرائع ابلاغ میں شائع ہوا:

اس وقت کرۂ ارض کا پورا محیط مقفل ہے، اگر چہ اب کہیں ہلکی پھلکی چہل پہل شروع ہو رہی ہے، لیکن ایک ایسا وقت گزرا ہے کہ 90 فیصد تک انسان کی ساری مصروفیات اس کے گھر تک محدود ہو گئیں تھیں اور یہ ناگزیر بھی تھا۔ اس لیے کہ کورونا وائرس کی یہ بیماری انسانوں کے کندھوں پر سفر کرتی ہے۔ بلکہ تمام وبائی امراض اسی طرح پھیلتے ہیں۔ ایک جلیل القدر صحابی حضرت عمرو بن عاص نے طاعون کے بارے میں کہا تھا کہ یہ آگ کی طرح ہے۔ یعنی وبائی امراض آگ کی طرح ہوتے ہیں۔ جب تک ان کو ایندھن ملتا رہے گا، وہ پھیلتے رہیں گے اور جب ان کو چاروں طرف سے اس طرح محدود کر دیا جائے گا کہ دوسرے انسانوں تک اس کی رسائی نہ ہو، تو وہ وبا اپنی موت آپ مر جائے گی۔

کورونا وائرس کی اس وبا میں بھی اسی لیے لاک ڈاؤن کیا گیا کہ اس وائرس کی چین ٹوٹ جائے، اس لیے اسکول بند ہوئے، یونیورسٹیاں بند ہوئیں، جہاز بند ہوئے، بازار بند ہوئے، ٹرینیں رک گئیں اور سڑکیں ویران ہو گئیں، مسجدوں میں جماعت کی نماز محدود کر دی گئی، مذہبی اور غیر مذہبی ہر طرح کی تقریبات پر پابندی عائد کر دی گئی۔

عیدُ الفطر مسلمانوں کے دو عظیم تہواروں میں سے ایک ہے۔ چوں کہ یہ رمضانُ المبارک کے بعد آتا ہے، اس لیے اس کی خوشیاں بھی زیادہ ہوتی ہیں۔ لیکن اس وقت لاک ڈاؤن کے دور میں، بلکہ لاک ڈاؤن میں کہیں ڈھیل بھی ہو، تب بھی عیدالفطر کو اس روایتی جوش کے ساتھ منانا کہیں کسی ناخوشگوار حادثہ کا پیش خیمہ نہ بن جائے، اس لیے اس کی ضرورت ہے کہ ہم اس خوشی کے موقع کو پوری خوشی کے ساتھ منائیں، لیکن ہماری خوشیاں کسی غم کا موجب نہ بن جائیں، اس لیے اپنے گھروں میں رہیں۔ عیدگاہ نہ جائیں اور نہ علاقے کی مساجد میں جائیں، بلکہ عیدالفطر کی نماز کے لیے مثالی احتیاط کا ماحول قائم کر کے اس کا ثبوت دیں کہ

آپ زندہ اور باشعور لوگ ہیں اور وقت کے تقاضوں سے بے خبر نہیں ہیں۔

1: عیدالفطر کی نماز واجب ہے اور عیدالفطر کا خطبہ سنت ہے۔

عیدالفطر کے لیے جمعہ کی طرح یہ شرط ہے کہ امام کے علاوہ کم از کم تین مرد ہوں، تو جن گھروں میں چار مرد ہیں اور پہلے سے ایک ساتھ رہ رہے ہیں، ان کو اجازت ہے کہ وہ اپنے گھر میں عید کی نماز اداء کرلیں۔ اس کا طریقہ وہی ہوگا، جو عام طور پر عید کا ہوتا ہے۔ یعنی چھ زائد تکبیروں کے ساتھ ادا کریں۔ اگر خطبہ یاد ہو، یا دیکھ کر پڑھ سکتے ہوں، تو خطبہ پڑھ لیں۔ لیکن اگر خطبہ یاد نہ ہو، تو پہلے خطبے میں اللہ کی حمد وثنا، سورہ فاتحہ پڑھ لیں اور دوسرے میں درود شریف پڑھ لیں۔

2: اگر ایک گھر میں چار مرد نہ ہوں، تو انفرادی طور پر چاشت کی نماز پڑھیں۔ البتہ اس کے لیے پورا اہتمام کریں۔ نہا دھو کر صاف ستھرے کپڑے پہنیں، گھر میں خوشبو ہو، تو خوشبو لگائیں، اہتمام کے ساتھ دو دو رکعت کر کے چار رکعت نماز ادا کریں۔ یہ نماز عید کے قائم مقام ہوگی۔ اس میں چھ زائد تکبیریں کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ چوں کہ یہ نفل ہے، اس لیے ان کو انفرادی طور پر بھی پڑھا جا سکتا ہے اور جماعت بھی کی جا سکتی ہے۔ البتہ جماعت نفل نماز کی ہوگی، عید کے دوگانہ کی نہیں، چوں کہ اس کے لیے امام کے علاوہ کم از کم تین لوگوں کا ہونا ضروری ہے اور اس میں خطبہ بھی نہیں ہوگا۔

3: عید کے دن بھی ان تمام چیزوں کا اہتمام کریں، جن کا اہتمام ہم روزانہ کر رہے ہیں، جیسے کسی سے ملنے نہ جائیں، کوئی پڑوسی سامنے پڑ جائے، تو فاصلے سے بات کریں، زبان سے مبارک باد دیں، لیکن ہاتھ نہ ملائیں۔ سوئیاں، شیر وغیرہ اپنے گھر بنائیں اور خود ہی کھائیں، نہ کسی کے گھر جائیں اور نہ کسی کے گھر اپنے گھر سے کچھ بھیجیں، اور اگر کوئی بھیجے، تو محبت سے اس کو بھی سمجھا دیں۔

4: عید سے قبل جمعۃ الوداع بھی باقی ہے۔لیکن جمعۃ الوداع کی اصل اہمیت یہی ہے کہ وہ جمعہ ہے اور رمضان المبارک کا جمعہ ہے۔اس میں الگ سے کوئی اہتمام نہ کریں، بلکہ جیسے دوسرے جمعے ادا کیے جارہے ہیں، جمعۃ الوداع کو بھی اسی طرح اداء کریں۔

اس وقت دنیا کی جو صورتِ حال ہے، وہ تو استثنائی ہے، ماضی میں ایسے حالات شاید کبھی نہیں آئے۔

لیکن فقہاء نے اپنی کتابوں میں مختلف طرح کی امکانی صورتوں پر بھی بحث کی ہے، ان کی روشنی میں آج کے ان مشکل مسائل کے لیے رہنمائی مل جاتی ہے۔

اس لیے اس موقع پر ان علماء وفقہاء کے لیے خاص طور پر دعاء کریں، جنھوں نے ساری عمر دین وشریعت کی تفہیم اور اس کی اشاعت میں صرف کردی۔

دوسرا کام یہ کریں کہ عیدالفطر کا موقع بھی قبولیتِ دعاء کا موقع ہے۔اپنے لیے ساری امت کے لیے اور پوری دنیائے انسانیت کے لیے دعاء کریں۔

اور اللہ سے دعاء کریں کہ اللہ اس وبا سے ساری دنیا کو نجات عطا فرمائے۔

(قومی آواز' لاک ڈاؤن میں عیدالفطر کی نماز ... محمد مشتاق تجاروی' 20-05-2020)

https://www.qaumiawaz.com/social/eid-ul-fitr-prayer-during-lockdown-column-by-md-mushtak-tijarvi

مذکورہ بالا بیانات سے بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ عوام کے دینی اقدار کی کس قدر رعایت کی گئی ہے، اور ہر قسم کی ٹھیس پہنچانے سے گریز کیا گیا ہے۔

مولانا مفتی محمد تقی عثمانی کا حوالہ

یہاں پہنچ کر حال ہی میں سوشل میڈیا پر وائرل ہونے والی حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب زید مجدہٗ کی ایک آڈیو کال دستیاب ہوئی، جس میں، مولانا نبیل صاحب کو خطاب

کرتے ہوئے مفتی صاحب موصوف نے فرمایا کہ:

’’جس مسجد میں پانچ آدمی ہیں، اُن کی نمازِ عید تو ہو جائے گی۔

لیکن حنفیہ کے نزدیک گھر میں عید کی نماز پڑھنا درست نہیں ہے۔

البتہ بعض دوسرے مذاہب میں گھر میں نمازِ عید پڑھنے کی گنجائش ہے۔

اگر کوئی نہ پڑھنے کے مقابلہ میں، دوسرے ائمہ کے قول پر عمل کرتے ہوئے گھر میں عید کی نماز پڑھ لے، تو بھی ٹھیک ہے، یعنی مطلب یہ ہے کہ ان شاء اللہ، امید ہے کہ کوئی گناہ نہیں ہوگا۔

البتہ عید کا جو ایک مقصود ہے، یعنی اسلام کے شعائر میں سے ہونا، میرے خیال میں اس کے پیشِ نظر نمازِ عید کو گھروں میں پڑھنے کی رِیت ڈالنا درست نہیں ہے۔

اور جہاں گھروں میں، ہو رہی ہے، تو اُن کی نمازِ عید تو ہو ہی جائے گی۔

لیکن مجھے گھروں میں عید کی نماز پڑھنے کے بارے میں تردُّد ہے۔

لیکن بعض دوسرے ائمہ کا قول، چونکہ موجود ہے، اس لیے اگر کوئی کرلے، تو اس کو ملامت بھی نہیں کرنی چاہئے۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ‘‘

(صوت العلماء Eid ki Namaz ghar par parh sakty he? 23 May 2020)

(http://www.videomuzik.biz/video/Rahmatullah Ashrafi)

مذکورہ بالا بیان میں جو پانچ آدمیوں کی قید لگائی گئی ہے، وہ غالباً حکومتی اعلان اور سائل کے سوال کے مطابق ہے، ورنہ حنفیہ کے راجح قول کے مطابق امام سمیت چار افراد کا ہونا کافی ہے، جبکہ حنفیہ کا ایک قول امام سمیت تین افراد کے کافی ہونے کا بھی ہے، جس کے متعلق پہلے باحوالہ وضاحت گزر چکی ہے، اور آگے بھی آتی ہے۔

اور مذکورہ بیان میں حنفیہ کے نزدیک جو گھر میں نمازِ عید کے درست نہ ہونے، اور پھر اس پر تردُّد کا اظہار فرمایا گیا ہے، اس کی کوئی واضح علت ذکر نہیں کی گئی۔

اس پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر مسجد میں چند افراد کے ساتھ حنفیہ کے نزدیک عید کی نماز درست ہوسکتی ہے، تو اتنے ہی افراد کے ساتھ حنفیہ کے نزدیک گھروں میں نمازِ عید کے درست ہونے میں کیا شبہ اور ان میں ما بہ الفرق کیا ہے؟

مسجد اور غیر مسجد، اور عمارت وغیر عمارت میں جب فقہائے کرام نے کوئی فرق نہیں کیا، تو اس فرق کی وجہ بیان کرنے کی ضرورت ہے؟

اگر اس کی وجہ گھروں میں نمازِ عید پڑھ لینے کی رِیت اور رواج پڑ جانے کا خدشہ ہو، جس کا مذکورہ بالا بیان میں ذکر بھی ہے، تو یہ ایک مجبوری والی اور عارضی صورت ہے، اسی لیے، جن فقہائے کرام کے نزدیک صراحت کے ساتھ گھروں میں عید کی نماز کو جائز قرار دیا گیا، اور اُن کا مذکورہ بالا بیان میں بھی ذکر ہے، ان فقہاء نے مجتہدِ مطلق ہونے کے باوجود، اس خدشہ کا اعتبار نہیں فرمایا، اور نہ ہی ان کے مسلک پر چلنے والوں نے عام حالات میں اس کو رواج دیا، اسی لیے ان کے علماء وحکمرانوں نے موجودہ مخصوص صورتِ حال میں عوام کو گھروں میں پڑھنے کی بار بار تلقین وتبلیغ کی۔

دوسرے کسی خدشہ کی وجہ سے نمازِ عید کے درست نہ ہونے کا حکم لگانا، محلِ نظر ہے، بالخصوص جبکہ متعدد روایات وآثار سے بھی گھروں میں نمازِ عید کے جواز کا ثبوت ہوتا ہو۔

اور اگر اس فرق کی وجہ عندالحنفیہ اِذنِ عام وغیرہ کا نہ ہونا ہو، تو اس پر حنفیہ کی طرف سے مفصَّل کلام گزر چکا ہے، یہی وجہ ہے کہ ہندوستان وغیرہ میں بسنے والے متعدد حنفی علماء واصحابِ افتاء اور اہلُ الرائے حضرات نے گھروں میں نمازِ عید کے جواز کا واضح حکم بیان کیا ہے، اور بہت سے حضرات نے اس کی وجوہات کا بھی ذکر کیا ہے۔

اس لیے مندرجہ بالا بیان میں جہاں مذکورہ بالا خدشہ محلِ نظر ہے، اسی طرح حنفیہ کے نزدیک گھروں میں نمازِ عید کے نادرست ہونے کا حکم لگانا بھی محلِ نظر ہے۔

تاہم مذکورہ بالا بیان میں تشدُّد کے موجودہ ماحول میں یہ توسُّع بہت اہمیت کا حامل ہے کہ

دوسرے فقہائے کرام کے قول پر عمل کرنے والوں کی نماز کو درست قرار دیا گیا ہے، اور ان پر ملامت سے منع کیا گیا ہے۔

فجزاھم اللّٰہ تعالیٰ خیر الجزاء۔

اور ہم نے گھروں میں نمازِ عید کے درست ہونے اور قابلِ ملامت نہ ہونے کی باحوالہ توضیح وتشریح بھی ذکر کردی ہے، جیسا کہ آگے آتا ہے۔

مذکورہ بالا تحریرات، عبارات، بیانات اور فتاویٰ جات سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ دنیا بھر کے، متعدد مقتدر، سنجیدہ طبقات نے اس سلسلہ میں کس قدر، حکمت وبصیرت پر مشتمل، بروقت، انفرادی واجتماعی فیصلے کیے۔

لیکن ہمارے یہاں لاک ڈاؤن کا عرصہ اور ماہِ رمضان کا پورا مبارک مہینہ اسی کش مکش میں گزر گیا، نہ اَصحابِ علم میں کوئی اتفاق ہوسکا، نہ عوام کا اضطراب اور تشویش ختم ہوسکی۔ [1]

---

[1] چنانچہ اَواخرِ مارچ میں بی بی سی، اُردو میں یہ خبر شائع ہوئی کہ:

پاکستان میں نمازِ جمعہ اور باجماعت نمازوں کے اجتماعات محدود رکھنے کی حکومتی ہدایات کے ردعمل میں لوگ اپنی رائے کا اظہار کر رہے ہیں کہ آیا کورونا وائرس سے بچاؤ کے لیے کیے جانے والے یہ حفاظتی اقدامات درست ہیں یا نہیں۔

اس حوالے سے سوشل میڈیا پر جمعہ مبارک (Jummah Mubarak) مساجد (Mosques) اور جمعہ (Juma) جیسے الفاظ ٹرینڈ کر رہے ہیں۔

مساجد پر پابندی نامنظور کے نام سے ایک ٹرینڈ ایسا بھی ہے، جس میں لوگ اس ہدایت کی مخالفت کر رہے ہیں۔

دوسری طرف پرے فرام ہوم (Pray from home) یعنی گھر میں نماز پڑھیں بھی ٹرینڈ کر رہا ہے، جس میں لوگوں سے مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ وہ اپنی رہائش گاہوں میں قیام کرتے ہوئے نماز ادا کریں اور مساجد میں جانے سے گریز کریں، کیونکہ اس سے کووڈ 19 کے پھیلاؤ کا خدشہ ہے۔

بعض لوگوں کا کہنا تھا کہ حکومتی ہدایات کے باوجود مساجد میں بڑی تعداد میں لوگ نمازِ جمعہ کی ادائیگی کے لیے موجود تھے (بی۔بی۔سی۔اردو۔۲۷، مارچ ۲۰۲۰ء)

(https://www.bbc.com/urdu/pakistan-52061647)

اور جب ملکِ پاکستان میں حکومت اور مختلف مکاتبِ فکر کے علمائے کرام کے مابین SOP، کے تحت، مساجد میں نمازیں

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

ہمارے یہاں اب تک پورے لاک ڈاؤن کے عرصہ، بلکہ ماہِ رمضان کے مبارک مہینے میں ذرائع ابلاغ اور سوشل وغیر سوشل میڈیا پر، کیا کچھ ہوتا رہا، کتنے مسلمان زخمی ہوئے، کتنے علماء اور عوام پر کیس بنے، پکڑ دھکڑ، گرفتاریاں، پتھراؤ، گھیراؤ، ایک دوسرے کے خلاف بدکلامی، بدزبانی، طعن وتشنیع، سبّ وشتم، غیبت، جھوٹ، بہتان، الزام تراشی، اور باہم مسلمانوں کے مابین کیا کچھ نہیں ہوا۔

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

ادا کرنے کا معاہدہ طے پا گیا تھا، تو اس کے بعد ڈی ڈبلیو ڈاٹ کام، کی یہ خبر شائع ہوئی کہ:

رمضان کے پہلے دو ہفتوں کے دوران حکومت اور علماء کے بیس نکاتی ہدایات کو مساجد میں بڑے پیمانے پر نظرانداز کردیا گیا ہے۔ ایک تازہ سروے میں مساجد کے امام اور نمازیوں کی اکثریت نے کہا ہے کہ وہ حفاظتی ایس او پیز کے بارے میں جانتے ہیں، تاہم پچاسی فیصد نمازیوں اور چونسٹھ فیصد آئمہ نے مانا کہ ان پر کوئی خاص عمل نہیں ہوا۔

یہ سروے اسلام آباد سمیت پنجاب اور سندھ کے سولہ شہروں میں غیر سرکاری تنظیم "پتن" نے انتیس اپریل سے سات مئی کے دوران کرایا۔ سروے میں شامل سندھ کی نوے فیصد مساجد میں بیس نکاتی قواعد وضوابط کی خلاف ورزی نوٹ کی گئی۔

تنظیم کا کہنا ہے کہ سروے کے ذریعے حفاظتی اقدامات کے حوالے سے لوگوں کے رویوں کا اندازہ لگانا اور یہ دیکھنا تھا کہ اس سے کیا سبق سیکھا جا سکتا ہے۔

سروے میں شاید سب سے تشویش ناک بات یہ سامنے آئی کہ چوہتر فیصد نمازیوں نے کہا کہ ان سب باتوں کے باوجود وہ گھر پر عبادت کرنے کی بجائے مسجد میں باجماعت نماز اور تراویح کو ترجیح دیتے ہیں، کیونکہ ان کے بقول، ''زندگی اور موت تو خدا کے ہاتھ میں ہے''، آئمہ میں صرف سینتالیس فیصد نے ایک مہلک وبا کے دوران اس طرح کے رویے کی حمایت کی۔

سروے میں شامل ایک تہائی نمازیوں نے کہا کہ ایس او پیز پر عملدرآمد میں کوتاہی کے ذمہ دار امام اور مساجد کمیٹیاں ہیں۔ ساٹھ فیصد نمازیوں نے بتایا کہ مساجد کے آئمہ کی طرف سے لوگوں کو حفاظتی ہدایات کے حوالے سے کوئی خاص تلقین نہیں کی جاتی، لیکن جب آئمہ سے اس بارے میں پوچھا گیا تو سبھی نے کہا کہ وہ اپنی پوری کوشش کرتے ہیں۔ اڑتالیس فیصد نمازیوں نے عملدرآمد میں ناکامی پر پولیس کو موردِ الزام ٹھہرایا۔

پتن کے مطابق اس سروے میں پچانوے مساجد کے ایک سو بتیس آئمہ اور مساجد کمیٹیوں نے حصہ لیا، جبکہ تیئیس مساجد کے آئمہ نے اس میں حصہ لینے سے انکار کیا۔

(ڈی ڈبلیو ڈاٹ کام، ''زندگی اور موت خدا کے ہاتھ میں ہے'' 11-05-2020)

ان مناظر کا تماشہ، سب نے دیکھا، کیا دنیا کے کسی دوسرے ملک میں، مسلمانوں کے مابین اس طرح کی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔

عوام تو **کـالانعـام**، ہوتے ہیں، لیکن اس قسم کے حالات میں سنجیدہ، مقتداؤں کی طرف سے وسیع تر فقہی اقوال کی روشنی میں عوام کی رہنمائی اپنی جگہ ایک اہم دینی فریضہ ہے، جس پر سنجیدہ، علمی و تحقیقی کلام کی ضرورت ہے، جس سے عوام کی ذہن سازی میں مدد حاصل ہو۔

اور بندہ اس موضوع پر کئی مفصَّل اور مسلسل مضامین، اصحابِ علم کی خدمت میں پیش کر چکا ہے، جن کو شاید تا حال بہت سے اصحابِ علم کو ملاحظہ فرمانے کی نوبت بھی نہ آسکی ہو، اور نہ ہی شاید آئندہ ان بحرِ ذخار کی طرف سے کسی دریا، بلکہ برساتی نالہ و پرنالہ کی کوئی خاطر خواہ ضرورت محسوس کی جائے۔

مگران حالات میں بندہ کی سابقہ شکایت وحکایت، اور آئنہ نمائی، اپنی جگہ پھر بھی برقرار ہے، جو اہلِ نظر و فکر کو، بنظرِ انصاف واعتدال، تفکر وتدبر کی دعوت ضرور دیتی ہے، وہ الگ بات ہے کہ نقار خانہ میں طوطی کی آواز، زیادہ اہمیت نہ رکھے، لیکن تشنہ طلب کے لیے کسی درجہ میں اگر پیاس بجھانے کے کام نہ آئے، تو کم از کم خشک لبوں کو تری فراہم کرنے کا کام تو پھر بھی دے سکتی ہے۔

واللّٰہ الموفق۔

خلاصۃُ الکلام وحاصلُ المرام

مذکورہ تفصیل سے معلوم ہوا کہ شافعیہ اور مالکیہ کے نزدیک عید کی نماز سنتِ مؤکدہ ہے، اور جو شخص کسی عذر، یا بلا عذر جماعت کے ساتھ اس کو ادا نہ کرسکے، تو وہ نمازِ تراویح کی طرح بغیر جماعت کے بھی اپنے مقام پر رہتے ہوئے پڑھ سکتا ہے، خواہ مرد ہو، یا عورت، اور شہری ہو، یا دیہاتی۔

اور حنابلہ کے نزدیک عید کی نماز فرضِ کفایہ ہے، اگر شہر میں معتد بہ لوگ اس فرضِ کفایہ کو ادا کرلیں، تو باقی لوگوں کے لئے عید کی نماز ترک کردینے میں گناہ لازم نہیں آتا، اور اگر کوئی جماعت کے ساتھ، یا بغیر جماعت کے عید کی نماز پڑھنا چاہے، تو وہ بھی جائز ہوتا ہے، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، اور شہری ہو، یا دیہاتی۔

اور حنفیہ کے نزدیک نمازِ عید کے واجب اور سنت ہونے میں اختلاف ہے، حنفیہ کا ایک قول نمازِ عید کے سنت ہونے کا ہے، لیکن بہت سے مشائخِ حنفیہ نے نمازِ عید کے واجب ہونے اور اس کے لیے جمعہ کی شرائط لازم ہونے کے قول کو راجح قرار دیا ہے، اور عام کتبِ حنفیہ میں، اسی کے مطابق حکم مذکور ہے۔

پھر اکثر فقہائے کرام، یعنی مالکیہ، شافعیہ اور حنابلہ کے نزدیک اذنِ حاکم، اذنِ عام، اور مخصوص تعداد، اور مخصوص مقام، مثلاً عیدگاہ، یا مسجد، یا شہر کی قید وشرط کے بغیر عید کی نماز درست ہوجاتی ہے، البتہ خطبہ وغیرہ جیسی چیزوں میں جزوی اختلاف ہے، جو اصل مقصود میں مخل ومضر، اور رکاوٹ نہیں، عید کا خطبہ ویسے بھی سنت ہے، جس پر نمازِ عید کا وجود موقوف نہیں، اور عیدین کی زائد تکبیرات کے سنت اور واجب ہونے میں بھی اختلاف ہے، حنفیہ کے علاوہ دیگر فقہائے کرام ان تکبیراتِ زوائد کو سنت ومستحب قرار دیتے ہیں، اور اگر کوئی ان تکبیرات کو

عمداً یا سہواً ترک کردے، تو سجدہ سہو وغیرہ کے بغیر درست قرار دیتے ہیں۔

اور جہری قرائت بھی دیگر فقہائے کرام کے نزدیک سنت یا مستحب ہے۔ [1]

اورحنفیہ کے نزدیک اذنِ حاکم، اذنِ عام، اور مخصوص تعداد، کی شرکت شرط ہے، مخصوص مقام، مثلاً عیدگاہ، یا مسجد، ان کے نزدیک بھی شرط نہیں، بلکہ کسی دوسری جگہ بھی باجماعت ادا کرنا جائز ہے، خواہ وہ جگہ کوئی گھر ہو، یا دفتر ہو، الا ان یکون غیر المصر. [2]

---

[1] وهذه التكبيرات الزائدة قد خالف في وجوبها المالكية والشافعية والحنابلة، ثم اختلفوا في عدد هذه التكبيرات ومكانها.

فالشافعية قالوا :هي سبع في الركعة الأولى بين تكبيرة الإحرام وبدء القراء ة، وخمس في الركعة الثانية بين تكبيرة القيام وبدء القراء ة أيضا.

وذهب المالكية والحنابلة إلى أنها ست تكبيرات في الركعة الأولى عقب تكبيرة الإحرام، وخمس في الثانية عقب القيام إلى الركعة الثانية أي قبل القراء ة في الركعتين .

والجهر بالقراء ة واجب عند الحنفية فقط .واتفق الجميع على مشروعيته (الموسوعة الفقهية الكويتية، ج٢٧،ص ٢٤٦،مادة"صلاة العيدين")

[2] (باب صلاة العيدين) لا خفاء في وجه المناسبة بين صلاة العيد والجمعة، ولما اشتركت صلاة العيد والجمعة في الشروط حتى الإذن العام إلا الخطبة لم تجب صلاة العيد إلا على من تجب عليه الجمعة(فتح القدير،لابن الهمام، ج٢،ص ٧٠، كتاب الصلاة،باب صلاة العيدين)

ويشترط للعيد ما يشترط للجمعة من المصر والسلطان والأذان العام إلا في شيئين أحدهما في الخطبة والخطبة في صلاة العيد تخالف الخطبة في الجمعة من وجهين أحدهما أن الجمعة لا تجوز بدون الخطبة وصلاة العيد تجوز بدونها والثاني أن في الجمعة تقدم الخطبة على الصلاة وفي العيدين تؤخر عن الصلاة فإن قدم الخطبة في صلاة العيد جاز أيضاً ولا تعاد الخطبة بعد الصلاة ويخطب في صلاة العيد خطبتين كما هو المعتاد ويجلس بينهما جلسة خفيفة ويكبر في الخطبة في العيدين وليس ذلك عدد في ظاهر الرواية لكن ينبغي أن لا يكون أكثر الخطبة التكبير ويكبر في عيد الأضحى أكثر مما يكبر في خطبة عيد الفطر(فتاوى قاضي خان، ج ١،ص ١٤٢ ،باب صلاة العيدين وتكبيرات أيام التشريق)

(على من تجب عليه الجمعة بشرائطها) المتقدمة حتى الإذن العام (سوى الخطبة) فإنها سنة وليست بشرط، لأنها تؤدى بعد الصلاة وشرط الشيء يسبقه أو يقارنه وتأخيرها إلى ما بعد صلاة العيد سنة كذا في (الظهيرية)(النهر الفائق شرح كنز الدقائق، ج ١، ص ٣٦٦، كتاب الصلاة ،باب صلاة العيدين)

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

لیکن اگر حاکم کی طرف سے لوگوں کو اپنے طور پر امام مقرر کر کے نمازِ عید کی ممانعت نہ ہو، جیسا کہ آجکل ہمارے یہاں اسی طرح کی صورتِ حال ہے، یا کسی جگہ حکمران غیر مسلم ہو، جیسا کہ ہندوستان اور بعض دوسرے غیر مسلم ممالک میں صورتِ حال ہے، تو ایسی صورت میں لوگوں کو اپنے اپنے طور پر امام مقرر کر کے نمازِ عید کا باجماعت ادا کرنا جائز ہوتا ہے۔

جہاں تک اِذنِ عام کا تعلق ہے، تو اگر شہر میں ایک سے زیادہ مقامات پر نمازِ عید کی حاکم کی طرف سے ممانعت نہ ہو، اور متعدد مقامات پر نمازِ عید جاری ہو، جیسا کہ آج کل عموماً شہروں میں ایسا ہی ہے، تو حنفیہ کے نزدیک اِذنِ عام ضروری نہیں رہتا، اور گھروں وغیرہ میں نمازِ عید کا پڑھنا، دروازے وغیرہ بند کر کے بھی جائز ہوتا ہے، اور اگر پھر بھی کسی کی طرف سے اِذنِ عام کو ضروری قرار دینے پر اصرار کیا جائے، تو گھروں وغیرہ کا دروازہ کھول دینے اور دوسروں کو داخل ہونے سے منع نہ کرنے کی صورت میں وہ شرط بھی پوری ہو جاتی ہے، جس پر گھروں وغیرہ میں بآسانی عمل کر کے عید کی نماز باجماعت اداء کی جاسکتی ہے۔

جس کی باحوالہ دلائل کے ساتھ تفصیل بندہ نے جمعہ سے متعلق اپنے بعض دیگر مضامین ورسائل میں بیان کردی ہے۔

اور جہاں تک حنفیہ کے نزدیک نمازِ عید باجماعت کے لئے مخصوص افراد کی تعداد کا تعلق ہے، تو حنفیہ کے نزدیک نمازِ عید لئے نمازِ جمعہ کی طرح مشہور، اور راجح قول کے مطابق امام سمیت کم از کم چار افراد کا ہونا ضروری ہے۔ [1]

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

(وشرط لها) أى لصلاة العيد (شروط الجمعة وجوبا وأداء) حتى الإذن العام (إلا الخطبة) فإنها شرط لأداء الجمعة دون العيدين (شرح النقاية، للقاري، ج ١ ص ٤١٩، كتاب الصلاة، فصل في صلاة العيدين وتكبيرات التشريق، الناشر: شركة دار الارقم بن ابى الارقم، بيروت، لبنان، الطبعة الاولىٰ: ١٤١٨ هـ، 1997م)

[1] والأحكام التي سبقت بالنسبة للعدد الذى تنعقد به الجماعة إنما هو في غير الجمعة والعيد؛ إذ فيهما يختلف العدد -ولكل مذهب رأيه في تحديد العدد، حسبما

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

اور امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے شاگرد امام ابو یوسف اور بعض حضرات کے بقول امام محمد کی ایک

﴿ گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ ﴾

يستند إليه من أدلة (الموسوعة الفقهية الكويتية، ج٢٧، ص ١٧٠، مادة "صلاة الجماعة")

أما بيان شرائط وجوبها فكل ما هو شرط وجوب الجمعة فهو شرط وجوب صلاة العيدين من الإمام والمصر والجماعة إلا الخطبة فإنها سنة بعد الصلاة بإجماع الصحابة.

وشرط الشيء يكون سابقا عليه أو مقارنا له (تحفة الفقهاء للسمرقندي، ج ١، ص ١٦٦، كتاب الصلاة، باب صلاة العيدين)

ومن شرائطها :الجماعة وأقلهم عند أبي حنيفة ثلاثة سوى الإمام وقال أبو يوسف ومحمد :اثنان سوى الإمام(مختصر القدوري ، ص ٣٩، ٤٠، كتاب الصلاة، باب صلاة الجمعة)

قوله واشتراط الجماعة لها :أي لصلاة الجمعة وفيه أن الجماعة كما هي شرط لها شرط لصلاة العيدين .

قوله وكونها : بالجر عطف على الجماعة أي واشتراط كون الجماعة ثلاثة سوى الإمام وفيه أن كونها ثلاثة سوى الإمام ليس شرطا خاصا بالجمعة بل كذلك صلاة العيدين .

قوله والخطبة :أي اشتراط الخطبة لها بخلاف صلاة العيدين فإن الخطبة ليست شرطا لها ولو اقتصر على اشتراط الخطبة لها لكان صوابا وقد يقال المختص بها اشتراط المجموع لا كل واحد (غمز عيون البصائر شرح كتاب الأشباه والنظائر، ج٤، ص ٢٦، الفن الثالث من الأشباه والنظائر وهو فن الجمع والفرق، القول في أحكام يوم الجمعة)

(قوله وأقلها اثنان) لحديث اثنان فما فوقهما جماعة أخرجه السيوطي في الجامع الصغير، ورمز لضعفه .قال في البحر :لأنها مأخوذة من الاجتماع، وهما أقل ما تتحقق به، وهذا في غير جمعة اهـ

أي فإن أقلها فيها ثلاثة صالحون للإمامة سوى الإمام، مثلها العيد لقولهم :يشترط لها ما يشترط للجمعة صحة وأداء سوى الخطبة فافهم(رد المحتار على الدر المختار، ج ١، ص ٥٥٣، كتاب الصلاة، باب الإمامة)

واشتراط الجماعة لها وكونها ثلاثة سوى الإمام (ردالمحتار، ج٢ ص ١٦٥، كتاب الصلاة، باب صلاة العيدين)

تثنية عيد، وأصله عود قلبت الواو ياء لسكونها بعد كسرة اهـ ح .وفي الجوهرة مناسبته للجمعة ظاهرة وهو أنهما يؤديان بجمع عظيم ويجهر فيهما بالقراءة ويشترط لأحدهما ما يشترط للآخر سوى الخطبة، وتجب على من تجب عليه الجمعة، وقدمت الجمعة للفرضية وكثرة وقوعها .اهـ(رد المحتار على الدر المختار، ج٢، ص ١٦٥، كتاب الصلاة،باب العيدين)

روایت کے مطابق امام سمیت تین افراد کا ہونا، یعنی امام کے علاوہ مزید صرف دو افراد کا ہونا بھی کافی ہے۔

اگرچہ اس قول کو مشائخِ حنفیہ نے عام حالات کے مطابق مرجوح قرار دیا ہے، لیکن لاک ڈاؤن اور کرفیو وغیرہ جیسی ضرورت و مجبوری میں جب تین سے زیادہ افراد موجود نہ ہوں، بطورِ خاص نمازِ عید میں اس قول پر بھی عمل کی گنجائش معلوم ہوتی ہے، کیونکہ نمازِ عید، جمعہ کی طرح فرض نہیں، اور اس کو ادا کرنے کے نتیجہ میں جمعہ کی طرح کسی فریضہ کو ضائع کرنے کا خدشہ بھی لازم نہیں آتا، اور تداعی کی بناء پر جماعت فی التطوع کی بھی کراہت لازم نہیں آتی، کماسیجئ۔ [1]

---

[1] قال أبو جعفر :ولا تقوم الجمعة إلا بثلاثة سوى الإمام، وقال أبو يوسف بأخرة: اثنان سوى الإمام(شرح مختصر الطحاوى للجصاص، ج٢،ص ١٢٦، كتاب الصلاة،باب صلاة الجمعة،مسألة :العدد الذى تنعقد به الجمعة)

ومن شرائطها :الجماعة وأقلهم عند أبى حنيفة ثلاثة سوى الإمام وقال أبو يوسف ومحمد :اثنان سوى الإمام(مختصر القدورى،ص ٣٩، ٤٠، كتاب الصلاة ،باب صلاة الجمعة)

(قال) والجماعة من شرائطها لظاهر قوله تعالى (فاسعوا إلى ذكر الله) ولأنها سميت جمعة وفى هذا الاسم ما يدل على اعتبار الجماعة فيها .ويختلفون فى مقدار العدد فقال أبو حنيفة -رضى الله عنه -ثلاثة نفر سوى الإمام وقال أبو يوسف -رضى الله عنه - اثنان سوى الإمام لأن المثنى فى حكم الجماعة حتى يتقدم الإمام عليهما وفى الجماعة معنى الاجتماع وذلك يتحقق بالمثنى(المبسوط،لشمس الأئمة السرخسى، ج٢،ص ٢٤، كتاب الصلاة ، باب صلاة الجمعة، شروط الجمعة)

ثم إن العلماء رحمهم الله اختلفوا فيما بينهم فى تقدير الجماعة، قال أبو حنيفة ومحمد رحمهما الله :يتم بثلاثة نفر سوى الإمام، وعن أبى يوسف رحمه الله :فى غير رواية الأصول اثنان سوى الإمام...... وأبو يوسف رحمه الله يقول :للمثنى حكم الجماعة حقيقة وحكما، أما حقيقة، فلأن الجماعة مشتقة من الاجتماع وذلك يتحقق بالمثنى وأما حكما، فلأن الجماعة الإمام يتقدم عليهما، وذلك من أحكام الجماعة وربما كان يقول إذا كان سوى الإمام إثنان يكون مع الإمام ثلاثة، والثلاث جمع متفق عليه(المحيط البرهانى فى الفقه النعمانى، ج٢،ص ٧١، كتاب الصلاة، الفصل الخامس والعشرون فى صلاة الجمعة)

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

اور بعض مشائخِ حنفیہ کے بقول عیدین کی نماز کے لئے دوسری عام فرض نمازوں کی طرح

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

قال :(ولا بد من الجماعة) لأنها مشتقة منها، ولا خلاف فی ذلک .واختلفوا فی كميتها.

قال أبو حنيفة :لا بد من ثلاثة سوى الإمام، وأن يكون الإمام والثلاثة ممن يجوز الاقتداء بهم فی غير الجمعة .وقال أبو يوسف ومحمد :اثنان سوى الإمام، والأصح أن محمدا مع أبی حنيفة .لأبی يوسف أن الاثنين جماعة لأنه مشتق من الاجتماع وقد وجد .ولهما أن الجمع الصحيح ثلاثة وما دونها مختلف فيه، والجماعة شرط بالإجماع فلا يتأدى بالمختلف(الاختيار لتعليل المختار، ج ۱، ص ۱۸۳، كتاب الصلاة ،باب صلاة الجمعة)

(قوله والجماعة وهم ثلاثة) أی شرط صحتها أن يصلی مع الإمام ثلاثة فأكثر لإجماع العلماء على أنه لا بد فيها من الجماعة كما فی البدائع، وإنما اختلفوا فی مقدارها فما ذكره المصنف قول أبی حنيفة ومحمد وقال أبو يوسف اثنان سوى الإمام؛ لأنهما مع الإمام ثلاثة، وهی جمع مطلق؛ ولهذا يتقدمهما الإمام ويصطفان خلفه، ولهما أن الجمع المطلق شرط انعقاد الجمعة فی حق كل واحد منهم وشرط جواز صلاة كل واحد منهم ينبغی أن يكون سواه فيحصل هذا الشرط ثم يصلی، ولا يحصل هذا الشرط إلا إذا كان سوى الإمام ثلاثة إذ لو كان مع الإمام اثنان لم يوجد فی حق كل واحد منهم الشرط بخلاف سائر الصلوات؛ لأن الجماعة فيها ليست بشرط كذا فی البدائع(البحر الرائق شرح كنز الدقائق، ج ۲، ص ۱۶۱، ۱۶۲، كتاب الصلاة،باب صلاة الجمعة)

(قوله؛ لأن فی المثنى معنى الاجتماع إلخ) قال شمس الأئمة السرخسی -رحمه الله - فی أصوله ظن من أصحابنا أن أقل الجمع على قول أبی يوسف اثنان على قياس قوله فی هذه المسألة وقدره بالوصايا والمواريث وليس كذلک فإن عنده أقل الجمع الصحيح ثلاثة حتى لو قال لفلان على دراهم تلزمه ثلاثة دراهم، ولو قالت خالعنی على ما فی يدی من دراهم، وفی يدها درهم أو درهمان أو لم يكن فی يدها شیء يلزمها ثلاثة دراهم، ولو حلف لا يتزوج نساء ولا يشتری عبيدا أو لا يكلم رجالا لم يحنث إلا بالثلاثة ونص محمد فی السير الكبير على أن أدنى الجمع ثلاثة وجعل أبو يوسف الإمام من جملة الجماعة كما فی سائر الصلوات حتى يتقدم الإمام عليهما كالثلاثة .اهـ. شرح المجمع لأبی البقاء (قوله ومع المنادی ثلاثة)، وكذا مع الذاكر يصيرون أربعة . اهـ.(حاشية الشلبی علٰى تبيين الحقائق، ج ۱، ص ۲۲۱، كتاب الجمعة ،باب صلاة الجمعة، شرائط ادائها)

(وقالا) ش :أی أبو يوسف ومحمد .م :(اثنان سواه) ش :أی سوى الإمام، وبه قال أبو ثور وأحمد فی رواية والثوری فی رواية، وهو قول الحسن البصری(البناية شرح الهداية، ج ۳، ص ۶۴، كتاب الصلاة ،باب صلاة الجمعة)

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

دوافراد کا ہونا بھی کافی ہے، لیکن بعض اہلِ علم حضرات کے توجہ دلانے سے یہ قول تسامح پر مبنی معلوم ہوا۔ [1]

اور اگر بالفرض حنفیہ کے نزدیک نمازِ عید کی کسی شرط، مثلاً اِذنِ عام، یا اِذنِ حاکم، یا مخصوص تعداد کی شرط مفقود ہونے کی وجہ سے با جماعت نماز کو، عید کی نماز کے زمرے میں داخل نہ مانا

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

(قال) ش :أى المصنف -رحمه الله .-م :(والأصح أن هذا قول أبى يوسف وحده -رحمه الله -) ش :أى الأصح أن كون الاثنين سوى الإمام شرطا لانعقاد الجمعة، هو قول أبى يوسف وحده -رحمه الله -ومحمد مع أبى حنيفة -رحمهما الله-، والمذكور فى عامة نسخ "المختصر "أن محمدا مع أبى يوسف، واحترز المصنف بقوله والأصح أن هذا .م :(له) ش :لأبى يوسف .م :(أن فى المثنى معنى الاجتماع) ش :لأن فيه اجتماع واحد مع آخر .م :(وهى) ش :أى الجمعة .م :(منبئة) ش :أى مخبرة .م: (عنه) ش :أى عن الاجتماع لما ذكر أن الجمعة مشتقة من الجماعة وفى الجماعة اجتماع لا محالة.

م :(ولهما) ش :أى لأبى حنيفة ومحمد -رحمهما الله .-م :(أن الجمع الصحيح) ش: يعنى لغة ومعنى .م :(إنما هو الثلاث) ش :ولهذا يقال رجال ثلاثة، ولا يقال رجال اثنان.

م :(لأنه) ش :أى لأن الثلاث .م :(جمعة تسمية) ش :أى من حيث التسمية فى اللغة.

م :(ومعنى) ش :أى ومن حيث المعنى أيضا، ولهذا صح تقسيم أهل الصنعة بين المفرد والمثنى والمجموع ونفى الجمع عن التثنية فى قول القائل، هذا مثنى وليس بمجموع(البناية شرح الهداية، ج٣،ص ٦٦، كتاب الصلاة، باب صلاة الجمعة)

[1] حنفیہ کے یہاں بنیادی طور پر یہ قول نمازِ جمعہ یا نمازِ عید کے بجائے تکبیرِ تشریق کے متعلق تھا، کیونکہ تکبیرِ تشریق واجب ہونے کے لئے بھی امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک جمعہ وعید سے متعلق مشہور روایت "لاجمعة ولاتشريق الخ" مستدل ہے، جیسا کہ گزرا۔

اور ابتداءً اس قول کو بعض حضرات نے تکبیرِ تشریق کے مسئلہ کے ضمن میں ہی بیان فرمایا تھا، بعد کے بعض ناقلین نے، تسامح کی وجہ سے اس کو نمازِ عید کے مسئلہ میں نقل کر دیا، بندہ نے بھی پہلے بعض اہلِ فتاویٰ کی اتباع میں اس کو نقل کر دیا تھا، اب بندہ اس سے رجوع کرتا ہے۔

تاہم حنفیہ کے علاوہ دیگر جمہور فقہائے کرام کے قول کے مطابق پھر بھی نمازِ عید کے با جماعت درست ہونے کے لئے دوافراد کا ہونا کافی ہے، خواہ دوسرا فرد عورت ہو، یا سمجھدار لڑکا یا لڑکی ہو۔

اور حنفیہ کے نزدیک اگر کسی کو دو سے زیادہ افراد کے ساتھ نمازِ عید کی قدرت نہ ہو، اور پھر بھی دوافراد مل کر با جماعت نمازِ عید پڑھ لیں، تو اس میں کوئی گناہ لازم نہیں آئے گا، کیونکہ یہ زیادہ سے زیادہ عام تطوع کی جماعت کہلائے گی، اور اس میں افراد

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

جائے، تب بھی اُن کے نزدیک یہ زیادہ سے زیادہ تطوع اور نفل کی جماعت ہوگی۔

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

اور مواظبت کے اعتبار سے تداعی کی خاص صورت نہیں پائی جائے گی، جیسا کہ آگے آتا ہے۔ محمد رضوان خان۔

وفی (جامع قاضی خان) :وإذا ثبت اختصاص التكبير بالمصر علم أنه من الشعائر بمنزلة الخطبة فيشترط له ما يشترط للجمعة، إلا ما سقط اعتباره من السلطان والحرية فی الأصح والخطبة كذا فی (المعراج)، وعليه جرى الشارح قال فی (البحر) :وليس بصحيح إذ ليس الوقت والإذن العام من شروطه.

وأقول :بل هو الصحيح؛ إذ من شرائطه الوقت أعنی أيام التشريق حتى لو فاتته الصلاة فی أيامه فقضاها فی غير أيامه أو فی أيامه من القابل لا يكبر بخلاف ما إذا قضاها فی أيامه من تلك السنة حيث يكبر لأنه لم يفت عن وقته من كل وجه.

وإذا لم يشترط السلطان أو نائبه فلا معنى لاشتراط الإذن العام وكأنهم استغنوا بذكر السلطان عنه،

على أنا قدمنا أن الإذن العام لم يذكر فی الظاهر .نعم بقی أن يقال :من شرائطها الجماعة التی هی جمع والواحد هنا مع الإمام جماعة، فكيف يصح أن يقال :إن شروطه الجمعة(النهر الفائق شرح كنز الدقائق، ج ۱،ص ۳۷۳، كتاب الصلاة،باب صلاة العيدين)

كما فی النهروفيه ان من شرائطها الجماعة التی هی جمع والواحد هنا مع الإمام جماعة، فكيف يصح أن يقال :بشرائطها(حاشية الطحطاوی على الدر، ج ۱،ص ۳۵۱، كتاب الصلاة،باب العيدين)

قوله " :وشرائط الصحة "ظاهره أنه لا بد من الجماعة المذكورة فی الجمعة على خلاف فيها وليس كذلك فإن الواحد هنا مع الإمام جماعة فكيف يصح أن يقال بشرائطها(حاشية الطحطاوی على مراقی الفلاح،ص ۵۲۸، كتاب الصلاة،باب الجمعة)

وذكر الشارح أن الحاصل أن شروطه شروط الجمعة غير الخطبة والسلطان والحرية فی رواية، وهو الأصح اهـ.

وليس بصحيح إذ ليس الوقت والإذن العام من شروطه وهذا كله عند أبی حنيفة(البحر الرائق شرح كنز الدقائق، ج ۲،ص ۱۷۹، كتاب الصلاة ،باب العيدين)

(قوله :وليس بصحيح إلخ) قال فی النهر بل هو صحيح إذ من شرائطه الوقت أعنی أيام التشريق حتى لو فاتته صلاة فی أيامه فقضاها فی غير أيامه من القابل لا يكبر، وإذا لم يشترط السلطان أو نائبه فلا معنى لاشتراط الإذن العام وكأنهم استغنوا بذكر السلطان عنه على أنا قدمنا أن الإذن العام لم يذكر فی الظاهر نعم بقی أن يقال من شرائطها الجماعة التی هی جمع والواحد هنا مع الإمام جماعة فكيف يصح أن يقال :إن شروطه شروط الجمعة .اهـ.

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

لیکن قابلِ نکیر پھر بھی نہ ہوگی، جو فقہائے کرام شروع سے ہی نمازِ عید کو سنت قرار دیتے ہیں، جیسا کہ مالکیہ اور شافعیہ، حنفیہ کا ایک قول بھی نمازِ عید کے سنت ہونے کا ہے۔

تو ان کے نزدیک یہ ایسی تطوع نماز میں داخل ہوگی، جس کا باجماعت پڑھنا مشروع ہے، جیسا کہ نمازِ تراویح۔

اور حنابلہ کے نزدیک عید کی نماز فرض علی الکفایہ ہے، اور ان کے نزدیک بعد میں دوسرے لوگوں کو عید کی نماز باجماعت پڑھنا فرض نہیں، البتہ مستحب، یا جائز ہونے میں کوئی اختلاف نہیں، اگرچہ اس کی رکعات، یا طریقۂ کار میں تھوڑا بہت اختلاف ہو، ان کے نزدیک بھی یہ ایسی تطوع نماز میں داخل ہوگی، جس کا باجماعت پڑھنا مشروع ہے، بالخصوص جبکہ اُن کے نزدیک مطلق تطوع کو بھی جماعت کے ساتھ پڑھنا مکروہ نہیں۔

نمازِ عید کے واجب یا تطوع میں داخل ہونے کے اختلاف کی وجہ سے حنفیہ نے مطلق عید کی نماز کی نیت سے نمازِ عید کو جائز، بلکہ بعض نے افضل قرار دیا ہے۔

اور جو حضرات نمازِ عید کو اپنی اصل کے اعتبار سے واجب قرار دیتے ہیں، اور نمازِ عید کے لئے مخصوص شرائط کو لازم شرط قرار دیتے ہیں، جیسا کہ حنفیہ، اُن کے نزدیک اس طرح کی شرط فوت ہونے کے بعد، عید کی نماز واجب نہیں رہتی، اور **من حیث کامل الاداء**، اس کی

﴿ گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ ﴾

والجواب أن المراد الاشتراک فی اشتراط الجماعة فیهما لا من کل وجه وإلا انتقص ما أجاب به أولا فإن الشرط فی الجمعة وقت الظهر فالاشتراک فی اشتراط الوقت فیهما مطلقا فکذا الجماعة تدبر(منحة الخالق علی البحر الرائق شرح کنز الدقائق، ج۲،ص ۱۷۹، کتاب الصلاة،باب العیدین)

قلت :وفی إمامة البحر أن الجماعة فی العید تسن علی القول بسنیتها، وتجب علی القول بوجوبها .اهـ .وظاهره أنها غیر شرط علی القول بالسنیة لکن صرح بعده بأنها شرط لصحتها علی کل من القولین أی فتکون شرطا لصحة الإتیان بها علی وجه السنة وإلا کانت نفلا مطلقا تأمل لکن اعترض ط ما ذکره المصنف بأن الجمعة من شرائطها الجماعة التی هی جمع والواحد هنا مع الإمام کما فی النهر(رد المحتار علی الدر المختار، ج۲،ص ۱۶۶، کتاب الصلاة،باب العیدین)

صحت فوت ہو جاتی ہے، جیسا کہ فرض نماز کا معاملہ ہے، لیکن من حیث ناقص الاداء، بھی اس کی شرط فوت ہو جائے، یہ محلِ نظر ہے،، اور جب تک با جماعت ادائیگی کسی حیثیت سے ممکن ہو، اس وقت تک اس کو اسی سابقہ ہیئت کے مطابق اداء کرنا درست ہے، جس کی تائید اس جزئیہ سے بھی ہوتی ہے، جس میں پہلے دن کسی عذر سے نمازِ عید نہ پڑھی جانے کی صورت میں، دوسرے اور تیسرے دن تک نمازِ عید کو اداء کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

اور حنفیہ کے نزدیک عام نوافل کا جماعت سے پڑھنا اس وقت مکروہ ہے، جبکہ تداعی کے ساتھ ہو، جس کی تفسیر بعض حضرات نے اہتمام ومواظبت اور عادت سے، اور بعض نے اس سے کی ہے کہ امام کے علاوہ کم از کم تین، یا چار آدمی امام کے ساتھ جماعت میں شریک ہوں۔

عام نوافل کو جماعت کے ساتھ پڑھنا، اگر تداعی کے ساتھ اتفاقاً واحیاناً ہو، تو حنفیہ کے نزدیک مکروہ تنزیہی، یعنی خلاف اولیٰ ہے، گناہ نہیں، جس کا حاصل جواز نکلتا ہے، اور اگر تداعی کے بغیر ہو، تو بلا کراہت جائز ہے۔ [1]

---

[1] التطوع بالجماعة إذا كان على سبيل التداعى يكره وفى الأصل للصدر الشهيد أما إذا صلوا بجماعة بغير أذان وإقامة فى ناحية المسجد لا يكره، وقال شمس الأئمة الحلوانى :إن كان سوى الإمام ثلاثة لا يكره بالاتفاق وفى الأربع اختلف المشايخ والأصح أنه يكره .هكذا فى الخلاصة (الفتاوىٰ الهندية، ج ا، ص ٨٣، كتاب الصلاة، الباب الخامس، الفصل الأول)

قلت: وتفسير التداعى بالاهتمام والمواظبة اولى من تفسيرها بالعدد والكثرة كما لا يخفى........... فالتنفل بالجماعة على سبيل المواظبة يكره اتفاقا، واختلفوا فيما اذا كانت بدونها، فاجازه بعضهم مطلقا كالحلوانى، ومنعه بعضهم اذا كانوا اربعا سوى الامام (اعلاء السنن، ج٧ص ١٩٧١، كتاب الصلاة، باب كراهة الجماعة فى النوافل والوتر سوى التراويح والكسوف والاستسقاء والعيدين بالتداعى، مطبوعة: دارالفكر، بيروت، لبنان،الطبعة الاولىٰ ١٤٢١هـ، 2001ء)

وأصل هذا أن التطوع بالجماعة إذا كان على سبيل التداعى يكره فى الأصل للصدر الشهيد أما إذا صلوا بجماعة بغير أذان وإقامة فى ناحية المسجد لا يكره، وقال شمس الأئمة الحلوانى إن كان سوى الإمام ثلاثة لا يكره بالاتفاق، وفى الأربع اختلف

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

اور عید کی نماز سال میں ایک، یا دو مرتبہ پڑھی جاتی ہے، جس کو جماعت سے ادا کرنا بنیادی طور پر مشروع ہے، اور فقہائے کرام میں سے کسی کے نزدیک اجتہادی شرط کے مفقود ہونے کی وجہ سے اس پر معصیت کا حکم لگانا، یا اس پر نکیر کرنا پھر بھی درست نہیں ہوتا،

﴿ گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ ﴾

المشايخ والأصح أنه يكره اهـ.(البحر الرائق شرح كنز الدقائق، ج ا ،ص ٣٦٦، كتاب الصلاة ،باب الإمامة، صفة الامامة فى اصلاة)

وقيده فى الكافى بأن يكون على سبيل التداعى أما لو اقتدى واحد بواحد أو اثنان بواحد لا يكره وإذا اقتدى ثلاثة بواحد اختلفوا فيه وإن اقتدى أربعة بواحد كره اتفاقا اهـ (البحرالرائق، ج٢ص٧٥، كتاب الصلاة، باب الوتر والنوافل، صلاة التراويح)

(ولا يصلى الوتر و) لا (التطوع بجماعة خارج رمضان) أى يكره ذلك على سبيل التداعى، بأن يقتدى أربعة بواحد كما فى الدرر، ولا خلاف فى صحة الاقتداء إذ لا مانع نهر(الدر المختار)

(قوله أى يكره ذلك) أشار إلى ما قالوا من أن المراد من قول القدورى فى مختصره لا يجوز الكراهة لا عدم أصل الجواز، لكن فى الخلاصة عن القدورى أنه لا يكره، وأيده فى الحلية بما أخرجه الطحاوى عن المسور بن مخرمة، قال :دفنا أبا بكر -رضى الله تعالى عنه -ليلا فقال عمر -رضى الله عنه :-إنى لم أوتر، فقام وصفنا وراء ه فصلى بنا ثلاث ركعات لم يسلم إلا فى آخرهن .ثم قال :ويمكن أن يقال :الظاهر أن الجماعة فيه غير مستحبة، ثم إن كان ذلك أحيانا كما فعل عمر كان مباحا غير مكروه، وإن كان على سبيل المواظبة كان بدعة مكروهة لأنه خلاف المتوارث، وعليه يحمل ما ذكره القدورى فى مختصره، وما ذكره فى غير مختصره يحمل على الأول، والله أعلم اهـ.

قلت :ويؤيده أيضا ما فى البدائع من قوله :إن الجماعة فى التطوع ليست بسنة إلا فى قيام رمضان اهـ فإن نفى السنية لا يستلزم الكراهة، نعم إن كان مع المواظبة كان بدعة فيكره .وفى حاشية البحر للخير الرملى :علل الكراهة فى الضياء والنهاية بأن الوتر نفل من وجه حتى وجبت القراء ة فى جميعها، وتؤدى بغير أذان وإقامة، والنفل بالجماعة غير مستحب لأنه لم تفعله الصحابة فى غير رمضان اهـ وهو كالصريح فى أنها كراهة تنزيه تأمل .اهـ.

(قوله على سبيل التداعى) هو أن يدعو بعضهم بعضا كما فى المغرب، وفسره الوانى بالكثرة وهو لازم معناه.

(قوله أربعة بواحد) أما اقتداء واحد بواحد أو اثنين بواحد فلا يكره، وثلاثة بواحد فيه خلاف (رد المحتار على الدر المختار، ج٢، ص٤٨، ٤٩، كتاب الصلاة،باب الوتر والنوافل)

جیسا کہ آگے باحوالہ آتا ہے۔ [1]

اور اگر بحالاتِ موجودہ عندالحنفیۃ اِذنِ حاکم واِذنِ عام کو نمازِ عید کے لئے شرط نہ مانا جائے، یعنی اس کے موجود ہونے، یا تعدد کی وجہ سے اور ممانعت از حاکم نہ ہونے کی وجہ سے، تو پھر گھر وغیرہ میں موجود اُن لوگوں پر جن میں نمازِ جمعہ کے واجب ہونے کی شرائط پائی جاتی ہیں، اور اُن کو اپنے مقام پر رہتے ہوئے، باجماعت عید کی نماز پڑھنے پر قدرت ہو، تو ان پر حنفیہ کے نزدیک عید کی نماز واجب ہوگی، اور جائز وکراہت غیرہ کی مذکورہ بحث سے خارج ہوگی۔

بہرحال ایک سے زیادہ افراد کے باجماعت نمازِ عید پڑھنے کی صورت میں یہ نماز، یا تو حقیقی نمازِ عید ہوگی، یا تطوع کی غیر مکروہ، وغیر منکر جماعت ہوگی۔

اور فعلِ مباح، اور واجب، سنت، یا مستحب کے درمیان دائرا ختلاف کی صورت میں اس فعل کا کر لینا، اولیٰ ہوا کرتا ہے، تو اس حیثیت سے یہ جماعت بھی مکروہ کے بجائے، اولیٰ ہوگی۔

اب آخری مسئلہ نمازِ عید کو جماعت کے بغیر تنہاء پڑھنے کا باقی رہ جاتا ہے۔

اگر کوئی عید کی نماز جماعت سے نہ پڑھ سکے، خواہ عذر کی وجہ سے، یا بغیر عذر کے، تو دوسرے اکثر فقہائے کرام کے نزدیک ہر ایک کے حق میں عید کی نماز درست ہونے کے لئے جماعت کا ہونا ضروری نہیں۔

اس لئے اُن کے قول کے مطابق اگر کوئی شخص قانونی رُکاوٹ، یا حفاظتی تدبیر کے طور پر خود

---

[1] فالحاصل :أن الأحاديث لما اختلفت فى الصلاة بالجماعة وعدمها على وجه لا يصح به إثبات السنية لم يقل أبو حنيفة بسنيتها ولا يلزم منها قوله بأنها بدعة كما نقله عنه بعض المتعصبين بل هو قائل بالجواز اهـ:

قلت :والظاهر أن المراد به الندب والاستحباب لقوله فى الهداية قلنا :إنه فعله -عليه الصلاة والسلام -مرة وتركه أخرى فلم يكن سنة اهـ أى لأن السنة ما واظب عليه والفعل مرة مع الترك أخرى يفيد الندب تأمل(رد المحتار على الدر المختار، ج ۲، ص ۱۸۴، كتاب الصلاة،باب الاستسقاء)

سے نمازِ عید کی جماعت میں شرکت نہ کرے، یا اس قسم کا عذر بھی نہ ہو، تو اُس کو زوال سے پہلے پہلے اپنے مقام پر رہتے ہوئے تنہاء عید کی نماز پڑھنا، نہ صرف یہ کہ درست ہے، بلکہ بعض حضرات کے نزدیک اُن کو عید کی نماز پڑھنا سنت اور بعض حضرات کے نزدیک مستحب ہے، ممنوع وناجائز کسی کے نزدیک بھی نہیں۔

اور ان کے نزدیک مریض ومسافر، اور شہری ودیہاتی وغیرہ کو بھی اپنے مقام پر عید کی نماز اجتماعاً، یا انفراداً حسبِ موقع وحسبِ ضرورت پڑھنا جائز ہے۔

اور حنفیہ کے نزدیک اگر کوئی عید کی نماز جماعت سے نہ پڑھ سکے، تو اس کو دو رکعات، یا چار رکعات پڑھنے کا اختیار ہے، اور ایسا کرنا حنفیہ کے نزدیک جائز، یا مستحب ہے۔

البتہ اس کی یہ نماز، عید کی، یا عام نفل کی ہونے، نہ ہونے میں اختلاف ہے۔

عام اور مشہور قول کے مطابق تو یہ نماز، عام تطوع اور نفل کی نماز ہے، جس کو بعض حضرات نے چاشت کی نماز قرار دیا ہے، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جب جماعت اور خطبہ اور جہری قرائت وغیرہ نہ ہوگی، تو نمازِ عید کی مخصوص ہیئت موجود نہ ہونے کی وجہ سے یہ عام تطوع اور نفل نماز ہی شمار ہوگی۔

لیکن چونکہ دیگر متعدد فقہائے کرام کے معروف قول اور حنفیہ کے ایک غیر راجح قول کے مطابق، عید کی نماز بھی تطوع میں داخل ہے، اور اس کو صرف نمازِ عید کی نیت سے پڑھنا، نہ صرف یہ کہ جائز ہے، بلکہ بعض حضرات کے نزدیک اختلاف سے بچنے کے لئے افضل بھی ہے۔

اور خطبۂ عید صرف سنت ہے، اور جماعت کے بغیر عید کی نماز پڑھنے کی صورت میں اس کی بھی ضرورت نہیں رہتی۔

اور غیر حنفیہ کے نزدیک تکبیراتِ عید، سنت ہیں، واجب نہیں، اور جہری قرائت بھی ان کے نزدیک واجب نہیں، اور بغیر جماعت کے واجب قرار دینے والوں کے نزدیک بھی واجب

نہیں رہتی، تو ان کے نزدیک تکبیراتِ زوائد اور خطبہ و جہری قرائت کے بغیر بھی نمازِ عید کو وجود مل جاتا ہے۔

ان وجوہات کی بناء پر اس کو نمازِ عید کی قضاء کا عنوان اور حکم دینے میں کوئی حرج نہیں، نیز تکبیراتِ زوائد کا انفرادی نماز میں کہنا کوئی ایسا فعل نہیں، جو مفسدِ نماز، یا کراہتِ شدیدہ کا باعث ہو، بالخصوص، جبکہ یہ نماز تکبیراتِ زوائد والی نماز کی قضاء کے طور پر پڑھی جارہی ہو۔

اس لیے جب کسی کو جماعت کے ساتھ نمازِ عید میسر نہ ہو، یا کوئی مریض و مسافر اور عورت ہو، تو اس کے حق میں عنداللہ ان دو رکعتوں، یا چار رکعتوں کو نمازِ عید کا حکم و درجہ حاصل ہونے کا قول، جمہور کے علاوہ حنفیہ کے نزدیک بھی بے بنیاد نہیں، جس کی تائید بعض احادیث و روایات اور آثار، اور جمہور فقہائے کرام نیز بعض مشائخِ حنفیہ کے قول سے بھی ہوتی ہے۔

ہمارے نزدیک یہی راجح ہے۔

اور اگر کوئی اس توجیہ سے اتفاق نہ کرے، اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک کسی بھی جہت سے انفرادی طور پر نماز کو عید کے زمرہ میں شامل نہ کرے، تو پھر ہمارے نزدیک احادیث و آثار اور جمہور فقہائے کرام کے اقوال اور ان کی طرف سے بیان فرمودہ دلائل کے پیشِ نظر یہ قول راجح کہلائے جانے کا مستحق نہیں، کیونکہ ان روایات و آثار اور مجتہدینِ عظام کی تصریحات کی حیثیت، یقیناً غیر مجتہد مشائخِ حنفیہ کی توجیہ و تاویل سے زیادہ اہم اور راجح ہے۔

اور غور کرنے سے معلوم ہوا کہ فقہائے کرام کا یہ اختلاف کسی چیز کے واجب ہونے، نہ ہونے، یا سنت و مستحب اور مباح ہونے کے درمیان دائر ہے، اور اس قسم کے اختلاف میں اس عمل کو کر لینا افضل ہوا کرتا ہے۔

اس لیے جس کو عید کی نماز با جماعت میسر نہ ہو، اس کو بھی عید کی نماز جہری قرائت اور خطبہ کے بغیر پڑھ لینا بہتر ہے، اور خواتین کو بھی اپنے اپنے گھروں میں نمازِ عید کو پڑھنا بہتر ہے، بلکہ

ہر مسلمان جس کو جس طرح ممکن ہو، نمازِ عید کا حتی الامکان اہتمام کر کے حدیث میں مذکور ’’عِیدُنَا أَهْلَ الْإِسْلَامِ‘‘ کا مصداق بننا چاہیے۔

اس سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ آج کل ہمارے یہاں موجودہ حالات میں، جس طرح اہلِ علم کا ایک طبقہ لوگوں کو گھروں میں نمازِ عید پڑھنے کو بہر حال ناجائز قرار دے رہا ہے، جس سے اس کے معصیت ہونے کا تأثر مل رہا ہے، وہ محدثین وفقہائے کرام کے موقف کو صحیح نہ سمجھنے کی بناء پر ہے۔

اور جو بعض اہلِ علم حضرات کا یہ قول سوال میں ذکر کیا گیا ہے کہ:

’’فقہ حنفی کے مطابق نمازِ عید کا بڑے مجامع کے علاوہ، گھروں وغیرہ میں پڑھنا درست نہیں، ہاں دوسرے فقہ کے مطابق درست ہے‘‘۔

تو اس پر کلام کی بہت زیادہ گنجائش ہے، کیونکہ اس قول میں گھروں، یا مخصوص عمارات میں نمازِ عید کے عدمِ جواز کی نہ تو کوئی دلیل اور وجہ مذکور ہے، اور نہ ہی کسی فقہی حوالہ کا ذکر ہے۔

پھر دیگر فقہائے کرام اور حنفیہ کے مابین نمازِ عید کے کسی مقام پر جواز وعدمِ جواز کا مابہ الفرق کوئی مخصوص عمارت، یا گھر وغیرہ ہونا، ہرگز نہیں، بلکہ عندالحنفیہ زیادہ سے زیادہ وجودِ سلطان، یا اِذنِ عام وغیرہ کی شرط کے فقدان کو قرار دیا جاسکتا ہے، لیکن چونکہ گھروں میں چار افراد کا باجماعت عید کی نماز پڑھنا ممکن ہے، اور اس کی حکمران کی طرف سے بھی ممانعت نہیں، اور اِذنِ عام کی شرط، اَوّلاً تو ایک سے زیادہ مقامات پر عید کے جواز کے قول اور اس کے مطابق عمل ہونے سے باقی نہیں رہتی۔

دوسرے گھروں وغیرہ میں بھی اِذنِ عام کی صورت پر بآسانی عمل درآمد ہوسکتا ہے، اور اس کے مطابق متعدد حنفیہ، فتاویٰ جاری کر چکے ہیں۔

جبکہ حنفیہ کے علاوہ، دیگر فقہائے کرام کے نزدیک صحتِ نمازِ عید کے لیے نہ تو اِذنِ عام شرط ہے، اور نہ ہی جماعت کا ہونا شرط ہے۔

البتہ اگر معتد بہ افراد کی جماعت کے ساتھ نہ پڑھی جائے، تو پھر حنفیہ کے نزدیک عدمِ جواز بمعنیٰ ''عدمُ الاعتداد بصلاۃ العید'' کی معقول وجہ ہوسکتی ہے، لیکن معصیت وکراہت اس میں بھی نہیں پائی جاتی، جس پر کلام گزر چکا۔

اس کے علاوہ مذکورہ بیان میں دوسرے فقہاء کے قول پر عمل جائز و درست ہونے، یا گھروں میں نمازِ عید پڑھنے کے عمل پر نکیر کا ذکر نہیں۔

اور دوسرے اُصول وقواعد سے یہ بات ثابت ہے کہ اس عمل پر نکیر وملامت نہیں کی جاسکتی۔

چنانچہ اس سلسلہ میں حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ کی تحریرات سے چند قیمتی اقتباسات ذکر ونقل کیے جاتے ہیں۔

مفتی صاحب موصوف ایک مقام پر فرماتے ہیں کہ:

ائمہ اربعہ کے متفق علیہ اصول سے یہ ثابت ہے کہ جس مسئلے میں اجتہاد کی گنجائش ہو، اور ائمہ مجتہدین اپنی اپنی صوابدید کے مطابق اس کی کوئی خاص صورت تجویز کر کے عمل کریں، تو ان میں کوئی جانب منکر نہیں ہوتی، دونوں جانبیں معروف ہی کی فرد ہوتی ہیں، اس لیے وہاں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا خطاب بھی متوجہ نہیں ہوتا، اور اپنے مسلکِ مختار کے مخالف عمل کرنے والوں پر تارکِ سنت ہونے کا الزام لگانا، یا ان کو فاسق کہنا کسی کے نزدیک جائز نہیں۔

امامِ حدیث حافظ ابنِ عبدالبر مالکی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ''جامع العلم'' میں اس کے متعلق جو مضمون نقل فرمایا ہے، وہ اہلِ علم کو ہمیشہ مستحضر اور صفحۂ قلب پر نقش رکھنا ضروری ہے، تاکہ ان مفاسد سے بچ سکیں، جن میں آج کل کے بہت سے علماء مبتلا ہیں کہ اجتہادی مسائل میں اختلاف کی بناء پر ایک دوسرے کی تفسیق وتکفیر تک پہنچ جاتے ہیں، اور اکابر علماء کی شان میں بے ادبی کے مرتکب ہوجاتے ہیں، جس کے نتیجہ میں دیندار مسلمان آپس میں ٹکراتے ہیں، اور پھر خدا جانے

کتنے صغیرہ، کبیرہ گناہوں میں مبتلا ہوتے ہیں (مجالسِ حکیم الامت، صفحہ ۶۸، ۶۹، مطبوعہ: دارالاشاعت، کراچی)

مفتی صاحب موصوف ایک مقام پر فرماتے ہیں کہ:

جس مسئلہ میں صحابہ وتابعین اور ائمہ مجتہدین کا اختلاف ہو، اس کی کوئی جانب شرعی حیثیت سے منکر نہیں کہلائے گی، کیونکہ دونوں آراء کی بنیاد قرآن وسنت اور ان کے مسلمہ اصول پر ہے، اس لیے دونوں جانبیں داخلِ معروف ہیں، زیادہ سے زیادہ ایک کو راجح اور دوسرے کو مرجوح کہا جاسکتا ہے، اس لیے ان مسائل مجتہد فیہا میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ بھی کسی پر عائد نہیں ہوتا، بلکہ غیر منکر پر نکیر کرنا، خود ایک منکر ہے، یہی وجہ ہے کہ سلفِ صالحین کا بے شمار مسائل میں جواز وعدمِ جواز اور حرمت وحلت کا اختلاف ہونے کے باوجود کہیں منقول نہیں کہ ان میں سے ایک دوسرے پر اس طرح نکیر کرتا ہو، جیسے منکرات پر کی جاتی ہے، یا ایک دوسرے کو یا اس کے متبعین کو گمراہی یا فسق وفجور کی طرف منسوب کرتا ہو، یا اس کو ترکِ وظیفہ یا ارتکابِ حرام کا مجرم قرار دیتا ہو، حافظ ابن عبدالبر رحمہ اللہ نے امام شافعی رحمہ اللہ کا جو قول نقل کیا ہے، وہ بھی اس پر شاہد ہے، جس میں فرمایا ہے کہ ایک مجتہد کو دوسرے مجتہد کا تخطیہ یعنی اس کو خطا وار مجرم کہنا جائز نہیں (جواہر الفقہ، جلد اول، ص ۴۰۸، ۴۰۹، مضمون ''وحدتِ امت''، مطبوعہ: مکتبہ دارالعلوم کراچی، طبع جدید: ذی الحجہ 1431ھ، نومبر 2010ء)

مفتی صاحب موصوف ایک مقام پر فرماتے ہیں کہ:

''روکنے ٹوکنے کا معاملہ صرف اُن مسائل میں ہوگا، جو اُمت میں مشہور ومعروف ہیں، اور سب کے نزدیک متفق علیہ ہیں، اجتہادی مسائل، جن میں اُصولِ شرعیہ کے ماتحت، رائیں (یعنی آراء) ہوسکتی ہیں، ان میں روک ٹوک کا سلسلہ نہ ہونا

چاہئے“ (معارف القرآن، ج ۲ ص ۱۴۲، سورہ آلِ عمران، آیت نمبر ۱۰۴، مطبوعہ: ادارۃ المعارف، کراچی، سنِ اشاعت: ذوالحجہ ۱۴۱۱ ہجری، جون 1991ء)

مفتی صاحب موصوف ایک مقام پر فرماتے ہیں کہ:

”یہاں سے ایک بہت اہم اصولی بات واضح ہوگئی کہ جو اجتہادی اختلاف، شرعی اجتہاد کی تعریف میں داخل ہے، اس میں اپنے اپنے اجتہاد سے جس امام نے جو جانب اختیار کرلی، اگرچہ عند اللہ اس میں صواب اور صحیح صرف ایک ہے، دوسرا خطاء ہے، لیکن یہ صواب وخطاء کا فیصلہ صرف حق تعالیٰ کے کرنے کا ہے، وہ محشر میں بذریعہ اجتہاد صواب پر پہنچنے والے عالم کو دوہرا ثواب عطا فرمائیں گے اور جس کے اجتہاد نے خطاء کی ہے، اس کو ایک ثواب دیں گے، اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو اجتہادی اختلاف میں یہ کہنے کا حق نہیں کہ یقینی طور پر یہ صحیح ہے، دوسرا غلط ہے۔ ہاں اپنی فہم وبصیرت کی حد تک ان دونوں میں جس کو وہ اقرب الی القرآن والسنہ سمجھے، اس کے متعلق یہ کہہ سکتا ہے کہ میرے نزدیک یہ صواب ہے، مگر احتمال خطاء کا بھی ہے اور دوسری جانب خطاء ہے، مگر احتمال صواب کا بھی ہے۔ اور یہ بات ہے جو تمام ائمہ فقہاء میں مسلم ہے۔

اس سے یہ بھی واضح ہوگیا کہ اجتہادی اختلاف میں کوئی جانب منکر نہیں ہوتی کہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے ماتحت اس پر نکیر کیا جائے اور جب وہ منکر نہیں تو غیر منکر پر نکیر، خود امرِ منکر ہے، اس سے پرہیز لازم ہے۔

یہ وہ بات ہے جس میں آج کل بہت سے اہلِ علم بھی غفلت میں مبتلا ہیں، اپنے مخالف نظریہ رکھنے والوں پر تبرا اور سب وشتم سے بھی پرہیز نہیں کرتے، جس کا نتیجہ مسلمانوں میں جنگ وجدل اور انتشار واختلاف کی صورت میں جگہ جگہ مشاہدہ میں آرہا ہے، اجتہادی اختلاف بشرطیکہ اصول اجتہاد کے مطابق ہو، وہ تو ہرگز

آیتِ مذکورہ ولا تفرّقوا کے خلاف اور مذموم نہیں۔

البتہ اس اجتہادی اختلاف کے ساتھ جو معاملہ آج کل کیا جارہا ہے کہ اسی کی بحث ومباحثہ کو دین کی بنیاد بنالی گئی اور اس پر باہمی جنگ وجدل اور سب وشتم تک نوبت پہنچادی گئی، یہ طرزِ عمل بلاشبہ ولا تفرّقوا کی کھلی مخالفت اور مذموم اور سنت سلف، صحابہ وتابعین کے بالکل خلاف ہے، اسلافِ امت میں کبھی کہیں نہیں سنا گیا کہ اجتہادی اختلاف کی بنا پر اپنے سے مختلف نظریہ رکھنے والوں پر اس طرح نکیر کیا گیا ہو'' (معارف القرآن، ج۲ ص۱۴۳، سورہ آلِ عمران، آیت نمبر۱۰۴، مطبوعہ: ادارۃ المعارف، کراچی، سنِ اشاعت: ذوالحجہ۱۴۱۱ ہجری، جون 1991ء)

مفتی صاحب موصوف ایک مقام پر فرماتے ہیں کہ:

استنباط سے جو حکم فقہاء نکالیں گے، اس کے بارے میں قطعی طور پر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اللہ کے نزدیک قطعی طور پر یہی حق ہے، بلکہ اس حکم کے خطاء ہونے کا بھی احتمال باقی رہتا ہے، ہاں اس کے صحیح ہونے کا ظن غالب حاصل ہوجاتا ہے، جو عمل کے لیے کافی ہے (معارف القرآن، ج۲، ص۴۹۴، سورہ نساء، مطبوعہ: ادارۃ المعارف، کراچی، سنِ اشاعت: ذوالحجہ۱۴۱۱ ہجری، جون 1991ء)

اور مفتی صاحب موصوف ایک مقام پر فرماتے ہیں کہ:

ائمہ مجتہدین جن کی شان اجتہاد علماءِ امت میں مسلم ہے، اگر کسی مسئلہ میں ان کے دو مختلف قول ہوں، تو ان میں سے کسی کو بھی منکرِ شرعی نہیں کہا جاسکتا، بلکہ اس کی دونوں جانبیں معروف میں داخل ہیں۔

ایسے مسائل میں ایک رائے کو راجح سمجھنے والے کے لیے یہ حق نہیں ہے کہ دوسرے پر ایسا انکار کرے، جیسا کہ گناہ پر کیا جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ صحابہ وتابعین میں بہت سے اجتہادی اختلافات اور متضاد اقوال کے باوجود یہ کہیں

منقول نہیں کہ وہ ایک دوسرے پر فاسق یا گنہگار ہونے کا فتویٰ لگاتے ہوں، بحث وتمحیص اور مناظرے ومکالمے سب کچھ ہوتے تھے، اور ہر ایک اپنی رائے کی ترجیح کی وجوہ بیان کرتا اور دوسرے پر اعتراض کرتا تھا، لیکن کوئی کسی کو اس اختلاف کی وجہ سے گناہ گار نہ سمجھتا تھا۔

خلاصہ یہ ہے کہ اجتہادی اختلاف کے موقع پر یہ تو ہر ذی علم کو اختیار ہے کہ جس جانب کو راجح سمجھے اسے اختیار کرے، لیکن دوسرے کے فعل کو منکر سمجھ کر اس پر انکار کرنے کا کسی کو حق نہیں ہے، اس سے واضح ہوا کہ اجتہادی مسائل میں جنگ و جدل، یا منافرت پھیلانے والے مقالات ومضامین امر بالمعروف یا نہی عن المنکر میں داخل نہیں، ان مسائل کو محاذِ جنگ بنانا، صرف ناواقفیت یا جہالت ہی کی وجہ سے ہوتا ہے (معارف القرآن، ج۳، ص۲۵۳و۲۵۴، سورہ مائدہ، ادارۃ المعارف، کراچی، اشاعت، اپریل،۱۹۹۲)

مفتی صاحب موصوف ایک مقام پر فرماتے ہیں کہ:

میرے نزدیک اس جنگ وجدل کا ایک بہت بڑا سبب فروعی اور اجتہادی مسائل میں تحزب وتعصب اور اپنی اختیار کردہ راہِ عمل کے خلاف کو عملاً باطل اور گناہ قرار دینا اور اس پر عمل کرنے والوں کے ساتھ ایسا معاملہ کرنا ہے، جو اہلِ باطل اور گمراہوں کے ساتھ کرنا چاہیے تھا (جواہر الفقہ، جلد اول، ص۱۴۱، مضمون ''وحدتِ امت'' مطبوعہ: مکتبہ دارالعلوم کراچی، طبع جدید: ذی الحجہ 1431ھ، نومبر 2010ء)

مفتی صاحب موصوف ایک مقام پر فرماتے ہیں کہ:

صحابہ وتابعین اور ائمہ مجتہدین کے دور کی وہ تاریخ بھی سامنے رکھنا ضروری ہے کہ تعبیر کتاب وسنت کے ماتحت جو اِن میں اختلافِ رائے پیش آیا ہے، اس پوری تاریخ میں ایک واقعہ بھی ایسا نہیں کہ اس نے جنگ وجدال کی صورت اختیار کی ہو،

باہمی اختلافِ مسائل کے باوجود ایک دوسرے کے پیچھے نماز پڑھنا اور تمام برادرانہ تعلقات قائم رہنا اس پوری تاریخ کا اعلیٰ شاہکار ہے (جواہر الفقہ، جلد اول، ص۴۴۲، مضمون ''اختلافِ امت پر ایک نظر'' مطبوعہ: مکتبہ دارالعلوم کراچی، طبع جدید: ذی الحجہ 1431ھ، نومبر 2010ء)

اور مفتی صاحب موصوف ایک اور مقام پر فرماتے ہیں کہ:

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ تعبیر کتاب وسنت کے ماتحت اختلافِ رائے جو صحابہ وتابعین اور ائمہ مجتہدین میں رہا ہے، تو بلاشبہ رحمت ہی ہے، اس کا کوئی پہلو نہ مسلمانوں کے لیے مضر ثابت ہوا، اور نہ آج ہوسکتا ہے، بشرطیکہ وہ انہیں حدود کے اندر رہے، جن میں ان حضرات نے رکھا تھا کہ ان کا اثر نماز، جماعت، امامت اور معاشرت کے کسی معاملے پر نہ پڑتا تھا (جواہرُ الفقہ، جلد اول، ص۴۴۳، مضمون ''اختلافِ امت پر ایک نظر''، مطبوعہ: مکتبہ دارالعلوم کراچی، طبع جدید: ذی الحجہ 1431ھ، نومبر 2010ء)

جہاں تک سوال میں ذکر کردہ اس بات کا تعلق ہے کہ عوام کو حسبِ ضرورت وحسبِ موقعہ فقہائے کرام میں سے کسی کے مسلک کے مطابق عید کی نماز پڑھنا جائز ہے، یا نہیں؟

تو اولاً تو اس سلسلہ میں ہم فقہائے کرام کے اقوال کی روشنی میں تفصیل ذکر کرچکے ہیں کہ بحالاتِ موجودہ نمازِ عید کا گھروں وغیرہ میں پڑھنا، تمام قابلِ ذکر مجتہدینِ عظام وفقہائے کرام کے نزدیک جائز ہے۔

پس مذکورہ صورت میں نمازِ عید کو گھروں وغیرہ میں پڑھنے کے جواز کے لئے کسی دوسرے مسلک پر چلنے کی ضرورت نہیں، بلکہ اس کا ثبوت اہلُ السنۃ والجماعۃ کے اکثر مشہور فقہی مذاہب ومسالک میں موجود ہے۔

اور اگر بالفرض کسی مسئلہ میں فقہائے کرام کا اختلاف ہو، تو عوام کو دوسرے فقہائے کرام کے اقوال پر عمل کرلینا، پھر بھی جائز ہے، جس میں دو یا زیادہ افراد کا جماعت اور بغیر جماعت کے

تنہاء عید کی نماز پڑھنا بھی داخل ہے، جبکہ کوئی ناجائز مقصد پیشِ نظر نہ ہو، بلکہ اپنی ضرورت وسہولت کی بنیاد پر ایک شرعی حکم پر عمل کرنا اور عبادت کو بجالانا مقصود ہو۔

جس کی تفصیل فقہائے کرام کی عبارات میں موجود ہے، اور ہم نے اپنے دوسرے مضامین میں اس مسئلہ کو مفصَّل ومدلَّل انداز میں بیان کردیا ہے۔

اوراس سلسلہ میں موجودہ دور کے بعض اہلِ علم حضرات کے ذہنوں میں پائی جانے والی بعض غلط فہمیوں کی نشاندہی بھی کردی ہے۔ [1]

---

[1] لایجب ــ فی الأصح الراجح ـ التزام مذهب فقهی معین، لأن ذلک مجرد تقلید (أی أخذ بقول الغیر من غیر معرفة دلیله) وإیجاب التقلید تشریع شرع جدید، کما قال شارح مسلم الثبوت.

فلا مانع شرعا من تقلید أئمة المذاهب والمجتهدین المشهورین والمغمورین، کما لامحذور فی الشرع من التلفیق بین أقوال المذاهب عملا بمبدأ الیسر فی الدین لقوله تعالی :(یرید الله بکم الیسر ولا یرید بکم العسر)ومن المعلوم أن أغلب الناس لامذهب لهم، وإنما مذهبهم مذهب مفتیهم، وهم حریصون علی أن یکون عملهم شرعیا(الفقه الإسلامی وأدلتهٔ للزحیلی، ،ج ا ،ص ۹۰، مقدمات ضروریة عن الفقه، المطلب السادس ـ الضوابط الشرعیة للأخذ بأیسر المذاهب)

وجواز التلفیق مبنی علی ما قررناه من أنه لا یجب التزام مذهب معین فی جمیع المسائل، فمن لم یکن ملتزما مذهبا معینا، جاز له التلفیق، وإلا أدی الأمر إلی بطلان عبادات العوام، لأن العامی لا مذهب له ولو تمذهب به، ومذهبه فی کل قضیة هو مذهب من أفتاه بها .کما أن القول بجواز التلفیق یعتبر من باب التیسیر علی الناس.

وتقلید إمام فی جزئیة أو مسألة لایمنع من تقلید إمام آخر فی مسألة أخری(الفقه الإسلامی وأدلتهٔ للزحیلی،ج ا ،ص۱۰۷ ،مقدمات ضروریة عن الفقه، المطلب السادس ـ الضوابط الشرعیة للأخذ بأیسر المذاهب، الفرع الرابع)

مطلب یجوز تقلید المفضول مع وجود الأفضل:ثم اعلم أنه ذکر فی التحریر وشرحه أیضا أنه یجوز تقلید المفضول مع وجود الأفضل .وبه قال الحنفیة والمالکیة وأکثر الحنابلة والشافعیة .وفی روایة عن أحمد وطائفة کثیرة من الفقهاء لا یجوز .ثم ذکر أنه لو التزم مذهبا معینا .کأبی حنیفة والشافعی، فقیل یلزمه، وقیل لا وهو الأصح اهـ وقد شاع أن العامی لا مذهب له.

إذا علمت ذلک ظهر لک أن ما ذکر عن النسفی من وجوب اعتقاد أن مذهبه صواب یحتمل الخطأ مبنی علی أنه لا یجوز تقلید المفضول وأنه یلزمه التزام مذهبه وأن ذلک

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

امام شیخ عبد الغنی نابلسی دمشقی حنفی رحمہ اللہ (المتوفیٰ: 1143ہجری) نے اپنی تالیف ’’الحدیقةُ الندیة، شرح الطریقة المحمدیة ‘‘میں اس بات کی وضاحت فرمائی ہے کہ جن مسائل میں فقہائے کرام کا اختلاف ہو، وہ حقیقی بدعت شمار نہیں ہوتے، اوران پر سختی ونکیر کرنا اورعوام الناس کی طرف سے فقہائے کرام میں سے کسی کے قول پر عمل ہونے کی صورت میں اس سے منع کرنا مناسب نہیں ہوتا، بلکہ عوام کا کوئی عمل، اتفاق سے فقہاء میں سے کسی کے قول کے مطابق، درست وجائز واقع ہوجائے، اس کی بھی گنجائش موجود ہوتی ہے۔

چنانچہ شیخ موصوف، مذکورہ کتاب میں فرماتے ہیں کہ:

وبعض صور العبادات الواردة فی الشرع بان یزاد فی صورتها او ینقص منها مع اعتقاد ان تلک الزیادة والنقصان طاعة بمجرد

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

لا يتأتى فى العامى.

وقد رأيت فى آخر فتاوى ابن حجر الفقهية التصريح ببعض ذلك فإنه سئل عن عبارة النسفى المذكورة، ثم حرر أن قول أئمة الشافعية كذلك، ثم قال إن ذلك مبنى على الضعيف من أنه يجب تقليد الأعلم دون غيره.

والأصح أنه يتخير فى تقليد أى شاء ولو مفضولا وإن اعتقده كذلك، وحينئذ فلا يمكن أن يقطع أو يظن أنه على الصواب، بل على المقلد أن يعتقد أن ما ذهب إليه إمامه يحتمل أنه الحق .قال ابن حجر :ثم رأيت المحقق ابن الهمام صرح بما يؤيده حيث .

قال فى شرح الهداية :إن أخذ العامى بما يقع فى قلبه أنه أصوب أولى، وعلى هذا استفتى مجتهدين فاختلفا عليه الأولى أن يأخذ بما يميل إليه قلبه منهما .وعندى أنه لو أخذ بقول الذى لا يميل إليه جاز؛ لأن ميله وعدمه سواء ، والواجب عليه تقليد مجتهد وقد فعل .اهـ(رد المحتار على الدر المختار، ج ا ،ص ۴۸،مقدمة)

مطلب العامى لا مذهب له قلت :وأيضا قالوا العامى لا مذهب له، بل مذهبه مذهب مفتيه، وعلله فى شرح التحرير بأن المذهب إنما يكون لمن له نوع نظر واستدلال وبصر بالمذهب على حسبه، أو لمن قرأ كتابا فى فروع ذلك المذهب وعرف فتاوى إمامه وأقواله.

وأما غيره ممن قال أنا حنفى أو شافعى لم يصر كذلك بمجرد القول كقوله أنا فقيه أو نحوى اهـ وتقدم تمام ذلك فى المقدمة أول هذا الشرح(رد المحتار على الدر المختار، ج۴،ص ۸۰، كتاب الحدود،باب التعزير)

الرأى ، لتخرج من البدع هذه الزيادة والنقصان الواقعة فى العبادات على حسب اختلاف المذاهب الاربعة اليوم كتثنية الاقامة عند ابى حنيفة رحمه الله تعالىٰ، بالنظر الى مذهب الامام شافعى رحمه الله تعالىٰ وافرادها عند الشافعى رحمه الله تعالىٰ بالنظر الى مذهب ابى حنيفة رحمه الله تعالىٰ ، وصلاة الكسوف بركوعين وسجودين وفاتحتين فى كل ركعة عند الشافعى ، لا عند ابى حنيفة رحمه الله تعالىٰ ، فان هذا او ما اشبهه ليس ببدعة فى الدين، لانه ماخوذ من الادلة الشرعية ، لا من مجرد الرأى

(الحديقة الندية، شرح الطريقة المحمدية، ج ۱،ص۹۷، الفصل الثانى من الفصول الثلاثة من الباب الاول فى بيان اقسام البدع، مطبوعة: المكتبة الحقيقية ، استانبول، تركيا، 1994ء)

ترجمہ: اور بدعت یہ بھی ہے کہ عبادت کی بعض صورتیں، جو شریعت میں وارِد ہیں، ان کی صورتوں میں زیادتی کی جائے، یا ان میں کمی کی جائے، اس اعتقاد کے ساتھ کہ یہ زیادتی اور نقصان، طاعت ہے، محض رائے کی بنیاد پر، تاکہ بدعت کے مفہوم سے وہ زیادتی اور نقصان خارج ہو جائے، جو عبادات میں آج کے زمانے میں مذاہبِ اربعہ کے اختلاف کی بنیاد پر واقع ہے، جیسا کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک، اقامت کے کلمات کا دو دفعہ ہونا، امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کے مذہب کے مقابلے میں، اور اقامت کے کلمات کا امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اکہرے ہونا، امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کے مذہب کے مقابلے میں، اور سورج گرہن کی نماز میں امام شافعی کے نزدیک ، ہر رکعت میں دو رکوع اور دو سجدوں، اور دو مرتبہ سورہ فاتحہ کا ہونا، نہ کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک،

کیونکہ یہ، اوران جیسی چیزیں، دین میں بدعت شمار نہیں ہوتیں، کیونکہ یہ دلائلِ شرعیہ سے ماخوذ ہیں، محض رائے سے ماخوذ نہیں (الحدیقة الندية)

امام شیخ عبدالغنی نابلسی حنفی رحمہ اللہ، مذکورہ کتاب میں ہی ایک مقام پر فرماتے ہیں کہ:

ومن هذا القبيل نهى الناس عن حضور مجالس الذكر بالجهر، وانشاد اشعار الصالحين، وان صرح فقهاء الحنفية بكراهة الجهر بالذكر، فان ائمة الشافعية كالنووى وغيره قائلون باستحباب ذالک ، ولاينبغى ان ينهى العوام عما تقول به ائمة المسلمين ، ولو كان العوام زاعمين انهم مقلدون لمذهب ابى حنيفة رحمه الله، وهم غير عالمين بفروع المذهب غير مجرد القول ، وقد ذكر الوالد رحمه الله تعالىٰ فى شرحه على شرح الدرر فى باب قضاء الفوائت فى مبحث الظن المعتبر.

قال فى البحر شرح الكنز: والحق ان المجتهد لا كلام فيه اصلا ، وان ظنه معتبر مطلقا سواء كانت تلک الفائتة واجبة الاداء بالاجماع، او لا ، اذ لا يلزمه اجتهاد ابى حنفية ، ولا غيره ، وان كان مقلدا لابى حنيفة ، فلا عبرة برأية المخالف لمذهب امامه ، وان كان عاميا ليس له مذهب معين ، فمذهبه فتوى مفتيه كما صرحوا به ، ولاعبرة برأيه وان لم يستفت احدا ، وصادف الصحة على مجتهد اجزاه ، ولا اعادة عليه كما بسطه ثمة اهـ.

ومن هذا القبيل :نهى العوام عن المصافحة، بعد صلاة الصبح، والعصر، فإن بعض المتأخرين من الحنفية، صرح بالكراهة فى ذلک، ادعاء بأنه بدعة، مع انه داخل فى عموم سنة المصافحة

مطلقا، فلا يبقى إلا مجرد التخصيص بالوقتين المذكورين، فيقتضى ابتداع ذلك.

وصرح النووى فى كتابه -الأذكار -وغيره من الشافعية، بأنها فى هذين الوقتين بدعة مباحة. فلا ينبغى للواعظ، أو المدرس، ان ينهى العوام عما أفتى بجوازه بعض أئمة الإسلام، ولو كان فى مذهب الغير، خصوصا، والعوام لا مذهب لهم، والتقليد للمذاهب الأربعة جائز لكل أحد، كما بسطناه فى رسالتنا"خلاصة التحقيق فى بيان حكم التقليد والتلفيق" (الحديقة الندية، شرح الطريقة المحمدية، ج٢، ص٩٨، الخلق الثامن والأربعون، من الأخلاق الستين المذمومة"الفتنة" مطبوعة: المكتبة الحقيقية ، استانبول، تركى، 1994ء)

ترجمہ: اور (لوگوں کو منع نہ کیے جانے والی صورتوں کے)اسی قبیل سے لوگوں کو ذکرِ جہری کی مجالس میں حاضر ہونے اور نیک لوگوں کے اشعار پڑھنے سے منع کرنا ہے (کہ اس سے بھی صرف جہر یا تداعی کی وجہ سے منع کرنا مناسب نہیں، جب تک کوئی اجماعی منکر لازم نہ آئے) اگر چہ فقہائے حنفیہ نے جہری ذکر (اور تداعی) کی کراہت کی تصریح فرمائی ہے، کیونکہ ائمۂ شافعیہ، جیسا کہ نووی وغیرہ، اس کے مستحب ہونے کے قائل ہیں، اور یہ بات مناسب نہیں کہ عوام کو اُن افعال سے منع کیا جائے، جن کے ائمۂ مسلمین قائل ہیں، اگر چہ عوام اس بات کا گمان کرتے ہوں کہ وہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے مذہب کے مقلد ہیں، حالانکہ وہ مذہب کے فروع کو جانتے نہیں، سوائے قولِ محض کے۔ [1]

اور میرے والد رحمہ اللہ تعالیٰ نے ''شرحُ الدرر'' کی اپنی شرح میں ''باب

[1] جس کی وجہ سے وہ عامی لوگوں میں داخل ہیں، جن کا کوئی مذہب نہیں ہوتا، جیسا کہ فقہائے کرام نے تصریح فرمائی ہے اور ہم نے اس قسم کی تصریحات، اپنے دوسرے مضامین وتالیفات میں ذکر کردی ہیں۔ محمد رضوان خان۔

قضاء الفوائت'' کے ذیل میں ظنِ معتبر کی بحث میں ذکر کیا ہے کہ ''**کنز**'' کی شرح ''**البحر**'' میں یہ مذکور ہے کہ حق بات یہ ہے کہ مجتہد کے بارے میں تو قطعاً کوئی کلام نہیں، اور اس کا گمان مطلقاً معتبر ہے، خواہ وہ فوت شدہ نماز بالا جماع، واجبُ الاداء ہو یا نہ ہو، کیونکہ اس مجتہد کو امام ابوحنیفہ اور ان کے علاوہ کسی اور مجتہد کا اجتہاد لازم نہیں۔ [1]

اور اگر وہ امام ابوحنیفہ کا مقلد ہو، تو پھر اس کے امام کے مذہب کے مخالف کی رائے کا اعتبار نہیں (جبکہ وہ عامی شخص نہ ہو، جیسا کہ آگے آتا ہے) اور اگر وہ عامی شخص ہو، تو اس کا کوئی مذہب متعین نہیں، پس اس کا مذہب، اس کے مفتی کا مذہب ہوتا ہے (خواہ اس نے حنفی مفتی سے فتویٰ لیا ہو، یا غیر حنفی مفتی سے) جیسا کہ فقہائے کرام نے تصریح فرمائی ہے، اور اس کی اپنی رائے کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا، اور اگر اس نے کسی مفتی سے استفتاء نہیں کیا، اور پھر اس کا عمل کسی بھی مجتہد کے مطابق صحیح واقع ہو گیا، تو بھی اس کے لیے جائز ہے، اور اس پر (اس نماز وغیرہ کے عمل کا) اعادہ نہیں، جیسا کہ وہاں (یعنی البحر میں) تفصیل بیان کی گئی ہے، انتہٰی۔

اور اسی قبیل سے عوام کو فجر اور عصر کی نماز کے بعد مصافحہ سے منع کرنا ہے (کہ اس سے منع کرنا بھی مناسب نہیں) کیونکہ حنفیہ کے بعض متاخرین نے اس کی کراہت کی تصریح کی ہے، اس بات کا دعویٰ کرتے ہوئے کہ یہ بدعت ہے، حالانکہ یہ مطلق مصافحے کی سنت کے عموم میں داخل ہے، پس مذکورہ دو وقتوں کے ساتھ صرف تخصیص ہی باقی رہ گئی، جو اس عمل کے مبتدع ہونے کا تقاضا کرتی ہے (لیکن اس میں توسّع موجود ہے)

چنانچہ شافعیہ میں سے امام نووی نے اپنی ''**کتابُ الاذکار**'' وغیرہ میں اس بات

---

[1] خواہ وہ کسی خاص متعلقہ مسئلہ یا متعلقہ مسائل میں جزوی مجتہد ہی، کیوں نہ ہو، جمہور اصولیین کے نزدیک اجتہاد متجزی ہونے کے قول کی رو سے۔ محمد رضوان خان۔

کی تصریح فرمائی ہے کہ ان دو وقتوں میں مصافحہ کرنا ''بدعتِ مباحہ'' ہے۔

لہٰذا واعظ یا مدرس کے لیے یہ بات مناسب نہیں کہ وہ عوام کو ایسی چیز سے منع کرے کہ جس کے جواز کا بعض ائمۂ اسلام نے فتویٰ دیا ہے، اگرچہ وہ مذہبِ غیر میں ہی کیوں نہ ہو، خاص طور پر عوام کو، جن کا کوئی مذہب نہیں ہوتا، اور مذاہبِ اربعہ کی تقلید، ہر ایک کے لیے جائز ہے، جیسا کہ ہم نے اپنے رسالے ''**خلاصة التحقيق في بيان حكم التقليد والتلفيق**'' میں اس کی تفصیل بیان کر دی ہے (الحديقة الندية)

امام عبدالغنی بن اسماعیل نابلسی دمشقی حنفی (المتوفیٰ:1143ھ) ہی اپنے رسالہ ''**خلاصة التحقيق في بيان حكم التقليد والتلفيق**'' میں فرماتے ہیں:

والحاصل :أن العلماء اختلفوا في لزوم مذهب معين، وصحح كل أحد منهم ما ذهب إليه، وعدم اللزوم هو الراجح كما ذكرناه بعد أن لا يخرج عن المذاهب الأربعة، والله ولي التوفيق (خلاصة التحقيق في بيان حكم التقليد، لعبدالغني النابلسي، ص٨، مطلب : هل على الإنسان التزام مذهب معين أم لا؟)

ترجمہ: اور خلاصہ یہ ہے کہ علماء کا مذہبِ معین کے لزوم میں اختلاف ہے، اور ہر ایک نے اپنے اختیار کردہ قول کی تصحیح کی ہے، لیکن مذہبِ معین کا لازم نہ ہونا راجح ہے، جیسا کہ ہم نے ذکر کیا، بعد اس کے کہ مذاہبِ اربعہ سے خروج نہ کرے، واللہ ولی التوفیق (خلاصۃ التحقیق)

پس حنفیہ کے نزدیک تو امام سمیت کم از کم چار افراد کا نمازِ عید کی جماعت کے لئے ہونا ضروری ہے، اور ایک قول کے مطابق، امام سمیت تین افراد کا ہونا بھی کافی ہے، ضرورت کے وقت اس پر بھی عمل کر سکتے ہیں۔

اور اگر صرف دو، یا تین افراد مل کر عید کی نماز با جماعت پڑھیں، تو غیر حنفیہ کے نزدیک تو اس کے جواز میں کوئی شبہ نہیں، اور حنفیہ کے نزدیک بھی تداعی نہ ہونے کی وجہ سے اس میں کوئی کراہت لازم نہیں آتی، اور اس کو فعلِ منکر کی فہرست میں شمار نہیں کیا جا سکتا، جس کی تفصیل پہلے ذکر کی جا چکی۔

اور ہمارے نزدیک افضل و بہتر، نیز اختلاف سے بچنے کا طریقہ یہی ہے کہ اگر کوئی با جماعت نمازِ عید پڑھے، تو پھر زائد تکبیرات کے ساتھ جہری قرائت بھی کرے، اور عذر نہ ہو تو خطبہ بھی دے۔

اور اگر انفرادی طور پر پڑھے، خواہ مرد ہو، یا عورت، تو بغیر خطبہ اور جہری قرائت کے، واجب کی قید لگائے بغیر مطلق نمازِ عید کی نیت کرے، اور زائد تکبیرات بھی کہے، اور دو رکعت کے بعد خطبہ و جماعت کی تلافی کے طور پر مزید دو رکعات نفل بھی پڑھ لے۔

پس موجودہ صورتِ حال میں جو لوگ نمازِ عید کو بڑے مجامع میں نہ پڑھ سکیں، اور وہ قانونی رُکاوٹ کی وجہ سے، یا حفاظتی تدبیر کے طور پر خود سے بڑے مجامع میں نمازِ عید کے لئے شرکت نہ کریں، تو اُن کو اپنے مقام پر رہتے ہوئے، حسبِ موقعہ با جماعت، یا بلا جماعت عید کی نماز پڑھنا جائز ہے، خواہ وہ مرد ہوں، یا خواتین، اور مریض ہوں، یا مسافر اور ان کو یومِ عید کے اہم عمل، نمازِ عید، اور **عند الجمهور** ایک مشروع کارِ خیر سے منع کرنا، یا ان کے عمل پر نکیر و ملامت کرنا درست نہیں۔

بلکہ جمہور فقہائے کرام اور ان کی طرف سے بیان کردہ دلائل، اور صحابۂ کرام و تابعین کرام کے آثار کے پیشِ نظر افضل اور بہتر یہ ہے کہ عام حالات میں عید کے دن خواتین اور گھر میں موجود افراد، اور گاؤں، دیہات کے وہ لوگ بھی نمازِ عید پڑھیں، جو شہر کے بڑے مجامع میں نمازِ عید میں شریک نہ ہوں، جیسا کہ دلائل کے ساتھ ماقبل میں ذکر کیا گیا۔

اور آخر میں ایک مرتبہ پھر بندہ، اس قسم کے اجتہادی، وفروعی مسائل میں تشدد و جمود اختیار

کرنے والے حضرات کو اپنے طرزِ عمل پر نظرِ ثانی کرنے، اور اعتدال پیدا کرنے کی مؤدبانہ درخواست والتماس کرتا ہے، خواہ وہ اکابر ومشائخ ہوں، یا معاصر ہوں، یا پھر اصاغر ہوں۔

لیکن اس کی نوبت اس وقت ہی آ سکتی ہے، جب اس طرح کے مضامین وآراء کو نیک نیتی ویکسوئی کے ساتھ ملاحظہ ومطالعہ کی زحمت فرمائی جائے، اور کسی موقف کو ملاحظہ ومطالعہ کیے بغیر اس پر بلا دلیل تفرد وغیرہ کا الزام، بلکہ تہمت عائد کرنے سے اجتناب کیا جائے۔

فقط.

وَاللّٰہُ سُبْحَانَہٗ وَتَعَالٰی اَعْلَمُ .

محمد رضوان خان

5/شوال المکرّم/1441ھ۔28/مئی/2020 بروز جمعرات

ادارہ غفران، راولپنڈی، پاکستان

علمی و تحقیقی رسائل

’’جو اجتہادی اختلاف، شرعی اجتہاد کی
تعریف میں داخل ہے، اس میں اپنے اپنے اجتہاد سے
جس امام نے جو جانب اختیار کر لی، اگرچہ عنداللہ اس میں صواب
اور صحیح صرف ایک ہے، دوسرا خطاء ہے، لیکن یہ صواب و خطاء کا فیصلہ صرف
حق تعالیٰ کے کرنے کا ہے، وہ محشر میں بذریعہ اجتہاد صواب پر پہنچنے والے عالم کو
دوہرا ثواب عطا فرمائیں گے اور جس کے اجتہاد نے خطاء کی ہے، اس کو ایک ثواب
دیں گے، اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو اجتہادی اختلاف میں یہ کہنے کا حق نہیں کہ یقینی طور پر
یہ صحیح ہے، دوسرا غلط ہے۔ ہاں اپنی فہم و بصیرت کی حد تک ان دونوں میں جس کو وہ اقرب
الی القرآن والسنہ سمجھے، اس کے متعلق یہ کہہ سکتا ہے کہ میرے نزدیک یہ صواب ہے، مگر
احتمال خطاء کا بھی ہے اور دوسری جانب خطاء ہے، مگر احتمال صواب کا بھی ہے۔ اور
یہ بات ہے جو تمام ائمہ فقہاء میں مسلم ہے۔ اس سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ
اجتہادی اختلاف میں کوئی جانب منکر نہیں ہوتی کہ امر بالمعروف و نہی
عن المنکر کے ماتحت اس پر نکیر کیا جائے اور جب وہ منکر نہیں تو
غیر منکر پر نکیر، خود امرِ منکر ہے، اس سے پرہیز لازم
ہے۔‘‘ (صفحہ نمبر 730)